

شرح

عقیدۂ طحاویہ

علی بن علی بن محمد بن محمد بن ابی العز الحنفی

ترجمہ وتعلیق

پیرزادہ شفیق الرحمن شاہ الدراوی حفظہ اللہ

دار المعرفۃ
پاکستان

ہدیہ دراوی

اردو ترجمہ؛ وحاشیہ

شرح عقیدۂ طحاوی

تألیف:

علی بن علی بن محمد بن محمد بن ابی العز الحنفی رحمۃ اللہ علیہ

المعروف ابن ابی العز (۷۳۱ھ تا ۷۹۲ھ)

تحقیق ونظر ثانی: علماء کی ایک جماعت

تخریج أحادیث: شیخ علامہ ناصر الدین الالبانی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ وحاشیہ

پیرزادہ شفیق الرحمٰن شاہ الدراوی

دار المعرفہ

نام کتاب	:	شرح عقیدہ طحاوی
تألیف	:	علی بن علی بن محمد بن محمد بن ابی العز الحنفی رحمۃ اللہ علیہ
تحقیق	:	علامہ ناصر الدین الالبانی رحمۃ اللہ علیہ ۔
ترجمہ	:	پیرزادہ شفیق الرحمٰن شاہ الدراوی
اشاعت اوّل:	:	

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش تحریر

الحمدللہ ؛والصلاۃ و السلام علی رسول اللہ ؛ و بعد

اس ترجمہ کو پڑھنے سے پہلے ان امور کا خیال رکھیں:

یہ کتاب عقیدہ کی معتبر کتاب '' شرح عقیدہ طحاوی''؛ از علی بن علی بن محمد بن محمد بن ابی العز رحمہ اللہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اگر چہ اس شرح کا ایک ترجمہ اس وقت دستیاب ہے؛ جو کہ مخدوم محترم حضرت مولانا صادق خلیل رحمہ اللہ کے نام سے منسوب ہے؛ مگر پھر بھی اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ:

مترجم رحمہ اللہ سے کئی امور میں تساہل/عمداً یا سہواً ہو گیا تھا۔

۱۔ اہم مباحث میں پورے پورے پیراگراف کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا تھا؛ جس سے کتاب کی افادیت پر کافی ملاحظات پیدا ہو گئے تھے۔

۲۔ چھوٹے چھوٹے جملے بجا بجا ترجمہ سے رہ گئے تھے۔

۳۔ حتی کہ کئی مقامات پر اہم ترین پیراگراف؛ آیات اور احادیث کا ترجمہ رہ گیا تھا۔

۴۔ مترجم رحمہ اللہ نے کئی مقامات پر اپنی طرف سے کچھ ایسے اضافے کر دیے تھے جو کہ اصل کتاب میں نہیں تھے؛ مگر پھر بھی وہ کتاب میں بغیر کسی نشاندہی؛ اشارہ؛ اور تنبیہ کے یوں شامل کر لیے گئے تھے کہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شارح کا کلام ہے؛ یا پھر مترجم کا۔

۵۔ کئی مقامات پر الفاظ یا اصطلاحات کا ترجمہ محل نظر تھا۔

۶۔ کئی مقامات پر ترجمہ شارح کی رائے کے بالکل برعکس تھا۔ جس سے معنی بالکل الٹ گیا تھا۔

میرا کام اور عملی خاکہ:

میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے عربی شرح عقیدہ طحاوی کے متن کو اعراب کے ساتھ اس ترجمہ میں درج کر دیا ہے۔ اور پھر نیچے اس کا ترجمہ ہے۔ کوشش یہ کی ہے کہ ترجمہ الفاظ کی حدود سے باہر بھی نہ جائے؛ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا بھی ہو۔

متن کی عبارت ایک جگہ پر پوری درج کی ہے؛ اور پھر حسب ضرورت اس کو علیحدہ علیحدہ پیرائے میں بھی لایا ہوں۔

میں نے حضرت مولانا مترجم سابق رحمہ اللہ کی محنت سے پورا استفادہ کرتے ہوئے ان کے ترجمے کو لفظاً لفظاً اصل کتاب کے ساتھ ملایا؛ اور جو کمی کوتاہی رہ گئی تھی؛ اسے پورا کر دیا۔

جہاں پر الفاظ کا ترجمہ مطابقت نہیں رکھتا تھا؛ اس کو تبدیل کر کے درست کر دیا۔

ہر ممکن کوشش کی ہے کہ متن کتاب کی اصل عبارت عربی میں اعراب کے ساتھ درج کی جائے تا کہ عام طالب علم بھی کما حقہ استفادہ کر سکے۔

اس کتاب کے ترجمہ کے لیے میں نے المکتب الاسلامی بیروت سے طبع شدہ/نوویں طبع کے نسخہ سے استفادہ کیا ہے۔ جس کی تحقیق علماء کی ایک جماعت نے کی ہے۔ اور تخریج احادیث محدث العصر امام ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ نے کی ہے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ کا [۶۰ صفحات پر مشتمل] وہ طویل مقدمہ جس میں انہوں نے ابوغدہ پر رد کیا تھا؛ اسے حذف کر دیا۔

اس پر شیخ الاسلام علامہ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ اور علامہ البانی رحمہ اللہ کی ان تعلیقات کا اضافہ کیا ہے جو الگ سے تعلیقات کے نام سے ایک چھوٹے رسالہ کی شکل میں عربی زبان میں طبع شدہ ہے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ کی تمام تعلیقات کا اضافہ نہیں؛ بلکہ ان میں سے بھی منتخب پیرائے کا اضافہ کیا ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے جو حصہ اسی شرح سے لیا گیا تھا؛ جس کا ترجمہ مطلوب ہے؛ اسے حذف کر دیا ہے۔ تاہم علیحدہ سے ان کو ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

اس کتاب میں ہر پیرائے کے ساتھ اصل مضمون/موضوع کا نام دیتے ہوئے سرخی کا اضافہ کیا ہے۔

کئی مقامات پر ذیلی سرخیاں بھی درج کی ہیں۔

اس کتاب کے ترجمہ میں جناب شیخ عبدالرحمٰن بن ناصر البراک کی عقیدہ طحاویہ کی شرح سے بھی استفادہ کیا ہے جو کہ حاشیہ میں کہیں کہیں مل جائے گا۔

اس کتاب کی اکثر شہ سرخیوں کو متن کی عبارت کے پیراگراف کے حساب سے نیا عنوان دیا گیا ہے۔ تاہم جہاں کہیں متن کی شرح آدھے صفحہ سے بھی کم تھی وہاں پر پیرے کا نمبر تو دے دیا ہے مگر اسے ذیلی سرخی میں عنوان دیکر اسی صفحہ پر لے آیا ہوں۔ تاکہ بلا وجہ صفحات بڑھا کر کتاب کا حجم اور خرچہ نہ بڑھایا جائے۔

جہاں کہیں کسی مشکل عبارت/یا اضافی تشریح کی ضرورت پڑی تو اسے اس [] بریکٹ میں لکھ دیا ہے۔ [] اس بریکٹ کی داخلی عبارت کا تعلق نہ مؤلف سے ہے نہ شارح سے؛ خواہ یہ بین القوسین عبارت متن میں ہے یا حاشیہ میں یا سرخی میں۔ وہ میرا کام ہے۔ اگر درست ہے تو من جانب اللہ؛ اور اس کی توفیق؛ اور اگر غلطی ہے؛ تو اس کا اعتراف اور کوتاہی کی معذرت؛ اور اصلاح کی درخواست۔

کہیں پر (/) اس علامت کے پہلے اور بعد تقریب فہم کے لیے مترادف الفاظ کا استعمال کیا گیا مثلاً:

مانع/رکاوٹ۔

اور حاشیہ میں کہیں کہیں: آپ کو سطر کے شروع میں ''اقول'' یا آخر میں ''دراوی'' لکھا ہوا مل جائے گا۔ یہ میری طرف سے اضافہ ہے؛ اور بعض جگہ پر میں نے دوسری شروحات سے اضافے کئے ہیں؛ ان کی طرف اشارہ بہت کم کیا ہے؛ اس سے آگاہ رہیں۔

اکثر مقامات سے راویوں یا محدثین/رجال کے نام کے ساتھ بین القوسین () ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج کر دی ہے۔ یہ تاریخیں اسی نسخہ سے لی ہیں جس سے میں ترجمہ کر رہا ہوں۔

جہاں کہیں حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے ایک کتاب سے کئی کئی اسناد کا ذکر کیا گیا تھا؛ وہاں پر میں نے صرف ایک یا دو اسناد کا حوالہ دینے پر اکتفاء کر لیا ہے۔ باقی تفصیل کے متلاشی طلبہ اصل کتاب کی طرف رجوع کر لیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
رب یسر و لا تعسر و تمم بالخیر۔ رب أعنی علی ذلک

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَسَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لا شَرِيْكَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ. صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ عَلَى آلِهِ وَ صَحْبِهِ وسلم تَسْلِيْماً كَثِيْراً؛ أَمَّا بَعْدُ [1]:

علوم اُصول دین کا شرف و مرتبہ:

[1] ۔عقیدہ طحاوی کے متن میں اس کتاب کی ابتداء یوں ہوتی ہے: امام ابو جعفر أحمد بن محمد بن سلامہ الازدی الطحاوی [مصری] رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
هٰذَا ذِكْرُ بَيَانِ عَقِيْدَةِ أَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ عَلَى مَذْهَبِ فُقَهَاءِ الْمِلَّةِ: أَبِي حَنِيْفَةَ النُّعْمَانِ بْنِ ثَابِتٍ الْكُوفِي، وَأَبِي يُوسُفَ يَعْقُوبَ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ الْاَنْصَارِي، وَأَبِي عَبْدِ اللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ الشَّيْبَانِي رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ أَجْمَعِيْنَ، وَمَا يَعْتَقِدُوْنَ مِنْ أُصُوْلِ الدِّيْنِ وَيَدِيْنُوْنَ بِهٖ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ.
یہ اہل سنت والجماعت کے اس عقیدہ کا بیان کا ذکر ہے جو فقہائے ملت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الکوفی ؛ اور ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاری اور ابو عبداللہ محمد بن حسن الشیبانی رضی اللہ عنہم اجمعین کے عقائد کے مطابق ہے؛ اور جو کچھ وہ اصول دین میں عقیدہ رکھتے تھے؛ اور رب العالمین کے بارے میں ان کا دین [وعقیدہ] تھا''۔ اگر مؤلف رحمہ اللہ تعالیٰ ''جو فقہائے ملت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الکوفی ؛ اور ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاری.....'' بجائے یوں فرماتے: ''جو فقہائے ملت جن میں سے امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الکوفی ؛......'' بھی ہیں؛ تو یہ زیادہ بہتر ہوتا۔ اس لیے کہ ان تین حضرات کی امامت اور فقاہت میں کوئی ادنی سا شک وشبہ نہیں؛ لیکن اس امامت وفقاہت کو ان تین میں محصور کرنا بھی ناروا ہے؛ کیونکہ ان کے علاوہ بھی دیگر ائمہ اسلام بھی ہیں جن کا یہی عقیدہ ہے۔ چنانچہ امام مالک؛ امام شافعی اور امام أحمد بن حنبل رحمہم اللہ اور ان کے صف اول کے پیروکاروں کا یہی عقیدہ رہا ہے۔
تبصرہ: اور امام صاحب کا یہ فرمان: ''اور جو کچھ وہ اصول دین میں عقیدہ رکھتے تھے؛ اور رب العالمین کے بارے میں ان کا دین [وعقیدہ] تھا''۔ واضح رہے کہ اس کتاب کی تحریر کا اصل مقصد اسی چیز کی وضاحت تھی۔ اکثر اہل علم کی تحریروں میں عقیدہ کے مسائل کے لیے اصول دین کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصول دین اعتقاد کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ اصول دین میں سے کچھ امور اعتقادی ہیں جیسے: اللہ تعالیٰ پر ایمان؛ فرشتوں اور رسولوں پر آخرت کے دن پر ایمان .....''۔ اس قدر ان امور کو اصول دین اعتقادی علمی کہا جاتا ہی۔ اور کچھ امور عملی ہیں: جیسے لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار؛ نماز قائم کرنا؛ روزے رکھنا......'' یعنی اسلام کے پانچ بنیادی ارکان۔ یہ دین کے عملی اصول ہیں۔ اس لیے کہ دین کے مسائل دو قسم کے ہیں:: علمی مسائل اور عملی مسائل۔ ان میں سے ہر ایک قسم کے کچھ اصول ہیں اور کچھ فروع۔ پس اس صورت میں اصول دین کی اصطلاح صرف اعتقادی مسائل کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ عملی مسائل کو بھی شامل ہے؛ جیسا کہ شیخ الاسلام نے یہ واضح کیا ہے۔ دیکھیں: منہاج السنہ النبویہ ۵/ ۸۷۔ اور مجموع الفتاوی ۶/ ۵۶؛ ۱۹/ ۲۰۷۔

جب یہ بات طے ہے کہ اصول دین کا علم تمام علوم سے اشرف واعلیٰ ہے؛ کیونکہ جس قدر کسی کی معلومات اعلی ہوں گی؛ اسی قدر وہ علم بھی اعلی ہوگا۔ یہی وہ علم ہے جسے فقہ الفروع [فقہ اصغر] کے مقابلہ میں [علم الاصول] فقہ اکبر کہا جاتا ہے۔ اسی لیے امام ابو حنیفہ

رحمہ اللہ (۸۰ھ تا ۱۵۰ھ) نے اصول دین سے متعلق اپنی کتاب میں جو کچھ کہا اور جمع کیا ہے؛ اس کو انہوں نے فقہ اکبر کا نام دیا ہے۔ اور انسانوں میں اس علم کی حاجت دیگر تمام دنیاوی حاجات سے بڑھ کر ہے۔ اس علم کی ضرورت سب دنیاوی ضرورتوں سے زیادہ ہے۔ چونکہ اپنے رب؛ معبود؛ خالق و مالک کے اسماء و صفات اور افعال وغیرہ کی معرفت کے بغیر دلوں کو تازگی؛ اطمینان اور سکون نصیب نہیں ہو سکتے؛ اور نہ ہی ان کے بغیر روح کی کوئی زندگی ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ لیا جائے تو اس علم کی اہمیت اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ اسی علم کی بدولت اللہ تعالیٰ کی محبت تمام کائنات کے دلوں میں موجزن ہوتی ہے۔ اور دیگر تمام مخلوقات کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کا سب سے زیادہ اور مؤثر ذریعہ ہے۔

چونکہ اصول دین کی تفصیلات کا ادراک کرنا اور اس قسم کی چیزوں کی معرفت حاصل کرنا انسانی عقل کے لیے محال تھا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ غالب و مہربان ہستی کی رحمت کا تقاضا ہوا؛ تو اس نے ان امور کی معرفت دینے والے انبیاء و مرسلین علیہم السلام کو مبعوث فرمایا؛ جو لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتے رہے اور اپنی بات ماننے والوں کو بشارتیں سناتے؛ اور مخالفت کرنے والوں کو برے انجام سے ڈراتے رہے۔ ان انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی کنجی اور رسالت کا خلاصہ معبود حقیقی کے اسماء و صفات اور افعال کی معرفت کو قرار دیا۔ کیونکہ تمام تر تعلیمات شریعت کی بنیاد اول تا آخر اسی معرفت پر قائم ہے۔

دین کی دو عظیم الشان بنیادیں:

پھر اس کے بعد ان دو عظیم بنیادوں کا درجہ آتا ہے:

۱۔ اس تک رسائی کی راہ کی معرفت: اس سے مراد وہ اسلامی شریعت ہے جو کہ اوامر و نواہی پر مشتمل ہے۔

۲۔ [منزل کی معرفت]: راہ حق پر گامزن کو یہ بتانا کہ ان کی منزل تک رسائی کے بعد انہیں کن کن نعمتوں سے نوازا جائے گا۔

لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی معرفت سب سے زیادہ اس کو ہے جو اس تک رسائی کی راہ پر زیادہ گامزن ہو۔ اور جس کو اس کے سامنے پیشی کے وقت سالکین کے احوال کی معرفت زیادہ ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ شریعت کو ''روح'' قرار دیا ہے۔ کیونکہ حقیقی زندگی اسی ''روح'' پر موقوف ہے۔ نیز اسے ''نور'' بھی قرار دیا ہے؛ کیونکہ ہدایت کا راستہ ملنا صرف اسی ''نور'' شریعت کی روشنی میں چلنے سے ملنا ممکن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ [غافر ۱۵]

''اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے وحی اتارتا ہے''۔

ایسے ہی اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (52) صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ (53)﴾ [شوری]

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح وحی کی، آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان کیا ہے؟ لیکن

ہم نے اسے ایسی روشنی بنا دیا جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں راہ دکھاتے ہیں اور بلاشبہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس اللہ کے راستے کی طرف کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے، سن لو! تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں''۔

تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت سے ہی روحانی زندگی ملتی ہے۔ اور شریعت مطہرہ ہی وہ نور ہے جس سے ہم روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہ شریعت شفاء بھی ہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ﴾[فصلت ۴۴]

''فرما دیجیے: یہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہدایت اور شفاء ہے''۔

اگرچہ یہ شریعت مطلق طور پر سب کے لیے ہی ہدایت اور شفاء ہے؛ لیکن چونکہ اس سے فائدہ اٹھانے والے حقیقت میں اہل ایمان ہی ہوتے ہیں؛ اس لیے اس آیت میں ان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تھا۔ پس ہدایت صرف اور صرف اسی چیز میں ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام لیکر آئے ہیں''۔ (الصواعق المرسلہ ۱۵۱)

اجمالی ایمان:

اس بات میں ذرہ بھر بھی شک نہیں [1] کہ ہر ایک پر یہ واجب ہوتا ہے کہ اس شریعت پر عام اور مجمل ایمان لائے جو دین اور شریعت محمد رسول اللہ ﷺ لیکر آئے ہیں۔ بلا شک وشبہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی تفصیلی معرفت حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ اور یہ فرض کفایہ (اہل علم کی) اس دعوت میں داخل ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف نازل کردہ شریعت کی تبلیغ کی جاتی ہے؛ اور قرآن مجید میں تدبر اور اس کا عقل وفہم حاصل کرنے میں اور کتاب وسنت کے علوم کے حصول اور نصوص شریعت کی حفاظت؛ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور حکمت ودانائی کے ساتھ خیر وبھلائی کی دعوت اور احسن انداز میں لوگوں کے اعتراضات کا جواب دینے میں داخل ہے۔

جس قسم کا ایمان لانا ہر شخص کے لیے واجب ہے؛ وہ بھی لوگوں کی قدرتوں اور حاجتوں اور معرفت کے مختلف مدارج اور ان کے مامور بہ اعیان کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ جو شخص دین وایمان کی باریکیوں کو سمجھنے اور علم کے بعض پہلوؤں کی سماعت سے عاجز ہے؛ اس کی ایمان کے سلسلہ میں ذمہ داری بھی اتنی نہیں جتنی اس شخص کی ذمہ داری ہے جو کہ نصوص کا تفصیلی علم اور علمی باریکیوں کو سمجھنے کی

[1] ۔شیخ عبدالرزاق عفیفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''دیکھیں: موافقة صحيح المنقول لصريح المعقول '' لشیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ص ۲۷-۳۰؛ ۹۵۔ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: استاذ محترم عبدالرزاق عفیفی رحمہ اللہ کی تمام تر تعلیقات کا حوالہ ''مطبعہ السنة المحمدیہ کی ۱۳۷۰ھ کی طباعت سے ہے۔ جس کی تحقیق شیخ حامد الفقی رحمہ اللہ نے کی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر رشاد سالم رحمہ اللہ کی تحقیق سے '' درء تعارض العقل والنقل '' کے نام سے نئی تحقیق کے ساتھ گیارہ جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

اہلیت رکھتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کے لیے جو کہ نصوص شریعت کو سنتا اور سمجھتا ہے؛ اور ان کا فہم وادراک رکھتا ہے؛ اس کے لیے اس قدر تفصیل سے ایمان لانا ضروری ہے؛ اتنا اس شخص کے لیے تفصیلی ایمان ضروری نہیں جو ان نصوص کو نہیں سمجھتا۔ الغرض جس طرح کا ایمان

کسی مفتی؛ محدث اور حاکم وقت سے مطلوب [یعنی اس پر واجب] ہے؛ وہ اس طرح سے اس شخص سے قطعاً مطلوب نہیں ہے جوان کی مانند نہیں۔

ایمان وعقائداور گمراہی:

یہ جان لینا چاہیے کہ ایمان وعقائد کے سلسلہ میں عموماً جولوگ گمراہی اور ضلالت کا شکار ہیں؛ یا معرفت حق سے عاجز رہے ہیں؛ تو (اس کا سبب دو بنیادی امور ہیں):

ا۔ وہ اس چیز میں کوتاہی اور افراط وتفریط کے مرتکب ہوئے جو نبی کریم ﷺ لیکر آئے ہیں۔

۲۔ انہوں نے شریعت کی معرفت تک پہنچانے والی چیز (یعنی وحی) میں تدبر وتفکر ترک کردیا۔ [فہم ودانست سے دور رہے]۔

پس جب یہ لوگ کتاب اللہ سے روگردانی کے مرتکب ہوئے تو گمراہ ہوگئے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰی (۱۲۳) وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (۱۲۴) قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ اَعْمٰی وَ قَدْ کُنْتُ بَصِیْرًا (۱۲۵) قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتْکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا وَ کَذٰلِکَ الْیَوْمَ تُنْسٰی (۱۲۶)﴾ [طه]

''پھر اگر کبھی واقعی تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کے پیچھے چلا تو نہ وہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا۔ اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو بے شک اس کے لیے تنگ گزران ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھنے والا تھا۔ وہ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات آئیں تو تو انھیں بھول گیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا''۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''جو شخص قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے؛ اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے؛ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی ضمانت ہے کہ نہ اسے کبھی دنیا میں گمراہ کریں گے؛ اور نہ ہی آخرت میں وہ بدبختوں میں سے اٹھایا جائے گا''۔

اور پھر آپ نے سورت طه کی مذکورہ بالا آیات کی تلاوت فرمائی۔ جیسا کہ سنن ترمذی اور دیگر کتب میں روایت کردہ حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''عنقریب کوئی فتنہ برپا ہوگا''۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! اس فتنہ سے بچنے کی صورت کیا ہوگی؟

آپ نے فرمایا: ''کتاب اللہ، اس میں تم سے پہلے کے لوگوں اور قوموں کی خبریں ہیں اور بعد کے لوگوں کی بھی خبریں ہیں، اور تمہارے درمیان کے امور ومعاملات کا حکم وفیصلہ بھی اس میں موجود ہے، اور وہ دوٹوک فیصلہ کرنے والی ہے، ہنسی مذاق کی چیز نہیں۔ جس نے اسے سرکشی سے چھوڑ دیا اللہ اسے توڑ دے گا اور جو اسے چھوڑ کر کہیں اور ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے گمراہ کر دے گا۔ وہ [قرآن] اللہ کی مضبوط رسی ہے یہ وہ حکمت بھرا ذکر ہے، وہ سیدھا راستہ ہے، وہ ہے جس کی وجہ سے خواہشیں ادھر ادھر نہیں بھٹک پاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے زبانیں نہیں لڑکھڑاتیں، اور اس کی انوکھی [وقیمتی] باتیں ختم نہیں ہوتیں؛ اور علما

کو[خواہ کتنا ہی اسے پڑھیں] آسودگی نہیں ہوتی، ...... جو اس کے مطابق بولے گا؛ وہ سچ کہے گا؛ اور جو کوئی اس کے مطابق عمل کرے گا اسے اجر وثواب دیا جائے گا۔ اور جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا اس نے انصاف کیا؛ اور جس نے اس کی طرف بلایا اسے سیدھے راستے کی ہدایت دی گئی''❶۔

ان کے علاوہ دیگر آیات اور احادیث بھی ہیں جو اس جیسے معانی پر دلالت کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اگلوں اور پچھلوں سے اس کے علاوہ کسی دین کو قبول نہیں کریں گے۔ بس صرف وہی چیز قبول ہوگی جو اس کے اس دین کے موافق ہو جو اس نے اپنے رسولوں علیہم السلام کی زبانی (بذریعہ وحی) بطور شریعت مشروع کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کو ان باتوں سے پاک اور مبراء قرار دیا ہے جو کچھ لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں؛ سوائے ان باتوں کے جو انبیائے کرام علیہم السلام نے اس کی صفات میں بیان فرمائی ہیں؛ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (180) وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (181) وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (182)﴾ [الصافات 182،180]

''پاک ہے تیرا رب، عزت کا رب؛ ان باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ اور سلام ہو رسولوں پر۔ اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے''۔

پس ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان باتوں سے اپنی ذات کو منزہ اور پاک قرار دیا ہے جو کچھ کافر اس کے متعلق بیان کرتے ہیں (اور اس کی شان میں گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں)۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسولوں پر سلامتی بھیجی ہے؛ کیونکہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ نقص اور عیب سے پاک ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تعریف بیان کرتے ہوئے ایسے منفرد اوصاف کا ذکر فرمایا ہے جن کا تقاضا تھا کہ ہر قسم کی حمد وثناء کا استحقاق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔

ایمان کے باب میں خیر القرون کا راستہ

خیر القرون یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے رہے۔ ان میں سے ہر پہلے والا اپنے بعد آنے والے کو؛ اور ہر اگلا اپنے پچھلے کو اس راستہ کی اقتداء کی وصیت اور تلقین کرتا رہا۔ اور یہ تمام لوگ اس سلسلہ میں اپنے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کی ہی پیروی کرتے رہے۔ اور آپ کے بتائے ہوئے منہج پر گامزن رہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ

❶۔ (3082) امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے، اس حدیث کو ہم صرف اسی سند سے جانتے ہیں۔ تفرد بہ المولف؛ تحفة الاشراف: ۱۰۰۷۵؛ ضعیف؛ معنوی اعتبار سے یہ روایت بڑی خوبصورت اور بامعانی ہے، مگر اس کی سند میں حارث الاعور ضعیف راوی ہے، بلکہ بعض ائمہ نے اسے جھوٹا کہا ہے۔ اور اصل میں یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔ اور اسے غلطی سے مرفوع کہا گیا ہے۔ اور ابن اخی الحارث بھی مجہول ہے۔ قال الشيخ الألباني: ضعيف، المشكاة 2138؛ صحيح وضعيف سنن الترمذي للألباني: ح 2906۔ [درء التعارض ۱/ ۵۱؛ مجموع الفتاوى ۳/ ۳۱۲]

اپنی کتاب میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ (یوسف ۱۰۸)

''فرما دیجیے: یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے''۔

[آیت کریمہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ] اگر جملہ '' وَ مَنِ اتَّبَعَنِي '' کا عطف '' اَدْعُوْٓا '' کی ضمیر متکلم کی طرف لوٹایا جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے حقیقت میں آپ ﷺ کے سچے متبعین ہی ہیں۔

اور اگر جملہ '' وَ مَنِ اتَّبَعَنِي '' کا عطف '' اَنَا '' کی ضمیر منفصل کی طرف مانیں تو یہ آیت مبارکہ اس باب میں انتہائی واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے راستے کے پیروکار ہی درحقیقت اہل بصیرت ہیں؛ کوئی دوسرا نہیں۔ اور اس آیت کریمہ کے یہ دونوں معانی ہیں برحق ہیں''۔ (الصواعق ۱۵۲-۱۵۵)

رسول اللہ ﷺ نے اس دین اسلام کی کھل کر تبلیغ کی؛ اور بصیرت کے متلاشیوں کے لیے راہیں واضح کر دیں؛ اور خیر القرون کے لوگ آپ ﷺ کے بعد اسی راستہ پر گامزن رہے۔ پھر ان کے بعد کچھ ایسے ناخلف لوگ آئے؛ جو اپنی خواہشات کی پیروی کرنے لگے؛ اور تفرقہ بازی کا شکار ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اصول دین کی حفاظت کے لیے ائمہ دین کو کھڑا کیا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا تھا:

''میری امت کے کچھ لوگ حق پر قائم رہیں گے؛ ان کے مخالفین ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے''❶۔

عقیدہ طحاوی کا موضوع:

جن ائمہ کرام نے دعوتِ دین کے اس حق کو ادا کیا؛ ان میں سے ایک امام ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ ازدی طحاوی رحمہ اللہ بھی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو رحمت و برکت سے ڈھانپ دے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ کی تاریخ پیدائش ۲۳۹ھ؛ اور تاریخ وفات ۳۲۱ھ ہے ❷۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے ہمیں وہ عقیدہ سکھایا ہے جس پر سلف صالحین گامزن رہے۔ امام موصوف نے (اپنی اس کتاب میں) امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب قاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الحِمیری الانصاری (۱۱۳-۱۸۲ھ) اور محمد بن حسن شیبانی (۱۳۱-۱۸۹ھ) رحمہم اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ اصول دین کے بارے میں یہ حضرات کس قسم کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اور اللہ رب العالمین کے حوالے سے ان کے عقائد کیا تھے۔

❶۔ (متفق علیہ) یہ حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ الصحيحة ٢٧٠ ؛ مسلم ١٩٢٠، عن ثوبان ؛ البخاری ٣٦٤٠ ؛ عن المغيرة و عن معاوية ١٩٢٢ ؛ و عن جابر بن سمرة و جابر بن عبدالله و عقبة بن عامر و سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اجمعین۔

❷۔ ان کے حالات زندگی کے لیے دیکھیں: تذكرة الحفاظ للذهبی ٣/ ٢٨-٢٩ ؛ وتاريخ ابن كثير ١١/ ١٧٤، والمنتظم لابن الجوزی ٦/ ٢٥، وشذرات الذهب ٢/ ٢٨٨، واللباب لابن الأثير ٢/ ٨٢، والجواهر المضيئة لابن أبی الوفا القرشی ١/ ١٠٢-١٠٥، والفوائد البهية: ٣١-٣٤، ولسان الميزان ١/ ٢٧٤-٢٨٢، وتهذيب تاريخ ابن عساكر ٢/ ٥٤-٥٥، وابن خلكان ١/ ٥٣-٥٥ ـ طبعة مكتبة النهضة بمصر۔

عقائد اور تحریفات کی ابتداء:

جیسے جیسے زمانہ عہد نبوی ﷺ سے دور ہوتا چلا گیا؛ بدعات پھیلتی چلی گئیں؛ کثرت سے تحریف ہونے لگی۔ جس کو اہل تحریف

نے (اپنے مذموم کام چھپانے کے لیے) تأویل کا نام دیا تاکہ اسے قبولیت مل جائے۔ اور وہ لوگ بہت کم تھے جو تحریف اور تأویل کے مابین فرق کو سمجھتے۔ اس لیے کہ کبھی تو کلام کو اس کے ظاہر سے پھیر کر دوسرا احتمالی معنی مراد لینے کو تأویل کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ وہاں ایسا کوئی قرینہ موجود نہ ہی ہو جو اس کو واجب کرتا ہو۔ پس یہیں سے فساد رونما ہوا۔ پس جب اسے تأویل کا نام دیا گیا تو لوگوں نے اسے قبول کرلیا؛ اور یہ عمل ان لوگوں میں رواج پکڑ گیا جو تحریف اور تأویل کے مابین فرق نہیں کر سکتے تھے۔

اس کے بعد اہل ایمان کو ضرورت پڑی کہ اس چیز کو دلائل کے ساتھ واضح کریں۔ اور دلائل پر وارد شدہ شبہات سے دفاع کریں۔ اس کشمکش میں بحث وجدل بہت بڑھ گیا۔ اس کا سبب ان اہل تحریف کا اہل باطل کے شبہات پر توجہ مرکوز کرنا اور اس مذموم علم کلام میں غور وفکر پیدا کرنا تھا؛ جسے سلف صالحین معیوب سمجھا کرتے تھے۔ اور اس میں غور وفکر کرنے اور اس علم کے حصول میں مشغول ہونے اور اس کی طرف متوجہ ہونے سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری میں روکتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ﴾ (انعام ۶۸)

''اور جب آپ ان کو دیکھیں جو ہماری آیات میں بحث کرتے ہیں تو ان سے کنارہ کرلیں، حتی کہ وہ اس کے علاوہ بات میں مشغول ہو جائیں''۔

یہ آیت کریمہ معنوی لحاظ سے ان تمام باتوں کو شامل ہے۔ تحریف وانحراف میں سے ہر ایک کے درجے ہیں؛ کبھی تو یہ کفر کے درجہ میں ہوتی ہے؛ اور کبھی فسق وفجور اور کبھی بہت بڑا گناہ اور خطا ہوتی ہے۔

گمراہی سے بچاؤ کی تدابیر:

مسلمانوں پر واجب ہوتا ہے کہ مرسلین علیہم السلام کی اتباع کریں۔ اور اس چیز کی اتباع کریں جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ہے۔ پھر ان مرسلین علیہم السلام کا سلسلہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے ختم کیا ہے؛ اور ان کو آخری نبی ورسول بنایا۔ اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کو تمام سابقہ آسمانی کتابوں پر نگہبان قرار دیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب ساتھ حکمت (یعنی سنت بھی) نازل فرمائی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو تمام جنات اور انسانوں کے لیے قیامت تک کے لیے عام اور باقی رہنے والی کر دیا ہے۔ اور بالآخر اس کے ساتھ بندوں پر اپنی حجت پوری کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن مجید میں ہر ہر چیز کو واضح فرما دیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے لیے دین کو خبر وامر [عقیدہ وعمل] کی تمام تر تفصیلات کے ساتھ مکمل کر دیا ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنی اطاعت؛ اور آپ کی نافرمانی کو اپنی نافرمانی قرار دیا ہے۔ اور اپنی ذات کی قسم کھا کر اعلان کر دیا ہے کہ وہ لوگ جو اپنے اختلافی امور آپ کو اپنا حکم تسلیم نہیں کرتے وہ کبھی بھی مؤمن نہیں ہو سکتے۔ اور یہ بھی خبر دی کہ منافقین اپنے اختلافی امور کے فیصلے آپ کے بجائے غیروں کے پاس لیکر جاتے ہیں۔ اور جب ان منافقین کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلایا جاتا ہے؛ جو کہ درحقیقت کتاب وسنت کی دعوت ہے؛ تو وہ بالکل روگردانی کرتے ہیں۔ اور منافقین خیال کرتے ہیں کہ وہی اچھا کام کر رہے ہیں؛ اس سارے طرز عمل کو احسان اور توفیق کا نام دیتے ہیں۔ جس طرح کہ اکثر متکلمین اور فلاسفہ اور دیگر لوگ کہتے ہیں: ''ہم تو اشیاء کے حقائق کے احساس یعنی ادراک اور معرفت کے لیے یہ کام کرتے ہیں''۔ یا تو ہم صرف عقلی دلائل جو کہ درحقیقت جہالت کے دلائل ہیں؛ اور اللہ اور اس کے

رسول ﷺ سے منقول دلائل کے مابین موافقت چاہتے ہیں۔

یا بالفاظ دیگر ہم تو صرف شریعت اسلامیہ اور عقلی فلسفہ کے درمیان موافقت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔جیسا کہ متکلمین اور فلاسفہ کی طرح اکثر بدعتی صوفیاء اور گنوار اہل طریقت بھی یہی کہتے ہیں: ہمارا ارادہ تو صرف اچھے طریقے سے اعمال کرنا ہے۔اور شریعت اور ان کے [عقلی فلسفہ کے] درمیان ؛ جس کا یہ دعوی کرتے ہیں ؛ بالکل باطل ہے ؛ اور جس چیز کو وہ حقائق کا نام دیتے ہیں ؛ درحقیقت وہ نری گمراہی اور ضلالت ہے۔جیسے گندی سیاست و امارت میں مصروف رہنے والے کہتے ہیں کہ: ہم تو اپنے اس عمل سے صرف سیاست حسنہ کی امید کرتے ہیں ؛ اور شرعی سیاست کے ساتھ اس کی مطابقت و موافقت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔اسی طرح دیگر بھی کئی عقائد ونظریات کے رنگ برنگ لوگ موجود ہیں۔

شریعت مطہرہ کی جامعیت:

ہر وہ شخص جو امور دین میں رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کو چھوڑ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتا ہے ؛ وہ اس کام کو اچھا خیال کرتا ہے۔ نیز اس کام کو شریعت اور غیر شریعت کے مابین موافقت کے دعویٰ سے پیش کرتا ہے ؛ تو اس کا اس گمراہی اور ضلالت میں حصہ بقدر خرابی مل کر رہتا ہے۔درحقیقت رسول اللہ ﷺ جس دین کو لائے ہیں ؛ وہی تمام امور و معاملات کے لیے کافی اور کامل ہے۔اور ہر طرح کا حق اسی میں موجود ہے۔ بے شک کوتاہی اور تقصیر ان لوگوں سے واقع ہوئی ہے جو اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پس اس قسم کے شخص کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے بہت سارے کلامیہ اور اعتقادیہ سے کچھ بھی شناسائی نہیں ہوتی۔اور نہ ہی بہت سارے امور عبادت ؛ اور نہ ہی بہت سارے سیاسی معاملات کا کوئی علم ہوتا ہے۔ یا یہ شخص اپنے غلط گمان اور تقلیدی ذہن کی بنا پر اسے شریعت محمدیہ کی طرف ایسی چیزوں کو منسوب کرتا ہے جو حقیقت میں اس میں داخل نہیں ؛ ان کی اس سرکشی اور دشمنی کا سبب ان کی جہالت اور نفاق ہے ؛ اور یہ نفاق بہت بڑھ گیا ہے۔اور بہت ساری ان چیزوں کو دین اسلام سے نکال رہا ہے جو کہ دین میں داخل ہیں۔

جبکہ بحث وجدل کی سب تفصیلات ؛ قوی غور وفکر کی تمام وسعتیں ؛ کامل ترین تدبر وتفکر اور اجتہاد موجود ہے جو نبی کریم ﷺ لیکر آئے ہیں۔پس ان کا عقیدہ رکھا جائے ؛ اور ظاہری اور باطنی طور پر اس پر عمل کیا جائے۔تو اسی صورت میں کتاب اللہ کی تلاوت کا حق ادا ہوسکتا ہے کہ اس میں سے کسی بھی چیز کو مہمل/مبہم نہ چھوڑا جائے۔

فہم دین کے مشکل مقامات اور مؤمن کا طرز عمل:

اگر بندہ [ایمانیات کے باب میں] بعض امور کی معرفت حاصل کرنے یا بعض احکامات پر عمل کرنے سے عاجز ہو تو جس چیز سے وہ خود عاجز آ گیا ہے ؛ دوسروں کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی معرفت سے مت روکے ؛ بلکہ اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی عاجزی کی وجہ سے اس سے ملامت کو ساقط کر دیا ہے۔لیکن اس کو اس پر خوش اور راضی رہنا چاہیے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو سمجھنے کے لیے کھڑا ہو گیا ہے۔اور اس کی چاہت ہونی چاہیے کہ کاش ! وہ خود یہ کام کر لیتا۔اور ایسا نہ کرے کہ شریعت کے ایک حصہ پر ایمان لائے اور دوسرے حصہ کا انکار کر دے۔ بلکہ پوری شریعت مطہرہ پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔اور دین اسلام میں ایسی چیز کو داخل کرنے سے

محفوظ رکھے جس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا؛ خواہ وہ رائے ہو یا روایت۔ یا پھر وہ اعتقاد اور عمل میں اس چیز کی پیروی کرے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس منہج کا حکم دیا ہے؛ فرمایا:

﴿وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾[البقرة ۴۲]

''اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ، جب کہ تم جانتے ہو''۔

سابقون الاولون کا بھی یہی طریقہ کار تھا۔ اور یہی طریقہ کار تابعین عظام رحمہ اللہ اور ان کے بعد ان کے پیروکاروں کا تھا۔ ان تابعین اولین میں سب سے پہلے سلف صالحین ہیں؛ اور پھر ان کے بعد آنے والے حضرات گرامی القدر ہیں۔ اور ان ہی معزز حضرات میں سے وہ ائمہ دین بھی ہیں جن کی امامت کے متعلق قرآن کریم کی زبانی اعتدال پسند امت کی شہادت موجود ہے [1]۔

حضرات ائمہ اور علم کلام کی مذمت:

حضرت امام قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ [۱۱۳-۱۸۲ھ] کا فرمان [2]:

''آپ نے بشر مریسی سے مناظرہ کے دوران فرمایا تھا [3]:

"اَلْعِلْمُ بِالْكَلَامِ جَهْلٌ؛ وَالْجَهْلُ بِالْكَلَامِ هُوَ الْعِلْمُ ؛ وَ إِذَا صَارَ الرَّجُلُ رَأْساً فِي عِلْمِ الْكَلَامِ قِيْلَ زِنْدِيقٌ ؛ أَوْ رُمِيَ بِالزَّنْدَقَةِ ".

''کلام کا علم جہالت ہے؛ اور علم الکلام سے جہالت ہی اصل علم ہے۔ اور جب انسان علم کلام میں نمایاں مقام حاصل کر لے تو اسے زندیق کہا جاتا ہے؛ یا اس کے زندیق ہونے کا فتوی دیا جاتا ہے''۔

امام موصوف رحمہ اللہ کے علم کلام کو جہالت کہنے سے مقصود یہ ہے کہ اس علم کی عدم صحت کا اعتقاد رکھا جائے؛ ورنہ ظاہر ہے کہ یہ علم بھی بہر حال بعض چیزوں کے اعتبار سے نفع بخش ہے۔ یا ان کا اس علم سے ناواقف رہنے کی تلقین کا مطلب یہ ہے کہ اس علم کی طرف التفات نہیں ہونا چاہیے؛ اور اس کو معتبر سمجھنے سے اعراض ہی کرنا چاہیے۔ بے شک ایسا کرنے سے انسان کا علم دینی اور عقل سلیم محفوظ ہو جاتے ہیں؛ تو اس اعتبار سے بلا ریب وشک اس سے جہالت علم ہی شمار ہوگی۔ واللہ اعلم۔

حضرت امام رحمہ اللہ کا ایک دوسرا قول بھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

[1] ۔ اعتدال پسند امت ہونے سے مراد بہترین امت ہونا ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان گرامی میں ہے: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ [البقرة ۱۴۳] ''اور ایسے ہی ہم نے تمہیں متوسط/معتدل امت بنایا ہے''۔

[2] [شیخ عبدالرزاق عفیفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: درء التعارض ۱/۱۴۰]

[3] ۔ بشر بن غیاث الدین المریسی؛ ابو عبدالرحمٰن؛ فقیہ معتزلی؛ اس پر زندیق ہونے کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔ اس نے علم فقہ کی تعلیم قاضی ابو یوسف سے حاصل کی تھی۔ یہی فرقہ مریسیہ کا سرغنہ بھی ہے۔ اللسان میں اس کے متعلق کہا گیا ہے: ''بدعتی اور گمراہ تھا؛ اس سے روایت کرنا مناسب نہیں؛ اور نہ ہی اس کی کوئی کرامت/عزت ہے''۔

''جس نے علم کلام پڑھا وہ زندیق بن گیا؛ اور جس نے کیمیا گری سے مال کمانا چاہا؛ وہ مفلسی ہی پائے گا؛ اور جس نے غریب الحدیث کی تلاش جاری رکھی؛ وہ کاذب ٹھہرا'' [1]۔

حضرت امام شافعی (۱۵۰ھ-۲۰۴ھ) رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے:

''اہل کلام کے متعلق میرا فیصلہ ہے کہ جوتوں اور ڈنڈوں سے ان کی چھترول کی جائے اور منہ سیاہ کر کے قبیلوں میں پھیرایا جائے اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کروایا جائے کہ جو شخص کتاب وسنت کو چھوڑ کر علم کلام کی طرف متوجہ ہو؛ اس کی یہی سزا ہونی چاہیے''۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرے موقعہ پر اس حوالے سے اشعار میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

کل العلوم سوی القرآن مشغلة إلا الحديث و الفقه فی الدين

العلم ما كان فيه قال حدثنا وما سوی ذالك وساوس الشياطين

''قرآن وحدیث اور تفقہ فی الدین کے ماسوا تمام علوم مشغلے ہیں۔ بس وہی چیز علم کہلانے کے لائق ہے جس میں حدثنا کے الفاظ سے بحث ہو؛ اس کے علاوہ باقی تمام علوم شیطانی وسوسے ہیں''۔

علم کلام کے متعلق ائمہ کرام رحمہم اللہ کا عمومی فتویٰ:

اہل فتوی حضرات نے ذکر کیا ہے کہ: ''اگر کوئی شخص اپنے شہر کے علماء کی بابت وصیت کرے تو متکلمین اس میں داخل نہیں ہوں گے (کیونکہ وہ علماء نہیں بلکہ جہلاء ہیں)۔ اسی طرح اگر کوئی انسان وصیت کرتا ہے کہ اس کی وہ کتابیں وقف ہیں جن میں علم موجود ہے؛ تو علماء کا [فتوی یہی ہے کہ ان کتابوں میں سے علم کلام کی کتابیں سرے سے وقف نہ ہوں گی] اور ان کا فتوی یہ ہے کہ علم کلام کی ان کتابوں کو پھر فروخت بھی کیا جاسکتا ہے؛ حالانکہ وقف شدہ چیز کا بیچنا حرام ہے''۔

فتاوی ظہیریہ ص ۴۴۶ میں تمام مکاتب فکر کے علماء کا اجماعی فتوی اس سلسلہ میں مذکور ہے۔

پس یہ کیسے تمنا کی جاسکتی ہے کہ علم عقائد تک تو رسائی ہو جائے؛ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو چھوڑ کر۔ کہنے والے نے کیا ہی اچھا کہا ہے:

" أيها المغتدی ليطلب علماً كل علم عبد لعلم الرسول

تطلب الفرع كی تصحح أصلاً كيف أغفلت علم أصل الأصول"۔

''اے شخص! جو بوقت صبح علم کی تلاش میں نکلنے والا ہے۔ (یہ جان لے کہ) تمام علوم؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے تابع (اور غلام) ہیں۔ تو فرعی علم حاصل کرتا ہے تاکہ تو اصل کی درستگی کر سکے؟ تعجب ہے کہ تو کیسے اصل الاصول علم سے غافل ہو بیٹھا ہے''۔

❶۔ حضرت امام اُحمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان: جب امام موصوف رحمۃ اللہ علیہ مسئلہ خلق قرآن کے سلسلہ میں قید و بند کی صعوبتیں اور طرح طرح کے مصائب جھیل رہے تھے؛ تو انہیں حکومت وقت کی طرف سے بار ہا یہ کہا گیا کہ آپ ان متکلمین سے بحث و مناظرہ کیوں نہیں کر لیتے؟ تو آپ کا جواب ہمیشہ یہی ہوا کرتا: ''مجھے پتہ نہیں یہ علم کیا ہے؛ میں اس کو نہیں جانتا۔ میرے پاس کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی دلیل لیکر آ ؤ''۔

امام گرامی القدر یہ اس لیے نہ کہتے تھے کہ وہ علم کلام اور علم جدل سے ناواقف تھے؛ بلکہ وہ یہ بات محض اس لیے کہتے کہ اگر وہ علم کلام کی روشنی میں اس مسئلہ شرعی پر بحث کر لیتے تو ماننا پڑتا کہ یہ علم کلام بھی صحیح علم ہے۔ جبکہ آپ اسے کسی طرح صحیح علم شمار نہ کرتے تھے۔

جناب ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علوم کے مبتدیات اور منتہیات اور جامع ترین علوم دیے گئے تھے'' ❶۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیوی اور اخروی سب قسم کے علوم کی تمام تر تفصیلات کے ساتھ بھیجے گئے تھے''۔[مجموع ۱۳/ ۱۵۸]

آپ کا دین ہر لحاظ سے کامل اور پورا ہے؛ لیکن پھر بھی جب کوئی بھی شخص بدعت ایجاد کرتا ہے؛ تو اس بدعت کا جواب دینے میں بہت وسعت سے کام لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ متأخرین کا کلام بہت لمبا ہوتا ہے؛ لیکن اس میں برکت بہت کم ہوتی ہے؛ بخلاف متقدمین کے کلام کے؛ ان کا کلام مختصر ہوتا ہے مگر بہت برکت والا ہوتا ہے۔ ایسا ہر گز نہیں جیسے گمراہ متکلمین اور ان کے جاہل لوگ کہتے ہیں: ''اسلاف کا طریقہ زیادہ سلامتی پر ہے؛ اور بے شک ہمارا طریقہ زیادہ محکم اور علم والا ہے۔ معاملہ ایسا بھی نہیں جیسے ان کی قدر سے نا آشنا اور فقہ کی طرف نسبت رکھنے والے کہتے ہیں کہ: ''سلف صالحین کا استنباط فقہ؛ احکام فقہ؛ اور اصول افقہ کے قواعد وغیرہ کی تدوین و ضبط کے لیے اس قدر فارغ نہ تھے جتنا کہ مابعد والے اس میں مشغول رہے۔ اس لیے وہ سلف سے زیادہ فقیہ ہیں۔

یہ تمام لوگ سلف صالحین کی علمی قدرتوں؛ علوم میں ان کی گہرائیوں؛ بے تکلفی اور دین میں ان کی کامل بصیرتوں کی معرفت سے قاصر [پردہ میں] ہیں۔ اللہ کی قسم! متأخرین کا امتیاز اس کے ماسوا کچھ نہیں کہ وہ ان فروعی چیزوں اور اطراف کے حصول میں بھرپور تکلف کے ساتھ مشغول رہے جن کی بابت ان کا مقصد محض اصولوں کی رعایت و پاسداری کرنا؛ قواعد وضوابط کی تدوین کرنا اور ان کی گرہیں مضبوط کرنا تھا۔ جبکہ متقدمین رحمہم اللہ ہر ہر شے میں مطالب عالیہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ المختصر متأخرین کا اپنا مقام ہے؛ اور متقدمین کا اپنا مقام۔ اللہ تعالیٰ نے جس قوم کو جس چیز سے نوازنا چاہا نواز دیا؛ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ وللہ الحمد و المنۃ۔

عقیدہ طحاویہ کا مقام اور ابن ابی العز رحمہ اللہ کی شرح:

[امام طحاوی رحمہ اللہ کے] اس عقیدہ کی کتاب کی شروحات متعدد علمائے کرام رحمہم اللہ نے لکھی ہیں؛ لیکن میں نے دیکھا کہ کچھ شارحین کا میلان مذموم اہل علم کلام کی طرف ہو گیا ہے؛ اور اپنی شروح میں ان اہل کلام سے مدد و اعانت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عبارات سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔

سلف صالحین رحمہم اللہ نے [ان کی وضع کردہ اصطلاحات]: جوہر؛ جسم؛ اور عرض وغیرہ کے استعمال کو بھی صرف اس وجہ سے مکروہ نہیں گردانا کہ صحیح معانی کے حوالے سے یہ نئی اصطلاحات وجود میں کیوں آئی ہیں؟ جیسے دیگر صحیح علوم کے سلسلہ میں الفاظ کی اصطلاحات ہیں۔ اور نہ ہی ان کے ہاں حق پر استدلال کرنا اور اہل باطل سے مجادلہ کرنا مکروہ تھا۔ بلکہ ان کے ان اصطلاحات کو مکروہ جاننے کی وجہ ان کا حق کے مخالف امورِ کاذبہ پر مشتمل ہونا ہے۔ انہی وجوہات میں سے کتاب وسنت کے احکامات کی مخالفت بھی ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ آپ متکلمین کے ہاں یقین و معرفت کی وہ مقدار کبھی نہ پائیں گے جو اہل سنت والجماعت کے عوام الناس میں پائی جاتی ہے۔ اہل سنت علماء کی بات ہی کچھ اور ہے۔

ان اصطلاحات کے مقدمات کے حق و باطل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے فکر و بحث وجدال کثرت سے وجود میں آ گیا؛ اور بحث و

❶۔[مسند أحمد ٦٦٠٣؛ البخاری ٢٩٧٧؛ مسلم ٥٢٣۔الصحیحة ١٤٨٣]

مباحثہ [قیل وقال] کا بازار گرم ہو گیا۔ پھر اسی بنا پر متکلمین کے ہاں ایسے ایسے خیالات نے جنم لیا جو نقل/شرع صحیح اور عقل صریح کے اتنے متضاد ہیں کہ یہاں ان کو مکمل طور پر کھول کر بیان کرنا ہی مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیل سے وضاحت ان شاء اللہ امام طحاوی

رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان کے تحت آئے گی: "فمن رام علم ما حضر عنه علمه ......"۔

میں نے چاہا کہ عقیدہ طحاوی کی شرح سلف صالحین کے طریقہ کار پر چلتے ہوئے ان کی عبارات کے ذریعے کروں؛ اورانہی کی خوشہ چینی کرتے ہوئے ان کے نہج پر چلوں؛ تاکہ میں بھی ان کے زمرہ میں شمار ہوسکوں اوران کی معیت میں ان لوگوں کے ساتھ اٹھایا جاؤں [جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے]:

﴿مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾

''ان کے ساتھ؛ جن پر اللہ نے انعام کیا، نبیوں اور صدیقوں اور شہداء اور صالحین میں سے اور یہ لوگ اچھے ساتھی ہیں''۔

اور جب میں نے محسوس کیا کہ قارئین اختصار کے طالب ہیں تو میں نے تفصیل اور تطویل کے بجائے اختصار کو ترجیح دی۔ اس کتاب کی کما حقہ شرح کی توفیق تو صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں۔ اور میرا بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہی ہے اوراسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ؛حسبنا الله و نعم الوكيل۔

توحید الٰہی میں اہل سنت والجماعت کا عقیدہ

۱۔ط:(نَقُولُ فِي تَوحِيدِ اللّٰهِ مُعْتَقِدِين بِتَوفِيقِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاحِدٌ لاَّ شَرِيكَ لَهُ) ❶۔

''اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اللہ کی توحید کے متعلق کہتے ہیں: بیشک اللہ تعالیٰ ایک ہیں ان کا کوئی شریک نہیں''۔

❶۔علامہ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:(نَقُولُ فِي تَوحِيدِ اللّٰهِ): جان لیجیے کہ توحید کا وہ پیغام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو دیکر مبعوث فرمایا ہے؛ اور اسے اپنی کتابوں میں نازل فرمایا ہے؛ کتاب وسنت کی نصوص اور مکلفین کے احوال کے مطابق کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تین اقسام ہیں:

پہلي قسم: توحید ربوبیت: اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے افعال میں اس کی توحید بجالانا؛ اور یہ ایمان رکھنا کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہی خالق ورازق ہیں؛ اور وہ ہی اپنی تمام تر مخلوق کے نظام کی تدبیر کرتے ہیں؛ اور ان کے دنیا وآخرت کے تمام تر امور میں صرف اسی کا تصرف ہے؛ اس کا ان امور میں کوئی شریک نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾[الرعد ۱۶] ''فرمادیں: اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے''۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ﴾[یونس ۳] ''بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے''۔ توحید کی اس قسم کا اقرار تو مشرکین کو بھی تھا جو بتوں کو پوجتے تھے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر بعث نشور کے منکر تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ اسلام میں داخل نہیں ہوسکے کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اس کا شریک ٹھہراتے تھے؛ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے بتوں اور مورتیوں کی پوجا بھی بجالاتے تھے اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

دوسري قسم: توحید عبادت: اسے توحید الوہیت کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہی عبادت ہے۔ مشرکین توحید کی اس قسم کے منکر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ قول ذکر کیا ہے؛ فرمایا:﴿وَعَجِبُوْا اَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ (4) اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾(ص 5) ''اور انھوں نے اس پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آیا اور کافروں نے کہا یہ ایک سخت جھوٹا جادوگر ہے۔ کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ بلاشبہ یہ یقیناً بہت عجیب بات ہے''۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ توحید کی یہ قسم عبادت میں اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص اور اس بات پر ایمان کو شامل ہے کہ عبادت کا مستحق صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اور اس کے سوا کسی کی بھی عبادت باطل ہے۔ اور یہی لا إلہ إلا اللہ کا معنی ہے۔ بے شک اس کلمہ کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾(الحج ۶۲) ''یہ اس لیے کہ بے شک اللہ ہی ہے جو حق ہے اور (اس لیے) کہ بے شک اس کے سوا وہ جسے بھی پکارتے ہیں وہی باطل ہے اور (اس لیے) کہ بے شک اللہ ہی بے حد بلند ہے، بہت بڑا ہے''۔

تیسري قسم: توحید اسماء وصفات: اس سے مراد اس بات پر ایمان رکھنا ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں سے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں وارد ہوا ہے؛ یا صحیح سنت میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے؛ اسے اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے ہی ثابت مانا جائے جیسے اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے۔ اس میں نہ ہی تحریف کی جائے نہ ہی تعطیل؛ نہ ہی اس کے لیے مثال بیان کی جائے اور نہ ہی کیفیت۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (1) اَللّٰهُ الصَّمَدُ (2) لَمْ يَلِدْ ۵ وَلَمْ يُوْلَدْ (3) وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (4)﴾[اخلاص] ''کہہ دے وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ ہی بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا۔ اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے''۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾[الاعراف ۱۸۰] '' اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، سو اسے ان کے ساتھ پکارو''۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾(النحل ۶۰) '' اور اللہ کے لیے سب سے اونچی مثال ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے''۔ ان معانی میں بہت ساری آیات موجود ہیں۔ مثل اعلی سے مراد اعلی اوصاف ہیں؛ جن میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اصحاب رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد تابعین رحمہم اللہ سے لیکر آج تک اہل سنت والجماعت کا یہی عقیدہ ہے؛ وہ آیات صفات اور احادیث کو ایسے ہی تسلیم کرتے ہیں جیسے وہ نصوص میں وارد ہوئی ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی لیے معانی کو ثابت کرتے ہیں؛ اور اس کی مثال پیش کرنے سے برأت کا اظہار کرتے ہیں؛ اور وہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی مشابہت سے اس طرح منزہ مانتے ہیں کہ اس میں تعطیل [انکار] نہیں پائی جاتی۔ اور ان کا عقیدہ کتاب وسنت کے دلائل کا جامع ہے۔ اور ان کے مخالفین پر ان کی حجت　[حاشیہ جاری ہے]

تَشْرِیح: جان لیجیے انبیاء علیہم السلام کی اولین دعوت اور اس راہ کی اولین منزل توحید ہے۔ اور یہی وہ پہلا مقام ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف چلنے والا قائم رہتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾[اعراف ۵۹]

''بلاشبہ یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں''۔

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے ارشاد فرمایا:

[بقیہ حاشیہ]: قائم ہوتی ہے۔ انہی کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾(۱۰۰) اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے پہلے لوگ اور وہ جو نیکی کے ساتھ ان کے پیچھے آئے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی؛ اور اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں یہ بہت بڑی کامیابی ہے''۔

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ سے شرک کی نفی اس وقت تک پوری طرح نہیں ہوسکتی جب تک شریک کی تین اقسام کی نفی نہ کر لی جائے۔

1۔ ربوبیت میں شرک: یعنی کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا خالق بھی ہے۔ جیسا کہ مجوسیوں کا عقیدہ ہے؛ جو کہتے ہیں: بیشک برائی ایک خالق ہے؛ جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا ہے۔ اس قسم کا شرک اس امت میں بہت کم ہے۔ الحمد للہ۔ اگرچہ معتزلہ کا عقیدہ اس کے قریب تر ہے؛ جو کہتے ہیں: بیشک برائی انسان کی اپنی تخلیق ہوتی ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:'' القدرية مجوس هذه الأمة ''۔''قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں''۔ الحديث صحيح/ صحيح الجامع الصغير وزيادته رقم[٤٤٤٢](٤٣١٨)۔

2۔ الوہیت میں شرک: (عبودیت میں شرک)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے علاوہ انبیاء و صالحین کی بھی بندگی کی جائے؛ جیسے ان سے مشکل کشائی چاہنا اور مصائب کے وقت ان کو پکارنا اور اس طرح کے دیگر امور۔ بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کا شرک اس امت میں بہت زیادہ ہے۔ اس گناہ کا بڑا بوجھ ان کے ان علماو مشائخ پر ہے جو وسیلہ کا نام دیکر ان شرکیہ امور کی تائید کرتے ہیں۔ اور شرک کا نام بدل کر وسیلہ رکھ لیتے ہیں۔

3۔ صفات میں شرک: یعنی بعض مخلوقات کے کچھ ایسے اوصاف بیان کرے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی خاص ہیں۔ جیسے علم غیب جاننے کا دعویٰ۔ اس قسم کا شرک صوفیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اور جو لوگ ان سے متأثر ہیں؛ ان میں بھی یہ مصیبت پائی جاتی ہے۔ مثلاً: ایک شاعر کہتا ہے:

فإن من جودك الدنيا وضرتها ومن علومك علم اللوح والقلم۔

''بے شک دنیا اور آخرت کی عنایات آپ کی سخاوت میں سے ہیں اور آپ علم لوح و قلم آپ کے علوم میں سے ہیں۔''

یہاں سے بعض دجال قسم کے لوگوں کی گمراہی کا دروازہ کھلتا ہے جو کہتے ہیں: ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جاگتے ہوئے دیکھا؛ اور ان سے اپنے فلاں مرید کے مخفی / باطنی امور کے متعلق دریافت کیا۔ حقیقت میں وہ ایسی باتیں کر کے یہ چاہتے ہیں کہ بعض امور میں ان کی سرپرستی / سربراہی قائم رہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیات تھے؛ تو آپ ایسے امور کو نہیں جانتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ﴾[الاعراف ۱۸۸]''اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو ضرور بھلائیوں میں سے بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی''۔ تو پھر اپنی وفات کے بعد اور اپنے رفیق اعلیٰ کی طرف منتقل ہو جانے کے بعد ایسے امور کو کیسے جان سکتے ہیں؟۔

شرک کی یہ تین اقسام ہیں؛ جس کسی نے اللہ تعالیٰ سے اس کی توحید ان کی نفی کی؛ اور اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات وصفات اور عبادات میں اکیلا مانا؛ تو ایسا ہی شخص وہ موحد ہے جس کو وہ تمام فضائل حاصل ہوتے ہیں جو موحدین کے ساتھ خاص ہیں۔ اور جس کسی نے کسی ایک قسم میں کوتاہی برتی تو اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان صادق آتا ہے: ﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾(الزمر 65)''بلاشبہ اگر تو نے شریک ٹھہرایا تو یقیناً تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا اور تو ضرور بالضرور خسارہ اٹھانے والوں سے ہو جائے گا''۔ اس چیز کو یاد کر لیں؛ کیونکہ عقیدہ میں یہ اہم ترین چیز ہے۔ مصنف نے یہاں سے اپنی کتاب کی ابتدا کی ہے۔ جو کوئی اس کی تفصیل جاننا چاہتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کتاب کی شرح: اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ؛ ابن قیم؛ ابن عبدالوہاب رحمہم اللہ اور ان جیسے دوسرے ان مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کرے جو اس نہج پر چلے ہیں۔

﴿اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾[اعراف ۶۵]

''اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں''۔

حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے ارشاد فرمایا:

﴿اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾[اعراف ۷۳]

''اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں''۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے ارشاد فرمایا:

﴿اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾[اعراف ۸۵]

''اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں''۔

نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾[نحل ۳۶]

''اور بیشک ہر امت میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور شیطان سے بچو''۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾[الانبیاء ۲۵]

''اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو''۔

اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتی کہ وہ لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دینے لگ جائیں؛ چاہے اس کے لیے مجھے قتال ہی کیوں نہ کرنا پڑے''❶۔

مکلّف پر پہلا اور آخری واجب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت:

بے شک درست بات یہی ہے کہ مکلّف پر سب سے پہلا واجب کلمہ لا إلہ إلا اللہ کی گواہی ہے۔ نہ کہ غور و فکر کرنا؛ یا غور و فکر کا ارادہ کرنا؛ اور نہ ہی شک کرنا۔ جیسا کہ مذموم علم کلام کے حاملین کا عقیدہ ہے''۔ (مدارج السالکین ۳/۴۴۳)

بلکہ تمام ائمہ سلف اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کو سب سے پہلے شہادتین [یعنی لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ] کے اقرار کا حکم دیا جائے۔ اور اس بات پر بھی ان کا اتفاق ہے کہ جس نے بلوغت سے قبل یہ اقرار کرلیا؛ بلوغت کے بعد اس کی تجدید کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اس کے بالغ ہوجانے پر یا تمیز کی عمر کو پہنچنے پر۔ جو اس مذہب کے قائل ہیں۔ اس کو نماز؛ روزہ اور دیگر امور ادا کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ علماء اہل سنت میں سے کوئی ایک بھی اس بات کا قائل نہیں کہ ایسے بچے کو تمیز (سمجھداری) یا بلوغت کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس کے اولیاء پر واجب ہے کہ وہ اس سے شہادتین کی تجدید کروائیں۔ اگرچہ شہادتین کا اقرار باجماع امت واجب ہے؛ اور اس کا وجوب نماز

❶۔(رواه البخاری و مسلم ؛ من حديث ابن عباس رضی اللہ عنہما وغيره من الأصحاب ؛وهو مخرج في الصحيحة ٤٠٧ ؛ البخاری ٢٥ ؛ مسلم ٢٢ ؛ و عن ابن عمر البخاری ١٣٩٩ ؛ و مسلم ٢١ ؛ و أبوهريرة البخاری ٣٩٢ : مسلم ٢١)

کے وجوب پر مقدم ہے۔ لیکن یہ بچہ چونکہ اس وجوب کو پہلے ہی ادا کر چکا ہے؛ [اس لیے اب اس کو دوبارہ ادا کرنا ضروری نہیں]۔

یہاں کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جن میں فقہاء کے درمیان مباحث موجود ہیں۔ مثلاً وہ شخص جو نماز تو پڑھتا ہے یا نماز کے علاوہ دیگر خصائص اسلام میں سے کسی پر عمل پیرا ہے؛ لیکن اس نے زبان سے شہادتین کا اقرار نہیں کیا؛ تو کیا ایسا شخص مسلمان ہوگا یا نہیں؟۔ صحیح رائے یہی ہے کہ خصائص اسلام میں سے کسی ایک پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں یہ انسان مسلمان قرار پاتا ہے۔ (کیونکہ ان امور کی ادائیگی میں توحید کا اقرار شامل اور موجود ہے)۔

پس توحید ہی وہ پہلی چیز ہے جس کے ذریعہ بندہ اسلام میں داخل ہوتا ہے؛ اور یہی وہ آخری چیز ہے جس کے ساتھ مؤمن اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''جس شخص کا آخری کلام لا إلہ إلا اللہ ہو؛ وہ جنت میں داخل ہوگا'' [1]۔

پس توحید ہی پہلا واجب ہے؛ تو حید ہی آخری واجب بھی ہے''۔ [مدارج السالکین ۳/ ٤٤٤]

توحید کی اقسام:

پس 'توحید' ہی سب سے پہلا اور آخری واجب ہے؛ سے مراد توحید الوہیت ہے؛ اس لیے کہ توحید تین چیزوں کو شامل ہوتی ہے:

۱۔ توحید [اسماء و] صفات:

۲۔ توحید ربوبیت: یہ بیان کہ اللہ تعالیٰ اکیلے ہی ہر چیز کے خالق ہیں۔

۳۔ توحید الوہیت: یہ استحقاق کہ صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی بندگی کی جائے۔

توحید اسماء وصفات:

منکرین صفات نے اللہ تعالیٰ کی صفات کے انکار کو توحید کے مسمیٰ میں داخل کر لیا ہے۔ جیسا کہ جہم بن صفوان [۱۲۸ھ] [2] اور اس کے پیروکاروں کا مؤقف ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ [اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے] صفات کا اثبات زیادہ خداؤں کے وجود کو لازم کرتا ہے۔ اس عقیدہ کی خرابی ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے۔ کیونکہ ایک ایسی ذات جو تمام صفات سے خالی ہو؛ خارج میں اس کے وجود کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ہاں بسا اوقات ذہن ایسی محال اور ناممکن چیزوں کو سوچ اور فرض کر لیتا ہے۔ یہی تو تعطیل (یعنی صفات الٰہی کے انکار) کی انتہاء ہے۔ اس عقیدہ کے سبب صوفیاء کا ایک طبقہ حلول اور وحدۃ الوجود کی طرف چلا گیا ہے۔ یہ عقیدہ تو عیسائیوں کے کفر سے بھی بدتر

[1] ۔[حدیث حسن أو صحیح ؛ رواه الحاكم وغیره ؛ وقد خرجته فی إرواء الغلیل برقم ٦٨٧ . أبو داؤد ٣١١٦ ؛ مسند أحمد ١/ ١٦١ ؛ مسلم ٦٢ ؛ صحیح ابن حبان ٣٠٠٤ .]

[2] ۔[ابومحرز جہم بن صفوان سمرقندی؛ بدعتی اور گمراہ انسان تھا۔۱۲۸ھ میں ہلاک ہوا]

ہے؛ بے شک نصاریٰ حلول کے عقیدہ کو حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ خاص سمجھتے ہیں؛ جبکہ ان لوگوں نے اسے تمام مخلوقات کے لیے عام کر دیا۔ اسی وحدۃ الوجود کی توحید کے نتائج سے یہ باتیں بھی حاصل ہوتی ہیں کہ:

۱۔ اس عقیدہ کی فرع یہ بھی ہے کہ فرعون اور اس کی قوم در حقیقت سارے ہی کامل الایمان مؤمن اور اللہ کی حقیقی معرفت رکھتے تھے۔

۲۔ بت پرست سب حق وصواب پر قائم ہیں؛ کیونکہ حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی ہی تو عبادت کر رہے ہیں غیر کی نہیں۔

۳۔ حلال وحرام ہونے میں ماں؛ بہن اور اجنبی عورت میں کوئی فرق نہیں۔ نہ ہی پانی اور شراب میں کوئی فرق ہے؛ اور نہ ہی زنا اور نکاح میں؛ بلکہ یہ سب تو ایک ہی چیز کا حصہ ہیں۔ بلکہ زیادہ مناسب ہے کہ یہ سب ایک ہی چیز ہیں۔

۴۔ اس عقیدہ کی فرع یہ بھی ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام نے [-نعوذ باللہ- عوام پر خواہ مخواہ حلال وحرام کر کے] تنگی پیدا کر دی:

﴿سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا﴾(الاسراء ۴۳)

''پاک ہے وہ اور بہت بلند ہے اس سے جو یہ کہتے ہیں، بہت زیادہ بلند ہونا''۔

توحید ربوبیت:

جیسے یہ اقرار کرنا کہ ہر چیز کے خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ اور یہ کہ کائنات بنانے والے دو ایسے خالق نہیں ہو سکتے جو صفات اور افعال میں برابر ہوں۔ یہ توحید ایسا حق ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ یہی توحید اکثر اہل کلام؛ صوفیاء اور فلاسفہ کے ہاں غایت سمجھی جاتی ہے۔ اس توحید کا بنی آدم میں سے کسی بھی معروف گروہ نے انکار نہیں کیا۔ بلکہ دلوں کو اس توحید کی معرفت پر ہی پیدا کیا گیا ہے۔ اور انسانی فطرت میں دیگر موجوداتی چیزوں کے مقابلہ میں اس کی معرفت سب سے زیادہ رکھی گئی ہے۔ جیسا کہ مرسلین علیہم السلام نے دعوت دی تھی؛ اور ان سے رب العالمین نے حکایت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾[ابراھیم ۱۰]

''ان کے رسولوں نے کہا کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے''۔

کائنات کے خالق (اللہ رب العالمین کے ہونے) کے حوالے سے تجاہل عارفانہ کے طور پر انکار کرتے ہوئے سب سے زیادہ معروف ہونے والا شخص فرعون ہے؛ در حقیقت باطن میں وہ بھی اس توحید کا اقرار کرتا تھا؛ جیسا کہ قرآن مجید نے فرعون کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خطاب نقل کیا ہے؛ فرمایا:

﴿قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ﴾[اسراء ۱۰۲]

''فرمایا: یقیناً تو جان چکا ہے کہ انھیں آسمانوں اور زمین کے رب کے سوا کسی نے نہیں اتارا، اس حال میں کہ واضح دلائل ہیں''۔

بذات خود اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾[نمل ۱۴]

''اور انھوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل ان کا اچھی طرح یقین کر چکے تھے''۔

یہی وجہ ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تجاہل عارفانہ کی بنا پر انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ﴿وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''اور رب العالمین کون ہے''؟۔تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (24) قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ (25) قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (26) قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (27) قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (28)﴾ [شعراء]

''فرمایا: جو آسمانوں اور زمین اور ان کی درمیانی چیزوں کا رب ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔اس نے گردونواح کے لوگوں سے کہا: کیا تم سنتے نہیں؟ فرمایا: جو تمھارا رب اور تمھارے پہلے باپ دادا کا رب ہے۔کہا یقیناً تمھارا یہ پیغمبر، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے،ضرور پاگل ہے۔فرمایا: جو مشرق ومغرب کا اور اس کے درمیان کی چیزوں کا رب ہے، اگر تم سمجھتے ہو''۔

صوفیاء کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ: فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی ماہیت سمجھنے کے بارے میں سوال کیا تھا''۔(فصوص الحکم ۲۰۷) جب اللہ تعالیٰ کی کوئی ماہیت نہیں تھی؛ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جواب دینے سے عاجز آ گئے''۔یہ غلط ہے۔

بے شک یہ سوال انکار اور نہ ماننے والا سوال تھا۔جیسا کہ اس بات کی شاہد قرآن کی دیگر تمام آیات بھی ہیں کہ فرعون ہمیشہ ہی سے اللہ تعالیٰ کا انکار کرتا تھا؛ وہ اس ذات کا منکر تھا۔اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتا تھا کہ اس کی ذات کی ماہیت کا متلاشی ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:''وہ تو معروف ہی ہے''۔اس کی ربوبیت کے دلائل و براہین بہت صاف واضح اور ظاہر اور مشہور ہیں کہ اس کے متعلق سوال ہی کیا جائے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ زیادہ معروف؛ واضح اور ظاہر ہیں کہ: پوچھا جائے ما هو؟۔یعنی اس کا تعارف کیا ہے؟؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت تو فطرت میں دیگر تمام اشیاء کی معرفت سے زیادہ قوت اور عظمت کے ساتھ موجود ہے''۔[درء تعارض ۸/ ۳۸]

توحید ربوبیت کا اقرار:

کائنات میں کوئی بھی ایسا معروف گروہ نہیں رہا جو کہتا ہو کہ کائنات کے بنانے والے ایک سے زیادہ خدا ہیں جو کہ صفات اور افعال میں برابر ہیں۔بے شک مجوسیوں کے فرقہ ثنویہ اور مانویہ دو بڑے اصلوں یعنی نور اور ظلمت کے قائل ہیں کہ کائنات کا وجود ان دو سے ظہور میں آیا ہے۔ان کا عقیدہ ہے کہ نور کا خدا قابل تعریف ہے اور ظلمت شریر اور مذموم ہے۔پھر ان دونوں فرقوں کا ظلمت میں بھی اختلاف ہے کہ کیا یہ ازل سے موجود ہے یا بعد میں اسے وجود ملا؟ المختصر یہ گروہ بھی ایک جیسی صفات کے حامل دو رب نہیں مانتے۔

رہے نصاریٰ جو کہ عقیدہ تثلیث کے قائل ہیں؛ وہ بھی کائنات کے لیے ایسے تین برابر ارباب کے قائل نہیں کہ ان میں سے ہر ایک مستقل اور علیحدہ وجود رکھتا ہو۔بلکہ وہ تمام اس بات پر متفق ہیں کہ رب کائنات ایک ہی ہے؛ البتہ ان کا خیال ہے کہ باپ [رب اللہ سبحانہ وتعالیٰ] بیٹا [حضرت عیسیٰ] اور روح القدس [جبرائیل امین] [کا مجموعہ] ایک الہ ہے۔ان کا عقیدہ تثلیث بذات خود متناقض اور متضاد ہے۔اور حلول سے متعلق ان کا عقیدہ اس سے بھی زیادہ فاسد ہے۔اسی لیے یہ لوگ خود بھی آج تک اپنے عقیدہ کی تفہیم اور تعبیر میں مضطرب ہیں۔ان میں ایک بندہ بھی ایسا نہیں ہے جو کسی معقول انداز میں اس عقیدہ کی وضاحت کر سکے۔ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان کے دو افراد بھی کسی ایک بات پر متفق ہو جائیں۔ان کا عقیدہ ہے کہ: رب کائنات ایک ہی ہے؛ البتہ اقانیم تین ہیں۔پھر بسا اوقات اقانیم کی تعریف/معنی خواص سے بیان کرتے ہیں؛ اور بسا اوقات اس سے مراد صفات لیتے ہیں؛ اور بسا اوقات اشخاص سے تعبیر کرتے ہیں۔

یقیناً اللہ تعالیٰ نے انسان کی احسن تقویم صورت میں تخلیق کے ساتھ ہی اس قسم کے فاسد عقائد کی نفرت ان کی فطرت میں رکھ دی ہے۔ المختصر عیسائی حضرات بھی ایک جیسی صفات کے حامل دو خالق تسلیم نہیں کرتے۔

یہاں پر مقصود یہ بتانا ہے کہ: کوئی بھی ایسا گروہ نہیں جو کائنات کے ایک جیسے دو متماثل خالق ہونے کو مانتا ہو۔ حالانکہ اکثر اہل کلام اور فلاسفہ اس ثابت شدہ مطلوب کے لیے بحثیں کر کر کے ہلکان ہوتے رہے؛ حتی کہ ان میں سے بہت سارے متکلمین آخر میں یہ اعتراف کر گئے کہ اس چیز کو عقل کے ذریعہ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جو صرف نقلی اور سمعی دلائل سے ثابت شدہ ہے۔

رب کائنات کے وجود پر دلیل تمانع:

اہل نظر کے ہاں اللہ تعالیٰ کی ذات کا اثبات دلیل تمانع کے نام سے مشہور ہے۔ یعنی کہ اگر عالم کے دو خالق ہوتے؛ تو ان کے مابین اختلاف کی صورت میں؛ مثلاً ایک کسی جسم کو حرکت دینا چاہتا؛ اور دوسرا اس کو سکون کا حکم دیتا؛ یا پھر ایک رب اس کو زندگی عطا کرنا چاہتا ہو؛ اور دوسرا اسے مارنا چاہتا ہو؛ تو اس وقت (عقلی طور پر) یا تو دونوں کا حکم نافذ ہو جاتا؛ یا ان دو میں سے کسی ایک کا حکم نافذ ہوتا؛ یا ان میں سے کسی کا بھی حکم نافذ نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کا حکم نافذ ہونا تو ناممکن ہے؛ کیونکہ اس سے اجتماع نقیضین/ضدین لازم آتا ہے (جو کہ باطل ہے)۔ اور تیسری صورت [کہ ان میں سے کسی کا بھی حکم نافذ نہ ہوتا]؛ بھی ممتنع ہے؛ اس صورت میں جسم کا حرکت اور سکون؛ اور زندگی اور موت دونوں سے خالی ہونا لازم آتا ہے؛ یہ بھی ممتنع ہے۔ نیز ان دونوں ارباب کا عاجز ہونا لازم آتا ہے۔ جبکہ عاجز الہ نہیں ہوسکتا۔ اور جب ان دونوں میں سے کسی ایک کا حکم نافذ ہو؛ اور دوسرے کا نہ ہو؛ تو جس کا حکم نافذ ہوتا وہی الہ قادر ہے؛ جبکہ دوسرا تو عاجز ہے؛ اس میں رب بننے کی صلاحیت نہیں۔

اس اصول کی بنیاد پر تفصیلی گفتگو اپنی جگہ پر موجود ہے۔

قرآن کریم کا موضوع توحید:

بہت سارے ارباب نظر اور متکلمین کا خیال ہے کہ دلیل تمانع اللہ تعالیٰ کے اس فرمان گرامی میں ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾[الانبیاء ۲۲]

''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے''۔

کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ توحید ربوبیت ہی اصل میں وہ توحید ہے جسے قرآن کریم نے ''توحید الوہیت'' کے نام سے پیش کیا ہے اور جس کی دعوت انبیاء کرام علیہم السلام پیش کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ بات ایسے نہیں۔ بلکہ جس توحید کی طرف انبیائے کرام علیہم السلام دعوت دیتے رہے اور جس کے اثبات میں آسمانی کتابیں نازل ہوئیں؛ وہ توحید الوہیت ہی ہے جو کہ توحید ربوبیت پر مشتمل ہے؛ اور وہ یہ ہے کہ حق عبادت اور حقِ بندگی صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کے لیے ہونا چاہیے۔ بے شک مشرکین عرب تو ''توحید ربوبیت'' کو مانتے تھے؛ اور یہ اقرار کرتے تھے کہ زمین و آسمان کا خالق ایک ہی ہے جیسا کہ ان کے حوالے اللہ تعالیٰ نے خود یہ خبر دی ہے؛ ارشاد فرمایا:

﴿وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ﴾[لقمان ۲۵]

''اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے''۔

اور اسی طرح ارشاد فرمایا:

﴿قُلۡ لِّمَنِ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِیۡہَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ * سَیَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰہِ قُلۡ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ﴾[المؤمنون۸۶]

''پوچھیں: یہ زمین اور اس میں جو کوئی بھی ہے کس کا ہے، اگر تم جانتے ہو؟ ضرور کہیں گے اللہ کا ہے۔ کہہ دے پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟''۔

قرآن مجید میں اس قسم کی آیات بے شمار ہیں۔

مشرکین مکہ بتوں کے بارے میں یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے کہ تخلیق کائنات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی بھی کوئی مشارکت ہے؛ بلکہ ان کا معاملہ اس سلسلہ میں دیگر مشرک امتوں جیسے ہندوستان؛ ترکی اور حبشہ وغیرہ کے مشرکین کی طرح ہی تھا؛ کہ ان لوگوں کا یہ حتمی اعتقاد تھا کہ ہماری مورتیاں انبیاء اور صالحین کی قوم کی ہیں؛ اور وہ ان کو اپنے حق میں سفارشی بناتے تھے؛ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کا وسیلہ پکڑتے تھے۔ پس یہی اہل عرب کا شرک تھا۔

اہل عرب کا شرک اور اس کی نوعیت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم سے حکایت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَقَالُوۡا لَا تَذَرُنَّ اٰلِہَتَکُمۡ وَ لَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّ لَا سُوَاعًا ۬ۙ وَّ لَا یَغُوۡثَ وَ یَعُوۡقَ وَ نَسۡرًا﴾[نوح۲۳]

''اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وڈ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو''۔

اسی طرح صحیح البخاری[۴۹۲۰]؛ عام کتب تفسیر اور قصص الانبیاء علیہم السلام میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ روایت ثابت ہے کہ اس آیت میں مذکور نام حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک بزرگوں کے اسماء گرامی ہیں۔ جب یہ نیک لوگ مر گئے تو لوگ ان کی قبروں کے مجاور بن کر بیٹھ گئے۔ اور ان کی مورتیاں بنا ڈالیں؛ پھر زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے آہستہ آہستہ عقیدت میں ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک ایک قبیلہ کا نام لیکر ذکر کیا ہے ❶۔

صحیح مسلم[مسلم۹۶۹] میں حضرت ابو ہیاج اسدی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت موجود ہے؛ وہ کہتے ہیں:

''مجھ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا میں تمہیں اس کام پر نہ بھیج دوں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا اور وہ کام یہ تھا کہ میں مختلف قبائل عرب میں جاؤں؛ اور کسی اونچی قبر کو برابر کئے بغیر اور کسی تصویر کو مٹائے بغیر نہ چھوڑوں'' ❶۔

❶۔[یہ حدیث موقوف ھے؛ مگر مرفوع کے حکم میں ھے۔] [صحیح / أخرجہ مسلم؛ و أحمد ۱/ ۹۶ ؛وغیرھما و لہ طریق ذکرتھا فی إرواء الغلیل (۷۵۹؛ ۱۵۳۰ ؛ و أحکام الجنائز ص ۲۰۷]۔

امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ نے اپنی اپنی صحاح میں حدیث نقل کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرض الموت میں ارشاد فرمایا تھا:

''یہود و نصاری پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا''۔

[صحیح / وھو من حدیث عائشۃ رضی اللہ عنہا؛ بخاری ۴۳۵ ؛ مسلم ۵۳۱]و من حدیث أبی ھریرۃ البخاری ۴۳۷ ؛ مسلم

٤٣٧ ؛ و له شواهد كثيرة ؛ وخرجتها فى تحذير الساجد ص ١٦-٢٠ ؛ و فى أحكام الجنائز ص ٢١٦۔

آپ اپنی امت کو ان کے افعال سے ڈرا رہے تھے کہ وہ ایسے نہ کریں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کی قبر ظاہر کر دی جاتی، مگر آپ کو ڈر تھا کہ کہیں آپ کی قبر مسجد نہ بنالی جائے''۔

صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ کی مرض وفات میں آپ کے سامنے ایک گرجے کا ذکر کیا، جو حبشہ کی سرزمین میں دیکھا تھا، اور اس کی خوبصورتی اور انہوں نے جو جو تصویریں اس میں دیکھیں تھیں، آپ سے بیان کیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان میں کوئی ایک بندہ یا [یہ فرمایا کہ] کوئی نیک مرد مر جاتا ہے، تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے ہیں اور اس میں ان کی صورتوں کو بنا دیتے ہیں، قیامت کے روز یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوں گے''۔

[صحيح / من حديث عائشة رضی اللہ عنہا؛ [مسلم ٣٢٥]و خرجته فى المصدر المذكور س ٢١٨۔

صحیح مسلم میں ہے؛ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے پانچ دن پہلے ارشاد فرمایا:

''تم سے پہلے لوگ اپنے پیغمبروں اور نیک لوگوں کی قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے۔ خبردار تم قبروں کو مساجد ہرگز نہ بنانا؛ میں تمہیں ایسی چیزوں سے شدت سے منع کرتا ہوں''۔

[مسلم]صحيح / ورواه ابو عوانة فى صحيحه أيضاً ؛ وغيره؛ و هو مخرج أيضاً ص ٢١٧۔

شرک کے اسباب میں سے ایک سبب ستاروں کی عبادت؛ اور ان کی حسب طبیعت بت بنا کر پوجنا بھی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا شرک بھی' جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے؛ اسی قبیل سے تھا۔ اسی طرح فرشتوں اور جنات کے ساتھ اندھی عقیدت اور ان کے بت تراشنا بھی شرک کے اسباب میں سے ہے۔ لیکن یہ تمام قسم کے مشرکین اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ خالق کائنات صرف ایک اللہ ہے؛ دو یا دو سے زیادہ نہیں؛ البتہ وہ ان بتوں؛ ستاروں اور جنات اور ملائکہ وغیرہ کو محض اپنا سفارشی سمجھتے تھے: جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود خبر دی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾[الزمر ٣]

''اور وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا اور حمایتی بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا''۔

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ (یونس ۱۸)

''اور وہ اللہ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ انھیں نفع دیتی ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کیا تم اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں''۔

یہی حال ان گزری ہوئی امتوں کا بھی تھا؛ جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے؛ جنہوں نے رسولوں کی دعوت کا انکار کیا تھا؛ [ان

کے شرک کا معاملہ بھی اسی قسم کا تھا]۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کے واقعہ میں ان نو افراد کی ٹولی کا ذکر کیا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسمیں کھاتے ہوئے کہا تھا:

﴿ تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ﴾[نمل ۵۱]

''اوراللہ کی قسمیں اٹھائیں کہ ہم حضرت صالح علیہ السلام اوران کے اہلخانہ پرشب خون ماریں گے''۔

ان مفسدین مشرکین نے اپنے نبی اوران کے اہل خانہ کے قتل کے ارادہ پراللہ تعالیٰ کا نام ہی لیکر قسمیں کھائی تھیں۔معلوم ہوا کہ وہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے؛البتہ اس ایمان کی نوعیت مشرکین مکہ کے ایمان جیسی تھی۔

توحیدالوہیت کا بیان

مندرجہ بالا بحث سے واضح ہوا کہ شریعت مطہرہ میں حقیقی مطلوب توحیدالوہیت ہے جوکہ توحیدربوبیت کوبھی شامل ہے۔اللہ تعالیٰ کاارشادگرامی ہے:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰) مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳۱) مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۲) وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ (۳۳) لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۪ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳۴) اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ (۳۵) وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ (۳۶)﴾[الروم]

''پس تو ایک طرف کا ہوکراپنا چہرہ دین کے لیے سیدھا رکھ،اللہ کی اس فطرت کے مطابق ،جس پراس نے سب لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی پیدائش کوکسی طرح بدلنا(جائز)نہیں،یہی سیدھا دین ہےاورلیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے اوراس سے ڈرواورنماز قائم کرواورشرک کرنے والوں سے نہ ہوجاؤ۔ان لوگوں سے جنھوں نے اپنے دین کوٹکڑے ٹکڑے کردیااورکئی گروہ ہوگئے،ہرگروہ اسی پرجوان کے پاس ہے،خوش ہیں۔اور جب لوگوں کوکوئی تکلیف پہنچتی ہے وہ اپنے رب کواس کی طرف رجوع کرتے ہوئے پکارتے ہیں،پھر جب وہ انھیں اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھاتا ہےتواچانک ان میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک ٹھہرانے لگتے ہیں۔تاکہ جوکچھ ہم نے انھیں دیا ہےاس کی ناشکری کریں،سوفائدہ اٹھالوکہ جلد ہی جان لوگے۔یا ہم نے ان پرکوئی دلیل نازل کی ہے کہ وہ بول کروہ چیزیں بتاتی ہے جنھیں وہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا کرتے تھے۔اور جب ہم لوگوں کوکوئی رحمت چکھاتے ہیں وہ اس سے خوش ہوجاتے ہیں اوراگرانھیں کوئی برائی پہنچتی ہے،اس کی وجہ سے جوان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تواچانک وہ ناامید ہوجاتے ہیں''۔

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ﴾[ابراھیم ۱۰]

''کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ہر بچہ اسلامی فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی، یا مجوسی بنا لیتے ہیں''۔

[البخاری ۱۳۵۸؛ مسلم ۲۶۵۸؛ و ھو مخرج فی إلاروا الغلیل ۱۲۲۰]

اس حدیث کا معنی بالکل یہ نہیں کہ بچہ پیدائشی اعتبار سے بالکل سادہ پیدا ہوتا ہے نہ وہ توحید جانتا ہے نہ شرک؛ جیسے بعض لوگوں کا خیال ہے۔اس کی وجہ مذکورہ حدیث میں ہی موجود ہے۔اور اسی طرح حدیث قدسی میں آپ ﷺ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''میں نے تو اپنے بندوں کو دین حنیف پر ہی پیدا کیا تھا؛ بعد ازاں انہیں شیطان نے بہکا پھسلا دیا''۔

(رواہ مسلم ۲۸۶۵؛ و أحمد من حدیث عیاض بن حمار)

اسی طرح غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ حدیث کے الفاظ: ''فَأَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہِ وَیُنَصِّرَانِہِ وَ یُمَجِّسَانِہِ''۔''تو اس کے والدین اسے یہودی اور عیسائی اور مجوسی بنا دیتے ہیں''۔

اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا: ''یُسَلِّمَانِہِ'' یا اس کو مسلمان بناتے ہیں''۔(کیونکہ دین اسلام فطرت میں موجود ہے)۔اس حدیث کے بعض طرق میں ''یولد علی الملة ''''ملت پر پیدا ہوتا ہے''اور''یولد علی ھذہ الملة ''''اس ملت پر پیدا ہوتا ہے'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

دین فطرت پر عقلی دلائل:

مذکور احادیث میں جس چیز کی خبر رسول اللہ ﷺ دے رہے ہیں؛ یہ وہی چیز ہے جس کے صدق پر مختلف زاویوں سے عقلی دلائل وارد ہوتے ہیں (ان میں چند دلائل یہ ہیں):

[شیخ عبدالرزاق عفیفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن قیم کی کتاب'' شفاء العلیل؛ باب۳۰؛ انہوں نے اس مقام پر فطرت کی تفسیر میں علمائے کرام رحمہم اللہ کے اقوال نقل کئے ہیں۔]

۱۔ بلا شک وشبہ ہر انسان کو زندگی میں مختلف قسم کے ایسے اعتقادات اور تصورات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے جو کہ بسا اوقات حق ہوتے ہیں اور بسا اوقات باطل؛ کیونکہ انسان طبعی طور پر حساس اور متحرک بالارادہ ہے۔اسے پھر ان دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دیکر اپنانا لازم ہوتا ہے۔اور ترجیح کے لیے اس کے دلائل کا ہونا ضروری ہے۔نیز ہم جانتے ہیں کہ جب بھی کسی انسان کو ایسی بات پیش کی جائے کہ وہ سچ بول کر فائدہ اٹھائے یا پھر جھوٹ بول کر نقصان اٹھائے؛ تو انسان فطرت کے عین مطابق اسی طرف مائل ہوگا کہ وہ سچ بول کر فائدہ اٹھائے۔پس ایسی صورت میں خالق کے وجود کا اعتراف یعنی اس پر ایمان لانا حق ہے یا حق نہیں۔دوسری بات تو چونکہ قطعاً غلط اور ناممکن ہے؛ پس پہلی بات ہی ثابت ٹھہری۔چنانچہ یہ بات طے ہوگئی کہ فطرت میں ایسی صلاحیت موجود ہے؛ جو کہ معرفت خالق اور ایمان باللہ کا تقاضا کرتی ہے۔مزید برآں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ خالق پر ایمان اور فطرت میں اس کی

معرفت بندے کے لیے نفع مند ہے یا نقصان دہ؟۔ دوسری بات تو حتمی طور پر فاسد ہے؛ چنانچہ عقلی طور پر یہ طے پا گیا کہ انسان کی فطرت میں ایسی چیز کی محبت کا از بس ہونا ضروری ہے جو اسے فائدہ پہنچائے۔

۲۔ ہر انسان حسی طور پر منفعت کے حصول اور مضر چیزوں سے بچاؤ اختیار کرنے کی فطرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن بسا اوقات ہر ایک کی فطرت اس چیز کے لیے مستقل کافی نہیں ہوتی؛ بلکہ اسے فطرت کے معاون سبب کی ضرورت ہوتی ہے؛ پس جب شرط موجود ہو؛ اور کسی قسم کا کوئی مانع بھی نہ ہو تو فطرت میں جس چیز کا تقاضا موجود ہے؛ وہ لازماً ہو کر ہی رہے گی۔

۳۔ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ ہر انسان اپنے اندر تحصیل علم اور ارادہ حق کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر نفس میں ایسی طاقت موجود نہ ہو جو تحصیل علم اور ارادہ حق کو قبول کرے؛ تو صرف تعلیم؛ یا شوق اور رغبت دلانا کبھی بھی علم و ارادہ کو واجب نہیں کرتے۔ [غور فرمائیں] اگر معاملہ یوں نہ ہوتا تو پتھروں اور جانوروں کو اگر علم دیا جائے یا انہیں تحصیل علم کے لیے ابھارا جائے تو وہ کبھی بھی علم کو قبول نہیں کریں گے۔ پس واضح ہوا کہ فطرت میں اقرار خالق کا حصول؛ ایک ایسی ممکن بات ہے جو خارج میں کسی جدا سبب کی محتاج نہیں۔ انسان کی ذات کا وجود ہی اس کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ جب انسان کے اندر تقاضا کے عناصر موجود ہوں؛ اور کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو تو خارجی عوارض سے محفوظ ایسا کرتا ہے۔ بالاختصار یہ معلوم ہوگیا کہ اگر فطرت سلیمہ میں خرابی پیدا کرنے والی چیزیں موجود نہ ہوں تو فطرت بذات خود خالق کائنات کا اقرار کرتی ہے؛ اور اس کی اطاعت کرتی ہے۔

۴۔ جب کہیں خارجی طور پر فطرت کو خراب کرنے والی کوئی چیز ہو نہ اصلاح کرنے والی کوئی چیز؛ تو ایسی فطرت از خود نشو ونما اور پھلنے پھولنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کیونکہ علم و ارادہ کا مقتضی موجود ہے؛ اور موانع موجود نہیں ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق کہا جاتا ہے؛ کہ اہل کلام کے ایک گروہ نے توحید ربوبیت کے اثبات کے مسئلہ میں آپ سے بحث و مباحثہ کرنا چاہا۔ تو امام موصوف رحمہ اللہ نے فرمایا: ''اس مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے آپ لوگ ذرا مجھے اس کشتی کے بارے میں بتائیں جو کہ دریائے دجلہ میں چلتی جاتی ہے۔ کھانے اور سامان سے وہ خود بخود بھر جاتی ہے؛ اور پھر از خود واپس آجاتی ہے؛ از خود لنگر انداز ہوتی اور خود ہی سامان اتارتی ہے؛ اور بذات خود واپس لوٹ جاتی ہے۔ اور یہ تمام امور بغیر کسی تدبیر کے انجام پاتے ہیں تو وہ تمام متکلمین پکار اٹھے کہ یہ سارے معاملات محال بلکہ ناممکن ہیں۔ تو امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: '' جب آپ لوگوں کی نظر میں یہ سارے کشتی کے معاملہ میں ہی ناممکن ہیں؛ تو آپ خود بتائیے کہ اس ساری کائنات کا یہ اتار چڑھاؤ بغیر کسی مدبر کے کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟۔

یہ واقعہ امام موصوف رحمہ اللہ کے علاوہ دیگر کئی ائمہ کرام رحمہم اللہ سے بھی نقل کیا گیا ہے۔

توحید الوہیت؛ ایمان اور نجات کا دار و مدار:

اگر کوئی شخص توحید ربوبیت کا اقرار تو کرتا ہے؛ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتا؛ اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ دیگر معبودوں سے برأت کا اظہار بھی نہیں کرتا؛ تو وہ بھی اسی قسم کے مشرکین کی جنس کا ہی ایک مشرک ہے (ان کے درمیان کوئی فرق نہیں)۔

اگرچہ توحید ربوبیت کے مضمون کے دلائل کو؛ اور اس کے لیے مثالیں بیان کرنے کو؛ قرآن کریم میں کثرت کے ساتھ بار بار دھرایا گیا ہے؛ اور اس کی وضاحتوں سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں واضح فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی خالق

نہیں۔ یہ اقرار اس بات کو مستلزم ہے کہ عبادت بھی صرف اسی کی ہو۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے توحید ربوبیت کو توحید الوہیت کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ مشرکین مکہ چونکہ توحید ربوبیت کو مانتے تھے؛ اور ان کا اختلاف صرف توحید الوہیت کے مسئلہ میں تھا؛ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے سامنے بیان کیا کہ جب تو یقین رکھتے ہو کہ اللہ وحدہ لاشریک کے علاوہ کائنات کا کوئی خالق نہیں؛ اور وہی ہے جو بندوں کو نفع پہنچاتا ہے اور نقصان سے بچاتا ہے؛ اور اس سلسلہ میں اس کا کوئی شریک بھی نہیں تو پھر تم صرف اسی کی عبادت کیوں نہیں کرتے اس کا شریک کیوں بناتے ہو؟۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ءٰ آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ(59) اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ(٦٠)﴾۔[النمل]

"فرما دیجیے:" سب تعریف اللہ کے لیے ہے اور سلام ہے اس کے ان بندوں پر جنھیں اس نے چن لیا۔ کیا اللہ بہتر ہے، یا وہ جنھیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں؟ (کیا وہ شریک بہتر ہیں) یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ رونق والے باغات اگائے، تمھارے بس میں نہ تھا کہ ان کے درخت اگاتے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں جو راستے سے ہٹ رہے ہیں"۔............آگے آیت نمبر ٦٦ تک)۔

سورہ نمل کی مذکوہ آیات میں سے ہر ایک آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ بار بار سوال کرتے: ﴿ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ﴾: کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ یعنی ذرا یہ تو بتاؤ کہ کوئی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے جس نے یہ امور انجام دیے ہوں؟۔ یاد رہے کہ یہاں پر سوالِ استفہام انکار کے انداز میں ہے جو کہ ان امور میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی بھی شراکت کی نفی ثابت کرنے کو شامل ہے۔ مشرکین مکہ چونکہ خود اس بات کے اقراری تھے کہ یہ امور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور نے سرانجام نہیں دے؛ تو اسی بنیاد پر ان سوالات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف حجت قائم کی ہے۔ واضح رہے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ عام استفہام ہے؛ اور اللہ تعالیٰ پوچھ رہے ہیں کہ بتاؤ ﴿ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ﴾: کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ سیاق کلام کو اچھی طرح غور کرنے سے اس من گھڑت مفہوم کا احتمال تک نہیں نکلتا۔ ویسے بھی مشرکین تو باقاعدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دیگر خداؤں کے قائل تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَ إِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى قُلْ لَّآ اَشْهَدُ﴾[الانعام ۱۹]

"کیا بیشک تم گواہی دیتے ہو کہ بیشک اللہ کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں؟ فرما دیں: میں یہ گواہی نہیں دیتا"۔

قرآن مجید کے مطابق انہیں رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر اعتراض ہی یہی تھا کہ:

﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ﴾(ص 5)

" کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ بلا شبہ یہ یقیناً بہت عجیب بات ہے"۔

مشرکین کبھی بھی اس بات کے دعویدار نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے؛ جس نے زمین کو قرار بخشا ہے؛ اور اس میں نہریں جاری کیں؛ اور پہاڑ بنائے؛ اور اللہ تعالیٰ کے ہمراہ مل کر دریاؤں کے درمیان اوٹ کھڑی کی۔ بلکہ وہ تو سب اس بات کے مکمل اقراری تھے کہ تمام امور محض ایک رب کی کاریگری ہیں۔ اور قرآنی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾[البقرة ۲۱]

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تا کہ تم بچ جاؤ''۔

اللہ تعالیٰ کا ایک اور فرمان گرامی ملاحظہ فرمائیں:

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ﴾[الانعام ۴۶]

''فرمادیں: کیا تم نے دیکھا اگر اللہ تمھاری سماعت اور تمھاری نگاہوں کو لے لے اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمھیں یہ چیزیں لا دے؟''۔

قرآن مجید میں اس قسم کے مضمون کی آیات بہت زیادہ ہیں۔

معلوم ہوا کہ جب توحید ربوبیت اس توحید الوہیت میں داخل ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے پیغمبر علیہ السلام تشریف لائے؛ اور جس کے اثبات کے لیے آسمانوں سے کتابیں نازل ہوئیں؛ تو پھر یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ اس توحید کے دلائل بھی اتنی ہی کثرت کے ساتھ قرآن مجید میں موجود ہیں کہ جتنی کثرت سے رب کائنات کے اثبات (یعنی توحید ربوبیت) کی براہین اور صداقتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل موجود ہیں۔ کیونکہ جس علم کی طرف لوگوں کا احتیاج جتنا زیادہ ہوتا ہے اسی قدر اس علم کے دلائل بھی مخلوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کمال رحمت کی وجہ سے ظاہر اور واضح ہوتے ہیں۔

اثباتِ توحید اور عقلی دلائل:

قرآن کریم نے توحید کے مضمون کو ہر قسم کی مثالیں دے دیکر لوگوں کے لیے واضح کر دیا ہے؛ یہی انداز ہی وہ عقلی پیمانہ ہے جو مطالب دینی کو ثابت کرنے کے لیے مفید ہوا کرتا ہے۔ لیکن قرآن مجید اس سلسلہ میں حکم اور دلائل کے حوالے سے حق کو بیان کرنا ہی اپنا موضوع بناتا ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ قرآن کریم کے بیان کردہ حق کے بعد گمراہی کی کچھ بھی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟۔

قرآن کریم کے طریقہ احتجاج کے حوالے سے واضح رہے کہ وہ ان ضروری اور بدیہی مقدمات ہی کی بنیاد پر استدلال کرتا ہے جن کے مسلمہ ہونے پر لوگوں کا اتفاق ہو۔ قرآن کریم کا یہ انداز کہیں نہیں کہ وہ انہی مقدمات کو ثابت کرنے کے لیے دلائل بیان کرے۔

کسی چیز کے اثبات کے لیے فصیح طریقہ یہ ہے کہ بیان میں جہاں حذف کی ضرورت ہو؛ وہاں حذف کیا جائے۔ قرآن مجید بھی چونکہ فصاحت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے؛ اس لیے اُس کا طریقہ بھی یہی ہے۔ اُن جاہلوں کے دعوی کے برخلاف جن کے خیال میں قرآن مجید میں یہ طریقہ براہنیہ کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ خصوصاً جہاں اشتباہ یا نزاع کے پیدا ہونے کا امکان ہو؛ وہاں تو قرآن لازماً وضاحت سے ہی کلام کرتا ہے۔

ذات باری تعالیٰ کے ساتھ شراکت داری کی عقلی نفی:

یہ تو بات طے شدہ ہے کہ تمام فرقوں اور مذاہب میں شرک فی الربوبیت ممتنع ہے۔ اس کائنات میں کوئی بھی دو مماثل صفات و

افعال والے رب نہیں مانتا؛ اس کے باوجود بعض مشرکین کا خیال ہے کہ یہاں اور بھی خالق ہیں جنھوں نے کائنات کی بعض اشیاء کو پیدا کیا ہے؛ جیسا کہ ثنو یہ یہی بات ظلمت اور نور کے حوالے سے کہتے ہیں۔ اسی طرح حیوانات کے افعال کے حوالے سے قدر یہ فرقہ کا یہی کہنا ہے (کہ انسان اپنے افعال کا خالق خود ہے)۔ یونہی نیچری فلاسفہ افلاک (ستاروں؛ سورج اور چاند وغیرہ) یا اجسام طبعی کی حرکات اور انسان کے جسمانی نظام کے بارے میں اس قسم کے شرک کا شکار ہیں۔ المختصر یہ سب لوگ ایسے من گھڑت امور کو ثابت کر رہے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ثابت نہیں کیا۔ چنانچہ یہ تمام لوگ ربوبیت کی بعض جنسوں میں شرک کرتے ہیں۔ مزید برآں عرب اور دیگر علاقوں کے مشرکین بھی اپنے خداؤں کے بارے میں اسی قسم کا شرکیہ عقیدہ رکھتے تھے کہ نفع ونقصان ان کی طرف سے ہوتا ہے؛ اللہ تعالیٰ ان کی تخلیق نہیں کرتے۔

پس جب ربوبیت میں اس قسم کا شرک لوگوں میں موجود تھا تو قرآن مجید نے اس کے بطلان کو بیان کرتے ہوئے اپنا موضوعِ کلام بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد عالی ملاحظہ فرمائیں:

﴿مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ [المؤمنون ۹۱]

''اللہ نے نہ کوئی اولاد بنائی اور نہ کبھی اس کے ساتھ کوئی معبود تھا، اگر ایسا ہوتا ضرور ہر معبود، اپنی تخلیق کو لیکر چل دیتا اور یقیناً ان میں سے بعض بعض پر چڑھائی کر دیتا۔ پاک ہے اللہ اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں''۔

اس انتہائی واضح اور کھلم کھلا دلیل میں غور وفکر کیجیے؛ (توحید ربوبیت کے اثبات پر) کس قدر مختصر اور جامع انداز میں یہ مقدمہ پیش کیا گیا ہے کہ معبود برحق کے لیے خالق اور فاعل کی صفات کے ساتھ موصوف ہونا ضروری ہے؛ جو بندوں کو نفع دے سکے؛ اور نقصان سے بچا سکے۔ پس اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ اس کی بادشاہت میں کوئی دوسرا معبود شریک ہوتا تو اس کو بھی خلق اور فعل کا تصرف حاصل ہوتا؛ اس صورت میں وہ اس شرکت کو کبھی پسند نہ کرتا؛ بلکہ اگر اسے اپنے شریک پر غلبہ حاصل ہونے کی امید ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اپنی بادشاہت اور معبودیت میں تفرد حاصل کرنے کا امکان ہوتا تو وہ ضرور یہ کام کرتا۔ اگر اس پر قادر نہ ہوتا تو کم از کم یہ ضرور کرتا کہ اپنی مخلوق کو لیکر ایک طرف علیحدہ ہو جاتا؛ جیسا کہ ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے اپنی مملکت الگ کر لیتا ہے۔ جبکہ وہ دوسرے بادشاہ پر برتری اور غلبہ کی قدرت نہیں رکھتا۔ پس اس کے نتیجہ میں تین میں سے ایک کام کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ ہر خدا اپنی مخلوق اور بادشاہت کو لیکر الگ ہو جائے۔

۲۔ یا ایک خدا دوسرے خدا پر غلبہ اور برتری حاصل کر لے۔

۳۔ یا تمام لوگ صرف ایک بادشاہ کے ماتحت ہوں۔ وہ جس طرح چاہے ان میں تصرف کرے؛ لوگوں کو اس میں تصرف کا کوئی حق نہ ہو۔ بلکہ وہ اکیلا معبود ہو؛ اور اسکے ماسوا سب اس کے غلام ہوں اور ہر لحاظ سے اس کی ربوبیت میں ہوں۔

اب ان مقدمات کی روشنی میں دیکھ لیجیے کہ اس تمام کائنات کے امور کا اس قدر محکم اور منظّم ہونا اس بات کی سب سے زیادہ واضح دلیل ہے کہ اس عالم کا مدبر ایک ہی خالق ہے؛ وہی اکیلا بادشاہ ہے؛ اکیلا رب ہے؛ اس کے ماسوا مخلوق کا نہ کوئی رب ہے اور نہ ہی کوئی معبود۔ جیسا کہ دلیل تمانع بھی دلالت کرتی ہے کہ کائنات کا خالق ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی رب نہیں اور اس کے بغیر کوئی

معبود نہیں ہوسکتا۔ پس یہ تمانع فعل وتخلیق اور عبادت والوہیت ہر ایک ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح اس کائنات کے لیے دو ہم پلہ خالق اور ارباب کا ہونا محال ہے؛ اسی طرح اس کے لیے دو معبودوں اور الٰہ کا ہونا محال ہے''۔(الصواعق ۴۶۳)

پس کائنات کا دو ایک جیسے خالقوں سے وجود میں آنے کا علم سرے سے ممنوع (ممتنع بالذات) ہے؛ اور یہ بات فطرت میں استقرار پکڑے ہوئے ہے؛ اور صریح عقل سے بھی اس کا بطلان معلوم ہوتا ہے؛ پس اسی طرح دو خداؤں کی الوہیت بھی باطل ہے۔ پس مذکورہ آیت کریمہ توحید ربوبیت کے ساتھ موافق رکھتی ہے جو فطرت میں پہلے سے قائم اور ثابت شدہ تھی؛ اور توحید الوہیت پر دلالت اور اس کا اثبات کرتی ہے؛ اور اس کو التزامی طور پر لازم کرتی ہے۔

اس معنی کے قریب یہ دوسری آیت بھی ہے؛ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾[الانبیاء ۲۲]

''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے''۔

گمراہ فرقوں میں سے بعض (یعنی صوفیاء) کا کہنا ہے کہ تمانع کی دلیل وہ سابقہ مذکورہ آیت ہے جس میں ہے: ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾؛ اگر کائنات میں دو معبود ہوتے تو اس میں خرابی پیدا ہو جاتی ......الخ۔ لیکن یہ کہتے ہوئے وہ آیت کے مضمون سے غفلت کر گئے ہیں کیونکہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ارباب کا تو سرے سے تذکرہ ہی نہیں فرما رہے؛ بلکہ اس میں الٰہ کا بیان ہے۔ دوسرا یہ کہ اس آیت میں جس فساد کے ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے؛ وہ زمین وآسمان کے وجود کے بعد ہے۔ گویا آیت کریمہ فی الحقیقت یوں ہوئی: ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ[وهما موجودتان] اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾؛ ''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے [اور وہ حقیقت میں موجود بھی ہوتے] تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے''۔ یعنی یہاں پر زمین وآسمان کی تخلیق موضوع بحث ہی نہیں۔ بلکہ یہاں پر موضوع بحث تو ان کے قائم ودائم ہونے کی وجہ بیان کرنا ہے (اس کی مزید وضاحت آرہی ہے)۔

اور پھر غور کریں تو واضح ہوگا کہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ''لفسدتا'' کا لفظ بولا ہے؛ اور یہ فساد جیسا کہ بیان ہو چکا کہ ان کا وجود ہوگا تو ہونا ممکن ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر یہ نہیں فرمایا: ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ[وهما موجودتان] اِلَّا اللّٰهُ لم يوجدا﴾؛ ''اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے'' [اور وہ حقیقت میں موجود بھی ہوتے] تو ان دونوں کا وجود ہی نہ ہوتا''۔ اس آیت کریمہ کا موضوع اس بات کے امکان کی نفی ہے کہ زمین وآسمان میں متعدد الٰہ اور باطل معبود موجود ہوں؛ بلکہ زمین وآسمان میں معبود برحق صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن نہیں کہ یہ الٰہ برحق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ماسوا کوئی دوسرا ہو۔ کیونکہ آیت مذکورہ میں یہ متعین کیا گیا ہے کہ زمین وآسمان میں فساد اور خرابی اسی صورت میں ہو کر رہے گی جب ان میں ایک سے زیادہ معبود ہوں؛ یا معبود تو ایک ہی ہو مگر وہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا ہو۔ اور یہ بھی طے کر دیا ہے کہ زمین وآسمان کی سلامتی محض اس صورت میں قائم ہے کہ ان میں الوہیت صرف ایک اللہ تعالیٰ معبود وحدہ لاشریک کی ہو؛ کسی دوسرے کی نہیں۔ اگر کائنات کے جو معبود اور الٰہ ہوتے تو اس کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ کائنات کا نظام عدل واعتدال کے ساتھ قائم ہے۔ اور اسی عدل اور توازن پر زمین وآسمان کی سلامتی کی بقاء ہے۔ اور یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ سب سے اعلیٰ عدل توحید ہے؛ اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔

توحید الوہیت کی جامعیت:

اہل سنت والجماعت کے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ توحید الوہیت توحید ربوبیت کو مستلزم ہے؛ جبکہ توحید ربوبیت توحید الوہیت کو متضمن نہیں۔ پس جو ذات پیدا کرنے پر قادر نہیں؛ وہ عاجز ہے؛ اور عاجز معبود نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّ هُمْ يُخْلَقُوْنَ﴾[الاعراف ۱۹۱]

''کیا وہ انھیں شریک بناتے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں''۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں:

﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾[النحل ۱۷]

''تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے، اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ پھر کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾[الزمر ۳]

''ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا﴾[اسراء ۴۲]

''فرما دیں: اگر اس کے ساتھ کچھ اور معبود ہوتے، جیسے وہ کہتے ہیں تو تب وہ عرش والے کی طرف کوئی راستہ ضرور ڈھونڈتے''۔

اس آخری آیت کی تفسیر میں مفسرین کے دو اقوال زیادہ مشہور ہیں:

اول: اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ اور بھی معبود ہوتے تو وہ اسے مغلوب کرنے کی کوئی راہ نکالتے۔ (یہ غلط ہے)۔

دوم: حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور دیگر سلف صالحین سے منقول ہے؛ اور تفسیر طبری میں بھی مذکور ہے؛ کسی دوسرے نے یہ ذکر نہیں کیا۔ فرماتے ہیں: ''تو وہ اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کی راہ نکالتے''۔ جیسا کہ فرمایا ہے: ''إلى ذي العرش سبيلا'' اس کا یہ معنی قرآن کریم کی دوسری آیات سے بھی ثابت ہے۔ مثلاً: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾[دھر ۲۹]

''یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف (جانے والا) راستہ اختیار کر لے''۔

یہ وہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے گزشتہ آیت میں بیان فرمائی ہے۔ یعنی آیت کریمہ اپنے مفہوم کے مطابق یوں ہوگی:

﴿لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ﴾

''اگر اس کے ساتھ کچھ اور معبود ہوتے، جیسا کہ یہ کہتے ہیں''۔

یہ تفسیر صحیح ہے۔ یہ تفسیر اس لیے بھی صحیح تر ہے کہ مشرکین نہیں کہتے تھے کہ کائنات کے دو خالق ہیں۔ بلکہ انہوں نے اس رب کائنات کے ساتھ دوسرے معبودوں بنا رکھے تھے کہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا سفارشی بنا کر پیش کر سکیں۔ اور اس کا اظہار بھی کرتے

تھے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿ مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى ﴾[الزمر ۳]

''ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں، اچھی طرح قریب کرنا''۔ برخلاف پہلی آیت کے۔

[اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عمومی بیان]:

جس توحید کی طرف انبیاء و مرسلین علیہم السلام نے دعوت دی؛ اور جس کے اثبات کے لیے کتابیں نازل کی گئیں؛ اس کی دو اقسام مشہور و معروف ہیں:

۱۔توحید اثبات و معرفت

۲۔توحید طلب و ارادہ۔

[توحید اثبات و معرفت]:

توحید کی اس پہلی قسم کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی حقیقت اور اس کی صفات اور اسماء اور افعال کو ثابت کرنا؛ اور اس بات کا اقرار کرنا کہ ان تمام چیزوں میں کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا شریک اور ہم مثل نہیں۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہمیں خبر دی ہے۔ قرآن مجید نے توحید کی اس قسم کو مکمل طور پر کھول کر بیان کر دیا ہے۔ جیسا کہ سورہ حدید؛ اور سورہ طہ کی ابتدائی آیات؛ سورہ حشر کی آخری آیات؛ اور سورہ حم سجدہ اور سورہ آل عمران کی ابتدائی آیات؛ اور مکمل سورہ اخلاص وغیرہ اسی توحید کے بیان پر مشتمل ہے۔

[توحید طلب و ارادہ]:

توحید کی اس دوسری قسم کا مطلب یہ ہے کہ حکم و عبادت؛ اوامر و نواہی؛ طلب و اقتضاء کا حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ مکمل سورہ کافرون؛ سورہ آل عمران کی معروف آیت کریمہ:

﴿قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ﴾[آل عمران ۶۴]

''کہہ دے اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے درمیان اور تمھارے درمیان برابر ہے''۔

سورہ زمر کا پہلا اور آخری حصہ؛ سورہ یونس کا شروع اور درمیان اور آخر؛ سورہ اعراف کا اول و آخر؛ اور مکمل سورہ انعام وغیرہ جیسی آیات اور سورتیں اسی توحید کے موضوع پر مشتمل ہیں۔

قرآن کریم کی اکثر سورتوں میں مذکورہ بالا توحید کی دونوں اقسام کا ذکر ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر سورت اور آیت کا موضوع

ہی توحید کا بیان ہے۔ مثلاً غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم چار اقسام توحید سے باہر نہیں:

۱۔ یا تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے حوالے سے خبر ہوگی؛ تو یہ توحید علمی خبری ہے۔

۲۔ یا تو صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت اور اس کا مطالبہ ہوگا؛ اور یہ کہ اس سے کے علاوہ ہر معبود سے کنارہ کشی کر لینی چاہیے؛ تو یہ توحید طلبی ارادی ہے۔

۳۔ یا پھر قرآن مجید میں توحید کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی؛ اور صرف اس کی عبادت کے لازم ہونے کا ذکر ہوگا؛ تو یہ توحید کے حقوق اور اس کو مکمل کرنے والے امور کا بیان ہوگا۔

۴۔ یا اپنے اہل توحید کے لیے انعام واکرام کا ذکر ہوگا؛ اور یہ بیان ہوگیا کہ ان کے ساتھ دنیا میں کیا ہوا؟ اور آخرت میں کیا کچھ اکرام ہوگا؟۔ جو کہ اس کی توحید کا بدلہ ہے۔ یا اہل شرک کی خبر ہوگی کہ ان کے ساتھ دنیا میں عبرت وسزا کیا معاملہ ہوا؟ اور آخرت میں ان پر اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے کیا کچھ مسلط کر دیا جائے گا؟ اور یہ سب کچھ توحید سے خروج کی جزاء کا بیان ہے۔

الغرض قرآن کریم سارے کا سارا توحید؛ حقوق توحید؛ توحید کی جزاء؛ شرک اور اہل شرک کے احوال اور ان کی سزا وغیرہ کے بیان پر مشتمل ہے۔ مثلاً: غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے'' یہ توحید ہے۔ ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ''بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے'' یہ توحید ہے۔ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ بدلے کے دن کا مالک ہے۔ یہ توحید ہے۔ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ توحید ہے۔ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ یہ توحید ہے۔ کیونکہ اس میں اہل توحید کے راستہ کی طرف ہدایت کا سوال کیا گیا ہے۔ اور ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۶) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ (۷)﴾ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام کیا، جن پر نہ غصہ کیا اور نہ وہ گمراہ ہیں''۔ یہ توحید ہے۔ کیونکہ اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو توحید کی راہ پر گامزن رہے؛ اور ان لوگوں سے بچنے کی دعا ہے جنہوں نے توحید سے دوری اختیار کی۔

[توحید پر اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی گواہی:]

اللہ تعالیٰ نے بذات خود اپنی توحید کی گواہی دی ہے۔ اور اس کے تمام برگزیدہ انبیاء ومرسلین اور ملائکہ علیہم السلام اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ [وہی ایک معبود برحق ہے؛ کوئی اور معبود برحق نہیں]۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ [آل عمران ۱۸]

''اللہ نے گواہی دی کہ بے شک اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے؛ بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے''۔

یہ آیت کریمہ حقیقت توحید کے اثبات اور تمام گمراہ فرقوں کے رد کو شامل ہے۔ پس یہ آیت جلیل القدر اور عظیم الشان؛ مبنی برعدل؛

اور سچی ترین گواہی کوشامل ہے؛ جس کا گواہ بھی انتہائی جلیل القدر اور مشہود بہ بھی انتہائی جلیل القدر ہے۔

سلف صالحین کی عبارات میں لفظ ''شہد'' سے حکم وقضاء؛ اعلام واخبار اور بیان سبھی معانی مراد لیے گئے ہیں۔ یہ سارے اقوال ہی برحق ہیں۔ اوران میں کوئی اختلاف نہیں۔ اس لیے کہ شہادت میں شاہد کے کلام اس کی خبر اوراسے کسی دوسرے کو بیان کرنے اور معلوم کروانے کوشامل ہے۔

''شہادت'' کے چار مراتب ہیں:

پہلا مرتبہ: علم ومعرفت؛ مشہود بہ کی صحت کا اعتقاد اوراس کا ثبوت۔

دوسرا مرتبہ: شہادت کا اقرار وتکلم: اگرچہ انسان کسی اور کو خبر نہ بھی دے رہا ہو؛ بلکہ وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہو؛ یا اپنے دل میں ہی ذکر کردے یا زبان سے یہ الفاظ ادا کردے۔ یا قلم سے اسے لکھ دے۔

تیسرا مرتبہ: بیان: یعنی وہ جس چیز کی گواہی دے رہا ہے؛ اسے آگے بیان کرے اور دوسروں کو وضاحت کیساتھ بتائے۔

چوتھا مرتبہ: شہادت کا التزام: وہ اس شہادت کے مضمون کو لازم سمجھے؛ اوراس کا حکم بھی دے۔

پس اپنی ذات کے لیے عدل وانصاف کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی شہادت بھی ان چاروں مراتب پر مشتمل ہوتی ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس مشہود بہ کا علم رکھتے ہیں؛ اور پھر اس کے ساتھ کلام کرتے ہیں؛ اوراپنی مخلوق کواس کی خبر اور علم دیتے ہیں اور بالآخر ان پر اس بات کو تسلیم کرنے کو لازم قرار دیتے ہیں۔

[پہلا مرتبہ: شہادت علم ووجود]:

شہادت کا لفظ بدیہی طور پر علم کو شامل ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کہنا پڑے گا کہ: شاہد اس چیز کی شہادت دیتا ہے جس کا اس کو علم ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴾[زخرف ۸۶]

''مگر جس نے حق کے ساتھ شہادت دی اور وہ جانتے ہیں''۔

اسی طرح جب نبی کریم ﷺ نے سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''[جتنا اس سورج کا وجود یقینی ہے] ''اس طرح کے علم ویقین کے ساتھ گواہی دو''۔

مستدرك حاكم ٤ / ٩٨ ؛ الكامل لابن عدى ٣٢١٢۔

[دوسرا مرتبہ: شہادت تکلم وخبر:]

جبکہ خبر اور تکلم کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَجَعَلُوا الْمَلَآئِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ ﴾[زخرف ۱۹]

''حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوش خبری دی جائے جس کی اس نے رحمان کے لیے مثال بیان کی ہے تو اس کا منہ

سارا دن سیاہ رہتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل کو تکلم اور خبر کے قائم مقام قرار دیتے ہوئے اسے شہادت کہا ہے؛ جبکہ انہوں نے ان الفاظِ شہادت کو نہ زبان سے ادا کیا تھا؛ اور نہ الفاظ میں ان کا اظہار کیا تھا۔

[تیسرا مرتبہ: شہادت اعلام واخبار]:

اس مرتبہ کی دو اقسام ہیں:

۱۔ قولی شہادت　　۲۔ فعلی شہادت

جب بھی کوئی آدمی کسی دوسرے کو کسی معاملہ کی خبر دینا چاہتا ہو تو بسا اوقات وہ اسے اپنی زبان سے خبر دیتا ہے؛ یا اپنے فعل کے ذریعہ اسے آگاہ کرتا ہے۔ پس جو شخص اپنے گھر کو مسجد بنا دے؛ اور گھر کا دروازہ کھلا رکھے؛ اور راستے الگ کر دے؛ اور لوگوں کو اس گھر میں داخل ہونے اور اس میں نماز پڑھنے کی کھلی اجازت ہو؛ تو یقیناً وہ اپنی زبان سے لوگوں کو کچھ نہیں کہتا؛ لیکن اپنے فعل سے یہ خبر دیتا ہے کہ اس کا یہ گھر وقف ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی دوسرے کا قرب حاصل کرنے کے لیے مختلف قسم کی خوشیوں کا اظہار کرتا ہے تو گویا کہ وہ اسے اور دوسرے لوگوں کو یہ خبر دے رہا ہوتا ہے کہ وہ اس شخص سے محبت کرتا ہے؛ اگرچہ وہ زبان سے [اس مقصد کے لیے] ایک لفظ تک نہیں بولتا۔ نفرت کے اظہار کے سلسلہ میں بھی یہی معاملہ ہے۔ اسی طرح کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی گواہی اور اس کے بیان اور خبر دینے کا بھی ہے؛ کہ وہ خبر بسا اوقات قولی ہوتی ہے؛ اور بسا اوقات فعلی۔ اللہ تعالیٰ کی قولی شہادت تو رسولوں کو مبعوث کرنے؛ اور کتابیں نازل کرنے کے ساتھ ہے؛ جبکہ فعلی شہادت کے بیان اور اعلام کی صورت بالکل ویسے ہی ہے جیسے ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اپنی عجیب تدبیر اور اپنے محکم امور کے ساتھ مخلوق کے ہاں اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود برحق نہیں۔ شاعر کہتا ہے:

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ　　تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدُ

''ہر ایک چیز میں ایک نشانی ہے، جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بے شک اللہ ایک ہے۔''

قرآن کریم کی وہ آیات جو فعلی شہادت پر دلالت کرتی ہیں؛ ان میں سے ایک یہ بھی ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ﴾ [التوبۃ ۱۷]

''مشرکین کا کبھی حق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں حالانکہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دینے والے ہیں''۔

یہ ان کی اپنے نفوس پر گواہی ہے؛ جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں اپنی ذات پر دلالت کرنے والی جو نشانیاں رکھی ہیں؛ وہ ان کے ساتھ بھی شہادت دیتے ہیں؛ اور یہ شہادت (قول کے بجائے) خلق اور فعل کے ساتھ ہے۔

چوتھا مرتبہ: شہادت امر وقضاء:

بے شک عام طور پر صرف شہادت حکم اور الزام کو لازم نہیں کرتی؛ لیکن اس آیت میں شہادت حکم و الزام پر بھی مشتمل ہے اور اس پر دلالت بھی کرتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں جس چیز کی شہادت دی ہے؛ وہ ایسی شہادت ہے جو اس کے حکم پر مشتمل ہے؛ اور [اس چیز کا] امر [حکم] اور فیصلہ دیا گیا ہے۔ نیز بندوں پر اس چیز کو تسلیم کرنے کو لازم قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ﴾ [اسراء ۲۳]

''اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَتَّخِذُوْۤا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ﴾ [النحل ۵۱]

''اور تم دو معبود مت بناؤ''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [البينة ۵]

''اور انھیں یہی حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ [التوبة ۳۱]

''اور انھیں یہی حکم دیا گیا کہ وہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ [اسراء ۲۲]

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ بناؤ''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ [القصص ۸۸]

''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو''۔

سارا قرآن ہی اس بات پر شاہد ہے کہ لفظ شہادت یہاں امر اور حکم دونوں کو شامل ہے۔

یہاں پر لفظ شہادت کے امر اور حکم دونوں کو شامل ہونے کی عقلی وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب ''لا إلہ إلا اللہ'' کی گواہی دے دی؛ اور اس کے بارے میں خبر؛ علم، حکم قضاء اور بیان سے معلوم کرا دیا کہ اس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں؛ اور اس کے علاوہ جتنے بھی معبود ہیں؛ وہ سبھی باطل ہیں۔ چنانچہ جس طرح اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا؛ اسی طرح کوئی دوسرا عبادت کا مستحق بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ اس حکم کو مستلزم ہے کہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کو ہی معبود برحق مانا جائے؛ اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کو معبود بنانے کی ممانعت ہے۔ مخاطب اس قسم کی نفی و اثبات سے اس حکم کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ جیسے جب آپ کسی آدمی کو دیکھتے ہیں جو

کسی نااہل مفتی سے فتوی طلب کرتا ہے یا کسی سے گواہی دینے مطالبہ کرتا ہے؛ یا اس کا علاج کرواتا ہے؛ جبکہ وہ اس کا اہل نہ ہو؛ اور وہ آدمی اس کام کے اہل [صحیح مفتی یا طبیب] کو چھوڑ دے؛ تو آپ اسے کہتے ہیں کہ: بھائی! یہ شخص مفتی نہیں؛ یہ شخص طبیب نہیں؛ یہ شخص شاہد نہیں۔ مفتی فلاں آدمی ہے؛ طبیب فلاں شخص ہے؛ اور شاہد فلاں شخص ہے۔ تو بے شک یہ اس کی طرف سے امر ونہی ہے۔ پس مذکورہ مثال ہی سے سمجھ لیجیے کہ آیت جلیلہ دلالت کر رہی ہے کہ مستحق عبادت صرف اللہ وحدہ لاشریک ہیں۔ چنانچہ یہ خبر بندوں کے اس کے حکم اور التزام کو متضمن ہے کہ ان پر جو اللہ تعالیٰ کا استحقاق ہے؛ اس کو ادا کریں؛ اور ان پر عمل کرنا بندوں پر خاص اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

مزید برآں لفظ ''حکم'' اور ''قضاء'' جملہ خبریہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے جملہ خبریہ کو قضیہ یا حکم بھی کہتے ہیں۔ پس اس آیت جلیلہ میں ایک حکم دیا گیا ہے؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَآ اِنَّهُمۡ مِّنۡ اِفۡكِهِمۡ لَيَقُوۡلُوۡنَ (151) وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ (152) اَصۡطَفَى الۡبَنَاتِ عَلَى الۡبَنِيۡنَ (153) مَا لَكُمۡ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ (154)﴾ [الصافات]

''سن لو! بے شک وہ یقیناً اپنے جھوٹ ہی سے کہتے ہیں۔ کہ اللہ نے اولاد جنی اور بے شک وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ کیا اس نے بیٹیوں کو بیٹوں پر ترجیح دی؟ تمھیں کیا ہو گیا، تم کیسا فیصلہ کر رہے ہو؟''۔

پس یہاں پر صرف خبر دینے کو حکم قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ كَالۡمُجۡرِمِيۡنَ (35) مَا لَكُمۡ كَيۡفَ تَحۡكُمُوۡنَ (36)﴾ [القلم]

''تو کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہو گیا، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟''۔

لیکن یہاں پر [ان دونوں آیات کے آخر میں ﴿ تَحۡكُمُوۡنَ ﴾ کا جو لفظ ہے]؛ اس حکم میں کسی چیز کو لازم نہیں کیا گیا۔ اور یہ حکم کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں؛ یہ اس الزام کو متضمن ہے''۔ [مدارج السالکین ۳/ ٤٤١]

س لیے اس میں کوئی چیز لازم نہیں کی گئی۔ اور اگر یہاں مقصود صرف شہادت ہی ہوتی تو اس سے وہ کوئی علم حاصل نہ کر پاتے۔ وہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ اور نہ ہی ان پر کوئی حجت قائم ہو سکتی۔ بلکہ یہ آیت بندوں کے لیے مشہود بہ کے بیان؛ اس کی تعریف اور اس کی دلالت پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ اگر بندوں میں سے کسی کے پاس کوئی شہادت ہو اور وہ اس کو بیان نہ کریں؛ بلکہ چھپا دے؛ تو اس شہادت سے کسی کو نہ کوئی نفع حاصل ہو گا اور نہ ہی کسی پر کوئی حجت قائم ہو گی۔

شہادت حق اور انسانی صلاحیت:

جب یہ واضح ہو گیا کہ شہادت سے انتفاع صرف بیان کی صورت میں ممکن ہے؛ تو پھر [معلوم ہونا چاہیے کہ] اللہ عزوجل نے اسے تین طرح سے انتہائی درجہ بیان کر دیا ہے: سمع؛ بصر اور عقل۔

سمع: پس انسان پڑھی جانے والی آیات مبینات کی تلاوت سنتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ اپنی کمال والی تمام صفات سے ہمیں متعارف کروایا ہے؛ جیسے اس کی وحدانیت وغیرہ؛ یہ انتہائی تفصیلی بیان ہے۔ ایسا نہیں جیسا کہ جہمیہ اور ان کے ہمنوا معتزلہ اور منکرین صفات نے فضول احتمالات کی قبیل سے گمان کیا ہے۔ جس سے انسان جہاں حیرانی و پریشانی کا شکار ہوتا ہے؛ وہاں یہ انداز اللہ تعالیٰ کی

کتاب مبین اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی صفت بیان سے متصادم ہوتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے کتاب وسنت کو ''بیان'' سے موصوف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿حٰمٓ (1) وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (2)﴾[زخرف]

''حٰمٓ۔ اس کتاب کی قسم جو کھول کر بیان کرنے والی ہے!''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ(۱)﴾[یوسف]

''الٓرٰ۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ(۱)﴾[الحجر]

''الٓرٰ۔ یہ کامل کتاب اور واضح قرآن کی آیات ہیں''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾[آل عمران ۱۳۸]

''یہ لوگوں کے لیے ایک وضاحت ہے اور بچنے والوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت ہے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾[المائدۃ ۹۲]

''تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمے تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ(۴۴)﴾[النحل]

''اور ہم نے آپ پر نصیحت اتاری، تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے اور تاکہ وہ غور وفکر کریں''۔

اسی طرح سنت نبویہ ﷺ نے بھی ہر اس چیز کا بیان اور اقرار اور پختہ کر دیا جس پر قرآن کریم دلالت کرتا تھا۔

اصول دین کے سلسلہ میں رب سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں کسی شخص کی رائے اور کسی آدمی کے ذوق اور کشف و وجدان کا محتاج نہیں کیا۔ اسی لیے جب ہم مخالفین کتاب وسنت کو دیکھتے ہیں تو انہیں ہمیشہ اختلاف کا شکار اور مضطرب پاتے ہیں؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾[المائدہ]

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین پسند کر لیا''۔

پس اب تکمیل دین کے سلسلہ میں کتاب وسنت سے ماوراء کسی خارجی چیز کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔

اس معنی کی طرف امام طحاوی رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: ''ہم اپنی جانب سے دخل اندازی کو جائز نہیں سمجھتے۔ نہ تو اپنی

آراء کے ساتھ کسی تاویل کا ارتکاب کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی خواہشات کے مطابق کسی وہم میں مبتلا ہوتے ہیں بیشک اللہ کے دین میں وہی شخص سلامتی کے ساتھ ہم کنار ہے جو اللہ اور اس کے رسول کی تشریحات کے سامنے سر تسلیم خم کرلے''۔

بصر: جب کہ دیکھی جانے والی تخلیقی نشانیاں اور ان میں غور وفکر اور ان سے استدلال اسی چیز پر دلالت کرتی ہے جس پر آیات قولیہ سمعیہ دلالت کرتی ہیں۔[یعنی مشاہداتی تخلیق سمعی آیات پر دلالت کرتی ہیں]۔

عقل: عقل آیات قولی سمعی اور آیات مشاہداتی بصری کو آپس میں جمع کرتی ہے۔ پس عقل رسولوں کی لائی ہوئی شریعت کی صحت کو مزید پختہ یقین سے ثابت کرتی ہے۔ اور بالآخر سمعی؛ بصری؛ عقلی اور فطری دلائل سبھی مشھود بہ کی صحت پر متفق ہو جاتے ہیں۔

پس اللہ تعالیٰ نے بندوں سے عذر کے خاتمہ اور ان پر حجت قائم کرنے کی غرض سے اپنے کمال عدل و رحمت اور کمال احسان و حکمت اور محبت کے پیش نظر جو بھی نبی مبعوث فرمایا؛ اس کے ساتھ وہ دلائل بھی دیے جو اس کی صداقت پر دلالت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾[الحدید ۲۵]

''یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دیکر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتارا، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۴۳) بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ﴾[النحل]

''اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر مرد، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔ سو ذکر والوں سے پوچھ لو، اگر تم شروع سے نہیں جانتے۔ واضح دلائل اور کتابیں دے کر''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ﴾[آل عمران ۱۸۳]

''فرمادیں: بے شک مجھ سے پہلے کئی رسول تمھارے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے اور وہ چیز لے کر بھی جو تم نے کہی ہے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ﴾[آل عمران ۱۸۴]

''پھر اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو بے شک کئی رسول آپ سے پہلے جھٹلائے گئے، جو واضح دلیلیں اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ﴾[الشوری ۱۷]

''اللہ وہ ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی اور میزان بھی''۔

حتی کہ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ رسولوں میں سب سے مخفی آیات اور براہین حضرت ھود علیہ السلام کو دی گئیں۔ حتی کہ ان کی قوم

نے ان کے سامنے یہ کہہ دیا: [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:]

﴿قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ﴾ [هود ۵۳]

''اے ہود! آپ ہمارے پاس کوئی واضح دلیل [نشانی] نہیں لیکر آئے''۔

لیکن اس کے باوجود آپ کی نشانیاں/معجزات اور براہین ہر اس شخص کے لیے انتہائی واضح تھیں جسے اللہ تعالیٰ نے تدبر کی توفیق سے نوازا ہو۔ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۵۴) مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ (۵۵) اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵۶)﴾ [هود]

''اس نے کہا میں تو اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ بے شک میں اس سے بری ہوں جو تم شریک بناتے ہو۔ اس کے سوا۔ سو تم سب میرے خلاف تدبیر کرلو، پھر مجھے مہلت نہ دو۔ بے شک میں نے اللہ پر بھروسا کیا، جو میرا رب ہے اور تمھارا رب ہے۔ کوئی چلنے والا جاندار نہیں مگر وہ اس کی پیشانی کے بالوں کو پکڑے ہوئے ہے۔ بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے''۔

یہ سب سے بڑی نشانیاں ہیں۔ ایک شخص پوری قوم کے سامنے اکیلا کس طرح بغیر کسی خوف اور گھبراہٹ اور بزدلی کے؛ نڈر ہو کر یہ اعلان کر رہا ہے۔ بلکہ اپنے خطاب اور اعلان پر اس کو کتنا یقین اور اعتماد ہے۔ پس دیکھیں کہ سب سے پہلے وہ (حضرت ہود علیہ السلام) ان کے دین سے؛ اور جس اعتقاد پر وہ لوگ تھے؛ اس سے کھلم کھلا برأت کا اظہار کرتے ہوئے اللہ کو گواہ بناتے ہیں کہ ان کا اعتماد اور بھروسہ فقط اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے۔ اور قوم کو یہ خبر دیتے ہیں کہ ان کا حامی و مددگار وہی اللہ تعالیٰ ہے؛ اور وہ کبھی کافروں کو ان پر غلبہ نہیں دے گا۔ اور پھر آپ انہیں اپنی مخالفت پر کھلا گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ وہ ان کے دین اور ان کے خداؤں سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ خدا جن سے تعلق اور دوستی کا ان لوگوں کو دعوی تھا؛ اور جن کی خاطر وہ حضرت ھود علیہ السلام سے دشمنی رکھتے تھے؛ اور جن کی نصرت کے لیے وہ جانی اور مالی قربانیوں سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ پھر حضرت ھود علیہ السلام تاکیدی طور پر ان بتوں کی مزید حقارت اور ذلت بیان کرتے ہیں؛ اور انہیں انتہائی گھٹیا اور معیوب قرار دیتے ہیں۔ نیز کہتے ہیں کہ اگر تمام لوگ میری مخالفت پر جمع ہو جائیں اور اپنا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہیں؛ تو وہ جلدی کریں؛ اور انہیں کچھ بھی مہلت نہ دیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ کہ وہ انہیں صرف اسی قدر نقصان پہنچا سکیں گے جس قدر اللہ تعالیٰ نے ان کے نصیب میں لکھ دیا ہو۔ مزید برآں حضرت ہود علیہ السلام بار بار انہیں پکار رہے ہیں اور بہترین انداز میں انہیں دعوت دے رہے ہیں کہ ان کا اور ان کی قوم کا رب صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے؛ جس کے قبضہ میں ان سب کی پیشانیاں اور جانیں ہیں۔ وہی ان کا حامی و ناصر و محافظ ہے جو ان کی مدد و نصرت اور ان کی دعوت کی تائید کے لیے موجود ہے؛ اور یہ کہ وہی صراط مستقیم پر گامزن ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اس کو کبھی بھی ذلیل نہیں کرتے جو اس پر توکل کرتا ہے؛ اور اس کا اقرار کرتا ہے۔ اور نہ کبھی اس کے مخالفین کو اس پر ہنسنے اور ٹھٹھہ کرنے کا موقع دیتے ہیں۔

المختصر انبیائے کرام علیہم السلام کو دی گئی؛ نشانیوں؛ حجتوں اور دلائل سے زیادہ احسن اور زور دار کوئی اور دلیل کیا ہو سکتی ہے؟۔ دراصل

یہ دلائل وشہادات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے انتہائی صاف اور واضح بیان فرما دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک نام ''المؤمن'' بھی ہے؛ جس کی تفسیروں میں سے ایک تفسیر ''المصدّق'' بھی ہے؛ یعنی وہ ذات جو صدیقین کی ایسی تصدیق کرے جس سے ان کی صداقت کے دلائل اور ان پر شہادتیں قائم کرتی ہے۔ سو اس لیے ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے آفاقی اور نفسیاتی نشانیاں بھی قائم کر کے انہیں دکھائے؛ جس سے یہ واضح ہو کہ رسولوں کی لائی ہوئی وحی برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾[فصلت ۵۳]

''عنقریب ہم انھیں اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کے نفسوں میں دکھائیں گے حتی کہ ان پر واضح ہو جائے یقیناً یہی حق ہے''۔

(اَنَّهٗ) کی ضمیر کا مرجع قرآن کریم ہے؛ کیونکہ سیاق کلام میں وہی مذکور ہے۔ اور ایسے ہی فرمایا:

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾۔[فصلت ۵۱]

''کیا آپ دیکھتے ہیں؛ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو''۔

پھر اللہ تعالیٰ اس آیت کے آخر میں فرماتے ہیں:

﴿اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (53)﴾[فصلت]

''اور کیا تیرا رب کافی نہیں اس بات کے لیے کہ بے شک وہ ہر چیز پر گواہ ہے''۔

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ ﷺ کی صدق نبوت پر گواہی دی ہے اور بتایا ہے کہ جس کتاب کو آپ نے پیش کیا ہے وہ سچی کتاب ہے؛ اور وعدہ فرما رہے ہیں کہ وہ بندوں کے سامنے آفاقی اور نفسی دلائل بھی قائم کریں گے؛ جو اس پر زبان حال سے از خود گواہی دیں گے۔ پھر ان تمام دلائل سے عظیم اور زوردار گواہی/ دلیل یوں پیش فرماتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر ''شہید'' یعنی گواہ ہے''۔ بے شک الشہید اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ہے۔ یعنی وہ ذات جس کی نظروں سے کوئی بھی چیز اوجھل اور پردے میں نہیں۔ بلکہ وہ ہر ہر چیز پر مطلع؛ اور اس کا مشاہدہ کرنے والا؛ اور ان کی تفصیلات جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ استدلال اپنے اسماء اور صفات کے ساتھ ہے۔ جبکہ اس سے پہلے والا استدلال ارشادات اور اقوال کے طرز کا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے افقی اور نفسی نشانیاں پیش فرما کر استدلال کرنا اصل میں اپنے افعال اور تخلیق سے استدلال فرمانا ہے۔

[سوال]: اب اگر آپ کہیں کہ: وہ اپنے اسماء وصفات سے کیسے استدلال کر سکتا ہے؟ کیونکہ ان چیزوں سے استدلال کرنا ہمارے عرف میں نہیں؟۔

[جواب]: بیشک اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں ایسے اوصاف کو ودیعت فرما دیا ہے جو کہ فطرت سلیمہ بغیر کسی جحود انکار یا تشبیہ وتمثیل کے ساتھ نجس/ ملوث ہونے کا انکار کرتی ہے۔ بے شک اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے اسماء وصفات میں کامل اور اکمل ہے۔ اور بے شک وہ ان اوصاف سے متصف ہے جن کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کو؛ اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو موصوف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے کمالات میں سے جو چیز مخلوق کے علم سے مخفی ہے؛ وہ بہت عظیم اور ان امور سے بھی بہت زیادہ بڑی ہے جن کو وہ جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کمالات مقدسہ میں سے ہر ایک چیز پر اس کا مطلع اور شاہد ہونا بھی ہے؛ اس طرح سے کہ زمین و

آسمان کے ظاہر اور باطن کا ایک ذرہ بھی اس سے اوجھل یا مخفی نہیں۔ جس ذات پاک کی یہ شان ہو؛ تو پھر بندوں کے لیے یہ کیسے مناسب ہوسکتا ہے کہ اس کے ساتھ شرک کا ارتکاب کریں؟؛ اور کسی غیر کی عبادت بجالائیں؛ یا اس کے ساتھ کسی اور کو بھی معبود بنالیں؟۔ اسی طرح اس ذات اقدس کے ساتھ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایسے شخص کو قوت و استقرار بخشے جو اس پر انتہائی غلیظ جھوٹ بولے۔ اور اس کے متعلق ایسی خبریں دے جو خود اللہ تعالیٰ کے اپنے مطالبات کے خلاف ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی نصرت اور تائید کیسے کرسکتے ہیں کہ ایسے کذاب اور مفتری کی شان بلند کریں اور اس کی دعاؤں اور مطالبات کو قبول کریں؛ اور اس کے دشمنوں کو ہلاک کریں؛ اور اس کے خود ساختہ دین پر اسے ایسے معجزات اور خرق عادات کے ذریعہ غالب کریں کہ عام لوگوں کے اعصاب اس کی مثل کرامات پیش کرنے سے عاجز ہوں۔ ان تمام کے ہمراہ یہ بھی حقیقت ہو کہ وہ بندہ جھوٹا ہو؛ اور من گھڑت باتیں کہنے والا ہو۔

ظاہر ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہر شے پر شاہد اور مطلع ہونا؛ اس کی قدرت وحکمت؛ عزت اور اس کا کمال مقدس ان ساری باتوں کا انکار کرتا ہے۔ لیکن جو آدمی پھر بھی ان تمام باتوں کو ممکن قرار دے تو وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سلسلہ میں انتہائی درجہ کا لاعلم ہے۔

[استدلال کے] اس عقلی اسلوب و انداز سے قرآن کریم بھرا ہوا ہے۔ البتہ یہ طریقہ کار خواص کا ہے؛ جو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کریم کے ساتھ اس کے افعال پر اور ان امور پر استدلال کرتے ہیں جن کا کرنا یا نہ کرنا اس کی شان کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ (44) لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ (45) ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ (46) فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ (47)﴾ [الحاقة]

''اور اگر وہ ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا۔ تو یقیناً ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے۔ پھر یقیناً ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا''۔

اس بارے میں مزید تفصیل آگے آئے گی؛ ان شاء اللہ۔

مزید برآں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے توحید باری تعالیٰ کے اثبات اور شرک کے باطل ہونے پر بھی استدلال موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیں؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (23)﴾ [الحشر]

''وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ ہے، نہایت پاک، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان، سب پر غالب، اپنی مرضی چلانے والا، بے حد بڑائی والا ہے، پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں''۔

توحید باری تعالیٰ کے اثبات کے ضمن اس قسم کی بے شمار آیات موجود ہیں۔

اس طریقہ استدلال سے فائدہ اٹھانے والے لوگ بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ اور صرف خواص ہی اس طریقہ سے رہنمائی حاصل کرسکتے۔ جبکہ جمہور کا طریقہ عموماً آیات مشاہدہ سے استدلال کرنے کا ہے۔ کیونکہ یہی طریقہ قبولیت اور تسلیم کے اعتبار سے آسان تر ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو آپس میں ایک دوسرے پر ترجیح دے رکھی ہے۔ اور قرآن عظیم میں وہ تمام چیزیں جمع کردی ہیں جو

دیگر کتب میں نہیں۔ چنانچہ دلیل اور مدلول اور شاہد اور مشہود؛ سب کچھ اس میں جمع کر دیا گیا ہے''۔[مدارج السالکین ۳/۴۶۲]

[خلاصۂ کلام!] اللہ تعالیٰ نے صدقِ نبوت کی نشانی طلب کرنے والوں کو قرآن میں جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ اَوَ لَمۡ يَكۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ يُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَرَحۡمَةً وَّ ذِكۡرٰى لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ (۵۱)﴾[العنکبوت]

''اور کیا انھیں یہ کافی نہیں کہ بے شک ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے۔ بے شک اس میں یقیناً بڑی رحمت اور نصیحت ہے ایمان والوں کے لیے''۔

اہل طریقت کی تقسیم توحید اور اس پر رد:

جب یہ معلوم ہو گیا کہ ''توحید الوہیت'' ہی وہ چیز ہے جس کے ساتھ رسولوں کو مبعوث کیا گیا؛ اور اسی کو لیکر آسمانی کتب نازل ہوئیں۔ جیسا کہ اس کی طرف اشارہ گزر چکا۔ اب ان لوگوں کی طرف بالکل نہیں دیکھنا چاہیے جنہوں نے توحید کی تین من گھڑت اقسام بنا رکھی ہیں:

۱۔ توحید عوام

۲۔ توحید خواص؛ جس سے حقائق ثابت ہوتے ہیں۔

۳۔ توحید اخص الخواص۔ وہ توحید جو قائم بالقدم ہے۔

بے شک تمام مخلوق میں توحید کے اعتبار سے کامل و اکمل ترین ہستیاں انبیائے کرام علیہم السلام کی ہیں؛ مرسلین عظام علیہم السلام توحید میں ان سے بھی اکمل ہیں۔ پھر رسولوں میں سے اولوالعزم مرسلین یعنی حضرت نوح؛ حضرت ابراہیم؛ حضرت موسیٰ؛ حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ توحید میں سب سے بڑھ کر اکمل ہیں۔ توحید میں سب سے زیادہ کامل مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے؛ جو کہ علم و معرفت سے بھرپور؛ اور مخلوق کو اس طرف بلانے اور اس کے لیے کٹ مرنے کے اعتبار سے توحید کے جس مرتبہ پر قائم تھے؛ اس پر کوئی دوسرا ذی روح قائم نہ ہو سکا۔ پس اس سے افضل و اکمل کوئی توحید نہیں جس پر انبیائے کرام علیہم السلام بذات خود قائم تھے اور جس کی طرف وہ دعوت دیتے تھے؛ اور جس کی وجہ سے وہ اپنی قوموں سے جہاد میں مصروف رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کو اس سلسلہ میں ان تمام انبیائے کرام و مرسلین علیہم السلام کی اتباع و اقتداء کا حکم دیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنی قوم سے اقامت توحید اور بطلان شرک کے مناظرہ اور ان کی ذریت میں سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰٮهُمُ اقۡتَدِهۡ ﴾[الانعام ۹۰]

''یہی وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر''۔

واضح ہوا کہ اس توحید سے کوئی بھی توحید افضل و اکمل نہیں جس کی اقتداء کا حکم اللہ تعالیٰ نے سب سے برگزیدہ نبی کو دیا ہے۔ اور

رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو صبح کی یہ دعا سکھایا کرتے تھے:

((اَصْبَحْنَا عَلٰی فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ وَعَلٰی کَلِمَةِ الْاِخْلَاصِ وَعَلٰی دِیْنِ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی مِلَّةِ اَبِیْنَا اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَّمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ .))۔

[صحيح الجامع ٤٦٧٤ ؛ حديث صحيح: أخرجه عبد الله بن أحمد في زوائد "المسند" ٥/ ١٢٣ ؛ عن عبد الرحمن بن أبزى عن أبي بن كعب قال: "أن رسول اللهِ صلى الله عليهِ وسلم يعلمنا إذا أصبحنا: أصبحنا على فطرة الإسلام ...الحديث. وفي آخره: وإذا أمسينا مثل ذلك. وسنده ضعيف. لكنه أخرجه أحمد٣/ ٤٠٦ ؛ والدارمي ٢/ ٢٩٢ ؛ وابن السني في اليوم والليلة رقم 32 ؛ من طريقين آخرين عن عبد الرحمن بن أبزى قال: " إن النبي صلى الله عليهِ وسلم إذا أصبح قال ......فذكره. وسنده صحيح.]

''ہم نے صبح کی فطرت اسلام پر، کلمہ اخلاص پر اپنے نبی کریم ﷺ کی سنت پر اور اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر جو سب سے زیادہ یکسو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے''۔

پس ملت ابراہیم سے مراد توحید ہے؛ اور دین محمد ﷺ سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی قولی اور فعلی اور اعتقادی وحی ہے۔ اور کلمہ اخلاص سے مراد ''لا إلہ إلا اللہ'' کی گواہی ہے۔ اور فطرت اسلام سے مراد وہ فطرت سلیمہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے؛ اللہ وحدہ لاشریک کی محبت؛ عبادت؛ انابت؛ ذلت واطاعت؛ عبودیت کے جذبہ سے سرشار؛ اس کے سامنے سر جھکانے کے اعتبار سے پیدا کیا گیا ہے۔

پس اخص الخواص کی توحید وہی ہے جس سے بے رغبتی برتنے والا سب سے بڑا احمق قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ(۱۳۰) اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ(۱۳۱)﴾[البقرہ]

''اور ابراہیم کی ملت سے اس کے سوا کون بے رغبتی کرے گا جس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنالیا، اور بے شک ہم نے اسے دنیا میں چن لیا اور بلاشبہ وہ آخرت میں یقیناً صالح لوگوں سے ہے۔ جب اس سے اس کے رب نے کہا فرماں بردار ہو جا، اس نے کہا میں جہانوں کے رب کے لیے فرماں بردار ہو گیا''۔[مدارالسالکین ۳/۴۸۰]

فطرت سلیمہ؛ عقل؛ عقلی دلائل اور وحی:

ہر وہ شخص جس کو معمولی سی بھی تمیز؛ جانچ پرکھ والی عقل اور فطرت سلیم دی گئی ہے؛ وہ عام توحید کے اثبات میں کبھی بھی اہل کلام اور اہل جدل کی ایجاد کردہ اصطلاحات اور استدلال میں ان کے طریقوں کا محتاج نہیں۔ بلکہ ان میں پڑنے میں اکثر اوقات یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان غلط راستوں پر چلتا ہے تو بجائے اطمینان وایقان کے وہ شکوک وشبہات کے گہرے گڑھے میں ایسے گرتا چلا جاتا ہے کہ سوائے گمراہی اور سرگردانگی کے کوئی چیز ہاتھ نہیں آتی۔ بے شک توحید تو اس وقت فائدہ پہنچاتی ہے جب انسان کا دل ان گمراہیوں سے محفوظ ہو؛ اور یہی وہ قلب سلیم ہے جس کے انسان کو کامیابی نہیں ملتی۔ [اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ(89)﴾ ''مگر جو اللہ کے پاس سلامتی والا دل لے کر آیا''۔]

بے شک توحید کی دوسری اور تیسری قسم؛ جنہیں وہ خواص یا اخص الخواص کی توحید قرار دیتے ہیں؛ کا لازمی نتیجہ فناء فی وجود باری ہے؛ جس کا راگ اکثر صوفیاء الاپتے رہتے ہیں۔ حالانکہ فنافی اللہ کا یہ شرکیہ تصور انتہائی خطرہ کا مقام ہے؛ جو کہ بالآخر ''نظریہ وحدۃ الوجود'' کی انتہاء تک پہنچا دیتا ہے۔ دیکھیں: شیخ ابو اسماعیل انصاری رحمہ اللہ نے اشعار کی صورت میں کیسی عجیب بات کہی ہے:

ما وحد الواحد من واحد　　　إذ کل من وحده جاحد

توحید من ینطق عن نعته　　　عاریة أبطلها الواحد

توحیده إیاه توحیده　　　ونعت من ینعته لأحد

''کسی نے بھی ذات واحد کی توحید بیان نہیں کی؛ اس لیے کہ جس نے بھی اس کی توحید بیان کی؛ اس نے توحید کا انکار کیا۔ جو شخص اس کی صفات میں توحید بیان کرتا ہے؛ اس کی توحید کو بھی وہ ذات باطل قرار دے رہی ہے۔ اس کو ایک گردانا اس کی توحید ہے؛ اور اگر اس کی کی توحید کو صفات کے ذریعہ بیان کرنے والا ملحد ہے''۔

اگرچہ شیخ الاسلام کا مقصد وحدت الوجود ثابت کرنا نہیں؛ لیکن انہوں نے مجمل اور محتمل الفاظ استعمال کئے ہیں؛ جنہیں اہل طریقت نے وحدۃ الوجود کا لباس پہنا دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کر کہا ہے کہ شیخ الاسلام انہی میں سے تھے۔ بہر حال اگر شیخ الاسلام ایسے معروف شرعی الفاظ بولتے جو احتمال سے پاک ہوتے؛ تو یہ زیادہ بہتر ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی مدنظر رہے کہ وہ معانی جو ان اشعار میں پائے جاتے ہیں؛ اگر شارع کا ہم سے یہی مطلوب ہوتا؛ تو شارع علیہ السلام اس سے ضرور آگاہ کرتے؛ اس کی وضاحت کرتے؛ اور لوگوں کو اس کی دعوت دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری تو ''بلاغ مبین'' کی تھی۔ لیکن بتایئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاں فرمایا ہے کہ: ''یہ توحیدِ عوام ہے؛ اور یہ توحیدِ خواص؛ اور یہ توحیدِ اخص الخواص۔ یا اس کے قریب المعنی ہی کوئی بات فرمائی ہو۔ یا اس کی طرف اشارہ ہی کیا ہو؟۔

صوفیاء کی توحید اور دین میں غلو:

یہ عقول و نقول موجود ہیں؛ اور یہ اللہ تعالیٰ کا کلام جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے؛ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمارے سامنے ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خیر القرون کے حضرات اور چوٹی کے ائمہ اسلام کے اقوال ہیں؛ کیا فنافی وجود باری تعالیٰ کا کسی ایک نے بھی ذکر کیا ہے؟؛ یا توحید کی یہ تقسیم بیان کی ہے؟ بے شک یہ سب کچھ دین میں غلو کی پیداوار ہے۔ ان کا غلو خوارج بلکہ نصاریٰ کے اپنے دین میں غلو سے معمولی سا بھی کم نہیں۔ حالانکہ اللہ کریم نے دین اسلام میں غلو کی انتہائی مذمت فرمائی ہے۔ اور اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ﴾[النساء ۱۷۱]

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ گزرو اور اللہ پر مت کہو مگر حق بات''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا

كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾[المائدۃ ۷۷]

''فرمادیں:اے اہل کتاب!اپنے دین میں ناحق حد سے نہ بڑھواور اس قوم کی خواہشوں کے پیچھے مت چلو جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے اور انھوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے''۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم دین میں سختی نہ کرو؛ ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر بھی سختی کرے گا؛تم سے پہلے لوگوں نے دین میں سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کردی۔ان کی بقایا آج بھی گرجوں اور مندروں میں موجود ہیں۔رہبانیت ان لوگوں نے ایجاد کی؛ ہم نے ان پر لازم نہیں کی تھی''[1]۔

[1] ۔سنن أبی داؤد ۴۹۰۴؛اس کی سند میں سعید بن عبدالرحمٰن بن ابوالعمیاء ہے؛ جس کی توثیق ابن حبان کے علاوہ کسی نے نہیں کی؛(الضعیفۃ ۳۴۶۸)

صفات باری تعالیٰ میں مماثلت کی نفی:

۲۔((وَ لَا شَیْئَ مِثْلُهُ)) ❶۔

''اور کوئی بھی چیز اس کی مثل نہیں''۔

❶ ۔ یہ توحید کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔کوئی بھی چیز اللہ کے مماثل نہیں؛ نہ ہی اس کی ذات میں نہ ہی اس کی صفات میں اور نہ ہی اس کے افعال میں۔ لیکن اہل بدعت تاویل کا شکار لوگ اللہ تعالیٰ کی بہت ساری صفات کا انکار کرنے کے لیے اس کو اپنی اصل بناتے ہیں۔پس جب بھی ان کے دل اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت پر ایمان لانے سے تنگ پڑ جاتے ہیں تو وہ اس پر تاویل اور ہدم کے کلہاڑے مسلط کر دیتے ہیں۔اور ان کا انکار کر دیتے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں:﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾۔وہ پوری آیت سے تجاہل عارفانہ کرتے ہیں؛ چونکہ اسی آیت میں ہے:﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾۔پس یہ آیت کریمہ تنزیہ اور اثبات کی جامع ہے۔جو کوئی عقیدہ میں سلامتی چاہتا ہو؛ تو اس پر لازم ہے کہ اللہ کو مخلوق سے مشابہت دینے سے تنزیہ اختیار کرے؛ اور اس میں کوئی تأویل یا تعطیل بروئے کار نہ لائے۔اور اللہ تعالیٰ کے لیے ان تمام صفات کو ثابت مانے جو اس نے اپنی کتاب میں ثابت کی ہیں؛ یا پھر رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے لیے بیان کی ہیں؛ بغیر کسی تمثیل کے؛ یہ سلف صالحین کا مذہب ہے۔اور مصنف رحمہ اللہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اتباع میں اسی پر کاربند ہیں۔اس کی تفصیل شرح میں آپ دیکھ لیں گے:﴿فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ﴾ ''سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر''۔

شیخ عبدالرحمن بن ناصر البراک کہتے ہیں: یہ ایمان رکھنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ صفات کمال سے موصوف ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کی وہ صفات بیان کرنی چاہییں جو اس نے خود اپنی ذات کے لیے؛ یا پھر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیان کی ہیں۔ان کے بیان کرنے میں مخلوق کے ساتھ کوئی تشبیہ لازم نہیں آتی۔بخلاف معتزلہ جہمیہ؛ معطلہ اور ان کے ہمنواؤں کے۔ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صفات کے اثبات سے تشبیہ لازم آتی ہے؛ پس وہ اس شبہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کر دیتے ہیں۔حالانکہ یہ خیال باطل اور غلط ہے۔اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: منہاج السنۃ النبویہ ۲/۱۰۵؛ مجموع الفتاوی ۴/۱۵۰۔شرح عقیدہ طحاویہ از براک ۳۰۔

ایک بہت ہی عمدہ اور خوبصورت قاعدہ:

یہاں پر ذات باری تعالیٰ کے اسماء وصفات؛ خصوصاً جو انسانوں کے لیے بھی مستعمل ہیں؛ تو کیا ان میں انسانی خصائص کا اعتبار ہوتا ہے یا نہیں؟ اشاعرہ اور ماتریدیہ کا قول ہے کہ ان میں انسانی خصائص ملحوظ بلکہ اصل ہوتے ہیں۔مگر اہل سنت والجماعت نے اس بارے میں ایک بہت ہی عمدہ اور خوبصورت قاعدہ بیان کیا ہے۔حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''اہل نظر کا اسماء میں اختلاف ہے جن کا اطلاق اللہ تعالیٰ اور بندوں دونوں پر ہوتا ہے؛ جیسے حی؛ سمیع و بصیر؛ علم؛ قدیر؛ ملک وغیرہ میں اختلاف ہے؛ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ان کا بندوں کے لیے استعمال حقیقی ہے؛ اور اللہ تعالیٰ کے لیے ان کا استعمال مجازی ہے۔یہ قول سب سے خبیث اور گندہ قول ہے؛ غالی جہمیہ کا یہی عقیدہ ہے۔دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ ان اسماء کا رب تعالیٰ کے لیے استعمال حقیقی؛ اور انسانوں کے لیے مجازی ہے۔اس گروہ کا قول پہلے گروہ کے قول کے برعکس ہے۔یہ ابوالعباس قلانسی کا قول ہے۔تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ ان اسماء کا استعمال دونوں جگہ پر حقیقی ہے۔یہی قول درست ہے؛ جو کہ اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے''۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:''دراصل اس قسم کے اسماء وافعال کے تین اعتبارات ہوتے ہیں۔اول: ان کا ذکر مطلق ہو۔رب تعالیٰ کی طرف سے یا بندوں کی نسبت سے ان کو مقید نہ کیا جائے۔دوم: رب سبحانہ وتعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر اور اس سے مختص ہو کر ذکر ہوں۔سوم: بندہ کی طرف منسوب اور اس کی نسبت سے مقید ہو کر ذکر ہوں۔جب مطلق ذکر ہو جائے تو پھر اس اسم کے لیے جو کچھ ذاتاً اور حقیقتاً لازم آتا ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی ثابت ہوتا ہے اور بندہ کے لیے بھی۔مگر اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے جلال و کمال کے مطابق اور بندہ کے لیے اس کی حیثیت کے مطابق''۔.......پھر لکھتے ہیں:......''جو صفت بندہ کی طرف مضاف ہونے سے لازم آتی ہے؛ تو اس کی اللہ تعالیٰ سے نفی قطعاً واجب ہے۔جیسا کہ''حیات''اگر بندہ کے لیے ثابت ہو جائے تو پھر نیند؛ اونگھ اور خوراک وغیرہ اس کے ساتھ لازم آتے ہیں۔مگر جب ہم اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا استعمال کرتے ہیں تو پھر ان چیزوں کی نفی لازم ہو جاتی ہے''۔ بدائع الفوائد ۱/۱۶۵۔

ہمارے استاذ محترم ایک قاعدہ بیان کیا کرتے تھے:''جو عقیدہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ہے؛ وہی عقیدہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں بھی ہونا چاہیے۔اس میں کسی بھی چیز سے کوئی مشابہت یا تمثیل لازم نہیں آتی۔[دراوی]

تشریح: تمام اہل سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال میں اس کی کوئی مثل نہیں۔

اس کے باوجود لوگوں نے اپنے استعمالات میں''تشبیہ''کو ایک مجمل لفظ بنا رکھا ہے۔اس سے بسا اوقات وہی صحیح معنی مراد لیا جاتا

ہے جس کی قرآن کریم بھی نفی کرتا ہے؛ اور عقل بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور خصائص سے مخلوق کو متصف نہیں کیا جا سکتا۔ اور مخلوقات میں سے کوئی بھی چیز اس کی صفات میں اس کی کچھ بھی مماثلت نہیں رکھتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوری: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' اس میں ممثلہ ومشبہ کا رد ہے۔

اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

﴿ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ (الشوری: ۱۱)

''اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔'' اس میں منکرین صفات کا بھی رد ہے۔

پس جو کوئی خالق کی صفات کو مخلوق کی صفات کی مانند قرار دیتا ہے؛ وہ مذموم باطل پرست مشبہ ہے۔ اور جو کوئی مخلوق کی صفات کو خالق کی صفات کی مانند قرار دیتا ہے وہ بھی اپنے کفر میں عیسائیوں کی مانند ہے۔

صفات کا اثبات تشبیہ کو لازم نہیں کرتا:

اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کوئی بھی چیز ثابت نہیں۔ پس یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے علم و قدرت اور حیات وغیرہ کی صفات ہیں۔ کیونکہ بندہ خود بھی انہی صفات سے متصف ہے۔ چنانچہ اس قول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حیّ؛ علیم وقدیر وغیرہ ہرگز نہ مانا جائے۔ کیونکہ بندے کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ وہ حیّ؛ علیم وقدیر ہے۔ اور یہی حال کلام؛ سمع؛ بصر؛ ارادہ اور دیگر اسماء وصفات الٰہی کا بھی ہے۔ وہ اہل سنت والجماعت کے مؤقف سے اس حد تک موافق ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود؛ علیم وقدیر اور حیّ ہے۔ اور مخلوق بھی موجود؛ علیم وقدیر اور حیّ ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تشبیہ ہے؛ اور اس کی نفی کرنا لازم/ واجب ہو۔ اس مؤقف کے درست ہونے پر کتاب وسنت اور صریح عقل دلالت کرتی ہے۔ کوئی بھی عاقل اس بات سے اختلاف نہیں کرتا۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ان اسماء گرامی سے موسوم کیا ہے۔ اور یہ اسماء اپنے بندوں/مخلوق کے لیے بھی تجویز کئے ہیں۔ یہی حال صفات الٰہیہ کا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بعض صفات سے موصوف کیا ہے؛ اور پھر مخلوق کو بھی انہی میں سے بعض صفات سے موصوف قرار دیا ہے۔ درحقیقت مسمیٰ خالق مسمیٰ مخلوق کی مانند نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء: الحی ؛ العلیم؛ القدیر ؛ الرؤوف ؛ الرحیم ؛ العزیز ؛الحکیم ؛السمیع ؛ البصیر ؛ الملك ؛ المؤمن ؛ الجبار ؛ المتکبر ؛وغیرہ رکھے ہیں۔ اور بعض بندوں کو بھی ان [میں سے بعض] ناموں سے موسوم کیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾[الانعام ۹۶]

''وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (28) ﴾[الذاریات]

''اور اسے ایک صاحب علم لڑکے کی بشارت دی''۔

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ (101)﴾[الصافات]

''تو ہم نے اسے ایک بہت بردبار لڑکے کی بشارت دی''۔

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۱۲۸)﴾[التوبۃ]

''اوروہ مؤمنین پر بہت مہربان رحم کرنے والے ہیں''۔

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا (2)﴾[الانسان]

''پس ہم نے اس کو بنادیا سنتا ہوادیکھتا ہوا''۔

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ﴾[یوسف ۵۱]

''عزیز کی بیوی کہنے لگی''۔

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَّلِكٌ﴾[کھف ۷۸]

''اوران کے آگے ایک بادشاہ تھا''۔

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا﴾[السجدہ ۱۸]

''بھلا جوکوئی مؤمن ہو''۔

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (35)﴾[غافر]

''اسی طرح اللہ ہر متکبر، سرکش کے دل پر مہر لگادیتا ہے''۔

یہ بات تو معلوم شدہ ہے کہ زندہ اور زندہ[حیّ اور حیّ] برابر نہیں ہوسکتے؛ اور نہ ہی علیم اور علیم اور نہ ہی عزیز اور عزیز برابر ہوسکتے ہیں۔ یہی حال دیگر تمام اسمائے گرامی کا بھی ہے۔اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ﴾[البقرہ ۲۵۵]

''اوروہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرتے''۔

اوراللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَنزَلَهُ بِعِلْمِهِ﴾[النساء ۱۶۵]

''اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ مَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰی وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِهٖ ﴾[فاطر ۱۱]

''اور کوئی مادہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الۡقُوَّةِ الۡمَتِیۡنُ (58)﴾[الذاریات]

''بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیۡ خَلَقَهُمۡ هُوَ اَشَدُّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً ﴾[فصلت ۱۴]

''اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا بیشک وہ اللہ جس نے انھیں پیدا کیا، وہ ان سے زیادہ قوت والا ہے''۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اپنے تمام امور میں استخارہ کرنا ایسے سکھاتے تھے جیسے قرآن کی کوئی سورت سکھائی جاتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

''جب تم میں سے کوئی کسی کام کا ارادہ کرے تو فرض نماز کے علاوہ دو رکعت نماز نفل پڑھے؛ اور یہ دعا کرے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلاَ اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلاَ اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلاَّمُ الْغُیُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الاَمْرَ خَیْرٌ لِّی فِی دِیْنِی وَمَعَاشِی وَعَاقِبَةِ اَمْرِی فَاقْدِرْهُ لِی وَیَسِّرْهُ لِی ثُمَّ بَارِكْ لِی فِیْهِ وَ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الاَمْرَ شَرٌّ لِّی فِی دِیْنِی وَمَعَاشِی وَعَاقِبَةِ اَمْرِی فَاصْرِفْهُ عَنِّی وَاصْرِفْنِی عَنْهُ وَاقْدِرْ لِی الْخَیْرَ حَیْثُ كَانَ ثُمَّ ارْضِنِی بِهٖ .))[1]۔

[1] ۔[بخاری (1162) ابو داؤد (1538)] اس کی صحت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ امام بخاری نے یہ حدیث اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ نیز اسے صحیح ابن حبان (۸۸۶) میں بھی روایت کیا گیا ہے۔ مزید دیکھیں: الضعیفة ۲۳۰۵۔

''یا اللہ میں تجھ سے تیرے علم کے ساتھ خیر کا مطالبہ کرتا ہوں اور تیری قدرت کے ساتھ قوت کا مطالبہ کرتا ہوں اور تجھ سے تیرے عظیم فضل کا سوال کرتا ہوں اس لئے کہ تو طاقت رکھتا ہے اور میں طاقت نہیں رکھتا اور تو جانتا ہے میں نہیں جانتا اور تو غیب کا جاننے والا ہے۔ اے اللہ اگر تیرے علم میں یہ بات ہے کہ یہ کام میرے لئے میرے دین' میری معیشت اور میرے کام کے انجام میں بہتر ہے تو اسے میرے مقدر میں کر دے اور میرے لئے اس کو آسان کر دے پھر میرے لئے اس میں برکت ڈال دے اور اگر تیرے علم میں یہ بات ہے کہ یہ کام میرے لئے میرے دین' میری معیشت اور میرے کام کے انجام میں برا ہے تو اسے مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے مقدر میں بھلائی رکھ دے جہاں بھی ہو پھر مجھے اس پر راضی کر دے''۔[استخارہ کرنے والا ھذا الامر کی جگہ پر اپنی حاجت کا نام لے۔]

ایسے ہی سنن نسائی میں ہے؛ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ ان الفاظ میں دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبَ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ اَحْيِنِيْ مَاكَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ. اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ خَشْيَتَكَ فِي الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ؛ وَاَسْئَلُكَ كَلِمَةَ الْحَقِّ فِي الرِّضَا وَالْغَضَبِ وَ اَسْئَلُكَ الْقَصْدَ فِيْ الْغِنٰى وَالْفَقْرِ وَاَسْئَلُكَ نَعِيْمًا لَا يَنْفَدُ وَاَسْئَلُكَ قُرَّةَ عَيْنٍ لَّا تَنْقَطِعُ وَاَسْئَلُكَ الرِّضا بَعْدَ الْقَضَاءِ وَاَسْئَلُكَ بَرْدَ الْعَيْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَاَسْئَلُكَ لَذَّةَ النَّظْرِ اِلٰى وَجْهِكَ وَالشَّوْقَ اِلٰى لِقَآئِكَ فِيْ غَيْرِ ضَرَّآءَ مُضِرَّةٍ وَّلَا فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ۔ اَللّٰهُمَّ زَيِّنَا بِزِيْنَةِ الْاِيْمَان وَاجْعَلْنَا هُدَاةً مُهْتَدِيْنَ۔)) [1]۔

''اے اللہ اپنے غیب جاننے اور مخلوق پر تیرے اختیار کے واسطے سے مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک تیرے علم کے مطابق زندگی میرے لیے بہتر ہو اور اس وقت مجھے فوت کرنا جب تیرے علم کے مطابق موت میرے لیے بہتر ہو۔ اے اللہ! بے شک میں طالب ہوں تجھ سے تیری خشیت کا غائب اور حاضر (دونوں حالتوں) میں اور میں طالب ہوں تجھ سے سچی بات کہنے کا، راضی اور ناراضی (دونوں حالتوں) میں اور میں سوال کرتا ہوں، تجھ سے میانہ روی اختیار کرنے کا مالداری اور تنگ دستی میں، اور میں سوال کرتا ہوں تجھ سے ایسی نعمت کا جو ختم نہ ہونے والی ہو، اور سوال کرتا ہوں تجھ سے آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو ختم نہ ہو، اور سوال کرتا ہوں تجھ سے راضی رہنے کا تیرے فیصلوں پر، اور میں مانگتا ہوں تجھ سے زندگی کی ٹھنڈک کا موت کے بعد اور میں سوال کرتا ہوں تجھ سے تیرے چہرے کے دیدار کی لذت کا اور تیری ملاقات کے شوق کا (جو) بغیر کسی تکلیف دہ مصیبت اور گمراہ کن فتنے کے (حاصل) ہو اے اللہ! ہمیں مزین فرما ایمان کی زینت سے، اور بنا دے ہمیں راہنما ہدایت یافتہ''۔

[1]۔[نسائی: ۱۲۰۷؛ یہ حدیث صحیح ہے۔ اسے امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس پر ان کی موافقت کی ہے۔ مزید دیکھیں: الکلم الطیب ۱۰۵؛ ظلال الجنة ۱۲۹]

یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو صفات الٰہیہ جیسے علم وقدرت؛ اور قوت سے موصوف کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا﴾[الروم ۵۴]

''اور پھر اس نے قوت کے بعد کمزور بنا دیا''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ﴾[یوسف ۶۸]

''اور بیشک وہ بہت علم والا تھا جو ہم نے اس کو علم سکھایا''۔

یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور بندوں کا علم ایک جیسا نہیں۔ نہ اللہ تعالیٰ کی قوت بندوں کی قوت کے مثل ہے۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ ان مثالوں کا ماننا تمام اہل عقل کے لیے لازم ہے۔

منکرین صفات کے عقائد اور اقوال کا جائزہ:

پس جس نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی ایسی صفت کی نفی کی جو اس نے اپنی ذات کے لیے بیان کی ہیں؛ جیسے: رضا؛ غضب؛ محبت؛ بغض وغیرہ؛ یا اس طرح کی دیگر صفات؛ اور یہ خیال کیا کہ ان کو ماننے سے تشبیہ اور تجسیم لازم آتی ہے۔ اس سے سوال کیا جائے گا کہ: آپ بھی تو اللہ تعالیٰ کے لیے ارادہ؛ کلام؛ سمع اور بصر کی صفات ثابت مانتے ہیں [جیسا کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کا عقیدہ ہے]۔ جس چیز کو آپ اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کر رہے ہیں وہ بھی مخلوق کے اوصاف کی مانند نہیں؛ پس جس چیز کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ثابت کر رہے ہیں اور آپ اس کا انکار کرتے ہیں؛ اس کو ثابت کرنے کے لیے ایسے ہی کہو جیسے اپنی ثابت کردہ صفات کے بارے میں کہہ رہے ہو؛ اس لیے کہ ان دونوں کے مابین کوئی فرق نہیں۔

اگر وہ کہے کہ: میں تو اللہ تعالیٰ کے لیے کسی بھی صفت کو ثابت نہیں مانتا؛ [جیسے معتزلہ کا عقیدہ ہے] تو اس سے کہا جائے گا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ جیسے: الحی؛ العلیم؛ القدیر کو تو بہر حال ثابت مانتے ہیں؛ اور بندوں کو بھی ان اسماء سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پس جو اسماء اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں وہ ان اسماء کے مماثل نہیں جو بندوں کے لیے ثابت ہیں۔ چنانچہ اسماء کے حوالے سے جو آپ کا عقیدہ ہے؛ وہی توجیہ صفات کے ضمن میں بھی کر لیں۔

اگر وہ کہے کہ: میں تو اللہ تعالیٰ کے لیے اسمائے حسنیٰ بھی نہیں مانتا؛ بلکہ میں کہتا ہوں: یہ مجاز ہیں؛ یہ اصل میں اس کی بعض تخلیقات کے نام ہیں؛ جیسا کہ غالی فلاسفہ اور باطنیہ کا عقیدہ ہے۔ تو کہا جائے گا کہ: آپ لازمی طور پر یہ تو مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حق اور موجود اور اپنی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اور پھر جسم بھی موجود ہوتا ہے؛ اور وہ اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے؛ مگر ان میں مماثلت نہیں ہوتی۔

اگر وہ کہے کہ: میں اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی ثابت نہیں مانتا؛ بلکہ واجب الوجود کا بھی منکر ہوں۔

تو اس سے کہا جائے گا: ''یہ بات تو صریح عقل سے ثابت ہے کہ موجود یا تو بذات خود واجب ہوگا؛ یا پھر بذات خود غیر واجب ہوگا۔ اور پھر یا قدیم ازلی ہوگا؛ یا حادث ہوگا؛ اور اسے عدم سے وجود ملا ہوگا؛ یا مخلوق ہوگا؛ جسے اپنے خالق کی حاجت ہوگی یا پھر غیر مخلوق ہوگا؛ اور اسے کسی خالق کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور پھر یا اپنے علاوہ دوسروں کا محتاج ہوگا؛ یا دوسروں سے بے نیاز ہوگا۔ غیر واجب بنفسہ واجب بنفسہ کے بغیر نہیں ہوسکتا؛ حادث کے وجود کے لیے کسی قدیم کا وجود ہونا بھی ضروری ہے۔ ایسے ہی مخلوق کا خالق کے بغیر ہونا ناممکن ہے۔ اور فقیر کے وجود کے لیے ایک غنی کا وجود ضروری ہے۔ پس مذکورہ نقیضین کی تقدیر پر ایسے موجود کا وجود ماننا لازم آتا ہے جو واجب بنفسہ؛ قدیم ازلی اور خالق اور اپنے علاوہ ہر ایک سے بے نیاز اور غنی ہو۔ جبکہ اس کے برعکس جو وجود ثابت ہوگا وہ اس کے برخلاف صفات کا حامل ہوگا۔

خالق ومخلوق میں مماثلت کی نفی:

یہ بات حسی اور بدیہی طور پر معلوم ہوگئی کہ ایک ایسا وجود بھی موجود ہے؛ جو حادث اور عدم کے بعد وجود رکھنے والا ہو۔ اور حادث نہ قائم بنفسہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی قدیم ازلی۔ نہ ہی اپنے غیر کا خالق ہوسکتا ہے اور نہ ہی غیر سے بے نیاز ہوسکتا ہے۔ پس اس صورت میں ضرورت کے تحت دو موجودوں کا وجود ثابت ہوتا ہے: ان میں سے ایک واجب ہوگا؛ اور دوسرا ممکن؛ ایک قدیم ہوگا دوسرا حادث؛ ایک غنی ہوگا دوسرا فقیر؛ ایک خالق ہوگا دوسرا مخلوق۔ اور ان دونوں وجودوں میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ وجود رکھنے میں اور ثابت

ہونے مماثلت/ اتفاق رکھتا ہوگا۔اور یہ بات بھی معلوم شدہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک حقیقت میں دوسرے کے مماثل نہیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو ان دونوں کے مابین: واجب ہونے جائز ہونے اور ممتنع ہونے میں بھی مماثلت ہوتی ۔ اوران میں سے ایک کا قدیم ہونا واجب ہے جو کہ موجود بنفسہٖ ہے۔اور دوسرے کا قدیم ہونا واجب نہیں ؛ اور نہ ہی وہ اپنی ذات کے ساتھ قائم ہے؛ ان میں سے ایک خالق ہے؛ جبکہ دوسرا مخلوق ہے؛ اور ایک اپنے ماسوا سے غنی ہے جبکہ دوسرا فقیر اور محتاج ہے۔

پس اگر آپ ان دونوں وجودوں کو مماثل قرار دیں تو لازم آئے گا کہ ان میں سے ہر ایک کو بیک وقت قدیم بھی مانا جائے او رحادث بھی؛ اور ہر ایک ایک ہی وقت میں بذات خود موجود بھی ہو؛ اور بذات خود موجود نہ بھی ہو۔ خالق بھی مانا جائے؛ اور مخلوق بھی مانا جائے۔ ایک ہی وقت میں غنی بھی ہو اور فقیر بھی ۔ تو ان کو متماثل قرار دینے کی صورت میں اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔تو معلوم ہوا کہ جب دونوں کا متماثل ہونا صریح عقل کی روشنی میں منتفی ہے؛ تو ایسے ہی نصوص شریعت کی روشنی میں بھی ممنوع/منتفی ہے۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں معلوم ہوا کہ ان دونوں وجودوں کے درمیان ایک وجہ سے عموم وخصوص کی نسبت ہے؛ کہ یہ دونوں ایک لحاظ سے متفق بھی ہیں اور ایک لحاظ سے مختلف بھی ۔ پس جس نے ان دونوں کی اتفاقی جہت کا انکار کیا؛ تو وہ اس باطل عقیدہ کی وجہ سے صفات کا منکر (معطل) ٹھہرا؛ اور جس ان دونوں کو برابر اور تماثل کر دیا؛ وہ بھی اس باطل عقیدہ کی وجہ سے مشبہہ میں سے ٹھہرا۔ واللہ اعلم

یہ نتیجہ اس لیے اخذ کیا گیا ہے کہ اگر چہ یہ دونوں وجود اپنے مسمیٰ میں کسی حد تک متفق ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک صفت وجود؛ علم اور قدرت اور دیگر تمام صفات میں خصوصیت رکھتے ہیں ؛ اور بندہ ان میں سے کسی بھی صفت میں ذرہ برابر بھی ان سے مشابہت یا مشارکت نہیں رکھتا۔ اسی طرح بندہ بھی وجود؛ علم وقدرت اور اپنی تمام صفات میں خاص ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بندے کے ساتھ اس کے خصائص میں شراکت سے منزہ اور پاک ہے۔

انکار صفات میں بنیادی غلطی:

پس جب صفت وجود، صفت علم اور صفت قدرت کے مسمیات میں مشترک ہوں ؛ تو یہ اشتراک ذہن میں پائی جانے والی ایک 'مطلق کلی' ہی ہوسکتا ہے اعیان میں نہ ہوتا۔ اور جو چیز اذہان میں ہو وہ مختص ہوتی ہے؛ اس میں کوئی اشتراک نہیں ہوتا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں بہت سارے مناظرین اضطراب کا شکار ہو گئے ۔ کیونکہ انہیں یہ وہم اور غلطی لگی کہ ان اشیاء کے مسمیات میں اتفاق سے لازم آتا ہے کہ خارج میں بھی رب کا وجود اور بندے کا وجود ایک جیسے ہوں ۔

ایک اور گروہ کا خیال یہ ہے کہ لفظ وجود اشتراک لفظی کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنی عقلوں کی بڑائی کے قائل ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ اسماء عام ہیں جو کہ تقسیم کو قبول کرتے ہیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ''موجود'' واجب وممکن اور قدیم وحادث میں تقسیم کے قابل ہے۔ ان اقسام میں مورد تقسیم مشترک ہے۔ جبکہ لفظ مشترک مثلاً لفظ المشتری کو لے لیں جو کہ خرید وفروخت کرنے والے اور المشتری ستارے دونوں ہی کیلئے مستعمل ہے۔ اس کا معنی تقسیم نہیں ہوتا۔ اور یوں کہا جا سکتا کہ لفظ مشتری کی دو قسمیں ہیں کہ وہ اس مراد پر بھی بولا جاتا ہے اور اُس مراد پر بھی بولا جاتا ہے۔ ان مقالات پر تفصیلی بحث اپنے مقامات پر موجود ہے۔

المختصر غلطی اور خطاء کی اصل بنیاد [فلاسفہ اور متکلمین کا] یہ وہم ہے کہ بے شک اسماء عامہ کلیہ کا مسمی مطلق کلی ہوتا ہے۔ اور بعینہ

اس معین [ذہنی] میں بھی اور اس معین [خارجی] میں بھی ثابت ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہے۔ دیکھ لیجئے کہ جو چیز خارج میں پائی جاتی ہے وہ کبھی بھی کلی مطلق نہیں ہوتی؛ بلکہ لازماً معین مختص ہی پائی جاتی ہے۔ پس چنانچہ جب ان اسماء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موسوم کیا گیا تو ان اسماء کا مسمی اس کے ساتھ معین مختص تھا؛ اور جب بندے کو اِن ناموں سے پکارا جاتا ہے تو اس کا مسمی بھی ان کے ساتھ مختص معین ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے وجود وحیات کی صفات میں مخلوقات میں سے کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خارج میں خود مخلوقات کی ہر نوع کے افراد باہم ایسے معین مختص ہوتے ہیں کہ ان کے اسماء وصفات میں ان کا کوئی شریک نہیں ہوا کرتا تو پھر خالق جل جلالہ کے متعلق ایسا کیونکر ممکن ہے؟''۔ [منہاج السنہ ۲/۱۱۰۔]

کیا آپ نہیں غور کرتے کہ جب آپ یوں کہتے ہیں کہ (هــذا هــو ذاك) یعنی ''یہ تو وہی ہے'' تو مشار الیہ ایک ہی ہوتا ہے اگر چہ دو مختلف جہات کے اعتبار سے اختلاف ہوتا ہے۔

اس مذکورہ مثال سے اور اس قسم کی دیگر مثالوں کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مشبہہ نے یہ معانی مراد لئے ہیں۔ لیکن اس میں حق معانی پر کچھ زیادتی اپنی طرف سے کر لی؛ تو گمراہ ہو گئے۔ [اور معطّلہ نے] مماثلت کی نفی ان ہی معانی میں کی تھی؛ مگر اس میں اپنی طرف سے اضافہ کر لیا؛ تو گمراہ ہو گئے۔ اور بے شک کتاب اللہ اس حق معانی پر دلالت کرتی ہے۔ اور عقول سلیمہ بھی اس کو صحیح سمجھتی ہیں۔ اور یہی اعتدال پر مبنی وہ حق ہے؛ جس میں کوئی انحراف نہیں پایا جاتا۔

پس معطلہ نے یہ کام تو اچھا کیا کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوقات میں سے کسی شے کے ساتھ تشبیہ سے منزہ قرار دیا، لیکن نفس الامر میں اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کے لئے جو معانی ثابت تھے جب ان کا رد کیا تو نہایت برا کیا۔ اور مشبہ نے صفات کو ثابت مان کر تو اچھا کیا؛ مگر اس میں تشبیہ دینے کو زیادہ کر کے بہت برا کیا۔

مسئلہ صفات میں اہل سنت کا مؤقف اور عقلی دلائل:

جان لیجئے کہ مخاطب الفاظ سے تعبیر شدہ معانی کو سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے؛ الا کہ وہ ان کی اصلیت کو جانتا ہو؛ یا ایسی چیز کو جانتا ہو جو اس سے مشابہت رکھتی ہو۔ [یا ان کے مناسب معانی سے متعارف ہو]۔ نیز اُن دونوں میں اصل معانی کے اعتبار سے قدرِ مشترک اور مناسبت و مشابہت پائی جائے۔ اس طریقہ کو چھوڑ کر مخاطب کو بات سمجھانا قطعی ناممکن ہے۔

چنانچہ کلام کے معانی کو سیکھنے و سمجھنے کے (ابتدائی مرحلہ میں) الفاظ مفردہ کے معانی سمجھانے سے تعلیم کی ابتداء کی جاتی ہے۔ اُس بچہ کی مثال سامنے لایئے جسے لغت و بیان کی تعلیم دی جاتی ہے تو اولاً اس کے سامنے مفرد الفاظ بولے جاتے ہیں اور پھر اگر مسمی محسوس ظاہر یا محسوس باطن ہوتا ہے تو اس کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بچے کے سامنے دودھ، روٹی، ماں، باپ، آسمان، زمین، سورج، چاند اور پانی وغیرہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں اور اس عبارت کے بیان کے ساتھ ہی ہر ایک کے مسمیات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، وگرنہ بچہ کبھی بھی الفاظ کے معانی اور متکلم کی مراد کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس لئے بنی آدم میں سے ہر انسان سمعی تعلیم کا محتاج ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ آدم ابوالبشر علیہ السلام وہ پہلے انسان ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ادلہ سمعیہ کے اصول کی تعلیم دی، ان سے تکلم فرمایا اور انہیں خطابِ وحی سے اس چیز کی تعلیم دی جسے وہ مجرد عقل کے ساتھ جان نہ سکتے تھے۔

پس لفظ کے کسی معنی پر دلالت، دلالت کے اس واسطے کے ذریعے قائم ہوتی ہے جسے متکلم مراد میں ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ متکلم کے الفاظ سے اس کی متعین مراد اس کے دل میں موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ ابتدائی مرحلہ میں مخاطب اس کی مراد صرف الفاظ سے کبھی بھی سمجھ نہیں سکتا۔ چنانچہ وہ الفاظ کے بغیر معانی کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک اسے پہلے یہ سیکھا و بتا نہ دیا جائے کہ فلاں معانی فلاں الفاظ بول کر مراد لیے جاتے ہیں۔ پس جب وہ الفاظ سے مراد کے اس تصور کو جان لیتا ہے تو جب وہ دوبارہ وہی الفاظ سنتا ہے تو بلا اشارہ مراد معانی کو سمجھ لیتا ہے۔ اور اگر مشار الیہ محسوس باطن ہے، مثلاً بھوک، پیٹ کا سیر ہو جانا، سیرابی، پیاس، غم اور خوشی وغیرہ تو مخاطب ان اشیاء کے اسماء اس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک کہ نفس میں ان کا احساس جلوہ گر نہ ہو۔ جب احساس بیدار ہوگا تو کسی دوسرے کی طرف سے اشارہ ہوگا اور معلوم ہو جائے گا کہ اس کا نام فلاں ہے۔ کبھی اشارہ اپنی بھوک یا پیاس کی طرف ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص مخاطب کو بھوکا محسوس کرتا ہے تو اسے کہتا ہے تم بھوکے ہو؟ تم بھوک محسوس کر رہے ہو؟ تو مخاطب یہ لفظ سنتا ہے اور اشارہ کے ساتھ یا اشارہ کے قائم مقام دیگر ایسے قرائن، جو مراد کا تعین کریں، کی مدد سے حقیقی مراد کو جان لیتا ہے۔ قرائن سے اپنی بات سمجھانے کی مثال بھوک کی حالت میں شیر خوار بچے کا اپنی ماں کی طرف دیکھنا ہے اور اسے اپنی نظر وغیرہ کے زاویہ سے اپنی بھوک کا احساس کرانا ہے جس سے وہ اس کی بھوک کو جان لیتی ہے۔ یا (اشارہ کے ذریعے بات کا سمجھنا کبھی یوں ہوتا ہے کہ) مخاطب لوگوں کو سنتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کی بھوک کو یوں ان الفاظ سے تعبیر کر رہے ہوتے ہیں تو اس سے وہ عین المراد کو معلوم کر لیتا ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا تو اب دیکھیں! جب متکلم (اللہ تعالیٰ) اپنے مخاطب (انسان) کو معانی بتانا چاہتا ہے؛ تو معاملہ دو حال سے خالی نہیں: ۱۔ یا تو مخاطب مستمع ان معانی کا اپنے احساس و مشاہدہ یا عقل کے ذریعے ادراک کرتا ہے۔ ۲۔ یا ایسا نہیں کرتا۔

پہلی دونوعیتوں (یعنی احساسات و مشاہدات) کی صورت میں زبان کی معرفت کی ضرورت نہیں کہ مخاطب اولاً الفاظ مفردہ کے معانی کی معرفت حاصل کرے اور پھر جملہ کی ساخت کو جانے۔ اس کے بعد اگر اسے ارشادات باری تعالیٰ کو سنایا جائے، مثلاً:

﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ (8) وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ (9)﴾ [البلد ۸۔۹]

''کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں۔ اور ایک زبان اور دو ہونٹ''۔

یا پھر اس سے کہا جائے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۷۸)﴾ [النحل]

''اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمھارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیے، تا کہ تم شکر کرو''۔

اس طرح کی دیگر آیات بھی بہت زیادہ ہیں۔ تو مخاطب سنتے ہی وہ چیز سمجھے گا جس کا اس نے اپنے حواس کے ساتھ اس کا ادراک کیا ہوا ہے۔

اور اگر جن معانی سے اسے متعارف کروانا مقصود ہے؛ اگر وہ ایسے ہیں جن کا پہلے اپنے حواس سے ادراک ہو؛ اور نہ ہی اپنی

آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو، اور نہ ہی وہ کوئی ایسا مفہوم تصور (مفہوم کلی) ہو جو ان الفاظ کو متناول ہو؛ حتی کہ وہ ان الفاظ سے مراد کو نہ جان لے۔ بلکہ وہ ایسے امور میں سے ہو جن کا ادراک ظاہری یا باطنی حواس سے نہ ہو سکتا ہو؛ تو ضروری ہے کہ اس کے تعارف میں قیاس و تمثیل اور اعتبار میں تشبیہ و تناسب کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جس سے مخاطب اپنے مشاہدہ کے ذریعے قبل ازیں واقف ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جس قدر تمثیل قوی ہوگی اسی قدر بیان اچھا ہوگا اور فہم کامل تر ہوگا۔

امور غیبیہ کے تعارف کا ممکن طریقہ:

رسول کریم ﷺ نے ہمارے لئے ایسی باتیں بیان فرمائیں جو آپ ﷺ کے بیان سے قبل معروف نہ تھیں، اور نہ ہی اہل عرب کی لغت میں ایسے الفاظ موجود تھے جو کہ حقیقی مراد پر دلالت کی حیثیت رکھتے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایسے الفاظ پیش فرمائے جو اپنی مراد میں آپ ﷺ کی مراد کے مناسب و قریب تھے، پھر انہی الفاظ کو (اصطلاح کا لباس پہنا کر) اپنی مراد کے نام کے طور پر اختیار کر لیا۔ پس ان [اسماء اور مسمیات] کے درمیان ایک قدر مشترک جمع ہوگئی؛ مثلاً صلوٰۃ، زکاۃ، صوم، ایمان، کفر۔

اسی طرح آپ ﷺ نے جب ہمیں ایسے امور کی خبر دی جن کا تعلق ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ تھا اور آپ ﷺ کے خبر دینے سے قبل لوگ ان امور کو جانتے ہی نہ تھے؛ کہ ان کے پاس لغت میں ایسے الفاظ ہوتے، جو ان کی حقیقت پر دلالت کرتے؛ تو آپ ﷺ نے عربی لغت سے ایسے مناسب الفاظ کا انتخاب فرمایا جو معانی غیبیہ اور اُن معانی شہودیہ کے درمیان قدر مشترک پر دلالت کرتے تھے جن سے اہل عرب پہلے سے متعارف تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے کچھ ایسے اشارات اور و دیگر امور بھی ملا دیے جن سے اصل مراد کی حقیقت کا بھی بخوبی علم ہو سکے، جیسا کہ بچوں کو بات یونہی سمجھائی ہے۔ اسی وجہ سے مشہور تابعی ربیعہ بن ابی عبدالرحمن رحمۃ اللہ علیہ [م ۱۳۶ھ] کا قول ہے: ((الناس فی حجور علمائهم کالصبیان فی حجور آبائهم))

"لوگ علماء کی گود میں یوں ہیں جیسے بچے اپنے ماں باپ کی گودوں میں ہوتے ہیں"۔

رسول کریم ﷺ نے جن غیبی امور کی خبر دی ہے وہ یا تو:

(۱) ایسے امور ہوتے ہیں جن کی نظیر کا اپنے حواس اور عقل کے ساتھ ادراک کر سکتے ہیں۔ جیسے آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ تیز آندھی نے قوم عاد کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ تو قوم عاد انہی کی طرح انسان تھے اور آندھی کی جنس کو بھی وہ جانتے تھے اگرچہ وہ آندھی بہت سخت تھی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ان کو فرعون کے سمندر میں غرق ہونے کی خبر دی۔ اور دیگر سابقہ اقوام کے بارے میں بھی بہت سی باتیں بتائیں۔ پس اسی لئے ان اخبار کے بیان میں ہمارے لئے عبرت کا سامان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ [یوسف ۱۱۱]

"بلاشبہ یقیناً ان کے بیان میں عقلوں والوں کے لیے ہمیشہ سے ایک عبرت ہے"۔

اور کبھی یوں بھی ہوتا کہ رسول کریم ﷺ نے جن امور کی خبر دی ان کے مثل کا فی الحقیقت ادراک مکمل موافقت کی صورت میں تمام اعتبارات سے وہ نہیں رکھتے تھے۔ البتہ اس کے مفردات کی ان مفردات کے ساتھ بعض لحاظ سے مشابہت سے وہ واقف تھے۔ جیسے آپ ﷺ نے ان کو بعض ایسے غیبی امور سے مطلع کیا جن کا تعلق ایمان باللہ اور آخرت کے ساتھ تھا، تو ضروری ہوا کہ الفاظ کے ان

مفردات اور اُن مفردات جن کو وہ دنیا میں اپنے محسوسات اور عقل سے جانتے تھے کے درمیان معنوی اشتراک اور مشابہت سے وہ واقف ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں ان معانی سے جن کو انھوں نے ابھی تک دنیاوی امور میں نہیں دیکھا تھا، چاہا کہ وہ اس کا کامل مشاہدہ کریں تا کہ ظاہر اور غائب معنی کے درمیان قدر مشترک کو سمجھ دیکھ سکیں تو آپ ﷺ نے انہیں دنیاوی امور کا مشاہدہ کروایا۔ اور ان کی جانب اشارہ کیا/ رہنمائی کی۔ اور ایسا کام کیا جو ان کے لیے ایک حکایت اور مشابہت کا کام دے۔ اس طریقے سے سامعین نے جان لیا کہ حقائق مشہودہ کی معرفت ہی وہ وسیلہ جس سے وہ غیبی امور کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

مزید وضاحت کے لئے مناسب ہے کہ کلام کے ان تین درجات کو ذہن نشین کیا جائے:

۱) انسان کا مشاہداتی معانی محسوسہ کا ادراک کرنا۔

۲) پھر عقل کے ساتھ ان کلی معانی کو سمجھنا۔

۳) ان الفاظ سے واقف ہونا جو ان حسی اور عقلی معانی پر دلالت کرتے ہوں۔

ہر خطاب میں یہ تین مراتب لازماً پائے ہیں۔ تو جب ہمیں غیر مشاہداتی امور کی خبر دی جائے گی تو بات سمجھنے کے لئے ضروری ہو گا کہ ہم ان غیر مشاہداتی امور کے حقائق میں ما بہ الاشتراک معانی اور مشابہت کی بنیادیں جانیں۔ یہ بات ہمارے امور مشاہدہ کی معرفت سے حاصل ہو گی۔ پھر اگر وہ ایسی چیز ہے کہ اس کی مثل کسی فارق کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی؛ جیسا کہ قصص الانبیاء کے سلسلہ میں گزر چکا۔ لیکن اگر ان [معانی غیبیہ، معانی مشہودہ] کے مماثل نہیں تو اسے فارق کے بیان کے ذریعے واضح کر دیا جائے گا؛ مثلاً یہ کہا جائے کہ یہ دونوں اشیاء سو فیصد مماثل نہیں؛ یا اس طرح کی کوئی بات۔ جب مماثلت کی نفی طے ہو گئی؛ تو محض یہی اضافہ بیان فارق کے لیے کفایت کر جائے گا۔ البتہ مساوات کی نفی کا قطعی طور پر یہ مطلب نہیں ہوتا کہ لفظ مشترک کے مدلولات کے درمیان قدر مشترک کا وجود بھی نہیں۔ کیونکہ اگر معانی غیبیہ اور معانی مشہودہ میں معانی کی کوئی قدر مشترک ہی نہ ہو تو کبھی بھی متکلم (اللہ تعالیٰ) کے اس قسم کے امور کو سمجھنا ممکن ہی نہ رہے۔ [اس طریقہ سے ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ہم بہ آسانی امور غیبیہ کو سمجھ لیتے ہیں]۔

اللہ تعالیٰ سے عاجزی کی نفی:

٣۔ ((وَلَا شَيْءَ يُعْجِزُهُ))

''اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی''۔

اس جملہ میں اللہ تعالیٰ سے اس عاجزی کی نفی ہے جو اس کی کمال قدرت کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر اس کی تصریح کی ہے؛ فرمایا: ﴿اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا﴾[فاطر٤٤]۔ ''اور کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے، حالانکہ وہ قوت میں ان سے زیادہ سخت تھے اور اللہ کبھی ایسا نہیں کہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں کوئی چیز اسے بے بس کر دے، بے شک وہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے''۔ اس کے علاوہ بھی دیگر کئی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے عیب اور نقائص کی نفی ہے۔ جیسے نینداور اونگھ کی نفی؛ عاجزی اور تھکاوٹ کی نفی؛ ظلم اور غفلت کی نفی؛ نسیان اور بھول کی نفی۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر وہ وصف جس کی اللہ تعالیٰ سے نفی کی گئی ہے؛ وہ اپنی ضد کی کمال کے اثبات کو متضمن ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ایسی محض نفی سے موصوف نہیں جو کسی چیز کے اثبات کو متضمن نہ ہو۔ اس لیے کہ نفی محض کوئی مدح نہیں ہے؛ بلکہ مدح تو اس نفی میں ہے جو اس کی ضد کے کمال کے اثبات کو متضمن ہو۔ یہ ایک عمدہ قاعدہ ہے اسے اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا جائے۔[التدمریہ ص٢٠٠؛ مجموع الفتاوی ١٠/٢٥٠؛ جواب أہل العلم والایمان ص١٠٩؛ منہاج السنۃ النبویہ ٢/ ٣١٩۔ درء التعارض ٦/ ١٦٧۔] اس لیے کہ معطلہ نفی محض کے قائل ہیں: کبھی وہ کہتے ہیں: بے شک اللہ تعالیٰ جاہل نہیں ہیں؛ لیکن اس کے اللہ تعالیٰ کے لیے علم کی صفت کو ثابت نہیں مانتے۔ اور کبھی کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ عاجز نہیں ہیں؛ اور پھر وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ جیسا کہ امام عبدالعزیز الکنانی اور بشر المریسی جہمی کے مابین اللہ تعالیٰ کی علم کے بارے میں مشہور مناظرہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔[الحیدۃ ص٣١]

پس قاعدہ یہ ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نفی اور اثبات سے موصوف ہیں؛ اِثبات کمال؛ اور ان نقائص وعیوب اور آفات کی نفی جن سے مخلوق کی مماثلت لازم آتی ہے۔ پس اثبات کمال اپنے اضداد کی نفی کو متضمن ہے۔

تَشْرِیح؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (٢٠)﴾[البقرة]

''بیشک اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قدرت رکھتے ہیں''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا (٤٥) ﴾[الكهف]

''اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا﴾[فاطر]

''اور اللہ تعالیٰ کبھی ایسے نہیں کہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں کوئی چیز انہیں بے بس کر دے، بے شک وہ ہمیشہ سے سب کچھ

جاننے والے، ہر چیز پر پوری طرح قادر ہیں''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (۲۵۵)﴾[البقرہ]

''اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے اور اسے ان دونوں کی حفاظت نہیں تھکاتی اور وہی سب سے بلند، سب سے بڑے ہیں''۔

جملہ ﴿ وَ لَا يَـُٔوْدُهٗ ﴾ کا مطلب ہے: اس کو بوجھل نہیں کر سکتی، اس کو ثقل محسوس نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کو عاجز کر سکتی ہے۔ یہ نفی اس کی ضد کے کمال کے ثبوت کی وجہ سے ہے۔ یہی حال اُن تمام صفات کی نفی کا ہے جن کا ذکر کتاب وسنت ہے۔ کیونکہ ان کے متضاد عالی صفات اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کے لئے پورے کمال کے ساتھ ثابت ہیں۔ اس سلسلہ کی آیات ذیل میں ملاحظہ فرمایئے:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (۴۹)﴾[الکھف]

''اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا''۔

[یہاں پر] ظلم کی نفی اس کے کمال عدل [کے ثبوت] کی وجہ سے ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ ﴾[سباء ۳]

''اس سے ذرہ برابر چیز نہ آسمانوں میں چھپی رہتی ہے اور نہ زمین میں''۔

یہ نفی کمال علم کی وجہ سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴾[ق ۳۸]

''اور ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ نے نہیں چھوا''۔

یہ نفی کمال قدرت کی وجہ سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ﴾[البقرۃ ۲۵۵]

''اسے نہ ہی اونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند''۔

یہ نفی اللہ تعالیٰ کی کمال صفت حیات اور قیومیت کاملہ کی وجہ سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ (الانعام: ۱۰۳)

''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں''۔

یہ نفی اللہ تعالیٰ کے کمالِ جلال، کامل عظمت اور کامل کبریائی کی صفات کی وجہ سے ہے۔ وگرنہ محض نفی میں کوئی قابل تعریف بات ہی نہیں۔ کیا اس حوالے سے آپ شاعر کے قول میں غور نہیں کرتے؛ وہ کہتا ہے:

قبيلة لا يغدّون بذمة   ولا يظلمون الناس حبة خردل

''وہ ایسا قبیلہ ہے جو کبھی بھی عہد شکنی نہیں کرتا اور وہ لوگ کسی پر رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم نہیں کرتے۔''

جب آپ قبیلہ والوں سے عہد شکنی اور ظلم کی نفی کرتے ہوئے اس شعر سے ماقبل اور مابعد اشعار کو بھی ساتھ ملا کر دیکھیں گے اور قبیلہ کی تصغیر بھی آپ کے مدنظر رہے، تو بداہۃً معلوم ہوگا کہ مذکورہ صفات رذیلہ کی نفی سے مراد ان کی کمال قدرت کے بجائے ان کی سطوت، عجز اور ضعف کا بیان ہے۔

اس طرح ایک دوسرے شاعر کے شعر کو ملاحظہ فرمایئے:

لکن قومی وان کانوا ذوی عدد　　　لیسوا من الشرِّ فی شیءٍ وإن هانا

''میری قوم اگر چہ تعداد میں زیادہ ہیں، لیکن وہ شر (جنگ) میں کچھ بھی واقع نہیں ہوتے، اگر چہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔''

جب آپ اس شے کو جو ان کی مذمت پر دلالت کرتی ہے کو ان سے شر کی نفی کے ساتھ ملائیں گے تو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ یہاں محض نفی سے مقصود ان کی خوبی کے بجائے ان کے عجز اور ضعف کا بیان ہے۔

اثبات مفصل اور نفی مجمل میں منہج سلف:

یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ میں صفات باری تعالیٰ کے اثبات کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہے اور نفی مجمل ہے۔ یہ اہل کلام کے مذموم اسلوب کے برعکس ہے۔ بے شک یہ لوگ نفی کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں؛ اور اثبات کو مجمل بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''اللہ پاک جسم، سایہ، جثہ، صورت، گوشت، خون، شخص، جوہر عرض نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ رنگدار، خوشبو والا، قابل اکل چیز، قابل محسوس، حرارت والا، ٹھنڈک والا، رطوبت والا، خشکی والا، لمبا چوڑا، گہرا، اجتماع اور افتراق والا نہیں ہے۔ اسی طرح نہ وہ متحرک ہے، نہ ساکن ہے، نہ اس کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں اور نہ ہی وہ اجزا والا ہے، نہ اس کے جوارح اور اعضاء ہیں، وہ جہات والا نہیں ہے کہ دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے کا اس پر اطلاق ہو سکے۔ کوئی مکان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا، اس پر زمانہ کا اطلاق بھی نہیں ہوتا، اس کو ہاتھ لگانا بھی ممکن نہیں، اس کا نہ تو الگ ہونا ممکن ہے اور نہ ہی کسی مکان میں حلول صحیح ہے۔ وہ مخلوق کی صفات میں سے کسی ایسی صفت کے ساتھ موصوف نہیں جو مخلوقات کی حدوث پر دلالت کرتی ہوں اور نہ ہی متناہی صفت کے ساتھ موصوف ہے۔ اس کی پیمائش نہیں ہو سکتی، نہ ہی جہات میں ہونا ثابت ہے، نہ وہ محدود ہے، نہ وہ کسی کو جننے والا ہے اور نہ ہی وہ خود جنا گیا ہے، اقدار اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور پردے اسے بھی محجوب نہیں کر سکتے، وغیرہ وغیرہ صفات جو امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ [۲۶۰ھ-۳۲۴ھ] نے معتزلہ سے نقل کی ہیں۔

[مقالات الاسلامیین ص ۱۵۵]

اس جملہ میں حق بھی اور باطل بھی۔ کتاب وسنت کی معمولی معرفت رکھنے والا بھی اس کو پہچان سکتا ہے۔ پھر خالص نفی جس میں مدح کا کوئی پہلو ہی موجود نہیں، اس میں اللہ تعالیٰ کے حق میں بے ادبی [کا انداز بھی پایا جاتا] ہے۔ مثلاً آپ کسی بادشاہ سے کہیں کہ عالیجاہ! آپ بھنگی نہیں ہیں، نہ جاروب کش ہیں، نہ آپ حجام ہیں اور نہ بافندہ (یعنی کھالوں کو دباغنے والے)۔ تو اگر چہ آپ اپنی بیان کردہ تعریف میں سچے بھی ہوں تو بھی بادشاہ ایسے بیان پر آپ کو ادب سکھائے گا۔ آپ صحیح مدح کرنے والے تب ہی ٹھہریں گے جب آپ نفی کو مجمل بیان کریں گے۔ مثلاً آپ کہیں: بادشاہ سلامت! آپ اپنی رعیت میں کسی کی مانند نہیں ہیں، آپ سب سے اعلیٰ، اشرف اور جلیل القدر ہیں۔ جب آپ نفی میں اجمالی انداز اختیار کرتے ہیں تو بیان ادب میں بھی جمیل اور خوبصورت اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

حق کی تعبیر اور شرعی الفاظ:

حق کی تعبیر میں شرعی نبوی؛ الٰہی الفاظ استعمال کرنا یہ اہل سنت والجماعت کا منہج ہے۔ معطّلہ شارع کے بیان کردہ اسماء اور صفات سے اعراض کرتے ہیں، معانی پر غور و فکر کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے؛ اور اپنی جانب سے ایجاد کردہ معانی اور الفاظ کو یوں محکم سمجھتے ہیں کہ ان پر اعتماد اور ان کے مطابق اعتقاد واجب ہے۔ جبکہ اہل حق، اہل سنت اور اہل ایمان اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمودات کو حق گردانتے ہیں، جن پر ان کا اعتقاد و اعتماد رکھنا واجب ہوتا ہے۔ اور جو کچھ یہ لوگ (گمراہ فرقے) کہتے ہیں؛ یا تو اس میں مجمل طور پر روگردانی کر لی جائے؛ یا پھر وہ اس کے حال کی تفصیل بیان کریں۔ اور پھر اس پر کتاب و سنت کے مطابق حکم لگایا جائے ہیں۔ کتاب و سنت پر اُن کے اقوال [وافکار] سے حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

مقصود یہ ہے کہ ان متکلمین کے ہاں عقائد کے بیان کا عام انداز سلب و نفی کا ہے کہ ہر شے کو لیس ھکذا لیس ھکذا سے بیان کرتے ہیں، جب کہ اسلوب اثبات نہایت قلیل ہے۔ یعنی وہ صرف اللہ کے عالم، قادر اور حی [زندہ] ہونے کو بیان کرتے ہیں۔ اور پھر نفی کے اسلوب کا اکثر حصہ کتاب و سنت سے ہرگز ماخوذ نہیں؛ اور نہ ہی یہ عقلی طریقہ ہے جس پر ان کے علاوہ مثبتین صفات گامزن ہوئے ہیں؛ بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوری: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

اس ارشاد مبارک میں اثبات صفات کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس میں نفی کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا مراد یہ ہے کہ صفاتِ کمال میں اللہ تعالیٰ کا منفرد ہونا ہے۔ اللہ پاک انہی اوصاف سے موصوف ہے جو اس نے خود اپنی ذات کے لئے اور اس کے رسول ﷺ نے اس کے لئے بیان فرمائے، اللہ تعالیٰ اپنی ذات، اسماء اور صفات و افعال میں بے مثل ہے۔ نیز اس کی ایسی صفات بھی ہیں جن پر مخلوقات کا کوئی فرد بھی مطلع نہیں ہو سکا، جیسا کہ رسول صادق ﷺ نے دعائے کرب میں اس بات کو بیان فرما دیا ہے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ ، سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ ، اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ ، اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ [العظيم] رَبِيْعَ قَلْبِيْ ، وَنُوْرَ صَدْرِيْ وَجَلَآءَ حُزْنِيْ وَذَهَابَ هَمِّيْ غَمِّيْ۔)) [1]

''اے اللہ یقیناً میں آپ میں سے آپ کے ہر اس خاص نام کے ذریعے سے التجا کرتا ہوں جو آپ نے خود اپنا نام رکھا ہے؛ یا پھر اسے اپنی کتاب میں یا نازل فرمایا ہے؛ یا اپنی مخلوق میں سے کسی ایک کو سکھایا ہے؛ یا آپ نے اس کو علم غیب میں اپنے پاس خاص کیا ہے (میں درخواست کرتا ہوں) کہ آپ قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار بنا دیں، میرے سینے کا نور اور میرے غموں کا علاج اور میری پریشانیوں کا تریاق بنا دیں''۔

صفات باری کے متعلق جو ان کا باطل طریقہ کار ہے؛ اس پر تفصیلی تبصرہ آئندہ اوراق میں کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

[ایک شبہ اور اس کا جواب]:

امام طحاوی رحمہ اللہ کے قول: (وَلاَ شَیْءَ یُعْجِزُہُ) میں مذموم نفی کا ذکر نہیں۔ اس لیے کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا﴾[فاطر ۴۴]

''اور اللہ تعالیٰ کبھی ایسے نہیں کہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں کوئی چیز انہیں بے بس کر دے، بے شک وہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والے، ہر چیز پر پوری طرح قادر ہیں''۔

اس آیت کے آخر میں خود باری تعالیٰ نے عجز کی نفی پر تنبیہ فرما دی ہے، یہی تو کمال علم اور کمال قدرت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عجز یا تو فاعل کے ایک فعل کے قیام پر ضعف کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے؛ یا پھر اس چیز سے متعلق علم نہ ہونے کی وجہ سے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی ذرہ بھی اوجھل نہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ المختصر عقل و فطرت نے ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ کی کمالِ قدرت اور کمال علم کو جان لیا ہے۔ چنانچہ عجز کے از خود نفی ہوگئی کیونکہ قدرت اور عجز میں بدیہی طور پر تضاد ہے، اور اس کی وجہ سے بھی کہ عاجز معبود بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

تعالیٰ اللہ عن ذکر ذلك علوا کبیرا۔

❶۔أحمد (۱/ ٤٢٥)۔(الصحیحة ١٩٨) صحیح۔ وإن أعله الذهبی بجهالة أبی سلمة وتبعته علیه برهة من الزمن فقد تبیین لی فیما بعد أن أبا سلمة هذا ثقة معروف؛ و إن إسناده متصل صحیح۔

کلمہ توحید اور اس کے متضمنات

٤۔ ((وَلاَ إِلَهَ غَيْرُهُ))

''اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں''۔

تَشْرِیح: یہ وہ کلمہ توحید ہے جس کی طرف تمام رسولوں نے دعوت دی، جیسا کہ پہلے بھی گذر چکا ہے۔ اس کلمہ میں توحید کا اثبات نفی و اثبات دونوں طریق سے حصر کا تقاضہ کرتا ہے کیونکہ صرف اثبات کے ذکر میں احتمال کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ غالبًا یہی وہ سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾(البقرہ ١٦٣)

''اور تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے''۔

تو اس کے متصل بعد ساتھ ہی فرما دیا:

﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾(البقرہ ١٦٣)

''اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے''۔

اس لیے کہ کبھی کسی آدمی کے ذہن میں یہ شیطانی خیال بھی آ سکتا تھا کہ چلو! ہمارا معبود تو ایک ہی ہے، لیکن ہمارے علاوہ لوگوں کے لئے اور معبودوں کی گنجائش باقی ہے۔ چنانچہ نفی اثبات کا جملہ بطور حصر ذکر کرتے ہوئے فرما دیا:

﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾(البقرہ ١٦٣)

''اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے''۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهَ کی نحوی ترکیب

''المنتخب'' کے مؤلف نے نحویوں پر لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهَ کی تقدیرِ خبر کے سلسلہ میں لَآ اِلٰـهَ 'فی الوجود' اِلَّا اللّٰـهَ نکالنے پر اعتراض کیا ہے کہ: ''اس ترکیب سے صرف اللہ تعالیٰ کے ماسوا موجودات کی نفی ہوتی ہے۔ جبکہ یہ تو معلوم شدہ ہے کہ توحید کے بیان میں ماہیت کی نفی وجود کی نفی سے زیادہ قوی ہوتی ہے''۔ چنانچہ کلام کو اس کے ظاہر پر چھوڑ دینا اور مقدر عبارت نکالنے سے اعراض کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

تو مشہور امام ابوعبداللہ بن ابوالفضل مرسی رحمۃ اللہ علیہ [٥٧٠ھ-٦٧٧ھ] نے اپنی تفسیر ''ری الظمان'' میں اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے: ''یہ کلام ایسے شخص کا ہو سکتا ہے جو عربی زبان کے قواعد سے نابلد ہو، کیونکہ ''الـہ'' سیبویہ کے قول کے مطابق تو محل

ابتداء میں ہے؛ اور دیگر نحویوں کے نزدیک ''لا'' کا اسم ہے۔ پس دونوں صورتوں میں مبتداء کی خبر کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ تقدیر خبر سے استغنا کے حوالے سے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل فاسد ہے۔

باقی رہا یہ کہنا کہ: ''مقدر نہ ماننے کی صورت میں جملہ ماہیت کی نفی کو بھی شامل ہو جائے گا'' اس کی کوئی حقیقت نہیں؛ اس لئے کہ ماہیت کی نفی اصل میں وجود کی ہی نفی ہوگی۔ کیونکہ ماہیت کا تو کسی وجود کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ المختصر ماہیت کی نفی اور وجود کی نفی میں کوئی فرق نہیں۔ یہ معتزلہ کے برعکس اہل سنت والجماعت کا موقف ہے۔ کیونکہ وہ وجود سے خالی ماہیت کو ثابت مانتے ہیں۔''

پھر علامہ مرسی رحمہ اللہ اِلَّا اللّٰہَ کے وجہ اعراب کے ضمن میں مزید فرماتے ہیں کہ: ''اِلَّا اللّٰہَ، لَآ اِلٰہَ سے بدل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ مبتدا یا لا کی خبر ہونے کے سبب سے نہیں۔ پھر اس بات پر امام موصوف نے دلیل بھی ذکر کی ہے۔

یہاں پر مراد کلمہ طیبہ کا اعراب بتانا نہیں؛ بلکہ نحویوں پر اس سلسلہ میں واردشدہ اشکال کو رفع کرنا ہے اور یہ واضح کرنا ہے کہ نحویوں کے ذہن میں یہ بات معتزلہ کی طرف سے آئی ہے؛ جو کہ فاسد ہے۔ بیشک معتزلہ کا ''فی الوجود'' کہنا؛ شرط کے طور پر نہیں؛ اس لیے کہ عدم کی کوئی حقیقت نہیں۔ [معتزلہ کی یہ بات بالکل فاسد ہے]۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔا ﴾ (مریم ۹)

''اور یقیناً میں نے تجھے اس سے پہلے پیدا کیا جب کہ تو کوئی شے بھی نہ تھا''۔

اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا قول غیرہ [عبارت میں] لفظ اِلَّا اللّٰہَ کی طرح نہیں۔ کیونکہ قواعد لغت میں لفظ غیر کو وہی اعراب دیا جاتا ہے جو اِلَّا کے بعد واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ خبر دونوں طرح کے کلاموں میں ایک ہی انداز میں مقدر ہے۔ انہی احتمالات کے رفع کرنے کے لئے میں نے یہ اشکالات ذکر کر کے پھر ان کے جوابات نقل کر دئے ہیں [1]۔

---

[1] ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی صحیح اور سلفی تعریف: علامہ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (علامہ عبداللہ مرسی رحمہ اللہ نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی ترکیب نحوی کے ضمن میں تقدیر خبر فی الوجود نکالنے کے حوالے سے جو کچھ کہا ہے وہ بھی بقول شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کے ارشاد کے مطابق اہل سنت کا موقف نہیں، بلکہ وحدۃ الوجود کے حاملین صوفیاء کی رائے ہے۔ اور پھر یہ پہلو بھی قابل توجہ رہے کہ قرآن کریم صراحتاً اللہ کے علاوہ کثیر الہ [معبودوں] کے موجودگی کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ ارشادات ذیل ملاحظہ فرمائیں: ﴿فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً﴾ ''پھر ان لوگوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جنھیں انھوں نے قرب حاصل کرنے کے لیے اللہ کے سوا معبود بنایا؟''۔

قواعد لغت کی خدمت زیادہ تر چونکہ معتزلہ نے کی ہے اس لئے یہ بات بالکل نظر انداز کر دی گئی ہے کہ شریعت میں اُن مقامات میں، جہاں بسا اوقات خبر محذوف ہوتی ہے، عام نحات جن افعال عامہ کو مقدر مانتے ہیں ان میں لفظ 'حق' اور لفظ 'باطل' کے شرعی فعل عام کو بالکل بھول جاتے ہیں جو کہ مباحثِ شریعت کی ایک ایک جز میں زیر بحث ہوتا ہے۔ چنانچہ تقدیر خبر اسلاف کے صحیح قول پر لَآ اِلٰہَ موجود بحق اِلَّا اللّٰہُ یا لَآ اِلٰہَ حق اِلَّا اللّٰہُ ہے، جس سے اور آلہ [معبودوں] کے وجود کا تو اثبات ہوگا البتہ الہ حق کے بارے میں ثابت ہو جائے گا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے ہیں۔ قرآن کریم کا مدعا بھی اس سلسلہ میں یہی ہے کہ مشرکین مکہ نے بے شمار باطل معبود گھڑ رکھے تھے، تو اس پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے ان باطل معبودوں کے رد و بطلان کی غرض سے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ﴾ ''یہ اس لیے کہ بے شک اللہ ہی ہے جو حق ہے اور (اس لیے) کہ بے شک اس کے سوا وہ جسے بھی پکارتے ہیں وہی باطل ہے''۔ یہاں باطل معبودوں کے وجود کا انکار مطلوب بحث نہیں، بلکہ ان کا معبودان باطل ہونا اور اللہ تعالیٰ کا الہ حق ہونا مقصود خطاب ہے۔

صفت ''القِدَمُ'' اور ''البَقَاءُ'' کا بیان

۵۔ ((قَدِیْمٌ بِلاَ ابْتِدَاءٍ ❶ ، دَائِمٌ بِلَا انْتِهَاءٍ ❷))۔

''وہ قدیم ہے بغیر ابتداء کے اور دائم ہے بغیر کسی انتہاء کے''۔

تشریح: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ ﴾ (الحدید ۳۰)

''وہی سب سے پہلے ہے اور سب سے پیچھے ہے''۔

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَّاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ))[مسلم: 2713]

''اے اللہ! تو ہی اوّل ہے، پس نہیں تجھ سے پہلے کوئی چیز، اور تو ہی آخر ہے پس تیرے بعد کوئی چیز نہیں''۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول (قَدِیْمٌ بِلاَ ابْتِدَاءٍ ، دَائِمٌ بِلَا انْتِهَاءٍ) اللہ تعالیٰ کے اسماء اول و آخر کے معنی میں ہے۔

مزید برآں ان دونوں صفات کا ثبوت فطرت میں بھی ثابت شدہ ہے۔ کیونکہ موجودات (یعنی ممکن الوجود اشیاء) لازماً واجب

---

❶ ۔مصنف رحمہ اللہ کا فرمان: (قَدِیْمٌ بِلاَ ابْتِدَاء) ''قدیم'' اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں وارد نہیں ہوا۔ جیسا کہ شارح رحمہ اللہ اور دیگر حضرات نے اس جانب توجہ دلائی ہے۔ اس کا ذکر بہت سارے علماء علم کلام نے کیا ہے تاکہ وہ ہر چیز سے پہلے اللہ تعالیٰ کا وجود ثابت کر سکیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی توقیفی ہیں؛ کتاب اللہ اور صحیح سنت رسول اللہ ﷺ کی نصوص کے بغیر کوئی بھی نام ثابت نہیں کیا جاسکتا؛ اور نہ ہی اپنے رائے کو دخل دیکر کوئی چیز ثابت کی جاسکتی ہی۔ جیسا کہ ائمہ سلف صالحین رحمہ اللہ سے اس بارے میں نصوص موجود ہیں۔ اور لفظ قدیم ان معانی پر دلالت بھی نہیں کرتا جو اصحاب علم کلام مراد لینا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ صحیح عربی زبان میں قدیم کا مطلب ہے جسے دوسرے پر سبقت حاصل ہو۔ بھلے اس سے پہلے وہ معدوم ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ﴾ (یٰس: ۳۹) ''یہاں تک کہ گھٹ کر کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔'' بیشک اس حق پر مصنف رحمہ اللہ کا اگلا جملہ دلالت کرتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں: (قَدِیْمٌ بِلاَ ابْتِدَاء) لیکن یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کو بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں شمار کیا جائے؛ اس لیے کہ نصوص میں اس کا کوئی ثبوت نہی پایا جاتا۔ اور اللہ تعالیٰ کے صحیح نام ''الاول'' کو چھوڑ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ﴾ (الحدید ۳۰) ''وہی سب سے پہلے ہے''۔ [واللہ الموفق؛ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والے ہیں]۔

❷ ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جان لیجیے کہ قدیم اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں سے کوئی نام نہیں۔ متکلمین اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ عرب لغت جس میں قرآن نازل ہوا ہے؛ اس میں قدیم کا معنی دوسرے پر متقدم کا ہوتا ہے۔ تو کہا جاتا ہے: ھذا قدیم: پرانے کے لیے۔ و ھذا جدید اور نئے کے لیے۔ اس اسم کا استعمال صرف اس کے لیے کیا گیا ہے جو دوسرے پر مقدم ہو؛ اس میں اس کا استعمال نہیں ہوتا؛ جس سے پہلے کوئی عدم نہ تھا۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ﴾۔ یعنی کہا گیا ہے کہ عرجون قدیم پرانی شاخ کو اس وقت پرانی شاخ کہا جائے گا جب نئی شاخ نکل آئے اور اس کے نکلنے کے وقت اس کا وجود ہو تو نئی شاخ کو جدید اور پرانی کو قدیم کہا جائے گا۔ پس جب نیا وجود آ گیا تو اول قدیم بن گیا اور بعد والا جدید بن گیا اور اس کی تفصیل دوسرے مقام پر ہے۔ حققہ شیخ الاسلام ابن تیمیه فی مجموع الفتاوی ۱ / ۲٤۵؛ الشارح فی " شرحه". لیکن ابن مانع رحمہ اللہ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ''البدائع'' سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی صفت قدیم بیان کرنا ان معانی میں جائز ہے کہ وہ اس کے متعلق خبر دیتا ہے۔ اور خبر دینے کا باب صفات توقیفیہ کے باب کی نسبت بڑا وسیع ہے۔

الوجود ذات کی طرف منتہی ہوں گی، تاکہ تسلسل لازم نہ آئے۔ چنانچہ ہم حیوانات، نباتات، جمادات اور فضا میں نمودار ہونے والے دیگر حوادث مثلاً بادل، بارش وغیرہ کا دن رات مشاہدہ کرتے ہیں، یہ تمام اور دیگر حوادث ممتنع الوجود نہیں۔ کیونکہ ممتنع شے کا وجود ہی نہیں ہوتا، اور نہ ہی یہ اشیاء بذات خود واجب الوجود ہیں۔ کیوں کہ بذات خود واجب الوجود کو کبھی بھی عدم لاحق نہیں ہوسکتا۔ جبکہ یہ تمام اشیاء پہلے معدوم تھیں، پھر وجود میں آئیں۔ چنانچہ ان اشیاء کے معدوم ہونے کا وصف نے ان کے واجب الوجود ہونے کی نفی کرتا ہے۔ اور ان کے موجود ہونے نے ان کے ممتنع الوجود ہونے کی نفی کر دی۔ المختصر جو چیز [کسی زمانے میں] عدم کو اور پھر [دوسرے زمانہ میں] وجود کو قبول کرتی ہو وہ واجب الوجود نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ﴾ (الطور ۳۵)

''یا وہ کسی چیز کے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں، یا وہ (خود) پیدا کرنے والے ہیں؟''۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ بلا کسی وجود بخشنے والے کے از خود وجود میں آ گئے یا انہوں نے اپنے آپ کو خود وجود بخشا ہے؟ اور جواب بالکل واضح ہے کہ (مُـحْـدَث) مخلوق خود کو آپ ہی وجود میں نہیں لاسکتی۔ چنانچہ ایسا ممکن جس کا نہ ہی بذات خود کوئی وجود ہے؛ اور نہ ہی وہ معدوم ہے؛ وہ بذات خود موجود نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کا وجود کسی موجد [خالق] کا رہین منت ہے۔ وگرنہ وہ معدوم ہی رہے گا۔ المختصر ہر وہ چیز جس کا عدم سے وجود میں آنا ممکن ہو؛ اور وجود سے عدم میں تبدیل ہونا ممکن ہو؛ تو نہ اس کا وجود ذاتی ہوگا اور نہ اس کا عدم ذاتی طور پر اس کے لیے لازم ہوگا۔

[متکلمین کا طریقہ اور درست قرآنی اسلوب]:

[متکلمین کے طریقہ میں جو بھی حق اور درستی ہے؛ اس کا اعادہ قرآنی استدلال کی طرف ہوتا ہے۔]

جب بھی ایک باشعور اور قابل آدمی اُن عقلی و شعوری دلائل پر اچھی طرح غور کرے گا جو متکلمین اور فلاسفہ مختلف امور کے ضمن میں پیش کرتے ہیں تو ان میں موجود درست نتائج کے متعلق اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ قرآن کریم میں مذکور اُن عقلی و شعوری دلائل کی طرف ہی راجع ہیں جو نہایت فصیح عبارت اور مختصر ترین انداز میں اللہ تعالیٰ نے پہلے بیان کر دیے تھے۔ بلکہ قرآن کریم میں دلیل و مدلول کے سلسلہ میں جس قدر بیان و تحقیق کی پختگی ہوتی ہے اس قدر ان متکلمین کے کلام میں کبھی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا﴾ (الفرقان ۳۳)

''اور وہ تیرے پاس کوئی مثال نہیں لاتے مگر ہم تیرے پاس حق اور بہترین تفسیر بھیج دیتے ہیں''۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ مخفی و نظری مقدمات اور طویل عقلی دلائل میں استدلال کے اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ خفاء وظہور مختلف نسبتوں کے حوالے سے مفید یا نقصان دہ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ بسا اوقات کبھی کسی ایک شخص کے اعتبار سے مخفی دلیل دوسرے شخص کے اعتبار سے بالکل جلی ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح بعض لوگ عقلی مقدمات کو تسلیم کر لیتے ہیں چاہے وہ مخفی ہی ہوں، لیکن ان کے مقابل دوسرے جلی تر مقدمات کے تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح کبھی لوگ بحث و نظر کے بعد حاصل ہونے والے ظنی معلومات سے اتنی خوشی محسوس کرتے ہیں کہ حواس ظاہرہ سے حاصل شدہ قطعی معلومات پر اتنی خوشی محسوس نہیں کرتے۔ المختصر اگرچہ اثبات

خالق اور وجود باری تعالیٰ کے وجوب کا علم بلا ریب وشک بدیہی اور مکمل طور پر فطری امر ہے، تاہم بعض لوگوں کو کچھ ایسے شبہات پیش آ جاتے ہیں جو انہیں عقلی اور منطقی دلائل کی طرف نکلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

کیا ''القدیم'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے؟

متکلمین نے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ''القدیم'' کو بھی داخل کیا ہے، حالانکہ اسمائے حسنیٰ میں یہ نام کہیں مذکور نہیں۔ اس لیے کہ لغت عرب، جس میں قرآن کریم نازل ہوا، اس میں قدیم کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جو اپنے غیر پر متقدم ہو۔ چنانچہ پرانی چیز کو قدیم اور اس کے بالمقابل نئی چیز کو حدیث کہا جاتا ہے۔ اہل عرب اس لفظ کو صرف اس پس منظر میں استعمال کرتے ہیں کہ وہ شے جو کسی دوسری شے کے وجود پر متقدم ہو وہ قدیم ہے۔ یہی وجہ ہے اس کا اطلاق ایسی ذات (یعنی اللہ تعالیٰ) پر نہیں ہوسکتا جس پر کبھی عدم طاری نہیں ہوا[1]۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ﴾ (یس : ۳۹)

''یہاں تک کہ گھٹ کر کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہوجاتا ہے۔''

پرانی شاخ کو اس وقت پرانی شاخ کہا جائے گا جب نئی شاخ نکل آئے اور اس کے نکلنے کے وقت اس کا وجود ہو تو نئی شاخ کو جدید اور پرانی کو قدیم کہا جائے گا۔ ارشاد ربانی ہے:

[1] ۔جان لیجیے کہ قدیم اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں سے کوئی نام نہیں۔ متکلمین اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ عرب لغت جس میں قرآن نازل ہوا ہے؛ اس میں قدیم کا معنی دوسرے پر متقدم کا ہوتا ہے۔ تو کہا جاتا ہے: هذا قديم: پرانے کے لیے۔ وهذا جديد اور نئے کے لیے۔ اس اسم کا استعمال صرف اس کے لیے کیا گیا ہے جو دوسرے پر مقدم ہو؛ اس میں اس کا استعمال نہیں ہوتا؛ جس سے پہلے کوئی عدم نہ تھا۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ﴾۔ یعنی کہا گیا ہے کہ عرجون قدیم پرانی شاخ کو اس وقت پرانی شاخ کہا جائے گا جب نئی شاخ نکل آئے اور اس کے نکلنے کے وقت اس کا وجود ہو تو نئی شاخ کو جدید اور پرانی کو قدیم کہا جائے گا۔ پس جب نیا وجود آ گیا تو اول قدیم بن گیا اور بعد والا جدید بن گیا اور اس کی تفصیل دوسرے مقام پر ہے۔ حققه شيخ الاسلام ابن تيميه في مجموع الفتاوى ۱/ ۲٤٥؛ الشارح في "شرحه"۔ لیکن ابن مانع رحمہ اللہ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ''البدائع'' سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی صفت قدیم بیان کرنا ان معانی میں جائز ہے کہ وہ اس کے متعلق خبر دیتا ہے۔ اور خبر دینے کا باب صفات توقیفیہ کے باب کی نسبت بڑا وسیع ہے۔
میں کہتا ہوں: شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی کبھی یہ وصف استعمال کرتے ہیں۔ شاید اس کی یہی وجہ ہے۔

﴿وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ﴾ (الاحقاف : ۱۱)

''اور جب وہ اس سے ہدایت یاب نہ ہوئے، تو اب کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے۔''

یعنی اسے زمانے کے اعتبار سے تقدیم حاصل ہے۔ نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ﴾ (الشعراء: ۷۵، ۷۶)

''(ابراہیم علیہ السلام نے) کہا کیا تم نے دیکھا جن کو تم پوجتے رہے ہو، تم بھی اور تمھارے باپ دادا بھی۔''

اس آیت میں اقدم [قدیم سے] مبالغہ کا صیغہ ہے چنانچہ فقہ کی کتابوں میں عام طور پر ذکر آتا ہے کہ یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ کا قدیم ہے اور یہ جدید ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَأَوْرَدَهُمُ النَّارَ﴾ (هود: ۹۸)

''وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا اوران کو دوزخ میں جا اتارے گا۔''

خیال رہے کہ (قدیم) لازم استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے:

"أَخذتُ ما قدم وما حدث."

''یعنی میں نے قدیم، جدید دونوں کو حاصل کیا۔''

اور متعدی بھی استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے:

"هٰذَا قدم هٰذا وهو يقدمه."

''یہ اس سے پہلے تھا؛ وہ اس سے آگے بڑھا ہوا ہے۔''

اسی سے قدم کو قدم کہتے ہیں اس لیے کہ وہ انسان کے باقی بدن سے آگے ہوتا ہے۔قدیم کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر کرنا؛ اکثر متکلمین کے ہاں بڑا مشہور رہے؛ اکثر سلف صالحین اس کا انکار کرتے ہیں۔علامہ ابن حزم رحمہ اللہ بھی ان میں داخل ہیں۔اوراس میں کوئی شک نہیں کہ جب اس کا استعمال متقدم کے لیے ہوتا ہے تو یہ حوادث کے مقابلہ میں آتا ہے۔اوراس میں کوئی شک نہیں کہ جسے تمام حوادث پر تقدم حاصل ہو؛ وہی دوسروں سے تقدم کا زیادہ حق دار ہے۔لیکن اسماء الٰہیہ اسماء حسنیٰ ہیں؛ جو خاص طور پر مدح وتوصیف کے کے پہلو پر دلالت کرتے ہیں؛ جب کہ تقدم لغت میں مطلق ہے؛ یہ تمام حوادث پر تقدم کے ساتھ خاص نہیں۔لہٰذا اس نام کو اسماء حسنیٰ میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔شریعت میں اس کی جگہ پر اللہ کا نام اول ہے اور اول بہر حال قدیم سے زیادہ بہتر اور عمدہ ہے۔اس لیے کہ یہ نام یہ شعور دیتا ہے کہ اس کے بعد جتنے بھی آنے والے ہیں؛ وہ اس کے تابع اور اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں؛ بخلاف قدیم کے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کے ناموں میں حسن مبالغہ کی حد تک ہے؛ [یعنی سب سے اچھے اسماء ہیں] صرف حسن درجہ کے ہی نہیں۔

ذات باری تعالیٰ کی ابدیت:

٦. ((لاَ يَفْنِى وَلاَ يَبِيْدُ))۔

''وہ نہ فنا ہوگا اور نہ ہی ختم ہوگا''۔

تَشْرِيح:......اس میں اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ باقی رہنے کا اقرار ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ○﴾ (الرحمن: ٢٦،٢٧)

''جو بھی زمین پر ہے اس کو فنا ہونا ہے اور تمھارا رب جو صاحب جلال وعظمت ہے ہی باقی رہے گا۔''

فنا ہو جانا اور ہلاک ہو جانا دونوں مترادف المعنیٰ ہیں اور دونوں کو اکٹھا ذکر کرنے سے تاکید مقصود ہے اور قبل ازیں جو وصف بیان ہوئی ہے کہ اللہ کی ذات دائم ہے اس کی انتہا نہیں اس کی تائید میں یہ وصف ذکر کی گئی ہے۔

ارادہ الٰہی کا اثبات اور اہل سنت کا عقیدہ:

۷۔ ((وَلَا یَکُوْنُ اِلَّا مَا یُرِیْدُ))❶۔

''اور کچھ بھی نہیں ہوتا مگر جس کا وہ ارادہ کرتا ہے''۔

❶۔ بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہیں وہی کرتے ہیں؛ کوئی ان کو روک نہیں سکتا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ﴾(النحل ۴۰) ''ہمارا کہنا کسی چیز کو، جب ہم اس کا ارادہ کرلیں، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ ہم اسے کہتے ہیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے''۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ o فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ o﴾(البروج: ۱۵،۱۶) ''عرش کا مالک بڑی شان والا ہے جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔'' پس کائنات کی جو بھی چیز ہے اس کا وجود اور اس کی حرکات و افعال اللہ تعالیٰ کے علم و ارادہ سے ہو رہے ہیں۔ ارادہ الٰہی کی اقسام کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

تَشْرِیح:.......اس میں قدریہ اور معتزلہ کے عقیدہ کا رد ہے۔ بے شک وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تو تمام لوگوں سے ایمان کا ارادہ کیا تھا؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے خلاف کفار نے کفر کا ارادہ کیا ان کا یہ قول کتاب و سنت اور عقل صحیح کے خلاف ہے دراصل یہ تقدیر کا مشہور مسئلہ ہے آئندہ اوراق میں اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

قدریہ کی وجہ تسمیہ :ان کا نام قدریہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ تقدیر کا انکار کرتے ہیں اسی طرح جبریہ جو تقدیر کے ساتھ حجت پکڑتے ہیں ان کو بھی قدریہ کہا جاتا ہے لیکن قدریہ کا یہ اطلاق پہلے فریق پر اکثر ہوتا ہے۔

اہل سنت کا تقدیر کے بارے میں موقف:

بے شک اللہ تعالیٰ تقدیر کے لحاظ سے تو گناہ کا ارادہ کرتا ہے؛ لیکن نہ تو وہ گناہ کو اچھا جانتا ہے نہ ہی اسے پسند کرتا ہے اور نہ ہی ان کا حکم دیتا ہے۔ بلکہ وہ ان کو مکروہ جانتا ہے ان پر ناراض ہوتا ہے؛ ان کو برا جانتا ہے اور ان سے روکتا ہے۔ چنانچہ تمام اسلاف اس عقیدہ پر متفق ہیں اور برملا اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے اور جو کچھ وہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ قسم کھانے والا اگر کہتا ہے کہ اللہ کی قسم اگر اللہ نے چاہا تو فلاں کام کروں گا؛ تو اگر اس نے وہ کام نہ کیا تو وہ قسم توڑنے والا نہ ہوگا؛ بھلے وہ کام واجب یا مستحب ہی کیوں نہ ہو''۔[ابو داؤد ۳۲۶۱]

اور اگر اس نے کہا: اگر اللہ نے اس کو پسند کیا؛ تو اگر وہ فعل واجب یا مستحب ہے تو قسم توڑنے والا ہو جائے گا۔

ارادہ کی اقسام:

محققین اہل سنت کہتے ہیں: ''کتاب اللہ میں ارادہ کی دو قسمیں ہیں:

قسم اول: اِرَادَةٌ کُونِیَةٌ قَدْرِیَةٌ خَلْقِیَةٌ (یعنی اللہ کی وہ مشیت جو تخلیق، تقدیر اور تکوین سے تعلق رکھتی ہو)

قسم دوم: اِرَادَةٌ دِیْنِیَّةٌ امرِیَّةٌ شَرْعِیَّةٌ۔ (یعنی اللہ کا وہ ارادہ جو دین و شریعت میں حکم کے ضمن میں وارد ہو)

چنانچہ ارادہ شرعیہ اس کی محبت اور رضا کو شامل ہے اور ارادہ کونیہ اس مشئیت کا نام ہے جو تمام موجودات کو شامل ہے [1]۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے وہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔''

[1] ۔ ارادہء کونیہ قدریہ: کائنات میں ہونے والی ہر ایک چیز کے لیے عام ہے؛ کوئی چیز اس سے باہر نہیں ہوسکتی۔ یہ ہر اس چیز کو شامل جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہوں یا ناپسند کرتے ہوں۔ پس مؤمن کا ایمان لانا اور نیک اعمال کرنا؛ اور کافر کا کفر اور اس کی نافرمانی سب اس ارادہ کے تحت ہوتے ہیں۔ جبکہ ارادہ شرعیہ صرف ان امور کے ساتھ خاص ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں۔ پس اس اعتبار سے ارادہ کونیہ عام ہے جب کہ ارادہ شرعیہ خاص ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ: کبھی بھی ارادہ کونیہ کے خلاف نہیں ہوسکتا؛ جب کہ ارادہ شرعیہ سے مقصود کا واقع ہونا لازم نہیں آتا۔ یہ دونوں قسم کے ارادے مؤمن کے ایمان لانے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ پس مؤمن کا ایمان لانا اللہ تعالیٰ کا کونی ارادہ بھی ہوتا ہے اور شرعی ارادہ بھی۔ جبکہ ارادہ کونیہ کافر کے کفر اور اس کی معصیت میں منفرد ہے۔ اگر چہ یہ چیز بھی ارادہ کونیہ سے مراد و مطلوب ہے؛ مگر شرعاً نہ ہی مطلوب ہے نہ ہی مراد: بلکہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکروہ اور ناپسندیدہ ہے۔ اور ارادہ شرعیہ: کافر کے ایمان نہ لانے میں منفرد ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادہ شرعی کے تحت ابوجہل کو بھی ایمان لانے کا حکم دیا تھا؛ مگر وہ ایمان نہیں لایا۔ ارادہ شرعیہ کو اللہ تعالیٰ کی مشئیت / چاہت سے موصوف نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ہم یوں نہیں کہہ سکتے کہ اللہ تعالیٰ تو ابوجہل سے بھی ایمان ہی چاہتے تھے۔ مگر ہم یوں کہیں گے: اللہ تعالیٰ کو ابوجہل سے بھی ایمان مطلوب تھا؛ ارادہ شرعی کے تحت؛ اور اس کا حکم بھی دیا تھا؛ مگر وہ ایمان نہ لایا۔

نیز فرماتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام نے کہا:

﴿وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ﴾ (هود: ۳۴)

''اور اگر میں تمھاری خیر خواہی کرنا چاہوں اور اللہ یہ چاہے کہ تمھیں گمراہ کرے تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہ دے گی۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾ (البقره: ۲۵۳)

''لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

لیکن ارادہ شرعیہ امریہ ہوتا ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقره: ۱۸۵)

''اللہ تمھیں آسانی میں رکھنا چاہتا ہے، تمھیں تنگی میں نہیں رکھنا چاہتا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ○ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ○﴾ (النساء: ۲۶-۲۸)

''اللہ چاہتا ہے کہ (اپنی آیتیں) تم سے کھول کھول کر بیان فرمائے اور تم کو اگلے لوگوں کے طریقے بتائے اور تم پر مہربانی کرے

اور اللہ علم وحکمت والا ہے۔ اور اللہ تو چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی کرے اور جو لوگ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے رستے سے بھٹک کر دور جا پڑو، اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان (طبعًا) کمزور پیدا ہوا ہے۔''

اور ارشاد فرمایا:

﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ﴾ (المائدہ: ۶)

''اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ (الاحزاب: ۳۳)

''اے اہل بیت اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی دور کردے اور تمھیں بالکل پاک وصاف کردے۔''

ان آیات میں جس ارادہ کا ذکر کیا گیا ہے یہ وہ ارادہ ہے جو لوگ برے کام کرتے ہیں؛ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے کام کر رہے ہیں جن کا اللہ ارادہ نہیں کرتا یعنی اللہ تعالیٰ کو نہ پسند کرتا ہے اور نہ اس کا حکم دیتا ہے۔ اور ارادہ کونیہ وہ ارادہ ہے جس کا ذکر مسلمانوں کے اس قول میں ہے کہ: ''جو کچھ اللہ چاہتا ہے ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا''۔

دونوں ارادوں میں فرق:

اس میں فرق یہ ہے کہ کوئی کا ارادہ کرنے والا خود کوئی کام کرنا چاہتا ہو؛ یا پھر وہ اپنے غیر سے کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرے۔ جب فاعل خود کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو یہ ارادہ اس کے فعل کے ساتھ متعلق ہے اور جب وہ اپنے غیر سے کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس ارادہ کا تعلق غیر کے فعل کے ساتھ ہے۔ دونوں صورتوں سے لوگ آشنا ہیں، لیکن دوسری صورت میں ارادہ ثانیہ ضروری ہے جب کہ پہلی صورت میں ارادہ ثانیہ کی ضرورت نہیں ہے۔

پس اللہ تعالیٰ جب بندوں کو کسی کام کا حکم دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کبھی مامور انسان کی اعانت کرتا ہے اور کبھی وہ ایسا نہیں کرتا۔ اگرچہ وہ اس سے اس کام کے کرنے کا ارادہ ضرور کرتا ہے۔ اس تحقیق سے اللہ کے امر [حکم] میں پایا جانے والا اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔

کیا اللہ کا امر اس کے ارادہ کا مستلزم ہے؟

اس معاملہ میں اختلاف یہ ہے کہ کیا اللہ کا حکم اس کے ارادہ کو مستلزم ہے یا نہیں؟ [منہاج السنہ ۳/۱۵]

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی زبانی مخلوق کو ان چیزوں کا حکم دیا ہے جو ان کے لیے مفید ہیں اور ان امور سے روک دیا ہے جو ان کے لیے ضرر رساں ہیں۔ البتہ کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ان کے کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ارادہ کیا کہ ان میں ان کاموں کے فعل کو پیدا کردے۔ اور انسان کو اس کا فاعل بنائے۔ اور بعض انسانوں میں ان کے فعل کو پیدا نہ کرنے کا ارادہ فرمایا۔ پس اللہ کے بندوں کے افعال اور دیگر مخلوقات کا پیدا ہونے کی جہت وہ جہت نہیں جس میں وہ بندے کو بطور بیان کے ان کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم

دیتا ہے۔جس میں بندوں کی مصلحت یا خرابی ہوتی ہے۔مثلاً: اللہ تعالیٰ نے جب فرعون اور ابولہب وغیرہ کفار کو ایمان لانے کا حکم دیا تو ان کے سامنے مصلحتوں کو کھول کر بیان کیا؛ اور فوائد سے روشناس کرایا؛ جو ایمان لانے کی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں۔لیکن اللہ کے حکم دینے کو یہ بات مستلزم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد بھی فرمائے۔ بلکہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان میں فعل کی تخلیق کرنے ؛ اور اس پر ان کی مدد کرنے میں خرابی ہوتی ہے؛ اس لیے کہ وہ فعل اللہ تعالیٰ کا فعل ہے [اس لیے وہ ان کی مدد نہیں فرماتا]۔اس لیے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ پیدا کرتے ہیں وہ کسی حکمت کے تحت پیدا کرتے ہیں۔اور کسی مامور بہ فعل سے یہ لازم نہیں آتا کہ اگر مامور یہ فعل بجالائے ؛ تو اس میں اس کے لیے مصلحت بھی ہو۔ بلکہ اس کے یہ کام کرنے میں ؛ یا مامور کو اس کا فاعل بنانے میں ؛ حکم دینے والے کی مصلحت ہوتی ہے۔پس تخلیق اور امر میں واضح فرق ہے۔پس ایک آدمی اپنے غیر کو مصلحتاً کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیتا ہے، اس کا مقصد اس کی خیر خواہی ہوتا ہے۔لیکن اس کے باوجود وہ اس کی مدد نہیں کرنا چاہتا۔اس لیے کہ ایسا نہیں ہوتا کہ جب بھی میں کسی دوسرے کو [مصلحتاً] کسی کام کے کرنے کا حکم دوں ؛ تو میری مصلحت اس میں بھی ہو کہ میں اس پر اس کی مدد بھی کروں۔ بلکہ کبھی مصلحت اس کے مخالف ارادہ میں ہوتی ہے۔پس کسی کو خیر خواہی کے تحت حکم دینے کی جہت وہ جہت نہیں جس کے تحت خود کام کیا جاتا ہے۔پس جب مخلوق کے حق میں یہ فرق ممکن ہے؛ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے یہ امکان زیادہ اور اولیٰ ہے۔[لہٰذا امر اور فعل میں بھی فرق واضح ہو گیا ہے]۔

قدریہ کا استدلال:

[اعتراض:] قدریہ کہتے ہیں: ''جب ایک شخص دوسرے کو کوئی حکم دیتا ہے تو اسے لازماً ایسا کام کرنا پڑے گا جس سے مامور کو وہ کام کرنے میں آسانی ہو؛ جیسے خندہ جبینی ؛ چہرے کا تبسم ؛ بیٹھک اور مجلس وغیرہ کی تیاری؛ وغیرہ۔

[جواب]:اس سے کہا جائے گا:اس میں دو وجوہات ہو سکتی ہیں:۱۔اول: کام کی مصلحت کا تعلق حکم دینے والے کے ساتھ ہو، جیسے بادشاہ جب اپنے لشکر کو ایسے احکامات دیتا ہے جس میں اس کی بادشاہت کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔اسی طرح آقا اپنے غلام کو ایسے کاموں کا حکم دینا جن کے سرانجام پانے سے آقا کو مفاد حاصل ہو۔اور جیسے کسی انسان کا اپنے شرکاء کو ایسا حکم دینا جس میں ان دونوں کی مصلحت ہو۔اور اس طرح کی دیگر مثالیں۔

❀ دوم:حکم دینے والا مامور انسان کی اعانت اس کی مصلحت کی خاطر چاہتا ہو۔جیسے امر بالمعروف کا مسئلہ واضح ہے؛ اس میں جب نیکی اور بھلائی کے کام پر مامور کی مدد کی جاتی ہے؛ تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اطاعت کے کام پر مدد کرنے پر اسے ثواب سے نوازے گا۔اور بے شک یہ کہ: ''اللہ تعالیٰ اس بندے کی مدد کرتا ہے جب وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے''۔[مسلم۲۶۹۹]

اور جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حکم دینے والے نے مامور کو اس کی مصلحت کے لیے حکم دیا ہے اور حکم دینے والے کا مامور کے فعل بجا لانے میں کوئی ذاتی فائدہ نہیں۔ جیسے مشیر خیر خواہ؛ جب مشورہ دیتا ہے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ اس کی مدد کرے تو اس میں حکم دینے والے کی کوئی مصلحت نہ ہو؛ بلکہ مامور کی مصلحت ہو؛ اور آمر کے لیے نقصان ہو۔جیسے وہ شخص جو شہر کے کنارے سے دوڑتا ہوا آیا اور موسیٰ علیہ السلام سے یوں گویا ہوا:[ارشاد ربانی ہے:]

﴿اِنَّ الْمَلَاَ یَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِیَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّیْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِیْنَ۝﴾ (القصص : ۲۰)

''بے شک سردار تمھارے متعلق مشورہ کرتے ہیں کہ تمہیں مار ڈالیں، سو تم یہاں سے نکل جاؤ میں تمھارا خیر خواہ ہوں۔''

اس میں مصلحت یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شہر چھوڑنے کا حکم دے؛ نہ کہ اس سلسلہ میں آپ کی مدد کرے۔ اس لیے کہ اگر وہ مدد کرتا تو اسے قوم کی جانب سے تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

پس جب کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو اس چیز کا حکم دیتا ہے جو ان کی مصلحت میں ہو؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ان کو جن کاموں کا حکم دیتا ہے ان پر ان کی مدد بھی کرے۔ خاص طور پر قدریہ کے ہاں ہرگز یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ اللہ کسی کی اس کام پر مدد کرے جس سے وہ فاعل بن جائے۔ پس جب آپ اللہ تعالیٰ کے افعال کو حکمت کے ساتھ معلول کرتے ہیں؛ جو کہ نفس الامر میں ثابت بھی ہے؛ اگرچہ ہم اس کو نہ جانتے ہوں؛ تو اگر آمر کے حکم دینے میں کوئی حکمت ہو؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مامور بہ فعل پر مدد کرنے میں بھی حکمت ہو۔ بلکہ بعض اوقات مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کی مدد نہ کی جائے۔

پس جب مخلوق میں یہ ممکن ہے کہ حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ مامور کو حکم دے؛ اور یہ کہ آمر کے حق میں مصلحت و حکمت کا تقاضا یہ ہو کہ اس کام میں اس کی اعانت نہ کرے؛ تو اللہ تعالیٰ کے حق میں اس مصلحت کا امکان زیادہ اولیٰ اور مناسب ہے۔

مقصود یہ ہے کہ جب حکیم مخلوق کے حق میں یہ ممکن ہے کہ وہ کسی دوسرے کو کسی دوسرے کو کسی بات کا حکم دے اور اس پر اس کی مدد نہ کرے؛ تو اسی طرح خالق کے حق میں یہ امکان زیادہ اولیٰ اور مناسب ہے۔ پس اللہ تعالیٰ جس شخص کو حکم دیتا ہے پھر اس کی اعانت بھی کرتا ہے تو اس صورت میں فعل کے ساتھ اللہ کا تعلق بلحاظ خلق اور امر کے ہے۔ اس کی منشاء تخلیق اور محبت کے اعتبار سے ہے۔ تو اس صورت میں وہ کام تخلیقی جہت سے بھی مراد ٹھہرا؛ اور حکم دینے کی جہت سے بھی۔ اور جس کی مامور بہ فعل پر اعانت نہیں کرتا تو اس صورت میں بلحاظ امر کے تو تعلق ہے بلحاظ خلق کے نہیں۔ اس لیے کہ ایسی حکمت موجود نہیں ہے جو خلق کے تعلق کا تقاضا کرتی ہو۔ بلکہ ایسی حکمت موجود ہے جو اس کی ضد کے خلق کا تقاضا کرتی ہے اور ایک ضد کا خلق دوسری ضد کے خلق کے منافی ہے اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔

مثال: [اللہ تعالیٰ نے] اگرچہ بیماری پیدا کی ہے؛ جس سے انسان میں تواضع اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ بیمار انسان توبہ کرتا ہے، گڑگڑاتا ہے، اللہ سے دعائیں مانگتا ہے۔ اس سے اس کے گناہ دور ہوتے ہیں اس کا دل صاف ہوتا ہے، کبر و گھمنڈ کا خاتمہ ہوتا ہے اور کسی پر زیادتی کرنے اور تکبر و بڑائی کا عنصر سرد پڑتا ہے۔ تو بیماری کے عنصر کی تخلیق صحت کے عنصر کے خلاف ہے؛ جس سے یہ تمام مصلحتیں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح ظالم کے ظلم کا پیدا کرنا ہے؛ جس سے مظلوم کے حق میں وہ مصلحتیں حاصل ہوتی ہیں؛ جو بیماری سے حاصل ہوتی ہیں۔ ظلم عدل کی تخلیق کا الٹ ہے۔ پس عدل سے وہ مصلحتیں حاصل نہیں ہوتیں [جو ظلم سے حاصل ہوتی ہیں۔] اگرچہ مصلحت اسی میں ہے کہ وہ عدل کرتے''۔ [منهاج السنة ۳/ ۱۶۰-۱۶۶]

اللہ کے خلق اور امر میں جو حکمتیں کارفرما ہیں ان کی تفصیلی معرفت حاصل کرنا ممکن نہیں۔ انسانی عقل عاجزی اور درماندگی کا اعتراف کرتی ہے لیکن فرقہ قدریہ علتوں کے بیان میں فاسد طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہ اللہ کو مخلوق کے ساتھ مشابہ قرار دیتے ہیں اور اللہ کی حکمتوں کو ثابت نہیں کرتے ہیں۔

ادراک اور احاطہ سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ:

۸۔ ((لاَ تَبْلُغُهُ الأَوْهَامُ وَلاَ تُدْرِكُهُ الأَفْهَامُ))۔

''نہ تو وہاں وہم کی رسائی ہے اور نہ ہی فہم اس کا ادراک کرسکتا ہے''۔

تَشْرِیح:......ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾ (طٰهٰ: ۱۱۰)

''اور وہ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

صحاح میں ہے: وهمت الشئی: ظننته؛ وفهمت الشئی: علمته ۔[یعنی وہم کا معنی ظن اور فہم کا معنی علم کیا گیا ہے]۔ یہاں پر شیخ رحمہ اللہ کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کی ذات تک وہم رسائی نہیں کرسکتا اور نہ ہی علم اس کا احاطہ کرسکتا ہے۔ بعض کہتے ہیں وہم اس چیز کو کہتے ہیں جس کے واقع ہونے کی امید ہو۔ یعنی یہ خیال کیا جا تا سکتا ہے کہ وہ ان مواصفات سے موصوف ہوگا۔ اور فہم کا حصول عقل سے ہوتا ہے اور وہ اس کا احاطہ کرتی ہے۔ اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کیفیت کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں وہ خود ہی اپنا علم رکھتا ہے۔ ہاں ہم اللہ تعالیٰ کو اس کی صفات کے ساتھ پہچانتے ہیں۔ وہ ایک ہے بے نیاز ہے، نہ اس نے جنا اور نہ وہ جنا گیا ہے اور کوئی بھی اس کی برابری کرنے والا نہیں۔ اور ارشاد ربانی ہے:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ (البقرہ: ۲۵۵)

''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ اور قائم ہے اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔''

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (الحشر: ۲۳،۲۴)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، بادشاہ (حقیقی) پاک ذات (ہر عیب سے) سلامتی امن دینے والا نگہبان غالب زبردست بڑائی والا اللہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے، وہی اللہ (تمام مخلوقات کا) خالق ایجاد کرنے والا صورتیں بنانے والا ہے، سب اچھے اچھے نام اس کے ہیں، جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اس کی تسبیح بیان کرتی ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے۔''

مخلوق کے ساتھ مشابہت سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ:

9.((وَلاَ يُشْبِهُ الأَنَامُ))❶۔

''اور مخلوق اس کے مشابہ نہیں''۔

تَشْرِیح:......اس میں مشبہہ کے عقیدہ کا رد ہے جو خالق کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتے ہیں؛ جبکہ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوری : ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

یہاں پر مراد صفات کی نفی نہیں؛ جیسا کہ اہل بدعت کا عقیدہ ہے۔

۱۔امام ابوحنفیہ رحمہ اللہ کا قول: امام ابوحنیفہ ''الفقه الاکبر''میں لکھتے ہیں کہ اللہ اپنی مخلوق میں کسی کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا اور نہ ہی مخلوق میں سے کوئی چیز اس کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔اور پھر فرمایا:''اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی تمام صفات مخلوقات کی صفات سے ممتاز ہیں۔ وہ جانتا ہے مگر ہمارے جاننے کی طرح نہیں، وہ قدرت رکھتا ہے مگر ہماری قدرت کی طرح نہیں، وہ دیکھتا ہے مگر ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں''❷۔

۲۔نعیم بن حماد رحمہ اللہ[۲۲۸ھ] کا قول: فرماتے ہیں:''جو شخص اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتا ہے وہ کافر ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا انکار کرتا ہے جن کا اثبات خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے وہ بھی کافر ہے اور اللہ تعالیٰ کے جن اوصاف کا ذکر خود کیا ہے، یا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے؛ ان میں مخلوق کی صفات کیساتھ] کوئی تشبیہ نہیں پائی جاتی''۔

۳۔اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ[۱۶۱-۲۳۸ھ] کا قول:''جو شخص اللہ کے اوصاف بیان کرے؛ اور اس کی صفات کو کسی مخلوق کے اوصاف کے مشابہ قرار دیتا ہے وہ اللہ عظیم کے ساتھ کفر کرتا ہے۔اور فرمایا کہ:''اس میں جہم بن صفوان[۱۲۸ھ] اور اس کے رفقاء کی علامات پائی جاتی ہیں؛ وہ یہ کہ وہ جھوٹ کے خوگر ہوتے ہیں؛ اور اہل سنت پر الزام تراشی کرتے ہیں اور انھیں مشبہہ بلکہ معطلہ کا لقب دیتے ہیں۔

ائمہ سلف رحمہم اللہ کی ایک بڑی جماعت سے منقول ہے؛ فرماتے ہیں:

---

❶۔اس میں مشبہ کے عقیدہ کی نفی ہے جو خالق کو مخلوق سے تشبیہ دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوری: ۱۱)''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

یہاں پر مراد صفات کی نفی نہیں؛ جیسا کہ اہل بدعت کا عقیدہ ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ''الفقہ الاکبر''میں فرماتے ہیں:''نہ ہی مخلوق میں سے کوئی چیز اس کے مشابہ ہے اور نہ ہی وہ مخلوق میں سے کسی چیز کے مشابہ ہے۔پھر فرمایا:''اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی تمام صفات مخلوق کی صفات کے منافی ہیں اس کا علم ہمارے علم کے مشابہ نہیں اس کی قدرت دیسی نہیں اور نہ ہی اس کی رؤیت ہماری رؤیت کی طرح ہے''۔

❷۔ پھر اس کے بعد فرمایا: " وصفاته كلها في الازل بخلاف صفات المخلوقين يعلم لا كعلمنا ويقدر لا كقدرتنا ويرى لا كرؤيتنا ويسمع لا كسمعنا ويتكلم لا ككلامنا "۔ اس کی تمام صفات مخلوقات کی صفات سے ممتاز ہیں۔ وہ جانتا ہے مگر ہمارے جاننے کی طرح نہیں، وہ قدرت رکھتا ہے مگر ہماری قدرت کی طرح نہیں، وہ دیکھتا ہے مگر ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں'' ۔امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کی جنس سے نہیں ہیں؛ نہ ملائکہ؛ نہ ہی آسمان وافلاک نہ ہی پانی اور ہوا؛ اور نہ ہی زمین؛ نہ ہی آدمی اور ان کے ابدان اور نفوس؛ اور نہ ہی ان کے علاوہ کوئی چیز؛ کسی بھی مخلوق کی جنس سے نہیں۔ بلکہ یہ بات بھی قطعی طور پر معلوم شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے کسی چیز سے مماثلت کی حقیقت ان تمام مخلوقات کے مابین مماثلت کی حقیقت سے بہت دور کی چیز ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک مخلوق کی اپنی ایک حقیقت ہے۔ جو دوسری چیز میں پائی جانے والی اس حقیقت سے بہت مختلف ہے'' ۔العقیدۃ التدمریہ ص ۴۵۴۔ از شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ۔

''جہمیہ کی علامت یہ ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت کو مشبہہ کہتے ہیں۔ بے شک منکرین صفات میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کا اثبات کرنے والوں کو مشبہ نہ کہتا ہو۔''

خیال رہے کہ قرامطہ، فلاسفہ دیگر غالی زندیق فرقے جو بالکل ہی اللہ تعالیٰ کے اسماء کا انکار کرتے ہیں اور ہٹ دھرمی کے ساتھ دعوی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو عالم، قادر کہنا درست نہیں؛ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان اسماء کے ساتھ پکارنے والا مشبہہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے کہ نام میں اشتراک ہونا معنی میں اشتباہ پیدا کرتا ہے۔ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے اسماء کو ثابت مانتا ہے، اور انہیں مجاز کہتا ہے؛ جیسا کہ غالی قسم کے جہمیہ کا خیال ہے؛ وہ کہتے ہیں: ''جو کوئی اللہ تعالیٰ کو حقیقۃً عالم، اور قادر قرار دیتا ہے؛ وہ مشبہ ہے۔ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرتے ہیں؛ اور کہتے ہیں: بے شک اللہ کے لیے نہ علم ہے نہ ہی قدرت؛ نہ ہی کلام اور نہ ہی محبت اور نہ ہی ارادہ۔ یہ لوگ بھی صفات کے قائلین کو مشبہہ اور مجسمہ کہتے ہیں۔ اسی لیے منکرین صفات جہمیہ، معتزلہ، رافضہ اور دیگر گمراہ فرقوں کی تمام کتابیں قائلین صفات کے لیے مجسمہ اور مشبہ کے نام سے بھری ہوئی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کتابوں میں بلا جھجک کہتے ہیں کہ: ''بے شک جملہ مجسمہ میں سے ایک قوم ایسی ہے جسے مالکیہ کہا جاتا ہے؛ جو ایک آدمی کی طرف نسبت رکھتے ہیں جسے مالک بن انس رحمہ اللہ کہا جاتا ہے۔ اور کچھ لوگوں کو شافعیہ کہا جاتا ہے؛ جو اپنی نسبت ایک آدمی کی طرف رکھتے ہیں؛ جسے محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ کہا جاتا ہے۔ حتی کہ ان میں سے جو قرآن پاک کے مفسر ہیں جیسے زمخشری [۴۶۱-۵۳۸ھ]، قاضی عبدالجبار [۴۹۵ھ] وغیرہ وہ بھی اپنی تفاسیر میں صفات ماننے والوں کو اور دیدار الٰہی کے قائلین کو مشبہہ کا لقب دیتے ہیں، متاخرین میں یہ اصطلاح کثرت کے ساتھ متداول ہے۔

اہل سنت علماء کی وضاحت:

لیکن اہل سنت کے مشہور علماء کے ہاں اس لفظ کے استعمال سے مشہور یہ ہے کہ وہ تشبیہ کی نفی سے صفات کی نفی مراد نہیں لیتے۔ اور نہ ہی صفات کے قائلین کو مشبہ کہتے ہیں۔ بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ مخلوقات میں سے کوئی بھی اپنے اسماء وصفات اور افعال میں اس کی مشابہت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ سابقہ اوراق میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول گزر چکا ہے کہ: ''يعلم لا كعلمنا ويقدر لا كقدرتنا ويرى لا كرؤيتنا ويسمع لا كسمعنا ويتكلم لا ككلامنا '' ''وہ جانتا ہے مگر ہمارے جاننے کی طرح نہیں، وہ قدرت رکھتا ہے مگر ہماری قدرت کی طرح نہیں، وہ دیکھتا ہے مگر ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں'' ۔فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

کا یہی معنی ہے۔اس آیت میں مماثلت کی نفی اور صفات کا اثبات کیا گیا ہے۔آئندہ اوراق میں خود شیخ رحمہ اللہ کے کلام میں اثبات صفات کی مزید وضاحت ذکر کی جائے گی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تشبیہ کی نفی صفات کی نفی کو مستلزم نہیں۔

مقدمات کی ترتیب:

اس کی وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ:

اولاً: علم الٰہی کے اثبات میں قیاس تمثیلی سے استدلال جائز نہیں [1]۔جس میں اصل اور فرع برابر ہوتے ہیں۔

ثانیاً: قیاس شمولی سے بھی استدلال ممکن نہیں۔کیونکہ اس کے افراد مساوی/ برابر ہوتے ہیں۔بے شک اللہ تعالیٰ کی مثیل کوئی چیز نہیں؛ پس کسی دوسری چیز سے اس کی مثال بیان کرنا جائز نہیں۔

ثالثاً: اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر کو کسی ایسے قضیہ کلیہ کے تحت داخل نہیں مانا جا سکتا جس کے افراد برابر ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب فلاسفہ اور متکلمین نے مطالب الٰہیہ کے اثبات میں اس قسم کے قیاسات کی راہ پر گامزن ہوئے تو وہ یقین کی منزل پر رسائی حاصل نہ کر سکے۔بلکہ ان کے دلائل میں تناقض/ٹکراؤ رونما ہو گیا۔اور بالآخر حیرت اور اضطراب ان پر غالب آ گیا۔اس لیے کہ وہ خود دیکھتے تھے کہ ان کے دلائل فساد کا شکار ہیں۔اور ان میں برابری کا مادہ موجود نہیں۔البتہ قیاس اولیٰ کا استعمال صحیح ہے خواہ اس کی بظاہر صورت تمثیلی ہو یا شمولی ہو۔ارشاد ربانی ملاحظہ فرمائیں:

﴿وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ (النحل: ٦٠)

''اور تمام اعلیٰ مثالیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں''۔

[1]۔جس تمثیل کی اللہ تعالیٰ سے نفی واجب ہے؛اس کی دو اقسام ہیں:۱۔خالق کی مخلوق سے مماثلت۔۲۔مخلوق کی خالق سے مماثلت۔اس کا ضابطہ یہ ہے کہ:'' خالق کو مخلوق کے خصائص میں سے کسی ایک کے ساتھ تشبیہ دینا یہ خالق کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ ہے۔اور مخلوق میں خالق سبحانہ وتعالیٰ کے خصائص میں سے کوئی چیز بیان کرنا یہ مخلوق کو خالق کے ساتھ تشبیہ دینا ہے۔پس وہ تمام مشرکین جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود بناتے ہیں: وہ مخلوق کو خالق کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔اس لیے کہ وہ امور عبادت میں جو کچھ زمین و آسمان کے رب کے لیے خاص تھا وہ مخلوق میں تسلیم کرنے لگ گئے۔

اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی؛فقر؛بخل یا ان جیسی دیگر صفات سے موصوف کرتا ہے-جیسا کہ یہودی کہتے ہیں-تو وہ خالق کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے۔اس لیے کہ فقر و عاجزی اور بخل مخلوق کی خصوصیات اور اوصاف ہیں۔جن سے اللہ تعالیٰ منزہ اور پاک ہیں۔

مثلاً یہ جان لیا جائے کہ ہر وہ کمال جو ممکن یا محدث کے لیے ہو سکتا ہے؛جس میں کسی قسم کا کوئی نقص،عیب نہ ہو اور پھر اس کے وجود کو کسی وقت بھی عدم مستلزم نہ ہو تو اللہ تعالیٰ واجب قدیم اس کا زیادہ حقدار ہے۔اور ہر وہ کمال جو کسی مخلوق میں پایا جاتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا نقص نہیں؛اس کو مخلوق نے اپنے خالق،رب،مدبر سے حاصل کیا ہے؛اور وہی اس کا زیادہ حقدار ہے۔اور ہر نقص اور فی نفسہ عیب جو کمال کے سلب کو متضمن ہے جب اس کی نفی مخلوقات،ممکنات،محدثات سے واجب ہے؛تو اللہ تعالیٰ سے اس کی نفی بطریق اولیٰ ضروری/یعنی واجب ہو گی''۔[درء تعارض العقل والنقل ۱/۲۹]

مزید تعجب خیز بات یہ ہے کہ غالی منکرین صفات مذکورہ آیت سے اللہ تعالیٰ کی صفات اور اسماء کی نفی پر استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ایسا نہیں ہو سکتا اور ایسا نہیں ہو سکتا۔اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ اصل فلسفہ یہ ہے کہ حسب

استطاعت اللہ کوتشبیہ کے ساتھ ثابت کیا جائے۔اور اسے حکمت کی غایت اور انسانی کمالات کی انتہاء قرار دیتے ہیں؛اور ان کی موافقت بعض وہ لوگ کرتے ہیں جو اس عبارت کو علی الاطلاق لیتے ہیں؛ جو نبی کریم ﷺ سے [اس حدیث میں] مروی ہے:

((تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ)) ❶

''یعنی تم اپنے آپ کو اللہ کے ساتھ متصف کرو۔''

پس جب وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہیں تو پھر ان کے خیال میں وہ کون سے اوصاف ہیں جن کے ساتھ کوئی انسان موصوف ہوگا؟۔پس جس طرح اللہ تعالیٰ کسی مخلوق کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا؛ ایسے ہی کوئی بھی مخلوق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی۔لیکن اس عقیدہ کے مخالفین عیسائی،حلولیہ،اتحادیہ ھیں ۔لعنھم اللہ [جو کہ ہماری رائے کے ساتھ متفق نہیں]۔مخلوقات میں سے کسی ایک چیز کی اس کے ساتھ مشابہت کی نفی اس بات کو مستلزم ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی کسی مخلوق کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا۔

اسی لیے شیخ رحمہ اللہ نے متن میں فرمایا ہے: "وَلَا يُشْبِهُهُ الْأَنَامُ "۔لفظ انام کا معنی ہم نے (الناس) یعنی لوگ کیا ہے۔اگر چہ بعض لوگوں نے اس کا معنی ذی روح اور بعض نے تمام مخلوق اور بعض نے جن وانس کیا ہے۔لیکن ارشاد ربانی:

❶۔کتب حدیث میں اس کا اصل موجود نہیں بلکہ سیوطی کی جامع الکبیر میں بھی یہ حدیث نہیں ہے۔اسے سیوطی نے اپنی کتاب ''تائید الحقیقة العلیة'' ۱/ ۸۷ پر نقل کیا ہے۔ لیکن اسے کسی کی طرف منسوب نہیں کیا۔''المدارج'' ۳/ ۲۴۱ میں کہا ہے کہ یہ روایت فرقہ اتحادیہ نے نقل کی ہے جو کہ ایک باطل اثر ہے۔

﴿وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ﴾ (الرحمن : ۱۰)

''اور زمین کو اس نے مخلوق کے لیے بچھایا ہے''۔

اس سے بھی پہلا معنی ہی معلوم ہوتا ہے۔واللہ اعلم۔

باری تعالیٰ کے لیے حیات اور قیومیت کا اثبات

۱۰.((حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ قَیُّوْمٌ لَّا یَنَامُ))۔

''وہ زندہ ہے؛ مرے گا نہیں؛ وہ قیوم ہے اس کو نیند نہیں آتی''۔

تَشْرِیح:......ارشاد ربانی ہے:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ لَهٗ﴾ (البقرہ: ۲۵۵)

''اللہ (معبود حقیقی ہے) کوئی معبود نہیں سوائے اس کے وہ زندہ قائم ہے نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند 1۔''

پس نیند اور اونگھ کی نفی اس کی کمال حیات اور اس کی قیومیت کی دلیل ہے۔ اور ارشاد ربانی ہے:

﴿الٓمّٓ o اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ o نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ (آل عمران: ۱۔۳)

''الم۔ اللہ؛ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ قائم ہے اس نے حق کے ساتھ تجھ پر کتاب نازل کی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ﴾ (طٰهٰ: ۱۱۱)

''اور اس زندہ قائم کے روبرو منہ نیچے ہو جائیں گے۔''

1 ۔حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم قرآن کریم کی تین سورتوں میں ہے: سورہ بقرہ؛ سورہ آل عمران اور سورہ طٰہ''۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا؛ ح: ۳۸۵۶۔ والطحاوی فی شرح مشکل الآ ثار ۱/۶۲ا۔ طبرانی / المعجم الکبیر؛ ح: ۷۷۵۸۔ الحاکم ۱/ ۵۰۵۔ سلسلہ الصحیحہ ۷٤٦۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ﴾ (الفرقان: ۵۸)

''اور اس زندہ پر بھروسہ رکھو جو نہیں مرے گا اور اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (غافر: ٦٥)

''وہ (معبود) زندہ ہے اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ لَا یَنَامُ وَلَا یَنْبَغِی لَهٗ أَنْ یَّنَامَ)) . [مسلم(۱٦۹؛ ۲۹۳)، ابن ماجه(۱۹۵).]

''بے شک اللہ پر نیند طاری نہیں ہوتی اور اس کے لیے نیند کرنا لائق بھی نہیں ہے۔''

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے جب تشبیہ کی نفی کی تو ان صفات کا اشارہ فرمایا جن کی وجہ سے مخلوق اور خالق کے درمیان فرق نظر آتا ہے۔ وہ صفات صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں؛ اس کی مخلوق کے ساتھ نہیں۔ پس ان صفات میں سے؛ مثلاً: یہ صفت کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اسے موت نہیں آئے گی۔ بے شک باقی رہنے والی زندگی کی صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے؛ نہ کہ مخلوق کے ساتھ؛ بے شک ان پر موت طاری ہوگی۔ اور یہ صفت کہ اللہ قیوم ہے؛ وہ سوتا نہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ تشبیہ کی نفی کرنے سے یہ مراد نہیں کہ صفات کی بھی نفی کردی جائے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ صفت کے کمال کے ساتھ موصوف ہے؛ اس لیے کہ اس کی ذات میں کمال پایا جاتا ہے۔ بے شک باقی رہنے والی حیات کے ساتھ موصوف زندہ رہنے والے کی تشبیہ اس زندہ کے ساتھ نہیں ہوسکتی؛ جو زائل ہونے والی حیات کے ساتھ زندہ ہے۔ اسی لیے دنیا کی زندگی متاع اور لہو ولعب قرار دیا گیا ہے؛ [آخرت کی زندگی کو اصل زندگی کہا گیا ہے۔ فرمایا:]

﴿ وَّ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ﴾ [العنکبوت ۶۴]

''اور بے شک آخری گھر، یقیناً وہی اصل زندگی ہے''۔

گویا کہ دنیا کی زندگی نیند کی مانند ہے اور آخرت کی زندگی بیداری کی مثل ہے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آخرت کی زندگی کامل اکمل ہے؛ جو مخلوق کو عطا ہوگی۔ اس لیے کہ ہم کہتے ہیں کہ: وہ حی (زندہ) کہ حیات جس کی صفات لازمہ میں سے ہے؛ وہی مخلوق کو دائمی زندگی عطا کرے گا [اللہ تعالیٰ نے ہی مخلوق کو یہ دائمی زندگی عطا کی ہے۔] اور ان کی زندگی کو یہ دوام اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے حاصل ہوگا؛ اس لیے نہیں کہ دوام کا وصف اس کے لوازم حیات میں سے ہے۔ بخلاف اللہ تعالیٰ کی حیات کے۔ بالکل اسی طرح دیگر صفات کا حال بھی یہی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی صفات اس کے ساتھ ہیں جس طرح کہ وہ اس کے ساتھ لائق ہیں اور مخلوق کی صفات اس کے ساتھ ہے جیسے وہ اس کی شان کے لائق ہیں۔

الحیُّ القیُّومُ کی تشریح:

اللہ تعالیٰ کے یہ دونوں نام قرآن پاک میں تین سورتوں میں ایک ساتھ ذکر ہوئے ہیں۔ اور یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے بڑے عظیم اسماء میں سے ہیں؛ حتی کہ کہا گیا ہے: یہ دونوں اسم اعظم ہیں۔ [مسلم وابن ماجة (١٤٩٦) و أبو سعيد الدارمي في الرد على الجهمية]

اور بیشک یہ دونوں اسماء اکمل، اصدق صفات کمال کو شامل ہیں۔ اور قیوم اس ازلیت، ابدلیت پر دلالت کرتا ہے جس پر لفظ قدیم دلالت نہیں کرتا۔ نیز یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے ذاتی وجود کو ثابت کرتا ہے؛ واجب الوجود ہونے کا یہی معنی ہے۔ اور یہ لفظ ''قیوم'' قیام سے بلیغ ہے۔ اس لیے کہ الف کی نسبت سے واؤ میں قوت زیادہ ہوتی ہے؛ اور یہ قیام بنفسہ کی فائدہ دیتا ہے۔ اس پر تمام مفسرین اور اہل لغت متفق ہیں؛ اور یہ معنی ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے کہ اس کا مفہوم قائم بالذات ہے۔ لیکن کیا وہ اپنے غیر کو قائم کرنے کا فائدہ دیتا ہے اور اس کا قیام اسکے ساتھ ہے؟ اس میں دو قول ہیں۔ صحیح قول یہی ہے کہ وہ اس کا فائدہ دیتا ہے، یعنی اس میں قیام کا دوام اور کمال موجود ہے۔ صیغۂ مبالغہ کا بھی یہی تقاضا ہے۔

پس اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نہ زائل ہوگا، نہ غائب ہوگا؛ اس لیے کہ غائب ہونے والا قطعی طور پر زائل ہو کر رہتا ہے۔ یعنی نہ وہ غائب

ہوتا ہے اور نہ اس میں نقص پیدا ہونے کا امکان ہے؛ نہ اس پر فنا طاری ہوگا اور نہ ہی وہ معدوم ہوگا۔ بلکہ وہ ذات دائم ہے باقی ہے، ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گی۔ کمال کے تمام اوصاف کے ساتھ موصوف رہے گی۔ اور ''قیوم'' کے ساتھ اسم ''حیّ'' کا اقتران تمام صفات کمال کو مستلزم ہے اور اللہ کی ذات کے دوام اور بقاء پر دلالت کرتا ہے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے نقص اور عدم کی ازل سے ابد تک نفی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ: ﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ قرآن پاک میں عظیم ترین آیت ہے۔ جیسا کہ صحیح روایت میں نبی ﷺ سے بھی ثابت ہے''۔ [مسلم ۲/ ۱۹۹؛ ۱۸۰؛ عن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ]

اور ان دونوں اسماء پر تمام اسماء حسنیٰ کا دارومدار ہے؛ اور تمام اسماء کے معانی کا مرجع یہ دونوں ہیں۔ پس بے شک صفت حیات تمام صفات کمال کو مستلزم ہے اگر کوئی صفت مختلف ہوتی ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حیات میں ضعف ہے، پس جب اللہ کی حیات کی صفات اکمل اور اتم ہیں تو حیات کا اثبات ہر اس کمال کے اثبات کو مستلزم ہے جس کی نفی کمال حیات کی متضاد ہو۔

اور ﴿الْقَيُّوْمُ﴾ میں صفت قیومیت اس کے کمال استغناء اور کمال قدرت کو مستلزم ہے۔ بیشک وہ بذات خود قائم ہے وہ کسی لحاظ سے بھی کسی دوسرے کا محتاج نہیں۔ بلکہ وہ دوسروں کو قیام عطا کرنے والا ہے [1]۔ کوئی دوسرا اس کے قائم کئے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ تو ثابت ہوا کہ یہ دونوں اسم صفات کمال پر مکمل طور پر مشتمل ہیں''۔ [البدائع ۲/ ۴۱۰]

[1] ۔یعنی تمام مخلوقات کو قائم رکھنے والا؛ کوئی بھی مخلوق اللہ تعالیٰ کے قائم رکھے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ کسی کا کوئی وجود یا کوئی بقاء؛ یا کوئی اصلاح اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی نہیں کرسکتا۔ پس اللہ تعالیٰ ہی بلا ایجاد بنانے والے اور موجودہ صورت میں تخلیق کرنے والے ہیں؛ اور وہی ان مخلوقات کو ہر اس چیز سے مدد فراہم کرتے ہیں جس کی انہیں ضرورت ہے''۔ [تفسیر الطبری ۴/ ۵۲۹؛ الکافیہ الشافیہ ص ۱۸۲۔]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ دونوں اسماء گرامی اللہ تعالیٰ کی تمام تر صفات کو متضمن ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا اسم حیَّ صفات ذاتیہ کو متضمن ہے جیسے علم؛ سمع؛ بصر؛ قدرت؛ عزت؛ حکمت؛ اور رحمت''۔ جبکہ اسم قیوم: تمام صفات فعلیہ کو متضمن ہے جیسے: خلق وتدبیر؛ زندگی اور موت دینا؛ عزت اور ذلت دینا؛ نوازنا اور روک لینا؛ اور بلندی عطا کرنا اور پستی میں گرانا''۔ [بدائع الفوائد ۲/ ۶۷۸؛ الکافیہ الشافیہ ص ۴۴۔]

خالق ورازق صرف اللہ:

۱۱: ((خَالِقٌ بِلَا حَاجَةٍ رَازِقٌ بِلَا مُؤْنَةٍ))۔

''وہ خالق ہے بغیر کسی ضرورت کے؛ رازق ہے بغیر مشقت کے''۔ [1]

تَشْرِیح:......ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝ مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ۝﴾ (الذاریات: ٥٦-٥٨)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں، میں ان سے طالب رزق نہیں اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے (کھانا) کھلائیں، بیشک اللہ ہی تو رزق دینے والا زور آور اور مضبوط ہے۔''

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝﴾ (فاطر: ١٥)

''اے لوگو! تم اللہ کی بارگاہ کے محتاج ہو اور اللہ ہی وہ ذات ہے جو بے پروا اور تعریف والی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ﴾ (محمد: ٣٨)

''اور اللہ بے پروا اور تم محتاج ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ (الانعام: ١٤)

''کہو کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو مددگار بناؤں کہ (وہی) تو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور وہی (سب کو) کھانا دیتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا۔''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں[؛ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:]

((يَا عِبَادِي لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُمْ وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَى أَتْقَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ

[1] ۔یعنی بغیر کسی مشقت اور بغیر کسی تکلف کے۔ جیسا کہ شرح عقیدہ طحاویہ میں بھی ہے۔ [ص 125 الطبعة الرابعة]۔ یعنی ان کو پیدا کیا؛ حالانکہ ان کی اللہ تعالیٰ کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے مخلوق اس لیے نہیں پیدا کی کہ وہ ان کی وجہ سے قلت کو کثرت سے بدلے؛ یا کمزوری میں ان سے مدد حاصل کرے؛ یا فقر میں ان سے استغناء حاصل کرے۔ بلکہ ان کو پیدا کرنے کا مقصد ہی اس سے علیحدہ ہے۔ جیسا کہ شرح میں اس کا ذکر آرہا ہے۔

مَا زَادَ فِي مُلْكِي شَيْئاً. يَا عِبَادِيْ لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُم وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوا عَلَىٰ أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِنْكُمْ مَا نَقَصَ فِي مُلْكِي شَيْئاً. يَا عِبَادِيْ لَوْ أَنَّ أَوَّلَكُم وَآخِرَكُمْ وَإِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ قَامُوا فِي صَعِيدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلُونِي فَأَعْطَيْتُ كُلَّ إِنْسَانٍ مَسْئَلَتَهُ مَا نَقَصَ ذَالِكَ مِمَّا عِنْدِي إِلَّا كَمَا يَنْقُصُ الْمُخِيْطُ إِذَا أُدْخِلَ الْبَحْرَ.)) (مسلم ۸/ ۱۷؛ح:۲۵۷۷ أحمد۵/ ۱۶۰)

''اے میرے بندو! اگر تمھارے پہلے اور بعد والے تمھارے انسان اور جن تم میں سے زیادہ متقی انسان کے دل والے ہو جائیں تو وہ میری بادشاہت میں کچھ اضافہ نہیں کریں گے، اے میرے بندو! اگر تمھارے پہلے اور بعد والے اور تمھارے انسان اور جن تم میں سے زیادہ بدمعاش انسان کے دل والے ہو جائیں تو اس سے میری بادشاہت میں کمی نہیں ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمھارے پہلے اور بعد والے اور تمھارے انسان اور جن کسی چٹیل زمین میں اکٹھے ہو جائیں اور مجھ سے سوال کریں اور میں ہر شخص کے سوال کو پورا کردوں تو اس سے میری بادشاہت میں اتنی کمی بھی واقع نہ ہوگی جس قدر کہ سوئی کو جب سمندر میں داخل کیا جائے پھر نکال لیا جائے تو سمندر کے پانی میں کمی آتی ہے۔''

بلا مؤنة کا معنی بلا مشقت اور بلا تکلف/ بلا گرانی ہے [1]۔

[1]۔: خالق ورازق ہستی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ﴾(الروم ۴۰) ''اللہ وہ ہے جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر تمھیں رزق دیا، پھر تمھیں موت دے گا، پھر تمھیں زندہ کرے گا، کیا تمھارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کرے؟ وہ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں''۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ كَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَ اِیَّاكُمْ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾(العنکبوت ۶۰) ''اور کتنے ہی چلنے والے (جاندار) ہیں جو اپنا رزق نہیں اٹھاتے، اللہ انھیں رزق دیتا ہے اور تمھیں بھی اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے''۔

اللہ تعالیٰ ہی سب سے بہترین رزق دینے والے ہیں۔حدیث شریف میں ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ بھرے ہوئے ہیں؛ دن اور رات کے خرچ کرنے سے ان میں کوئی کمی نہیں آتی''۔[البخاری ۷۴۱۹؛ مسلم ۹۹۳]

زندگی اور موت کا مالک:

١٢.:((مُمِيْتٌ بِلاَ مَخَافَةٍ بَاعِثٌ بِلاَ مَشَقَّةٍ))❶۔

''وہ مارنے والا ہے بغیر کسی خوف کے؛ اٹھانے والا ہے بغیر کسی مشقت کے''۔

تَشْرِیح:......موت وجودی صفت ہے۔ فلاسفہ اور ان کے ہمنوا اس عقیدہ کے مخالف ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

❶۔ اللہ تعالیٰ خوف اور اس جیسی دوسری صفات نقص وعیب سے منزہ اور پاک ہیں۔ انہیں کسی کا خوف نہیں وہ جس کو چاہیں زندگی دیں اور جس کو چاہیں موت دیں۔ اگر اللہ تعالیٰ تمام کائنات کو بھی ختم کر دیں تو انہیں کسی کا کوئی خوف نہ ہو۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی ہے: ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا (14) وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (15)﴾[الشمس] ''تو ان کے رب نے انھیں ان کے گناہ کی وجہ سے پیس کر ہلاک کر دیا، پھر اس (بستی) کو برابر کر دیا۔ اور وہ اس (سزا) کے انجام سے نہیں ڈرتا''۔

اور ایسے ہی تمام مخلوقات کو دوبارہ اٹھانا اور زندہ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے لیے بہت آسان ہے؛ اس میں کوئی مشقت یا دقت نہیں۔ فرمان الٰہی ہے: ﴿اَوَ لَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾۔[العنکبوت ١٩] '' اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ خلق کی ابتدا کرتا ہے، پھر اسے دھرائے گا، بے شک یہ اللہ پر بہت آسان ہے''۔

نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾[الروم ٢٨] ''اور وہی ہے جو خلق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ اسے زیادہ آسان ہے اور سب سے اونچی شان اسی کی ہے''۔

آیت مبارکہ میں وارد لفظ ''اَھون'' کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آسانی ہے۔ اور یہ مبالغہ کے استعمال ہوا ہے یعنی ایسا کرنا انتہائی آسان ہے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾[لقمان ٢٨] '' نہیں ہے تمھارا پیدا کرنا اور نہ تمھارا اٹھانا مگر ایک جان کی طرح''۔

یہ ان لوگوں کے خلاف دلیل ہے جو دوبارہ اٹھائے جانے کو محال سمجھتے ہیں؛ اس سے مراد یہ ہے کہ عام لوگوں کی عقل کے مطابق بھی کسی چیز کو دوبارہ بنانا اس کی تخلیق اول کی نسبت بہت زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک اعتراض اور اس کا جواب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی ہے: ﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (78) قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (79)﴾ [یس]

''اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا، جب کہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟ کہہ دے انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا اور وہ ہر طرح کا پیدا کرنا خوب جاننے والا ہے''۔

﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملك: ٢)

''اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے۔''

عدم کا وصف مخلوق نہیں بیان ہو سکتا۔ [یعنی جب موت پر خلق وارد ہے تو معلوم ہوا کہ موت وجودی صفت ہے] حدیث میں ہے کہ:

''موت کو قیامت کے دن مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، جنت اور دوزخ کے درمیان اس کو ذبح کر دیا جائے گا''۔

(بخاری ٤٧٣٠، مسلم ٢٨٤٩؛ عن ابی سعید؛ و عن ابن عمر ٢٨٥٠؛ ٦٥٤٨)

موت اگرچہ عرض ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو عین کی شکل میں تبدیل فرمائیں گے۔ جیسا کہ نیک عمل کے متعلق آیا ہے کہ نیک عمل

خوبصورت نو جوان کی شکل میں آئے گا اور برا عمل بدصورت انسان کی شکل میں آئے گا''۔

(أحمد١٨٤٩١ ؛ يشير إلى حديث البراء فى عذاب القبر ونعيمه وسؤال الملكين ، وهو حديث طويل سيأتى فى آخر الكتاب بتمامه فى بحث عذاب القبر)

اسی طرح قرآن پاک کے متعلق ہے کہ: ''وہ خوبصورت نو جوان کی شکل میں آئے گا''۔

(دارمی ٢/ ٤٥٠ ؛ ابن ماجه ٣٧٨١ ؛ وأحمد٥/ ٣٤٨ وابن عدى فى الكامل١/ ٣٥؛ والحاكم ١/ ٢٥٦؛ من حديث بريد بن الحصيب مرفوعا بلفظ:"يجىء القرآن يوم القيامة كالرجل الشاحب فيقول لصاحبه: أنا الذى أسهرت ليلك ، وأظمأت هواجرك". قال الحاكم:"صحيح على شرط مسلم"۔ وبيض له الذهبى .وقال البوصيرى فى الزوائد : إسناده صحيح۔[قال الألبانى :قلت: لا ، فإن فيه بشير من المهاجر ، وهو صدوق لين الحديث ، كما قال الحافظ فى " التقريب " فمثله يحتمل حديثه التحسين ، أما التصحيح فهو بعيد.]

نیز اعمال کے بارے میں وارد ہے کہ ان کو ترازو میں رکھا جائے گا، حالانکہ اعراض کا وزن نہیں ہوسکتا۔(أحمد٥/ ٣٤٨)

معلوم ہوا کہ انھیں اعیان میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ اور سورت بقرہ اور آل عمران کے بارے میں وارد ہے کہ:

''قیامت کے دن وہ دونوں سورتیں دو بادلوں یا دو سایوں یا پر پھیلانے والے پرندوں کی دو جماعتوں کی مانند ہوں گی اور جو شخص ان کو پڑھا کرتا تھا ان پر سایہ کریں گی''۔(مسلم٨٠٤؛الحاکم١/ ٥٥٦؛مسند أحمد٥/ ٣٤٨)

نیز صحیح حدیث میں آتا ہے کہ: ''بندوں کے اعمال آسمان کی جانب بلند ہوتے ہیں''۔(بخاری ح:٧٩٩؛ترمذی٤٠٥/ جید)

مزید بحث البعث والنشور کے باب میں ذکر ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

صفات باری تعالیٰ میں کمال کی ازلیت وابدیت:

۱۳.:((مَا زَالَ بِصِفَاتِهِ قَدِيماً قَبْلَ خَلْقِهِ لَمْ يَزْدِدْ بِكَونِهِمْ شَيْئًا لَّمْ يكُنْ قَبْلَهُمْ مِنْ صِفَتِهِ وَكَمَا كَانَ بِصِفَاتِهِ أَزْلِيّاً كَذٰلِكَ لاَ يَزَالُ عَلَيهَا أَبْدِيًا))۔

''وہ مخلوق پیدا کرنے سے پہلے قدیم سے اپنی صفات کے ساتھ رہا،مخلوق کے ہونے سے اس کی صفات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا جو پہلے نہ تھا اور جس طرح اس کی صفات ازلی ہیں؛ وہ ہمیشہ ان سے موصوف رہے گا۔''

تَشْرِیح:...... بے شک اللہ تعالیٰ اور بلند ہمیشہ کمال کی صفات کے ساتھ موصوف رہا ہے؛ بھلے وہ صفات ذاتی ہیں یا فعلی۔ اور ہرگز یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ کسی ایسی صفت کے ساتھ موصوف ہوا جو اس میں پہلے نہ تھی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات صفاتِ کمال ہیں؛ اور ان کا فقدان وصفِ نقص کو مستلزم ہے۔ بھلا اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ پہلے وہ کمال کے ساتھ موصوف نہ تھا؛ اسے بعد میں کمال حاصل ہوا۔ اسی طرح صفات فعلی اور اختیاری وغیرہ سے اس پر اشکال وارد نہیں ہوسکتا؛ مثلاً: پیدا کرنا، شکل بنانا، مارنا، زندہ کرنا، بند کرنا، فراخ کرنا، لپیٹنا، مستوی ہونا، آنا، اترنا، ناراض ہونا، راضی ہونا وغیرہ۔ وہ صفات جن کے ساتھ خود اللہ نے اپنے آپ کو موصوف فرمایا ہے اور جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو موصوف فرمایا ہے۔ اگرچہ ہم ان کی کیفیت اور حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے جو کہ اس کی حقیقی تفسیر ہے؛ اور نہ ہی ہم اپنی رائے ان کی تاویل کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی خواہشات کے ساتھ ہی ان کی کوئی صورت پیش کر سکتے ہیں، اگرچہ صفات کا اصل معنی ہمیں معلوم ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کا قول:: جیسا کہ امام مالک رحمہ اللہ سے ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (اعراف : ٥٤) آیات صفات کے بارے میں سوال ہوا کہ اس کے مستوی ہونے کی کیفیت کیا ہے؟۔ تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا:

"اَلِاسْتِوَاءُ مَعْلُومٌ وَالْكَيْفُ مَجْهُولٌ"[1]

''اللہ کا مستوی ہونا معلوم ہے اور کیفیت مجہول ہے۔''

اگرچہ بعض احوال کا بظاہر کبھی ظہور ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ شفاعت والی حدیث میں ہے:

[1] ۔صاحب کتاب نے امام مالک رحمہ اللہ کا مکمل جواب ذکر کیا ہے؛ اس کے بقیہ الفاظ یہ ہیں: ''الایمان به واجب والسوال عنه بدعة'' اس پر ایمان ضروری ہے اور سوال کرنا بدعت ہے''۔ مراد اس کی کیفیت سے متعلق سوال کرنا ہے۔

اُقول: امام مالک رحمہ اللہ کے اس فرمان سے جو اہم نکات نکلتے ہیں؛ ان کا خلاصہ یہ ہے:

اول: استواء کی حقیقت معلوم ہے۔ کیونکہ اس آدمی نے کیفیت کے متعلق سوال کیا تھا۔ حقیقت کا سوال نہیں کیا۔ اس کے ترجمہ یہ تفسیر میں ''حقیقت'' کا اضافہ اپنی طرف سے تحریف اور جھوٹی دخل اندازی ہے۔ سلف کے قول: ''بلا کیف'' کا یہی معنی ہے۔ یعنی ایسی کیفیت کے بغیر جس کو بشر جانتے ہوں۔

دوم: اللہ تعالیٰ کے استواء پر ایمان رکھنا واجب ہے۔ اور اس کی کیفیت کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ جب استواء کا معنی معلوم ہے تو ایمان رکھنے کے لیے اتنا ہی

کافی ہے۔ کیفیت پر ایمان رکھنے کا مطالبہ ہی نہیں ہوا تو پھر اس کی کھوج میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟۔

سوم: اشاعرہ و ماتریدیہ اور دیگر بعض فرقوں کا ''وجوب تنزیہ'' کا خودساختہ عقیدہ بے بنیاد ہے۔ نہ ہی یہ سنت ہے؛ نہ ہی ایسا کرنا صحابہ کرام یا تابعین رحمہم اللہ کی عادت تھی۔ یہ وجوب بھی ان کا خودساختہ ہے جو جہمیہ کی بے جا تقلید کا نتیجہ ہے۔ اور یہ کہ وہ اوصاف و اسماء جو انسانوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں؛ اگر ان کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے ہو؛ تو پھر ان میں خصائص کا اعتبار نہیں؛ بلکہ پھر وہ اس ذات کے اعتبار سے ہی ہوں گے۔

چہارم: اس قسم کے سوالات کرنے والوں کو سلف صالحین کے دور میں دروس وغیرہ سے نکال دیا جاتا تھا؛ اور انہیں بدعتی کہا اور سمجھا جاتا تھا۔

امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سلف کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان تمام اوصاف سے موصوف کیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیے یا نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیان کئے ہیں۔ ان پر بغیر کسی اعتراض کے یا ان کی کیفیت کے بیان کے بغیر ان پر ایمان رکھنا واجب ہے؛ اور ان کی کیفیت کے تعین کو ترک کرنا لازم ہے''۔ [رسالۂ اہل ثغر ص۱۳۴]

''میرا رب آج اس قدر غصہ میں ہے کہ اس سے پہلے اس طرح غصہ میں نہ تھا اور نہ پھر کبھی اتنا غصہ میں ہوگا''۔ (بخاری و مسلم)

ظہور کے لحاظ سے کسی صفت کا حدوث ممتنع نہیں؛ اس لیے ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ یہ صفت پہلے نہ تھی اب پیدا ہوئی ہے۔

مثال: کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جو شخص آج کلام کر رہا ہے؛ وہ اس سے قبل کل بھی کلام کرتا تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کلام کرنے کی صلاحیت نئی ہے؛ اگرچہ وہ کسی رکاوٹ کی وجہ سے کلام نہ بھی کرتا ہو؛ مثلاً: بچپن میں؛ یا جب کوئی گونگا ہو؛ اور پھر وہ کلام کرنے لگ جائے تو کہا جائے گا کہ وہ بات چیت کرنے کی قوت سے بہرہ ور ہو گیا؛ ایسے ہی جو آدمی بغیر کسی رکاوٹ کے خاموش ہو تو [اس میں کلام کرنے کی قوت موجود ہے] تو اسے زبردستی کلام کرنے والا کہا جاتا ہے۔ وہ جب چاہے کلام کر سکتا ہے اسی طرح بلا کسی رکاوٹ کے کلام نہ کرنے والا بھی متکلم بالقوۃ ہے اور جب وہ کلام کرے گا تو وہ متکلم بالفعل ہوگا بالکل اسی طرح وہ کاتب جو بالفعل کتابت کر رہا ہے وہ کتابت نہ کرنے کی صورت میں کاتب ہونے کے دائرے سے خارج نہیں۔

کیا اللہ تعالیٰ محل حوادث ہے؟

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حوادث کا حلول؛ جس کی مذموم علم کلام میں نفی کی گئی ہے؛ اور اس کی نفی یا اثبات کتاب و سنت میں وارد نہیں ہوئے۔ اس میں اجمال ہے؛ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس میں محدث مخلوقات میں سے کسی چیز کا حلول نہیں ہو سکتا؛ اور نہ ہی کسی ایسے جدید وصف کا حلول ہو سکتا ہے جو پہلے سے نہ ہو؛ تو پھر یہ نفی صحیح ہے۔ اور اگر اس سے صفات اختیاری کی نفی مراد ہے؛ یعنی وہ جو چاہتا ہے نہیں کر سکتا؛ اور وہ جب چاہتا ہے جو بات کرنا چاہتا ہے نہیں کر سکتا؛ اور اس میں ناراضگی اور رضامندی کے اوصاف پائے جاتے ہیں؛ مگر کسی مخلوق کی طرح نہیں۔ اور جس طرح اس نے اپنے اترنے، مستوی ہونے اور آنے کو اپنی شان اور عظمت کے مطابق موصوف کیا ہے [مگر] ہم اس کو موصوف نہیں کر سکتے؛ تو یہ نفی باطل ہے۔

مذموم متکلمین مطلقاً حوادث کے حلول کی نفی کرتے ہیں۔ پس اہل سنت متکلمین کی اس بات کو مان لیتے ہیں؛ وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کی نفی کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے جلال کے مناسب نہیں۔ جب وہ اس نفی کو تسلیم کر لیں تو اس سے صفات اختیاری اور فعلی کی نفی لازم کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اس کے لوازم میں سے ہے۔ بیشک اہل سنت نے ان کی اس نفی کو اجمال کی وجہ سے تسلیم کر لیا ہے؛ اگر ان سے اس کی تفصیل اور وضاحت پوچھی جائے تو ان کی بات کو ہرگز نہ مانا جائے۔

مسئلہ صفات باری تعالیٰ:

ایسے ہی صفات کا مسئلہ بھی ہے۔کیا صفات اللہ کا غیر [یعنی اس کی ذات سے] (زائد) ہیں یا نہیں؟: یہاں پر یہ [زائد کا] لفظ مجمل ہے۔ یہی حال لفظ ''غیر'' بھی ہے۔کبھی اس سے مراد صرف اس کی ذات کے ساتھ لازم لی جاسکتی ہے؛ اور کبھی مراد وہ صفات ہوسکتی ہیں جن کا اس سے جدا ہونا جائز ہے۔

اسی لیے ائمہ اہل سنت اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے کلام پر نہ تو یہ اطلاق کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا غیر ہے؛ اور نہ ہی یہ کہ اس کا غیر نہیں۔اس لیے کہ مطلقاً اثبات یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ صفات اس سے جدا ہیں۔اور مطلق نفی سے محسوس ہوتا ہے وہ صرف وہی ہے (یعنی صفات سے خالی ہے)۔اس لیے کہ جب لفظ غیر میں اجمال پایا جاتا ہے تو اس کے بیان اور تفصیل کے بغیر اس کا اطلاق جائز نہیں۔پس اگر اس سے مراد ایسی خالی ذات ہے جو از خود قائم ہو؛ اور ان صفات سے الگ ہو جو ذات سے زائد ہیں تو یہ صحیح نہیں۔اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ بے شک صفات ذات سے زائد ہیں؛ اور جو معنی ذات سے سمجھا جاتا ہے وہ صفات سے نہیں سمجھا جاتا؛ تو یہ صحیح اور حق ہے۔لیکن خارج میں کوئی ایسی ذات نہیں جو صفات سے خالی ہو۔ بلکہ وہ ذات جو کمال کی صفات کے ساتھ موصوف ہے وہ صفات اس کے ساتھ ثابت ہیں اس سے جدا نہیں ہوتی۔البتہ ذہن ذات اور صفات میں سے ہر ایک کو الگ الگ فرض کر لیتا ہے۔لیکن خارج میں کوئی ذات صفت کے بغیر نہیں ؛ بے شک ایسا ہونا محال ہے۔پس اگر صرف صفت وجود کے علاوہ اور کوئی صفت نہ بھی ہو؛ تو بھی وہ موجود سے الگ نہیں ہوسکتی۔اگر چہ ذہن ذات اور وجود میں سے ہر ایک کا الگ الگ تصور کرتا ہے لیکن خارج میں کوئی ایک دوسرے سے الگ نہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صفات نہ موصوف کا عین ہوتی ہیں نہ ہی غیر ہوتی ہیں۔اس قول کا ایک معنی درست ہے؛ وہ یہ کہ صفت ذات کی موصوف کا عین نہیں جس کو ذہن مجرد ثابت کرتا ہے؛ بلکہ وہ اس کا غیر ہے۔اور نہ ہی موصوف کا غیر ہے۔بلکہ موصوف اپنی صفات سے مل کر ایک ہی چیز ہوتی ہیں؛ جن میں تعدد نہیں ہوتا۔حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں فرق کیا جائے کہ: صفات ذات کا غیر ہوتی ہیں؛ اور اللہ تعالیٰ کی صفات اس کا غیر ہیں۔ان میں سے دوسرا قول باطل ہے۔اس لیے کہ لفظ ''اللہ'' کے مسمیٰ میں اس کی صفات بھی داخل ہوتی ہیں۔بخلاف ذات کے مسمیٰ کے؛ اس میں صفات داخل نہیں ہوتیں۔اس لیے کہ ذات کو ثابت کرنے والوں کے نزدیک اس سے مراد زائد صفات ہیں؛ جبکہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہیں جو اپنی صفات لازمہ کے ساتھ موصوف ہیں۔اسی لیے شیخ رحمہ اللہ نے فرمایا: ''وہ ہمیشہ سے اپنی صفات سے موصوف رہا ہے'' یوں نہیں کہا کہ: ''وہ اور اس کی صفات ہمیشہ رہی ہیں''۔اس لیے کہ عطف کی صورت میں مغایرت کا راستہ نکل سکتا تھا۔

ایسے ہی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے جہمیہ کے ساتھ مناظرہ میں کہا تھا: ''ہم یوں نہیں کہتے: ''اللہ تعالیٰ اور اس کا علم؛ اللہ تعالیٰ اور اس کی قدرت؛ اور اللہ تعالیٰ اور اس کا نور'' لیکن ہم کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ اپنے علم اور قدرت اور نور کے ساتھ ایک ہی معبود برحق ہے''۔

پس جب آپ کہتے ہیں: ''أعـوذ بـالـلـه'' ''میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں'' تو آپ نے ایک ایسی ذات مقدس کی پناہ حاصل کی جو صفات کمال کے ساتھ موصوف ہے وہ ایسی مقدس صفات ہیں جو کسی بھی صورت میں انفصال/علیحدگی کو قبول نہیں کرتی ہیں۔

لیکن جب آپ "أعوذ بعزة الله" کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت کے ساتھ پناہ حاصل کرتے ہیں؛ غیر اللہ سے پناہ نہیں چاہتے۔ اور یہی معنی لفظ ''ذات'' سے بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اصل میں ''ذات'' بھی مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتی ہے: جیسے: ذات وجود، ذات قدرت، ذات عزت، ذات علم، ذات کرم؛ اور ان کی علاوہ دیگر صفات بھی ہیں؛ ان سب میں ذات کا معنی صاحب کا ہے یعنی وہ ذات جو وجود والی ہے قدرت والی ہے وغیرہ۔ لفظ ''ذات'' لفظ ''ذو'' کی مؤنث ہے؛ یہ اس کلمہ کی اصل ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ذات سے صفات کا انفصال/علیحدگی کسی بھی صورت میں ممکن نہیں؛ ہاں ذہن میں صفات سے منفصل/خالی کسی ذات کا فرض کرنا ممکن ہے جیسا کہ محالات کو فرض کر لیا جاتا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ملاحظہ فرمائیں:

((اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَ اُحَاذِرُ .)) ❶۔

''میں اللہ تعالیٰ کی عزت اور اس کی قدرت کے ساتھ اس چیز کے شر سے پناہ پکڑتا ہوں جسے میں پاتا ہوں اور ڈرتا ہوں''۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ۔)) مسلم (۲۷۰۸)۔

''میں اللہ تعالیٰ کے مکمل کلمات کیساتھ پناہ مانگتا ہوں، اس کی مخلوق کے شر سے''۔

نیز آپ ﷺ دعا فرماتے:

((اَللّٰهُمَّ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ))[مسلم 486]

''اے اللہ تعالیٰ میں تیری رضامندی کے ساتھ تیری ناراضگی سے اور تیرے معاف کرنے کے ساتھ تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں اور تیری ذات کے ساتھ تجھ سے پناہ مانگتا ہوں''۔

نیز آپ ﷺ دعا فرماتے:

((وَنَعُوْذُ بِعَظْمَتِكَ اَنْ نُغْتَالَ مِنْ تَحْتِنَا۔)) ❷

''اور ہم پناہ مانگتے ہیں تیری عظمت کے ساتھ اس بات سے کہ ناگہاں ہلاک کیے جائیں اپنے نیچے سے''۔

نیز آپ ﷺ دعا فرماتے ہیں:

((أَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِيْ أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ)) ❸

''میں تیری ذات کے نور کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں جس سے تمام اندھیرے (چھٹ کر) منور ہو گئے۔''

کیا اسم مسمیٰ کا عین ہے یا غیر:

❶۔[مسلم (۲۲۰۲) ابو داؤد (۳۸۹۱)[اس حدیث کی سند صحیح ہے]]

❷۔[بسند صحیح ؛ ابن ماجه: 2/ 332۔أبو داؤد ؛ أحمد4768]

❸۔(ابن اسحاق) حدیث ضعیف ہے۔دیکھیں:الضعیفة ؛ برقم : ۲۹۳۳۔

ایسے ہی متکلمین کا یہ کہنا بھی ہے کہ: ''کیا اسم مسمیٰ کا عین ہوتا ہے یا غیر؟''۔ بہت سے لوگ اس مسئلہ میں غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔ اور وہ اس حق بات سے نا آشنا ہی رہے کہ حقیقت میں کبھی اسم سے مراد مسمیٰ ہوتا ہے اور کبھی اس پر دلالت کرنے والا لفظ مراد ہوتا ہے

مثلاً: جب آپ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا''؛ یا اللہ تعالیٰ نے حمد کرنے والے کی حمد کو سنا، تو اس سے مراد ذات مسمیٰ ہے۔ اور جب آپ کہتے ہیں اللہ عربی اسم ہے الرحمان عربی اسم ہے؛ الرحمان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔ تو یہاں پر اسم سے مراد مسمیٰ ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ لفظ غیر میں اجمال ہے۔ ہاں اگر مغایرت سے مراد یہ ہے کہ لفظ معنیٰ کا غیر ہے؛ تو یہ درست ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ تھا اس کا کوئی نام نہ تھا پھر اس نے اپنے اسماء کا خلق کیا؛ یا مخلوق نے اللہ تعالیٰ کے وہ نام اپنی طرف سے رکھے، تو یہ بہت بڑی گمراہی اور الحاد ہے وہ راہِ راست سے بھٹک چکے ہیں''۔ [الشفاء ۱/ ۲۷۷]

معتزلہ، جہمیہ، شیعہ کا رد:

شیخ رحمہ اللہ نے متن میں فرمایا: ''مَا زَالَ بِصِفَاتِهِ قَدِيْماً قَبْلَ خَلْقِهِ ......الخ ''۔ [آپ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں وضاحت فرما کر] معتزلہ، جہمیہ، اور ان کے ہمنوا شیعہ کا رد کرنا چاہا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فعل اور کلام پر قادر ہوا؛ اس کے بعد کہ وہ پہلے ان پر قادر نہ تھا۔ اس لیے کہ اس کے حق میں فعل اور کلام ممتنع تھا؛ پھر ممکن ہوا۔

علی بن کلاب اور اشعری اور ان کے ہم خیال لوگ بھی یہی کہتے ہیں: ''بے شک اللہ تعالیٰ کے لیے فعل اور کلام ممکن ہوا ہے؛ پہلے ممتنع تھا؛ اور ان کے نزدیک [کلام] امتناع ذاتی سے امکانِ ذاتی میں بدل گیا''۔ مشیئت اور قدرت کے تحت مندرج نہیں؛ بلکہ وہ تو ایک ہی چیز ہے جو کہ اس کی ذات کے ساتھ لازم ہے۔

علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے التمہید ۳/ ۳۵۱ پر لکھا ہے: ''اہل سنت کا ان تمام صفات کے اقرار پر اجماع ہے جو کتاب وسنت میں وارد ہوئی ہیں؛ اور وہ ان پر ایمان رکھتے؛ اور انہیں حقیقت پر محمول کرتے ہیں نہ کہ مجاز پر؛ ہاں وہ ان میں سے کسی بھی چیز کی کوئی کیفیت بیان نہیں کرتے۔ اور نہ ہی وہ اس میں کوئی صفت محصور پاتے ہیں۔ جبکہ اہل بدعت جہمیہ اور تمام معتزلہ اور تمام خوارج اس کا انکار کرتے ہیں؛ وہ ان میں سے کسی بھی چیز کو حقیقت پر محمول نہیں کرتے۔ اور یہ خیال کرتے ہیں جو کوئی ان کا اقرار کرتا ہے؛ وہ مشبہ ہے؛ اور وہ خود اسماء وصفات کے قائلین کے نزدیک معبود کی نفی کرنے والے ہیں''۔ اہل سنت کا عقیدہ حضرات صحابہ کرام وتابعین عظام رحمہم اللہ کے عقیدہ کے مطابق وموافق ہے۔

جہمیہ کا عقیدہ:

اس کلام کی اصل ابتداء جہمیہ سے ہوئی ہے؛ بے شک وہ کہتے ہیں: حوادث کا دوام ممتنع ہے۔ اور بے شک یہ ضروری ہے کہ حوادث کا کوئی آغاز/ مبداء ہو۔ اس لیے کہ حوادث میں یہ بات ممتنع ہے کہ اس کی ابتدا ہی نہ ہو۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ سے اپنی مشیئت سے فاعل متکلم ہونا ممتنع ہوا؛ بلکہ اس پر قادر ہونا بھی ممتنع ہوا۔ اس لیے کہ ممتنع پر قدرت ہونا بھی ممتنع ہے۔ ان کی یہ سب باتیں فاسد ہیں۔ اس لیے کہ ان سے تو عالم کے حدوث کا امتناع لازم آتا ہے؛ حالانکہ عالم حادث ہے۔ اور حادث جب عدم کے بعد معرض وجود میں آتا ہے تو وہ لازمی طور پر ممکن ہوتا ہے۔ اور امکان کے لیے کوئی وقت متعین نہیں کیا جا سکتا۔ جو وقت بھی متعین کیا جائے گا امکان اس میں ثابت ہو گا۔ اس لیے کہ فعل کے امکان؛ اور اس کے جواز اور صحت کے لیے کوئی مبدأ نہیں جس کی طرف اس کی انتہاء ہوتی ہو؛ پس یہ واجب ہوتا ہے کہ فعل ہمیشہ سے ممکن؛ جائز اور صحیح رہا ہو۔ پس اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر ہمیشہ سے قادر رہا ہو؛ اس سے ایسے حوادث کا جواز اور امکان ثابت ہوا جن کے مبدأ کی انتہا نہیں۔

ایک اعتراض اوراس کا جواب:

[اعتراض]: جہمیہ اوران کے ہم خیال فرقے کہتے ہیں: ''ہم نہیں مانتے کہ حوادث کے امکان کا مبدأ ہی نہیں۔ ہاں ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ حوادث کا امکان اس شرط کے ساتھ کہ وہ مسبوق بالعدم ہیں؛ ان کا مبدأ نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک حوادث کا قدیم النوع ہونا ممتنع ہے۔ بلکہ اس کی نوع کا حدوث واجب ہے اوران کا قدم ممتنع ہے۔ لیکن کسی متعین وقت میں حدوث واجب نہیں ہوتا۔ پس حوادث کا امکان اس شرط کے ساتھ کہ حوادث مسبوق بالعدم ہوں ان کا مبدأ نہ ہو؛ یہ جنس حوادث کے خلاف ہیں۔

[جواب]: ان سے کہا جائے گا: تصور کریں تم ایسی بات کہتے ہو؛ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ مھارے نزدیک جنس حوادث کے امکان کے لیے مبدأ ہے۔ پس جب مھارے نزدیک جنس کا حدوث ممکن ہوا؛ حالانکہ پہلے وہ ممکن نہ تھا۔ اوراس امکان کے لیے کوئی [متعین] وقت نہیں؛ بلکہ جو بھی وقت فرض کیا جائے گا؛ اس سے پہلے امکان ثابت ہوگا۔ تو اس سے امکان کا دوام لازم آتا ہے وگرنہ لازم آئے گا کہ بغیر کسی حدوث کے جنس امتناع سے امکان کی جانب پلٹ جائے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ جنس حدوث یا جنس حوادث یا جنس فعل؛ یا جنس احداث؛ یا اس سے مشابہ عبارات؛ [حقیقت میں تبدیلی] امتناع سے امکان کی جانب ہے۔ یعنی وہ بلا سبب تجدد ممتنع ہونے کے بعد ممکن اور جائز بننے والا ہے۔ یہ بات صریح عقل کی روشنی میں ممتنع ہے۔ مزید برآں یہ کہ یہ تو جنس کا انقلاب امتناع ذاتی سے امکان ذاتی کی طرف ہورہا ہے۔ اور بے شک جنس حوادث کی ذات ان کے ہاں ممتنع ہونے کے بعد ممکن ہوجاتا ہے۔ اور یہ تبدیلی کسی خاص وقت کے ساتھ مختص نہیں۔ پس اس لیے کہ جو وقت بھی تسلیم کیا جائے گا اس سے پہلے امکان ثابت ہو گا۔ تو اس سے لازم آیا کہ تبدیلی ہمیشہ ممکن ہے۔ پس اس سے یہ بھی لازم آیا کہ ممتنع ہمیشہ سے ممکن ہے۔ ہمارا یہ انداز امتناع کے بارے میں اس انداز سے زیادہ مؤثر/ بلیغ ہے کہ حادث ہمیشہ ممکن ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے جس طرف فرار اختیار کیا اس سے انھیں جو چیز لازم آئی وہ زیادہ بلیغ ہے بہ نسبت اس کے جس سے انھوں نے فرار اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ حادث کا ممکن ہونا معقول ہے اور امکان کا دوام بھی معقول ہے البتہ ممتنع کا ممکن ہونا یا فی نفسہ ممتنع ہے تو کس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے کہ امتناع کا ہمیشہ امکان رہا ہے۔ یہ مسئلہ دوسری جگہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے''۔ [منہاج السنہ ۱/ ۱۵۶-۱۶۰]

خلاصہ:

حاصل کلام! کیا نوع حوادث کا دوام مستقبل اور ماضی میں ممکن ہے یا نہیں؟ یا صرف مستقبل میں ممکن ہے؟ یا صرف ماضی میں ممکن ہے؟

اس میں مناظرین اہل اسلام اور دیگر حضرات کے تین اقوال ہیں:

اول: سب سے کمزور قول اس شخص کا ہے جو کہتا ہے: ''حوادث کا دوام ماضی اور مستقبل میں ممکن نہیں''۔

یہ قول جہم بن صفوان [۱۲۸ھ] اور ابو الہذیل علاف [۱۳۵ھ-۲۳۵ھ] کا ہے۔

دوم: اس شخص کا قول ہے جو کہتا ہے: ''مستقبل میں تو دوام ممکن ہے لیکن ماضی میں ممکن نہیں''۔

یہی قول اکثر متکلمین اوران کے ہم مشرب فقہاء اور دیگر حضرات کا ہے۔

سوم: ان لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں: ''حوادث کا دوام ماضی، مستقبل دونوں میں ممکن ہے'' جیسا کہ ائمہ حدیث کا عقیدہ ہے۔ یہ بڑے اہم مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔[منہاج السنہ ۱/۱۷۶]

کسی ایک نے یہ نہیں کہا کہ حوادث کا دوام ماضی میں ممکن ہے مستقبل میں ممکن نہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام مکتبِ فکر کے جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کے سوا ہے وہ مخلوق ہے؛ وہ پہلے نہ تھی بعد میں وجود میں آئی ہے۔ یہی تمام پیغمبروں اور ان کے پیروکار مسلمانوں یہودیوں عیسائیوں اور دیگر کا عقیدہ ہے''۔[منہاج السنہ ۱/ ۳۵۹]

اس بات کے بدیہی ہونے میں کچھ شک نہیں کہ کسی مفعول کا فاعل کے ساتھ ہمیشہ سے مقارن ہونا؛ اور ہمیشہ کے لیے مقارن ہونا ممتنع اور محال ہے۔ اور جب مستقبل میں حوادث کا تسلسل اس سے مانع نہیں کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی وہ آخر ہو جس کے بعد کوئی چیز نہ ہو، اسی طرح ماضی میں حوادث کا تسلسل اس سے مانع نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی وہ اول ہو جس سے پہلے کوئی چیز نہیں۔ اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ تک رہے گا۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ (آل عمران : ٤٠)

''اس نے کہا اس طرح اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾ (البقرہ: ٢٥٣)

''اور لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ (البروج: ١٥،١٦)

''عرش کا مالک بڑی شان والا ہے جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾ (لقمان: ٢٧)

''اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب) قلم ہوں اور سمندر (کا پانی) سیاہی ہو اور اس کے بعد سات سمندر اور (سیاہی ہو جائیں) تو اللہ تعالیٰ کی باتیں (یعنی اس کی صفتیں) ختم نہ ہوں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (الکهف: ١٠٩)

''کہہ دو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے (لکھنے کے) لیے سیاہی ہوں تو قبل اس کے کہ میرے رب کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے، اگرچہ ویسا ہی اس کی مدد کو لائیں۔''

یہاں پر ثابت کمال ممکن الوجود ہے؛ پس اس صورت میں جب نوع دائی ہو؛ تو ممکن اور اکمل یہ ہے کہ اسے افراد میں سے ہر ایک فرد پر اس طرح سے تقدم حاصل ہو کہ اجزاء کائنات میں کوئی چیز کسی بھی لحاظ سے اس کے ساتھ مقارن (ملی ہوئی) نہ ہو۔ جبکہ دوامِ فعل بھی کمال میں سے ہے۔ اس لیے کہ جب فعل صفت کمال میں سے ہے؛ تو اس کا دوام بھی کمال کا دوام ہے''۔[منہاج السنہ ۱/ ۴۱۹]

تسلسل اور اس کی اقسام:

تسلسل کا یہ لفظ مجمل ہے کتاب وسنت میں نہ اس کی نفی یا اثبات کچھ بھی وارد نہیں ہوا۔ اس کی تین قسمیں ہیں: واجب، ممتنع، ممکن۔ مؤثرین میں تسلسل محال ممتنع بالذات ہے۔ مؤثرین میں تسلسل کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے پہلے سے اثر لیا ہے اور اس سلسلہ کی کوئی انتہاء نہ ہو۔

۱۔ تسلسل واجب؛ جیسے ابد الآباد کے لیے اللہ تعالیٰ کے افعال کو دوام؛ پر عقل اور شرع دونوں دلالت کرتی ہیں؛ مثلاً: اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اہل جنت کے لیے ہمیشہ ہیں جب بھی اہل جنت کی نعمتیں اختتام پذیر ہوں گی تو ان کے لیے متبادل نعمتیں پیدا کر دی جائیں گی جو ختم نہ ہوں گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے افعال میں تسلسل ازلی بھی ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ کا ہر فعل دوسرے کے بعد ہے یہی تسلسل اللہ تعالیٰ کے کلام میں بھی ہے وہ ہمیشہ سے متکلم رہا ہے جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے لیکن اس کی صفت کلام کے لیے حدوث نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے افعال جو اس کی صفت ''حیات'' کو لازم ہیں اس لیے کہ ہر ''حیات'' کی صفت والا فعال ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حی اور میت (زندہ اور مردہ) میں فرق صرف فعل کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر سلف صالحین الحيُّ الفعال کہتے ہیں۔ عثمان بن سعید نے کہا کہ: ''ہر حیّ فعال یعنی حیّ وہ ہے جو کام کرنے والا ہے۔ پس ہمارا رب کسی وقت میں بھی کمال کی صفت سے خالی نہیں رہا اسی طرح نہ وہ کلام ارادہ فعل کے وصف سے خالی ہے۔

۳۔ تسلسل ممکن اس کے مفعولات کے لحاظ سے ہے ازلیت، ابدیت دونوں طرفوں کا خیال رکھا جاتا ہے اس لیے کہ جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیشہ سے حی قادر مرید[ارادہ کرنے والا] اور متکلم ہے؛ اور ایسا ہونا اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے؛ تو ان صفات کے لحاظ سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے لیے افعال ممکن ہیں۔ اور یہ وہ غیر فعال ہونے کے بجائے زیادہ اکمل انداز میں افعال بجا لائے ہوں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خلق ہمیشہ اس کے ساتھ رہی ہو۔ اسی لیے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ تو تمام مخلوق کے ہر ہر فرد پر ایسے مقدم ہیں جس کی ابتداء ہی نہیں ہے؛ پس ہر مخلوق کی ابتداء ہوتی ہے؛ لیکن خالق سبحانہ وتعالیٰ کی کوئی ابتداء نہیں؛ وہ اکیلا خالق ہے اور اس کے ماسویٰ تمام مخلوق ہیں انہیں عدم کے بعد وجود ملا ہے۔

انہوں نے کہا ہے: ''پس اس کے علاوہ باقی جتنے بھی اقوال ہیں؛ صریح عقل ان کا رد کرتی ہے؛ اور ان کے باطل ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ ہر وہ شخص جو اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فعل پر ہمیشہ سے قادر ہے اس کو دو میں سے ایک بات لازم آئے گی؛ اس سے کوئی چارہ نہیں؛ یا اس کو اس بات کا قائل ہونا ہوگا کہ فعل ہمیشہ سے ممکن ہے۔ یا اس بات کا کہ وہ ہمیشہ سے وقوع پذیر ہے۔ وگرنہ کھلم کھلا تناقض لازم آئے گا۔ جب اس کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے فعل پر قادر ہے اور فعل محال ممتنع لذاتہٖ ہے؛ اگر وہ اس کا ارادہ کرے تو اس کا وجود ممکن نہیں؛ بلکہ اس کے نزدیک تو اس کے ارادہ کو فرض کرنا محال ہے جب کہ وہ اس پر قادر بھی ہے اس قول کا بعض

دوسرے بعض کا مخالف ہے''۔[شفاء ۱/۱۵۶]

مقصود یہ ہے کہ جس چیز پر شریعت اور عقل دلالت کر رہی ہے اللہ تعالیٰ کے ماسویٰ ہر چیز مخلوق ہے پہلے اسے عدم سے وجود ملا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ فعل سے معطل رہا پھر وہ فعل بجالایا؛ تو شرع اور عقل میں اس کا اثبات نہیں ہے، بلکہ دونوں اس کی نقیض پر دلالت کرتے ہیں''۔[منہاج السنہ ۱/۴۲۰]

ابوالمعالی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الارشاد'' میں اور دیگر اہل فکر نے تسلسل فی الماضی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر آپ کہیں میں تجھے ایک درہم نہیں دوں گا مگر اس کے بعد تجھے ایک درہم دوں گا یہ تو ممکن ہے اور اگر آپ کہیں کہ میں تجھے ایک درہم نہیں دوں گا، یہاں تک کہ تجھے اس سے پہلے ایک درہم دوں گا تو یہ ناممکن ہے۔ مذکورہ تمثیل اور موازنہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح موازنہ یہ ہے کہ آپ کہیں میں نے تجھے ایک درہم نہیں دیا مگر اس سے پہلے ایک درہم دیا ہے۔ اس میں ماضی سے پہلے ایک اور ماضی کا ذکر کیا ہے جیسا کہ تو نے پہلے مستقبل کے بعد ایک مستقبل کا ذکر کیا ہے۔ لیکن قائل کا یہ قول کہ میں تجھے نہیں دوں گا یہاں تک کہ اس سے پہلے تجھے دوں، میں اس میں مستقبل کی نفی ہے اس کا حصول مستقبل میں ہوگا تو اس مستقبل سے پہلے مستقبل کی نفی کر دی ہے۔ یہ ممتنع ہے البتہ ماضی کی نفی کہ اس سے پہلے ماضی ہو یہ ممکن ہے وہ عطاء جو زمانہ مستقبل میں ہے اس کا آغاز بھی مستقبل میں ہے اور وہ عطاء جس کی ابتداء اور انتہا ہے اس سے قبل وہ چیز نہیں ہے جس کی انتہا نہیں ہے اس لیے کہ غیر متناہی کا متناہی میں ہونا ممتنع ہے۔[منہاج السنہ ۱/۴۳۵]

اسم خالق اور باری کی اُزلیت:

۱۴:((لَيْسَ بَعْدَ خَلَقَ الْخَلْقَ اسْتَفَادَ اسمَ الْخَالِقِ وَلاَ بِإِحْدَاثِ الْبَرِيَّةِ اسْتَفَادَ اسْمُ الْبَارِى)) ❶۔

''مخلوق کی تخلیق کے بعد سے اسم ''خالق'' کا استفادہ نہیں کیا؛ اور نہ ہی کائنات کو پیدا کر کے اسم ''الباری'' کا ''استفادہ کیا ہے''

ش :......ظاہر میں شیخ رحمہ اللہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہاں زمانۂ ماضی میں حوادث کا تسلسل ممنوع ہے؛ اور آپ کے کلام میں یہ بحث آگے آئے گی؛ جو دلالت کرتی ہے کہ لیکن مستقبل میں آپ اس کو ممنوع نہیں سمجھتے۔ چنانچہ شیخ رحمہ اللہ کا قول: ''جنت، دوزخ مخلوق ہیں ان پر فنا طاری ہوگا اور نہ ہی وہ کبھی اختتام پذیر ہوں گی'' بھی اس پر دلالت کر رہا ہے۔ جمہور محدثین رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے جیسا کہ اس کا ذکر گزر چکا۔ اور ان لوگوں کا عقیدہ فاسد ہونے میں کچھ شک نہیں جو حوادث کے تسلسل کو ماضی، مستقبل میں ممنوع قرار دیتے ہیں؛ جیسے جہم میں صفوان اور اس کے پیروکار کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ دونوں فنا ہو جائیں گی۔ اس کے دلائل آگے آئیں گے۔

❶ ۔:الخلق: ''مخلوق'' یہ لفظ کبھی تقدیر اور ایجاد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ خالق اور خلاّق ہیں بھلے وہ کچھ بھی نہ پیدا کریں۔
الباری: وہ ذات جو چیزوں کو عدم سے وجود کی طرف لاتی ہے۔

لیکن جو لوگ جو حوادث کے جواز کے قائل ہیں کہ ان کی ابتداء ہی نہیں؛ اور جو لوگ کہتے ہیں: حوداث کی انتہاء ہی نہیں؛ ان لوگوں کا قول ان کے قول کی نسبت سے زیادہ درست معلوم ہوتا ہے جو ان دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے زندہ ہے اور فعل حیات کے لوازم سے ہے؛ پس وہ ہمیشہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُo فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُo﴾ (البروج: ۱۵،۱٦)

''عرش کا مالک بڑی شان والا ہے جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔''

یہ آیت مبارکہ چند امور پر دلالت کرتی ہے:

اول: اللہ تعالیٰ کے افعال اس کے ارادہ اور مشیئت کے ساتھ ہوتے ہیں۔

دوم: وہ ہمیشہ سے اسی طرح ہے۔ اس نے اس وصف کا ذکر اپنی ذات کو مدح وثنا کے مقام میں کیا ہے۔ اور بے شک یہ اللہ تعالیٰ کے کمال میں سے ہے۔ اور اوقات میں سے کسی بھی وقت میں اس کے اس کمال کا معدوم ہونا جائز نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَo﴾ (النحل: ۱۷)

''تو جو پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو پیدا نہ کر سکے تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے۔''

جب اللہ تعالیٰ کمال وجلال سے موصوف ہے تو پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ پہلے معدوم تھا پھر وجود میں آیا۔

سوم: وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کر گزرتا ہے۔ بیشک یہاں پر لفظ ''ما'' موصولہ عام ہے؛ یعنی وہ جو بھی کرنا چاہتا ہے؛ کرتا ہے۔ اور اس کے جس ارادہ کا تعلق بندہ کے فعل کے ساتھ ہے تو اس کا حال مختلف ہے۔ اگر وہ بندہ سے فعل کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس کو مدد دینے کا ارادہ نہیں کرتا اور نہ اس کو فاعل بنانا چاہتا ہے تو فعل وجود میں نہیں آتا۔ لیکن اگر اس کا ارادہ ہو؛ اور وہ خود اس کو فاعل بنانا چاہتا ہو؛ [تو فعل معرض وجود میں آتا ہے]۔ یہی وہ نکتہ ہے جو قدریہ اور جبریہ کی نظروں سے اوجھل رہا اور وہ مسئلہ تقدیر میں راہ صواب سے بھٹک گئے۔ ایسا اس مسئلہ سے ان کی غفلت کی وجہ سے ہوا۔ پس فرق واضح ہو گیا اس میں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ بندہ فعل کرے اور اس میں کہ وہ اس کو فاعل بنانے کا ارادہ کرتا ہے مزید وضاحت مسئلہ تقدیر میں آئے گی۔

چہارم: اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور اس کا فعل دونوں متلازم ہیں جس کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسے کر لیتا ہے اور جس کام کو اس نے کیا؛ اس کا ارادہ بھی کیا۔ بخلاف مخلوق کے۔ اس لیے کہ مخلوق کبھی ایسے کام کا ارادہ کرتی ہے جس کو نہیں کر پاتی اور کبھی جس کام کا ارادہ نہیں کرتی اس کو کر لیتی ہے پس یہاں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی ہستی ایسی نہیں جس کا وصف یہ ہو کہ وہ جو ارادہ کرے اسے کر گزرے۔

پنجم: افعال کے لحاظ سے متعدد ارادے ثابت ہیں؛ اور ہر فعل کے لیے اس کا ایک خاص ارادہ ہوتا ہے یہ نظریہ فطرت انسانی میں راسخ ہے۔ لیکن اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ارادہ کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

ششم: ہر وہ فعل جس کے ساتھ اس کے ارادہ کا تعلق صحیح ہے اس کا کرنا درست ہے تو جب وہ ارادہ کرتا ہے کہ ہر رات آسمان دنیا کی جانب نزول کرے اور قیامت کے دن فیصلہ کے لیے آئے اور اپنے بندوں کو اپنا دیدار کرائے اور اپنی مشیئت کے مطابق ان کے سامنے تجلی فرمائے، ان سے ہم کلام ہو ان سے ہنسی کرے، ان کے علاوہ جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کرنا چاہے تو اس کا فعل اس پر ممتنع نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ: ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ (البروج: ١٦) ''اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔ البتہ ان سب افعال کی صحت رسول اکرم ﷺ کے خبر دینے پر موقوف ہے۔ تو جب رسول اللہ ﷺ کسی فعل کی خبر دیتے ہیں تو اس کو تسلیم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے؛ اور جس کو چاہتا ہے اس کو ثابت کرتا ہے؛ ہر دن وہ کسی کام میں ہوتا ہے؛ سبحانہ وتعالیٰ۔

حوادث کی ابتداء؟

یہ کہنا کہ حوادث کا اول ہے؛ اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے بیکار رہا ہو؛ اور اللہ تعالیٰ پہلے سے غیر فعال تھے: پھر فاعل بنے؛ [اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ نظریہ/عقیدہ غلط ہے]۔ اس سے عالم کا قدیم ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسویٰ ہر چیز حادث/مخلوق؛ ممکن الوجود ہے۔ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے ساتھ ہے۔ وگرنہ فی نفسہ اس پر عدم اور فقر طاری تھا اور اللہ تعالیٰ کے ماسویٰ ہر چیز میں فقر اور احتیاج اس کا لازمی اور ذاتی وصف ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ واجب الوجود لذاتہٖ ہے ذاتی طور پر اس میں غنا موجود ہے۔ اور غنی ہونا اللہ تعالیٰ کی ذات کا لازمی وصف ہے۔

تخلیق کائنات کی ابتداء:

اس عالم کے بارے میں لوگوں کے دو قول ہیں؛ کہ کیا وہ مادہ سے مخلوق ہے یا نہیں؟، پھر یہ اختلاف ہے کہ اس عالم میں اولاً کس

چیز کو پیدا کیا گیا؟۔ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ (ھود: ۷)

''اور اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہیں جس نے آسمان وزمین کو چھ دن میں پیدا کیا؛ اس کا عرش پانی پر تھا''۔

بخاری اور دیگر کتب میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ [652ء] سے مروی ہے کہ:

''یمن کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے: ہم آپ کے پاس دین میں سمجھ حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں اور ہم آپ سے اس عالم کے آغاز کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تھا اس سے پہلے کچھ نہ تھا''[1]۔

[1] بخاری [۷۴۱۸] میں ایک مقام پر مکمل روایت نہیں ہے کچھ حصہ بدء الخلق اور کچھ حصہ التوحید میں ہے۔امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحیح: ورواية" معه" لم أجدها عند البخاري. وقد أخرج الحديث في موضعين من "صحيحه"-بدء الخلق والتوحيد بالروايتين الأخيرتين:"قبله" و" غيره"- وبالأخرى منهما أخرجه البيهقي في " الأسما والصفات 6و270، ورواه أحمد 4/ 431؛ بالرواية الأولىٰ منهما، لكن بلفظ :" كان الله تبارك وتعالىٰ قبل كل شيءٍ"- وعزاه الذهبي في مختصر العلو 98/ 40 . للبخاري؛ وقال :حديث صحيح- انظر المقدمة ص ,27 . وكلام الحافظ ابن حجر في شرحه للحديث يشعر بأن هذه الرواية معه لم يقف عليها، فقد قال :206 /6تنبيه :وقع في بعض الكتب في هذا الحديث:"كان الله ولا شيءَ معه، وهو الآن على ما عليه كان . وهي زياد ليست في شيء من كتاب الحديث، نبه على ذلك العلامة تقي الدين ابن تيمية، وهو مسلم في قوله:" وهو الآن إلى آخره......"-وأما لفظ:"ولا شيء معه" فرواية الباب بلفظ: " ولا شيء غيره بمعناها"- قلت: فلو أن عند الحافظ علم بهذه الرواية لذكرها، واستغن بذلك عن الاحتجاج عليها بمعنى الرواية التي ذكرها، كما هو ظاهر ,والله علم.

ایک روایت میں ہے:''اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی''۔[1319]

ایک روایت میں ہے:''اس کے ساتھ اس کا غیر نہ تھا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔اس نے لوح محفوظ میں ہر چیز کو لکھا ہوا ہے، اس نے آسمانوں زمین کو پیدا کیا''۔''ایک روایت میں ہے: پھر زمین وآسمان کو پیدا کیا''۔[منہاج السنہ ۱/ ۳۶۱]

حدیث میں ''کتب فی الذکر'' سے مراد لوح محفوظ میں لکھنا ہے۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ﴾ (الانبیاء: ۱۰۵)

''اور ہم نے نصیحت (کی کتاب یعنی تورات) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔''

لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اس کو بھی ذکر کہا جاتا ہے۔جیسا کہ جس چیز کو کتاب میں لکھا جاتا ہے اس کو بھی کتاب کہا جاتا ہے۔مذکورہ حدیث میں لوگوں کے مشہور دو قول ہیں:

[پہلا قول]: کچھ حضرات کہتے ہیں: حدیث میں مقصود اللہ تعالیٰ کا خبر دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکیلا ہی موجود تھا وہ ہمیشہ اسی طرح رہا ہے؛ پھر اس نے تمام مخلوقات کو پیدا فرمانا شروع کیا۔پس مخلوقات کے جنس اور اعیان تمام مسبوق بالعدم تھے۔اور جنسِ زمان بھی حادث ہے جس کا کوئی زمانہ نہیں۔اور اللہ تعالیٰ فعل کا فاعل ہے جبکہ وہ ازل سے ابتداء فعل تک کچھ نہیں کرتا تھا اور نہ فعل ممکن تھا۔

[دوسرا قول]: اللہ تعالیٰ کی مراد اس عالم مشہود کی تخلیق کی ابتداء کے بارے میں خبر دینا ہے کہ اس نے اس جہان کی چھ دن میں تخلیق ہوئی؛

پھر وہ عرش پر مستویٰ ہوا۔اسی قسم کا مفہوم قرآن پاک میں متعدد مقامات میں موجود ہے۔

صحیح مسلم میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ [۷ق ھ؛۶۲ ھ] نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیر کو آسمانوں، اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل مقدر فرمایا اور اس کا عرش پانی پر تھا''۔

اس حدیث میں رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ: ''آسمانوں، زمینوں کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیر کو چھ دن میں مقدر فرمایا، اس وقت اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا''۔ یہ قول صحیح ہے۔

دوسرے قول کی صحت کی وجوہ:

اس دوسرے قول کے صحیح ہونے کی کئی وجوہات ہیں:

اول: یمن کے لوگوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا ہے آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں تاکہ ہم آپ سے اس کائنات کے آغاز کے بارے میں دریافت کریں''۔ یہ اس عالم مشہود و موجود کی طرف اشارہ ہے؛ یہاں پر امر مامور کے معنی میں ہے۔ یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے بنایا۔ آپ ﷺ نے ان کو اس موجود کائنات کے آغاز کے بارے میں جواب دیا؛ نہ کہ مخلوقات کی جنس کے بارے میں۔ اس لیے کہ انہوں نے آپ ﷺ سے اس بارے میں پوچھا ہی نہیں تھا۔ آپ نے انھیں مطلع کیا کہ جب اس نے آسمانوں کو زمین کو پیدا فرمایا تو اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا؛ اس کے علاوہ کوئی چیز نہ تھی''۔ اس حدیث میں عرش کی تخلیق کا ذکر نہیں ہے ظاہر ہے کہ عرش اس سے پہلے پیدا کیا جا چکا تھا۔

نیز ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تھا، اس سے پہلے اور کچھ نہ تھا''۔ اس روایت میں قبل (یعنی پہلے) کے علاوہ (معہ) (اس کے ساتھ وغیرہ) (اس کے علاوہ) کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے راویوں نے روایت بالمعنیٰ کی ہے۔ جب کہ ایک ہی مجلس میں یہ بات کی گئی ہے البتہ (قبل) کے لفظ کو ترجیح ہے۔ صحیح مسلم کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ اپنی دعا میں یہ کلمات کہا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَیْءٌ))[مسلم ٤٦/ ٢٧١٣]

''اے اللہ! تو اول ہے، تجھ سے پہلے کوئی چیز نہ تھی''۔

دوسرے دو الفاظ میں سے ایک بھی دوسری جگہ پر ثابت نہیں۔ اسی لیے بہت سارے محدثین نے اسے لفظ ''قبل'' کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جیسے حمیدی نے مسند میں (الجمع ۵۵۸)؛ بغوی رحمہ اللہ نے ''مشکاۃ'' (۵۶۹۸) میں؛ اور ابن اثیر نے ''جامع الأصول'' (۱۹۸۸) میں روایت ہے۔ جب بات ایسے ہی ہے تو یہاں پر ابتدائے تخلیق/حوادث کی بات ہی نہیں ہو رہی؛ اور نہ ہی سب سے پہلی مخلوق کی بات کی جا رہی ہے۔

مزید برآں یہ بھی فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ تھا اس سے پہلے کچھ نہ تھا'' اور ''اس کے ساتھ کچھ نہ تھا'' اور ''اس کے علاوہ کچھ نہ تھا'' اور اس کا عرش پانی پر تھا کے الفاظ بھی منقول ہیں۔ اور یہ حدیث: ''وَ كَتَبَ فِي الذِّكْرِ كُلَّ شَيْءٍ '''' اس نے ذکر میں ہر ایک چیز تحریر کر دی ہے''۔ پس ان تین چیزوں کے متعلق حرف واؤ کے عطف کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اور پھر فرمایا: ''وَخَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَ

الأَرْضَ ''۔ یہ حرف ''واؤ'' کے ساتھ بھی مروی ہے؛ اور حرف ''ثم'' کے ساتھ بھی۔

پس ظاہر ہوا کہ اس کا مقصود انہیں زمین و آسمان اور ان میں موجود چیزوں کی تخلیق کی ابتداء کی خبر دینا ہے؛ اور یہی وہ مخلوق ہیں جنھیں چھ دن میں پیدا فرمایا۔ یہ ذکر نہیں ہے کہ کس مخلوق کو اولاً پیدا فرمایا۔ اس حدیث میں زمین و آسمان کا ذکر ان کی تخلیق پر دلالت کرتا ہے؛ اور اس چیز کا بھی ذکر کیا؛ جو اس کے ہونے اور وجود پر دلالت کرتا ہے؛ مگر یہاں پر ابتدائی تخلیق سے تعرض نہیں کیا۔ مزید برآں جب حدیث مبارکہ میں ہر دو طرح سے وارد ہوا ہے؛ تو بغیر کسی دلیل کے کسی ایک چیز کو حتمی طور پر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ پس جب ان دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح حاصل ہو جائے؛ تو پھر بھی جو کوئی دوٹوک طور پر کہے: رسول اللہ ﷺ کی مراد کوئی دوسرا معنی تھا؛ تو ایسا انسان خطا کار ہے۔ کیونکہ کتاب و سنت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو دوسرے معانی پر دلالت کرتی ہو۔ پس کسی ایسی چیز کو ثابت کرنا جائز نہیں جس کے متعلق یہ خیال ہو کہ یہ حدیث ہے۔ یہ حدیث کہ: ''کان الله و لا شئی معه'' سے اس کا خالی اور مجرد ہونا مراد نہیں۔ بلکہ یہ اس مذکورہ سیاق کے ضمن میں وارد ہوا ہے۔ پس کوئی یہ گمان نہ رکھے کہ: اس کا معنی اللہ تعالیٰ کے متعلق خبر دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے بیکار رہے یہاں تک زمین و آسمان کو پیدا کر لیا۔ مزید برآں یہ حدیث کہ اللہ تعالیٰ تھا؛ اور اس سے پہلے کچھ بھی نہیں تھا؛ یا اس کے ساتھ کچھ نہ تھا؛ یا اس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا؛ اور اس کا عرش پانی پر تھا......'' سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ صرف اکیلا تھا۔ اس کے ساتھ قطعاً کوئی مخلوق نہ تھی۔ کیونکہ یہ جملہ: ''و کان عرشه علی الماء'' سے اس کا رد ہو رہا ہے۔ کیونکہ یہ جملہ ''و کان عرشه علی الماء'' ؛ یا تو حالیہ ہے؛ یا معطوفہ۔ بہر حال ہر دو صورتوں میں اس وقت عرش مخلوق و موجود تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس عالم مشہود میں سے کچھ بھی موجود نہیں تھا''۔ [المجموع ۱۸/ ۲۱۱]

ربوبیت اور خالقیت کا معنیٰ:

۱۵: ''لَهُ مَعْنَى الرُّبُوبِيَّةِ وَلاَ مَرْبُوبَ، وَمَعْنَى الْخَالِقِ وَلاَ مَخْلُوقَ''۔

''اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ میں ربوبیت کا وصف ہے نہ کہ مربوب [تربیت پانے والا] کا؛ اور خالق کا وصف ہے نہ کہ مخلوق''۔

تَشْرِیح:......مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ''مربوب'' (کائنات) کے وجود سے پہلے بھی رب تھے۔ اور اس سے پہلے کہ مخلوق کو وجود میں لایا جائے وہ خالق تھے۔ بعض مشائخ شارحین کہتے ہیں کہ شیخ نے لفظ معنی ربوبیت اور معنی خالق کے ساتھ ذکر کیا ہے، خالقیت کا ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ خالق وہ ہوتا ہے جو ایک چیز کو عدم سے عالم وجود کی طرف نکال لاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی معنی نہیں۔ جبکہ لفظ رب کثیر معانی کا تقاضا کرتا ہے اس میں ملک، حفاظت، تدبیر، تربیت اور کسی چیز کو بتدریج اس کے کمال تک پہنچانے کے معانی بھی موجود ہیں۔ اس بنا پر ایسا لفظ استعمال کرنے میں جو ان تمام معانی پر مشتمل ہو؛ کوئی حرج نہ تھا۔ اور وہ ہے: ربوبیت۔ لیکن یہ قول کا محل نظر ہے اس لیے کہ خلق کا معنیٰ بھی تقدیر کا ہوتا ہے۔

زندگی اورموت دینے والا:

۱۶. :((وَكَمَا أَنَّهُ مُحْيِي الْمَوْتَىٰ بَعْدَ مَا أَحْيَا ، اسْتَحَقَّ هٰذَا الْاسْمَ قَبْلَ إِحْيَائِهِمْ ، كَذٰلِكَ اسْتَحَقَّ اسْمَ الْخَالِقِ قَبْلَ إِنْشَائِهِمْ)) .

''اور جیسا کہ وہ مردوں کو زندہ کرنے والا ہے لیکن وہ ان کو زندہ کرنے سے پہلے اس وصف [کا مستحق ؛یعنی اس] کے ساتھ موصوف تھا۔اسی طرح مخلوق کو پیدا فرمانے سے پہلے وہ وصف خالق [کا حق دار] ساتھ موصوف تھا''۔

تَشْرِیح :......اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ان کو زندہ کرنے سے قبل اس وصف کے ساتھ موصوف تھا اسی طرح وہ ان کو پیدا کرنے سے پہلے خالق کی صفت کے ساتھ موصوف تھا۔اس میں معتزلہ اوران کے موافقین کے عقیدہ پر رد ہے۔ہم ان سے یہ حکایت نقل کر چکے ہیں۔اور اس مسئلہ کی تقریر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے فاعل رہے ہیں۔

کامل قدرت اور بے نیازی کا اثبات:

۱۷. :((ذٰلِكَ بِأَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ، وَكُلُّ شَيْءٍ إِلَيهِ فَقِيْرٌ ، وَكُلُّ أَمْرٍ عَلَيْهِ يَسِيْرٌ .لَا يَحْتَاجُ إِلَى شَيْءٍ ، ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ o﴾ (الشوری : ۱۱)))

''یہ اس لیے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے [1] اور ہر چیز اس کی طرف محتاج ہے اور ہر معاملہ اس پر آسان ہے وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ؛ اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا جاننے والا ہے''۔

[1] ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : شیخ ابن مانع رحمہ اللہ فرماتے ہیں [ص 7] بعض لوگ یوں کہتے ہیں : وہ جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے۔لیکن اس طرح بولنا ٹھیک نہیں۔ بلکہ حق بات وہی ہے جو کتاب سنت میں وارد ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قادر ہیں۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی چاہت اور قدرت عام ہے۔بخلاف معتزلہ کے؛ جو کہتے ہیں : اللہ تعالیٰ تو بندے سے معاصی کے وقوع پذیر ہونے کا ارادہ نہیں کرتے ؛ لیکن ان کا وقوع اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر انسان کے اپنے ارادہ سے ہوتا ہے۔یہ ان کی بڑی گمراہیوں میں سے ایک ہے۔[شاعر کہتا ہے]:''یہ نادان جاہل اور اس کے ہم عقیدہ لوگ کہتے ہیں : بے شک گناہ اللہ تعالیٰ کی قضاء سے ہوتے ہیں۔اگر جو کچھ وہ کہتا ہے وہ برحق ہے تو پھر زنا کی حد اور چور کا ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ کیوں کیا گیا ہے''۔أبو الخطاب نے حق اور صواب کے بیان میں کتنی اچھی بات کہی ہے :[اشعار کا ترجمہ]''وہ کہتے ہیں : بندوں کے افعال ؟ میں نے کہا : اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر کے علاوہ ان کا کوئی خالق نہیں''۔تو کہنے لگے : کیا وہ برے افعال کا ارادہ بھی کرتا ہے'' تو میں نے کہا :''اس میں ارادہ کام کرنے والے کا ہوتا ہے۔اگر وہ یہ ارادہ نہ کرتا تو اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کو اس سے روکنے کا تھا''۔

ابو خطاب نے یہ جو ارادہ اپنے سوال میں ذکر کیا ہے ؛ یہ اللہ تعالیٰ کا کونی وقدری ارادہ ہے ؛ کونی اور شرعی ارادہ مراد نہیں۔

تَشرِیح:......مقصود یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق سے پہلے ازل سے وہ ان صفات کے ساتھ موصوف ہے۔ یہاں پر کلام لفظ ''کل'' اور اس کے شمول پر ہے۔ لفظ ''کل'' کا شمول ہر مقام پر اس کے قرائن کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو آگے آئے گی۔

'' وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ '' ❶ سے جو معنیٰ سمجھ میں آتا ہے؛ معتزلہ نے اس میں تحریف کی ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان افعال پر قادر ہے جو اس کے مقدور میں ہیں۔ ان کے نزدیک وہ بندوں کے افعال پر وہ قادر نہیں ہے۔ اور ان کا اختلاف اس میں ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اس کی مثل پر قادر ہے یا نہیں؟۔ اگر معنی ایسے ہی ہوتا جیسے وہ کہتے ہیں؛ تو وہ اس منزلت پر ہوتا کہ یوں کہا جاتا کہ وہ صرف ان چیزوں کا علم رکھتا ہے جن کا اس کو علم ہے اور اور صرف ان کا خالق ہے جن کو اس نے پیدا کیا ہے۔ اس طرح کی دیگر بھی عبارات ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ گویا کہ انھوں نے ہر چیز سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی صفت کو اللہ تعالیٰ سے سلب کیا ہے۔

❶ ۔ کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر نہیں ہو سکتی۔ پس تمام موجودات کا وجود اللہ تعالیٰ کی مشئیت اور قدرت سے ہے۔ اس جملہ میں معتزلہ اور قدریہ فرقہ کے لوگوں پر رد ہے جو کہتے ہیں: بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی قدرت اور چاہت سے باہر ہوتے ہیں؛ ان کا اللہ تعالیٰ کی تخلیق و قدرت سے کوئی تعلق نہیں۔ پس ان کے نزدیک بندے ہی اپنے افعال کے خالق ہیں؛ اور وہی اللہ تعالیٰ کی مشئیت کے بغیر ان میں تصرف کرتے ہیں۔ ان کے باطل عقائد کا خلاصہ یہ ہے: وہ کہنا چاہتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ کافر کو مؤمن بنانے پر قدرت نہیں رکھتے۔ اور نہ ہی مؤمن کو کافر بنا سکتے ہیں۔ پس کائنات میں جتنے بھی وجودی امور جاری و ساری ہیں؛ خواہ ان کا تعلق بندوں کے افعال سے ہو یا حیوانات کے افعال سے؛ وہ اللہ تعالیٰ کی مشئیت سے خارج ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان میں کسی ایک چیز کو بھی روکنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ [ان عقائد کے رد میں] ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ﴾ [الانعام ۱۳۷]

'' اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے اپنی اولاد کو مار ڈالنا ان کے شریکوں نے خوش نما بنا دیا، تا کہ وہ انھیں ہلاک کریں اور تا کہ وہ ان پر ان کا دین خلط ملط کریں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ پس چھوڑ انھیں اور جو وہ جھوٹ باندھتے ہیں''۔

اہل سنت کا مسلک:

جبکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک: ﴿وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں''؛ تمام ممکن چیزیں اس میں داخل ہیں۔ البتہ محال لذاتہٖ مثلاً: ایک چیز کا ایک ہی حالت میں موجود اور معدوم ہونا؛ نہ تو اس کی کچھ حقیقت ہے اور نہ ہی اس کے وجود کا تصور ہو سکتا ہے؛ اور نہ ہی اسے کسی چیز کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس پر تمام عقلمندوں کا اتفاق ہے۔ یہ ان محالات کے قبیل سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا اپنا مثل پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ کو معدوم کر دینا۔

اس کی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ تامہ پر ایمان۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہی شخص اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا رب مانتا ہے؛ جس کا ایمان ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مکمل اور پوری پوری ربوبیت اور اس کے کمال پر صرف وہی شخص ایمان رکھتا ہے جس کا ایمان ہو کہ وہ ہر ایک چیز پر قادر ہے۔ البتہ معدوم ممکن میں اختلاف ہے کیا وہ کوئی چیز ہے یا نہیں؟۔ حقیقت یہ ہے کہ معدوم خارج میں کوئی چیز نہیں؛ البتہ اللہ تعالیٰ ہونے والی چیز کو ہونے سے پہلے جانتا ہے اور اس کو لکھ لیتا ہے اور اس کی خبر دیتا ہے جیسے ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ○﴾ (الحج: ۱)

''بیشک قیامت کا زلزلہ ایک حادثہ عظیم ہے۔''

اس آیت میں ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں؛ کتاب میں؛ اور لوح محفوظ میں ہے، خارج میں نہیں۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝﴾ (یٰس: ۸۲)

''اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا۝﴾ (مریم: ۹)

''اور میں نے پہلے تم کو پیدا کیا اور تم کچھ چیز نہ تھے۔''

یعنی تو خارج میں نہ تھا اگرچہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا۔ نیز ارشاد فرمایا:

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا۝﴾ (الدھر: ۱)

''کیا انسان پر زمانے میں ایسا وقت نہیں آیا جب وہ کوئی قابل ذکر چیز ہی نہ تھا۔''

ارشاد ربانی ''لیس کمثله شئی'' [1] ۔''اس کی مثل کوئی چیز نہیں''۔ میں مشبہہ کا رد ہے اور فرمان الٰہی: ''هو السميع البصير'' سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے'' میں معطلہ کا رد ہے۔ پس اللہ تعالیٰ صفات کمال کے ساتھ موصوف ہے ان میں اس کا کوئی مشابہت رکھنے والا نہیں۔ اگرچہ مخلوق بھی سمع و بصارت کی صفات سے موصوف ہے لیکن مخلوق کی سمع، بصر اللہ تعالیٰ کے سمع، بصر کی مانند نہیں۔ محض صفت کے اثبات سے تشبیہ لازم نہیں آتی۔ کیونکہ مخلوق کی صفات مخلوق میں ان کی اپنی شان کے مطابق ہیں اور خالق کی صفات ایسے ہی ہیں جیسے اس کی شان کے لائق ہیں۔

[1] ۔اس سے قبل دو جملے اور ہیں جن کی شرح شارح نے نہیں کی۔ اور وہ ہیں: وَكُلُّ شَيْءٍ إِلَيهِ فَقِيْرٌ، وَكُلُّ أَمْرٍ عَلَيْهِ يَسِيْرٌ .لاَ يَحْتَاجُ إِلَى شَيْءٍ''۔ '' اور ہر چیز اس کی طرف محتاج ہے اور ہر معاملہ اس پر آسان ہے وہ کسی چیز کا محتاج نہیں''۔
وَكُلُّ شَيْءٍ إِلَيهِ فَقِيْرٌ''۔ '' اور ہر چیز اس کی طرف محتاج ہے''۔ ہر چیز اس کی محتاج ہے اور وہ بذات خود غنی اور بے نیاز ہے۔ پس مطلق طور پر غنی اور بے نیاز ہونا اللہ تعالیٰ کی ذات کے لوازم میں سے ہے۔ وہ ہر لحاظ سے غنی اور بے نیاز ہے جب کہ مخلوق ہر لحاظ سے محتاج و فقیر ہیں۔ حتی کہ اپنے وجود اور بقا میں۔
'' وَكُلُّ أَمْرٍ عَلَيْهِ يَسِيْرٌ .لاَ يَحْتَاجُ إِلَى شَيْءٍ''۔ ''اور ہر معاملہ اس پر آسان ہے وہ کسی چیز کا محتاج نہیں''۔ اس جملہ سے سابقہ اس جملہ کی تاکید و تصدیق ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور کوئی بھی چیز کرنا اس کے لیے مشکل نہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے سورت عنکبوت کی آیت نمبر ۱۹ اور سورت فاطر کی آیت نمبر ۴۴ کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی کمال بے نیازی کی تاکید ہوتی ہے۔

یاد رکھیں کہ آپ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے ان صفات کی نفی نہ کریں جن کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے اور جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ''اعرف الخلق بربه'' ''مخلوق میں سے اپنے رب کے متعلق سب سے بڑی عالم'' اس امت کے سب سے بڑے خیر خواہ اور فصیح و بلیغ اور قادر الکلام ہستی نے موصوف کیا ہے؛ کہ اس کے حق میں واجب کیا ہے اور ممتنع کیا ہے؟۔ اگر آپ ان صفات میں سے کسی صفت کا انکار کریں گے تو جو کچھ حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا ہے اس کے ساتھ کفر کریں گے لیکن جب آپ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی وہ صفات ثابت کریں جو اس نے خود اپنے لیے بیان کی ہیں؛ تو آپ ان میں اللہ تعالیٰ کو کسی مخلوق کے ساتھ تشبیہ نہیں دیتے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مثیل نہیں تو جب آپ مخلوق کے ساتھ تشبیہ دیں گے تو آپ کافر ہو جائیں گے۔

نعیم بن حماد رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

نعیم بن حماد الخزاعی رحمہ اللہ (۲۲۸ھ)، امام بخاری رحمہ اللہ (۱۹۴ھ-۲۵۶ھ) کے استاذ ہیں؛ وہ کہتے ہیں: ''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دی وہ کافر ہو گیا۔ اور جس شخص نے ان صفات کا انکار کیا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے ثابت کیا ہے وہ بھی کافر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جن کو اس نے خود بیان فرمایا یا ان کو رسول اکرم ﷺ نے بیان فرمایا، ان کی کسی مخلوق کے ساتھ مشابہت نہیں ہے۔

آئندہ اوراق میں امام طحاوی رحمہ اللہ کے کلام میں بھی وضاحت موجود ہے کہ جس شخص نے نفی، تشبیہ میں احتیاط نہ کی وہ جادۂ حق سے پھسل گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کو منزہ قرار دینے میں کچھ صحیح قدم نہ اٹھایا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ تمام اعلیٰ مثالیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں؛ ارشاد باری ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ (النحل: ٦٠)

''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انہی کے لیے بری باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے اعلیٰ صفات ۔''

نیز ارشاد فرمایا:

﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝﴾ (الروم: ٢٧)

''اور آسمانوں اور زمین میں اعلیٰ مثالیں اسی کے لیے ہیں؛ اور وہ غالب حکمت والا ہے۔''

تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے بری مثال (جو عیوب نقائص اور سلب کمال کو متضمن ہے) اپنے دشمن مشرکین اور ان کے معبود بتوں کے بارے میں دی ہے اور خبر دی ہے کہ بلند مثال (جو تمام قسم کے کمالات کو متضمن ہے) صرف اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ثابت ہیں۔ تو اب جس کسی نے اللہ تعالیٰ سے صفت کا کمال سلب کیا؛ اس نے اللہ تعالیٰ کے لیے بری مثال دی؛ اور اس سے ان بلند اوصاف کی نفی کر دی جو اس نے اپنی ذات کے لیے ثابت کیے ہیں۔ یعنی اس کمال مطلق کو ختم کر دیا؛ جو امور وجودیہ اور معانی ثبوتیہ کو شامل ہے؛ وہ جس قدر بھی کسی موصوف میں زیادہ ہوں گے اسی قدر وہ دوسروں سے اکمل اور اعلیٰ ہو گا۔

اور جب اللہ تعالیٰ کی صفات اکمل اور اعلیٰ ہیں تو اس کی مثال بھی اعلیٰ ہے اور وہ کسی بھی دوسرے سے اس کا زیادہ حقدار ہے۔ بلکہ مطلق مثل اعلیٰ میں دو کا شریک ہونا محال ہے اس لیے کہ اگر وہ دونوں ہر لحاظ سے مساوی ہیں؛ تو ان میں سے کوئی دوسرے سے اعلیٰ نہ ہوا؛ اگر مساوی نہیں ہے تو پھر صرف ایک موصوف ہو گا اس صورت میں جس کے لیے مثل اعلیٰ ثابت ہے اس کا مثیل، نظیر محال ہو گا۔

المثل الاعلیٰ کی تشریح میں توجیہات:

مفسرین کرام رحمہم اللہ اس کی تشریح میں مختلف توجیہات ذکر فرماتے ہیں؛ اور جن کو اللہ تعالیٰ نے توفیق اور ہدایت دی ہے وہ ان کے مابین جمع و تطبیق کی کوشش کرتے ہیں۔ تو فرماتے ہیں ''المثل الاعلیٰ'' صفات عالیہ؛ اور سب جہانوں سے متعلق علم اور ان کا علمی وجود ؛ اور ان کے متعلق خبر اور ذکر کو؛ اور علم و معرفت کے واسطہ سے رب کی ایسی عبادت کو؛ جو اس کی عبادت اور اس کا ذکر کرنے والوں کے

دلوں کو شامل ہے۔ یہاں پر چار امور ہیں:

پہلی توجیہ: اعلیٰ صفات اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں خواہ مخلوق ان کا علم رکھتی ہے یا نہیں۔ یہ معنی ان لوگوں کے نزدیک ہے جو اس کی تفسیر ''صفت'' سے کرتے ہیں۔

دوسری توجیہ: ان کا وجود علم اور شعور میں ہے۔ متقدین ومتاخرین اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس سے مراد اس کے بندوں اور اس کی یاد کرنے والوں کے دلوں میں پائی جانے والی معرفت ذکر محبت، تعظیم، خوف، امید، توکل اور انابت ہے۔ خلق کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی جو مثل اعلیٰ پائی جاتی ہیں؛ وہ اس کے ساتھ خاص ہیں؛ ان میں کوئی دوسرا اس کا شریک بالکل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ دلوں کا تعلق صرف اس کے ساتھ خاص ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس کی ذات کے ساتھ خاص تعلق ہوتا ہے۔ یہ معنی ان مفسرین کے نزدیک ہے جو کہتے ہیں: ''اس کا معنی یہ ہے کہ آسمانوں کی مخلوق اس سے محبت کا اظہار کرتی ہے اس کی تعظیم بجالاتی ہے، اس کی عبادت میں محو رہتی ہے اسی طرح زمین پر بسنے والی مخلوق بھی اس کی عبادت وغیرہ میں مصروف رہتی ہے۔ ان کا جذبۂ محبت اس سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ اگرچہ کچھ مشرکین اس کے ساتھ شرک کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ اس کی نافرمانی کررہے ہیں، اور منکرین اس کی صفات کا انکار کررہے ہیں۔ پس اہل زمین اس کی تعظیم اور جلال بجالاتے ہیں؛ اور اس کی عظمت کے سامنے سرنگوں ہیں؛ اور اس کی عزت اور جبروت کے سامنے سر تسلیم خم ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ (الروم: ۲۶)

''آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں اس کی ملکیت ہیں، تمام اس کے مطیع ہیں۔''

تیسری توجیہ: اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی صفات کا ذکر کرنا اور ان سے متعلق خبر دینا اور ان کو عیوب نقائص اور تمثیل سے منزہ رکھنا۔

چوتھی توجیہ: اللہ تعالیٰ جو اعلیٰ صفات والا ہے اس سے محبت کا اظہار کرنا؛ اس کی توحید بجالانا؛ اس کے ساتھ مخلص رہنا، اس پر توکل رکھنا اور اس کی جانب جھکنا۔ ظاہر ہے کہ جس قدر صفات پر ایمان کامل ہوگا اسی قدر محبت اور اخلاص میں قوت زیادہ ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں سلف صالحین رحمہم اللہ کی عبارات ان چار توجیہات کے گرد گھومتی ہیں۔ پس اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہے جو ارشاد ربانی ﴿وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ اور ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ میں ٹکراؤ ثابت کرتا ہے؛ اور ''لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ'' سے صفات کی نفی پر استدلال کرتا ہے اور مکمل آیت سے آنکھیں بند کرلیتا ہے (جس میں اللہ تعالیٰ کا سمیع اور بصیر ہونا ثابت کیا گیا ہے)۔ حتیٰ کہ اس گمراہی نے احمد بن ابی داؤد قاضی کو برانگیختہ کیا تو اس نے خلیفہ مامون کو مشورہ دیا کہ وہ غلاف کعبہ پر ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ کے بعد ''وَهُوَا الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' کندہ کرائے، یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کرے۔ جبکہ کلام اللہ میں ﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ ہے مقصود یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سمیع اور بصیر ہونے کی نفی کرے۔ جیسا کہ ایک دوسرے گمراہ جہم بن صفوان نے کہا میں چاہتا ہوں کہ قرآن پاک سے ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ کے الفاظ کھرچ کر نکال دوں۔

ہم اللہ عظیم، سمیع بصیر سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے فضل وکرم سے دنیا اور آخرت میں ثابت قدمی عطا فرمائے۔ آمین

کمثلہ کا محل اعراب:

(وجہ اول) کاف صلہ کا ہے؛ اور تاکید کے لیے زائد ہے جیسا کہ اوس بن حجر کہتا ہے:

((لیس کمثل الفتیٰ زهیر خلق یو ازیه فی الفضائل))

''نوجوان زہیر نامی کا ہمسر فضائل میں کوئی نہیں ہے۔''

ایک اور شاعر کہتا ہے:

((ما إن کمثلهم فی الناس من البشر))

''ان جیسا لوگوں میں کوئی انسان نہیں ہے۔''

ایک دوسرا کہتا ہے:

((وقتلی کمثل جذوع النخیل))

''اور مقتول کی مثال کھجور کے کٹے تنے کی مانند ہے۔''

اس صورت میں لفظ ''مثله'' لیس کی خبر ہے؛ لفظ 'شیء' اس کا اسم ہے؛ یہ توجیہ قوی اور اچھی ہے۔ عربی زبان میں اس توجیہ کا معنی متعارف ہے؛ جب ان الفاظ میں خطاب کیا جائے؛ تو اس میں کوئی بات مخفی نہیں [رہتی]؛ کلام عرب میں عام طور پر کاف تاکید کے لیے زائد استعمال ہوتا ہے شاعر کہتا ہے:

((وصالیات ککما یؤثفین))

''جلے ہوئے پتھر، جیسے چولہے کے پتھر ہیں جن پر ہانڈی رکھی جاتی ہے۔''

دوسرا شاعر کہتا ہے:

((فأصبحت مثل کعصف مأکول))

''پس تو کھائے ہوئے بھوسہ کی مانند ہوگئی۔''

وجہ ثانی: مثل کا لفظ زائد ہے یعنی ''لیس کهو شئی'' ''اس طرح کی کوئی چیز نہیں'' لیکن یہ توجیہ بعید از استعمال ہے اس لیے کہ مثل اسم ہے؛ اسم کو زائد کہنے کی بجائے حرف تاکید کو زائد کہنا اولیٰ ہے۔

وجہ ثالث: اصل میں یہاں پر کوئی لفظ زائد نہیں ہے۔ بلکہ یہ جملہ ''مثلك لا یفعل کذا'' کے قبیل سے ہے؛ اس کا معنی ہے کہ تو اس کام کو نہیں کر رہا ہے لفظ مثل بالغہ کے لیے لایا گیا ہے؛ اس کے معنی میں کہتے ہیں کہ یعنی ''لیس کمثله'' میں بھی مبالغہ ہے یعنی اگر مثل فرض بھی کیا جائے تب بھی اس کا مثل نہیں؛ تو اس کا مثل کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اس کا مثل نہیں ہے اس کے علاوہ بھی کچھ اور توجیہات بیان کی گئی ہیں۔ لیکن پہلی توجیہ واضح اور ظاہر ہے۔

تخلیق کائنات اور علم الٰہی:

۱۸ : ((خَلَقَ الْخَلْقَ بِعِلْمِهِ))۔

''اس نے مخلوق کو اپنے علم سے پیدا فرمایا''۔

تَشْرِیح:......لفظ (خَلَقَ) (أَوْجَدَ) اس نے ایجاد کیا (اَنْشَأَ) اس نے بنایا (أَبْدَعَ) اس نے بلانمونہ بنایا، کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز (خَلَقَ) (قَدَّرَ) اس نے قدر کیا [یعنی تقدیر بنائی]، کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لفظ ''خلق'' مصدر ہے جو کہ یہاں پر مخلوق کے معنی میں ہے۔ بِعِلْمِهِ : ''حال'' ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی اس نے ان کو پیدا فرمایا اس حال میں کہ وہ ان کے بارے میں علم رکھتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ﴾ (الملك: ١٤)

''بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے؟ وہ تو پوشیدہ باتوں کا جاننے والا اور آگاہ ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىکُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ﴾ (الانعام: ٥٩، ٦٠)

''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں؛ اسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اسے جنگلوں اور دریاؤں کی سب چیزوں کا علم ہے اور کوئی پتہ نہیں جھڑتا، مگر وہ اسے بھی جانتا ہے اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ اور کوئی ہری یا سوکھی چیز نہیں، مگر کتاب روشن میں لکھی ہوئی ہے اور وہی ہے جو رات کو تمھاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کی خبر رکھتا ہے'' [1]۔

اس آیت مبارکہ میں معتزلہ کا رد ہے۔

[1] ۔ اللہ تعالیٰ کا علم تمام چیزوں کو محیط اور شامل ہے۔ اس نے اپنے بندوں کے اعمال؛ اقوال اور احوال کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ حتی کہ وہ ان خیالات کو بھی جانتا ہے جن کا گزر انسان کے دل پر ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿ یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ﴾ ۔ (غافر 19) ''وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور اسے بھی جو سینے چھپاتے ہیں''۔ علم اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے جب کہ اہل بدعت اس صفت کا انکار کرتے ہیں۔ مثلاً معتزلہ کہتے ہیں: وہ علیم ہے بغیر علم کے؛ پس علم اس کی ذات کے ساتھ قائم کوئی صفت نہیں۔ وہ قدیر ہے بغیر قدرت کے؛ اور سمیع وبصیر ہے بغیر سمع وبصر کے۔ اہل علم نے ان کے عقائد ایسے ہی نقل کئے ہیں۔ جب کہ وہ حق جس پر کتاب وسنت اور عقل دلالت کرتے ہیں؛ اور جس پر اس امت کے سلف صالحین قائم تھے؛ وہ اس کے خلاف ہے۔ یہ سبھی اللہ تعالیٰ کے ان تمام صفات کو ثابت مانتے ہیں جو یا تو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے بیان کی ہیں یا پھر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیان کی ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ہے؛ اس میں کوئی تجدید نہیں ہوتی''۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھو: النبوات ا/ ۵۷۷۔

امام عبدالعزیز مکی رحمہ اللہ کا بشر مریسی کے ساتھ مناظرہ:

امام عبدالعزیز مکی رحمہ اللہ جو امام شافعی رحمہ اللہ کے تلامذہ سے ہیں انھوں نے اپنی تالیف ''الحیدہ'' میں بشر مریسی معتزلی کے ساتھ اپنے مناظرہ کا ذکر کیا ہے۔

مامون عباسی کی مجلس میں بشر مریسی اور امام عبدالعزیز مکی رحمہ اللہ دونوں موجود تھے۔ جب اس نے بشر سے اللہ تعالیٰ کی صفت کے علم کے بارے میں سوال کیا، تو بشر نے جواب دیا، اللہ تعالیٰ میں جہل نہیں۔ اس نے پھر یہی سوال دہرایا۔ لیکن بشر نے یہی جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ جاہل نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو صفتِ علم سے موصوف کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ امام عبدالعزیز رحمہ اللہ بول اٹھے کہ: ''کسی سے جہل کی نفی کرنا تو اس کی مدح نہیں۔ بے شک اسطوانہ بھی جاہل نہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے علم کی بنیاد پر انبیاء کرام علیہم السلام، ملائکہ اور ایمانداروں کی تعریف کی ہے نہ کہ وصف جہالت کی نفی سے۔ پس جو کوئی علم کو ثابت مانتا ہے وہ یقیناً جہالت کی نفی کرتا ہے۔ لیکن جو کوئی جہالت کی نفی کرتا ہے وہ علم کا اثبات نہیں کرتا۔ پس تمام مخلوق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ان اوصاف کو ثابت کریں جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کے لیے بیان کیے ہیں۔ اور ان صفات کی نفی کریں جن کی خود اللہ تعالیٰ نے نفی کی ہے اور جن اوصاف کے ذکر سے اللہ تعالیٰ خاموش رہے ہیں ان پر خاموشی اختیار کی جائے۔

اللہ تعالیٰ کے علم پر عقلی دلیل:

جہالت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو ایجاد کرنا محال ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو ایجاد کرنا اس کے ارادہ کے ساتھ ہوتا ہے اور ارادہ مراد کے تصور کو مستلزم ہے۔ اور تصور مراد اور علم بالمراد ایک ہی چیز ہیں۔ پس ایجاد ارادہ کو مستلزم ہوا اور ارادہ علم کو مستلزم ہوا، نتیجتاً ایجاد علم کو مستلزم ہوا۔ نیز مخلوقات میں جو استحکام اور مضبوطی موجود ہے وہ فاعل کے علم کو مستلزم ہے اس لیے کہ کسی محکم اور پختہ فعل کا صدور علم کے بغیر ممتنع ہے۔

نیز ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مخلوقات بھی عالم ہیں۔ اور علم صفت کمال ہے۔ تو خالق کا عالم نہ ہونا ممتنع ہے [اس کو وضاحت سے سمجھیں]اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: ہم ضرورت کے تحت جانتے ہیں کہ خالق مخلوق سے اکمل ہے اور واجب ممکن سے اکمل ہے۔ نیز ہم ضرورت کے تحت یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر ہم دو چیزیں فرض کر لیں ایک عالم ہو دوسرا غیر عالم ہو تو عالم اکمل ہوگا، پس اگر خالق عالم نہ ہو تو لازم آتا ہے کہ ممکن اس سے اکمل ہو اور ایسا ہونا ممتنع ہے۔

دوسری صورت: ممکنات یعنی مخلوقات میں جو علم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اور یہ بات ممتنع ہے کہ کمال کا فاعل اور موجد کمال سے خالی ہو؛ بلکہ وہ کمال کا زیادہ مستحق ہے؛ اللہ تعالیٰ کے لیے اعلیٰ مثال ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اور مخلوق مساوی نہیں ہیں نہ قیاس تمثیلی میں نہ قیاس شمولی میں۔ بلکہ ہر وہ کمال جو مخلوق کے لیے ثابت ہے خالق اس کا زیادہ حقدار ہے اور وہ نقص جس سے مخلوق منزہ ہے خالق کا اس سے منزہ ہونا زیادہ بہتر [اور اولیٰ] ہے''۔ [الاصفهانية ٤٤]

مخلوق کی تقدیر کا تعین اور علم الٰہی:

19۔......"وَقَدَّرَ لَهُمْ أَقْدَارًا"۔

"اور اس نے ان کے لیے تقدیر مقرر فرمائی"۔

تشریح:......ارشاد ربانی ہے:

﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا﴾[الفرقان ۲]

"اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا اندازہ مقرر کیا، پورا اندازہ"۔

اور ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ۝﴾ (القمر: ۴۹)

"بے شک ہم نے ہر چیز اندازۂ مقرر کے ساتھ پیدا کی ہے۔"

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ۝﴾ (الاحزاب: ۳۸)

"اور اللہ تعالیٰ کا حکم ٹھہر چکا تھا۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الَّذِي خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدٰى ۝﴾ (الاعلیٰ: ۲،۳)

"جس نے بنایا پھر تو درست کیا اور جس نے اس کا اندازہ ٹھہرایا پھر راستہ بتایا۔"

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((قَدَّرَ اللّٰهُ مَقَادِيرَ الْخَلْقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ، وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ .))

"اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل مخلوق کی تقدیر بنائی اور اس کا عرش پانی پر تھا" [1]۔

---

[1]۔[مسلم ح:۸۰] تقدیر کا تعین دو طرح سے ہوتا ہے: ۱۔ زمانے کے اعتبار سے؛ ۲۔ ذات اور جگہ کے اعتبار سے۔ پس زمانے کے اعتبار سے تو ہر انسان کی تقدیر متعین ہے؛ فرمان الٰہی ہے: ﴿وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾[الحج ۵] "اور ہم جسے چاہتے ہیں ایک مقررہ مدت تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں"۔ یعنی جتنی دیر جنین رحم میں رہے گا؛ وہ بھی متعین ہے؛ کوئی چھ ماہ؛ کوئی نو ماہ؛ کوئی دس ماہ؛ کوئی اس سے زیادہ۔ ایسے ہی ہر ایک کا عمل؛ اس کا رزق اور دیگر تمام امور بھی متعین ہیں۔ (قَدَّرَ اللّٰهُ مَقَادِيرَ) ایک مختصر سا جملہ ہے؛ مگر اس کا مفہوم بہت وسیع ہے؛ ہم اس کا احاطہ تو کیا تصور بھی نہیں کر سکتے؛ مگر اجمالاً کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

اَجل کا تقرر:

۲۰.:((وَضَرَبَ لَهُمْ آجَالاً.))

''اوران کی اجل مقرر فرما دی''۔

تَشْرِیح:......یعنی اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی اجل[موت کی گھڑی]مقرر فرما دی ہے کہ جب ان کی اجل آجائے گی تو ایک گھڑی بھر کے لیے آگے پیچھے نہ ہوگا۔ارشاد ربانی ہے:

﴿اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ (یونس: ۴۹)

''جب ان کا وقت آجائے گا تو نہ ایک ساعت تاخیر والے ہوں گے نہ تقدیم والے ہوں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ (آل عمران: ۱۴۵)

''اور کسی کے بس میں نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر مر جائے؛موت کا وقت طے شدہ ہے۔''

صحیح مسلم میں ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے دعا کی: ((اَللّٰهُمَّ أَمْتِعْنِي بِزَوْجِي رَسُولِ اللّٰهِ صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبِأَبِي أَبِي سُفْيَانَ وَبِأَخِي مُعَاوِيَةَ)) قَالَ :فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :((قَدْ سَأَلْتِ اللّٰهَ لِآجَالٍ مَّضْرُوْبَةٍ وَأَيَّامٍ مَّعْدُوْدَةٍ وَأَرْزَاقٍ مَّقْسُوْمَةٍ لَّنْ يُّعَجِّلَ شَيْئًا قَبْلَ حِلِهِ أَوْ يُؤَخِّرَ شَيْئًا عَنْ حِلِهِ وَلَوْ كُنْتِ سَأَلْتِ اللّٰهَ أَنْ يُعِيذَكِ مِنْ عَذَابٍ فِي النَّارِ وَ عَذَابٍ فِي الْقَبْرِ كَانَ خَيْرًا وَأَفْضَلُ))[1]۔

---

[1] ۔[مسلم ۲۶۶۳ ؛ مسند أحمد ح: ۴۱۳ ؛ ۴۳۳ ؛ ۴۴۵ ۔السنه لابن ابی عاصم ۲۶۲۔۲۶۳]

آجال: اجل کی جمع ہے؛ اجل طے شدہ مدت کو کہا جاتا ہے۔پس اس دنیا کی بھی ایک اجل مقرر ہے؛ اور تمام امتوں کے اوقات طے شدہ تھے۔اللہ تعالیٰ کا ارشادگرامی ہے:﴿لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ (یونس ۴۹) ''ہر امت کے لیے ایک وقت ہے، جب ان کا وقت آپہنچتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں''۔ایسے ہی ہر فرد کے لیے بھی اجل مقرر ہے ارشاد فرمایا: ﴿وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾[آل عمران ۱۴۵] ''اور کسی جان کے لیے کبھی ممکن نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے، لکھے ہوئے کے مطابق جس کا وقت مقرر ہے''۔پس جب مرنے والے کا مقررہ وقت آجاتا ہے تو وہ مر جاتا ہے خواہ وہ طبعی موت مرے؛ یا قتل ہو کر مرے جیسا بھی اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں لکھا ہو۔جب کہ معتزلہ کہتے ہیں: قتل ہونے والا اپنی اجل سے نہیں مرتا۔بلکہ قاتل اس کی زندگی کو کاٹ دیتا ہے/منقطع کر دیتا ہے۔اس پر تفصیلی بحث آگے آئے گی۔یہ اللہ تعالیٰ کے متعلق بہت بڑی جہالت؛ لاعلمی اور گمراہی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ﴾ (فاطر: ۱۱) ''اور نہ کسی معمر کی عمر زیادہ کی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے مگر سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔''

''یااللہ! مجھے میرے خاوند رسول اللہ ﷺ اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور میرے بھائی معاویہ کا مجھے فائدہ عطا فرما''۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''تو نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے کہ متعین اجل میں تاخیر ہوجائے اور جس قدر زندگی کے دن لکھے جاچکے ہیں ان میں اضافہ ہو اور جو رزق قسمت میں لکھا جاچکا ہے اس میں اضافہ ہو۔ (یاد رکھ) وقت مقرر میں تقدیم تاخیر نہیں ہوسکتی۔ اس کے بجائے اگر تو اللہ تعالیٰ سے جہنم کے عذاب یا عذاب قبر سے نجات کا سوال کرتی تو وہ تیرے حق میں بہتر اور افضل ہوتا''۔

پس مقتول اپنی اجل کے مطابق قتل ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اس کی تقدیر ہے کہ یہ انسان فلاں بیماری سے مرے گا اور فلاں قتل کے سبب سے؛ اور فلاں اس پر عمارت گرنے کے سبب سے؛ اور فلاں آگ میں جلنے کے سبب سے؛ اور فلاں پانی میں ڈوب کر مرے گا۔ ان کے علاوہ دیگر اسباب بھی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے موت، زندگی کو پیدا کیا؛ اور زندگی اور موت کے اسباب کو بھی پیدا کیا۔

معتزلہ کا نظریہ:

معتزلہ کہتے ہیں: جو شخص قتل ہوا؛ اس کی اجل منقطع کردی گئی، اگر وہ قتل نہ ہوتا تو اپنی اجل تک زندہ رہتا۔ پس گویا کہ اس کی دو اجل ہیں۔ ان کا یہ خیال باطل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب یہ نسبت نہیں ہوسکتی کہ اس نے کسی مخلوق کی ایسی اجل مقرر کی جس کے متعلق وہ جانتا تھا کہ وہ ہرگز اس اجل تک زندہ نہیں رہے گا۔ یا اس کی دو اجل مقرر کی ہیں۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ کو انجام کا علم نہیں۔

ہاں قاتل پر قصاص یا دیت کا واجب ہونا اس لیے ہے کہ اس نے ممنوعہ کا ارتکاب کیا ہے اور حرام کام میں ملوث ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان گرامی ہے:

((صِلَةُ الرَّحْمِ تَزِيْدُ فِي الْعُمَرِ))[1]۔

''صلہ رحمی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے''۔

[1] ۔ یہ حدیث صحیح ہے؛ اور دوسری ان احادیث مبارکہ کو تقویت دیتی ہے جو اس معنی میں ہیں۔ ان دیگر احادیث میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے: ''من أحب أن يبسط له في رزقه و ينسأله في أثره فليصل رحمه ''۔ ''جس کو یہ پسند ہو کہ اس کا رزق بڑھا دیا جائے اور اس کی عمر لمبی کردی جائے تو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے'' ۔ البخاري ۲۰۶۷ ؛ مسلم ۲۵۵۷ ؛ الصحیحة ۱۹۰۸ ۔ ایک دوسری حدیث میں ہے؛ ارشاد فرمایا: '' لا يزيد في العمر إلا البر ''۔ [أحمد ۵/ ۲۷۷؛ سنن ابن ماجة ۹۰؛ صححه ابن حبان ۸۷۲ ؛ مستدرك الحاكم ۱/ ۴۹۳؛ حسنه العراقي فيما نقله البوصيري في مصباح الزجاجة ۳۳؛] ۔ حقیقت میں ایسا ہونا تقدیر کے منافی نہیں۔ اس کا معنی یہ بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سابق علم اور کتاب میں ہے کہ اس کی عمر ساٹھ سال ہوگی۔ پھر ایسے ہوا کہ کسی نے اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کی تو اس کی عمر بڑھا دی گئی۔ ایسا نہیں۔ بلکہ جو انسان صلہ رحمی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی عمر بڑھا دیتے ہیں؛ تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے سابق علم اور کتاب میں موجود ہے کہ اس سبب کی وجہ سے اس کی عمر بڑھا دی گئی۔ بس تمام امور اسباب اور مسببات کی بنا پر جاری ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت تام کے تحت مندرج ہیں۔ ایسا ہی کچھ دعا کے تعلق سے بھی ہے۔ جس چیز کا حاصل ہونا اللہ تعالیٰ نے دعا کے ذریعہ مقدر کردیا ہو؛ تو بسا اوقات اس کا سبب بھی مقدر کردیا جاتا ہے۔ اور بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا۔ پس جس کا سبب مقدر نہ ہو؛ وہ فقط دعا سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور جس کا سبب مقدر ہو؛ وہ سبب اور مسبب سے حاصل ہوتی ہے۔

یعنی عمر لمبی ہونے کا ایک سبب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی تقدیر میں لکھا ہوا ہے کہ فلاں صلہ رحمی کرے گا پس وہ اس سبب کی بنا پر اس انتہاء تک زندہ رہے گا۔ اگر یہ سبب نہ ہوتا تو وہ اس انتہاء تک زندہ نہ رہتا۔ لیکن یہ سبب بھی مقدر ہوچکا؛ اور اس کا فیصلہ ہوچکا۔ اور یہ بھی فیصلہ ہوچکا کہ فلاں صلہ رحمی نہیں کرے گا؛ اور وہ اتنا عرصہ زندہ رہے گا۔ ہم نے یہی بات قتل اور عدم کے بارے میں بھی کہی ہے۔

[سوال] : کیا عمر میں اضافہ یا کمی صلۂ رحمی کی بنا پر اسی طرح ہے جس طرح کہ دعا سے بھی اضافہ یا کمی ہوتی ہے؟۔

[جواب] : یہ ضروری نہیں۔ جیسا کہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے یہ بات واضح ہو رہی ہے: [کہ فرمایا:]

((قَدْ سَأَلْتِ اللّٰهَ لِآجَالٍ مَّضْرُوْبَةٍ ......))

''تو نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا ہے کہ متعین اجل کے بارے میں [کہ تاخیر ہو جائے ......]''۔

ابھی ابھی اس حدیث کا ذکر گزر چکا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ بے شک عمریں متعین ہیں ان میں تبدیلی کے لیے دعا شریعت میں وارد نہیں۔ اس کے برعکس بے شک آخرت کے عذاب سے نجات کی دعا مشروع بھی ہے اور نافع بھی۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اخروی نفع کے لیے عمر میں اضافہ کی دعا کرنا جائز اور مشروع ہے۔ جیسا کہ سنن نسائی میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ [۵۷ ق ھ ۳۷ ھ] سے روایت ہے؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی، اس کے کلمات یہ تھے:

((اَللّٰهُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَيْبِ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ أَحْيِنِي مَا كَانَتِ الْحِيٰوةُ خَيْرًا لِّي وَ تَوَفَّنِي إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ ......)) . (الیٰ آخر الدعاء)

''اے اللہ! تیرے غیب کا علم رکھنے اور مخلوق پر قدرت رکھنے کے ساتھ مجھے اس وقت تک زندگی عطا کر جب تک کہ میرے لیے زندہ رہنا بہتر ہے اور مجھے فوت کر جب فوت ہونا میرے لیے بہتر ہو۔''

اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو صحیح حاکم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا:

((لَا يَرُدُّ الْقَدَرُ إِلَّا الدُّعَاءُ ، وَلَا يَزِيْدُ فِي الْعُمْرِ إِلَّا الْبِرُّ ، وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيْبُهُ .))

''تقدیر کو کوئی چیز رد نہیں کر سکتی مگر دعا؛ اور عمر میں اضافہ نہیں کر سکتے مگر نیک کام؛ اور بے شک آدمی گناہ کا مرتکب ہونے کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے''۔ [1]

اس حدیث میں ان کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ: ''نذر ماننا دفع بلا اور حصولِ نعمت کا سبب بنتی ہے۔ جبکہ صحیحین میں

[1] ۔ حدیث حسن ہے۔ اس کو امام حاکم رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے؛ اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس پر موافقت کی ہے۔ (الصحیحة ۱۵٤)۔ حسن ، دون قوله: (وإن الرجل ليحرم ...) وقد صححه الحاكم ووافقه الذهبي ، وفيه راو مجهول ، لكن له شاهد دون الزيادة المذكور فالحديث حسن بدونها ، وقد تكلمت على الحديث في " الأحاديث الصحيحة رقم (154) طبع المكتب الإسلامي.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے نذر ماننے سے منع فرمایا اور فرمایا کہ:

''نذر سے کوئی بھلائی حاصل نہیں ہوتی البتہ بخیل سے مال اگلوانے کا ایک ذریعہ ہے''۔ [1]

[1] ۔ أخرجاه من حديث ابن عمر ، رواه مسلم من حديث أبي هريرة بلفظ: ((لا تنذروا فإن النذر لا يغني من القدر شيئا وإنما يستخرج به من البخيل)). وقد خرجته في كتاب السنة لابن أبي عاصم برقم (314) والإرواء. (2585) ۔

خیال رہے کہ دعا بعض کاموں میں مشروع اور مفید ہوتی ہے بعض میں نہیں؛ اور بات یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا میں مبالغہ آرائی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ مکروہ جانتے تھے کہ کوئی شخص ان کے لیے درازی عمر کی دعا کرے؛ وہ فرمایا کرتے تھے: ''یہ ایسا کام ہے جس سے فراغت ہو چکی ہے''۔ [الاستقامة ۱/ ۱۵۷]

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ﴾ (فاطر: ۱۱)

''اور نہ کسی معمر کی عمر زیادہ کی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے مگر سب کچھ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔''

آیت مذکورہ میں ''من عمرہ'' کی ضمیر ان کے اس قول ''عندی درهم ونصفه'' کی منزلت پر ہے۔ درہم اور دوسرا نصف درہم مراد ہے۔ یعنی کسی دوسرے کی عمر میں کمی نہیں کی جاسکتی۔ اور بعض کہتے ہیں: ''اس سے مراد وہ زیادتی اور کمی ہے جو ان صحیفوں میں ہے جو فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اسی طرح یہ آیت:

﴿لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ o يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ o﴾ (الرعد: ۳۸،۳۹)

''ہر اجل کا وقت طے شدہ ہے، اللہ تعالیٰ جسے چاہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہے قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔''

اس بات پر محمول کی گئی ہے کہ محو اور اثبات [مٹایا جانا اور باقی رکھنا] ان صحیفوں میں ہوتا ہے جو فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ فرمان الٰہی: ﴿وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ ام الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ سیاق آیت اسی پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ﴾ ''ہر اجل کا وقت طے شدہ ہے''۔ پھر فرمایا: ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ﴾ '' اللہ تعالیٰ جسے چاہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہے قائم رکھتا ہے۔'' یعنی اس کتاب میں سے۔ ﴿وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد اس کی اصل؛ لوح محفوظ ہے۔

بعض کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ جن شرائع کو منسوخ کرنا چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جن شرائع کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے منسوخ نہیں کرتا۔ آیت کا سیاق اس سے بڑھ کر پہلی توجیہ پر دلالت کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی ہے:

﴿وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ﴾ [الرعد ۳۹]

''اور کسی رسول کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ کوئی نشانی لے آتا، مگر اللہ کے اذن سے۔ ہر وقت کے لیے ایک کتاب ہے''۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ کوئی نبی اپنی طرف سے کوئی نشانی لیکر نہیں آتا۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: ﴿لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ o يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ﴾ (الرعد: ۳۸،۳۹) ''ہر اجل کا وقت طے شدہ ہے، اللہ تعالیٰ جسے چاہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہے قائم رکھتا ہے۔'' یعنی کی شریعتوں کا ایک مقررہ وقت اور انتہاء ہوتی ہے؛ پھر اسے دوسری شریعت سے منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ پس یہ مقررہ وقت پورا ہونے پر اللہ تعالیٰ جس شریعت کو چاہیں منسوخ فرما دیتے ہیں۔ اور جس کو چاہیں ثابت رکھتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں دیگر اقوال بھی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تقدیر اور شریعت پر ایمان لانے کا وجوب:

۲۱. :((وَلَمْ يَخْفَ عَلَيْهِ شَيْءٌ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَهُمْ وَعَلِمَ مَا هُمْ عَامِلُونَ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَهُمْ)).

''ان کو پیدا کرنے سے پہلے بھی اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی اور ان کی تخلیق سے پہلے بھی اس کو علم تھا کہ وہ کیا عمل کریں گے''❶۔

تَشرِیح:...... بے شک اللہ تعالیٰ جانتے ہیں جو ہو چکا ہے اور جو ہوگا اور جو نہیں ہوا؛ اگر وہ ہوتا تو کیسے ہوتا؟ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَانُهُوْا عَنْهُ ....﴾ (الانعام: ۲۸)

''اور اگر وہ لوٹائے جائیں تو پھر وہی کام کرنے لگیں گے جن سے ان کو منع کیا گیا تھا۔''

اگر چہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ انھیں لوٹایا نہیں جائے گا۔ لیکن مطلع کیا ہے کہ اگر انھیں لوٹایا گیا تو وہ دوبارہ وہی کام کریں گے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (الانفال: ۲۳)

''اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں کو جانتا تو ان کو سنا دیتا؛ اور اگر ان کو سنا بھی دیتا تو وہ پلٹ جاتے؛ منہ پھیر کر بھاگنے والے ہوتے۔''

اس میں روافض اور قدریہ اور ان لوگوں کا رد ہے جن کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے اور ایجاد کرنے سے پہلے کچھ علم نہیں رکھتا تھا۔ یہ مسئلہ اصل میں مسئلہ تقدیر کی فرع ہے۔ اس کی مزید وضاحت آرہی ہے؛ ان شاء اللہ۔

❶۔ اس سے پہلے جملہ کی تاکید ہوتی ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے مخلوق کو پیدا کیا؛ اور ان کے لیے تقدیر مقرر کی؛ اور ان کی اجل متعین کی''۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے تمام لوگوں کے اعمال کا علم تھا؛ خواہ وہ مؤمن ہوں یا کافر؛ اطاعت گزار ہوں یا نافرمان۔ یہ علم لوگوں کی پیدائش سے بھی قبل اللہ تعالیٰ کو تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ کچھ لکھ دیا تھا؛ اور ان کے لیے مقدر کر دیا تھا۔ یہ تمام باتیں ام الکتاب میں محفوظ ہیں۔

تخلیق جنات وانس کی حکمت:

۲۲. :((وَأَمَرَهُمْ بِطَاعَتِهِ، وَنَهَاهُمْ عَنْ مَعْصِيَتِهِ۔))

''اور اس نے ان کو اپنی فرمانبرداری کا حکم دیا اور اپنی نافرمانی سے منع کیا''۔

تَشرِیح:...... خلق، قدر کے بعد شیخ رحمہ اللہ نے امر و نہی کا ذکر کیا ہے؛ جو اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝﴾ (الذاريات: ٥٦)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملك: ٢)

''وہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے کہ کون تم میں اچھے کام کرتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی چاہت اور ارادہ کا نفاذ:

۲۳:((وَكُلُّ شَيْءٍ يَجْرِي بِتَقْدِيرِهِ وَمَشِيئَتِهِ ,وَمَشِيئَتُهُ تَنْفُذُ، لَا مَشِيئَةَ لِلْعِبَادِ إِلَّا مَا شَاءَ لَهُمْ، فَمَا شَاءَ لَهُمْ كَانَ، وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ①.))

① ۔یہاں سے مؤلف رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کے عمومی ارادہ کے متعلق گفتگو شروع کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہر ایک چیز کو شامل ہوتا ہے؛ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے مقدر کرنے اور چاہنے سے ہو رہا ہے۔اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سابقہ علم اور چاہت کے حساب سے ہی چل رہی ہے۔یعنی اس کائنات میں خیر و شر؛ ہدایت اور گمراہی جو کچھ ہو رہا ہے؛ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور چاہت اس سب کو شامل ہے۔ بہت ساری معروف آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔جن کا شرح میں مراجعہ کرنا ممکن ہے۔ یہاں پر اس فقرہ سے مراد معتزلہ پر رد کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عمومی چاہت کی نفی کرتے ہیں۔ یہ جاننا واجب ہے کہ:''اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پسند بھی کرتے ہیں''پسند کرنا ارادہ سے ایک علیحدہ چیز ہے۔اگر ایسا نہ ہوتو پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکوکار اور بدکار کے مابین کوئی فرق باقی نہ رہے۔اور اس کی تصریح عقیدہ وحدۃ الوجود کے بعض بڑے بڑے علماء نے کی ہے؛ وہ کہتے ہیں: اطاعت گزار اور بدکار؛ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی اطاعت میں لگا ہوا ہے۔سلف صالحین فقہاء اور تقدیر کے قائلین اہل سنت والجماعت رحمہم اللہ کی اکثریت اور دوسرے حضرات کہتے ہیں: ارادہ اور محبت میں فرق ہے۔اسی کی طرف قصیدہ''بدرالامالی''میں اشارہ کیا گیا ہے؛ وہ کہتا ہے:''اس کا ارادہ خیر و شر اور قبیح کا ہوتا ہے؛ مگر وہ محال [یعنی برائی] پر راضی نہیں وہوتا''۔
شیخ اسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''قدریہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کفر وفسوق اور نافرمانی کو ناپسند کرتا ہے؛ اور ان کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔پس کائنات میں ایسا کچھ ہو جاتا ہے جو وہ نہیں چاہتا؛ اور وہ نہیں ہوتا جو وہ چاہتا ہے''۔اور تقدیر کے قائلین ایک گروہ کا کہنا ہے''جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں وہ ہوتا ہے؛ اور جو وہ نہیں چاہتے وہ نہیں ہوتا''۔پس اس صورت میں وہ کفر وفسق اور نافرمانی کا ارادہ تو کرتا ہے؛ مگر یہ ارادہ دینی نہیں ہوتا۔یا کافر سے وہ کوئی کام چاہتا ہے جو کہ وہ مؤمن سے نہیں چاہتا پس اس اعتبار سے وہ کفر وفسق اور نافرمانی کو پسند تو کرتا ہے؛ مگر دین کے طور پر اسے پسند نہیں کرتا اور کافر سے کچھ ایسی چیزیں پسند کرتا ہے جو مؤمن سے پسند نہیں کرتا۔یہ دونوں باتیں غلط اور کتاب وسنت اور اجماع سلف امت اور ائمہ کے مخالف ہیں۔ان کا اتفاق ہے کہ: جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں وہ ہو کر رہتا ہے اور جو نہیں چاہتے وہ نہیں ہوتا۔اور اس کی چاہت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔اور مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتے؛ اور نہ ہی اپنے بندوں کے لیے کفر پر راضی ہوتے ہیں۔اور کفار ایسی باتیں کرتے راتیں گزارتے ہیں جن پر وہ راضی نہیں ہوتے۔فرمان الٰہی ہے:﴿ يبيتون ما لا يرضى من القول ﴾[النساء۱۰۸]''مجموع الفتاوی ۶/۱۱۵؛ شفاء العلیل ۱۲۰۔

''ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور تقدیر کے ساتھ جاری ہے اس کی مشیئت نافذ ہوتی ہے؛ بندوں کی کچھ مشیئت نہیں مگر جو اللہ تعالیٰ کی مشیئت ان کے لیے ہو؛ پس جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو چاہا ہوا اور جو نہیں چاہا نہیں ہوا''۔

تَشْرِیح :......ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًاo﴾(الدھر: ۳۰)

''تم نہیں چاہتے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور حکمت والا ہے①۔''

① ۔اسی مضمون کی آیات سورت تکویر کے آخر میں ہیں۔جن میں دو گمراہ فرقوں پر رد ہے؛ جبریہ اور قدریہ۔پہلی آیت میں ہے:﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴾''تم میں سے جو کوئی چاہے سیدھی راہ پر چلے''۔اس میں بندے کا ارادہ ثابت کر کے جبریہ پر رد کیا گیا ہے۔اور اس آیت میں ہے: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾(الدھر: ۳۰) ''تم نہیں چاہتے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے''۔یہاں پر اللہ تعالیٰ کا ارادہ ثابت کر کے تقدیر کے منکرین قدریہ پر رد کیا گیا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا تَشَآؤُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (التکویر: ۲۹)

''اور تم نہیں چاہتے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ رب العالمین چاہتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الانعام: ۱۱۱)

''اور اگر ہم ان پر فرشتے بھی اتار دیتے اور مردے بھی ان سے گفتگو کرنے لگتے اور ہم سب چیزوں کو ان کے سامنے لا موجود بھی کر دیتے تو بھی یہ ایمان نہ لاتے؛ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ﴾ (الانعام: ۱۱۲)

''اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کرتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا﴾ (یونس: ۹۹)

''اگر آپ کا رب چاہتا تو زمین پر (رہنے والے) تمام لوگ ایمان لے آتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''تو جس شخص کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا؛ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا:

﴿وَ لَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ﴾ (ھود: ۳۴)

''اور میری نصیحت تمھیں کچھ فائدہ نہیں دیگی اگر میں تمہیں نصیحت کرنا چاہوں اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ تمھیں گمراہ کر دے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَ مَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (الانعام: ۳۹)

''جس کو اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے سیدھے رستے پر چلا دے۔''

ان کے علاوہ بھی کثیر آیات اس مضمون کی ہیں کہ وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، اگر وہ نہیں چاہتا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بھلا

اس کی بادشاہت میں ایسا کام کیسے ہوسکتا ہے جس کو وہ نہ چاہتا ہو۔اور اس شخص سے زیادہ گمراہ اور بڑا کافر کوئی نہیں ہوسکتا جس کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ کافر ایمان لائے ،لیکن کافر نے کفر اختیار کیا اس طرح کافر کی مشیئت اللہ تعالیٰ کی مشیئت پر غالب آ گئی۔ تعالیٰ الله عما يقولون علواً كبيراً۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

اگر اس ارشاد ربانی کے متعلق اشکال پیدا ہو:

﴿سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْشَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا﴾ (الانعام: ١٤٨)

''عنقریب مشرکین کہیں گے: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا (شرک کرتے)۔''

اور ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ﴾ (النحل: ٣٥)

''اور مشرکین نے کہا اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے۔''

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ﴾(الزخرف: ٢٠)

''اور کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے ان کو اس کی خبر نہیں؛ وہ تو اٹکل سے (ایسی بات کہتے ہیں)۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی مذمت کی ہے، جب انھوں نے کہا کہ ہمارا شرک کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیئت سے ہے۔اسی طرح ابلیس کی مذمت ہے جس نے اپنے گمراہ ہونے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب کی؛ جب اس نے کہا:

﴿رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ٥﴾ (الحجر: ٣٩)

''میرے رب اس لیے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا میں زمین پر ان کے لیے مزین کروں گا اور ان سب کو بہکا دوں گا۔''

[جوب]: یقیناً ان اعتراضات کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔ان میں سب سے بہترین جواب یہ ہے کہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کی ان باتوں کا انکار کیا ہے؛ اس لیے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے ساتھ اس کی رضا اور محبت پر دلیل پکڑی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کو ناپسند کرتے اور اس پر ناراض ہوتے؛ تو پھر ہرگز ایسا نہ چاہتے۔پس یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مشئیت کو اس کی رضا مندی کی دلیل گردانتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اس بات میں ان پر رد کیا ہے۔اور ان کے اس اعتقاد کا انکار کیا ہے کہ اس کی مشئیت اس چیز کا حکم دینے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔اور اللہ تعالیٰ نے اس بات کا بھی انکار کیا ہے کہ اس کی شریعت اس کے حکم سے ٹکراتی ہو۔وہ اللہ جس نے اس شریعت کے ساتھ رسولوں کو مبعوث کیا؛ اور اپنی قضاء وقدر سے اس شریعت کے ساتھ کتابیں نازل کیں۔تو یہ لوگ اس کی مشئیت عامہ سے اس کے احکام سے جان چھڑانے لگے؛ پھر انھوں نے اللہ تعالیٰ کی مشیئت/ چاہت کو بطور توحید کے نہیں؛ بلکہ اس کے احکام کے ساتھ ٹکراؤ کے طور پر ذکر کیا ہے؛[تاکہ وہ مشیئت ایزدی کا بہانہ بنا کر] اس کی شریعت سے جان چھڑا لیں۔جیسا کہ عام طور پر زندیق اور جاہل لوگ کرتے ہیں۔ان کو جب کسی کام کا حکم دیا جاتا ہے یا کسی کام سے روکا جاتا ہے تو وہ تقدیر سے استدلال کرتے ہیں۔

چنانچہ ایک چور نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب تقدیر کا سہارا لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں تیرا ہاتھ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر کے ساتھ ہی تو کاٹ رہا ہوں''۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی ہے:

﴿كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (الانعام: ١٤٨)

''اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے تکذیب کی۔''

معلوم ہوا ان کا مقصد شریعت کی تکذیب ہے۔ یہ بھی فعل کی قبیل سے ہے۔ انہیں کیسے علم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقدر نہیں کیا؟۔ کیا وہ غیب سے آگاہ ہو گئے ہیں؟۔

[سوال]: اگر کہا جائے: ''آپ حضرت آدم علیہ السلام کے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حجت لیجانے سے متعلق کیا کہیں گے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: آپ مجھے ایسے کام پر ملامت کر رہے ہیں جس کو میرے پیدا ہونے سے چالیس سال قبل میرے مقدر میں لکھا ہوا تھا''۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی گواہی دیتے ہوئے فرمایا کہ:

''حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے''۔ [بخاری ۳۴۰۹؛ مسلم ۲۶۵۲]

تو معلوم ہوا گناہ میں تقدیر کا سہارا لینا درست ہے۔

جواب: اس حدیث کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہونے کی وجہ سے سمع و طاعت کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں؛ ہم اس کے راویوں پر رد اور جھٹلانے والی بات نہیں کرتے جیسے قدریہ کرتے ہیں؛ اور نہ ہی کسی کمزور تاویل کے مرتکب ہوتے ہیں۔

بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنے گناہ پر قضاء اور تقدیر کا سہارا لے کر غالب نہیں آئے؛ وہ اپنے گناہ کے بارے میں اور اپنے رب کے بارے میں خوب علم رکھتے تھے۔ بلکہ آپ کی اولاد میں سے کوئی بھی مؤمن اپنے گناہوں پر تقدیر کا سہارا نہیں لیتا؛ ان پر اس قسم کا الزام باطل ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اپنے باپ آدم علیہ السلام اور ان کے گناہ کا بخوبی علم رکھتے تھے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو ایسے گناہ پر ملامت کریں جس سے وہ تائب ہو چکے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی تھی ان کو منتخب فرمایا اور نور ہدایت سے نوازا۔

اصل ملامت تو اس مصیبت پر کی گئی جس نے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو جنت سے نکال دیا۔ پس حضرت آدم علیہ السلام نے مصیبت پر تقدیر سے استدلال کیا اپنے گناہ پر نہیں۔ مصیبت کے وقت تقدیر کا سہارا لینا درست ہے نہ کہ گناہ کے وقت۔ حدیث یہ تشریح نہایت مناسب ہے۔ پس جو مصیبت تقدیر میں لکھی جا چکی ہے اسے تسلیم کرنا واجب ہے؛ اور بے شک ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہونے کی کامل اور اتم ترین صورت ہے۔ جہاں تک گناہ کی بات ہے تو انسان کو گناہ نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر گناہ ہو جائے تو اس پر واجب ہوتا ہے کہ توبہ و استغفار کرے۔ یعنی گناہوں سے توبہ کی جائے اور مصیبت پر صبر کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ﴾ (المومن: ٥٥)

''تو صبر کرو بے شک اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا﴾ (آل عمران: ١٢٠)

''اور اگر تم صبر کرو؛ اور تقوی اپناؤ تو ان کا فریب تمھیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔''

جبکہ ابلیس کا یہ کہنا کہ:

﴿رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ﴾ (الحجر: ۳۹)

''اے رب اس لیے کہ جو تو نے مجھے گمراہ کیا۔''

بے شک اس آیت میں تقدیر سے استدلال کرنے پر مذمت کی گئی ہے؛ نہ کہ تقدیر کے اعتراف اور اثبات پر۔ [اس نے تقدیر کے ساتھ استدلال کو مذموم کہا ہے]، کیا آپ حضرت نوح علیہ السلام کا یہ قول نہیں سنتے:

﴿وَ لَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ (هود: ۳٤)

''''اور میری نصیحت تمھیں کچھ فائدہ نہیں دیگی اگر میں تمہیں نصیحت کرنا چاہوں اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ تمھیں گمراہ کر دے۔ وہی تمھارا رب ہے اور تمھیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

فما شئت كان وإن لم أشأ وما شئت إن لم تشأ لم يكن

''جو تو نے چاہا ہو گیا اگر چہ میں نہ بھی چاہوں اور جو میں نے چاہا نہ ہوا اگر تو نے نہ چاہا۔''

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے تقدیر میں غور کیا حیران ہو گیا پھر غور کیا مزید حیران ہوا۔ بالآخر میں نے دیکھا کہ مسئلہ تقدیر کو وہ انسان زیادہ جانتا ہے جو اس میں بحث کرنے سے رکتا ہے اور وہ زیادہ جاہل ہے جو تقدیر میں بحث کرتا ہے''۔

ہدایت وگمراہی اور مسئلہ تقدیر:

۲۴.:((یَهْدِی مَنْ یَّشَاءُ، وَیَعْصِمُ وَیُعَافِی فَضْلًا [1] وَیُضِلُّ مَنْ یَّشَاءُ وَیُخْذِلُ وَیَبْتَلِی عَدْلاً.))

''وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور محفوظ رکھتا اور تندرستی عطا کرتا ہے؛ اپنے فضل سے۔ اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، مدد چھوڑتا ہے؛ آزماتا ہے؛ اپنے عدل سے''۔

تشریح:...... اس پیرائے میں معتزلہ کے اس عقیدہ پر رد ہے کہ اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ بندہ کے لیے زیادہ مناسب کام کرے۔ یہ مسئلہ ہدایت اور گمراہی کا مسئلہ ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہدایت کا مطلب ہے راہ صواب کو واضح کرنا۔ اور اضلال کا معنی ہے کسی بندے کو گمراہ کہنا [کرنا]۔ کسی بندہ پر گمراہ ہونے کا حکم من جانب اللہ تعالیٰ اس وقت ہوتا ہے جب بندہ خود میں گمراہی پیدا کرتا ہے، اس کی بنیاد ان کے اس فاسد اصول پر ہے کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں۔

---

[1] ۔یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں خیر و بھلائی کے راستوں کی توفیق دیں۔ وہ نیک اعمال بجالائے؛ اور اپنے فضل سے اسے گناہوں اور برائیوں سے بچالیں۔ اور اسے معاف رکھیں۔ یہ سب اس کا فضل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلٰـکِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَکَرَّهَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْیَانَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ (7) فَضْلًا مِنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَّاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (8)﴾[الحجرات] ''اور لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو محبوب بنادیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کردیا اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمھارے لیے ناپسندیدہ بنادیا، یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔ اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت کی وجہ سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾[ابراہیم ۱۱] ''مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں احسان فرماتے ہیں''۔ اس سے پتہ چلا کہ ہدایت کامل جانا محض اللہ تعالیٰ کا احسان ہے؛ کسی اللہ تعالیٰ پر کوئی استحقاق نہیں۔

واضح رہے کہ مکلفین کے افعال سے متعلق ہدایت کی دو اقسام ہیں: عمومی ہدایت: جس میں کافر اور مؤمن برابر ہیں۔ یہ ہدایت بیان و رہنمائی اور خیر و شر کی راہوں سے آگاہ کرنے کی ہدایت ہے۔ اس کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَیْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰی عَلَی الْهُدٰی﴾[فصلت ۱۷] ''اور جو ثمود تھے تو ہم نے انھیں سیدھا راستہ دکھایا مگر انھوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھا رہنے کو پسند کیا''۔

اور ارشاد فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِیقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ﴾ (النمل 45) ''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو تو اچانک وہ دو گروہ ہو کر جھگڑ رہے تھے''۔

اور دوسری قسم ہے: ہدایت توفیق۔ یعنی قبول حق کی توفیق۔ الہام اور رشد؛ اور شرح صدر۔ فرمان الٰہی ہے: ﴿فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ﴾(الانعام: ۱۲۵) ''تو جس شخص کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے''۔

ان میں سے پہلی قسم ہدایت عامہ جب کہ دوسری قسم ہدایت خاصہ کہا جاتا ہے۔ ہدایت عامہ یہ رسولوں کا کام اور ان کا منصبی فریضہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾(الشوریٰ 52) ''بے شک آپ یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں''۔ معتزلہ ہدایت توفیق کے منکر ہیں؛ اس لیے کہ وہ بندوں کے افعال کو رب تعالیٰ کی مشئیت اور قدرت سے خارج کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ہدایت دینے پر قادر نہیں ہیں۔ یہی عقیدہ معتزلہ سے بعد میں آنے والے امامیہ اور روافض نے بھی لیا ہے۔ اور آج کل بھی یہ عقیدہ عراق و ایران کے امامیہ میں پایا جاتا ہے۔ میدان عرفات میں مسجد کوفہ کے امامی خطیب کے ساتھ اس مسئلہ میں میرا مناظرہ ہو چکا ہے۔ الحمد للہ۔

ہمارے مؤقف کے درست ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی ہے:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (القصص: ٥٦)

''بیشک آپ اسے ہدایت نہیں دے سکتے جسے آپ محبوب رکھیں؛ مگر اللہ تعالیٰ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے''۔

اگر ہدایت کا معنی صرف راہ واضح کرنا ہوتا تو نبی کریم ﷺ سے راہ ہدایت کے بیان کی نفی صحیح نہ ہوتی۔ کیونکہ آپ ہر شخص کو صحیح راہ دکھاتے تھے؛ خواہ وہ پسند کرے یا نہ پسند کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا﴾ (السجدہ: ١٣)

''اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو ہدایت دے دیتے۔''

نیز ارشاد گرامی ہے:

﴿یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ (المدثر: ٣١)

''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

یہ آیات بھی ان کے بیان کردہ معنی کا رد کرتی ہیں۔ نیز اگر ہدایت کا معنی راہ حق کو بیان کرنا ہوتا تو اسے مشیئت کے ساتھ مقید کرنا صحیح نہ تھا جب کہ راہ حق کے بیان میں تمام مساوی ہیں اور عام ہیں اسی طرح یہ فرمان الٰہی بھی ہے:

﴿وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ۝﴾ (الصافات: ٥٧)

''اور اگر میرے رب کی مہربانی نہ ہوتی تو میں بھی حاضر کیے جانے والوں میں سے ہوتا۔''

اور فرمان الٰہی ہے:

﴿مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ وَ مَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۝﴾ (الانعام: ٣٩)

''جس شخص کو اللہ تعالیٰ چاہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہے سیدھے راستے پر رکھتا ہے۔''

[یہ سبھی آیات ان کے بیان کردہ معنی کو غلط قرار دیتی ہیں] [1]۔

اللہ تعالیٰ کا فضل اور عدل:

۲۵. : ((وَكُلُّهُمْ يَتَقَلَّبُونَ فِی مَشِيئَتِهِ بَيْنَ فَضْلِهِ وَعَدْلِهِ.))

[1] ان آیات کو درست سمجھنا اور ان سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے فہم کے مطابق معانی اخذ کرنا یہ بھی صرف اہل سنت والجماعت کا اعزاز اور وہ بہت بڑی نعمت ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس مبارک جماعت کو چن لیا ہے۔

''اور سبھی اس کی مشیئت میں اس کے فضل اور عدل کے درمیان پھر رہے ہیں''۔

تَشْرِیح:......ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ (التغابن: ۲)ء

''وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے تمھیں پیدا کیا تو تم میں سے کچھ کافر ہیں اور کچھ مومن۔''

پس جس کو اس نے ایمان کی ہدایت عطا کی اسے اپنے فضل سے ہدایت دی ہے؛ پس اسی کی حمد و ثنا ہے۔ اور جس کو اس نے گمراہ کیا اسے اپنے عدل سے گمراہ کیا ہے؛ اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے [1]۔ مزید وضاحت آئندہ اوراق میں کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

[1] ۔اللہ تعالیٰ وسیع علم و حکمت والے ہیں؛ وہ جہاں اور جس پر چاہیں اپنا فضل فرما دیں۔ اور جس کے ساتھ چاہیں اپنی حکمت بالغہ کے تحت عدل سے کام لیں۔ پس اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنے فضل و حکمت سے ہدایت سے نوازتے ہیں؛ اور جس کو چاہیں اپنے عدل و حکمت سے گمراہ کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی حکمت معتبر اور ہر ایک چیز میں جاری ہونے والی ہے۔ پس کسی کو ہدایت دینا یا گمراہ کرنا؛ مدد کرنا یا بے یار و مددگار چھوڑ نا اس کی اسی حکمت کے تحت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا﴾ [النساء ۷۰] ''یہ فضل اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کافی ہے سب کچھ جاننے والا''۔ اللہ تعالیٰ کے ہر ایک فعل میں علت اور حکمت پائی جاتی ہے؛ بعض چیزوں کی حکمت نصوص سے معلوم ہو جاتی ہے۔ اور بعض کی حکمت غور و فکر اور تدبر سے معلوم ہوتی ہے؛ اور بعض امور کی حکمت معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ بندوں میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ کر سکیں۔

دراصل شیخ امام طحاوی رحمہ اللہ مسئلہ تقدیر پر کسی ایک مقام پر مکمل بحث نہیں کرتے ہیں۔ مختلف مقامات پر بحث کرتے ہیں، پس میں نے بھی ان کی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی برابری کی نفی:

26۔:((وَهُوَ مُتَعَالٍ عَنِ الْأَضْدَادِ وَالْأَنْدَادِ۔))

''اور وہ مخالفین اور برابری کرنے والوں سے بلند ہیں''۔

تَشْرِیح:......اُضداد: ضد کی جمع ہے؛ اور انداد: ند کی جمع ہے۔ ضد مخالف اور ند مثل کو کہتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا کوئی معارض نہیں بلکہ اس نے جو چاہا ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہوا اور اس کی برابری کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۝﴾ (الاخلاص: ٤)

''اور اس کی کوئی برابری کرنے والا نہیں۔''

شیخ امام طحاوی رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کے مخالف اور مماثل کی نفی کرتے ہوئے معتزلہ کا رد کر رہے ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ بندہ خود اپنے فعل کا خالق ہے۔

حکم الٰہی کے نفاذ پر ایمان

27۔: " لاَ رَادَّ لِقَضَائِهِ، وَلاَ مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ، وَلاَ غَالِبَ لِأَمْرِهِ".

''اس کا فیصلہ رد کرنے والا کوئی نہیں، نہ کوئی اس کے حکم کو ٹال سکتا ہے؛ اور نہ ہی اس کے امر پر کوئی غالب ہے''۔

تَشْرِیح:......کوئی رد کرنے والا اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو کوئی رد نہیں کر سکتا؛ اور کوئی ٹالنے والا اس کے حکم کو نہیں ٹال سکتا؛ اور نہ ہی کوئی غلبہ پانے والا اس کے امر پر غالب آ سکتا ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ ایک ہے زبردست غلبے والا [1]۔

۲۸.: " آمَنَّا بِذَلِكَ كُلِّهِ، وَأَيْقَنَّا أَنَّ كُلًّا مِنْ عِنْدِهِ".

''ان سب پر ہم ایمان لائے ہیں؛ اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ یہ تمام اسی کی جانب سے ہیں'' [2]۔

تَشْرِیح:......ایمان پر بحث آئندہ صفحات میں ہوگی؛ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ایقان استقرار کا نام ہے کہا جاتا ہے:

"یقن الماء فی الحوض" ''پانی حوض میں ٹھہر گیا'' اس وقت کہا جاتا ہے جب پانی حوض میں قرار پکڑ لے۔''

اور ''کلًا'' کی تنوین بدل اضافت کی ہے۔ یعنی ہر ہونے والی چیز اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیدا کی گئی ہے یعنی اس کے قضا، قدر، ارادہ، مشیئت اور تکوین کے ساتھ ہے، مزید وضاحت آئندہ صفحات میں آئے گی۔

---

[1] ۔''اس کا فیصلہ رد کرنے والا کوئی نہیں''۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ اِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ﴾ (الرعد ۱۱) ''اور جب اللہ کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کر لے تو اسے ہٹانے کی کوئی صورت نہیں اور اس کے علاوہ ان کا کوئی مددگار نہیں''۔

''کوئی اس کے حکم کو ٹالنے والا نہیں''۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا وَ اللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ وَ هُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ (الرعد ۴۱) ''اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم زمین کی طرف آتے ہیں، اسے اس کے کناروں سے کم کرتے آتے ہیں اور اللہ فیصلہ فرماتا ہے، اس کے فیصلے پر کوئی نظر ثانی کرنے والا نہیں اور وہ جلد حساب لینے والا ہے''۔

[2] ۔یعنی ہمارے اس یقین میں شک کی آمیزش تک نہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر و تدبیر سے ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ [النساء ۷۸] ''اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔ کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں''۔

ہم اس تمام پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہدایت و گمراہی اللہ کے ہاتھ میں ہے؛ اور ہر چیز میں اس کی مشیئت اور تقدیر نافذ ہے۔ کائنات کی کسی بھی چیز کو اس کی تقدیر و تدبیر اور مشیئت و ارادہ سے مفر حاصل نہیں۔ اور نہ ہی وہ کسی چیز سے عاجز اور کمزور ہے۔

رسالتِ محمد ﷺ کا اعتقاد:

اور آپ کی نبوت کے اثبات کے دلائل

۲۹.: ((وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ الْمُصْطَفٰی ❶ ، وَنَبِیُّهُ الْمُجْتَبٰی ، وَرَسُولُهُ الْمُرْتَضٰی)). ①

''بیشک محمد ﷺ اس کے برگزیدہ بندے اس کے چنے گئے پیغمبر اور اس کے پسندیدہ رسول ﷺ ہیں''۔

تَشرِیح:......''الا صطفاء ، الا جتباء ، الا رتضاء'' ہم معنی الفاظ ہیں۔

یہ جان لینا چاہیے کہ مخلوق کا کمال اللہ تعالیٰ کی عبودیت کے حقائق پورے کرنے میں ہے۔ پس جس قدر بندے میں عبودیت کی حقیقت زیادہ ہوتی جائے گی؛ اس کے کمال میں اضافہ ہوتا جائے گا اور اس کے درجات بلند ہوتے جائیں گے۔ اور جو شخص اس وہم میں مبتلا ہے کہ مخلوق کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر عبودیت سے خارج ہو سکتی ہے؛ اور یہ کہ مخلوق کا عبودیت سے نکل جانا زیادہ اکمل ہے۔ تو ایسا انسان مخلوق میں سب سے بڑے گمراہ اور جاہل ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۝﴾ (الانبیاء: ۲۶)

''اور بولے: رحمان نے کوئی اولاد بنا رکھی ہے، وہ پاک ہے، بلکہ وہ معزز بندے ہیں''۔

ان کے علاوہ دیگر آیات بھی اس موضوع پر دلالت کرتی ہیں''۔ [المجموع ۱۰/۱۷۶]

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو اشرف ترین مقام میں عبدیت کے ساتھ ذکر کیا ہے؛ سورت اسراء میں ارشاد فرمایا:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ﴾ (الاسراء: ۱)

''وہ ذات پاک جس نے اپنے بندے کی سیر کرائی۔''

---

❶۔ نبی کریم ﷺ کے متعلق یہ گواہی دینا واجب ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ﴾ (الجن: ۱۹) ''اور بے شک جب اللہ تعالیٰ کے بندے (محمد ﷺ) اس کی عبادت کو کھڑے ہوئے۔'' اس کے علاوہ بھی دیگر کئی آیات میں آپ کا یہ وصف بیان ہوا ہے؛ اور اس عبودیت پر آپ کی ثناء خوانی کی گئی ہے۔ یہ ایسی خاص عبودیت ہے، جس کی نسبت اپنے رب کی طرف کی گئی ہے۔ اسے شرفیہ نسبت یا اضافت تشریفی کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار اور سیدھی راہ پر چلنے اور چلانے والے تھے۔ اس لیے آپ کے حق میں اس قسم کی گواہی دینا انتہائی ضروری ہے۔

①۔ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جان لیجیے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے؛ اور ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ نبی اور رسول کے مابین جو فرق ذکر کیے گئے ہیں؛ وہ آپ کی علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی تفسیر میں (۵/۱۴۹) اور دیگر تفاسیر مل سکتے ہیں۔ ان میں سب سے مناسب بات یہ ہے کہ: رسول وہ ہوتا ہے جسے نئی شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہو۔ اور نبی وہ ہے جسے پرانی شریعت کے احیاء کے لیے بھیجا گیا ہو۔ طبعی طور پر وہ اسی پرانی شریعت کی تبلیغ پر مامور ہوتا ہے۔ اور [اب] یہ بھی معلوم ہے کہ جب علماء اس چیز پر مامور ہیں؛ تو انبیاء تو بالا ولی اس پر مامور ہوں گے۔ یہ بات کوئی مخفی نہیں ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ﴾ (الجن: ۱۹)

''اور بے شک جب اللہ تعالیٰ کے بندے (محمد ﷺ) اس کی عبادت کو کھڑے ہوئے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰىؕ﴾ (النجم: ۱۰)

''پھر اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو بھی وحی کی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا﴾ (البقرہ: ۲۳)

''اگر تم اس کتاب میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی۔''

اس عبدیت کی وجہ سے آپ دنیا و آخرت میں تقدیم کے حق دار ٹھہرے۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے روز جب لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے پاس شفاعت کے لیے جائیں گے؛ تو آپ کہیں گے:

''تم محمد ﷺ کے پاس جاؤ وہ ایسا بندہ ہے جس کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں''①۔

پس آپ ﷺ کو یہ مرتبہ تکمیل عبودیت کی وجہ سے حاصل ہوا۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کے کلام میں ''إِنَّ مُحَمَّداً'' میں ہمزہ کسرہ کے ساتھ ہے؛ اس کا عطف ''إِنَّ اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریك له'' پر ہے۔ اس لیے کہ یہ پورا جملہ ''قول'' سے معمول ہے یعنی: ''نقول فی توحید اللہ تعالیٰ ......''۔

سچی اور جھوٹی نبوت میں فرق:

متکلمین اور مناظرین کے ہاں انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی صداقت پر معجزات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ لیکن اکثر متکلمین معجزات کے بغیر انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو جانتے ہی نہیں؛ اور اس کو وہ بڑے مضطرب طریقہ سے ثابت کرتے ہیں۔ اور ان میں سے بہت سارے غیر انبیاء سے ''خرق عادات'' کا انکار کرتے ہیں۔ حتی کہ کرامات اولیاء اور سحر [جادو وغیرہ] کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

① ۔(بخاری ۶۷۴۴؛ مسلم ۳۲۲؛ یہ طویل حدیث کا ایک ٹکڑا ہے؛ تفصیلی حدیث آگے آئے گی۔)

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ معجزات کا ظہور انبیاء علیہم السلام کی صداقت کی صحیح دلیل ہیں؛ لیکن یہ دلیل صرف معجزات تک محصور نہیں۔ بے شک ہم دیکھتے ہیں کہ نبوت کا دعویٰ راست باز بھی کرتے ہیں اور بڑے بڑے کذاب بھی۔ اور ان دونوں کا معاملہ کسی انتہائی جاہل انسان پر ہی ملتبس/خلط ملط ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان دونوں کے احوال و قرائن ان کی حالت بتاتے ہیں جس سے ان دونوں کی پہچان ہوتی ہے؛ اور سچے اور جھوٹے میں فرق [امتیاز] کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ دعوی نبوت کے بغیر بھی عام لوگوں کے احوال دیکھ کر بھی ان میں تفریق کرنے کے بہت سارے طریقے ہیں؛ تو پھر دعوائے نبوت کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں؟ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے [رسول اکرم ﷺ کی تعریف میں] کتنی بہترین بات کہی ہے:

((لو لم يكن فيك آيات مبينة كانت بديهته تاتيك بالخبر))

''اگر آپ میں واضح نشانیاں نہ بھی ہوں پھر بھی آپ کے پاس آنے والی فی البدیہہ خبریں اصل حقیقت کو واضح کر رہی ہیں''۔

کذابین میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہو مگر ان میں نہ صرف جہالت، کذب بیانی؛ فسق و فجور موجود ہوتا ہے، بلکہ ان پر شیطانوں کے غلبہ کی نشانیاں صاف ظاہر ہوتی ہیں۔ جو کہ ان امور میں ادنیٰ سی سمجھ رکھنے والوں پر بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ رسولوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو کچھ باتوں کی خبر دیں؛ اور کچھ باتوں کا حکم دیں؛ اور خود بھی کچھ امور بجا لائے جن سے ان کی صداقت واضح ہو۔ اور جھوٹے کے بات کرنے؛ اس کے حکم دینے؛ اور کارکردگی سے اس کا جھوٹ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کی بہت ساری وجوہات ہوتی ہیں: جب کہ سچے کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

بلکہ جب دو انسان ایک بات کا دعویٰ کریں؛ ان میں سے ایک سچا اور ایک جھوٹا ہو۔ تو ان میں سے ایک کی سچائی اور دوسرے کا جھوٹ ظاہر ہونا بہت ضرور ہے۔ بھلے ایک مدت کے بعد ہی ایسا کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ سچائی نیکی کو لازم کرتی ہے: جب کہ جھوٹ فسق و فجور کو مستلزم ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تم پر سچائی کو اختیار کرنا لازم ہے، بے شک سچائی نیکی کا راہ دکھاتی ہے اور بے شک نیکی جنت کا راہ دکھاتی ہے۔ ایک آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور سچائی کا دلدادہ رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں راست باز لکھ دیا جاتا ہے اور جھوٹ سے بچاؤ اختیار کرو اس لیے کہ جھوٹ بولنا بدکاری کا راہ دکھاتا ہے اور بدکاری جہنم کی راہ دکھاتی ہے۔ ایک آدمی ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا ہے اور اس کو اپنا شیوہ بنالیتا ہے حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے''[1]۔

اسی لیے ارشاد ربانی ہے:

﴿هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ o تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ o يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كَاذِبُوْنَ o وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ o اَلَمْ تَرَى اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَهِيْمُوْنَ o وَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ o﴾ (الشعراء: ۲۲۱،۲۲۶)

[1] (مسلم) صحیحین کی طرف نسبت درست نہیں مؤلف کو تسامح ہوگیا ہے۔ قال الشيخ أحمد شاكر: الزيادتان ثابتتان فى رواية مسلم 2289 :2، وكان فى المطبوعة"ولا يزال" فى الموضعين، وأثبتنا ما فى مسلم أيضاً؛ لأن الرواية التى نقلها المؤلف أقرب الألفاظ إلى رواية مسلم، من طريق وكيع وأبى معاوية، كلاهما عن الأعمش ,وكذلك رواه أحمد 4108، عن وكيع وأبى معاوية بنحوه، وقد تساهل المؤلف فى نسبة الحديث بهذا اللفظ للصحيحين؛ لأن البخارى إنما روى بعضه بنحو معناه مختصراً من طريق آخر ,ولعله تبع فى ذلك المنذرى فى الترغيب والترهيب 26 :4، فقد تساهل أيضاً ونسبه للبخارى .انظر فتح البارى 422 :10۔قال ناصر الدين: صحيح، وهو فى" الأدب" من صحيح البخارى مختصراً، كما ذكر الشيخ شاكر رحمه الله تعالىٰ، لكنه فى " الأدب المفرد" له رقم 386 أتم منه.

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں، ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں، جو سنی ہوئی بات (اس کے کان میں) ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہیں اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔''

کاہن لوگ کبھی کبھار کچھ غیبی چیزوں کی خبریں دیتے ہیں۔ اوران کی باتوں میں سے کچھ سچی بھی ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا عام جھوٹ بولنا اور بدکردار ہونا پتہ دیتا ہے کہ وہ جو غیب کی خبریں بتاتے ہیں ان کی خبروں کا اصل کوئی فرشتہ نہیں اور نہ ہی ان کو انبیاء تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ خیال کریں جب نبی ﷺ نے ابن صیاد سے کہا:

''میں نے دل میں تمہارے لیے کچھ چھپا رکھا ہے؛ [بتاؤ وہ کیا ہے؟]''۔ اس نے کہا: ''درخ''۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ذلت تیرا مقدر ہو؛ کبھی تجھے بلندی حاصل نہ ہوگی''۔ [بخاری ۳/۶۱۷؛ مسلم ۲۹۳۰]

یعنی تو تو محض کاہن ہے، بے شک اس نے آپ ﷺ سے کہا تھا: ''میرے پاس سچا اور جھوٹا دونوں آتے ہیں؛ اور پانی کی سطح پر تخت دیکھتا ہوں''۔ [مسلم ۸/۱۹۰] دراصل وہ شیطان کا تخت تھا۔

شاعروں کے متعلق فرمایا کہ: ﴿يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ﴾ ''ان کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں'' جو اپنی خواہشات نفس اور شہوات کی اتباع کرتے ہیں، اگرچہ ایسا کرنا انجام کار کے لحاظ سے ان کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔

پس جو شخص رسول اللہ ﷺ کی معرفت رکھتا ہو؛ آپ کے صدق و وفاء کی؛ اور آپ کے قول فعل میں مطابقت کی معرفت رکھتا ہو؛ تو اسے یقینی طور پر پتہ چلے گا کہ [آپ کی زندگی تو اخلاق حمیدہ کا مرقع ہے اس لیے] آپ شاعر یا کاہن نہیں ہو سکتے۔

سچ اور جھوٹ کے قرائن:

لوگ مختلف قرائن/نشانیوں سے سچے اور جھوٹے میں تمیز کر لیتے ہیں۔ حتی کہ صنعت گری اور مقالات میں بھی؛ جیسا کہ وہ لوگ جو کاشتکاری کرتے ہیں یا کپڑا بنتے ہیں یا فن کتابت سے وابستہ ہیں؛ یا جو لوگ علم نحو، علم طب اور علم فقہ کا دعوی رکھتے ہیں [ان میں بھی مدارج ہیں؛ اور ان کا تعین کرنا کچھ مشکل نہیں]۔ اسی طرح نبوت ایسے علم اور عمل پر مشتمل ہوتی ہے جن سے ایک رسول کا متصف ہونا بہت ضروری ہے۔ اور وہ علم اور اعمال بہت ہی اعلی و اشرف ہوتے ہیں۔ پس ایک سچے اور جھوٹے میں کوئی مشابہت کیسے ہوسکتی ہے؟۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض محققین کا یہ کہنا کہ: بعض اوقات قرائن سے علم یقین [علم ضروری] حاصل ہو جاتا ہے، اگرچہ خبر دینے والا ایک فرد یا دو یا تین افراد ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بعض اوقات ایک انسان کے خدوخال اس کی رضامندی؛ محبت؛ بغض؛ خوشی اور غمی اور اس کے دل کی دیگر باتوں کا بھی پتہ چل جاتا ہے اور کچھ چیزیں اس کے چہرہ سے عیاں ہوجاتی ہیں۔ جذبات اصل حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں، اگرچہ فی الواقع زبان سے اظہار نہیں ہوتا اور بعض دفعہ اظہار ممکن بھی نہیں ہوتا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَاهُمْ﴾ (محمد: ۳۰)

''اور اگر ہم چاہتے تو وہ لوگ تم کو دکھا بھی دیتے اور تم ان کو ان کے چہروں ہی سے پہچان لیتے۔''

نیز ارشاد فرمایا:

﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (محمد: ۳۰)

''اور تم (ان کے) انداز گفتگو ہی سے پہچان لوگے۔''

بعض لوگوں کا قول ہے:

((ما أسر أحد سريرة إلا ظهرها الله تعالىٰ على صفحات وجهه وفلتات لسانه))

''جوشخص دل میں کچھ بھی راز چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ کے خدوخال اور اس کی زبان پر کبھی نہ کبھی اس کے اثرات نمایاں کر دیتا ہے۔'' [الجواب الصحيح ٦/ ٤٨٧]

پس جب مخبر کے صدق و کذب کا قرائن سے پتہ چلتا ہے تو پھر اس مدعی کے دعوی کا کیسے پتہ نہ چلے گا جو کہتا ہے: میں اللہ کا رسول ہوں؟۔ اس کا صدق و کذب کیسے مخفی رہ سکتا ہے؟ اور اتنے دلائل کی موجودگی میں کیوں کر سچے اور جھوٹے میں امتیاز نہیں ہوسکتا ہے؟۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بیان:

یہی وجہ ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا (۶۸-۳ق ھ) جانتی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راست باز نیکوکار ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ: ''بے شک مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے''۔

تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''بالکل نہیں، اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کی معاونت ترک نہیں کرے گا۔ بے شک آپ تو صلۂ رحمی کرتے ہیں؛ سچ بولتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، فقیروں پر خرچ کرتے ہیں، راہ حق میں اعانت کرتے ہیں''۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمداً جھوٹ سے ڈرتے تھے، آپ جانتے تھے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ بلکہ آپ خوفزدہ ہو گئے تھے کہیں آپ کسی برے حادثہ کا شکار نہ ہو جائیں۔ یہی وہ دوسرا مقام ہے۔ تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ایسے امور ذکر کر دیے جن سے اس کی نفی ہوتی ہے؛ اور وہ محاسن اخلاق اور اعلیٰ اوصاف بیان کر دیے جو آپ میں فطرتاً پائے جاتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سنت سے یہ بات معلوم شدہ ہے کہ جس میں مکارم اخلاق موجود ہوں اور وہ برے اخلاق سے کنارہ کش رہتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل نہیں کرتا نہ اس کی مدد چھوڑتا ہے۔

نجاشی رحمہ اللہ علیہ کا بیان:

جب حضرت نجاشی رحمہ اللہ علیہ (۹ ھ) نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہجرت کرنے والوں سے دریافت کیا اور آپ انہیں کس چیز کا حکم دیتے ہیں؛ انھیں قرآن پاک کی تلاوت کرنے کا کہا۔ جب انہوں نے قرآن پڑھا؛ تو وہ بول اٹھا کہ جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا رہا؛ اس کا اور اُس کلام کا ایک مخرج ایک ہی چراغ ہے''۔ [سیرۃ ابن ہشام ۱/ ۳۵۷؛ أحمد ۱/ ۲۰۱؛ إسنادہ حسن]۔

حضرت ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کا بیان:

ایسے ہی ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ ۱۲۰ق ھ)[کا قصہ بھی ہے]۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کو وہ کچھ بتایا جو آپ نے دیکھا تھا؛ تو ورقہ بن نوفل جو کہ عیسائی ہو چکا تھا؛ اور انجیل کا عربی زبان میں ترجمہ کر رہا تھا؛ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اس سے کہا: اے چچا! اپنے بھتیجے سے سنیں؛ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا؛ اس کو بتا دیا؛ تو اس نے کہا:

''یہ وہی جبرئیل علیہ السلام فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا کرتا تھا''۔[البخاری ۳؛ مسلم ۱۶۰]

شاہ روم ہرقل کا بیان:

رسول اکرم ﷺ نے جب روم کے بادشاہ ہرقل [۲۰ ھ] کی جانب خط بھیجا؛ جس میں اس کو اسلام کی طرف دعوت دی تھی؛ تو ہرقل نے وہاں موجود عرب کے باشندوں کو جمع کیا۔ان دنوں ابوسفیان [۵۷ ق ھ-۳۳ ھ] قریش قبیلہ کے چند لوگوں کی رفاقت میں تجارتی قافلہ لے کر شام آیا ہوا تھا۔تو ان سے رسول اکرم ﷺ کے حالات کے بارے میں دریافت کیا۔اس نے ابوسفیان سے آپ کے متعلق دریافت کیا؛ اور باقی لوگوں کو حکم دیا کہ اگر ابوسفیان کہیں کذب بیانی سے کام لے تو تمھیں اس کے جھوٹ کو ظاہر کرنا ہوگا؛ اور ان کا مجلس میں خاموش رہنا ابوسفیان کی موافقت شمار ہوگی۔

اس نے دریافت کیا: کیا آپ ﷺ کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟۔انھوں نے نفی میں جواب دیا۔

اس نے دریافت کیا: کیا آپ ﷺ کے قبیلہ میں اس سے پہلے بھی کسی نے یہ دعوی کیا ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔

اس نے دریافت کیا: کیا وہ تم میں اونچے نسب کا مالک ہے؟ تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔

اس نے پوچھا: کیا اس دعویٰ سے پہلے بھی تم نے اس پر جھوٹ کی تہمت دھری ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا اور کہا ہم نے اس سے کبھی جھوٹ نہیں سنا۔

پھر اس نے دریافت کیا: اس کی پیروی کرنے والے کمزور لوگ ہیں یا اونچے لوگ ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: اس کی پیروی کرنے والے تو کمزور لوگ ہیں۔

اس نے پوچھا: کیا ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے یا کمی آ رہی ہے؟، جواب دیا: ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اس نے پوچھا: کیا کوئی شخص دین میں داخل ہونے کے بعد ناراض ہو کر دین سے برگشتہ بھی ہوا، انھوں نے نفی میں جواب دیا۔

اس نے پوچھا: کیا تم نے اس کے ساتھ لڑائی کی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔

پھر سوال کیا: لڑائی میں کوئی غالب رہا، انھوں نے جواب دیا کبھی وہ ہم پر غالب آیا اور کبھی ہم اس پر غالب آئے۔

پھر اس نے دریافت کیا: کیا وہ عہد شکنی کرتا ہے، انھوں نے کہا: وہ عہد شکنی نہیں کرتا۔

پھر دریافت کیا: وہ تمھیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے، انھوں نے جواب دیا وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور وہ ہمیں ان بتوں کی عبادت سے روکتا ہے جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے اور وہ ہمیں نماز، سچائی، پاکدامنی اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے۔یہ دس سے زیادہ مسائل ہیں؛ اور پھر اس نے ان مسائل میں موجود دلائل بیان کیے۔

پھر اس نے کہا: ''میں نے تم سے دریافت کیا کہ کیا اس کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ تھا، تم نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے محسوس کیا اگر اس کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ وہ اپنے باپ کی بادشاہت کا طالب ہے۔

پھر میں نے تم سے دریافت کیا: کیا تم میں سے پہلے بھی کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے تم نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر اس سے پہلے کسی نے یہ دعویٰ کیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ وہ اپنے سے پہلے کی اقتداء کر رہا ہے۔

پھر میں نے تم سے دریافت کیا: اس کے اس دعویٰ سے پہلے بھی تم اسے جھوٹ کے ساتھ متہم کرتے ہو، تو تم نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے محسوس کیا جب یہ لوگوں پر جھوٹ سے گریز کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔

پھر میں نے تم سے دریافت کیا، اس کے پیروکار کمزور لوگ ہیں یا اونچے طبقہ کے لوگ ہیں؟ تم نے جواب دیا کمزور ہیں۔ اور شروع شروع میں پیغمبروں کے پیروکار کمزور لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔

پھر میں نے تم سے دریافت کیا: کیا وہ زیادہ ہو رہے ہیں یا ان کی تعداد کم ہو رہی ہے، تم نے جواب دیا تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایمان کا حال ایسے ہی ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ مکمل ہو جاتا ہے۔

پھر میں نے تم سے دریافت کیا: کیا دین میں داخل ہونے کے بعد ناراض ہو کر کوئی شخص مرتد بھی ہوا ہے، تم نے نفی میں جواب دیا، ایمان کا یہی حال ہوتا ہے۔ جب ایمان کی بشاشت دل میں پیوست ہو جاتی ہے تو پھر کوئی ناراض ہو کر دین سے برگشتہ نہیں ہوتا۔ اور یہ کسی حق اور سچائی کی بہت بڑی علامات میں سے ہے؛ [ظاہر ہے کہ] جھوٹ اور باطل بالآخر ظاہر ہو کر ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ماننے والے اس سے رجوع کر لیتے ہیں؛ اور ان لوگوں کو بھی منع کرتے ہیں جو ابھی اس دین میں داخل نہیں ہوئے۔ یعنی جھوٹ چند روز ظہور پذیر رہتا ہے اس کے بعد جلد ہی اس کا انکشاف ہو جاتا ہے۔

پھر میں نے تم سے دریافت کیا: تمھارے ساتھ اس کی لڑائی کا حال کیا ہے؟ تم نے جواب دیا کبھی ہم غالب کبھی وہ۔ اسی طرح پیغمبروں کی آزمائش ہوتی ہے، آخر کار انھیں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

پھر میں نے تم سے دریافت کیا: کیا وہ عہد شکن ہے، تم نے نفی میں جواب دیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ پیغمبر عہد شکنی نہیں کرتے''۔ اس کو علم تھا کہ رسولوں کی عادت اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ انہیں خوشحالی اور مصائب کے ساتھ انھیں آزماتا ہے تاکہ وہ شکر اور صبر کے درجہ پر فائز ہوں۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اللہ تعالیٰ مومن کے لیے جو فیصلہ صادر فرمائے وہ اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ یہ انعام صرف مومن کے لیے ہے۔ اگر مومن خوشحالی سے ہمکنار ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے، تو یہ اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، اگر کسی مصیبت سے دوچار ہوتا ہے اور صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے''۔

[مسلم ٢٩٩٩؛ أحمد ٤/ ٣٣٣] بلفظ: ((عجبا لأمر المؤمن، أن أمره كله خير، وليس ذلك لأحد ...، الحديث والباقي مثله سواءً، وفي رواية لأحمد: بينما رسول الله صلى الله عليه وسلم مع أصحابه إذ ضحك فقال: ألا تسألوني مم أضحك؟ قالوا: يا رسول الله ! ومم تضحك؟ قال: عجبت لأمر المؤمن، ...الحديث ,وسنده صحيح على شرط مسلم وله شاهد مختصر، خرجته في الصحيحة 147.

جنگ احد میں دشمن کے مسلمانوں غلبہ میں جو بھی حکمت تھی؛ اللہ تعالیٰ نے اس کو یوں بیان کیا ہے:

﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران: ١٣٩)

''اور بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا، اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿الٓمّٓ ○ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَھُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ○﴾ (العنکبوت: ۱، ۲)

''الٓمّٓ، کیا لوگ یہ سوچتے ہیں کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے؛ کہ وہ کہیں: ہم ایمان لائے اوران کی آزمائش نہیں کی جائے گے۔''

ان کے علاوہ اور بھی آیات اوراحادیث اس مضمون کی وارد ہیں جو بندوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور حکمت کو بیان کرتی ہیں جس سے عقلیں حیران ہوجاتی ہیں۔

پھر میں نے دریافت کیا: وہ پیغمبر کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟ ۔تم نے بتایا کہ وہ حکم دیتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ؛ نیز وہ نماز ادا کرنے، سچ بولنے؛ پاکدامنی اختیار کرنے اورصلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے اورتم کوان بتوں کی عبادت دے روکتا ہے جن کی عبادت تمھارے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ پس یہی تو پیغمبر کی صفت ہے ۔اور مجھے معلوم تھا کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے، لیکن میرا یہ خیال نہ تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ البتہ میں پسند کرتا ہوں کہ میں اس کی خدمت میں پہنچوں اگر میرے پاس بادشاہت نہ ہوتی تو میں ضرور وہاں جاتا۔ اوراگر تیری باتیں درست ہیں تو یقیناً اس کواس جگہ کی بادشاہت مل کر رہے گی جہاں پر میرے دونوں قدم ہیں''۔ ہرقل کی باتوں کا اصل مخاطب ابوسفیان بن حرب تھا؛ وہ ان دنوں کافر تھا اور نبی کریم ﷺ سے بہت بغض رکھتا تھا؛ اورآپ ﷺ کا بہت بڑا دشمن تھا۔

ابوسفیان بن حرب بیان کرتا ہے: ''جب ہم اس کی مجلس سے نکل رہے تھے تو میں نے اپنے رفقاء سے کہا کہ: ''ابن ابی کبشہ کا معاملہ بہت عظیم ہوگیا ہے کہ روم کا بادشاہ بھی اس کی تعظیم کرتا ہے، پھر ہمیشہ میں اس یقین میں رہا کہ نبی اکرم ﷺ کا دین عام ہو جائے گا یہاں تک کہ بادل نخواستہ میں بھی اسلام داخل ہوگیا۔ [البخاری ۲۹۴۱]

صدق، کذب کے دلائل میں فرق:

یہ جان لینا ضرور ہے کہ بسا اوقات دل میں مجموعی امور سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے؛ بعض امورا کیلے یہ کام نہیں کر سکتے جس سے سیرابی ہوجائے ۔ بلکہ سیرابی ؛تشنگی کا خاتمہ؛شکر؛ خوشی؛ غم جیسے جامع امور حاصل ہوتے ہیں۔ بعض باتوں سے یہ امور تکمیل نہیں پا سکتے۔ ہاں بعض امور سے کچھ تھوڑی سی چیزیں حاصل ہوسکتی ہے۔

یہی حال خبروں میں سے کسی ایک خبر کا بھی ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خبر واحد سے دل میں ایک گمان کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے؛ اور پھر دوسری خبر اس کوتقویت دیتی ہے۔ حتی کہ اس سے یقینی علم حاصل ہوجاتا ہے۔ اور یہ سلسلہ بڑھتا رہتا ہے اورتقویت پاتا رہتا ہے۔ یہی حال سچ اور جھوٹ کے دلائل کا بھی ہوتا ہے۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ نے اس عالم میں ایسے آثار بھی باقی رکھے ہیں جوحضرات انبیاء علیہم السلام اورایماندار لوگوں کی عظمتوں اوران کی کرامتوں پر دلالت کرتے ہیں؛ اور جو کچھ ان کو جھٹلانے والوں کوسزائیں ملی ہیں؛ جیسے طوفان کا ثبوت؛ فرعون اوراس کے لشکر کا غرق ہونا۔اور اللہ تعالیٰ نے جو پیغمبروں کے قصے بیان کئے ہیں؛ ایک کے بعد ایک نبی کا قصہ؛ جیسے سورہ شعراء میں ہے؛ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ؛ اورحضرت ابراہیم؛ حضرت نوح علیہ السلام اوران کے بعد کے انبیاء کے قصے۔ ان میں سے ہر ایک قصہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہی ارشاد فرمایا ہے:

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (67) وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (68)﴾(الشعراء)

''بے شک اس میں یقیناً ایک نشانی ہے اوران کے اکثر مؤمن نہیں۔اور بے شک تیرارب، وہی غالب،رحم والا ہے''۔

مختصر یہ کہ زمین میں کچھ لوگ ایسے موجود تھے جنہوں نے اعتراف کیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں؛ اورآپ کی پیروی کی اور کچھ لوگوں نے مخالفت کی۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں اوراہل ایمان کی مدد فرمائی؛ اوران کا انجام اچھا کیا۔اوران کے دشمنوں کے واقعات تواتر کے ساتھ واضح الفاظ میں ثابت ہیں۔اوران امور کی خبریں نقل کرنا اس سے زیادہ واضح اور ظاہر ہیں کہ سابقہ گزری ہوئی امتوں کی خبریں نقل کی جائیں؛ جیسے: شاہانِ فارس اور یونان کے اطباء بقراط[460¾377ق م]، جالینوس[129¾199ق م]بطلیموس، [200ق م]سقراط[470¼399ق م]، افلاطون[428¼347ق م]، ارسطو[384¼322ق م]اوراس کے پیروکار تاریخ میں اتنی شہرت کے مالک نہیں،[جس قدر وہ قومیں مشہور ہیں جوعذاب باری تعالیٰ میں گرفتار ہوئیں، یا جوقومیں پیغمبروں کی اطاعت کر کے دنیوی اخروی سعادتوں سے ہمکنار ہوئیں]۔

انبیاء علیہم السلام کے واقعات میں تواتر:

آج ہم حضرات انبیا علیہم السلام اوران کے پیروکاروں اوران کے مخالفین کے حالات تواتر کے ساتھ جانتے ہیں اور ہم یقینی علم رکھتے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام راہ حق پر اور سچائی کے ساتھ موصوف تھے۔اس کئی وجوہات ہیں:

اول: انہوں نے لوگوں کومخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جولوگ ہماری اطاعت کریں گے وہ کامیاب ہوں گے اوراطاعت نہ کرنے والے ذلیل وخوار ہوں گے؛ اورآخرت میں اچھا انجام ان کے ماننے والوں کے لیے ہوگا۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ماننے والوں کوغلبہ عطا کیا اوردشمنوں کوھلاک کرڈالا، جب یہ معلوم ہوجائے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ جیسے فرعون کا غرق ہونا، اورقوم نوح علیہ السلام کا پانی میں ڈوب کر مرنا؛ اور دیگر احوال سے رسولوں کی صداقت کا علم ہوجاتا ہے۔

❀ اس کی دلیل یہ ہے کہ: جب انبیائے کرام علیہم السلام کی جانب سے پیش کردہ شریعت اوراس کے تفصیلی احکام پرغور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کاعلم دیگر تمام لوگوں سے زیادہ ہے۔ایسی باتیں کسی کذاب اور جاہل سے صادر نہیں ہوسکتیں۔اورانبیائے کرام جو پیغام لائے ہیں؛اس میں جومصلحت؛ رحمت، ہدایت، خیر،اورلوگوں کی ان امور کی طرف رہنمائی پائی جاتی ہے؛ جن میں ان کا فائدہ ہوتا ہے؛ اوران چیزوں کی ممانعت ہوتی ہے جوانہیں نقصان دیں؛ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے امور کسی انتہائی مہربان؛ اور خیر خواہ سے ہی صادر ہوسکتے ہیں؛ جس کا مقصد انتہائی درجہ کی خیراور مخلوق کے لیے نفع رسانی ہے''۔[الاصفہانیہ ۱۳۷]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا تفصیلی تذکرہ کا مقام دوسرا ہے۔آپ کے معجزات پر بعض حضرات کی مستقل تصانیف موجود ہیں مثلاً: امام بیہقی رحمہ اللہ کی کتاب ''دلائل النبوة''اور دیگر کتب میں گراں قدر معلومات کی حامل ہے۔ بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات میں طعن کے مترادف ہے اوراللہ تعالیٰ کوظلم اور سفاہت کی طرف منسوب کرنا ہے بلکہ بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے انکار کے مترادف ہے۔تعالیٰ الله عن ذلك علواً كبيراً۔

رسول اکرم ﷺ کی صدق نبوت کی دلیل:

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاں محمد ﷺ سچے نبی نہیں تھے؛ بلکہ-نعوذ باللہ- آپ ظالم بادشاہ تھے؛ یہ لوگ یقیناً اللہ تعالیٰ پر افترا باندھنے پر کمر کس چکے ہیں۔اور اپنی طرف سے باتیں گھڑ کر اللہ تعالیٰ پر لگا رہے ہیں۔کہ وہ[یعنی آپ ﷺ] مسلسل ایسی باتیں کرتے رہے حتی کہ اپنی طرف سے حلال وحرام کرتے ؛ فرائض کا تعین فرماتے ہیں ؛شرائع کو مشروع کرتے ؛ ملتوں کو منسوخ ٹھہراتے ؛ گردنوں پر تلواریں چلاتے ۔پیغمبروں کے پیروکاروں اور اہل حق کو قتل کرتے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں اور ان کے بچوں کو غلام بناتے۔ان کے مال لوٹتے ؛ان کی آبادیوں کو تہس نہس کرتے ۔فتوحات کا سلسلہ بڑھتا رہتا رہا؛حتی کہ زمین فتح ہو جاتی ہے۔اور پھر آپ ان تمام کاموں کی نسبت اللہ تعالیٰ کے حکم ؛اور اس سے اپنی محبت کے اظہار کی طرف فرماتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان سب کاموں کا مشاہدہ فرماتے ہیں کہ وہ اہل حق کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔اور مسلسل تیئیس سال آپ اللہ تعالیٰ پر افترا باندھ رہے ہیں اس کے باوجود اللہ تعالیٰ آپ کی تائید ونصرت فرماتے ہیں؛ آپ کے دین کو غلبہ عطا کرتے ہیں اور آپ کو اتنی بڑی کامیابی سے ہمکنار فرماتا ہے جس سے انسانی طاقت عاجز ہے۔اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ آپ کی دعائیں قبول ہوتی ہیں آپ کے دشمن ہلاک کر دیئے جاتے ہیں آپ کی شہرت میں اضافہ ہوتا ہے۔افسوس کہ ان تمام باتوں کے باوجود ان لوگوں کے نزدیک- معاذ اللہ- یہ سب کچھ ظلم ؛ جھوٹ اور افتراء پردازی ہے۔حالانکہ وہ انسان بہت بڑا ظالم ہے جس نے اللہ تعالیٰ پر افترا باندھا؛ انبیاء کی شریعتوں کو باطل سمجھا؛ ان کو تبدیل کیا؛ اور اولیاء اللہ کو قتل کیا؛ پھر بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت اس پر ہمیشہ نازل ہوتی رہی ؛اور اللہ تعالیٰ اس کو اسی حالت پر برقرار رکھتے رہے۔پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا مؤاخذہ نہ کیا۔اس کا ہاتھ پکڑ کر نہ روکا ؛اس کی شہ رگ کو نہ کاٹا۔اس سے ان پر لازم آئے گا کہ وہ کہیں اس عالم کا نہ کوئی صانع ہے نہ کوئی مدبر ہے۔اگر اس عالم کا کوئی صانع مدبر وحکیم ہوتا تو اس کے ہاتھوں کو پکڑ لیتا؛ اور اس کا بہت بڑا مقابلہ کرتا؛ اور صالحین کے لیے اسے نشان عبرت بنا دیتا۔کیونکہ بادشاہوں کو اس کے علاوہ کوئی دوسری بات جچتی ہی نہیں۔تو پھر بادشاہوں کا بادشاہ[اللہ] احکم الحاکمین کیوں ایسا نہیں کرتا؟۔

بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر بلند کیا؛ آپ کی دعوت کو غلبہ عطا کیا اور تمام ملکوں میں سب کے سامنے آپ کی نبوت کی شہادت دی۔نیز ہم اس بات کا بھی انکار بھی کر سکتے کہ کثیر تعداد میں کذابین نے اپنا وجود قائم کیا؛ اپنی شان وشوکت کا انھوں نے اظہار بھی کیا لیکن انھیں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور نہ ہی ان کا اقتدار/ ولولہ زیادہ عرصہ رہا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ظالم کے استیصال کے لیے اپنے رسولوں اور ان کے پیروکاروں کو ان پر مسلط کر دیا؛ جنھوں نے ان ظالموں کو تہ تیغ کیا اور ان کی نسل کو ختم کیا۔اللہ تعالیٰ کی یہ سنت قدیم زمانہ سے جاری ہے''۔[زاد المعاد ۳/۶۱۰] یہاں تک کہ کفار بھی اس سے واقف ہیں۔ارشاد ربانی ہے:

﴿أَمۡ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِۦ رَيۡبَ ٱلۡمَنُونِ ۝ قُلۡ تَرَبَّصُواْ فَإِنِّي مَعَكُم مِّنَ ٱلۡمُتَرَبِّصِينَ ۝﴾ (الطور: ۳۰، ۳۱)

''کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے؛ ہم اس پر حوادث زمانہ کے منتظر ہیں؛ فرمادیں: منتظر رہو؛ میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں۔''

کیا آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خبر دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کمال اور اس حکمت اور قدرت اس چیز کا انکار کرتیہیں کہ وہ اپنے اوپر افترا باندھنے والوں کو قرار عطا کرے۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ ان کو اپنے بندوں کے لیے نشان عبرت بنا دے؛ جیسا کہ اس کی

سنت ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِكَ﴾ (الشوریٰ: ۲۴)

''یا وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ لیا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمھارے دل پر مہر لگا دے۔''

یہاں پر جواب شرط ختم ہو گیا؛ اس کے بعد خبر جازم غیر معلق دی ہے کہ وہ باطل کو ختم کرتا اور حق کو ثابت رکھتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ﴾ (الانعام: ۹۱)

''اور اللہ تعالیٰ کی قدر نہ کی؛ جیسے قدر کا حق تھا؛ جب کہنے لگے: اللہ تعالیٰ نے بشر پر کچھ بھی نازل نہیں کیا۔''

پس اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ سے رسول ارسال کرنے اور کلام کی نفی ہے اس نے اللہ تعالیٰ کی قدر ایسے نہیں کی جیسے اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔

رسول اور نبی میں فرق:

انبیائے کرام اور مرسلین عظام علیہم السلام کے مابین فرق کی متعدد وجوہ بیان کی جاتی ہیں؛ لیکن سب سے بہتر توجیہ یہ ہے جس پر آسمانوں سے وحی کی گئی ہو؛ اور اس کو حکم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں تک یہ خبریں پہنچائیں تو وہ نبی رسول ہے۔ اور اگر غیروں کو تبلیغ کرنے کا حکم نہیں ملا؛ تو وہ نبی ہے رسول نہیں۔ پس رسول نبی سے خاص ہے۔ ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں۔ لیکن رسالت اپنی جہت کے اعتبار سے عام ہے؛ نبوت رسالت کا جزء ہے؛ کیونکہ رسالت کا لفظ نبوت اور دیگر کو شامل ہے؛ بخلاف رسول کے۔ لیکن لفظ رسل انبیاء اور ان کے غیر کو متناول نہیں البتہ لفظ انبیاء رسل بھی شامل ہے۔ پس رسالت اپنی ذات کے اعتبار سے عام ہے اور اپنے اہل کے اعتبار سے خاص ہے۔

رسولوں کی بعثت اللہ تعالیٰ کی نعمت:

رسولوں کا مبعوث کرنا مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے خصوصاً حضرت محمد ﷺ کا مبعوث ہونا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ (آل عمران ۱۶۴)

''اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا ہے جب ان میں انھیں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا اور ان کو پاک کرتا اور کتاب اور دانائی سکھاتا؛ اور پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۷)

''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

مسئلہ ختم نبوت:

۳۰. :((وَأَنَّهُ خَاتِمُ الأَنْبِيَاءِ وَ إِمَامُ الأَتْقِيَاءِ وَ سَيِّدُ الْمُرْسَلِيْنَ وَ حَبِيْبَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ))۔

''اور بیشک آپ خاتم الانبیاء اور امام الاتقیاء اور سید المرسلین اور حبیب رب العالمین ہیں''

۳۰۔ ۱ :((وَأَنَّهُ خَاتِمُ الأَنْبِيَاءِ))

''اور بے شک آپ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں''۔

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الاحزاب: ٤٠)

''لیکن آپ اللہ تعالیٰ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔''

تمام انبیاء کرام و مرسلین عظام علیہم السلام آپ سے گزر چکے ہیں؛ اب آپ کے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔ سنت مطہرہ میں بہت ساری نصوص ایسی ہیں جو آپ کے بعد کسی نبی کے نہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ آپ کے اسماء گرامی میں سے ایک اسم مبارک ''العاقب'' ہے جس کا معنی ہے آخر میں آنے والا جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ [دیکھیں: البخاری ۴۸۹۶؛ مسلم ۲۳۵۴۔ یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔]

اور ایک حدیث میں ہے: حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عنقریب میں امت میں تیس جھوٹے ظاہر ہوں گے؛ ان میں سے ہر ایک کا خیال ہوگا کہ وہ نبی ہے؛ میں خاتم الانبیاء ہوں؛ میرے بعد کوئی نبی نہیں''۔ [رواہ أحمد ۵/ ۲۷۸؛ البخاری ۳۶۰۹؛ أبوداؤد ۴۲۵۲؛ الترمذی ۲۲۱۹]

یہ مسئلہ دین اسلام میں ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے۔ اس میں نہ ہی کوئی اختلاف ہے نہ ہی یہ مسئلہ مخفی ہے۔ بلکہ یہ چڑھتے سورج کی طرح عیاں اور واضح ہے۔ جو کوئی آپ کی ختم نبوت میں شک کرے وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ کجا کہ کوئی نبی ہونے کا دعوی کرے یا کسی ایسے دعویدار کی تصدیق کرے۔ اور ایسے ہی جس کسی کا یہ اعتقاد ہو کہ اسے شریعت محمدی ﷺ سے خروج کی وسعت حاصل ہے؛ تو وہ بھی کافر ہے۔ اس لیے کہ آپ کے خاتم الانبیاء ہونے پر ایمان رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی اطاعت مطلق کا عقیدہ بھی رکھا جائے۔ ایسے ہی جو کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ یہود و نصاری پر آپ ﷺ کی اطاعت لازم نہیں؛ اور وہ آپ کی اطاعت کے بغیر ہی جنت میں چلے جائیں گے؛ تو وہ بھی کافر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میرے متعلق کوئی یہودی اور عیسائی سنے اور پھر وہ مجھ پر ایمان نہ لائے تو وہ جہنم میں جائے گا''۔ [رواہ مسلم ۱۵۳]

اور فرمایا: ''اگر حضرت موسی علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو انہیں میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا''۔ [أحمد ۳/ ۳۳۸؛ ابن ابی شیبہ فی المصنف ۱۳/ ۴۵۹۔]

ارشاد نبوی ہے:

''میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال ایک محل کی ہے؛ جو بہت خوب صورت بنا ہوا ہے لیکن ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ محل کی زیارت کرنے والے اس کے گرد گھومتے ہیں؛ اور اس کی خوبصورتی پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں لیکن ایک اینٹ کی کمی پر عیب لگاتے ہیں تو وہ اینٹ میں ہوں میں نے محل کے عیب کو ختم کر دیا میرے ساتھ عمارت مکمل ہوگئی اور میرے ساتھ ہی رسولوں کا آنا ختم ہوگیا''۔ (بخاری، مسلم)

نیز رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((إِنَّ لِي أَسْمَاءً: أَنَا مُحَمَّدٌ، وَأَنَا أَحْمَدُ، وَأَنَا الْمَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللّٰهُ بِي الْكُفْرَ، وَأَنَا الْحَاشِرُ الَّذِي يُحْشَرُ النَّاسُ عَلَى قَدَمِي وَأَنَا الْعَاقِبُ الَّذِي لَيْسَ بَعْدَهُ أَحَدٌ))❶۔

''بیشک میرے بہت سارے نام ہیں ۔ میں محمد ہوں، اور میں احمد ہوں، اور میں ماحی (مٹانے والا) ہوں جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کفر کو مٹایا، میں حاشر (اکٹھا کرنے والا) ہوں، جس کے قدموں میں لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا۔ اور میں عاقب (آخر میں آنے والا) ہوں، جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہے''۔

صحیح مسلم میں حضرت ثوبان سے روایت ہے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا میری امت میں تیس کذاب ہوں گے سب کہیں گے کہ وہ نبی ہیں حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ (الحدیث)

صحیح مسلم میں ہے ایک مقام پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ: أُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ، وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ، وَأُحِلَّتْ لِي الْغَنَائِمَ؛ وَجُعِلَتْ لِي الْأَرْضُ طَهُوراً وَّ مَسْجِداً، وَّأُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً، وَّخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ))❷۔

,, مجھے انبیاء پر چھ وجہ سے فضیلت دی گئی ہے، مجھے جوامع الکلم دیے گئے ہیں؛ اور رعب کیساتھ میری مدد کی گئی ہے، اور میرے لئے غنیمت کو حلال کیا گیا ہے۔ اور میرے لئے زمین کو طہارت اور اور مسجد بنا دیا گیا ہے؛ اور مجھے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے؛ اور مجھ پر نبوت کو ختم کر دیا گیا ہے،،۔

مطلق امامت:

۳۰۔۲: ((وَ إِمَامُ الْأَتْقِيَاءِ))

''آپ پرہیزگاروں کے پیشوا ہیں''❸۔

رسول اکرم ﷺ ہی وہ پیشوا ہیں جن کی مطلق پیروی کی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت اسی لیے ہوئی ہے کہ ان کی پیروی کی جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران: ۳۱)

''فرمادیں: اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو تم سے اللہ تعالیٰ محبت کرے گا''۔

رسولوں کی سرداری:

۳۰۔۳ : ''وَ سَيِّدُ الْمُرْسَلِيْنَ ❹''.

''اور سید المرسلین ہیں''۔

پس ہر وہ شخص جو آپ ﷺ کی اتباع کرے گا اور ان کی راہ پر چلے گا؛ وہ متقی ہے۔

❶-: مسلم ؛ كتاب الفضائل باب في أسمائه ﷺ؛ ح: ٤٤٤٦ - صحيح ابن حبان كتاب التاريخ ؛ ح: ٦٤٠٤ - سنن الترمذي ؛ أبواب الأدب؛ باب : ما جاء في أسماء النبي ﷺ ح: ٢٨٤٠ - یہ معاملہ اسلام میں ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے؛ اس میں کوئی اختلاف یا مخفی بات ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آپ ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے میں شک کرنے والا کافر ہے؛ کجا کہ کوئی نبوت کا دعوی کرے یا کسی ایسے دعویدار سے تصدیق طلب کرے۔

❷- مسلم ح: ٥٢٣ - دیکھو: سابقہ تخریج۔

❸- پس تمام تر متقین خواہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام ہوں یا ان سے کم کوئی اور ان سب کے امام جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اور عام انسان کے لیے بھی یہ دعا کرنا ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اسے متقین کی جنس کا امام بنائے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہم یوں کہیں: ﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ [الفرقان ۷۴] ''اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور اولادوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیز گاروں کا امام بنا''۔ یعنی ایسا امام و پیشوا کہ متقی لوگ اس کی پیروی کریں۔

❹- علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: یہ عقیدہ بہت ساری ان مشہور احادیث کی روشنی میں ثابت ہے جن کو امت میں قبولیت حاصل ہے۔ شارح رحمہ اللہ نے ان میں سے کچھ احادیث کا ذکر کیا ہے؛ آپ کو وہاں مطالعہ کرنا چاہیے؛ یہ احادیث مبارکہ علم یقینی کا فائدہ دیتی ہیں۔ یقیناً آپ ﷺ تمام رسولوں کے سردار ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس عقیدہ پر وہ لوگ ایمان نہیں رکھتے جو عقیدہ کے باب میں حدیث پر ایمان کے واجب ہونے کے لیے اس کے متواتر ہونے کی شرط عائد کرتے ہیں۔ اس پر ان لوگوں کا ایمان کیسے ہوسکتا ہے جو کھل کر کہتے ہیں کہ عقیدہ صرف قرآن مجید سے لیا جاسکتا ہے۔ جیسے شیخ شلتوت اور دیگر حضرات۔ ان تمام پر میں نے اپنے رسالہ ''وجوب أخذ بحديث الآحاد في العقيدة والرد على شبه المخالفين'' میں بیس وجوہات سے رد کیا ہے۔ اور اس رسالہ کے آخر میں بیسیوں مثالیں ان عقائد کی ذکر کی ہیں جو صحیح احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں؛ اور ان پر [اپنے اس خودساختہ قانون کی روشنی میں] ان کا انکار کرنا؛ اور ان پر ایمان نہ لانا لازم آتا ہے۔ یہ ان میں سے عقیدہ کا ایک مسئلہ ہے۔ میرا وہ رسالہ طبع ہو چکا ہے؛ تفصیل کے خواہش منداس کا مراجعہ کرلیں۔

میں کہتا ہوں: آپ کے رسولوں کے سردار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ: آپ ﷺ ان سب سے افضل ہیں؛ اول سے آخر تک بشمول انبیاء و مرسلین علیہم السلام آپ تمام اولاد آدم علیہ السلام سے افضل ہیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا ایک دوسرے سے افضل ہونا قرآن کی نص سے ثابت ہے۔ ان میں سب سے افضل محمد ﷺ ہیں؛ اور ان کے بعد باقی اولوالعزم رسول ہیں۔ ان کی تعداد پانچ ہے۔ حضرت نوح؛ حضرت ابراہیم؛ حضرت موسیٰ؛ حضرت عیسیٰ اور جناب حضرت محمد علیہم السلام و ﷺ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾ [احزاب ۷] ''اور جب ہم نے تمام نبیوں سے ان کا پختہ عہد لیا اور تجھ سے اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی اور ہم نے ان سے بہت پختہ عہد لیا''۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے: ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ [الشوریٰ ۱۳] ''اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا تاکیدی حکم اس نے نوح کو دیا اور جس کی وحی ہم نے تیری طرف کی اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، یہ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں جدا جدا نہ ہو جاؤ''۔ اور حدیث میں جو ممانعت ہے کہ: ''لا تفضلوا بين الأنبياء''۔ انبیاء کرام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو''۔ تو اہل علم کے نزدیک یہ نہی تعصب پر محمول ہے؛ کہ کسی دوسرے کی شان میں فرق نہ آئے۔

تشریح: ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، وَأَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ ، وَأَوَّلُ شَافِعٍ ، وَأَوَّلُ مُشَفَّعٍ))❶-

''قیامت والے دن میں اولاد آدم کا سردار ہونگا، اور سب سے پہلے میری قبر شق (کھولی جائیگی) ہوگی، اور سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا، اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی،،۔

نیز مسلم کی شفاعت والی حدیث کے شروع میں ہے:

((أَنَا سَيِّدُ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ .))[]

''میں قیامت کے دن تمام لوگوں کا سردار ہوں گا''۔

مسلم، ترمذی میں ہے حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَى كَنَانَةَ مِنْ وَلَدِ اسْمٰعِيْلَ ، وَاصْطَفَى قُرَيْشاً مِّنْ كَنَانَةَ ، وَاصْطَفَى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشَمٍ ، وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِيْ هَاشَمٍ)) ❷

''بیشک اللہ تعالیٰ نے اسمعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کو، اور کنانہ کی اولاد سے قریش کو چن لیا تھا، اور قریش سے بنی ہاشم کو، اور بنی ہاشم میں سے مجھے چن لیا ہے،،۔

ایک اشکال اور اس کا جواب:

اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ اس حدیث کے مضمون کے خلاف دوسری حدیث آتی ہے ارشاد نبوی ہے:

''تم مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت عطا نہ کرو اس لیے کہ قیامت کے دن تمام لوگ بے ہوش ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے میں ہوش میں آؤں گا لیکن اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرش کا پایہ پکڑا ہوگا؛ پس مجھے علم نہیں کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے یا وہ ان سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ رکھا''۔ [بخاری، مسلم]

اور دوسری حدیث میں ہے:

((أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ ، وَ لاَ فَخَرَ .)) ❸

''میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور اس میں کوئی فخر کی بات نہیں ہے''۔

❶۔ مسلم ح ۲۲۷۸۔ نیز دیکھیں سابقہ حوالہ جات۔ ❷۔:مسلم کتاب الفضائل ؛ باب : فضل نسب النبي ﷺ ح: ۴۳۱۸۔ صحيح ابن حبان ؛ كتاب التاريخ 'ذكر اصطفاء الله تعالىٰ جل و علا صفيه ﷺ؛ ح: ٦٤٢٤۔

❸۔ ابن حبان'كتاب التاريخ '؛ ذكر الخبر المصرح بأن هذا القول إنما زجر عنه من أجل ......ح: ٦٣٣٣ ۔مسلم 'كتاب الفضائل' باب : تفضيل النبي ﷺ على جميع الخلائق'ح: ٤٣٢٠۔ المستدرك للحاكم 'كتاب تواريخ المتقدمين من الأنبياء و المرسلين' ذكر أخبار سيد المرسلين و خاتم النبيين ﷺ ح: ٤١٢٩۔

ان دونوں میں موافقت کی صورت کیا ہوگی؟۔

جواب: دراصل آپ ﷺ کے اس فرمان کا ایک سبب تھا۔ وہ یہ کہ ایک یہودی نے کہا: ''اس ذات کی قسم جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تمام انسانوں میں سے چن لیا'' یہ سن کر ایک مسلمان نے اس کو طمانچہ لگا دیا؛ اور کہا: ''کیا تو ایسی بات کہتا ہے جبکہ رسول اکرم ﷺ ہم میں موجود ہیں''۔ چنانچہ یہودی آیا اور اس مسلمان کی شکایت کی جس نے تھپڑ مارا تھا۔ تو آپ ﷺ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔ اس لیے کہ جب فضیلت دینا عصبیت اور حمیت؛ اور خواہش نفس کی بنا پر ہو؛ تو ایسا کرنا شرعاً مذموم ہے۔ بلکہ خود جہاد بھی؛ اگر کسی کو حمیت اور عصبیت کی بنا پر قتل کیا جائے تو وہ بھی مذموم ہوتا ہے اسی لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فخر و مباحات کو حرام قرار دیا ہے۔ وگرنہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّنَ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (الاسراء: ۵۵)

''ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ﴾(البقرة: ۲۵۳)

''یہ پیغمبر ہیں؛ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے گفتگو کی؛ اور بعض کو درجات میں بلندی دی''۔

معلوم ہوا فخر کے ساتھ ایک کو دوسرے پر فضیلت عطا کرنا مذموم ہے یا اگر مفضول کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو اسی پر حدیث: ''تم انبیاء علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو'' کو محمول کیا جائے گا۔ یہ حدیث ثابت ہے؛ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حدیث کا ایک حصہ ہے؛ جو کہ بخاری رحمہ اللہ اور دیگر محدثین رحمہم اللہ کی روایت کردہ ہے؛ اس کے باوجود بعض لوگ کہتے ہیں: اس میں علت ہے؛ بخلاف حدیث حضرت موسیٰ علیہ السلام کے؛ بے شک وہ حدیث صحیح ثابت ہے؛ اس میں کوئی علت نہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔

بعض حضرات نے ایک دوسرا جواب بھی دیا ہے؛ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان: '' لا تفضلونی علی موسی '''' مجھے حضرت موسیٰ پر فضیلت نہ دو''۔ اور یہ حدیث: '' لا تفضلوا بين الأنبياء ''۔''انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو''۔ یہ ممانعت خاص فضیلت کی ہے۔ یعنی کسی خاص پیغمبر پر کسی دوسرے کو فضیلت دینا درست نہیں۔ اس کے برعکس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ:

''میں اولاد آدم کا سردار ہوں اس پر مجھے فخر نہیں'' [1]۔

یہ عام طرح کی فضیلت ہے لہٰذا اس سے نہیں روکا جائے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھیں: اگر یہ کہا جائے کہ'' فلاں شخص تمام شہر والوں سے افضل ہے؛ اس سے ان کے افراد پر حرف نہیں آتا؛ یہ کلام درست ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کسی سے یوں کہا جائے کہ: ''فلاں تجھ سے افضل ہے'' تو ایسا کہنا درست نہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہی جواب شیخ طحاوی رحمہ اللہ نے شرح معانی الاثار میں بھی دیا ہے''۔[شرح معانی الآثار ۴/ ۳۱۵]

[1] حدیث صحیح ہے بخاری ۲/ ۳۶۰۔ ۱۳۶۱ اگرچہ شارح نے حدیث میں علت کا ذکر کیا لیکن صحیح نہیں حافظ ابن حجر نے بھی اس پر کچھ نقد نہیں کیا پھر اس حدیث کے شاہد بھی موجود ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث روایت کی گئی ہے: ''تم مجھے حضرت یونس بن متی پر فضیلت نہ دو'' ۔

اور یہ واقعہ کہ بعض شیوخ نے تلامذہ سے کہا میں اس حدیث کی تفسیر نہیں بتاؤں گا جب تک مجھے کثیر مال نہیں دیا جائے گا۔ جب تلامذہ نے شیخ کو کثیر مال دے دیا تو اس نے تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ حضرت یونس جب مچھلی کے پیٹ میں تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اسی قدر قریب تھے جس قدر کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات اللہ تعالیٰ کے قریب تھے؛ اور اس تفسیر کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا'' [یہ بھی بالکل غلط ہے]۔ یہ قصہ ان لوگوں کی کلام اللہ اور کلام رسول سے ان کی لفظی اور معنوی کلام ناواقفیت/ لاعلمی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ حدیث ان الفاظ میں کسی بھی معتمد کتاب میں روایت نہیں کی گئی۔ ہاں صحیح روایت کے الفاظ یوں ہیں:

''کسی انسان کے لیے لائق نہیں کہ وہ کہے: ''میں یونس بن متی سے بہتر ہوں''۔(مسلم، احمد)

ایک روایت میں ہے: ''جس نے کہا: ''میں یونس بن متی سے بہتر ہوں اس نے جھوٹ بولا''۔

یہ دونوں الفاظ عموم پر دلالت کرتے ہیں کہ کسی شخص لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو یونس بن متی پر فضیلت عطا کرے۔ لیکن اس میں یہ بھی نہیں کہ مسلمانوں کو روکا گیا ہو کہ تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یونس بن متی پر فضیلت نہیں دے سکتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے

حضرت یونس کے بارے میں فرمایا کہ:

﴿فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ﴾ (الصافات142)

''اس کو مچھلی نے نگل لیا اس نے قابل ملامت کام کیا تھا''۔[یعنی ایسا کام جس پر ملامت کیا جاتا ہو]

اور ارشاد ربانی ہے:

﴿وَذَا النُّونِ إِذ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَن لَّن نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ أَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ (الانبیاء: ۸۷)

''اور مچھلی والے جب چلا گیا غصہ ہو کر پس وہ سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے پھر اس نے اندھیروں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے بے شک میں گنہگاروں سے تھا''

اس واقعہ سے بعض لوگوں کو وہم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو حضرت یونس علیہ السلام سے بہتر سمجھتے ہیں؛ اور یہ کہ انہیں ایسے مقام کی کوئی ضرورت نہیں؛ کیونکہ اس سے کوئی قابل ملامت کام نہیں ہوتا؛ جس نے ایسا گمان بھی کیا تو وہ جھوٹا ہے۔ بلکہ تقریباً اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ہر بندہ وہی کہتا ہے جو حضرت یونس علیہ السلام نے کہا تھا؛ یعنی:

﴿لَّا إِلَٰهَ إِلَّا أَنتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ (الانبیاء: ۸۷)

''تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے میں ظالموں میں سے ہوں۔''

اور جیسا کہ سب سے پہلے نبی [حضرت آدم علیہ السلام] اور سب سے آخری نبی [حضرت محمد ﷺ] نے فرمایا تھا:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (الاعراف: ۲۳)

''ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔''

تمام پیغمبروں کے سردار خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ سے صحیح حدیث میں مروی ہے؛ جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے استفتاح نماز کی روایت میں ہے؛ آپ نے ((وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ......)) پڑھنے کے دوران یہ دعا فرمائی:

((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْمَلِكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ، اَنْتَ رَبِّيْ وَاَنَا عَبْدُكَ ، ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ جَمِيْعًا ، اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّآ اَنْتَ......))۔(مسلم ۷۷۱)

''یا اللہ! تو ہی بادشاہ ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو رب ہے میرا اور میں تیرا بندہ ہوں۔ میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا؛ اور میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ پس تو میرے سب گناہ معاف فرما دے، کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہ بخشنے والا نہیں''۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ایسے ہی کہا تھا؛ فرماتے ہیں:

﴿رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ (القصص: ۱۶)

''اے رب! بیشک میں نے اپنی جان پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے؛ تو ان کو بخش دیا بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

ایسے ہی جب حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا کہ:

﴿وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ﴾[القلم ۴۸]

''اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو، جب اس نے پکارا، اس حال میں کہ وہ غم سے بھرا ہوا تھا''۔

تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے سے روکا اور آپ کو حکم دیا گیا کہ اولوالعزم پیغمبروں علیہم السلام کے ساتھ مشابہت اختیار کریں؛ اور آپ سے کہا گیا:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (الاحقاف: ۳۵)

''پس آپ بھی اسی طرح تم بھی صبر کریں جس طرح عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں۔''

یقیناً جب کوئی کہنے والا کہتا ہے کہ: ''میں حضرت یونس علیہ السلام سے افضل ہوں''۔ پس افضل کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے سے کم مرتبہ والے پر فخر کا اظہار کرے؛ لیکن اگر وہ افضل نہیں ہے تو ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ [لقمان ۱۸] ''اللہ تعالیٰ تکبر اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں جانتا''۔ صحیح مسلم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے؛ آپ نے فرمایا:

''میری جانب وحی کی گئی ہے کہ تواضع اختیار کرو نہ کوئی کسی پر فخر کرے اور نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے''۔

پس اللہ تعالیٰ نے تو عام ایمانداروں پر فخر کرنے سے روکا ہے؛ تو پھر کسی عزت والے نبی پر فخر کرنا کیسے جائز ہوگا؟ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں''۔

پس یہ نہی عام ہے کسی کو بھی حضرت یونس علیہ السلام پر فخر کی اجازت نہیں؛ اگر چہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ افضل ہے تب بھی فخر کی اجازت نہیں؛ کیونکہ ایسا کلام کوتاہی کا سبب بنتا ہے؛ اور جو انسان ایسی بات کہتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ اور پھر یہ کہ کسی نبی نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ (الزمر: ٦٥)

''اگر تم نے شرک کیا تو تمھارے عمل ضائع ہو جائیں گے۔''

اگر چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک سے معصوم تھے؛ پھر بھی وعد و وعید مقادیر اعمال کے بیان کے لیے ہوتے ہیں۔ [یعنی اصل تو اعمال ہیں جن پر جزاء وسزا ملے گی]۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ خبر دی کہ: ''بے شک آپ اولاد آدم کے سردار ہیں'' بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم بتائے بغیر ہمارے لیے اس اعزاز کا علم حاصل ہونا ناممکن تھا۔ اس لیے کہ آپ کے بعد تو کوئی نبی آنے والا نہ تھا جو ہمیں اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کی عظیم الشان قدر ومنزلت [اور اس قسم کے اعزازات] سے مطلع کرتا؛ جیسا کہ آپ نے پہلے انبیاء علیہم السلام کے فضائل کا ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح آپ نے اپنی فضیلت کا ذکر کرنے کے بعد ''ولا فخر'' کا لفظ استعمال فرمایا کہ ''مجھے اس پر فخر نہیں''۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔

اور کیا وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام جنھیں معراج کرایا گیا اور جنھیں اللہ تعالیٰ کریم کا عظیم قرب حاصل ہوا؛ اس پیغمبر کے مقام کے برابر ہے جو مچھلی کے پیٹ میں گرایا گیا اور ان سے قابل ملامت فعل سرزد ہوا؛ اور کہاں ایک وہ پیغمبر جو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا مقرب و معظم ہے اور دوسرا پیغمبر امتحان میں ابھی تادیب کی منازل طے کر رہا ہے۔ ایک تو انتہائی قربت کے مقام پر ہے؛ اور دوسرا انتہائی تأدیب کی منازل طے کر رہا ہے۔ استدلال کے الفاظ پر غور کیجیے؛ بے شک

یہ تحریف شدہ الفاظ ہیں؛ جو کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد نہیں فرمائے۔

پھر یہ دلیل اللہ تعالیٰ کے مخلوق پر علو کی نفی کرتی ہے جو کہ دلائل صحیحہ اور صریحہ سے ثابت ہے۔ جن دلائل سے مخلوق پر اللہ تعالیٰ کا علو/ بلند ہونا ثابت ہوتا ہے؛ وہ غالباً ایک ہزار سے بھی زائد دلائل اس ضمن میں موجود ہیں۔ شیخ رحمہ اللہ کے قول محیط بکل شيء وفوقه کے ضمن میں ان کا ذکر کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

خلیل اللہ تعالیٰ کا لقب:

۳۰۔٤ :((وَ حَبِيْبَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ❶))

''آپ رب العالمین کے حبیب ہیں''۔

❶۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: بلکہ آپ اللہ تعالیٰ رب العالمین کے خلیل ہیں۔ بیشک خلت کا مقام و مرتبہ محبت سے زیادہ اونچا اور کامل ہے۔ جیسے حدیث نبوی ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ اتَّخَذَنِیْ خَلِیْلًا کَمَا اتَّخَذَ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلًا''۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے ہی خلیل بنایا ہے؛ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا تھا''۔ اسی لیے حدیث میں کہیں بھی آپ کا حبیب اللہ تعالیٰ ہونا ثابت نہیں ہے۔ اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ مزید دیکھو: فقرہ ۵۲۔

تشریح: رسول اکرم ﷺ کے لیے عند اللہ تعالیٰ محبت کا سب سے اونچا مقام [حاصل اور] ثابت ہے اسی کا نام خلۃ [خالص دوستی] ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''مجھے اللہ تعالیٰ نے خلیل بنایا جیسا کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا''۔ (مسلم، ابوعوانہ: احکام الجنائز ۲۱۷)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

''اگر میں نے زمین والوں سے کسی کو خلیل بنانا ہوتا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیل بناتا لیکن آپ کا یہ ساتھی تو اللہ تعالیٰ کا خلیل ہے''۔ (مسلم، ترمذی)

مذکورہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں؛ ان کی روشنی میں اس شخص کا قول باطل ہو جاتا ہے جو کہتا ہے خلت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا کی گئی اور محبت حضرت محمد ﷺ کو عطا کی گئی اس لحاظ سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ تعالیٰ ہیں اور حضرت محمد ﷺ حبیب اللہ تعالیٰ ہیں نیز صحیح حدیث میں مذکور ہے کہ: ''میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمام کی خلت سے براءت کا اظہار کرتا ہوں''۔ (مسلم)

جبکہ محبت آپ کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی ثابت ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۝﴾ (آل عمران: ١٣٤)

''اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو محبوب جانتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۝﴾ (آل عمران: ٧٦)

''بے شک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو محبوب جانتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾ (البقرۃ: ۲۲۲)

''بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو محبوب جانتا ہے۔''

تو ان دلائل کی روشنی میں اس شخص کا قول باطل ہو جاتا ہے جو خلت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خاص کرتا ہے اور محبت کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص کرتا ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ خلت دونوں کا خاصہ ہے اور محبت عام ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کہ: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں۔خبر دار میں اللہ تعالیٰ کا حبیب ہوں اس پر مجھے فخر نہیں'' (یہ حدیث ثابت نہیں ہے اس حدیث میں زمعہ بن صالح اور سلمہ بن وہرام ضعیف ہیں۔)

محبت کے مراتب:

محبت کے کئی مراتب ہیں؛ ان میں سے :

پہلا مرتبہ تعلق: دل کا محبوب کے ساتھ معلق ہونا۔

دوسرا مرتبہ ارادہ: دل کا محبوب کی جانب میلان کرنا اور اس کی طلب کرنا۔

تیسرا مرتبہ الصبابہ [دل کا پگھل جانا]: دل کا محبوب کی محبت میں اس قدر جھک جانا کہ وہ آپ کے ضبط میں نہ رہے جیسے پانی نچلی سطح کی زمین میں گرتا رہتا ہے۔

چوتھا مرتبہ الغرام [فدا ہو جانا]: ایسی محبت جو دل میں پیوست ہو جائے؛ اسی سے غریم ہے۔اس لیے کہ آپ اس کے ساتھ چپکے رہتے ہیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ (الفرقان: ٦٥)

''بے شک کہ اس کا عذاب بڑی تکلیف کی [چپک جانے والی] چیز ہے۔''

پانچواں مرتبہ مودت اور ود: اس کا معنی دلی محبت؛ خالص محبت اس کا نچوڑ یا لب لباب ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ (مریم: ٩٦)

''اللہ تعالیٰ ان کی محبت (مخلوقات کے دل میں) پیدا کر دے گا۔''

چھٹا مرتبہ شغف: محبت کا دل کے شغاف [گہرائی] میں سرایت کر جانا۔

ساتواں مرتبہ عشق: انتہاء درجہ کی محبت جس سے جان کا خطرہ محسوس کیا جائے۔لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت یا کسی بندے کی رب سے محبت کو عشق کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا؛ اگر چہ بعض نے ان پر بھی اس لفظ کا اطلاق کیا ہے۔

اس لفظ کا استعمال منع ہونے کے سبب میں اختلاف ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو یہ لفظ کتاب وسنت میں موجود نہیں یا اس لیے کہ عشق میں محبت کے ساتھ شہوت بھی ہوتی ہے؛ [یا کوئی اور سبب بھی ہو سکتا ہے]۔

آٹھواں مرتبہ التَتَیُّم: ایسی محبت کہ آپ محبوب کے غلام بن جائیں۔

نواں مرتبہ: تعبد ہے۔

دسواں مرتبہ خلت: ایسی محبت جو محبّ کے دل و دماغ میں سرایت کر جائے۔[مدارج السالکین ۳/۲۸]

بعض لوگ دوسرے انداز کی ترتیب ذکر کرتے ہیں لیکن یہ ترتیب بہت اچھی ہے؛ اس کے حسن سے ہر وہ شخص آگاہ ہوسکتا ہے جو ان کے معانی میں غور و فکر کرے۔

جان لیجیے! اللہ تعالیٰ کے وصف محبت اور خلت کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔[یہ ویسے ہی ہیں] جیسے اللہ تعالیٰ کی شان جلال اور عظمت کے جو لائق ہے؛ بے شک ان انواع سے ہم اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کر سکتے ہیں؛[جیسا کہ ان کے متعلق نصوص میں بھی وارد ہے]۔ دیگر صفات جن کے بارے میں نص وارد ہے؛ جیسے: ''ارادہ؛ ود؛ محبت؛ خلت۔

محبت کی تحدید [حد بندی] میں تقریباً تیس اقوال ذکر کیے جاتے ہیں؛ لیکن اس سے زیادہ واضح حد اس کی کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس کی جو بھی تعریف کی جاتی ہے اس سے اس کے خفا میں اضافہ ہوتا ہے معاملہ واضح نہیں ہوتا۔ اور یہ اشیاء واضح ہیں؛ ان کی کسی تحدید اس کی عریف کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی جیسے پانی، ہوا، مٹی، بھوک وغیرہ کسی تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔

ختم نبوت اور دعویٰ ءنبوت:

۳۱۔ :((وَكُلُّ دَعْوَى النُّبُوَّةِ بَعْدَهُ فَغَيٌّ وَّهَوَى))①۔

''آپ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ گمراہی اور نفسانی خواہش کی تسکین ہے''۔

تشریح: جب آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا ثابت ہو گیا تو جو شخص آپ کے بعد نبوت کا مدعی ہو گا وہ جھوٹا ہے اور یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اگر نبوت کا دعویٰ کرنے والا معجزات اور سچے دلائل پیش کرے تو ہم اس کی تکذیب کیسے کریں۔ بے شک ہم کہتے ہیں: اس کے وجود کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق کسی محال کو فرض کر لینے کے باب سے ہے۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خبر دیدی ہے کہ آپ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں۔ اب کوئی نبوت کا دعویدار آئے؛ اور اس کے اپنے دعوی میں جھوٹا ہونے کی نشانیاں ظاہر نہ ہوں؛ محال ہے۔ [گمراہی] ہدایت کی الٹ ہے۔ اور [نفسانی خواہش] اس کا مطلب یہ ہے اس کے دعویٰ کا اس کی خواہشات نفس ہیں؛ اس کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں۔ اس وجہ سے اس کا دعوی باطل ہے۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: رسول اللہ ﷺ نے اس امت کی خیر خواہی کرتے ہوئے انہیں آگاہ کر دیا تھا؛ بہت ساری احادیث میں خبر وارد ہوئی کہ آپ ﷺ کے بعد بہت زیادہ دجال ہوں گے۔ بعض روایات میں ہے آپ نے فرمایا: ''ان میں سے ہر ایک یہ گمان کرے گا کہ میں نبی ہوں؛ اور میں خاتم الانبیاء ہوں؛ میرے بعد کوئی نبی نہیں''۔ [رواہ مسلم/ دیکھو: سلسلہ احادیث صحیحہ ۱۶۸۳]

ان ہی دجالوں میں سے ایک دجال میرزا غلام احمد قادیانی ہے؛ جس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس کے ماننے والے ہندوستان؛ جرمنی؛ بریطانیہ؛ امریکا؛ [اور پاکستان] میں پھیلے ہوئے ہیں؛ ان کی وہاں پر مساجد ہیں؛ جن میں یہ مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ بلاد شام میں تھے؛ اللہ تعالیٰ نے ان کی جڑیں کاٹ دیں؛ اور انہیں ختم کر دیا۔ نبوت کے مسلسل باقی رہنے کے عقیدہ کے علاوہ بھی بہت سارے نئے عقائد ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا پیشوا ابن عربی صوفی ہے؛ ان کا ایک رسالہ بھی جس میں انہوں نے اپنے اس عقیدہ کی تائید میں ابن عربی کے اقوال جمع کئے ہیں۔ ان کے مشائخ اس پر رد نہ کر سکے؛ اس لیے کہ یہ کلام تو ابن عربی کا تھا [جس کو صوفی لوگ اپنا بڑا امام مانتے تھے]؛ حالانکہ وہ مرزائیوں کے کافر ہونے کا دوٹوک اور قطعی عقیدہ رکھتے تھے۔ یہ موقعہ ان کے عقائد ذکر کرنے کا نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث مبارکہ میں مراد لیے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آخری زمانے میں ایسے جھوٹے دجال ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی احادیث لیکر آئیں گے جو نہ تم نے سنی ہوں گی نہ تمہارے آباؤ اجداد نے؛ ان سے بچ کر رہنا؛ کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کر دیں اور فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں''۔ [رواہ المؤلف فی مشکل الآثار ٤/ ١٠٤ ـ وعند الامام مسلم ١/ ٩]

ان کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ جب یہ لوگ اپنی دعوت کے بارے میں بات چیت شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے حضرت عیسی علیہ السلام کی موت کے متعلق گفتگو شروع کرتے ہیں۔ جب وہ اپنے تئیں اس مرحلہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو دوسرے مرحلہ میں داخل ہوتے ہیں؛ وہ احادیث زیر بحث لاتے ہیں جن میں حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے تو وہ ان احادیث پر اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں؛ اور پھر بہت جلد ہی ان میں تأویل شروع کر دیتے ہیں؛ کیونکہ وہ اپنے حساب سے حضرت عیسی علیہ السلام کی موت ثابت کر چکے ہیں۔ اس لیے کہ مقصود تو حضرت عیسی علیہ السلام کے جیسے کا نزول ثابت کرنا ہے؛ اور وہ [ان کے جیسا] غلام احمد قادیانی ہے۔ ان کے ہاں اس طرح کی تأویلات بہت زیادہ پائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ باطنی ملحد لوگ ہیں۔ ان کے بعض گمراہ کن عقائد کی جانب اشارہ آگے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَ لَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ [] ''اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، یا کہے میری طرف وحی کی گئی ہے، حالانکہ اس کی طرف کوئی چیز وحی نہیں کی گئی اور جو کہے میں (بھی) ضرور اس جیسا نازل کروں گا جو اللہ نے نازل کیا''۔

نبوت محمد ﷺ کی عالمگیری:

۳۲۔: وَهُوَ الْمَبْعُوثُ إِلَى عَامَّةِ الْجِنِّ ① وَكَافَّةِ الْوَرَى② بِالْحَقِّ وَالْهُدٰى وَبِالنُّورِ وَالضِّيَاءِ "۔

"رسول اکرم ﷺ تمام جنات اور پوری خلقت کی جانب حق وہدایت ونور اور روشنی کے ساتھ مبعوث ہوئے"۔

تشریح: آپ ﷺ تمام جنات کی جانب بھی مبعوث کیے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ جنات کے قول کی حکایت بیان فرماتے ہیں [انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا]①:

﴿يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ﴾ (الاحقاف: ۳۱)

"اے قوم اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والے کی بات کو قبول کرو۔"

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قادیانیوں کی گمراہیوں میں سے ایک جنات کے انسانوں کی طرح ایک مخلوق ہونے کا انکار کرنا ہے۔اور وہ ان تمام آیات اور احادیث میں تأویل کرتے ہیں جن میں جنات کے انسانوں سے علیحدہ ایک جدا مخلوق ہونے کی تصریح ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ جنات کو بھی انسانوں کی ہی ایک قسم یا ان کا ایک گروہ کہتے ہیں؛ حتی کہ ابلیس کے متعلق بھی کہتے ہیں: یہ ایک شریر انسان ہے۔یہ کتنی بڑی گمراہی کی بات ہے۔
دراوی: میں نے عقائد کے بعض دوسری کتابوں میں پڑھا ہے کہ اہل حضرات اس انسان کو کافر کہتے ہیں جو کوئی جنات کے وجود کا سرے سے منکر ہے۔اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: اکفار الملحدین از علامہ انور شاہ کشمیری ؛ اور شرح عقیدہ الطحاویہ از شیخ براک ص ۱۰۰۔

② ۔کتاب وسنت کی نصوص میں جنات کے متعلق بہت ساری خبریں وارد ہوئی ہیں؛ جن کے ذکر کا یہ مختصر مقام متحمل نہیں ہوسکتا۔البتہ یہاں پر اتنا سمجھانا مقصود ہے کہ آپ کی رسالت کا تمام جنات اور انسانوں کے لیے عام ہونا ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے۔انسان اس وقت تک رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کرنے والا نہیں ہوسکتا جب تک وہ یہ گواہی نہ دے کہ آپ کو تمام کائنات کے لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔اور اس عقیدہ کا منکر کافر ہے۔

نیز سورۂ جن بھی دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ ان کی جانب بھی مبعوث کئے گئے تھے۔لیکن مقاتل کا یہ کہنا کہ آپ سے پہلے انسانوں، جنوں کی طرف کوئی رسول نہیں بھیجا گیا۔یہ بات ناقابل فہم ہے۔جبکہ ارشاد ربانی ہے:

﴿يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ﴾ (الانعام: ۱۳۰)

"اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمھارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آتے رہے۔"

پھر رسولوں کا سلسلہ انسانوں میں ہی رہا ہے کوئی جن رسول بن کر نہیں آیا۔مجاہد اور دیگر ائمہ سلف رحمہم اللہ کا یہی قول ہے ❶۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

❶ ۔اس معاملہ کو سمجھنا آسان ہے کہ سورہ ذاریات کی آیت نمبر ۵۶ میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمادیا ہے کہ میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔یہ دونوں اقسام کی مخلوق مکلّف ہیں؛ اور ان پر حجت تمام کردی گئی ہے۔ان دونوں میں سے مؤمن بھی ہیں اور کافر بھی؛ نیک بھی ہیں اور بدکردار بھی۔جیسا کہ کتاب وسنت کی کئی ایک نصوص سے یہ بات کھل کر واضح ہوتی ہے۔
جنات ایک غیبی مخلوق ہیں جو اگر بنوآدم کے سامنے آئیں تو مختلف اشکال اختیار کرکے آتے ہیں۔وہ لوگوں کے ساتھ زمین میں ہی رہتے ہیں۔ان کی مختلف مواصفات ہیں۔یہ کھاتے پیتے بھی ہیں اور بچے بھی جنتے ہیں؛ اور ان میں نر اور مادہ کا نظام بھی ہے۔

''رسولوں کا سلسلہ تو بنو آدم سے ہے اور جنات میں ڈرانے والے آتے رہے ہیں''؛ اور جنوں کا یہ قول: ﴿اِنَّا سَمِعۡنَا كِتٰبًا اُنۡزِلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى﴾ (الاحقاف: ۳۰) ''ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہے۔'' دلالت کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جنات کی جانب بھی بھیجے گئے تھے''۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ (۲۵ھ-۱۰۵ھ) کا قول جو طبری میں ہے کہ جنوں میں بھی رسول آتے رہے ہیں؛ (اور استدلال سابقہ آیت سے ہے) محل نظر ہے؛ یہ آیت صریح نہیں ہے محتمل ضرور ہے [اور احتمال سے استدلال نہیں ہوسکتا]۔ جیسا کہ:

﴿يَخۡرُجُ مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَالۡمَرۡجَانُ﴾ (الرحمن: ۲۲) ''دونوں سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔''

سے مراد دونوں نہیں ہیں؛ بلکہ ان دونوں میں سے ایک سمندر مراد ہے۔''

عمومی بعثت:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کی جانب مبعوث ہو کر آئے تھے؛ اس سلسلہ میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا﴾ (سباء: ۲۸)

''اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

''فرما دیں کہ لوگو میں تم سب کی طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں''۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اُوۡحِىَ اِلَىَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ﴾ (الانعام: ۱۹)

''اور یہ قرآن مجھ پر اتارا گیا ہے تاکہ میں تمہیں ڈراؤں؛ اور کو بھی جس تک یہ پہنچ سکے۔''

من بلغ کا لفظ عام ہے؛ یعنی ان کو ڈراؤں جن تک یہ پیغام پہنچے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَرۡسَلۡنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا﴾ (النساء: ۷۹)

''اور ہم نے تم لوگوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور اس بات کا اللہ تعالیٰ ہی گواہ کافی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَهُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ﴾ (یونس: ۲)

''کیا لوگوں کو تعجب ہوا کہ ہم نے انھیں میں سے ایک مرد کو حکم بھیجا کہ لوگوں کو ڈر سنا دو اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے دو کہ ان کے رب کے ہاں ان کا سچا درجہ ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَبَارَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا﴾ (الفرقان: ۱)

''وہ بہت ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل فرمایا تاکہ اہل عالم کے لیے ڈراوا ہو جائے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ﴾ (آل عمران: ۲۰)

''آپ اہل کتاب اوران پڑھ لوگوں سے پوچھیں کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ اسلام لے آئیں تو بیشک ہدایت پا لیں اور اگر منہ موڑ لیں تو آپ کا کام صرف اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔''

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

''مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں؛ جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو یہ چیزیں نہیں دی گئیں۔ ایک ماہ کی مسافت تک کے رعب سے میری مدد کی گئیہے۔ اور زمین کو میرے لیے مسجد اور طہارت بنا دیا گیا ہے؛ پس میری امت کے کسی فرد پر جب نماز کا وقت آجائے تو وہ نماز ادا کر لے۔ اور میرے لیے غنیمت حلال کر دی گئی ہے؛ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہ تھی۔ اور مجھے شفاعت کا عطیہ دیا گیا ہے۔ اور ہر نبی اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوا اور مجھے سب لوگوں کی جانب مبعوث کیا گیا ہے''۔
(بخاری ، مسلم؛ إرواء الغلیل ۲۸۵)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

''اس امت کا کوئی یہودی، عیسائی میرے بارے میں معلوم کرنے کے بعد اگر ایمان نہیں لائے گا تو وہ جہنم میں داخل ہوگا''۔
(مسلم/)

آپ کا تمام کائنات کی جانب مبعوث ہونا ضرورت کے تحت دین اسلام کا تقاضا ہے۔ لیکن بعض عیسائیوں کا یہ قول کہ آپ خاص طور پر اہل عرب کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے؛ کھلم کھلا باطل ہے۔ اس لیے کہ جب وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا رسول مانتے ہیں تو آپ جو باتیں کہتے ہیں ان کو وہ سب باتیں تسلیم کرنی چاہئیں۔ آپ ﷺ نے جب فرمادیا کہ: ''میں تمام لوگوں کی جانب اللہ تعالیٰ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ تو پھر ظاہر ہے کہ رسول جھوٹ نہیں بولتا؛ تو آپ کی تصدیق حتمی طور پر ضروری ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے روئے زمین کے تمام اطراف میں اپنے قاصد ارسال کیے اور کسریٰ قیصر، نجاشی، مقوقس، دیگر بادشاہوں کی جانب خطوط ارسال کیے اور انھیں اسلام کی جانب دعوت دی۔

لفظ کافۃ کی صرفی نحوی تحقیق:

یہاں پر لفظ ''کافۃ'' کا مجرور ہونا محل نظر ہے۔ چونکہ لفظ کافۃ کلام عرب میں صرف بطور ''حال'' استعمال ہوتا ہے اس لیے اس کو زیر دے کر پڑھنا درست نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾ (سباء: ۲۸)

''اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف رسول (بنا کر بھیجا) ہے۔''

لفظ كافة کے اعراب میں تین قول ہیں:

پہلا قول: وہ کاف سے حال ہے؛ اور اسم فاعل کا صیغہ ہے؛ اور ''ۃ'' مبالغہ کی ہے؛ یعنی آپ لوگوں کو باطل سے پھیرنے والے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کف کا مصدر ہے۔ معنی یوں ہوگا کہ آپ لوگوں کو باطل سے روکیں۔ اکثر طور پر مصدر حال آتا رہتا ہے۔

دوسرا قول: ''الناس'' سے حال ہے۔ لیکن اعتراض واقع ہوتا ہے کہ مجرور کا حال مجرور سے پہلے نہیں آ سکتا۔ جمہور کا یہی مسلک ہے۔ لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں؛ اس لیے کہ کلام عرب میں یہ ترکیب کثرت کے ساتھ موجود ہے لہٰذا اس کو تسلیم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

پس ابن مالک نحوی (۶۰۰-۶۷۰ھ) نے اسی کو ترجیح دی ہے اصل یوں ہوگا: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا لِّلنَّاسِ كَآفَّةً﴾

تیسرا قول: مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی إرسالةً كَآفَّةً۔ ایسی رسالت جو لوگوں کو باطل سے روکنے والی ہے۔ اس پر پھر وہی پہلے والا اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ صرف حال ہی استعمال ہوتا ہے۔

حق وہدایت اور نور:

((بِالْحَقِّ وَالْهُدٰى وَبِالنُّورِ وَالضِّيَاءِ))۔

''حق وہدایت ونور اور روشنی کے ساتھ مبعوث ہوئے''۔

حق وہدایت، نور، ضیا، دراصل اس دین اور شریعت کے اوصاف ہیں جس کو آپ ﷺ لائے؛ اور جن کی تائید قرآن کریم کی واضح براہین اور دیگر تمام دلائل سے ہوتی ہے۔ اور لفظ ضیاء میں لفظ نور سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا﴾ (یونس: ۵)

''وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا۔''[1]

[1] ۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [الاعراف ۱۵۷] ''سو وہ لوگ جو اس پر ایمان لائے اور اسے قوت دی اور اس کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا وہی لوگ کامیاب ہیں''۔
یہ وہ نور ہے جس سے ہدایت پرست لوگ سعادت کی راہ دیکھتے ہیں۔ جو کوئی اس نور سے محروم رہا؛ وہ جہالت وغفلت اور کفر کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہے؛ یہی حال بشریت کی اکثریت کا ہے؛ وہ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ وہ حقائق کی معرفت؛ حق وباطل میں تمیز اور حرام وحلال کی پہچان سے صرف اس لیے محروم ہیں کہ وہ ان امور کی معرفت کے لیے وحی کی راہ کو نہ اپنا سکے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس امت پر حقوق میں سے ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت کی جائے اور جو نور آپ لیکر آئے ہیں؛ اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس کی حقانیت پر ایمان رکھا جائے اور حسب استطاعت اس کے مطابق عمل بھی کیا جائے۔ جن چیزوں کا حکم دیا ہے ان پر عمل کریں؛ جن سے منع کیا ہے ان سے رک جائیں؛ اور جن باتوں کی خبر آپ نے دی ہے؛ ان کی تصدیق کریں؛ اور اللہ تعالیٰ کی بندگی صرف آپ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کریں۔ کامیابی اسی میں ہے۔

قرآن کے متعلق اہل سنت کا عقیدہ اور مخالفین پر رد

۳۳۔((......وَإِنَّ الْقُرْآنَ كَلامُ اللّٰهِ ، مِنْهُ بَدَا بِلا كَيفِيَّةٍ قَوْلاً ، وَأَنْزَلَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَحْياً ، وَصَدَّقَهُ الْمُؤْمِنُونَ عَلَى ذَلِكَ حَقًّا ، وَأَيْقَنُوا أَنَّهُ كَلامُ اللّٰهِ تَعَالَى بِالْحَقِيقَةِ ، لَيْسَ بِمَخْلُوقٍ كَكَلامِ الْبَرِيَّةِ ۔فَمَنْ سَمِعَهُ فَزَعَمَ أَنَّهُ كَلامُ الْبَشَرِ فَقَدْ كَفَرَ ، وَقَدْ ذَمَّهُ اللّٰهُ وَعَابَهُ وَأَوْعَدَهُ بِسَقَرَ حَيْثُ قَالَ تَعَالَى: ﴿سَأُصْلِيهِ سَقَرَ۝﴾ (المدثر : ۲۶)۔فَلَمَّا أَوْعَدَ اللّٰهُ بِسَقَرَ لِمَنْ قَالَ : ﴿إِنْ هٰذَآ إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ۝﴾ (المدثر : ۲۵) عَلِمْنَا وَأَيْقَنَّا أَنَّهُ قَوْلُ خَالِقِ الْبَشَرِ ، وَلا يَشْبِهُ قَوْلَ الْبَشَرِ .))۔①

''بلاشبہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے؛ اسی کی طرف سے اس کی ابتداء بغیر کیفیت کے ہوئی ؛ بول کر۔اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر وحی کے ذریعہ نازل فرمایا۔مومنوں نے اس کے حقانیت کی تصدیق کی ؛ اوران کا ایمان ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حقیقی کلام ہے۔انسانوں کے کلام کی طرح مخلوق نہیں۔پس جس شخص نے قرآن سنا اوراس کو انسانی کلام خیال کیا؛ وہ یقینی کافر ہوگیا۔یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت اورعیب جوئی کی ہے؛ اوراس کو جہنم کی وعید سنائی ہے۔ارشادفرمایا:

﴿سَأُصْلِيهِ سَقَرَ۝﴾ (المدثر : ۲۶)

''ہم عنقریب اس کو دوزخ رسید کریں گے۔''

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ کلام مصنف رحمہ اللہ سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے (مجموع الفتاوی ۱۲/ ۵۰۷)۔اوراس سے شارح ابن ابی العز رحمہ اللہ نے بھی استشہاد پیش کیا ہے (ط۴؛ص ۱۷۹)۔۔یہ جو کچھ امام طحاوی رحمہ اللہ نے حکایت بیان کی ہے؛ یہی وہ حق ہے جس پر غور وفکر کرنے سے کتاب وسنت کی دلالت واضح ہوتی ہے۔اوروہ فطرت سلیمہ بھی اس کی گواہی دیتی ہے جو شکوک وشبہات اور باطل آراء سے پاک ہو؛ اس میں تبدیلی نہ آئی ہو۔مسئلہ کلام میں لوگوں کے نو اقوال ہیں۔جن کا ذکر شارح نے کردیا ہے......الخ۔ان میں سے نوواں قول:......اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے کلام کے ساتھ متکلم رہا......''۔یہ قول ائمہ حدیث وسنت کا ہے۔
اورمصنف رحمہ اللہ کا قول: مِنْهُ بَدَا بِلا كَيفِيَّةٍ قَوْلاً ۔اس میں معتزلہ اوردیگر فرقوں پر رد ہے۔معتزلہ کا خیال ہے کہ قرآن کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوئی؛ اس سے پہلے ان کے اس عقیدہ سے متعلق حکایت گزرچکی ہے۔شیخ محمد بن مانع رحمہ اللہ فرماتے ہیں (ص ۸):'' قرآن عظیم اپنے الفاظ اور معانی میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔یہ نہیں کہا جاسکتا کہ معانی کے بغیر صرف الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں؛ جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے۔اور نہ ہی الفاظ کے بغیر معانی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوسکتے ہیں جیسا کہ گمراہ کلابیہ اوراس باطل پران کی پیروی کرنے والے اہل کلام اور مذموم باطنیہ کا عقیدہ ہے۔اہل سنت والجماعت اس کا اظہار کرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ: قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے؛ اس کی طرف سے نازل ہوا ہے؛ مخلوق نہیں؛ اس کے الفاظ اور معانی بالکل وہی ہیں جو جبریل امین نے اللہ تعالیٰ سے سنے ہیں؛ اورپھر نبی کریم ﷺ تک انہیں پہنچایا۔نبی کریم ﷺ نے حضرت جبریل سے سنا؛ اورصحابہ نے نبی کریم ﷺ سے سنا۔یہ قرآن صحائف میں لکھا ہوا ہے؛ سینوں میں محفوظ ہے اورزبانوں پر پڑھا جاتا ہے۔حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''اورایسے قرآن عین اس کا کلام ہے جو اس سے حقیقت میں بیان کے ساتھ سنا گیا ہے۔وہ تمام میرے رب کا قول ہے؛ نہ کہ کچھ؛ اس کے الفاظ ومعانی دوعلیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔وہ اللہ تعالیٰ رب العالمین کی طرف سے بذریعہ نازل ہوا ہے؛ اس کے الفاظ اور معانی؛ اس میں کوئی شک نہیں''۔امام طحاوی رحمہ اللہ کے کلام میں ان لوگوں پر رد ہے جو کہتے ہیں:''اللہ تعالیٰ کا کلام ایک معنی ہے جس کا سننا ممکن نہیں اورمسموع، منزل، مقروء، مکتوب اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں وہ تو عبارة عن کلام اللہ [یعنی کلام اللہ تعالیٰ کی تعبیر] ہے''۔[یہاں پر امام البانی رحمہ اللہ نے شارح رحمہ اللہ کا کلام نقل کیا ہے؛ جو متن میں آرہا ہے؛ اسے یہاں سے حذف کیا جارہا ہے۔مترجم]

پس اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو جہنم کی وعید سنائی ہے جو کہتا ہے:

﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ﴾ (المدثر: ۲۵)

''بے شک یہ (قرآن) نہیں ہے مگر انسانوں کا کلام[1]۔''

[1]۔ہم اس بات کا دل و زبان سے اقرار کرتے اور ایمان رکھتے ہیں کہ بلا شک و شبہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا حقیقی کلام ہے جو فاتحہ کی الحمد سے شروع ہو کر والناس میں ''الناس'' پر ختم ہوتا ہے۔اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کلام کیا ہے؛ اور پھر اپنے مکرم فرشتہ کے ذریعہ رسول محترم پر نازل فرمایا۔فرمان الٰہی ہے: ﴿وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾[التوبہ ٦] ''اور اگر مشرکوں میں سے کوئی آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دیں، حتی کہ وہ اللہ کا کلام سن لے''۔اس میں قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا کلام کہا گیا ہے؛ جو کہ حقیقت پر مبنی ہے اس میں کوئی مجاز نہیں۔اور یہ بھی فرمایا: ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ ۷۵) ''تو کیا تم طمع رکھتے ہو کہ وہ تمھارے لیے ایمان لے آئیں گے، حالانکہ یقیناً ان میں سے کچھ لوگ ہمیشہ ایسے چلے آئے ہیں جو اللہ کا کلام سنتے ہیں، پھر اسے بدل ڈالتے ہیں، اس کے بعد کہ اسے سمجھ چکے ہوتے ہیں اور وہ جانتے ہیں''۔
پس قرآن کریم اپنے حروف اور معانی میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے؛ ایسا نہیں کہ حروف اللہ کا کلام ہیں معانی نہیں؛ اور نہ ہی معانی اللہ کی طرف سے ہیں اور حروف کسی کے ہیں۔یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔بلکہ اس کے حروف بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں؛ اور معانی بھی اللہ کی طرف سے ہیں۔

تو ہم نے جان لیا؛ اور اس پر یقین کرلیا کہ یہ انسانوں کے خالق کا کلام ہے انسانوں کے قول کے مشابہ نہیں''۔

تَشْرِیح:......امام طحاوی رحمہ اللہ نے ایک بہترین قاعدہ اور اصول دین میں ایک بہترین اور عمدہ اصول ذکر فرمایا ہے جس میں لوگوں کے اکثر گروہ گمراہ ہوگئے ہیں۔امام طحاوی رحمہ اللہ نے یہ جو وضاحت ذکر کی ہے اس کے سچے ہونے پر کتاب و سنت کے دلائل ان لوگوں کو دلالت کرتے نظر آتے ہیں جو کتاب و سنت میں غور و فکر کرتے ہیں۔اور وہ فطرت سلیمہ بھی اس کا اقرار کرتی ہے جو شکوک و شبہات اور باطل آراء کی وجہ سے بدل نہ گئی ہو۔

قرآن کے بارے میں اقوال:

مسئلہ :......قرآن پاک کے بارہ میں لوگوں کا نو اقوال میں اختلاف ہوا ہے:

پہلا قول:......فلاسفہ اور صابیوں کا قول ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس کے معانی کا عقل فعال کی طرف سے نفوس پر فیضان ہوتا ہے۔

دوسرا قول:......قرآن پاک مخلوق ہے؛ اور اللہ تعالیٰ سے منفصل ہے۔یہ قول معتزلہ کا ہے۔

تیسرا قول:......قرآن پاک کا ایک ہی معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے اس میں امر نہی خبر، استفہام سبھی اسلوب ہیں جب ان معانی کو عربی میں تعبیر کیا جاتا ہے تو وہ قرآن ہے اور اگر عبرانی میں تعبیر کیا جاتا ہے تو تورات ہے یہ قول ابن کلاب اور اس کے ہم خیال اشعری وغیرہ کا ہے۔

چوتھا قول:......قرآن پاک حروف اور ازلی آوازوں کا نام ہے جو ازل میں مجتمع تھیں یہ قول بعض متکلمین اور بعض محدثین کا ہے۔

پانچواں قول:......قرآن پاک حروف اور اصوات کا نام ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ متکلم ہوا اس سے پہلے کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ متکلم نہ تھا یہ قول کرامیہ وغیرہ کا ہے۔

چھٹا قول:......قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کو اپنے علم اور ارادہ سے (جو اس کی ذات کے ساتھ ہیں) بناتا ہے صاحب المعتبر [۳/ ۲۰۸] کا یہی قول ہے اور امام رازی المطالب العالیہ [۳/ ۲۰۱-۲۰۷] میں اس کی طرف مائل ہیں۔

ساتواں قول:......اللہ تعالیٰ کا کلام ایسے معنی کو متضمن ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے جس کو اس نے اپنے غیر میں مخلوق کیا ہے۔ یہ قول ابو منصور ماتریدی ہے۔

آٹھواں قول:......قرآن پاک معنی قدیم قائم بالذات اور ان آوازوں کے درمیان مشترک ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے غیر میں پیدا فرمایا ہے۔ یہ قول ابوالمعالی [۴۱۹ھ تا ۴۷۸ھ] اور اس کے پیروکاروں کا ہے۔

نواں قول:......اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے کلام کے ساتھ متکلم رہا ہے؛ اس نے جب چاہا اور جیسے چاہا وہ ایسی آواز کے ساتھ متکلم رہا جو سنی جاتی ہے اور کلام قدیم ہے اگرچہ معین آواز قدیم نہیں ہے۔ یہ قول ائمہ حدیث وسنت کا ہے''۔[منہاج السنہ۲/ ۳۵۸]

حرف إنّ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے؛ جو کہ:'' إن الله تعالیٰ وحده لا شريك له '' پر عطف ہے۔

پھر فرمایا:'' إنَّ محمداً عبده المصطفى '' یہاں پر بھی ہمزہ مکسور ہے۔ یہ تینوں مواقع پر ایسے ہی ہے۔ اس لیے کہ یہ قول کا معمول واقع ہو رہا ہے۔ یعنی کلام کے شروع میں ہے:'' نقول في توحيد الله ؛ إن الله تعالیٰ وحده لا شريك له ''۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: (قرآن پاک اللہ کا کلام ہے) شیخ کے اس قول سے معتزلہ کی تردید ہو رہی ہے جو کہتے ہیں:

'' قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے شروع نہیں ہوا'': جیسا کہ پہلے ان کے عقیدہ کے بیان میں گزرا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ قرآن کی اضافت اللہ تعالیٰ کی جانب [اضافتِ] تشریفی ہے جیسے ہم کہتے ہیں: بيت الله یا ناقة الله۔ وگرنہ اس سے اس کا نکلنا مراد نہیں؛ وہ حقیقت میں کلام میں تحریف کر رہے ہیں۔ معتزلہ کا یہ عقیدہ بالکل باطل ہے''۔

بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت اعیان کی بھی ہوتی ہے؛ اور اجسام کی بھی اور معانی کی بھی۔ جب اعیان کی اضافت اللہ تعالیٰ کی جانب ہوتی ہے تو وہ تشریفی ہوتی ہے۔ [جیسے بيت الله یا ناقة الله۔] اور اعیان اس کی مخلوق ہیں]۔ بخلاف معانی کی اضافت کے؛ جب اضافت معانی کی طرف ہوتی ہے جیسے علم، قدرت، عزت، جلال، کبریاء، کلام، حیاۃ، علو، قہر تو یہ سب اللہ تعالیٰ کے صفات ہیں اور ان میں سے کسی بھی صفت کا مخلوق ہونا ممکن ہی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا کلام کے ساتھ موصوف ہونا اوصافِ کمال میں سے ہے اور کلام کا نہ ہونا نقص کے اوصاف سے ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَ لَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا﴾ (الاعراف: ۱۴۸)

''اور قوم موسیٰ نے موسیٰ کے بعد اپنے زیور کا ایک بچھڑا بنا دیا (وہ) ایک جسم (تھا) جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی ان لوگوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ نہ ان سے بات کر سکتا ہے اور نہ ان کو رستہ دکھا سکتا ہے۔''

معلوم ہوا بچھڑے کی عبادت کرنے والے کافر ہونے کے باوجود معتزلہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتے تھے انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ تو نہیں کہا کہ تیرا رب بھی کلام نہیں کرتا۔ نیز بچھڑے کے بارے میں فرمایا:

﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا وَّ لَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا۝﴾ (طٰہٰ: ۸۹)

''کیا وہ دیکھتے نہیں کہ وہ ان کی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ ان کے نفع نقصان کا مالک ہے۔''

معلوم ہوا بات کا جواب نہ دینا اور کلام نہ کرنا ایسا عیب ہے جس سے بچھڑے کے معبود نہ ہونے پر استدلال کیا جا رہا ہے۔

معتزلہ کے شبہ کا ازالہ:

معتزلہ کے شبہ کی آخری حد یہ ہے کہ [اللہ تعالیٰ میں] کلام کی صفت کو تسلیم کر لینے سے اس کا مجسم ہونا اور مشابہ ہونا لازم آتا ہے۔

جواب میں ان سے کہا جائے گا: ''جب ہم کہتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا اس کی شان کے مطابق ہے؛ [ہم اس کی کیفیت نہیں جانتے]۔ اس سے ان کے شبہ کی نفی ہو جاتی ہے۔ کیا آپ غور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ﴾ (یٰس: ٦٥)

''آج ہم انکے مونہوں پر مہر لگا دیں گے انکے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور انکے پاؤں گواہی دیں گے۔''

ہمارا ایمان ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں کلام کریں گے۔ لیکن ہم ان کے کلام کی کیفیت کا علم نہیں رکھتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (السجدۃ ٢١)

''اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ کہیں گے کہ جس اللہ تعالیٰ نے سب چیزوں کو نطق بخشا ہے اسی نے ہم کو بھی گویائی دی۔''

اسی طرح کنکروں اور کھانے کا سبحان اللہ تعالیٰ کہنا اور پتھر کا سلام کرنا؛ یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کا منہ نہیں ہے؛ لیکن ان سے آواز نکل رہی ہو گی جس میں حروف سنائی دے رہے ہوں گے۔

شیخ رحمہ اللہ نے اس طرف اشارہ کیا ہے؛ ''اس قول کی ابتداء بلا کیفیت کے اسی کی طرف سے ہوئی ہے''۔ یعنی اسی سے اس کلام کا ظہور ہوا ہے؛ لیکن ہم اس کے تکلم کی کیفیت کو نہیں جانتے۔ اس معنی کی تاکید کے لیے ''قولاً'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی ایسا مصدر لائے ہیں جس سے حقیقی معنی واضح ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ''تکلیماً'' کا مصدر لا کر حقیقی کلام کی تاکید کی اور مجاز کی نفی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ (النساء: ١٦٤)

''اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے کلام کیا۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ﴾ (یونس: ٣٢)

''پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟''۔

ایک معتزلی نے ابو عمرو بن العلاء قاری [٧٠ھ تا ١٥٤ھ] [جو کہ قراء سبعہ میں سے ایک ہیں] سے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ آپ ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى﴾ میں لفظ اللہ تعالیٰ کو نصب کے ساتھ مفعول بنا کر پڑھیں؛ تاکہ متکلم حضرت موسیٰ علیہ السلام قرار پائیں۔ اللہ تعالیٰ

متکلم نہ بنیں۔ انھوں نے کہا چلو میں یونہی تلاوت کر لیتا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے اس قول کا تیرے پاس کیا جواب ہے:﴿وَلَمَّا جَاءَ مُوسٰى لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ﴾ ''اور جب حضرت موسیٰ ہمارے وعدہ کے مطابق آئے؛ اور ان کے رب نے ان سے گفتگو کی''۔

یہ سن کر معتزلی ہکا بکا رہ گیا [اس سے کوئی جواب نہ بن سکا]۔

اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے پر کتاب وسنت سے دلائل:

کتاب وسنت میں کتنے ہی دلائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں سے اور دیگر لوگوں سے ہم کلام ہوں گے؛ ارشاد ربانی ہے:

﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ (یٰس: ۵۸)

''سلامتی والا قول اللہ تعالیٰ رحم کرنے والے کی طرف ہے۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ایک بار اہل جنت نعمتوں میں ہوں گے تو وہ ایک روشنی سے ہمکنار ہوں گے؛ جب وہ نگاہیں اٹھا کر دیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے اوپر سے ان کی جانب جھانک رہے ہوں گے؛ اور فرمائیں گے: السلام علیکم اے جنت والو!'' پس ارشاد ربانی:

﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ (یٰس: ۵۸)

''سلامتی والا قول اللہ تعالیٰ رحم کرنے والے کی طرف سے۔'' کی یہی تشریح / وتفسیر ہے۔

تو وہ جب تک اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے رہیں گے۔ انھیں جنت کی نعمتوں کی جانب کچھ دھیان نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ پردے میں ہو جائیں گے لیکن اس کی برکت اور اس کا نور باقی رہے گا''۔ [1]

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا اور اس کی صفت رؤیت؛ اور صفت علو [یعنی بلند ہونا] تینوں ثابت ہو رہی ہیں۔

[1] ۔ ابن ماجہ [۱۸۴]، حدیث ضعیف ہے۔ وكذا أبو نعيم في الحلية ٦/ ٢٠٨ ؛ وإسناده ضعيف كما قال الذهبي في "العلو" ٩٩ ؛ فيه أبو عاصم العباداني واسمه عبد الله بن عبيد الله ، قال الذهبي: واه ، عن الفضل الرقاشي وهو منكر الحديث كما في "التقريب" ومنه يتبين أن قول الشيخ أحمد شاكر فيما يأتي:إسناده جيد" غير جيد . وأورده ابن الجوزي في" الموضوعات" من رواية ابن عدي ، ثم قال:موضوع . الفضل رجل سوءٍ . وتعقبه السيوطي في اللآلي ٢/ ٤٦٠؛ بأن ابن ماجه أخرجه . وهذا لا شيء ، وبأن ابن النجار أخرجه من حديث أبي هريرة نحوه ، وفيه سليمان بن أبي كريمة ، قال السيوطي: قال ابن عدي: عامة أحاديثه مناكير ، ولم أر للمتقدمين فيه كلاما .قلت: وضعفه أبو حاتم كما في الجرح والتعديل٢/ ١٣٨ . قلت: وهذا وإن كان ينفي أن يكون الرقاشي تفرد بالحديث فلا يرفع عنه الضعف .واللہ أعلم.

لیکن اس سب کے باوجود یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ رب سبحانہ وتعالیٰ کے کلام کا صرف ایک ہی معنی ہو؟۔ دیکھیے ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ﴾ (آل عمران: ۷۷)

''جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد اور اپنی قسمیں تھوڑی سی قیمت کے عوض بیچ ڈالتے ہیں ان کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں ان سے

اللہ تعالیٰ نہ تو کلام کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف دیکھے گا۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کلام ترک کر کے ان کو ذلیل کیا ہے؛ یعنی عزت اور تکریم والی کلام نہیں فرمائے گا؛ یہی اس کی صحیح تفسیر ہے۔ وگرنہ دوسری آیت میں جہنمیوں سے کلام کا ذکر موجود ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قَالَ اخْسَؤُا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِo﴾ (المؤمنون: ۱۰۸)

''اسی میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو۔''

پس اگر اللہ تعالیٰ ایماندار بندوں سے بھی کلام نہ فرمائیں تو وہ اور اللہ تعالیٰ کے دشمن برابر ٹھہرے؛ اور دشمنوں سے کلام نہ کرنے کا ذکر کرنے میں سرے سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں ایک باب کا عنوان یوں منعقد کیا ہے کہ:

(اللہ تعالیٰ کا اہل جنت کے ساتھ کلام کرنا) اس باب کے تحت متعدد احادیث ذکر کی ہیں۔

پس جنت والوں کے لیے سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کے چہرہ مبارک کا دیدار اور اس کا ان سے کلام کرنا ہے تو پھر ان نعمتوں کا انکار جنت کی روح؛ اور اعلیٰ وافضل ترین نعمتوں کا انکار ہے۔ جس کے بغیر کوئی نعمت خوشگوار نہیں ہوسکتی۔

قرآن پاک کے مخلوق ہونے پر معتزلہ کے دلائل:

معتزلہ قرآن پاک کی اس آیت سے دلیل پیش کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الرعد: ۱٦)

''اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔''

پس قرآن بھی شے ہے؛ اور وہ بھی اس ''کل'' کے عموم میں داخل ہے۔ لہٰذا وہ بھی مخلوق ہوا۔ ان کا قول بڑا ہی عجیب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معتزلہ کے نزدیک بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق نہیں؛ بلکہ بندے اپنے تمام افعال کے خالق خود ہی ہیں؛ انہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا۔ تو اس طرح انھوں نے ان افعال کو اس ''کل'' کی عمومیت سے خارج کر دیا؛ اور اللہ تعالیٰ کے کلام کو اس کے عموم میں داخل کر دیا؛ حالانکہ کلام اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے؛ اور اس سے چیزیں تخلیق ہوتی ہیں؛ کیونکہ مخلوقات اس کے حکم سے وجود میں آتی ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾ (الاعراف: ٥٤)

''اور سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے حکم کے تابع ہیں؛ آگاہ رہو تخلیق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی۔''

یہاں پر امر اور خلق میں فرق کیا گیا ہے۔ اگر امر بھی مخلوق ہو تو لازم آئے گا کہ وہ کسی دوسرے امر کے ساتھ مخلوق ہوا ہو۔ اور وہ پھر کسی دوسرے کے ساتھ ہو [اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا]؛ اور اس کی کوئی انتہاء نہ رہے گی؛ تو تسلسل لازم آئے گا جو کہ باطل ہے۔ اور ان کے اس باطل [کل کی عمومیت کے تقاضا] میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف جیسے علم، قدرت وغیرہ بھی مخلوق ہوں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کہنا صریح کفر ہے۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ کا علم ایک چیز ہے؛ اور اس کی قدرت علیحدہ چیز ہے؛ اس کی زندگی (حیات) علیحدہ چیز ہے۔ پس یہ بھی اس ''کل کے عموم میں داخل ہوتے ہیں؛ اس طرح یہ بھی عدم سے وجود میں آنے والی

مخلوقات ٹھہریں گے۔تعالیٰ اللہ عما یقولون علوا کبیرا۔

یہ عقیدہ کیسے درست ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ متکلم بالکلام تو ہے؛ مگر اس کا کلام غیر کے ساتھ قائم ہے؟ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جمادات اور حیوانات میں جو کلام پیدا کیا ہے وہ اس کا کلام ہو۔اس لحاظ سے نَطَقَ [بولا] اور اَنْطَقَ [بولوایا] میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔حالانکہ بے شک قرآن پاک میں ہے کہ چمڑے کہیں گے: ﴿اَنْطَقَنَا اللّٰهُ﴾ ''ہم کو اللہ تعالیٰ نے نطق دیا ہے'' یہ نہیں کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے کلام کیا ہے۔

اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو کلام اللہ تعالیٰ کے غیر میں ہے خواہ وہ جھوٹ ہو یا کفر یا بکواس؛ اس کا متکلم اللہ تعالیٰ ہی ہو۔(اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند ہے)۔یہ نظریہ تو ان لوگوں کا ہے جو وحدت الوجود کے قائل ہیں چنانچہ ابن عربی کہتا ہے:

((أوكل كلام في الوجود كلامه سواء علينا نثره و نظامه.))

''اور جو بھی کلام موجود ہے وہ اس کا ہے خواہ وہ اس کی نثر ہے یا نظم۔''

اگر یہ درست ہوتا کہ ہم موصوف کو اس صفت کے ساتھ موصوف کرتے ہیں جو اس کے غیر کے ساتھ قائم ہے تو پھر یہ بھی درست ہوتا کہ اندھے کو بینا اور بینا کو اندھا کہتے۔اس لیے کہ بصیر [بینا] میں وصف عمیٰ [اندھاپن] اس کے غیر کے ساتھ قائم ہے۔اسی طرح نابینا میں بھی وصف بصر اس کے غیر کے ساتھ قائم ہے اسی طرح پھر یہ بھی درست ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو ان صفات کے ساتھ موصوف کیا جائے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے غیر میں پیدا فرمایا جیسے مختلف قسم کے رنگ، خوشبوئیں، ذائقے، طول عرض وغیرہ۔

امام عبدالعزیز مکی اور بشر مریسی کا مناظرہ [1]:

یہ مناظرہ مامون عباسی کے سامنے ہوا۔امام عبدالعزیز مکی رحمہ اللہ نے لازم ٹھہرایا تھا کہ مناظرہ میں نص قرآن کے علاوہ دیگر کوئی دلیل پیش نہ کی جائے؛ اور اس حجت کو لازم کر دیا تھا۔لیکن بشر مریسی نے امیر المومنین سے مطالبہ کیا کہ مناظرہ میں اس شرط کو ختم کیا جائے کہ دلیل صرف نص قرآن سے ہو پھر دیکھنا کہ وہ کس طرح اسی لمحہ اپنے قول سے رجوع کرتا ہے؛ اور قرآن پاک کو مخلوق کہتا ہے؛ اگر اس طرح نہ ہوا تو میرا خون حلال ہے۔چنانچہ مناظرہ شروع ہوا۔امام عبدالعزیز رحمہ اللہ نے دریافت کیا تو پہل کرتا ہے یا میں تجھ سے سوال کروں؟ بشر نے کہا تم پہلے سوال کرو۔اور وہ میرے بارے میں پر امید تھا۔میں نے کہا: ''تین باتوں میں سے ایک ضرور ہے:

[1] - امام عبدالعزیز بن یحیٰ الکنانی مکی شافعی المسلک فقیہ تھے۔مامون کے دور میں بغداد آئے اور مامون کی موجودگی میں خلق قرآن کے مسئلہ پر یہ مناظرہ ہوا۔چنانچہ امام عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس مناظرہ پر الحیدۃ کتاب تالیف کی؛ جس میں یہ مناظرہ ثابت کیا ہے۔حقیقت میں یہ مناظرہ ثابت نہیں۔اس لیے کہ مناظرہ بیان کرنے والا راوی محمد بن حسن بن ازہر الدعاء متفرد ہے خطیب نے اس کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا/گھڑا کرتا تھا۔ذہبی نے کہا کہ اس مناظرہ کو بھی اس نے وضع کیا۔(المیزان: ۳/ ٤٤)

اول: یہ اقرار کرو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو اپنے نفس میں پیدا کیا (جبکہ میں تو قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھتا ہوں)۔

دوم: یا یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو اس حال میں پیدا کیا کہ وہ اپنی ذات اور نفس کے ساتھ قائم ہے۔

سوم: یا پھر یہ کہ اس نے قرآن کو اپنے غیر میں پیدا کیا ہے۔

اس نے جواباً کہا: اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو اسی طرح پیدا فرمایا؛ جس طرح اس نے تمام چیزوں کو پیدا کیا۔ اور جواب سے گریز کیا۔

مامون نے امام عبدالعزیز رحمہ اللہ سے کہا: ''آپ اس جواب کی تشریح کریں؛ بشر کو چھوڑیے؛ وہ تو ناکام ہو چکا ہے۔ تو امام عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر بشر کہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کو اپنے نفس میں پیدا کیا ہے'' تو یہ محال ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات حوادث مخلوقہ کا محل نہیں ہے۔ اس کی ذات میں کوئی چیز مخلوق نہیں۔ اگر یہ کہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے غیر میں پیدا کیا ہے؛ تو قیاس اور غور وفکر کے نتیجہ میں لازم آتا ہے کہ ہر وہ کلام جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے غیر میں پیدا کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو۔ اور اگر یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلام کو پیدا کیا؛ اس حال میں کہ وہ اپنے نفس اور ذات کے ساتھ قائم ہے؛ تو یہ بھی محال ہے اس لیے کہ کلام تو متکلم سے ہوتا ہے؛ جیسا کہ ارادہ اس سے ہوتا ہے جو ارادہ کرنے والا ہے اور علم عالم سے ہوتا ہے۔ اور عقلی طور پر کسی ایسے کلام کا وجود ممکن نہیں جو بذات خود قائم ہو؛ اور خود ہی متکلم بھی ہو۔ تو جب ان وجوہ سے اس کا مخلوق ہونا محال ہے تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا وصف ہے۔

امام عبدالعزیز رحمہ اللہ کا یہ کلام اختصار کے ساتھ کتاب ''الحیدۃ'' کے صفحہ ۷۹ پر ہے۔

قرآن پاک میں لفظ ''کل'' کا استعمال:

لفظ ''کل'' کا عموم ہر مقام پر اس کی مناسبت سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی معرفت قرائن سے حاصل ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَى إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ﴾ (الاحقاف: ۲۵)

''ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے تباہ کر دیتی؛ تو ایسے ہوئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔''

مساکن [گھر] بھی تو شے ہیں؛ ان کو اس عموم میں کیوں داخل نہیں کیا گیا جن کو آندھی نے برباد کر دیا تھا؟۔ اس لیے کہ اس سے مراد ہر اس چیز کا تباہ ہونا ہے جو عموماً آندھی سے تباہ برباد ہو جاتی ہیں؛ یا جو چیزیں اس تباہی کی مستحق تھیں۔

نیز (بلقیس کی حکایت بیان کرتے ہوئے) ارشاد ربانی ہے:

﴿وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (النمل: ۲۳)

''اور اسے ہر چیز میسر کی گئی تھی۔''

اس کل سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کے بادشاہ محتاج ہوتے ہیں۔ قرائن سے یہی قید سمجھ میں آتی ہے۔ چونکہ ہُدہُد کا مقصد یہ بتانا تھا کہ وہ کامل با اختیار بادشاہ زادی ہے اسے مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں؛ جس سے اس کی بادشاہی کی تکمیل ہو۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ ایسے ہی ارشاد ربانی ہے:

﴿خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الرعد: ۱۶)

''وہ ہر چیز کا خالق ہے۔'' یعنی ہر مخلوق چیز کا خالق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر موجود چیز مخلوق ہے؛ تو اس عموم میں لازماً بندوں کے افعال بھی حتمی طور پر داخل ہیں لیکن اس میں خالق سبحانہ و تعالیٰ داخل نہیں۔ اور اس کی صفات اس کی ذات کا غیر نہیں ہیں۔ اس لیے کہ بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ، صفات کمال کے ساتھ موصوف ہے

؛اوراس کے صفات اس کی ذات مقدس کے ساتھ لازم ہیں؛ صفات کے ذات سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔جیسا کہ اس معنی کا ذکر اشارتاً پہلے آ چکا ہے:(ما زال بصفاته قديما قبل خلقه) . بلکہ وہ جس چیز سے بھی اپنے حق میں دلیل پیش کرتے ہیں؛ وہ دلیل انہی کے خلاف ہوتی ہے۔ان کے خیال میں (جب اللہ تعالیٰ کا قول ﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ مخلوق ہے تو اس سے دلیل لینا صحیح نہیں ہوسکتا۔

معتزلہ کی دوسری دلیل: جہاں تک معتزلہ کے درج ذیل آیت سے دلیل پیش کرنے کا تعلق ہے:

﴿اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا﴾ (الزخرف: ۳)

''بے شک ہم نے اس کتاب کو قرآن عربی زبان میں بنایا۔''

[یعنی اس آیت میں جعل بمعنی خلق ہے]۔لیکن ان کا یہ استدلال کتنا ہی فاسد ہے؛اس لیے کہ جعل جب خلق کے معنی میں آتا ہے؛تو اس وقت ایک مفعول کی جانب متعدی ہوتا ہے۔مثلاً ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ﴾ (الانعام: ۱)

''اوراس نے اندھیرے اور روشنی کو پیدا کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ۝ وَ جَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ۝ وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ (الانبياء ۳۰-۳۲)

''ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندگی عطا کی یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تا کہ لوگوں کے بوجھ سے ہلنے (اور جھکنے) نہ لگے اور اس میں کشادہ رستے بنائے تا کہ لوگ ان پر چلیں۔اور آسمان کو محفوظ چھت بنایا۔''

اور جب جَعَلَ دو مفعولوں کی جانب متعدی ہوتا ہے تو پھر خلق کے معنی میں نہیں ہوتا۔ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا﴾ (النحل: ۹۱)

''اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو ان کو مت توڑو کہ یقیناً تم اللہ تعالیٰ کو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ﴾ (البقرة: ۲۲۴)

''اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کا حیلہ نہ بنانا کہ قسمیں کھاؤ۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ۝﴾ (الحجر: ۹۱)

''وہ لوگ جنھوں نے قرآن کے ٹکڑے کر ڈالے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَجۡعَلۡ یَدَکَ مَغۡلُوۡلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ﴾ (الاسراء: ۲۹)

''اوراپنے ہاتھ کونہ تو گردن سے بندھا ہوا یعنی (بہت تنگ) کرلو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ﴾ (الاسراء: ۳۹)

''اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی معبود نہ بنانا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَجَعَلُوا الۡمَلٰٓئِکَۃَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عِبٰدُ الرَّحۡمٰنِ اِنَاثًا﴾ (الزخرف: ۱۹)

''اور انھوں نے فرشتوں کو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں (خدا کی) بیٹیاں مقرر کیا۔''

اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ یہی حال اس آیت مبارکہ کا بھی ہے:

﴿اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (3)﴾[الزخرف]

''بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنایا، تاکہ تم سمجھو۔''

معتزلہ کی تیسری دلیل: ان کا یہ استدلال بھی اسی خرابی کا شکار ہے کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿نُوۡدِیَ مِنۡ شَاطِیَٴ الۡوَادِ الۡاَیۡمَنِ فِی الۡبُقۡعَۃِ الۡمُبٰرَکَۃِ مِنَ الشَّجَرَۃِ﴾ (القصص: ۳۰)

''تو پھر وادی کے دائیں کنارے سے ایک مبارک جگہ میں ایک درخت میں سے آواز دی گئی۔''

اس آیت میں ہے؛ اللہ تعالیٰ نے کلام کو درخت میں پیدا فرمایا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخت سے کلام کو سنا؛ مگر اس آیت کے سیاق وسباق سے اندھے بن گئے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی تو یوں ہے:

﴿فَلَمَّاۤ اَتٰىہَا نُوۡدِیَ مِنۡ شَاطِیَٴ الۡوَادِ الۡاَیۡمَنِ﴾(القصص: ۳۰)

''جب وہاں پہنچے تو وادی کے دائیں کنارے سے آواز دی گئی۔''

نداء کا معنی ہے: دور سے آواز دینا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وادی کے کنارے سے آواز سنی؛ پھر فرمایا: ﴿فِی الۡبُقۡعَۃِ الۡمُبٰرَکَۃِ من الشجرۃ﴾ ''آواز درخت کے قریب مبارک جگہ سے آرہی تھی''۔ یعنی یہ آواز درخت کے پاس ایک مبارک جگہ سے آرہی تھی۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں:"سمعت کلام زید من البیت""میں نے گھر سے زید کا کلام سنا''۔ تو اس مثال میں گھر متکلم نہیں ہے آواز کا آغاز گھر سے ہورہا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اگر کلام کو درخت میں مخلوق مانا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ درخت کہہ رہا ہے:''﴿یا موسیٰ إننی أنا اللہ رب العالمین﴾ ''اے موسیٰ بے شک میں اللہ رب العالمین ہوں'' کیا یہ کلمہ اللہ رب العالمین کے علاوہ کسی دوسرے نے کہا ہے کہ میں رب العالمین ہوں؟۔ اگر اس قسم کا کلمہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی جانب سے سنا گیا ہے تو وہ فرعون ہے جس نے کہا تھا:﴿اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی﴾(النازعات: ۲۴)''میں تمھارا اعلیٰ رب ہوں۔'' پھر تو فرعون سچا ٹھہرا۔

دونوں کلام معتزلہ کے ہاں مخلوق ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے غیر نے کہا ہے؛ لیکن ایک کلام کو اللہ تعالیٰ نے درخت میں پیدا فرمایا؛ اور دوسرے کلام کو فرعون میں پیدا کیا۔ پس اس طرح دین میں تحریف اور تبدیلی کے مرتکب ہوئے اور یہ اعتقاد قائم کرلیا کہ خالق غیر اللہ

تعالیٰ ہے۔اس پر تفصیلی کلام مسئلہ ''افعال العباد'' میں آئے گا۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔

معتزلہ کی چوتھی دلیل: اگر یہ کہا جائے کہ بے شک ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝﴾ (الحاقة: ٤٠)

''وہ عزت والے رسول کا قول ہے۔''

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ قرآن پاک رسول کی تخلیق ہے؛ خواہ اس کو حضرت محمد ﷺ نے بنایا ہو یا جبریل علیہ السلام نے بنایا ہو۔

جواب: ......آیت میں رسول کا ذکر ''ال'' معرفہ کے ساتھ بطور مبلغ کے ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے پہنچانے والا۔ یہ نہیں کیا گیا کہ کسی نبی یا فرشتے کا قول ہے۔تو معلوم ہوا کہ رسول نے صرف وہ پیغام پہنچایا ہے جس کے ساتھ اسے مبعوث کیا گیا تھا۔ایسا نہیں کہ اس نے اپنی طرف سے اس کو بنایا ہو۔رسول کا لفظ دو آیتوں میں ہے۔ایک آیت میں مراد حضرت محمد ﷺ ہیں اور دوسری میں مراد حضرت جبریل امین علیہ السلام ہیں۔اوران دونوں میں سے کسی ایک کی طرف اس کی اضافت ظاہر کرتی ہے کہ یہ اضافت صرف تبلیغ کے لیے ہے۔پس اگر ہم تسلیم کریں کہ ان میں سے ایک نے اس کو پیدا کیا ہے؛ تو پھر دوسرے سے اس کی تخلیق ممنوع ٹھہری۔ نیز رسول امین کا جملہ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ جس کلام کی تبلیغ پر وہ مامور ہے؛ وہ اس میں کمی بیشی نہیں کر رہا؛ وہ امانت دار ہے؛ وہ اس کو مرسل کی جانب سے پہنچا رہا ہے۔مزید برآں جس نے قرآن پاک کو بشر کا کلام کہا؛ اللہ تعالیٰ نے اس کو کافر کہا ہے۔محمد ﷺ تو بشر ہیں۔پس جس نے یہ کہا کہ: ''یہ محمد ﷺ کا بنایا ہوا کلام ہے؛ وہ کافر ہے''۔اس میں کچھ فرق نہیں کہ آپ اس کو انسان، جن یا فرشتے کا کلام کہیں ظاہر ہے کہ کلام کی نسبت تو اس طرف ہوتی ہے جس نے ابتداء میں کلام کیا ہو۔جس نے کلام کو آگے پہنچایا؛ یا کسی کہنے والے سے سنا؛ اس کی جانب کلام کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔مثلاً آپ کسی انسان سے امرؤالقیس کا شعر سنتے ہیں:

قفا نبك من ذكرىٰ حبيب ومنزل

''ٹھہرو ہمیں محبوب اور اس کی منزل کا ذکر کر کے رونے دو۔''

تو جس سے آپ نے شعر سنا یہ اس کا کلام نہیں ہے کلام بہرحال امرؤالقیس کا ہے۔اسی طرح جس نے سنا ہو:

((إِنَّمَا الاَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امرِئٍ مَّانَوىٰ .))

''اعمال نیات کے ساتھ ہیں اور ہر آدمی کے لیے وہ ہے جو اس نے نیت کی۔''

تو وہ یہی کہے گا کہ یہ رسول اکرم ﷺ کا کلام ہے۔ایسے ہی جب کوئی سنے گا کہ کوئی پڑھ رہا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ • اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ • مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ • اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنَ؛ تو بیشک وہ یہی کہے گا: ''یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے؛ اس کا کلام نہیں جس سے آپ یہ جملے سن رہے ہیں''۔اگر اس کو پہلے پتہ ہوگا؛ وگرنہ وہ یہی کہے گا: ''پتہ نہیں یہ کس کا کلام ہے''؛ اور اگر کوئی اس کا انکار کرے گا تو یہ اس کو جھٹلائے گا۔کیونکہ جب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے کوئی عمدہ شعر یا نثر یا کلام سنتا ہے تو وہ اس سے دریافت کرتا ہے یہ کس کا شعر ہے یہ کس کا کلام ہے۔آپ کا ہے یا کسی اور کا ہے؟۔

قرآن پاک کے متعلق اہل سنت والجماعت کا اجماع:

خلاصہ کلام! اہل سنت کے مذاہب اربعہ اور دیگر اس عقیدہ کے حاملین متقدین اور متاخرین اس پر متفق ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام اور غیر مخلوق ہے۔ لیکن بعد میں متاخرین میں اختلاف ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ایک ہی معنی ہے جو قائم بالذات ہے یا حروف اور اصوات کا نام ہے؛ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ متکلم ہوا ہے؟ جبکہ وہ پہلے متکلم نہ تھا؛ یا وہ ہمیشہ سے متکلم رہا؛ جب اس نے چاہا اور جس وقت چاہا اور جیسے چاہا کلام کیا۔ اور نوع کلام قدیم ہے۔ بعض معتزلہ قرآن پاک کو غیر مخلوق اس معنی میں کہتے ہیں کہ وہ کلام جھوٹا نہیں؛ اس کا افتراء نہیں کیا گیا بلکہ وہ سچا کلام ہے؛ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس لحاظ سے یہ معنی کوئی شخص نہیں لیتا۔ اور تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ قرآن پاک جھوٹا کلام نہیں ہے۔

اہل قبلہ کے مابین اختلاف تو اس مسئلہ میں ہے کیا قرآن مخلوق ہے؛ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے؟ یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے؛ جو اللہ تعالیٰ نے [بول کر] کلام کیا ہے؛ اور اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے؟۔ بیشک یہ سوال اہل سنت سے کیا گیا ہے؛ وگرنہ اس کے جھوٹ اور افتراء پردازی کے عقیدہ کے باطل ہونے پر مسلمانوں کا کوئی اختلاف نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معتزلہ کے مشائخ اور اہل بدعت اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ توحید اور صفات اور قدر میں ان کے جو عقائد ہیں؛ وہ انہوں نے کتاب وسنت سے یا ائمہ صحابہ اور تابعین سے حاصل نہیں کئے؛ بلکہ ان کا خیال ہے کہ عقل ان پر دلالت کرتی ہے۔ اگر چہ بظاہر یہی کہتے ہیں کہ ہم یہ تمام مسائل ائمہ شریعت سے اخذ کرتے ہیں۔

درحقیقت اگر لوگوں کو فطرت سلیمہ اور عقول مستقیمہ پر آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان کے مابین کوئی جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔ لیکن شیطان نے بعض لوگوں کو اپنے مغالطوں میں سے مغالطہ میں ڈال دیا؛ جس سے ان میں افتراق پیدا کر دیا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍo﴾ (البقرة: ۱۷۶)

''اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا؛ یقیناً وہ بہت دور کی بدبختی میں پڑے ہوئے ہیں''۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا کلام واضح دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم رہا ہے؛ جب چاہا اور جس طرح چاہا وہ متکلم ہوا۔ اور اس کا کلام قدیم النوع ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول:

فقہ اکبر میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے؛ آپ فرماتے ہیں:

((......اَلْقُرْآنُ فِي الْمَصَاحِفِ مَكْتُوبٌ وَ فِي الْقُلُوبِ مَحْفُوظٌ وَعَلَى الْأَلْسَنِ مَقْرُوْءٌ وَعَلَى النَّبِي ﷺ مُنَزَّلٌ وَلَفْظُنَا بِالْقُرْآنِ مَخْلُوقٌ وَالْقُرْآنُ غَيْرُ مَخْلُوقٍ وَمَا ذَكَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِي الْقُرْآنِ عَنْ مُوسٰى عليه السلام وَغَيْرِهِ وَعَنْ فِرْعَوْنَ وَاِبْلِيْسَ فَإِنَّ ذٰلِكَ كَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰى أَخْبَارًا مِّنْهُمْ وَكَلَامُ مُوسٰى وَغَيْرِهِ مِنَ الْمَخْلُوقِيْنَ مَخْلُوقٌ وَ الْقُرْآنُ كَلَامُ اللّٰهِ تَعَالٰى لَا كَلَامُهُمْ وَسَمِعَ مُوسٰى عليه السلام كَلَامَ اللّٰهِ تَعَالٰى فَلَمَّا كَلَّمَ مُوسٰى كَلَّمَ بِكَلَامِهِ الَّذِي هُوَ مِنْ صِفَاتِهِ لَمْ يَزَلْ؛

وَصِفَاتُهُ كُلُّهَا خلافَ صِفَاتِ الْمَخْلُوْقِيْنَ يَعْلَمُ لاَ كَعِلْمِنَا وَيَقْدِرُ لاَ كَقُدْرَتِنَا وَيَرَى لاَ كَرَوَّيَتِنَا وَيَتَكَلَّمُ لاَ كَكَلاَمِنَا . انتهى))۔

''قرآن پاک مصاحف میں لکھا ہوا ہے دلوں میں محفوظ ہے اور زبانوں پر پڑھا جاتا ہے جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا ہمارے الفاظ قرآن مخلوق ہیں جب کہ قرآن غیر مخلوق ہے اور قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء کے واقعات نیز فرعون اور ابلیس کے واقعات یہ سب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے واقعات سے میں خبر دی ہے جب کہ حضرت موسیٰ اور دیگر پیغمبروں کا اپنا کلام مخلوق ہے اور قرآن پاک تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے ان کا کلام نہیں اور موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا جب اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ کے ساتھ ہم کلام ہوئے۔تو اللہ تعالیٰ نے اس سے جو کلام کیا وہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے جو ہمیشہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی تمام صفات مخلوق کی صفات کے خلاف ہیں اللہ تعالیٰ کا علم ہمارے علم جیسا نہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہماری قدرت جیسی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی رؤیت ہماری رؤیت جیسی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہمارے کلام جیسا نہیں ہے۔''

خیال رہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کا وصف تھا۔یعنی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہم کلام ہوئے۔یوں نہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ کلام بھی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اللہ تعالیٰ کہتا رہے گا: اے موسیٰ اے موسیٰ۔......؛ جیسا کہ بادی النظر میں اس آیت سے سمجھ میں آ رہا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَ كَلَّمَهٗ رَبُّهٗ﴾ (الاعراف: ۱۴۳)

''اور جب موسیٰ ہمارے طے شدہ وقت پر (کوہ طور) پر پہنچے اور ان کے رب نے ان سے کلام کیا۔''

اس آیت میں آپ کے اصحاب میں سے ان لوگوں کا بھی رد مقصود ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وصف کلام؛ اس کا ایک معنی ہے؛ وہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔اس کو سننے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔لیکن اللہ تعالیٰ فضا میں آواز پیدا فرما لیتا ہے جیسا کہ ابو منصور ماتریدی اور دیگر حضرات کا قول ہے۔

''مصنف رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ:''وہ ہمیشہ سے اس کی صفات میں سے ہے'' اس میں ان لوگوں پر رد ہے جو کہتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ پہلے سے متکلم نہیں تھے؛ بعد میں متکلم ہوئے''۔

خلاصہء کلام! معتزلہ جس چیز سے بھی حجت پیش کرتے ہیں؛ وہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام اس کی مشیئت اور قدرت کے ساتھ متعلق ہے وہ جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے اور وہ شیئاً بعد شیءٍ کلام کرتا ہے''۔یہ بالکل صحیح اور درست ہے۔اور اس کو قبول کرنا واجب ہے۔نیز جن حضرات کا یہ کہنا کہ:''بیشک اللہ تعالیٰ کا کلام اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور کلام اس کا وصف ہے''۔ ظاہر ہے کہ صفت کا قیام موصوف کے بغیر نہیں ہو سکتا۔یہ بھی صحیح ہے اس کو ماننا اور اس کے مطابق عقیدہ رکھنا واجب ہے۔پس ہر دو گروہوں میں سے جس کے پاس بھی حق اور ثواب کی بات موجود ہو؛ اسے قبول کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ہاں ان کا وہ قول تسلیم نہ ہو گا جو عقل اور شرح کے خلاف ہو گا۔

لیکن معتزلہ جب کہتے ہیں کہ:''اس سے لازم آتا ہے کہ حوادث کا قیام اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو''۔تو ہم کہتے ہیں یہ قول مجمل ہے۔ نیز یہ کہ تم سے پہلے وہ کون سے ائمہ ہیں جنہوں نے ان معانی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ حوادث کے قیام کا انکار کیا ہے؟۔جب کہ

قرآن وسنت کی نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں۔ نیز ائمہ کے نصوص اور صریح عقل بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ پیغمبر جو لوگوں سے مخاطب ہوئے اور انھیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں بات کہی فلاں کی منادی کی؛ اور فلاں سرگوشی کی یا وہ فلاں بات کہتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں وہ لوگوں کو یہ نہیں سمجھا رہے ہوتے کہ کلام مخلوق اور اس کی ذات سے جدا ہے۔ بلکہ وہ یہ سمجھا رہے ہوتے ہیں کہ: ''بیشک اللہ تعالیٰ نے خود کلام کیا ہے؛ اور اس کا کلام اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے؛ کسی دوسرے کے ساتھ قائم نہیں۔ اور بیشک خود اللہ تعالیٰ نے الفاظ میں کلام کیا ہے؛ اور ان کو بولا ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعات افک میں وہ خود فرماتی ہیں:

''میرے دل میں میری شان اس سے بہت کم تھی کہ میرے بارے میں اللہ تعالیٰ کلام فرماتا اور وحی نازل فرماتا کہ اس کی تلاوت ہوتی''۔ [البخاری ۳۶۶۱؛ مسلم ۲۷۷۰]

اگر ان ساری باتوں سے مراد اس مفہوم کے خلاف ہوتی جو کچھ سمجھا گیا تھا؛ تو اس کا بیان واجب ہو جاتا۔ اس لیے کہ بیان میں ضرورت کے وقت سے تاخیر کرنا جائز نہیں۔

نیز لغت عرب میں اور میدان عقل میں کسی ایسے قائل اور متکلم کی معرفت نہیں ہو سکی جس کا قول اور کلام اس کے ساتھ قول اور کلام کا قیام نہ ہو۔ بلکہ اس کلام کا قیام کسی دوسرے کے ساتھ ہو۔ اگر چہ معتزلہ کا خیال یہ ہے کہ وہ اس تأویل سے اس لیے بھاگے ہیں تا کہ تشبیہ لازم نہ آئے؛ اور انہوں نے پھر کسی دوسری صفت کو بھی ثابت نہیں مانا۔ لیکن جب وہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا علم ہے مگر ہمارے علم جیسا نہیں؛ تو ہم کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ متکلم ہے لیکن اس کا تکلم ہمارے تکلم جیسا نہیں''۔ اسی طرح باقی تمام صفات سمجھ لیجیے۔ ہم پوچھتے ہیں کیا کسی قادر کا تصور ممکن ہے جس کے ساتھ قدرت قائم نہ ہو۔ یا کیا کسی حی [زندہ] کا تصور اس کے ساتھ حیات کے قیام بغیر ممکن ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذیل کے دعائیہ کلمات مروی ہیں؛ [الفاظ ملاحظہ فرمائیں:]

((اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ الَّتِی لَا یُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ)) ❶۔

''میں اللہ تعالیٰ کے ان مکمل کلمات کے ساتھ پناہ میں آتا ہوں، جن سے کوئی نیک اور بد آدمی تجاوز نہیں کر سکتا''۔

تو کیا کوئی عقلمند یہ کہہ سکتا ہے کہ: آپ نے مخلوق سے پناہ طلب کی ہے؟ ❷۔ یہ بھی اس مبارک دعا کی طرح ہے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَاَعُوْذُ بِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ)) ❸

''میں تیری رضا کے ساتھ تیری ناراضگی سے؛ اور تیرے عفو کے ساتھ تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں۔''

بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی فرماتے ہیں:

((اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدْرَتِهٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ .)) ❹

''میں اللہ تعالیٰ کی عزت اور قدرت کے ساتھ اس چیز کے شر سے پناہ پکڑتا ہوں جسے میں پاتا ہوں اور ڈرتا ہوں''۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے:

((وَاَعُوْذُ بِعَظْمَتِكَ اَنْ نُغْتَالَ مِنْ تَحْتِنَا۔)) ❺

❶ مسند احمد، حدیث صحیح ہے۔
❷ [ان تمام کلمات میں جن صفات کے ساتھ پناہ طلب کی گئی ہے ان کو مخلوق کہنا درست نہیں وہ سب غیر مخلوق ہیں اس لیے کہ مخلوق کے ساتھ پناہ طلب کرنا درست نہیں]
❸ ۔[احمد:1/ 391 صححه الباني] ❹۔[مسلم (۲۲۰۲) ابو داؤد (۳۸۹۱) ترمذی (۲۰۸۱)]۔
❺ [ابو داؤد (۵۰۷۳) مسند احمد ۲/ ۲۵ ابن ماجه (۳۸۷۱)]

''میں تیری عزت کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں کہ زمین کے نیچے سے ہلاکت میں ڈالے جائیں۔''

یہ تمام کلمات اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ یہ تفصیل اپنی جگہ پر موجود ہے؛ یہاں پر میرا مقصود اس کی طرف صرف اشارہ کرنا ہے۔

متاخرین حنفیہ کا قرآن پاک کے بارے میں نظریہ اور ان کا رد:

اکثر متاخرین حنفیہ کہتے ہیں: کلام بس ایک معنی ہے تعدد، تکثر؛ اجزاء بندی اور تبعیض بلحاظ حاصلِ دلالت کے ہے؛ بلحاظ مدلول کے نہیں۔ اور کلام کی عبارتیں مخلوق ہیں اور عبارتوں کو کلام اللہ تعالیٰ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اس پر دلالت کرتی ہیں اور ان کے ساتھ اس کی ادائیگی ہوتی ہے ان کو عربی میں پیش کرو تو قرآن ہے عبرانی میں ذکر کرو تو تورات ہے بس اختلاف عبارات میں ہے کلام میں نہیں مجازاً عبارات کو ہی کلام اللہ کہا گیا ہے۔

[جواب] :...... یہ انتہائی فاسد کلام ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ لا تقربوا الزنی کا وہی معنی ہو جو اقیموا الصلوٰۃ کا ہے۔ اور آیۃ الکرسی کا وہی معنی ہو جو آیت مداینہ کا ہے۔ اور سورۃ اخلاص کا وہی معنی ہے جو تبت یدا ابی لہب کا ہے۔ غور و فکر کرنے اس عقیدہ کی خرابی واضح ہو جاتی ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ یہ عقیدہ سلف صالحین کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تورات، انجیل، زبور اور قرآن فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں؛ اور کلام اللہ کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ وہ ہمیشہ سے کلام کرتا رہا اور ہمیشہ کلام کرتا رہے گا۔ وہ جو کچھ چاہے؛ جس طرح چاہے؛ اور جب چاہے؛ کلام کرے؛ اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًاO﴾ (الكهف: ۱۰۹)

''کہہ دو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے (لکھنے کے) لیے سیاہی ہو تو قبل اس کے کہ میرے رب کی باتیں تمام ہوں سمندر ختم ہو جائے اگرچہ ہم ویسا ہی اور اس کی مدد کو لائیں۔''

اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌO﴾ (لقمان: ۲۷)

''اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم ہوں اور سمندر سیاہی ہو اور اس کے بعد سات سمندر اور سیاہی ہو جائیں؛ تو اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہ ہوں بے شک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔''

پس اگر جو کچھ مصحف میں ہے اس کو کلام اللہ تعالیٰ سے عبارت مانا جائے؛ کلام اللہ تعالیٰ نہ کہا جائے؛ تو جنبی اور بے وضو انسان کا اس کو ہاتھ لگانا کیسے ممنوع ہوتا؟۔

اور اگر قاری جو کچھ پڑھتا ہے؛ وہ قرآن نہ ہوتا؛ تو جنبی اور بے وضوء انسان کے لیے اس کا پڑھنا کیسے ناجائز ہوتا؟ بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام دلوں میں محفوظ ہے زبانوں سے پڑھا جاتا ہے جو مصاحف میں لکھا ہوا ہے جیسا کہ فقہ اکبر کے حوالے سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول پہلے گزر چکا ہے۔ اور وہ ان تمام مواقع پر حقیقت ہے۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ: ''مصحف میں لکھا ہوا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے؛ تو اس سے صحیح اور حقیقی معنی سمجھ میں آتا ہے۔

اور ایسے ہی قرآن پاک کی کتابت کے بارے میں کہنا کہ فلاں کا خط ہے؛ درست ہے۔ کتابت سیاہی سے ہوئی ہے درست ہے۔ اس سے صحیح اور حقیقی معنی ہی سمجھ میں آتا ہے۔ جب یہ کہا جائے کہ مصحف میں سیاہی ہے؛ تو اس سے وہ ظرفیت سمجھ میں نہیں آتی جو ظرفیت یہ کہنے سے سمجھ میں آتی ہے: ''اس میں آسمان وزمین ہیں''۔ اور یوں کہنا کہ: اس میں حضرت محمد وعیسیٰ علیہما السلام ہیں درست ہے۔ اس طرح کا دیگر کلام؛ یہ دونوں معانی قائل کے اس قول کے معانی سے جدا ہیں کہ ''اس میں فلاں کاتب کی تحریر ہے'' اور یہ تینوں معانی اس سے جدا ہیں کہ: ''اس میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے''۔ اور جو کوئی ان معانی کے مابین فرق سے آگاہ نہیں ہوتا وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور راہ ہدایت پر نہیں آ سکتا۔ ایسے ہی قرأت پڑھنے والے کا فعل ہے؛ اور ''مقروٗ'' [پڑھا گیا] جو کہ رب تعالیٰ کا کلام ہے؛ کے مابین فرق کا معاملہ بھی ہے۔ جو کوئی اس سلسلہ میں فرق نہ سمجھے؛ وہ بھی گمراہ ہے؛

اس کی مزید وضاحت ایک مثال سے ہو رہی ہے مثلاً ایک کاغذ پر ذیل کا شعر لکھا ہوا ہے الا کل شیء ما خلا اللہ تعالیٰ باطل اور یہ شعر کسی معروف کاتب کا لکھا ہوا ہے تو جس شخص کو معلوم ہے کہ یہ شعر لبید کا ہے وہ یہ نہیں کہے گا کہ یہ فلاں کاتب کا ہے وہ اس کی نسبت لبید کی طرف کرے گا بالکل اسی طرح اگر چہ قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں لیکن قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے ہمارا کلام نہیں اگر چہ متکلم ہم ہیں۔

قرآن کن معانی میں استعمال ہوتا ہے؟

قرآن اصل میں مصدر ہے۔ کبھی اس کا ذکر کیا جاتا ہے؛ اور اس سے قراءت مراد لی جاتی ہے؛ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ (الاسراء: ۷۸)

''اور بوقت فجر تلاوت قرآن کرنا بے شک صبح (کے وقت) قرآن پڑھنے کو حاضر ہوا جاتا ہے۔''

اور حدیث شریف میں آتا ہے:

((زَيِّنُوا الْقُرآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ .)) (ابو داؤد)

''اپنی آوازوں کے ساتھ قراءت کو زینت عطا کرو۔'' [یہاں پر قرآن قراءت کے معنی میں ہے۔]

اور کبھی قرآن کا ذکر ہوتا ہے؛ اور اس سے مراد وہ ہوتا ہے جس کو پڑھا جا رہا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (النحل: ۹۸)

''اور جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے پناہ مانگ لیا کرو۔''

اور ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝﴾ (الاعراف : ٢٠٤)

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو تم توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی ہے:

((إِنَّ هَذَا الْقُرْاٰنَ أُنْزِلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ.)) (بخاری، مسلم)

''بیشک یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔''

ان کے علاوہ بھی متعدد آیات اور احادیث ان دونوں مذکورہ معانی پر دلالت کرتی ہیں۔ پس حقائق کا وجود عینی بھی ہوتا ہے اور ذہنی بھی، لفظی بھی ہوتا ہے اور رسمی بھی۔ پہلے ان اعیان کے وجود کو معلوم کیا جاتا ہے پھر ان کا ذکر کیا جاتا ہے پھر انھیں اِحاطۂ تحریر میں لایا جاتا ہے۔ تو معانی کو مصحف میں لکھنا چوتھا درجہ ہے۔ لیکن کلام اور اس کے مصحف میں لکھنے میں کچھ واسطہ نہیں؛ بلکہ وہ اَذہان یا زبان کے واسطہ کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے۔

قرآن پاک کے ﴿ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ ''ضرور پہلی کتابوں میں ہے'' میں ہونا اور ''رق منشور'' یعنی ''کشادہ اوراق میں'' ہونا؛ یا ''لوح محفوظ میں'' یا کتاب مکنون (پوشیدہ کتاب) میں ہونا؛ یہ انتہائی واضح ہے۔ ان کا مفہوم ایک ہی ہے لیکن قرآن پاک کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ﴿ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ ''ضرور پہلی کتابوں میں ہے'' اس سے مراد اس کے ذکر؛ اوصاف اور اس سے متعلق خبر کا موجود ہونا ہے۔ جیسا کہ حضرت محمد ﷺ کے اوصاف کا ذکر بھی پہلی کتابوں میں موجود ہے۔ اس لیے کہ قرآن پاک کو تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ پر نازل فرمایا ہے؛ آپ کے علاوہ کسی پر نازل نہیں فرمایا؛ اسی لیے یہاں پر'' زُبُـــر '' کا لفظ استعمال ہوا ہے؛ صحف یا 'رق'' کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ خیال رہے کہ زبر'' زبور'' کی جمع ہے؛ اس کا معنی لکھنا اور جمع کرنا ہے۔ یعنی اس کا ذکر پہلی سماوی کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔ تو فرمان الٰہی ہے:

﴿ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ ''ضرور پہلی کتابوں میں ہے'' یعنی پہلوں کی کتابوں میں تحریر شدہ ہے۔

پس خود اس لفظ اور اس کے مشتقات میں اس سے مراد معنی کی وضاحت پائی جاتی ہے۔ اور اس میں قرآن مجید کے بیان کا کمال ہے جو کہ ہر قسم کے التباس سے خالی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ﴾ (الاعراف: ١٥٧)

''وہ شخص جس کا (وصف) اپنے ہاں لکھا ہوا پاتے ہیں۔'' یعنی اس کا ذکر؛ یہ اس کلام کے برعکس ہے: ''رق منشور'' اور ''لوح محفوظ'' اور ''کتاب مکنون''۔ اس لیے کہ ظرف میں عامل یا تو افعال عامہ میں سے کوئی ہوگا؛ جیسے کون؛ استقرار؛ حصول؛ اور اس طرح کے دوسرے افعال۔ یا پھر اسے مقدر مانا جائیگا: جیسے مکتوب فی کتاب؛ أو فی رق۔

اور لفظ کتاب سے کبھی محل کتابت اور کبھی کلام مکتوب مراد لیا جاتا ہے۔ اور کتاب میں کلام لکھنا؛ اور ان چیزوں کو لکھنا جو خارج میں موجود ہیں ان دونوں میں فرق کرنا واجب ہے۔ اس لیے کہ جو چیزیں خارج میں موجود ہیں ان کے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا کتاب میں ذکر ہو۔ جب بھی انسان اس معانی پر تدبر کرے گا تو اس پر فرق واضح ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا کلام جو خارج میں حقیقتاً موجود ہے؛ یہ وہی کلام ہے جو اللہ تعالیٰ سے سنا گیا؛ پھر اس کی طرف سے پہنچانے والے سے اسے سنا جاتا ہے۔ جب سامع اس کو سنتا ہے تو اسے علم حاصل ہوتا ہے اور وہ اس کو حفظ کر لیتا ہے۔ پس اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ کا کلام مسموع، محفوظ معلوم ہے جب سامع اس کی قرأت کرتا ہے تو وہ تلاوت کردہ مقروء ہوا۔ اور جب تحریر میں آ گیا تو وہ مکتوب/منقش ہو گیا ان تمام صورتوں میں اللہ تعالیٰ کا کلام حقیقی ہے اس کی نفی کرنا درست نہیں جب کہ مجاز کی نفی کرنا درست ہوتی ہے۔ تو یہ کہنا بالکل جائز نہیں کہ مصحف میں اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں؛ اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ قاری نے اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں پڑھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبة : ٦)

''اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا طلب گار ہو تو اس کو پناہ دو حتی کہ وہ کلام اللہ تعالیٰ سن لے۔''

اس صورت میں یہ مشرک اللہ تعالیٰ سے اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں سنتا؛ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبلغ سے سنتا ہے۔ پس یہ آیت اس انسان کا عقیدہ فاسد ہونے پر دلالت کرتی ہے؛ جو کہتا ہے: ''سنی گئی چیز کلام اللہ تعالیٰ کی تعبیر ہے؛ بذات خود اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں''۔

حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبة : ٦)

''حتی کہ وہ کلام اللہ تعالیٰ سن لے۔''

یہ نہیں کہا: ﴿حَتّٰى يَسْمَعَ ما هو عبارة عن كَلٰمَ اللّٰهِ﴾۔ ''حتی کہ وہ ایسی چیز سن لے جو کلام اللہ سے عبارت ہو۔''

اصل یہ ہے کہ ہر لفظ کا حقیقی معنی مراد لیا جائے۔ اسی طرح جو شخص کہتا ہے کہ مصاحف میں لکھا ہوا کلام عبارۃ کلام اللہ یا حکایۃ کلام اللہ ہے؛ یا اس میں کلام اللہ نہیں؛ اس نے کتاب وسنت اور سلف امت کے مسلک کی مخالفت کی؛ اور اس کے لیے یہی گمراہی کافی ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کے قول میں ان لوگوں پر رد ہے جو کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا کلام ایک معنی ہے جس کا اس کی ذات سے سننے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور مسموع، منزل، مقروء، مکتوب اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں وہ تو عبارۃ عن کلام اللہ [یعنی کلام اللہ تعالیٰ کی تعبیر] ہے۔

تو امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے؛ اسی کی طرف سے شروع ہوا''۔ دیگر سلف صالحین رحمہم اللہ کا بھی یہی عقیدہ ہے؛ کہ یہ کلام اسی کی طرف سے شروع ہوا؛ اور اسی کی طرف لوٹے گا۔ ان حضرات نے کہا: ''اس کی طرف سے شروع ہوا''۔

یہ اس لیے کہا ہے کہ: جہمیہ اور معتزلہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے کلام کو ایک محل [جگہ] میں پیدا کیا؛ تو وہاں سے کا آغاز ہوا''۔ [اللہ تعالیٰ سے نہیں] جبکہ سلف امت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہے اس سے کلام کا آغاز ہے مخلوقات سے آغاز نہیں ارشاد ربانی ہے:

﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۝﴾ (الزمر : ١)

''اللہ تعالیٰ غالب حکمت والے کی طرف سے کتاب کو نازل کرنا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ﴾ (السجدة : ١٣)

''اور لیکن میرا قول حق ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ﴾ (النحل: ۱۰۲)

''فرمادیں: اس کوآپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ روح القدس نے اتارا ہے۔''

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''اللہ تعالیٰ کی طرف کلام کالوٹایا جائے گا'' اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سینوں اور مصاحف سے اٹھا لیا جائے گا تو سینوں اور مصاحف میں اللہ تعالیٰ کے کلام کا کچھ اثر باقی نہیں رہے گا۔ جیسا کہ متعدد آثار میں اس کا ذکر موجود ہے''۔[البیہقی ۴۰۴۹/صحیح]

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''بغیر کسی کیفیت کے'' یعنی اس قرآن کے ساتھ کلام کرنے کی کیفیت معلوم نہیں۔ آگے ''قولاً'' کہہ کر بتادیا کہ حقیقی قول کے ساتھ؛ نہ کہ مجازاً۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی فرشتے کے ذریعے اپنے رسول کی جانب وحی کی۔ یعنی فرشتے کی زبانی آپ پر نازل کیا؛ پس فرشتے حضرت جبریل علیہ السلام نے کلام کو اللہ تعالیٰ سے سنا اور حضرت جبریل علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا آپ نے لوگوں پر اس کو پڑھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾ (الاسراء: ۱۰۶)

''اور ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ آپ لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ کر سنائیں؛ اور ہم نے اس کو آہستہ آہستہ اتارا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُo عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَo بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍo﴾ (الشعراء)

''اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ آپ کے دل پر؛ تاکہ آپ نصیحت کرتے رہو فصیح عربی زبان میں۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے لیے علو کی صفت کا اثبات بھی ہے۔

[اعتراض] :......اس پر اعتراض وارد کیا جاتا ہے کہ قرآن پاک کے نازل کرنے کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ اس نے بارش نازل کی ہے یا لوہا نازل کیا ہے یا چوپائیوں کے آٹھ جوڑے نازل کئے ہیں۔

جواب :......قرآن پاک کے متعلق صراحت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿حٰمٓo تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِo﴾ (غافر: ۲،۱)

''کتاب قرآن کو اللہ تعالیٰ غالب علم والے کی طرف سے نازل کرتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِo﴾ (الزمر: ۱)

''کتاب قرآن کو اللہ تعالیٰ غالب حکمت والے کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِo﴾ (فصلت: ۲)

''رحم کرنے والے مہربان کی طرف سے نازل کرنا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ۝﴾ (حم السجدة : ٤٢)

''حکمت والے بزرگی والے کی طرف سے نازل کرنا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيْمٍ۝ أَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ۝﴾ (الدخان : ٣-٥)

''کہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا ہے ہم تو رستہ دکھانے والے ہیں اسی رات میں تمام حکمت کے کام کے فیصلے کیے جاتے ہیں (یعنی) ہمارے ہاں سے حکم ہو کر بے شک ہم ہی (پیغمبر کو) بھیجتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَأْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ أَهْدٰى مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝﴾ (القصص : ٤٩)

''تم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی کتاب لاؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو اگر تم سچے ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ۝﴾ (الانعام: ١١٤)

''اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی؛ وہ جانتے ہیں کہ وہ آپ کے رب کی طرف سے برحق نازل ہوئی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ﴾ (النحل : ١٠٢)

''کہہ دو کہ اس کو تیرے رب کی طرف سے روح القدس نے برحق اتارا ہے۔''

[معلوم ہوا قرآن پاک کا نزول اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا ہے] جبکہ بارش کا نزول آسمان کے ساتھ مقید ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿أَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا۝﴾ (الفرقان : ٤٨)

''ہم نے بادلوں سے پاک پانی اتارا۔''

آیت میں لفظ سماء کا معنی علو [یعنی بلندی] ہے۔ ایک دوسرے مقام پر ﴿مِنَ الْمُزْنِ﴾ ہے کہ اس نے بارش کو بادلوں سے نازل کیا۔ مزن بادلوں کو کہتے ہیں۔ پھر ایک اور مقام پر فرمایا کہ:

﴿وَّأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ﴾ (النبا14)

''اور ہم نے بدلیوں [ہواؤوں] سے پانی اتارا''۔

البتہ لوہے اور چوپائیوں کے بارے میں آیات مطلق ہیں۔ تو قرآن پاک کے انزال کو ان کے مشابہ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟۔ پس لوہا کانوں سے نکلتا ہے جو پہاڑوں میں ہوتی ہیں اور پہاڑ سطح زمین سے بلندی پر ہوتے ہیں عام طور پر مشہور ہے کہ لوہے کی کان جس قدر زیادہ بلند ہوگی اسی قدر لوہا اعلیٰ اور عمدہ ہوگا۔

اور چوپائیوں کا سلسلہ توالد وتناسل سے چلتا ہے۔ نر کا مادہ منویہ اس کی کمر سے خارج ہو کر مادہ کے رحم میں گرتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ''نزل و لم ینزل'' ''اتر گیا مگر انزال نہ ہوا''۔ پھر وہ جنین مادہ کے پیٹ سے باہر زمین پر آتا ہے؛ یہ تو معلوم شدہ ہے۔ وطی کے وقت نر مادہ پر بلند ہوتا ہے؛ اور نر کا پانی بلندی سے پستی کی جانب یعنی مادہ کے رحم میں پہنچتا ہے؛ مادہ [کا جب حمل پورا ہو جاتا ہے تو وہ] بچے کو بلندی سے پستی کی جانب پھینکتی ہے۔ پس اس بنیاد پر اس ارشاد باری تعالیٰ کی تفسیر میں دو احتمال ہیں:

﴿وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ﴾ (الزمر: ٦)

''اور اس نے تمھارے لیے چوپائیوں میں سے نازل کیا۔''

پہلا احتمال: یہاں پر ''مِنْ'' جنس کے بیان کے لیے ہے۔

دوسرا احتمال: ''مِنْ'' ابتدائے امر کے لیے ہے۔ اور یہی دو احتمال اس آیت کی تفسیر میں بھی ہیں:

﴿جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا﴾ (الشوری)

''اسی نے تمھارے لیے تمہاری ہی جنس کے جوڑے بنائے ہیں اور چار پایوں کے بھی جوڑے۔''

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''ایمانداروں نے اس کے حق ہونے کی تصدیق کی'' اس میں اس چیز کی طرف اشارہ مقصود ہے جو انہوں نے اس اعتبار سے تکلم اور نزول کا ذکر کیا ہے۔ یعنی یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا [اور ان کے بعد آنے والوں کا] سلف صالحین کا عقیدہ ہے۔ اور یہی حق اور سچ ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ......''ان کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام حقیقی ہے؛ وہ مخلوق نہیں؛ جیسے باقی مخلوق کا کلام ہے''۔

اس میں بھی معتزلہ اور دیگر فرقوں کا کھلم کھلا رد مقصود ہے۔ اور اس قول میں کہ: ''اللہ تعالیٰ کا کلام حقیقت میں ہے'' ان لوگوں کا رد ہے جو کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے کلام کا ایک ہی معنی ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے؛ لیکن وہ اس سے سنا نہیں جاتا''۔ یعنی ان کے ہاں وہ نفسانی کلام ہے۔ اس لیے کہ جس کے ساتھ نفسانی کلام کا قیام ہوا اور وہ اس کے ساتھ متکلم نہ ہو تو اس کلام کو حقیقی کلام نہیں کہا جا سکتا۔ وگرنہ ماننا پڑے گا کہ گونگا انسان بھی متکلم ہے اور ماننا پڑے گا کہ جو کچھ مصاحف میں ہے وہ قرآن نہ ہو؛ اور نہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو بلکہ کلام اللہ تعالیٰ کی تعبیر ہو؛ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا کلام نہ ہو۔ جیسا کہ جب ایک گونگا انسان کسی دوسرے شخص کی جانب اشارہ کرے جس سے مقصود سمجھ میں آئے تو وہ شخص معنی کی عبارت کو تحریر کرے پس اس صورت میں مکتوب معنی کی عبارت ہے یہ ایسی مثال ہے جو معتزلہ کے عقیدہ کے بارے میں انتہاء درجہ کی مطابقت رکھتی ہے۔ اگرچہ مثال کی مطابقت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کو کوئی شخص گونگا کہنے کے لیے تیار نہیں۔ البتہ ان کے ہاں اس کی وضاحت یوں ہے کہ فرشتے نے اللہ تعالیٰ سے وہ معنی سمجھا جو اس کے ساتھ قائم تھا۔ اور فرشتے نے اللہ تعالیٰ سے کسی آواز کو نہیں سنا اور نہ کسی حرف کو سنا ہے بس اس نے صرف ایک معنی کو سمجھا اس کو تعبیر کیا؛ پھر اس نے قرآن پاک کو ترتیب دیکر عربی زبان میں تالیف کو پیدا فرمایا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بعض اجسام میں جو فرشتے سے بہت پست درجہ والے ہیں اس قسم کی عبارت کو پیدا کیا ہے۔ جیسے ہوا میں۔

❁ جو شخص اللہ تعالیٰ کے کلام کو ایک معنی سمجھتا ہے ہم اس سے دریافت کریں گے کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمام معنی کو سنا یا بعض کو سنا۔ اگر وہ کہے: ''تمام کو سنا''۔ کیونکہ اس کے خیال میں حضرت موسی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا تمام کلام سن لیا تھا'' اس کے اس قول کا فساد ظاہر

ہے۔ اگر بعض کا کہے؛ تو دعویٰ ٹوٹ گیا کہ: ''وہ ایک معنی ہے''۔ اس لیے کہ اس نے خود اس کی تبعیض کا اقرار کر لیا۔ یہی حال ان تمام کا ہے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔ یا اس پر اپنے کلام کا کچھ حصہ نازل کیا''۔ [مجموع ۱۲/ ۱۳۰]

نیز جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً﴾ (البقرۃ: ۳۰)

''بیشک میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

نیز جب اللہ تعالیٰ نے [فرشتوں سے] کہا: ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ ''آدم کو سجدہ کرو'' تو یہ اللہ تعالیٰ کا تمام کلام ہے یا بعض کلام ہے؟ ۔ اگر کہے: ''تمام ہے؛ تو یہ مکابرہ ہے۔ اگر بعض کہے؛ تو اس نے تعدد کا اعتراف کر لیا۔

کلام اور قول سے کیا مراد ہے؟

لوگوں کے نزدیک عندالاطلاق کلام اور قول کے مسمیٰ میں چار قول ہیں:

پہلا قول :......کلام لفظ اور معنی دونوں کو شامل ہے جیسا کہ لفظ انسان جسم اور روح دونوں کو متناول ہوتا ہے یہ سلف امت کا قول ہے۔

دوسرا قول :......کلام سے مراد صرف لفظ ہے؛ اور معنی مسمی کا جزء نہیں بلکہ مسمی کا مدلول ہے یہ معتزلہ کی ایک جماعت اور کچھ دیگر لوگوں کا قول ہے۔

تیسرا قول :......کلام صرف معنی کا نام ہے؛ لفظ پر اس کا اطلاق مجازاً ہے۔ کیونکہ وہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ یہ قول ابن کلاب اور اس کے ہم خیال لوگوں کا ہے۔

چوتھا قول :......کلام لفظ اور معنی میں مشترک ہے یہ قول بعض متاخرین کلابیہ کا ہے۔ ان کا ایک اور قول بھی ہے جو ابوالحسن [260¾ 329ھ] سے مروی ہے؛ وہ کہتا ہے:

" کلام کا لفظ کلام اللہ تعالیٰ میں مجاز اور انسانوں کے کلام میں حقیقت ہے۔ اس لیے کہ انسانوں کے حروف ان کے ساتھ قائم ہیں؛ پس کلام کا قیام غیر متکلم کے ساتھ نہ ہوا۔ بخلاف اللہ تعالیٰ کے کلام کے؛ کیونکہ اس کے نزدیک اس کا قیام اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہیں؛ تو اس کو کلام اللہ تعالیٰ کہنا ممتنع ہوا''۔ کیونکہ اس کی تفصیل اپنی جگہ پر ہے۔ [الایمان ۱۳۷]

اور جو کوئی کہتا ہے: ''کلام ایک معنی ہے؛ اور اس پر اخطل کے فاسد شعر سے استدلال کرتا ہے؛ شعر ملاحظہ فرمائیں:

إِنَّ الْكَلَامَ لَفِي الْفُؤَادِ وَإِنَّمَا جُعِلَ اللِّسَانُ عَلَى الْفُؤَادِ دَلِيْلاً

''کلام کا تعلق تو دل کے ساتھ ہے۔ اور بیشک زبان تو دل پر صرف راہنمائی کا کام دیتی ہے۔''

یہ ایک فاسد استدلال ہے۔ اگر کوئی صحیحین کی حدیث سے استدلال کرے تو کہتے ہیں: یہ خبر واحد ہے؛ بھلے علماء اس خبر واحد کی تصدیق کرنے؛ اور اس کو قبول کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے پر متفق ہوں [1]۔

[1] ۔ صحیحین سے استدلال اور اس کی حدیث کو خبر واحد کہہ کر رد کر دینا ائمہ کے اتفاق اور اجماع کے منافی ہے بلکہ انکارِ حدیث کے مترادف ہے۔

تو اس شعر سے کیسے دلیل دی جا سکتی ہے؟ ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شعر موضوع ہے؛ جو کہ اخطل کی جانب منسوب ہے؛ اس کے

دیوان میں نہیں پایا جاتا۔ بعض لوگوں نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: ''إن البیان لفی الفؤاد ''اور یہ درستگی کے زیادہ قریب ہے۔ اس کو صحیح تسلیم کرنے کے باوجود بھی اس سے استدلال صحیح نہیں ہے۔

بیشک عیسائی بھی کلام کا معنی بیان کرنے میں گمراہ ہو گئے؛ انھوں نے سمجھ لیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہیں۔ اور لاہوت کا ناسوت کے ساتھ اتحاد ہو گیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی کوئی خصوصیت لوگوں میں آ گئی ہے۔ تو کیا ہم کلام کے معنی کے سلسلہ میں عیسائیوں کے قول سے استدلال کریں جو کلام کا معنی بیان کرنے میں راہِ حق سے بھٹک گئے ہیں۔ اور کلام کے اس معنی کو چھوڑ دیا جائے جو لغت عرب سے معلوم ہوتا ہے''۔ [الایمان ۱۱۳]

مزید برآں کہ یہ معنی بھی صحیح نہیں؛ اس سے لازم آتا ہے کہ ہم گونگے کو متکلم کہیں۔ جبکہ کلام کا قیام اس کے دل کے ساتھ ہے زبان سے نہ وہ بات کرتا ہے اور نہ اس سے کوئی بات سنی جاتی ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ پوری تفصیل کے ساتھ ہے۔ بے شک یہاں پر میں نے اس طرف صرف اشارہ کیا ہے۔

یہاں پر ایک عجیب معنی پایا جاتا ہے؛ کہ اس قول میں نصاریٰ کے عقیدہ کے ساتھ بڑی مضبوط مشابہت پائی جاتی ہے۔ جو لاہوت ناسوت کے [اتحاد کے] قائل ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اور مخلوق میں وحدت ہے۔ اور ان کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ کا کلام ایک معنی ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے؛ اس کا سننا ممکن نہیں اور جو ترتیب ہم کو سنائی دے رہی ہے؛ وہ مخلوق ہے''۔ پس قدیم معنی کو مخلوق ترتیب کے انداز سے بتانا بالکل اسی طرح ہے جس طرح لاہوت کو ناسوت کی شکل میں ظاہر کیا جائے کہ حضرت عیسیٰ اللہ تعالیٰ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کے وجود میں ظہور پذیر ہے۔ ذرا دیکھیں تو سہی یہ کتنی ہی عجیب تشبیہ ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ ان لوگوں کا رد کرتے ہیں جو کہتے ہیں: ''کلام سے مراد وہ معنی ہے جو ذات کے ساتھ قائم ہے''۔

پھر ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بیشک یہ ہماری نمازیں ہیں؛ ان میں لوگوں کے کلام میں سے کچھ بھی درست نہیں''۔

(مسلم ۱۰۸؛ عن معاویہ بن حکم؛ صحیح أبی داؤد ۸۶۲؛ إرواء الغلیل ۳۹۰)

نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بیشک اللہ تعالیٰ جیسے چاہتے ہیں احکام میں تجدید فرماتے ہیں؛ اب اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ تم نماز میں کلام نہ کیا کرو''۔

(نسائی ۱۱۹۳؛ أبو داؤد ۷۲٤؛ وغیرہ بسند حسن ؛صحیح أبو داؤد ۸۵۷)

علماء کرام رحمہم اللہ اس بات پر متفق ہیں کہ: ''جب نمازی عمداً بلا مصلحت نماز میں کلام کرتا ہے؛ تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے''۔ اور اس پر بھی ان تمام کا اتفاق ہے کہ: ''جو چیز دل کے ساتھ قائم ہو؛ جیسے بعض امور کی تصدیق؛ یا امور دنیویہ کی طلب؛ تو اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ البتہ نماز کلام کرنے سے باطل ہو جاتی ہے۔ تو تمام مسلمانوں کے اجماع کی روشنی میں معلوم ہوا کہ معنی کو کلام کہنا درست نہیں۔ نیز صحیحین میں ہے؛ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے نفسانی خیالات کو معاف کر دیا ہے جب تک وہ کلام نہ کریں یا عمل نہ کریں''۔

[بخاری ۲۵۲۸ ؛مسلم ۱۲۷ ؛ إرواء الغلیل ۲۰٦۲]

آپ اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دل کے خیالات کو معاف کر دیا ہے۔ جب تک کہ ان کے ساتھ کلام نہ کیا جائے۔ اس میں دل کے خیالات اور کلام میں فرق کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس وقت تک مؤاخذہ نہ ہوگا جب تک زبان پر کلام نہ لایا جائے۔ مراد یہ ہے کہ زبان سے بول نہ لیا جائے۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ تو معلوم ہوا کہ لغت عرب میں کلام کا یہی معنی مراد ہے اور شارع علیہ السلام نے ہم سے عربی زبان میں خطاب کیا ہے۔ نیز سنن میں ہے:

''حضرت معاذ رضی اللہ عنہ [۲۰ ق ھ-۱۸ھ] نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم جو زبان سے کہتے ہیں اس پر ہمارا مؤاخذہ ہو گا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگوں کو ناک کے بل جہنم میں گرایا جائے گا؛ مگر ان کی زبانوں کی کمائی کی وجہ سے''۔

رواه الترمذی وغیره وفی سنده انقطاع' ترمذی ۲۷٦۷؛ نسائی ۱۳۹٤؛ ابن ماجة ۳۹۷۳۔

تو واضح ہوا کہ کلام کا تعلق زبان کے ساتھ ہے؛ اور لفظ؛ قول، کلام نیز ان سے جو صیغ مشتق ہوتے ہیں: فعل ماضی؛ مضارع؛ امر ؛ اسم فاعل؛ کتاب وسنت اور کلام عرب میں ان کا تعین لفظاً اور معناً موجود ہے۔ لفظ کلام اور قول میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین، تابعین کرام رحمہم اللہ علیہم کے دور میں کچھ اختلاف نہ تھا''۔ [الایمان ۱۰۹]۔

یہ اختلاف متأخرین اہل بدعت علماء میں رونما ہوا پھر وسیع ہوتا چلا گیا۔

بلا شک کلام اور قول اور دیگر [اصطلاحات] کے مسمی کے بیان کے لیے کسی شاعر کا شعر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بے شک اس مسئلہ میں اہل زبان متقدمین اور متاخرین نے کلام کیا ہے؛ اور وہ اس کے معنی سے اسی طرح متعارف ہیں جس طرح وہ سر، ہاتھ، پاؤں کے مسمی سے متعارف ہیں''۔ [الإیمان ١١٤]

نیز اس میں بھی شک نہیں کہ جو کوئی یہ کہتا ہے: ''اللہ تعالیٰ کا کلام ایک ہی معنی ہے؛ جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے؛ اور نہ ہی متلو، محفوظ، مکتوب، مسموع کلام اللہ تعالیٰ سے حکایت ہے؛ جو کہ مخلوق ہے۔ تو یقیناً ایسا شخص قرآن پاک کو مخلوق کہتا ہے؛ مگر اس کا شعور نہیں رکھتا۔ بیشک ارشاد ربانی تو یہ ہے:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ﴾ (الاسراء: ۸۸)

''فرما دیجیے: اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے۔''

کیا اس آیت میں اشارہ اس معنی کی جانب ہے جو اللہ تعالیٰ کے نفس میں ہے؟ یا اس سے مراد متلو [تلاوت کردہ] مسموع [سنا گیا] ہے؟ ظاہر ہے کہ اشارہ متلو، مسموع کی طرف ہے؛ اس لیے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے نہ اس کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے نہ وہ اتارا گیا ہے نہ وہ مقروٴ ہے اور نہ ہی مسموع۔ اور یہ ارشاد ربانی کہ: ﴿لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ﴾ ''وہ اس کی مثال نہیں لا سکتے'' کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرمانا چاہتے ہیں: ((لا یا تون بمثل ما فی نفسی مما لم یسمعوه ولم یعرفوه)) ''جو چیز میرے نفس میں ہے؛ اس کی مثل نہیں لا سکتے؛ جس کو انہوں نے سنا ہی نہیں؛ اور اس کو وہ جانتے ہی نہیں''۔ اور جو چیز اللہ تعالیٰ کے نفس میں ہے اس تک رسائی کا کوئی حیلہ نہیں۔ اور نہ ہی اس کا علم حاصل ہوسکتا ہے۔

اگر وہ یہ کہیں کہ: ''مذکورہ آیت میں اشارہ اس چیز کی حکایت کی طرف ہے جو اللہ تعالیٰ کے نفس میں ہے اور وہ متلو، مکتوب، مسموع ہے''۔ پس جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف اشارہ کی بات ہے؛ تو پھر یہ درست نہیں۔ یہ تو کھلے الفاظ میں قرآن کو مخلوق کہنا ہے۔

بلکہ یہ لوگ تو اس مسئلہ میں معتزلہ سے بھی زیادہ کافر ہیں۔ اس لیے کہ کسی چیز کی حکایت اس کے مثل اور مشابہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہاں پر یہ واضح طور پر کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی حکایت بیان کی جاتی ہے۔ اگر تلاوت حکایت کا نام ہوتا تو سب لوگ اللہ تعالیٰ کے کلام کا مثل پیش کر سکتے تھے۔ تو پھر ان کے عاجز ہونے کا چیلنج کہاں گیا۔ اور ان کے خیال میں تلاوت کرنے والا ایسی آواز اور حروف کی حکایت کرتا ہے جو کہ [اصل میں] آواز اور حروف نہیں۔ حالانکہ قرآن پاک تو مرتب سورتوں اور تحریر شدہ آیات کے مجموعہ کا نام ہے جو پاکیزہ صحائف میں موجود ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيٰتٍ﴾ (ھود: ۱۳)

''تو اس جیسی دس سورتیں لاؤ جو جھوٹ موٹھ ہوں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ مَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ۝﴾ (العنکبوت: ۴۹)

''بلکہ یہ روشن آیتیں ان کے سینوں میں ہیں جو علم دیے گئے؛ اور ہماری آیات کا انکار صرف ظالم کرتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ۝﴾ (عبس: ۱۳،۱٤)

''قابل ادب ورقوں میں (لکھا ہوا) جو بلند مقام پر رکھے ہوئے (اور) پاک ہیں۔''

پس جو شخص قرآن کی تلاوت کرتا ہے اس کے لیے ہر حرف کے بدلہ میں دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''آگاہ رہو میں نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے لیکن الف ایک حرف لام دوسرا حرف اور میم تیسرا حرف ہے''[1]۔

[1] ترمذی ۳۰۸۷، ابن ماجہ سند صحیح ہے۔ آداب حملۃ القرآن أز آجری؛ صحیح سند کے ساتھ؛ دیکھو: ''المشکاۃ'' ۲۱۳۷۔

قرآن پاک حفاظ کے سینوں میں محفوظ ہے۔ تلاوت کرنے والوں کی زبانوں سے اسے سنا جاتا ہے۔

شیخ حافظ الدین النسفی رحمہ اللہ کا قول:

شیخ حافظ الدین النسفی رحمہ اللہ (م ۷۱۰ھ) ''المنار'' میں رقم طراز ہیں:

''قرآن پاک الفاظ معانی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے دیگر ماہرین اصول بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے کہ جو شخص نماز میں فارسی زبان میں قرآن پاک پڑھتا ہے اس کی نماز درست ہے''۔ امام صاحب نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

''عربی میں پڑھنے کی قدرت ہو تو دوسری زبان میں پڑھنا درست نہیں''۔

بلکہ ائمہ کا قول ہے نماز میں غیر عربی میں تلاوت کرنے والا اگر دیوانہ ہے تو اس کا علاج کیا جائے اگر زندیق ہے تو واجب القتل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے عربی میں کلام کیا ہے اور اس کا اعجاز بھی نظم اور معنی دونوں کے ساتھ مل کر حاصل ہوتا ہے''۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول ہے: ''جس شخص نے قرآن پاک سنا اور کہا کہ یہ تو انسان کا کلام ہے؛ تو وہ یقینی کافر ہے۔ ایسے شخص کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں جو قرآن مجید کے کلام اللہ تعالیٰ ہونے کا انکار کرتا ہو۔ اور اگر وہ اس [قرآن] کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ؛ یا کسی فرشتے یا بشر؛ یا کسی بھی مخلوق کا کلام کہتا ہے؛ تب بھی وہ کافر ہے۔ اسی طرح جو شخص قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام تو سمجھتا ہے لیکن تحریف اور تاویل کا دروازہ کھولتا ہے وہ بھی ان لوگوں کے زمرہ میں داخل ہے جو کہتے ہیں: ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴾۔ ''بیشک یہ قرآن تو انسان کا کلام ہے''۔ ان میں بھی کفر موجود ہے؛ کیونکہ یہ وہی لوگ ہیں جنہیں: ﴿ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ ﴾ ''بیشک ان کو شیطان نے راہ حق سے پھسلا دیا ہے''۔ اس پر تفصیلی کلام شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے اس کلام کی شرح میں آئے گا: ''لا نکفر أحداً بذنب......''۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول ہے: ''قرآن پاک انسانی کلام کے مشابہ نہیں ہے''۔

یعنی یہ کلام اشرف اور افصح اور أصدق یعنی نہایت سچا کلام ہے''۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ (النساء: ۸۷)

''اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون سچی بات والا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ﴾ (الاسراء: ۸۸)

''کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ.... ﴾ (هود: ۱۳)

''تو اس جیسی دس سورتیں لاؤ......۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ (یونس: ۳۸)

''کہہ دو کہ اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ۔''

وہ عرب کے فصیح بلیغ لوگ تھے؛ اور اسلام کے بہت بڑے دشمن تھے؛ مگر وہ اس سے عاجز آ گئے؛ اور اس کی مثل ایک سورت بھی نہ لا سکے؛ جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت نمایاں ہوئی کہ یہ قرآن پاک کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اور اس سے الفاظ و معانی ہر لحاظ سے قرآن پاک کا معجزہ ہونا ثابت ہوا؛ صرف ایک لحاظ سے نہیں۔ اور ہم یہ بھی کہتے ہیں: ''قرآن پاک واضح عربی زبان میں ہے اس میں کسی قسم کی کجی نہیں۔ پس کوئی کلام نہ صرف لفظ، بلکہ معنی کے لحاظ سے؛ بلکہ کلمات، حروف اور تکلم کے لحاظ سے بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ سورتوں کی ابتداء میں حروف مقطعات سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ یہ بھی ان کے کلام کا اسلوب اور ان کی لغت کا حصہ ہے؛ جس لغت میں وہ باہم گفتگو کرتے ہیں؛ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ حروف مقطعات کے بعد قرآن پاک کا ذکر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿الٓمّٓ o ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ o﴾ (البقرة: ۱،۲)

''الٓمّٓ o یہ کتاب اس میں کچھ بھی شک نہیں ہے۔''

﴿الٓمّٓ o اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ o نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ....﴾ (آل عمران: ۱۔۳)

''الم؛ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ زندہ ہمیشہ رہنے والا ہے اس نے آپ پر سچی کتاب نازل کی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الٓمّٓصٓ o كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ (الاعراف: ۱،۲)

''(الٓمّٓصٓ) کتاب آپ پر نازل کی گئی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ o﴾ (یونس: ۱،۲)

''الٓر یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔''

یہی حال دیگر آیات کا بھی ہے۔ یہ آیات پتہ دیتی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ ان کے پاس ایسی کتاب نہیں لائے جس کو تم پہچانتے نہیں؛ بلکہ تمہاری روزمرہ کی زبان میں تمہیں مخاطب کیا ہے۔

لیکن فاسدانہ نظریات کے حامل اس قسم کی باتیں کر کے قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کی؛ اور حضرت جبریل امین علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ سے سماع کی نفی کی راہ نکالتے ہیں جیسا کہ لیس کمثله شيء سے صفات کی نفی کی راہ نکالتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اس عقیدہ کا رد خود اس آیت میں موجود ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وهو السميع البصير﴾۔

[اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا اثبات موجود ہے]۔ اور جو حروف کی نفی کرتے ہیں ان کا رد ﴿فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ میں موجود ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سورت لانے کا کہا ہے؛ حرف یا کلمہ لانے کا نہیں کہا۔ سب سورتوں سے مختصر سورت تین آیات پر مشتمل ہے اسی لیے امام ابو یوسف [۱۱۳ھ-۱۸۲ھ] اور محمد [۱۳۱ھ-۱۸۹ھ] رحمہما اللہ کہتے ہیں: ''نماز میں کم از کم تین آیات چھوٹی یا ایک آیت لمبی سے اکتفاء ہوگا؛ اس سے کم میں اعجاز کا چیلنج ممکن نہیں''۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اللہ تعالیٰ کی تشبیہ دینے کا حکم:

۳۴۔:......وَمَنْ وَصَفَ اللّٰهَ بِمَعْنًى مِنْ مَعَانِي الْبَشَرِ ، فَقَدْ كَفَرَ .مَنْ أَبْصَرَ هٰذَا اعْتَبَرَ .وَعَنْ مِثْلِ قَوْلِ الْكُفَّارِ انْزَجَرَ .وَعَلِمَ أَنَّ اللّٰهَ بِصِفَاتِهِ لَيْسَ كَالْبَشَرِ.

''اور جس نے اللہ تعالیٰ کو بشری اوصاف میں سے کے ساتھ موصوف کیا وہ یقیناً کافر ہو گیا۔جس نے صفات کو بصیرت کی آنکھ کے ساتھ دیکھا؛ وہ قابل اعتبار ٹھہرا۔ اور کفار جیسی بات سے رک گیا؛ اور اس نے معلوم کر لیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اوصاف میں انسان کی مانند نہیں ہے''۔

تشریح: پہلے بیان ہو چکا ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا حقیقی کلام ہے اس کی طرف سے شروع ہوا ہے؛ اس کے بعد خبردار کیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ انسانوں کی مانند نہیں ہے گویا کہ مشابہت کی نفی کو صفات کے اثبات کے بعد لائے ہیں۔یعنی جب کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ صفتِ کلام کے ساتھ موصوف ہیں، متکلم ہیں۔لیکن یہ وصف کسی بھی لحاظ سے انسان کے وصف کلام کے مانند نہیں ہے؛ بے شک فرمان الٰہی ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوری: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے [1]۔''

[1] ۔جو کوئی اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے کسی چیز کے مشابہ کہتا ہے؛ وہ یقیناً کافر ہو گیا؛ اس لیے کہ وہ مذکورہ بالا آیات کی تکذیب کرتا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کوئی بھی چیز اس کی مانند نہیں؛ نہ ہی اس کی ذات میں نہ ہی صفات میں اور نہ ہی اس کے افعال میں۔امام نعیم بن حماد جو کہ امام بخاری اور یحی بن معین رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ ہیں؛ فرماتے ہیں: ''جس نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دی؛ وہ کافر ہو گیا۔اور جس نے ان اوصاف کا انکار کیا جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو موصوف کیا ہے؛ وہ بھی کافر ہو گیا۔یاد رکھو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے بیان کیا ہے؛ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیان کیا ہے؛ اس میں کوئی تشبیہ نہیں ہے''۔[شرح أصول اعتقاد اہل السنۃ ۳/ ۵۸۷؛ تاریخ دمشق ۶۲/ ۱۶۳؛ العلو ۲/ ۱۰۹۲]

عمدہ مثال : اللہ تعالیٰ کی صفات بلا تشبیہ اور بلا تعطیل ثابت کرنے والے وہ اس کی ایک نہایت عمدہ مثال بیان کرتے ہیں کہ: خالص دودھ ایسا مشروب ہے جس کا خوشگوار ہونا مسلّم ہے۔لیکن وہ گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے۔اس میں تعطیل کے گوبر اور تشبیہ کے خون کی آمیزش نہیں ہوتی۔اسی طرح اللہ تعالیٰ تعطیل اور تشبیہ سے پاک ہے۔جو لوگ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرتے ہیں وہ معدوم کی عبادت کرتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو تشبیہ دیتے ہیں وہ کسی بت کی عبادت کرتے ہیں۔آئندہ اوراق میں شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں اس کا ذکر آ رہا ہے کہ جو شخص نفی اور تشبیہ سے کنارہ کش نہ رہا وہ راہ حق سے بھٹک گیا اور اللہ تعالیٰ کو منزہ قرار دینے میں اس نے راہ صواب کو نہ پا سکا۔ایسے ہی شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول: ''وهـو بين التشبيه و التعطيل '''' وہ تعطیل اور تشبیہ کے درمیان ہے'' سے مراد دین اسلام ہے۔اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کرنا تو اللہ تعالیٰ کو تشبیہ دینے سے بھی بدتر ہے اس کا ذکر

آئندہ اوراق میں بھی کروں گا۔ان شاءاللہ تعالیٰ۔

جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی صفات کا ذکر کیا ہے؛ یا پھر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی ہیں تو اس سے تشبیہ کا پہلو نہیں نکلتا۔ بلکہ خالق کی صفات ویسے ہی ہیں جیسے اس کے شایان شان ہیں؛ اور مخلوق کی صفات اس طرح ہیں جس طرح ان کے ساتھ لائق ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ کا قول: "فمن ابصر هذا اعتبر ." ''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں بصیرت سے کام لیا وہ عبرت پا گیا'' [1]۔

یعنی صفات کو ثابت مانا؛ تشبیہ کی نفی کی اور اس کی وعید سے عبرت حاصل کی اور کفار جیسی باتیں کہنے سے رک گیا؛ اسے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں کسی کے ساتھ مشابہ نہیں ہے۔

[1]۔ یعنی جس نے اپنی عقل و بصیرت سے کام لیکر اس سے عبرت حاصل کی؛ اور مکذبین کے حال سے بچ کر رہا؛ اور باطل عقائد سے اجتناب برتا؛ جیسا کہ معتزلہ؛ جہمیہ اور دیگر فرقوں کے باطل عقائد ہیں۔قرآن اللہ تعالیٰ کا حقیقی کلام ہے؛ اللہ تعالیٰ جب چاہیں اور جیسے چاہیں کلام کر سکتے ہیں۔اور جس کو اللہ تعالیٰ چاہیں اپنا کلام بلا واسطہ بھی سنا سکتے ہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سنایا تھا۔اللہ تعالیٰ نے ان سے سرگوشی کی اور ان کو آواز بھی پکارا۔جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿وَ نَادَیْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَیْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِیًّا﴾ (مریم ۵۲) ''اور ہم نے اسے پہاڑ کی دائیں جانب سے آواز دی اور سرگوشی کرتے ہوئے اسے قریب کر لیا''۔

لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ مخلوق بھی آواز دیتی ہے؛ سرگوشی کرتی ہے؛ کلام کرتی ہے؛ مگر ہم کہتے ہیں: کلام اور کلام میں فرق ہے؛ سرگوشی اور سرگوشی میں فرق ہے۔جس طرح اللہ تعالیٰ کی زندگی مخلوق کی زندگی جیسی نہیں؛ اس کا علم مخلوق کے علم جیسا نہیں؛ ایسے باقی تمام صفات میں بھی اللہ تعالیٰ کسی بھی لحاظ سے کسی بھی مخلوق کی کسی صفت کے مشابہ نہیں؛ اور نہ ہی مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے کسی وصف کی مشابہت ہے۔

قاعدہ یہ ہے: ''جو عقیدہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں ہے؛ ویسا ہی عقیدہ اس کی صفات کے بارے میں بھی ہونا چاہیے''۔

جنت میں دیدار الٰہی اور عقیدہ اہل سنت:

۳۵۔((......وَالرُّؤْيَةُ حَقٌّ لِأَهْلِ الْجَنَّةِ، بِغَيْرِ إِحَاطَةٍ وَلَا كَيْفِيَّةٍ، كَمَا نَطَقَ بِهِ كِتَابُ رَبِّنَا: ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ۝ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ (القیامہ: ۲۲،۲۳) وَتَفْسِيرُهُ عَلَى مَا أَرَادَ اللّٰهُ تَعَالَى وَعَلِمَهُ، وَكُلُّ مَا جَاءَ فِي ذَلِكَ مِنَ الْحَدِيثِ الصَّحِيحِ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَهُوَ كَمَا قَالَ، وَمَعْنَاهُ عَلَى مَا أَرَادَ، لَا نَدْخُلُ فِي ذَلِكَ مُتَأَوِّلِينَ بِآرَائِنَا وَلَا مُتَوَهِّمِينَ بِأَهْوَائِنَا، فَإِنَّهُ مَا سَلِمَ فِي دِينِهِ إِلَّا مَنْ سَلَّمَ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَلِرَسُولِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. وَرَدَّ عِلْمَ مَا اشْتَبَهَ عَلَيْهِ إِلَى عَالِمِهِ.))

''اہل جنت کو بغیر کسی کیفیت اور احاطہ کے دیدار الٰہی ہونا برحق ہے؛ جیسا کہ کتاب اللہ خود کہتی ہے:

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ۝ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ (القیامہ: ۲۲،۲۳)

''اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے (اور) اپنے رب کے محو دیدار ہوں گے۔''

اس کی تفسیر وہی ہے: اللہ تعالیٰ نے جس کا ارادہ کیا؛ اور جیسے وہ جانتا ہے۔ اس بارے میں جس قدر صحیح احادیث رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں ہم انھیں ویسے ہی درست مانتے ہیں جیسے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ ان کا وہی معنی صحیح ہے جس کا آپ ﷺ نے ارادہ کیا ہے۔ ہم اس میں اپنی رائے پر مبنی تأویل کی بنا پر دخل اندازی کو جائز نہیں سمجھتے۔ اور نہ ہی اپنی خواہشات کے مطابق کسی وہم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بے شک اسی شخص کا دین سلامتی سے ہم کنار ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے؛ اور مشتبہ چیزوں کے علم کو ان کے جاننے والوں کی جانب رد کرتا ہے''۔ [حادی ارواح]

تَشْرِیح: رؤیت کے بارے میں اس عقیدہ کے مخالف جہمیہ، معتزلہ، خوارج، امامیہ ہیں۔ کتاب و سنت کے دلائل کی روشنی میں ان کا عقیدہ باطل اور مردود ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین، تابعین عظام رحمہم اللہ، اور معروف أئمہ اسلام؛ جن کی امامت دین میں تسلیم شدہ ہے؛ محدثین، متکلمین؛ اہل کلام کے دیگر فرقے؛ اور جو فرقے اہل سنت والجماعت کی طرف منسوب ہیں؛ وہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے اثبات کے قائل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا مسئلہ اصول دین کے اشرف اور جلیل القدر مسائل سے ہے۔ اس مسئلہ کی معرفت کے لیے اہل علم نے عرق ریزی سے کام لیا ہے اور خداداد صلاحیتوں کو صرف کیا ہے۔ اور اس کی معرفت سے وہی لوگ محروم رہے جو اپنے رب کی رؤیت سے روکے جائیں گے؛ اور بارگاہ باری تعالیٰ میں باریابی سے دھتکار دیا جائے گا؛ وہ اس کے منکر ہی رہے''۔ [حادی الارواح ۱۹۶]

امام طحاوی رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں جو دلائل پیش کیے ہیں؛ ان میں سے یہ فرمان باری بھی ہے:

﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ۝ إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾ (القیامہ: ۲۲،۲۳)

''بہت سے چہرے رونق دار ہوں گے اور اپنے رب کے محو دیدار ہوں گے۔''

یہ دلیل تمام دلائل سے زیادہ روشن اور واضح ہیں لیکن انکار کرنے والے نصوص کی تاویل کے نام پر ان میں تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اہل تأویل کے لیے حشر ونشر، جنت وجہنم، حساب وغیرہ کے مسائل میں تاویلات کرنا اس مسئلہ میں اس تاویل کی بہ نسبت آسان ہے [جس کا ارتکاب مسئلہ رؤیت میں ہو رہا ہے]۔ باطل پرست ان نصوص میں تاویل بلکہ تحریف کر کے انہیں اپنے مقام سے بدلنا چاہتے ہیں۔ اور وہ اس کی طرف راہ نصوص میں تأویل کے ذریعہ سے پاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ان کی دنیا وآخرت کو برباد کر ڈالا۔ یہود ونصاریٰ کی گمراہی کی وجہ بھی یہی تھی کہ انھوں نے تورات، انجیل کی نصوص میں تحریفات کیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے سے خبردار کیا ہے۔

لیکن باطل پرست لوگ ان کے نقش قدم پر چلتے رہے؛ اور دین اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان فاسد تاویلات کی وجہ سے کتنے ہی بڑے جرائم کے مرتکب ہوتے رہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سانحہ فاسدانہ تاویلات کا نتیجہ نہ تھا؟ اور کیا جنگ جمل [۳۶ھ]، جنگ صفین [۳۷ھ]، جنگ حرہ [۶۳ھ] اور حضرت حسین کی شہادت [۶۱ھ] جیسے سنگین واقعات کا ظہور بھی تاویلات کا فاسدہ کا رہین منت نہیں؟ اور کیا خوارج کا خروج اور معتزلہ کا اعتزال اور روافض کا رفض اور گمراہ فرقوں کا وجود؛ اور امت مسلمہ کا تہتر فرقوں میں بٹ جانا ان ہی باطل/ فاسد تأویلات کا کرشمہ نہیں ہے؟

مندرجہ بالا آیت میں لفظ نظر کی نسبت چہرہ کی جانب ہے جو نظر پڑنے کی جگہ ہوتی ہے۔ پھر وہ لفظ ''الیٰ'' کے ساتھ متعدی ہے جس کا واضح تقاضا اس آنکھ کی نظر کا مراد ہونا ہے۔ [یہاں پر] لفظ کا کسی ایسے قرینہ سے خالی ہونا جو اس کی حقیقت اور موضوع کے خلاف پر دلالت کرتا ہو؛ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ بے شک اس سے اللہ تعالیٰ کی مراد چہرہ والی آنکھ کی نظر ہے جو اللہ تعالیٰ پر پڑے گی۔

لفظ نظر کے استعمالات:

لفظ نظر کے کئی استعمالات ہیں جو کہ اس کے موصول اور بذات خود متعدی ہونے کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر یہ لفظ بنفسہٖ متعدی ہو تو اس کے معنی توقف اور انتظار کے ہوتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ (الحدید: ۱۳)

''ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمھارے نور سے روشنی حاصل کریں۔''

اگر حرف ''فی'' کے ساتھ متعدی ہو تو اس کا معنی تفکر اور اعتبار کا ہوتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَوَ لَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الاعراف: ۱۸۵)

''کیا انھوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں غور وفکر نہیں کیا۔''

اگر حرف ''الیٰ'' کے ساتھ متعدی ہو تو اس سے مراد آنکھوں کے ساتھ معائنہ ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ﴾ (الانعام: ۹۹)

''جب پھلتی ہیں تو ان کے پھلوں پر نگاہ ڈالو۔''

جب لفظ نظر چہرہ کی جانب (جو نظر کا محل ہے) مضاف ہو تو پھر بالا ولیٰ اس کا معنی معائنہ ہی ہے۔ چنانچہ ابن مردویہ [۳۲۳ھ-۴۱۰ھ] نے مسند میں اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ تعالیٰ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ناضرۃ'' کا معنی ہے کہ: ''چہرے حسن و جمال کے ساتھ تر و تازہ، اور رونق ہوں گے۔ ناظرہ کا معنی ہے: ''ان کی نظریں اللہ تعالیٰ کے چہرہ پر ہوں گی''۔ ❶

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ فرماتے ہیں:

''نگاہ نے جب اپنے رب کا مشاہدہ کیا تو اس کے نور سے چہرہ تر و تازہ ہو گیا''۔

حضرت ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

﴿اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (القیامہ ۲۳) ''اور اپنے رب کے دیدار میں محو ہوں گے۔''

''ناظرہ کا معنی اللہ تعالیٰ کے چہرے کی جانب دیکھ رہے ہوں گے''۔

حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ [۲۵ھ-۱۰۵ھ] بیان کرتے ہیں لفظ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ۝﴾ کا معنی ہے کہ چہرے نعمتوں کی وجہ سے بارونق ہوں گے۔ ﴿اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۝﴾ ''اور ناظرہ کا معنی اپنے رب کی جانب آنکھوں سے دیکھنے والے ہوں گے''۔ پھر آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایسی حکایت نقل کی ہے؛ اور تمام محدثین کرام رحمہم اللہ اور اہل سنت مفسرین کا بھی یہی قول اور عقیدہ ہے۔ نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿لَهُمْ مَا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ۝﴾ (ق : ۳۵)

''وہاں وہ جو چاہیں گے ان کے لیے حاضر ہے اور ہمارے ہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔''

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ (۱۰ ق ھ-۹۳ھ) نے اس سے اللہ تعالیٰ کے چہرے کی جانب دیکھنا مراد لیا ہے''۔ نیز ارشادِ ربانی ہے:

❶ یہ روایت بہت ضعیف ہے اس کی سند میں ثویر بن ابی فاختہ کذاب ہے؛ امام ثوری نے اسے کذاب کہا ہے۔ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''التقریب'' میں اسے دوٹوک الفاظ میں ضعیف کہا ہے۔

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ﴾ (یونس : ۲۶)

''ان لوگوں کے لیے جنھوں نے نیک عمل کیے جنت بھی ہے اور اس سے زیادہ بھی۔''

اس آیت کریمہ میں حسنٰی کا معنی ''جنت'' ہے اور ''زیادۃ'' کا معنی اللہ تعالیٰ کے چہرے کی جانب دیکھنا ہے۔ یہ تفسیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ صحیح مسلم [۱۸۱] میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ﴾۔

''ان لوگوں کے لیے جنھوں نے نیک عمل کیے جنت بھی ہے اور اس سے زیادہ بھی۔'' اور پھر فرمایا:

''جب جنت والے جنت میں اور جہنم والے جہنم میں داخل ہو جائیں گے تو آواز دینے والا آواز دے گا۔ اے جنت والو! اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھارے ساتھ وعدہ ہے اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرنا چاہتا ہے''۔ وہ دریافت کریں گے وہ کون سا وعدہ ہے؟ کیا اس

نے ہمارے اعمال کو وزنی نہیں کر دیا؟ اور ہمارے چہروں کو روشن نہیں کیا؟ کیا اس نے ہمیں جنت میں داخلہ نہیں دیا؟ کیا اس نے ہمیں جہنم سے نہیں بچایا؟ اس پر پردہ درمیان سے اٹھ جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے تو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کو دے رکھا ہوگا ان سب سے زیادہ محبوب نعمت ان کے ہاں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا یہی لفظ زیادہ کی تشریح ہے''[1]۔

نیز یہ حدیث متعدد اسانید اور مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہے جس میں الزیادۃ کا معنی اللہ تعالیٰ کے چہرہ کی جانب دیکھنا ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے نقل کی ہے؛ ان میں: حضرت ابوبکر صدیق، حذیفہ، ابوموسیٰ اشعری اور ابن عباس رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

اور ارشاد ربانی ہے:

﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾ (المطففين: ١٥)

''ہرگز نہیں بیشک یہ لوگ اس روز اپنے رب (کے دیدار) سے اوٹ میں ہوں گے۔''

اس آیت سے امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نے اہل جنت کے رب تعالیٰ کا دیدار کرنے پر استدلال کیا ہے[2]۔

امام طبری رحمہ اللہ نے اور دیگر حضرات نے امام مزنی رحمہما اللہ (۱۷۵-۲۶۴ھ) سے نقل کیا ہے؛ وہ امام شافعی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں؛ امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہم سے اصم نے حدیث بیان کی؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے ربیع بن سلیمان نے بیان کیا؛ وہ کہتے ہیں: ''امام شافعی رحمہ اللہ کے پاس ایک خاتون صعید (مصر کے ایک گاؤں) سے حاضر ہوئی؛ اس کے پاس ایک رقعہ تھا۔ اس میں تحریر تھا: آپ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر میں کیا کہتے ہیں: ﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ﴾ ''ہرگز نہیں بیشک یہ لوگ اس روز اپنے رب (کے دیدار) سے اوٹ میں ہوں گے۔'' تو امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا:

[1] ۔ ترمذی ۲۶۸۹، ابن ماجہ ۱۸۷؛ وأحمد ۴/۳۳۲؛ حدیث صحیح ہے۔ الظلال الجنة (٤٧٢)

[2] ۔ کہ جب وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوں گے وہ دیدار الٰہی سے محروم کیے جائیں گے تو اہل جنت جن پر اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے انھیں اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے اہل جنت کے لیے دیدار الٰہی ثابت کیا ہے۔

''چونکہ ان لوگوں کو ناراضگی کی وجہ سے اوٹ میں کر دیا جائے گا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے اولیاء رضامندی کی حالت میں اس کا دیدار کریں گے''۔

معتزلہ کا استدلال اور اس پر رد:

عدم رؤیت باری تعالیٰ پر معتزلہ اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں: ﴿لَنْ تَرَانِي﴾ ''تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے''۔ سے استدلال کرتے ہیں۔ نیز ان کی دلیل یہ آیت کریمہ بھی ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ (الانعام: ١٠٣)

''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں''۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں آیات ان کے خلاف دلیل ہیں۔

جہاں تک پہلی آیت کا تعلق ہے تو: یہ کئی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی رؤیت پر دلالت کرتی ہیں؛ ان دلائل میں سے:

اولاً :......حضرت موسیٰ علیہ السلام جو اللہ تعالیٰ کے رسول اور کلیم اللہ تعالیٰ کے لقب کے ساتھ معروف ہیں؛ اور اپنے وقت میں اپنے رب کے بارے میں سب سے بڑے عالم تھے؛ ان کے بارے میں یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے اللہ تعالیٰ سے ایسا سوال کریں جو کہ جائز نہ ہو؛ بلکہ یہ ان کے نزدیک سب سے بڑی محال بات ہے۔

ثانیاً :......پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال پر انکار نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنے بیٹے کے بارے میں اس کی نجات کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کا رد فرمایا۔ اور فرمایا:

﴿ اِنِّیۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ﴾ (هود ۴۶)

''بے شک میں تجھے اس سے نصیحت کرتا ہوں کہ تو جاہلوں میں سے ہو جائے''۔

ثالثاً:......جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ﴿ لَنۡ تَرٰىنِىۡ ﴾ ''تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے''۔ یہ نہیں فرمایا کہ: ''مجھے دیکھا نہیں جا سکتا؛ یا میرا دیدار جائز نہیں؛ یا میں مرئی [دیکھے جانے کی چیز] نہیں ہوں۔ ان دونوں جوابات میں فرق واضح ہے۔ ایک مثال سے فرق سمجھیں ایک شخص کی بغل میں پتھر ہے دوسرا آدمی یہ سمجھ کر کہ اس کی بغل میں کھانا ہے اس سے سوال کرتا ہے مجھے کھانا دیجیے اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ جو کچھ میں نے بغل میں دبایا ہوا ہے وہ کھایا نہیں جا سکتا۔ لیکن اگر بغل میں کھانا ہو؛ تو صحیح جواب یہ ہے کہ آپ اسے نہیں کھا سکتے۔ تو اس سے معلوم ہوا اللہ تعالیٰ مرئی ہے؛ لیکن اس دنیا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قویٰ میں اتنی قوت نہیں تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتے۔ اس لیے کہ دنیا میں بشری اعضاء میں اتنی قوت نہیں پائی جاتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کر سکیں۔ اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ اس قول سے ہوتی ہے:

رابعاً :......﴿وَ لٰكِنِ انۡظُرۡ اِلَى الۡجَبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِىۡ﴾ (الاعراف : ۱۴۳) ''ہاں پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ قائم رہا تو تم مجھ کو دیکھ سکو گے۔'' یعنی حضرت موسیٰ کو باور کرایا کہ اللہ تعالیٰ کی تجلی کے سامنے پہاڑ جس میں اس قدر قدرت اور صلابت [سختی] موجود ہے؛ اس دار دنیا میں اللہ تعالیٰ کی تجلی کے سامنے برقرار نہیں رہ سکتا؛ تو انسان اللہ تعالیٰ کی تجلی سے کیسے ہمکنار ہو سکتا ہے جو کہ فطرتاً کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

خامساً :......اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ وہ پہاڑ کو استقرار عطا کرے؛ یہ ممکن بھی ہے۔ رؤیت کے جواز کو اس پر معلق کیا تھا۔ اگر رؤیت محال ہوتی تو پھر یوں کہا جاتا اگر پہاڑ برقرار رہا (جو کہ محال ہے) تو میں کھاؤں گا پیئوں گا سوؤں گا (یعنی یہ محال ثابت ہوتا۔) یہ تمام امور ان کے نزدیک برابر ہیں۔

سادساً :......ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا﴾ (الاعراف : ۱۴۳)

''جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔''

معلوم ہوا پہاڑ جو جمادات میں سے ہے جسے جزا سزا کے ساتھ کچھ تعلق نہیں جب اس پر تجلی کا ہونا جائز ہے تو پیغمبروں اور اولیاء اللہ تعالیٰ کو کرامت کے گھر جنت میں دیدار کیوں نہیں ہو سکتا؟۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم کرایا کہ جب اس دنیا میں پہاڑ جیسی قوی چیز تجلی کو برداشت نہیں کر سکی تو انسان جو کمزور ہے [وہ کیسے تجلی کو برداشت کر سکتا ہے؟۔]

سابعاً :......اللہ تعالیٰ کا بغیر کسی واسطہ کے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرنا آواز دینا سرگوشی کرنا ثابت ہے اور جس سے تکلم اور کلام ثابت ہوتا ہے۔تو رؤیت کے جواز سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔اور رؤیت کا انکار اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک پہلے کلام کا انکار نہ کیا جائے؛اس لیے انہوں نے ان دونوں چیزوں کو جمع کر دیا؛اس لیے دونوں درست ہیں۔

ان کا یہ دعویٰ کرنا کہ:''لن''نفی کی تابید کے لیے آتا ہے۔؛اور یہ جملہ آخرت میں دیدار کی نفی کرتا ہے﴿لن ترانی﴾۔ یہ بالکل باطل/اور فاسد ہے۔اس لیے کہ اگر اس جملہ میں لفظ ابداً بھی ساتھ ملا دیا گیا ہوتا؛تب بھی نفی کا دوام ثابت نہ ہوتا۔لیکن جملہ مطلق ہے اسے ایک مثال سے سمجھیں۔ارشاد ربانی ہے:﴿وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا﴾(البقرة : ۹۵) ''اور وہ اس[موت] کی ہرگز آرزو نہ کریں گے۔'' حالانکہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی مذکور ہے:

﴿وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ﴾ (الزخرف : ۷۷)

''اور پکاریں گے کہ اے مالک!چاہیے کہ تمھارا رب ہمیں موت دے دے۔''

[کہتے ہیں]اس لیے کہ اگر ابدیت مطلق طور پر ہو تو اس کے بعد فعل کی تحدید کا جواز نہیں رہتا۔حالانکہ تحدید[قرآن کریم میں] موجود ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ﴾ (یوسف : ۸۰)

''جب تک والد صاحب مجھے حکم نہ دیں میں تو اس جگہ سے ہلنے کا نہیں۔''

پس ثابت ہوا کہ لفظ لن نفی مؤبدہ کا تقاضا نہیں کرتا؛شیخ ابن مالک نحوی بھی اسی کے قائل ہیں ان کا شعر ملاحظہ ہو:

وَمَنْ رَأَى النَّفْىَ بِ(لَنْ) مُؤَبَّدَا فَقَوْلُهٗ أُرْدُدْ وَ سِوَاهُ فَاعْضُدَا

جو شخص حرف''لن''کے ساتھ نفی میں ابدیت کا قائل ہے اس کا قول رد کر دو؛اور اس کے غیر کے قول کو تقویت دو''۔

دوسری آیت سے استدلال:

[﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾]اسی آیت سے ایک خوبصورت اور لطیف وجہ کی بنا پر رؤیت پر استدلال کرتے ہیں۔تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر مدح کے سیاق میں کیا ہے ظاہر ہے کہ مدح مثبت صفات کی بنا پر ہوتی ہے۔جبکہ عدم محض میں کچھ کمال نہیں؛نہ اس سے مدح کو ثابت کیا جاتا ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ کی مدح نفی کی شکل میں اسی وقت درست ہے جب وہ کسی امر وجودی کو متضمن ہو۔جیسا کہ اونگھ،اور نیند کی نفی میں اللہ تعالیٰ کی کمال قیومیت موجود ہے اور موت کی نفی میں کمال حیات موجود ہے۔تھکاوٹ اور سستی کی نفی میں کمال قدرت موجود ہے۔شریک،بیوی،اولاد مددگار وغیرہ کی نفی میں کمال ربوبیت الوہیت اور غلبہ موجود ہے کھانے پینے کی نفی میں کمال بے نیازی اور استغنا موجود ہے شفاعت کی نفی میں کمال وحدانیت اور غناء موجود ہے۔ظلم کی نفی میں کمال عدل،علم،غنا[بے نیازی]موجود ہے نسیان اور کسی چیز کے ذہن سے اوجھل ہونے کی نفی میں کمال علم،اور احاطہ موجود ہے۔مثلیت کی نفی میں اس کی ذات اور صفات کا کمال موجود ہے؛اسی لیے اللہ تعالیٰ کی مدح کبھی محض عدم سے ثابت نہیں جس کے ضمن میں مثبت صفت موجود نہ ہو۔اس لیے کہ معدوم اپنے عدم موصوف کے ساتھ شریک ہے:اور کامل کا ایسا وصف نہیں بیان کیا جا سکتا جس میں وہ اور معدوم مشترک ہوں۔پس

آیت کا معنی یوں ہوا کہ وہ دیکھا جا سکتا ہے لیکن اس کا ادراک اور احاطہ نہیں ہوسکتا اس لیے کہ وہ کمال عظمت والا ہے اور ہر چیز سے بڑا ہے؛ اس کا ادراک اور احاطہ نہیں ہوسکتا۔ اور فرمان الٰہی: [﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی کمال عظمت اور ہر چیز سے بڑا ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور بے شک یہ کہ اس کی کمال عظمت کی وجہ سے اس کا ایسا ادراک نہیں ہوسکتا کہ اس کا احاطہ ہو جائے۔ بے شک ادراک بمعنی احاطہ کا معنی رؤیت سے ایک زائد چیز ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلَمَّا تَرَاءَى الْجَمْعَانِ قَالَ أَصْحَابُ مُوسَىٰ إِنَّا لَمُدْرَكُونَ ○ قَالَ كَلَّا....﴾ (الشعراء: ٦١، ٦٢)

''جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو موسیٰ کے ساتھی کہنے لگے کہ ہم تو پکڑے گئے؛ تو فرمایا: ''ہرگز نہیں۔''

دیکھیے درج بالا آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رؤیت کی نفی نہیں کی ادراک کی نفی کی ہے معلوم ہوا ادراک اور رؤیت دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بھی پائے جاتے ہیں؛ اور ایک دوسرے کے بغیر بھی پائے جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے اس کا ادراک نہیں ہوسکتا اس کا علم حاصل ہوتا ہے لیکن احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ائمہ اس آیت سے یہی معنی سمجھے۔ جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں ائمہ کرام رحمہم اللہ کے اقوال ذکر کر دیے ہیں۔ بلکہ یہ سورج جو کہ مخلوق ہے دیکھنے والا اس کے ادراک اور ماہیت کے احاطہ پر قادر نہیں؛ [تو اللہ تعالیٰ کے ادراک پر کیسے قادر ہوسکتا ہے؟]۔

رؤیت کے اثبات میں احادیث:

رؤیت کے مسئلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے احادیث تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔ یہ احادیث مبارکہ صحاح، سنن مسانید اور دیگر تمام کتب میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

''چند لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا قیامت کے دن ہم اپنے رب کا دیدار کریں گے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا چودھویں رات کے چاند دیکھنے میں تمھیں کچھ تکلیف ہوتی ہے؟

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''نہیں؛ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!'' ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا سورج کے دیکھنے میں تمھیں کچھ تکلیف ہوتی ہے جب کہ بادل نہ ہوں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''نہیں اے اللہ کے رسول! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسی طرح اللہ تعالیٰ کو دیکھو گے۔'' [1]

نیز حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی حدیث مروی ہے۔ [مسلم ۱۸۳؛ بخاری ۷۴۳۹۔]

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ [م ۵۴ھ] بیان کرتے ہیں:

''ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے؛ آپ نے چودھویں رات کے چاند کی جانب دیکھ کر فرمایا: ''تم اپنے رب کو ایسے صاف دیکھو گے جیسا کہ تم چاند کو دیکھ رہے ہو اس کے دیکھنے میں تمھیں تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' [2]

اسی مضمون کی حدیث حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح مسلم [ح:۱۸۱] میں ہے۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا:

''دو [جنت میں] باغ چاندی کے ہیں ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے چاندی کا ہے۔ اور دو [جنتیں] باغ سونے کے ہیں؛

ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے سونے کا ہے۔ جنت عدن میں اہل جنت اور ان کے رب کو دیکھنے میں تکبر کی چادر حائل ہوگی جو اس کے چہرے پر ہوگی۔'' ❸

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''تم میں سے ہر ایک ضرور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا؛ جس دن وہ اس سے ملے گا؛ ان کے درمیان میں نہ پردہ حائل ہوگا نہ ہی ترجمان ہوگا؛ جو اس کا ترجمہ کرے۔ اللہ تعالیٰ دریافت کریں گے: ''کیا میں نے تمھاری جانب رسول نہیں بھیجے جنھوں نے تمھارے پاس میرے احکامات پہنچائے؟ ۔ وہ اثبات میں جواب دیں گے؛ اور کہیں گے: ضرور اے رب! بھیجا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ دریافت کریں گے: ''کیا میں نے تمھیں مال و دولت اور اپنے فضل سے نہیں نوازا؟'' وہ جواب میں کہیں گے: '' ضرور نوازا تھا''۔ ❹

❶ متفق علیه: الظلال الجنة (٤٥٣ـ٤٧٥)مسلم ١٨٢؛ بخاري ٧٤٣٧ـ
❷ متفق علیه: الظلال الجنة (٤٤٦ـ٤٥١ـ٤٦١). مسلم ٦٣٣؛ بخاري ٥٥٤ـ
❸ متفق علیه: الاحادیث الضعیفه (٣٤٦٥). مسلم ١٨٠؛ بخاري ٤٨٧٨ـ
❹ بخاري، کتاب المناقب. ٣٥٩٥ـ

احادیث رؤیت تقریباً تیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ جس نے ان کی معرفت کا احاطہ کرلیا؛ وہ دوٹوک یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین ہیں۔ اگر میں نے اختصار کا التزام نہ کیا ہوتا تو تمام احادیث کو ذکر کرتا۔[حادی الارواح ۲۰۵]

اور جو کوئی ان سے آگاہ ہونا چاہے تو اسے چاہیے کہ مسلسل احادیث نبویہ سنتا رہے؛ اور ان احادیث میں دیدار الٰہی کے اثبات کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس سے چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے۔ وہ قیامت کے دن لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے کے لیے آئے گا۔ وہ عالم کے اوپر ہے۔ اور وہ ان کو ایسی آواز دے گا جو دور سے بھی اسی طرح سنائی دے گی جس طرح نزدیک سے سنائی دیتی ہے''۔[ذکره البخاری معلقاً ٧٤٨١؛ وفی الأدب المفرد ٩٧٠]

وہ بندوں پر تجلی فرمائے گا۔ وہ ان کے سامنے ہنسے گا۔ ان کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں؛ [جن کا جہمیہ انکار کرتے ہیں]۔ اور ان آیات کا سننا جہمیہ پر بجلی گرنے کے مترادف ہے۔

اصول دین کا علم کتاب وسنت کے بغیر کیسے ہوسکتا ہے؟ اور کتاب اللہ تعالیٰ کی ایسی تفسیر کیسے درست ہوسکتی جو تفسیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہ ہو؟۔ جن کی زبان میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''جس شخص نے قرآن پاک میں اپنی رائے کو داخل کیا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے''۔ ❶

ایک روایت میں ہے: ''جس شخص نے قرآن پاک کی تفسیر بغیر علم کے کی وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''۔ ❷

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا﴾ (عبس: ٣١) کے متعلق دریافت کیا گیا کہ ''اَبًّا'' سے کیا مراد ہے؟۔ تو آپ نے جواب دیا:

''مجھے بھلا کون سا آسمان اپنے تلے جگہ دے گا یا مجھے کون سی زمین اوپر اور جگہ دے گی جب میں اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ایسی

بات کا اضافہ کروں جس کا مجھے علم نہیں"۔

اللہ تعالیٰ کے دیدار کو سورج اور چاند کے دیدار کے ساتھ تشبیہ دینے سے اللہ تعالیٰ کی تشبیہ دینا لازم نہیں آتا۔ بلکہ یہ رؤیت کی رؤیت کے ساتھ تشبیہ ہے۔ مرئی [دیکھے جانے والے] کی تشبیہ مرئی کے ساتھ نہیں۔ البتہ اس میں اللہ تعالیٰ کے مخلوق پر بلند اور عالی ہونے کی دلیل موجود ہے۔ وگرنہ رؤیت کا تعقل بلا مقابلہ کیسے ہوسکتا ہے؟۔ جو کوئی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھا جاسکتا ہے لیکن وہ کسی جہت میں نہیں۔ اسے اپنی عقل پر ماتم کرنا چاہیے؛ یا تو یہ شخص عقل سے مکابرہ [تکبر وانکار] کرتا ہے؛ یا پھر اس کی عقل میں خلل ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی کہتا ہے: اسے دیکھا جاسکتا ہے؛ لیکن نہ وہ سامنے ہے نہ پیچھے ہے نہ دائیں نہ بائیں؛ اور نہ ہی اوپر ہے نہ نیچے۔ تو فطرت سلیمہ کی روشنی میں ہر شخص اس کی بات کو رد کر دے گا۔ اسی لیے معتزلہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے صفت علو [بلند ہونے] کی نفی کرتے ہوئے اس کی رؤیت کی بھی نفی کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: "رؤیت کا تعقل بلا مقابلہ اور بغیر جہت کے کیسے ہوسکتا ہے؟۔ لیکن ہم اہل سنت کہتے ہیں کہ: "اس دنیا میں تو ہم اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے؛ اس کی وجہ ہماری نظروں کی عاجزی ہے نہ کہ رؤیت کا امتناع۔ غور فرمائیں سورج کی جانب دیکھنے والا انسان جب شعاعوں کو غور سے دیکھتا ہے تو اس کی نظر چندھیا جاتی ہے۔ [اور سورج کو دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے]۔ اس لیے نہیں کہ مرئی کا دیکھنا ممتنع ہے؛ بلکہ وجہ دیکھنے والے کا عاجز آجانا ہے۔ لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ انسانوں کی قوتوں میں اضافہ فرمائیں گے تو ان میں دیکھنے کی قوت پیدا ہو جائے گی یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلی کی۔ تو [یہ ہوا کہ]:

﴿ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الاعراف: ۱۴۳)

❶ ترمذی (۳۱۳۵)، حدیث ضعیف هے۔ تخریج المشکاة (۲۳۴).

❷ ابو داؤد (۳۶۵۲)، ترمذی (۳۱۳۶) وعن جندب (۳۱۳۴)۔ حدیث ضعیف ہے۔

"اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے جب ہوش میں آئے تو کہنے لگے کہ تیری ذات پاک ہے اور میں تیرے حضور میں توبہ کرتا ہوں اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے اول ہوں۔"

اس لیے کہ کوئی جاندار تجھے نہیں دیکھ سکتا وہ دیکھتے ہی مر جائے گا۔ اور بے جان پر جب تجلی ہو گی تو وہ اپنا مقام چھوڑ دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان تو فرشتوں کو ان کی شکل میں دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتے ہاں جن کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہو جائے؛ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قوت حاصل تھی؛ تو آپ ﷺ نے حضرت جبرائیل کو اصل شکل میں دیکھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَ لَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ﴾ (الانعام: ۸)

"اور کہتے ہیں اس پر فرشتہ کیوں نازل نہ ہوا؛ اگر ہم فرشتہ نازل کرتے تو کام تمام ہو جاتا۔"

سلف صالحین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ: "انسان فرشتوں کو ان کی اصلی شکل میں نہیں دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اگر ہم ان پر کسی فرشتہ کو نازل کرتے تو اسے بھی ہم انسانی شکل میں بھیجتے تو پھر یہ اشتباہ میں پڑ جاتے۔ کیا یہ انسان ہے یا فرشتہ ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ہم میں ہم سے ہی رسول بھیجا۔

پس معتزلہ نے یہ الزام اس لیے اپنے موافقین پر لازم نہیں کیا؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نہ عالم کے داخل میں ہے اور نہ ہی اس کے خارج میں۔ لیکن جو لوگ کہتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ موجود ہے دیکھا جاسکتا ہے لیکن وہ کسی جہت میں نہیں"۔

ان کا یہ قول ان لوگوں کے قول کی نسبت اقرب الی العقل ہے جو کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ موجود ہے؛ وہ اپنی ذات کے ساتھ قائم ہے؛ لیکن نہ اسے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ وہ کسی جہت میں ہے''۔

پس جو شخص رؤیت کی نفی کی بنیاد اس کے لازم یعنی جہت کی نفی پر استوار کرتا ہے؛ ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ: ''جہت سے آپ کی مراد امر وجودی ہے یا عدمی؟۔ اگر وہ کہے وجودی ہے تو ثابت ہوا جو چیز موجود نہیں؛ اسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ مقدمہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اثبات پر کوئی دلیل نہیں۔ بلکہ یہ تو بالکل باطل ہے۔ دیکھئے اس عالم کی سطح کو دیکھنا ممکن ہے اور یہ عالم دوسرے عالم میں نہیں۔ اگر جہت سے مراد امر عدمی ہے تو دوسرا مقدمہ ممنوع ہے ہم تسلیم نہیں کرتے ہیں کہ وہ اس اعتبار کے ساتھ کسی جہت میں نہیں۔

کتاب وسنت کی اہمیت:

وہ انسان اصول دین میں کیسے کلام کر سکتا ہے جس نے کتاب وسنت سے رہنمائی حاصل ہی نہ کی ہو؛ بلکہ وہ لوگوں کے اقوال کو بنیاد بناتا ہو۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ وہ کتاب اللہ تعالیٰ سے رہنمائی لے رہا ہے؛ اور وہ کتاب اللہ تعالیٰ کی تفسیر کا علم صحیح احادیث سے نہیں لیتا؛ نہ ان میں غور وفکر کرتا ہے؛ اور نہ ہی صحابہ اور تابعین رحمہم اللہ کے اقوال کی ضرورت محسوس کرتا ہے؛ جو ہم تک ثقہ راویوں نے نقل کئے ہیں؛ اور جنہیں نقاد مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان روایوں نے صرف قرآن پاک کے الفاظ ہی کو نقل نہیں کیا بلکہ اس کے معانی کو بھی نقل کیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بچوں کی طرح قرآن پاک کے صرف الفاظ ہی کی تلاوت نہیں کیا کرتے تھے؛ بلکہ اس کے معانی کا بھی علم حاصل کرتے رہے۔ جو شخص ان کا راستہ اختیار نہیں کرتا وہ اپنی رائے کو دین میں داخل کر رہا ہے۔ اور جو شخص اپنی رائے کو دین میں داخل کرتا ہے؛ اور اسے دین سمجھتا ہے؛ اور کتاب اللہ تعالیٰ سے رہنمائی نہیں لیتا؛ وہ گنہگار ہے اگرچہ اس کی رائے صحیح بھی ہو۔ اور جو شخص کتاب وسنت سے علم اخذ کرتا ہے اگرچہ وہ خطا پر بھی ہو تب بھی اس کو ثواب ملتا ہے اگر رائے درست ہو تو ثواب دو گنا حاصل ہوتا ہے۔

اہل جنت اور دیدار الٰہی:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول:...... ''جنتیوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہونا برحق ہے''۔ یہاں پر اہل جنت کو بطور خاص ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر جنتیوں کو دیدار نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنتیوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار جنت میں نصیب ہوگا۔ اسی طرح جنت میں داخل ہونے سے پہلے میدان محشر میں بھی دیدار نصیب ہوگا۔ صحیحین کی ایک حدیث سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے۔ نیز ارشاد ربانی: ﴿تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَٰمٌ﴾ (الاحزاب: ٤٤) ''جس روز وہ اس سے ملیں گے ان کا تحفہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) سلام ہوگا'' اس سے بھی رؤیت کا اثبات ہو رہا ہے۔

البتہ اہل محشر کو اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا [یا نہیں؟] اس میں علمائے کرام رحمہم اللہ کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول :......صرف ایمانداروں کے علاوہ کسی کو یہ دیدار نہیں ہوگا۔

دوسرا قول :......تمام محشر والے دیدار کریں گے۔ مومن، کافر سب۔ پھر کافروں سے پردہ کر لیا جائے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے رب

کو نہ دیکھ سکیں گے۔

تیسرا قول :.......ایماندار اور منافقین تو دیدار کریں گے۔ البتہ کفار کو دیدار نہیں ہوگا۔

اسی طرح کا اختلاف محشر کے میدان میں اہل محشر سے کلام کرنے کے بارے میں بھی ہے۔

دنیا میں دیدار الٰہی کے امکان کی نفی:

تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہیں کہ اس دنیا میں کوئی بھی اپنی ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس میں بطور خاص رسول اکرم ﷺ کے علاوہ کسی کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ بعض علماء نے آپ ﷺ کے بھی ان آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی نفی کی ہے۔ اور بعض نے اس کو آپ ﷺ کے حق میں ثابت مانا ہے''۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ (۴۷۶ تا ۵۴۴ھ) نے اپنی کتاب ''الشفاء'' میں اس مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد آنے والوں کا رسول اللہ ﷺ کو رب کا دیدار ہونے میں اختلاف نقل کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ انکار نقل کیا ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے دیکھا ہو۔ جب حضرت مسروق رحمہ اللہ (م ۶۳ھ) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا:

کیا حضرت محمد ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا تھا؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''تیرے اس سوال سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے (یعنی میں کانپ اٹھی)۔ پھر فرمایا:

''جو شخص تجھے بتائے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے وہ جھوٹا ہے''۔ ❶

پھر قاضی صاحب نے کہا ہے: ''اہل علم کی ایک جماعت کا قول بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول کے مطابق ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ محدثین، فقہاء، متکلمین رحمہم اللہ کی ایک جماعت دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا مطلقاً انکار کرتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

''رسول اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے''۔

ضعیف، أخرجه ابن خزيمة فی التوحيد بألفاظ مضطرب عنه موقوفاً.

حضرت عطاء رحمہ اللہ (۲۷-۱۱۴ھ) نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے؛ فرمایا:

''آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دل کے ساتھ دیکھا ہے''۔ ❷

پھر چند اقوال اور فوائد ذکر کرنے کے بعد قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس کو نبی کریم ﷺ کے لیے واجب کرنا؛ اور یہ کہنا کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو ان آنکھوں سے دیکھا ہے؛ اس پر کوئی قطعی دلیل/ نص موجود نہیں۔ اس سلسلہ میں سورۂ نجم کی دو آیتوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں اختلاف [ماثور] ثابت ہے۔ اور اس کا احتمال بھی ممکن ہے''۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ کا یہ قول حق پر مبنی ہے۔ دنیا میں بھی رؤیت ممکن ہے؛ اگر ممکن نہ ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کا سوال نہ کرتے۔ تاہم بہرحال کوئی ایسی نص قاطع نظر نہیں آتی جس سے معلوم ہو کہ آپ ﷺ نے اپنی ان سر والی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھا

ہو۔ بلکہ ایسی روایات موجود ہیں جو رؤیت کی نفی پر دلالت کرتی ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ تو سراپا نور ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں''۔ ❸

ایک روایت میں ہے: ''میں نے نور دیکھا''۔ نیز صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر ہمیں پانچ باتیں بتائیں؛ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سوتا نہیں اور نہ ہی سونا اس کے لائق ہے۔ وہ ترازو کو عدل کے ساتھ نیچا اور اونچا کرتا ہے۔ اس کی جانب رات کے اعمال سے پہلے دن کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں اور دن کے اعمال سے پہلے رات کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں۔ اس پر نور کا حجاب ہے''۔ ایک روایت میں ''نار'' یعنی آگ کا لفظ ہے؛ اگر وہ حجاب کھول دے تو اس کے چہرہ کے انوار جہاں تک اس کی مخلوق پر نظر جاتی ہے ان کو بھسم کردے''۔ ❹

❶ بخاری[٤٨٥٥]، مسلم[١٧٧]، مسند احمد (٦/ ٤٩).

❷ ابن خزیمه فی التوحید حدیث ضعیف ہے۔ اس کے الفاظ میں اضطراب پایا جاتا ہے۔

❸ صحيح أخرجه مسلم فی آخر كتاب الإيمان؛ ويشهد له حديث ابن عمر مرفوعاً بلفظ: "يوم القيامة أول يوم نظرت فيه عين إلى الله عز وجل". رواه الدارقطني كما في "الدر "٦/ ١٩١؛ وله شاهد مرسل، رواه بو سعيد الدارمي في الرد على الجهمية ص ﴿57﴾ طبع المكتب الإسلامي.

❹ - حدیث صحیح ہے۔ مسلم، ابن ماجة.

تو اس صورت میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت: ''میں نے ایک نور دیکھا ہے'' کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے ذات الٰہی پر حجاب دیکھا۔ اور یہ کہنا کہ: ''وہ نور ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں'' اس سے مراد حجاب کا نور ہے جو اللہ تعالیٰ کی رؤیت سے مانع ہے۔ تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتے تھے۔ یعنی میں اس کو کیسے دیکھتا جب کہ نور کا حجاب میرے اور اس کے دیدار کے درمیان میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ یہ حدیث رؤیت کی نفی میں واضح ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

عثمان بن سعد دارمی رحمۃ اللہ علیہ [۲۰۰ھ-۲۸۰ھ] نے اس قول پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اتفاق نقل کیا ہے۔ اور ہم حضرت جبریل علیہ السلام کی رؤیت ثابت کرسکیں تو یہ غنیمت ہے چہ جائیکہ ہم اللہ تعالیٰ کی رؤیت ثابت کرتے پھریں ❶ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت تو بہت اعلیٰ اور عظیم بات ہے۔ بے شک نبوت کا اثبات اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے اثبات پر ہرگز بھی موقوف نہیں۔

❶ الردعلى الجهمية للدارمى (ص ٦٤).

احاطہ اور کیفیت کی نفی:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول:...... ''بغیر احاطہ اور کیفیت کے بیان کے''۔ ایسا اللہ تعالیٰ کی کمال عظمت اور خوبصورتی کی وجہ سے ہوگا۔ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکیں گی؛ اور نہ اس کی ذات کا احاطہ ہو سکے گا؛ جیسے اس کے متعلق معلوم کیا جاسکتا ہے؛ مگر علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ (الانعام: ۱۰۳) ''آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں۔'' نیز ارشاد ربانی ہے: ﴿وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾ (طہٰ: ۱۱۰) ''اور وہ اپنے علم سے اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کرسکتے۔''

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ......''اس کی تفسیر وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا؛ اور وہ اس کا علم رکھتا ہے [1] ......آگے چل کر فرمایا: ......اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہم اپنی رائے کو دخل دے کر تاویلات نہیں کریں گے اور نہ ہی اپنی خواہشات سے وہم وگمان کا عمل دخل کریں گے'' [2]۔ جیسا کہ معتزلہ نے مسئلہ رؤیت میں کتاب وسنت کے نصوص کے ساتھ سلوک کیا [اور ان میں تأویل کی]۔ در حقیقت ایسا کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام میں تحریف کرتے ہوئے اسے اپنی جگہ سے بدل دینا ہے۔ صحیح تاویل وہ ہوتی ہے جو سنت کے موافق ہو؛ اور جو سنت کے مخالف ہو وہ فاسد تأویل ہوتی ہے۔ پس ہر وہ تاویل جس پر سیاق وسباق سے کوئی دلیل نہ ملتی ہو نہ ہی قرینہ اس کا تقاضا کرتا ہو؛ تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایسے متکلم کا مقصود نہیں جو ہادی اور مبین [ہدایت دینے والا اور کھول کر بیان کرنے والا] ہے۔ اگر اس سے مقصود وہی ہوتا جو آپ سمجھ رہے ہیں تو وہاں اس کے مطابق ایسے قرائن کی بھر مار ہوتی جو ظاہری معنی کے خلاف پر دلالت کرتے ہیں؛ تا کہ سننے والا التباس اور خطأ میں نہ واقع ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام ہدایت اور بیان کے لیے نازل فرمایا ہے؛ اگر اس سے مراد ظاہر کے خلاف ہوتا؛ اور ایسے قرائن بھی موجود نہ ہوتے جو اس معنی کے علاوہ کسی دوسرے معنی پر دلالت کرتے جن کی طرف سننے والے کا ذہن فوراً منتقل ہوتا ہے۔ تو اس کا معنی یہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں وضاحت اور ہدایت موجود نہیں؛ [لیکن اس کے غلط ہونے میں کچھ شبہ نہیں]۔ پس تأویل متکلم کی مراد سے متعلق خبر دینے میں ہوتی ہے؛ اس کے انشاء میں نہیں ہوتی۔

[1] ۔ اس عبارت کا مضمون تفویض ہے۔ یعنی ہم نہیں ان نصوص کے معانی نہیں جانتے۔ لیکن مصنف کی مراد یہ ہو؛ ایسا کہنا درست نہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے رؤیت الٰہی کو تو ثابت کیا ہے۔ اور یہ فرمایا ہے: ''بغیر احاطہ اور کیفیت کے''۔ اس سے رؤیت کی حقیقت تو ثابت ہوتی ہے۔ اب یہ کہنا درست نہیں کہ مؤلف کی مراد یہ ہے کہ ان نصوص میں وارد ذکر رؤیت کی مراد ہم نہیں جانتے۔ بلا شک وشبہ اس سے مراد یہ ہے کہ لوگ اپنے رب کو دیکھیں گے۔ یہی عقیدہ سنت نبویہ کی صحیح نصوص سے ثابت ہے۔ ان نصوص سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہمیں معلوم ہے۔ ان کے حقائق تو معلوم ہیں؛ البتہ ہم اس کی کیفیت نہیں جانتے۔

[2] ۔ پس ہم ان نصوص میں اپنی رائے سے تفویض یا تأویل نہیں کرتے۔ اور نہ ہی کسی خواہش نفس کی وجہ سے ان نصوص کے ظاہر کے خلاف جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسی تأویل جس پر کوئی دلیل نہ ہو؛ اس کی اصل وجہ خواہشات نفس کی پیروی ہوتی ہے۔ پس کسی شک وشبہ یا خواہش نفس کی وجہ سے کتاب وسنت کی صریح وصحیح نصوص میں کسی بھی صورت میں ہرگز ہرگز جائز نہیں۔ یہی سلف صالحین رحمہم اللہ کا منہج اور طریقہ کار ہے۔

خیال رہے کہ اس مسئلہ میں اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے جب کہ کلام سے مقصود متکلم کی مراد کو سمجھنا ہوتا ہے۔ مثلاً جب کہا جاتا ہے اس لفظ کا یہ معنی ہے؛ تو مطلب یہ بتانا ہوتا ہے کہ متکلم کی مراد یہ معنی ہے۔ [یہ جملہ خبریہ ہوتا ہے] اگر خبر واقع کے مطابق نہ ہو تو وہ متکلم پر جھوٹ ہوتا ہے۔ متکلم نے جس معنی کا ارادہ کیا ہے اس کو کئی طریقوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے؛ ان طریقوں میں سے:

اولاً: ......اس معنی کے ارادہ کی وضاحت کرے۔

ثانیاً: ......وہ لفظ استعمال کرے جس کا وضعی معنی ظاہر ہو۔ نیز ایسا قرینہ نہ لائے جس سے وضعی معنی کا ابطال ہوتا ہو بلکہ ایسے قرائن موجود ہوں جو حقیقی، وضعی معنی کو ترجیح دیں۔ پھر جب کلام ایسے قرائن سے بھر پور ہو جو اس کے حقیقی اور وضعی معنی مراد ہونے پر دلالت کرتے ہوں؛ تو اس وقت کیا عالم ہوگا؟ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًاo﴾ (النساء: ١٦٤)

''اور اللہ تعالیٰ موسیٰ سے ہم کلام ہوا۔''

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''تم اپنے رب کو کھلم کھلا دیکھو گے جیسا کہ تم دو پہر کے وقت بادل نہ ہوں تو سورج کو دیکھتے ہو۔'' [1]

[1] متفق علیه .

اس کلام سے مراد کے متعلق سامع دوٹوک مؤقف اختیار کر سکتا ہے [یہ کلام اپنے معنی پر دلالت کرنے میں صاف واضح ہے]۔

پس اگر کسی خبر میں متکلم کے الفاظ معنی مراد پر حقیقتاً دلالت کر رہے ہیں، قرائن مؤکدہ بھی موجود ہیں تو وہ خبر دینے میں سچا ہے۔ اور اگر متکلم کے کلام ایسی تاویل سے کام لیا جا رہا ہے جس پر کلام دلالت نہیں کرتا؛ اور تاویل پر دلیل کے لیے قرائن بھی موجود نہیں؛ تو پھر بھی اس کا یہ کہنا کہ متکلم کی اس سے مراد یہ ہے؛ تو یہ خبر جھوٹی ہے۔ یہ اپنی رائے سے تأویل اور خواہش نفس کی بدگمانی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کہنے والے کا یہ کہنا کہ: ''ہم اس کو اس پر محمول کرتے ہیں؛ یا اس میں یہ تأویل کرتے ہیں؛ بیشک یہ عمل الفاظ کو ان کے اصلی وضع کردہ معانی سے دور کرنا ہے۔ بلا شک کہ اگر اس اختلاف کرنے والے سے گفتگو کی جائے تو اس کے لیے اشکالات کا جواب دینا؛ اور اصل معنی سے اعراض کرنا ممکن نہیں رہتا؛ کہ وہ یوں کہے: میں اس کو اس کے ظاہر کے خلاف پر محمول کرتا ہوں۔

اگر یہ کہا جائے کہ: اس کو محمول کرنے [احتمال پیش کرنے] کا ایک دوسرا معنی ہے جس کا آپ نے ذکر نہیں کیا؛ وہ یہ ہے کہ جب لفظ سے اس لفظ کا حقیقی، ظاہری وضعی معنی مراد لینا محال ہو؛ اور اس سے انکار بھی ناممکن ہو؛ تو اس کا مجازی معنی مراد ہوگا؛ تو پھر ہم اس لفظ کے وارد ہونے سے استدلال کرتے ہیں کہ اس سے ظاہری معنی مراد نہیں؛ بلکہ اس سے مراد مجاز ہے۔ تو ہم اسے اس پر دلالت کے اعتبار سے محمول کرتے ہیں؛ ابتداء نہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: ''متکلم سے متعلق خبر دینے کا یہی معنی ہے کہ اس کی مراد یہ ہے؛ اور وہ یا تو سچ ہوگی یا پھر جھوٹ ہوگی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ اور یہ بات بھی ممتنع ہے کہ مراد اس کی حقیقت اور ظاہر کے خلاف لی جائے؛ مگر سامع کے لیے وہ معنی واضح نہ کیا جائے جو مراد لیا جا رہا ہے۔ بلکہ اس کے کلام کے ساتھ ایسے قرآئن ملے ہوئے ہوں جو اس سے حقیقی معنی مراد ہونے کی تاکید کر رہے ہوں۔ ہم اس بات کو ممنوع نہیں کہتے کہ متکلم کبھی اپنے کلام سے حقیقت کے خلاف بھی مراد لے سکتا ہے؛ جب اس کا مقصد سامع کو اندھیرے میں رکھنا ہو؛ اور ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے۔ لیکن ہم اس چیز کا انکار کرتے ہیں جب مقصد ہی ایضاح؛ بیان اور اپنی مراد سمجھانا ہو؛ اور پھر بھی وہ اپنے کلام سے ظاہری حقیقت کے خلاف مراد لے''۔ [الصواعق ۲۰۲]

اور یہ کیسے ہو سکتا ہے جب کہ متکلم اپنے کلام کی تائید اس طرح کر رہا ہو؛ جس سے مجاز کی نفی ہوتی ہے؛ اور وہ بار بار اسے دھرا رہا ہو؛ اور اس کے لیے مثالیں بیان کر رہا ہو [1]۔

[1] ۔ اس کے آگے مصنف نے فرمایا ہے: ''((فَإِنَّهُ مَا سَلِمَ فِي دِينِهِ إِلَّا مَنْ سَلَّمَ لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَلِرَسُولِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ .وَرَدَّ عِلْمَ مَا اشْتَبَهَ عَلَيْهِ إِلَى عَالِمِهِ .))'' بے شک اسی شخص کا دین سلامتی سے ہم کنار ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے؛ اور مشتبہ چیزوں کے علم کو ان کے جاننے والوں کی جانب رد کرتا ہے'' ۔ اس کی تشریح رہ گئی تھی۔ دراصل یہ اس سابقہ جملہ کی تعلیل ہے؛ کہ ہم اپنی تأویل یا آراء سے دخل اندازی نہیں کرتے''۔ بلکہ ہم اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مراد پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان نصوص پر ایمان لانا ہم پر واجب ہے۔ ان سے جو کچھ ہم نے علم حاصل کیا ہے؛ اس کو جیسے سمجھے ہیں اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جس چیز کا علم نہیں ہو سکا؛ اسے ہم ان نصوص کے علماء کی طرف رد کرتے ہیں۔ مؤمن پر یہی واجب ہوتا ہے کہ وہ کتاب وسنت کی نصوص پر ایمان رکھنے میں توقف نہ کرے۔ خواہ ان کو سمجھے یا نہ سمجھے۔

حکمِ کتاب وسنت کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کا وجوب

۳۶۔((......وَلاَ تَثْبُتُ قَدَمُ الإِسْلاَمِ إِلاَّ عَلَى ظَهْرِ التَّسْلِيْمِ وَالْاِسْتِسْلاَمِ . فَمَنْ رَامَ عِلْمَ مَا حُظِرَ عَنْهُ عِلْمُهُ ، وَلَمْ يَقْنَعْ بِالتَّسْلِيمِ فَهْمُهُ ، حَجَبَهُ مَرَامُهُ عَنْ خَالِصِ التَّوْحِيْدِ ، وَصَافِي الْمَعْرِفَةِ ، وَصَحِيْحِ الإِيْمَان . فَيَتَذَبْذَبُ بَيْنَ الكُفْرِ وَالإِيْمَان ، وَالتَّصْدِيْقِ وَالتَّكْذِيْبِ ، وَالْإِقْرَارِ وَالإِنْكَارِ ، مُوَسْوِسًا تَائِهاً ، شَاكًا زَائِغاً ، لاَ مُؤْمِنا مُصَدِّقاً ، وَلاَ جَاحِداً مُكَذِباً))

''اورقدم اسلام پر ثابت نہیں رہ سکتے جب تک کہ اسلام کے سامنے سرِتسلیم خم نہ کرلیں اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے سپرد نہ کردیں۔ پس جس شخص نے ایسا علم حاصل کرنے کا قصد کیا جس سے روکا گیا تھا؛ سرِتسلیم خم کرنے پر قناعت نہ کی؛ اسے خالص توحید (جو اصل مقصود ہے) کی صاف معرفت اور صحیح ایمان کی نعمت سے محرومی ہوگی۔ پس وہ کفر و ایمان؛ تصدیق و تکذیب اور اقرار و انکار کے مابین مذبذب اور وسوسوں میں مبتلا رہے گا؛ وہ حیرانگی اور شکوک وشبہات کا شکار رہتا ہے وہ نہ سچی تصدیق کرنے والا مومن ہوتا ہے اور نہ ہی جھٹلانے والا منکر''۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''......اس شخص کا دین سالم اور محفوظ ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا ہے۔ اور مشتبہ چیزوں کے علم کو اس کے جاننے والے کی طرف رد کرتا ہے''۔

یعنی کتاب وسنت کے نصوص (کو تسلیم کرتا ہے) شکوک وشبہات اور تاویلات فاسدہ کا دروازہ نہیں کھولتا؛ اور نہ یہ کہتا ہے کہ یہاں پر عقل نقلی دلائل کے خلاف گواہی دے رہی ہے۔ اور مزید یہ کہتا ہے کہ نقل کی اصل عقل ہے۔ اور اگر ان دونوں میں ٹکراؤ ہو جائے تو عقل کو مقدم کریں گے۔ ایسا کبھی بھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر کسی موقع پر کوئی ایسا وہم پیدا ہوتا ہو تو پھر اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں؛ یا تو وہ نقل/[نص شرعی] صحیح ہوگی؛ تو اس صورت میں معقول کا دعوی کرنے والا حقیقت میں مجہول ہے۔ اگر اس پر گہری نظر سے غور وفکر کیا جائے تو حقیقت واضح ہو جائے۔

اور اگر وہ نقل صحیح نہیں تو اس صورت میں وہ معارضہ [ٹکراؤ] کے قابل ہی نہیں۔ یاد رہے کہ عقل صریح اور نقل صحیح میں تو کبھی تعارض کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ تعارض ان لوگوں کے کلام میں ہے؛ جو ایسی باتیں کرتے ہیں۔

پس ان سے کہا جائے گا: اور عقل اور نقل میں تعارض کی صورت میں نقل کو مقدم رکھنا واجب ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مدلولین کو جمع کرنا اصل میں جمع بین النقیضین ہے۔ اور ان دونوں کو ختم کرنا رفع النقیضین ہے۔ اور عقل کو مقدم کرنا درست نہیں [بلکہ ممتنع ہے]۔ اس لیے کہ عقل ہی تو ہے جو نقل کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے اور فرمودات رسول ﷺ کو قبول کرنے کے وجوب کا

تقاضا کرتی ہے۔ پس اگر ہم نقل کو باطل قرار دیں تو یقیناً ہم نے عقل کی دلالت کو بھی باطل کر دیا۔ اور اگر ہم عقل کی دلالت کو باطل کرتے ہیں تو اس صورت میں نقل کے ٹکراؤ کے قابل ہی نہیں رہتی۔ اس لیے کہ جس میں دلیل بننے کی صلاحیت نہیں وہ کسی بھی چیز کا معارضہ [ٹکراؤ] کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی۔ پس عقل کی تقدیم تو عدم تقدیم کی موجب ٹھہری؛ لہٰذا اس کی تقدیم جائز نہیں۔ یہ بات انتہائی صاف اور واضح ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ عقل ہی تو ہے جو نقل کے صدق اور صحت پر دلالت کرتی ہے۔ اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ خبر واقع کے عین مطابق ہے۔ پس اگر یہ جائز ہوتا کہ نقل کے بطلان کی وجہ سے عقل کی دلالت باطل ہوتی؛ تو لازم آتا کہ عقل صحیح دلیل نہیں ہے۔ اور جب وہ صحیح دلیل نہیں ہے تو پھر جائز نہیں کہ کسی صورت میں اس کے پیچھے چلا جائے۔ چہ جائیکہ اس کو مقدم رکھا جائے۔ پس عقل کو نقل سے مقدم رکھنا دراصل عقل پر قدح [عیب جوئی] ہے''۔ [الصواعق ۸۵۳؛ درء التعارض ۱/ ۱۷۰]

پس رسول اکرم ﷺ کی تمام باتوں کو مکمل طور پر تسلیم کرنا اور آپ کے حکم کے سامنے سر جھکانا اور آپ کی احادیث کی تصدیق کرنا اور انہیں ماننا ہم پر واجب ٹھہرتا ہے۔ جسے ہم عقل کا نام دیتے ہیں؛ ان کا ایسے کسی باطل خیال کے ساتھ معارضہ نہیں ہو سکتا؛ اور نہ ہی ہم انہیں کسی شک وشبہ پر محمول کرتے ہیں۔ اور نہ ہم لوگوں کی آراء اور ان کے ذہنی افکار کی پراگندگی کو آپ ﷺ کے حکم سے مقدم کرتے ہیں۔ جس طرح ہم ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اس کے سامنے عجز، انکساری، تواضع اختیار کرتے ہیں اسی پر توکل کرتے ہیں اسی طرح ہم رسولِ اکرم ﷺ کی تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہیں؛ صرف ان کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں؛ آپ کی باتوں پر یقین کرتے ہیں اور آپ کی اطاعت کرتے ہیں۔

توحید فی الرسالت:

توحید کی دو اقسام ہیں۔ کوئی انسان اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچ سکتا جب تک ان دونوں کو مان نہ لے۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی متابعت کی توحید۔ پس ہم نہ آپ کے علاوہ کسی کی جانب فیصلہ لے کر جاتے ہیں؛ نہ اس کے فیصلہ کو تسلیم کرتے ہیں؛ اور نہ ہی آپ کے حکم کے نفاذ اور آپ ﷺ کی خبر کی تصدیق میں توقف اختیار کرتے ہیں؛ اور نہ آپ کے حکم کو کسی امام، یا شیخ [بزرگ]؛ اپنے ہم جماعت؛ ہم مذہب یا جن کی ہم تعظیم کرتے ہیں؛ ان کے قول پر پیش کرتے ہیں؛ کہ اگر وہ اس کی اجازت دیں تو نافذ کریں اور آپ کی خبر کو قبول کر لیں؛ وگرنہ ائمہ، مشائخ کی طرف تفویض کریں؛ اور آپ کے حکم اور خبر سے منہ موڑ لیں؛ وگرنہ اس میں تحریف کر کے اس کا نام تاویل یا محمول کرنا رکھیں۔ اور کہے کہ: ہم اس میں یہ تأویل کرتے ہیں؛ اور اسے اس پر محمول کرتے ہیں۔ اور اس قسم کے نظریات/عقائد والا انسان؛ شرک کے علاوہ دیگر تمام گناہوں کے ساتھ اگر کوئی شخص بارگاہِ الٰہی میں پیش ہو تو یہ اس سے اس کے لیے بہتر ہے؛ کہ وہ بارگاہ الٰہی میں اس حال میں پیش ہو۔ [رسول اکرم ﷺ کی اطاعت سے دستکش ہو کر کسی امام شیخ کی اطاعت کو ترجیح دیتا ہو]۔ بلکہ جب اسے صحیح حدیث پہنچ جائے؛ تو وہ یوں سمجھے کہ وہ اس حدیث کو رسول اکرم ﷺ سے سن رہا ہے۔ تو کیا کسی کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ حدیث رسول ﷺ کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے میں تأخیر کرے حتی کہ اسے پہلے کسی امام کے قول، اور مذہب پر پیش کرے۔ بلکہ اس صورت میں حدیث رسول اللہ ﷺ کو بلا پس و پیش [بلا چون و چراں] اور بغیر کسی التفات کے تسلیم کرنا فرض ہو جاتا ہے''۔ [مدارج السالکین ۲/ ۳۸۷]

اور نہ ہی یہ اشکال پیش کرے کہ یہ حدیث تو فلاں امام کی رائے کے خلاف ہے۔ بلکہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے یہ ان آراء واقوال پر اشکال پیش کرے۔نص کے مقابلہ میں قیاس کا معارضہ نہ کرے؛ بلکہ تمام قیاسات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نصوص سنت کے ساتھ وابستگی اختیار کرے۔اور ہم آپ کے کلام کو اس کی حقیقت سے کسی ایسے خیال کی وجہ سے تحریف کا شکار نہیں کرتے جسے یہ لوگ معقول کا نام دیتے ہیں۔حقیقت میں وہ مجہول بلکہ راہ صواب سے بہت دور ہے۔حدیث رسول اللہ ﷺ کو قبول کرنا کسی ایک کے قول کے موافق ہونے پر موقوف نہیں؛ بھلے وہ کوئی بھی ہو[کتنا ہی بڑا امام اور عالم کیوں نہ ہو]۔

مسند احمد رحمہ اللہ میں ہے: حدثنا انس بن عیاض؛ حدثنا ابو حازم؛ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند کے ساتھ روایت ہے ؛ کہتے ہیں:

''میں اور میرا ایک بھائی ہم دونوں ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے؛ مجھے پسند نہیں کہ اس مجلس کے بدلے مجھے سرخ اونٹ دستیاب ہوں؛ (یعنی وہ مجلس دستیاب نہ ہو)۔میں اور میرا بھائی آئے تو ہم نے دیکھا کہ رسول اکرم ﷺ کے عمر رسیدہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے دروازوں میں سے ایک دروازہ پر بیٹھے تھے۔ہم نے پسند نہ کیا کہ ان کے درمیان ہماری وجہ سے تفریق ہو اس لیے ہم ایک کنارے میں ہو کر بیٹھ گئے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ایک آیت کی تلاوت کی پھر اس میں بحث کرنے لگے ان کی آوازیں بلند ہو گئیں رسول اکرم ﷺ غصہ کے عالم میں باہر تشریف لائے؛ آپ ﷺ کا چہرہ انور سرخ ہو چکا تھا آپ ان پر مٹی پھینک رہے تھے؛ اور فرما رہے تھے:

''لوگو! رک جاؤ تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے انبیاء کی تعلیمات میں اختلاف کیا اور کتب الٰہیہ کی تعلیمات کو آپس میں ٹکرانے لگ گئے تھے۔احکام کا انکار کیا بے شک قرآن پاک کا نزول اس لیے نہیں ہوا کہ اس کا کچھ حصہ باقی حصہ کی تکذیب کرے اس کی آیات ایک دوسرے کی تصدیق کر رہی ہیں۔قرآن پاک کے جن مسائل کی تمھیں معرفت حاصل ہو جائے ان پر عمل کرو اور جن کی معرفت حاصل نہ ہو سکے ان کو کسی عالم کی طرف لوٹا دو''۔ [1]

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق بلا علم بات کہنے کو حرام قرار دیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (الاعراف: ۳۳)

[1] بغوی شرح السنة(۱۲۱)؛ رجاله ثقات علی خلاف مشهور فی عمرو بن شعیب ۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

''کہہ دو کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو ظاہر ہوں یا پوشیدہ اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کرنے کو حرام کیا ہے اور اس کو بھی کہ تم کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس کو بھی کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جن کا تمھیں کچھ علم نہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ (الاسراء: ۳۶)

''اور جس چیز کا آپ کو علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑیں۔''

پس ہر انسان کو چاہیے کہ [وہ اس حق کی اتباع کرے] جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو دیکر مبعوث کیا؛ اور اس کے بیان میں کتابیں نازل کیں۔ یہی وہ حق ہے جس کی اتباع واجب ہے۔ پس اس کی تصدیق کرے کہ یہی حق اور سچ ہے۔ اس کے علاوہ تمام لوگوں کے کلام کو اللہ تعالیٰ! کی کتاب پر پیش کرے اگر وہ کتاب اللہ سے موافق ہو تو درست؛ اور اگر مخالف ہے تو باطل۔ اور اگر یہ علم نہ ہو سکے کہ اس میں موافقت ہے یا مخالفت اس لیے کہ وہ کلام مجمل ہو؛ اور صاحب کلام کی مراد معلوم نہ ہو رہی ہو؛ یا معنی تو معلوم ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ رسول اکرم ﷺ سے اس کی تصدیق یا تکذیب وارد ہوئی ہے یا نہیں؟ تو بیشک اس صورت میں اس سے بچ کر رہے۔ اور بغیر علم کے کلام نہ کرے۔ علم وہی ہے جس پر دلیل موجود ہو؛ اور اس میں سے بھی نفع بخش علم وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہو۔ کبھی رسول اکرم ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے سے بھی علم حاصل ہو جاتا ہے لیکن یہ علم دنیاوی امور کے بارے میں ہوتا ہے مثلاً علم طب، حساب، زراعت وغیرہ کا علم دنیاوی امور کا علم ہے۔ لیکن امور الٰہیہ معارف دینیہ کے علم کا ماخذ رسول اکرم ﷺ ہیں کوئی دوسرا نہیں ہے''۔ [مجموع ۱۳/ ۱۵۵]

اسلام کا تقاضا:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''......اسلام پر قدم ثابت نہیں رہ سکتے جب تک کہ کوئی اسلام کے سامنے سر تسلیم خم نہ کر لے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے سپرد نہ کر دے''۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا کلام استعارہ کے باب سے ہے۔ ظاہر ہے کہ حسی طور پر قدم کسی چیز کی پشت پر ہی جم سکتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اس شخص کا اسلام درست نہیں جو کتاب و سنت کے نصوص تسلیم نہیں کرتا ان کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ اعتراض کرتا ہے یا اپنی رائے کے ساتھ معارضہ کرتا ہے عقل اور قیاس کو ترجیح دیتا ہے۔ امام بخاری، امام محمد بن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ (۵۸-۱۲۴ھ) سے ذکر کرتے ہیں؛ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو نازل فرمایا اس کے رسول ﷺ نے لوگوں تک پہنچایا ہمارے لیے اس کو ماننا ضروری ہے''۔ اور یہ کلام بظاہر نہایت جامع اور مفید ہے۔

عقل و نقل کی مثال:

عقل و نقل کے مابین تفاوت کے لیے کتنی ہی بہترین مثال بیان کی گئی ہے۔ عقل و نقل کے مابین نسبت یوں ہی ہے جیسے عامی مقلد اور عالم مجتہد کے درمیان نسبت ہے؛ بلکہ اس کا مقام اس سے بہت کم ہے۔ اس لیے کہ عامی مقلد کا عالم بننا ممکن ہے لیکن کسی عالم کا نبی یا رسول بننا ممکن نہیں۔ جب ایک عامی مقلد کسی عالم کی معرفت حاصل کرتا ہے اور اس کے بارے میں کسی دوسرے عامی مقلد کو خبر دیتا ہے۔ پھر کسی مسئلہ میں مفتی عالم اور اس کی طرف راہنمائی کرنے والے میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ تو اس صورت میں مستفتی پر واجب ہے کہ وہ مفتی کا فتویٰ تسلیم کرے؛ نہ کہ جس نے مستفتی کی راہنمائی کی اس کے قول کو تسلیم کرے۔ [یعنی اگر وہ مفتی کے قول کے خلاف ہو تو اسے تسلیم نہ کرے]۔ اگر راہنمائی کرنے والا کہے: ''میرا قول درست ہے؛ مفتی کا قول درست نہیں؛ اس لیے کہ اصل میں میں نے تمہیں

آ گاہ کیا اور بتایا کہ فلاں مفتی ہے۔تو اگر تو مفتی کے قول کو میرے قول پر مقدم کرتا ہے تو اس اصل پر قدح کر رہا ہے جس کی وجہ سے تمہیں اس کے مفتی ہونے کا علم ہوا۔اور اصل پر قدح سے فرع پر قدح لازم آتی ہے۔لیکن مستفتی راہنمائی کرنے والے سے کہتا ہے درست ہے کہ تو نے گواہی دی کہ وہ مفتی ہے؛ اور اس کی راہنمائی کی۔تو نے اس کی تقلید کے وجوب کی گواہی دی تھی نہ کہ اپنی تقلید کی دعوت۔اس متعین علم کی حد تک میری آپ کی موافقت کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر مسئلہ میں آپ کی موافقت کی جائے۔اور آپ کی غلطی اس مسئلہ میں ہے جس میں آپ کی رائے مفتی کی رائے کے خلاف ہے؛ جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے؛ تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کا یہ بتانا بھی غلط ہے کہ وہ مفتی ہے۔اس علم کے باوجود یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مفتی کا بھی کبھی خطا کرنا ممکن ہے۔لیکن ہر عقل مند انسان جانتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتاتے ہیں آپ ان میں معصوم ہیں ان میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا؛ پس آپ کی بات ماننا؛ اور آپ کے حکم پر سر تسلیم خم کرنا؛ اور ان کا تسلیم کرنا ہم دین اسلام میں اضطراری طور پر جانتے ہیں کہ ضروری ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص رسول اکرم ﷺ سے کہتا ہے جس قرآن کو آپ پیش کر رہے ہیں اور جس سنت کا آپ پرچار کر رہے ہیں ان میں بہت سارے ایسے مسائل موجود ہیں جو ہماری عقل کے خلاف ہیں حالانکہ آپ کی صداقت کا علم ہمیں عقل سے ہی ہوا ہے۔اگر ہم آپ کی تمام باتیں تسلیم کرتے ہیں؛ حالانکہ ہماری عقل ان کی مخالفت کرتی ہے؛ تو عقل کے ساتھ ہی تو ہم نے آپ کو سچا مانا تھا؛ اس صورت میں عقل پر قدح عائد ہوتی ہے جس کے ذریعہ ہم نے آپ کی صداقت کو تسلیم کیا ہے۔پس ہم آپ کے کلام سے ظاہر ہونے والے تناقضات کے موجب اعتقاد رکھتے ہیں۔اور اب ہمارا ٹکراؤ ہی آپ کے اقوال سے ہو رہا ہے؛ اس سے ہمیں نہ ہی ہدایت ملتی ہے اور نہ ہی علم۔تو اس قسم کے نظریات رکھنے والا انسان رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان رکھنے والا نہیں کہلا سکتا۔اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ اس کی ان باتوں سے راضی ہو سکتے ہیں۔بلکہ یہ بات معلوم شدہ ہے کہ اگر ایسا کہنا جائز ہو تو یہ راہ کھل جائے گی کہ ہر کوئی نبی کریم ﷺ کی لائی ہوئی کسی نہ کسی چیز کا انکار کر دے۔چونکہ لوگوں کی عقلیں مختلف ہیں اور شبہات بھی کثرت سے موجود ہیں۔اور شیاطین مسلسل لوگوں کے نفوس میں وسوسہ اندازی کرتے رہتے ہیں۔تو ہر شخص کے لیے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تمام تعلیمات اور احکامات میں اپنی عقل سے ایسی باتیں کہتا پھرے۔[نتیجہ میں شریعت کے بہت سے مسائل سے انکار کی صورت میں نکلے گا]۔[درء التعارض ۲۱۴/۵] ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ﴾ (النور: ٥٤)

''اور رسول کے ذمہ تو صاف صاف (احکام اللہ) کا پہنچا دینا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (النحل: ٣٥)

''پس پیغمبروں پر تو (احکام خداوندی) کا صاف صاف پہنچا دینا ہے۔''

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (ابراهيم: ٤)

''اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ انھیں (احکام اللہ) کھول کھول کر بتا دے پھر اللہ تعالیٰ جسے چاہتا

ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ﴾ (المائدہ: ۱۵)

''بے شک تمھارے پاس نور اور روشن کتاب آچکی ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ﴾ (الدخان: ۱،۲)

''حٰمٓ۔ کھول کر بیان کرنے والی کتاب کی قسم۔''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ﴾ (یوسف: ۱)

''یہ بیان کرنے والی کتاب کی آیتیں ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَ لٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (یوسف: ۱۱۱)

''ایسی بات نہیں ہے جو بنائی گئی ہو بلکہ جو (کتابیں) اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں ان کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر چیز کی تفصیل کرنے والا ہے اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل ۸۹)

''اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے اس میں ہر چیز کا بیان اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔''

قرآن مجید میں اس مضمون کی بے شمار آیات ہیں۔ پس ایمان باللہ تعالیٰ اور ایمان بالآخرت کا معاملہ دو احوال سے خالی نہیں ہوتا: ۱۔ یا تو رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں وہ گفتگو کی ہوگی جو حق پر دلالت کرتی ہے؛ ۲۔ یا پھر ایسا نہیں۔ یہ دوسرا احتمال باطل ہے۔ اور اگر آپ ﷺ نے اس مسئلہ میں ایسے مجمل الفاظ میں گفتگو کی ہے جس میں دوسرے احتمال بھی موجود ہیں؛ تو آپ ﷺ نے دین اسلام کو واضح شکل میں [بلاغ مبین کے ساتھ] نہیں پہنچایا۔ جبکہ خیر القرون کی امت اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ آپ نے دین کو واضح اور کھول کر پہنچا دیا؛ اور موقف عرفات کے عظیم الشان موقع پر آپ نے اللہ تعالیٰ کو اس پر گواہ بھی بنایا۔ جو شخص اُصول دین کے بارے میں کہتا ہے کہ آپ نے اس کی تبلیغ صاف صاف کھول کر نہیں کی؛ وہ رسول اکرم ﷺ پر افتراء باندھ رہا ہے۔

فاسد علوم کی ممانعت:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''......پس جس شخص نے ایسے علم حاصل کرنے کا قصد کیا جس سے روکا گیا تھا اور قناعت اختیار نہ کی تو اسے

خالص توحید (جو اصل مقصود ہے) کی صحیح معرفت اور ایمان کی نعمت سے محرومی ہوگی''۔

تشریح: اگر چہ اس عبارت سے سابقہ عبارت کی تاکید ہو رہی ہے؛ یہاں پر مزید متنبہ کیا گیا ہے کہ کوئی شخص بغیر علم کے اصول دین میں یا دوسرے علوم [و امور] میں ہرگز کلام نہ کرے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (الاسراء: ٣٦)

''اور جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باز پرس ہوگی۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ﴾ (الحج: ٣، ٤)

''اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے متعلق بغیر علم کے جھگڑتے اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرتے ہیں جس کے بارے میں لکھ دیا گیا ہے کہ جو اسے دوست رکھے گا تو وہ اس کو گمراہ کر دے گا اور دوزخ کے عذاب کا رستہ دکھائے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ نُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ (الحج ٨، ٩)

''اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے متعلق بغیر علم و ہدایت اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتے ہیں اور تکبر سے گردن موڑ لیتے ہیں تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہٹا دے اس کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور قیامت کے دن ہم اسے آگ کا مزا چکھائیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (القصص: ٥٠)

''اور اس سے بڑا گمراہ کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے بے شک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾ (النجم: ٢٣)

''بے شک وہ خواہشات نفس کے پیچھے چل رہے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔''

ان کے علاوہ بھی آیات قرآنیہ اس مضمون پر دلالت کر رہی ہیں۔

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ (۸۱ھ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہدایت کے بعد جو لوگ گمراہ ہوئے ان میں مجادلہ گھس آیا'' اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ [1]

﴿مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا﴾ (الزخرف: ٥٨)

''انھوں نے جو اس (عیسیٰ علیہ السلام) کی مثال تم سے بیان کی ہے تو صرف جھگڑے کو۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام لوگوں سے زیادہ مبغوض جھگڑالو لوگ ہیں''۔ ❷

اس میں کچھ شک نہیں کہ جو شخص فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا؛ اس کی توحید میں کمی آ جاتی ہے اس لیے کہ اس نے اپنی خواہش اور رائے کو اپنا اللہ [معبود] بنالیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کو چھوڑ کر اہل رائے اور خواہشات پرستوں کی بات مانتا ہے۔ اس کے عقیدہ توحید میں اسی قدر کمی آتی ہے جس قدر وہ تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر چلا جاتا ہے۔ بیشک ایسا شخص غیر اللہ کو اپنا معبود بنالیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (الفرقان: ٤٣)

''کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے خواہش نفس کو معبود بنا رکھا ہے۔''

❶ امام ترمذی نے کہا ہے: ''یہ حدیث حسن ہے''۔ (ترمذی ٣٤٨٣) المشکاۃ (١٨٠)، صحیح الترغیب (رقم: ١٣٧).

❷ بخاری (٢٤٥٧)، مسلم (٢٦٦٨).

یعنی اس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم میں فساد پھیلانے والے تین فرقے ہیں۔ چنانچہ امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

رَأَيْتُ الذُّنُوْبَ تُمِيْتُ الْقُلُوْبَ ... وَقَدْ يُوَرِّثُ الذُّلَّ إِدْمَانُهَا

وَتَرْكُ الذُّنُوْبِ حِيَاةُ الْقُلُوْبِ ... وَخَيْرٌ لِنَفْسِكَ عِصْيَانُهَا

وَهَلْ أَفْسَدَ الدِّيْنَ إِلَّا الْمُلُوْكُ ... وَأَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

''ہم نے دیکھا ہے کہ گناہ دلوں کو مردہ کر دیتے ہیں، اور گناہوں پر اصرار ذلت کو جنم دیتا ہے۔ گناہوں کے ترک سے دلوں کو زندگی حاصل ہوتی ہے اور گناہوں کی نافرمانی نفس کے لیے بہتر ہے دین اسلام میں فساد رونما کرنے والے بس بادشاہ، برے عالم اور صوفی ہی تو ہیں۔''

پس ظالم بادشاہ شریعت اسلامیہ کے ساتھ [اپنی ظالم سیاست سے] ٹکراتے ہیں؛ اس سیاست سے شریعت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ترجیح دیتے ہیں''۔ [مدارج السالکین ۲/۷۰]

اور [احبار سوء] برے صوفی وہ علمائے سوء ہیں جو اپنی آراء اور فاسد قیاسات کی وجہ سے شریعت اسلامیہ سے باہر ہو جاتے ہیں۔ پر اپنی آراء مقدم کرتے ہیں جن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محرمات کو حلال گردانتے ہیں مباحات کو حرام ٹھہراتے ہیں۔ جن چیزوں کو شریعت نے لغو قرار دیا ہے؛ اسے معتبر سمجھتے ہیں؛ اور جسے معتبر سمجھنا ہے اسے لغو قرار دیتے ہیں۔ مقید کو مطلق قرار دیتے ہیں اور مطلق کو مقید۔ اور اس طرح کی دیگر حرکات بھی کرتے ہیں۔

درویش [رہبان] وہ جاہل صوفی ہیں جو باطل وجد، حال، اور شیطانی کشف دیگر صوفیاء کی من گھڑت اصطلاحات کو دین کا جزو قرار دیکر ایمان اور شریعت کے حقائق سے روگردانی کرتے ہیں۔ اور شریعت کو ایسا لباس پہناتے ہیں جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں

دی۔اور اسلامی شریعت کو باطل [تبدیل] کر دیتے ہیں؛ جس کو رسول اکرم ﷺ نے پیش کیا تھا۔نتیجتاً وہ ایمانی حقائق کے بجائے شیطانی چالوں اور خواہشاتِ نفس کا شکار ہو جاتے ہیں۔[یہ لوگ شریعت اور کشف وغیرہ کے ٹکراؤ کی صورت میں کشف کو ترجیح دیتے ہیں] جیسا کہ ان کے پہلے کہہ گئے ہیں کہ:''جب سیاست اور شریعت کا ٹکراؤ ہو جائے تو ہم سیاست کو ترجیح دیتے ہیں''۔اور دوسرے علمائے سوء نے یہ کہا:''جب عقل اور نقل کا ٹکراؤ ہو جائے تو ہم عقل کو نقل پر ترجیح دیتے ہیں''۔اور اصحاب ذوق کہتے ہیں:''جب ذوق اور کشف کا ٹکراؤ ظاہر شریعت کے ساتھ ہو جائے تو ہم ذوق اور کشف کو ترجیح دیتے ہیں''۔ [مدارج السالکین ۲/۷۰]

امام غزالی رحمہ اللہ (۴۵۰-۵۰۵ھ) کا قول:......احیاء علوم الدین جو امام غزالی کی جلیل القدر تالیف ہے آپ اس میں (۱/۹۴-۹۷ پر) تحریر فرماتے ہیں کہ:''اگر کوئی شخص دریافت کرے کہ علم جدل اور علم کلام دونوں کا علم نجوم کی طرح حاصل کرنا مذموم ہے یا مباح بلکہ مندوب ہے؟۔

[ہم جواب میں کہیں گے]: جان لینا چاہیے کہ بیشک لوگ اس میں اسراف اور غلو کرتے ہوئے افراط وتفریط کا شکار ہیں۔بعض اس کو بدعت بلکہ حرام ٹھہراتے ہیں؛ اور کہتے ہیں کوئی شخص اگر شرک کے علاوہ دیگر تمام گناہوں کا مرتکب ہے اور اسی حالت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جاتا ہے تو اس حالت میں اس کا جانا بدرجہا بہتر ہے؛ اس سے کہ وہ علم کلام میں مشغولیت اختیار کرتا ہو۔جبکہ بعض لوگ اس کو فرض قرار دیتے ہیں؛ پھر یہ فرض یا تو کفایہ ہے؛ یا پھر فرض عین۔اور اس کو تمام اعمال سے افضل اور تقرب الٰہی کے تمام ذرائع سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔اس لیے کہ علم کلام میں مہارت رکھنے والا توحید کی حقیقت سے باخبر ہوتا ہے؛ اور دین اسلام پر اعتراضات سے مدافعت کرنے کی صلاحیت اس میں بدرجۂ اتم ہوتی ہے۔

امام شافعی، مالک، احمد بن حنبل، سفیان اور اسلاف میں سے تمام ائمہ حدیث رحمہم اللہ اس علم کی تحصیل کو حرام قرار دیتے ہیں۔متقدمین محدثین کا اس پر اتفاق ہے۔اور ان سے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں۔فرمایا:''بے اس مسئلہ پر اہلحدیث کے اسلاف کا اتفاق ہے اور ان سے اس سلسلہ میں جو تشدیدات منقول ہیں؛ یہ کلام انہی تک منحصر ہے۔ان کا کہنا ہے کہ: حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس چیز پر خاموش ہو جائیں؛ جو کہ شریعت کے حقائق سے بخوبی واقف تھے اور جن کا کلام اسلوب اور معانی کے لحاظ سے فصاحت و بلاغت کے میدان میں فائق نظر آتا ہے؛ وہ صرف اس لیے کہ اس علم [یعنی علم کلام سے اجتناب برتتے رہے] کہ اس علم سے شر ہی پھیلتا ہے۔اسی لیے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

((هَلَكَ الْمُتَعَنِّطُونَ)) ❶

''مسائل میں تعمق اور تکلف کے ساتھ بحث کرنے والے ہلاک ہو گئے''۔

نیز علم کلام میں بحث کرنا اگر دین اسلام کی خدمت ہوتا تو رسول اکرم ﷺ نے جن چیزوں کا حکم دیا ہے؛ ان میں سب سے اہم [یہی حکم] ہوتا۔[اور اس کی راہ بتاتے]۔اور اس میں مہارت اختیار کرنے والوں کی تعریف فرماتے۔نیز اس علم کے مقدمات اور نتائج سے پردہ کشائی فرماتے''۔

اس کے بعد امام غزالی رحمہ اللہ متکلمین کے دلائل کا ذکر فرماتے ہیں؛ اس کے ساتھ ہی مخالفین کے دلائل سے ان کا رد کرتے ہیں پھر اپنی رائے کا ذکر کرتے ہیں؛ اگر آپ پوچھیں کہ آپ کے نزدیک مختار رائے کیا ہے؟ تو اس کا تفصیلی جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس علم میں فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ فوائد کو دیکھا جائے تو اس علم کی تحصیل نہ صرف یہ کہ حلال بلکہ مندوب یا واجب ہے؛ جیسے بھی احوال کا تقاضا ہو۔ اور اگر نقصانات کی طرف دیکھا جائے تو پھر ضرر کے وقت اس کا طلب کرنا حرام دکھائی دیتا ہے''۔ پھر فرماتے ہیں: ''اس علم کا نقصان یہ ہے کہ اس میں مہارت حاصل کرنا شکوک وشبہات کو جنم دیتا ہے؛ عقائد میں تزلزل پیدا کرتا ہے؛ اور جزم ویقین کی کیفیت کو ختم کرتا ہے۔ ایسا تو شروع میں ہوجاتا ہے جس سے دلیل کی روشنی میں شکوک وشبہات کا ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ اس میں لوگ مختلف درجات کے ہوتے ہیں۔ حق عقیدہ کی بابت اس کا نقصان یہ ہے۔ جبکہ اس کا دوسرا نقصان بدعتی عقائد کو تقویت ملنا اور ان عقائد کا سینوں میں راسخ ہوجانا ہے۔ اور بدعات کے دواعی اُمڈ آتے ہیں؛ اور اس پر اصرار کی حرص بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اس نقصان کا اصل سبب وہ مذہبی تعصب ہے جو بحث وجدل کے نتیجہ میں سامنے آتا ہے''۔

❶ مسلم، حديث ابن مسعود۔ غاية المرام في تخريج احاديث الحلال والحرام (رقم: ۷).

جہاں تک اس علم کے فوائد کا تعلق ہے؛ تو: ''اس علم سے حقائق سے پردہ کشائی ہوتی ہے ان کی اصل کیفیت کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ہائے افسوس! علم کلام سے اس قدر اعلیٰ واشرف مطالب ومقاصد سے وفا کب ہوسکتی ہے۔ [اور اس قسم کے عمدہ اور مفید نتائج حاصل کہاں حاصل ہوسکتے ہیں]۔ بلکہ شاید جس قدر بعض انکشافات اور معرفت سے ہمکنار ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ گمراہی اور خبط کے قریب پہنچتے ہیں اور مسائل صاف کھلنے کی بجائے الجھ جاتے ہیں''۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں:

''بات یہ ہے کہ جب آپ کسی بدعتی متکلم؛ یا حشوی سے سنیں؛ اور آپ کے ذہن میں یہ بات آئے کہ: ''جس چیز سے لوگ آشنا نہیں ہوتے اس کے دشمن ہوجاتے ہیں'' تو آپ ان سے بھی سنیں جنہوں نے علم کلام حاصل کیا؛ اور اس میں مہارت حاصل کی؛ اور اس میں اس درجہ منہمک ہوگئے کہ متکلمین کے درجہ تک پہنچ گئے۔ اور اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ دوسرے تمام علوم کو چھوڑ کر اس کی گہرائی میں چلے گئے۔ تو پتہ چلا کہ اس علم کے سامنے معرفت کی راہیں بند ہیں۔ میری عمر کی قسم! بعض امور کی وضاحت؛ بعض چیزوں کی تعریف وغیرہ بھی ناممکن ہے؛ مگر نادر طور پر کوئی فائدہ حاصل ہوجائے تو یہ علیحدہ بات ہے''۔ [امام غزالی کا کلام ختم ہوا]

علم کلام کی مذمت:

امام غزالی رحمہ اللہ جیسی نابغہء روزگار ہستیوں کا یہ تبصرہ ایک عظیم اور بلیغ حجت ہے۔ سلف صالحین رحمہم اللہ نے بھی علم کلام کو مذموم قرار دیا ہے؛ لیکن اس لیے نہیں کہ علم کلام صحیح معانی کے برخلاف کوئی جدید اصطلاح ہے؛ جبکہ دیگر صحیح علوم جدیدہ کی اصطلاحات بھی پائی جاتی ہیں؛ اور نہ ان اصطلاحات کی وجہ سے ہم مذموم سمجھتے ہیں۔ نہ اس لیے کہ علم کلام بھی حق کی راہنمائی کرتا ہے اور باطل پرست لوگوں کے ساتھ محاذ آرائی اختیار کرتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ یہ علم ایسے جھوٹے قضایا پر مشتمل ہے جو حق کے خلاف ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان علوم کو تسلیم کرنے سے کتاب وسنت اور ان میں مذکورہ علوم صحیحہ کی مخالفت لازم آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ متکلمین کو اس علم کی تدوین میں دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرنا پڑا ہے پھر اس علم کو ثابت کرنے کے لیے طویل طویل بحثیں ہیں۔ حالانکہ ان کا فائدہ بہت ہی کم ہے۔ اس علم کی مثال تو یوں ہے جیسے کسی دشوار گزار پہاڑ کی چوٹی پر کسی لاغر اونٹ کا گوشت رکھا ہوا ہے اب نہ تو راستہ آسان ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر آسانی سے پہنچا جائے نہ گوشت ہی اتنا عمدہ ہے کہ اس کی عمدگی کی وجہ سے مشکل راہ عبور کرکے اسے حاصل کیا جائے۔ اگر اس

علم میں کچھ صحیح چیزیں بھی موجود ہیں تو وہ چیزیں قرآن پاک میں نہایت عمدہ پیرایہ میں مذکور ہیں۔

اس علم کی مذمت میں کہا گیا ہے:

لو لا التنافس فی الدنیا لما وضعت　　　　كتب التناظر لا المغنی ولا العمد

یحللون بزعمهم عقدا　　　　وبالذی وضعوه زادت العقد

''اگر دنیا کے لوگوں میں مسابقت اور منافست کا جذبہ نہ ہوتا تو المغنی اور العمد مناظرہ کی کتب مدوّن نہ ہوتیں کتابیں وضع کرنے والے اس زعم میں ہوتے ہیں کہ وہ کسی گرہ کو کھول رہے ہیں جب کہ ان کے وضع کرنے سے مزید گرہیں پیدا ہوئی ہیں۔''

وہ سمجھتے ہیں ہم نے علم کلام پیش کر کے شکوک وشبہات کا ازالہ کر دیا ہے۔ جبکہ اہل علم وفضل خوب جانتے ہیں کہ اس علم نے مزید شکوک وشبہات پیدا کیے ہیں۔ پھر یہ تو بالکل محال ہے کہ کتاب اللہ تعالیٰ اور حدیث رسول ﷺ سے تو شفاء؛ اور علم ویقین کی دولت حاصل نہ ہو؛ لیکن ان حیران وسرگرداں لوگوں کے کلام سے شفاء مل جائے''۔[إغاثة اللفهان ۱/ ۷٤]

بلکہ واجب تو یہ تھا کہ قال الله اور قال الرسول کو اصل قرار دیا جاتا؛ اس کے معانی پر تدبر کیا جاتا؛ اسے سمجھا جاتا؛ اس کے پیش کردہ دلائل کا تجزیہ کیا جاتا عقلی، خبری، سمعی براہین کی معرفت حاصل کی جاتی۔ پھر ان کے مختلف مدلولات کو دیکھا جاتا؛ لوگوں کے اقوال سے ان کا تقابل کیا جاتا اگر لوگوں کے اقوال ان مدلولات کے موافق یا مخالف ہوتے تو انھیں مجمل یا متشابہ قرار دیا جاتا۔ ان اہل اقوال سے کہا جاتا: اس قول میں یہ احتمال پایا جاتا ہے۔ اگر ان کی مراد حدیث رسول اللہ ﷺ کے موافق ہوتی تو اسے قبول کیا جاتا؛ اور اگر مراد اس کے مخالف ہوتی تو رد کر دیا جاتا۔

اصطلاحات متکلمین:

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے لفظ مرکب، جسم، تحیز جوہر، جہت، حیز، عرض وغیرہ کی اصطلاحات۔ یہ لوگ ان الفاظ سے جو معانی مراد لیتے ہیں ان معانی میں یہ الفاظ کتاب وسنت میں استعمال نہیں ہیں بلکہ لغت عرب میں بھی استعمال نہیں ہیں۔ اور ان الفاظ سے جو معانی لیے جا رہے ہیں غالباً ان کے علاوہ کسی دوسرے علم وفن میں ان کے یہ معانی نہیں ہیں ان میں ان معانی کو دیگر الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس علم کے مقابلہ میں جب ہم قرآن پاک کے عقلی، سمعی دلائل پر غور کرتے ہیں اور پیش آمدہ مسائل میں راہنمائی چاہتے ہیں تو تمام گرہیں کھل جاتی ہیں حق وباطل میں امتیاز ہو جاتا ہے کوئی اشکال باقی نہیں رہتا''۔[مجموع ۱۳/ ۱٤٥]

اس کی ایک مثال لفظ ترکیب سے لیتے ہیں؛ یہ لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے:

پہلا معنی :......اگر دو یا دو سے زائد متبائن چیزوں سے مرکب ہے تو اس کو ترکیب امتزاجی کہتے ہیں جیسے حیوان عناصر اربعہ اور اعضاء وغیرہ سے مرکب ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر لفظ ترکیب کا اطلاق نہیں ہوتا اگرچہ اللہ تعالیٰ علو اور دیگر صفات کیساتھ موصوف ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کو مرکب کہا جائے۔

دوسرا معنی :......ترکیب الجوار کا ہے جیسے دروازہ اور چوکھٹ۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے لیے صفات کمال کو ثابت ماننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں ترکیب الجوار موجود ہو۔

تیسرا معنی :......متماثل اجزاء سے مرکب ہو اس کا نام الجواہر المفردہ رکھا جاتا ہے۔

چوتھا معنی :......ہیولی اور صورت سے مرکب ہونا۔ جیسے انگوٹھی؛ اس میں چاندی ہیولیٰ ہے اس کی صورت معروف ہے۔ متکلمین جسم کو جواہر مفردہ سے مرکب مانتے ہیں اور اس کے ضمن میں طویل کلام کیا ہے جس میں درحقیقت کوئی فائدہ نہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: کیا وہ دو اجزاء یا چار یا چھ یا آٹھ یا سولہ سے مرکب ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ مرکب نہیں۔ اللہ تعالیٰ تو اپنی صفات اور علو کی وجہ سے مخلوق سے الگ ہے۔ پھر حق بات تو یہ ہے کہ جسم بھی ان اشیاء سے مرکب نہیں ہوتا۔ متکلمین کا قول صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اور یہ مسئلہ اپنی جگہ تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

پانچواں معنی :......ذات وصفات سے مرکب ہوتا ہے۔ وہ اس کو ترکیب اس لیے کہتے ہیں تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کر سکیں۔ یہ ان کی ایسی اصطلاح ہے جو نہ لغت میں معروف ہے نہ اسے شارع نے استعمال کیا ہے۔ لہٰذا ہم یہ نام دینے میں ان کی موافقت کو پسند نہیں کرتے۔ اور نہ ہی اس میں کوئی کرامت اور عزت کی بات ہے۔ اگر وہ صفات کے اثبات کو ترکیب کا نام دیتے ہیں تو ہم ان سے کہتے ہیں کہ: ''اعتبار معانی کا ہوتا ہے الفاظ کا نہیں ہوتا۔ جو چاہو کسی کا نام رکھ لو۔ معانی کے بغیر کسی نام پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ مثلاً اگر دودھ کا نام شراب رکھ دیا جائے تو دودھ حرام نہیں ہو جائے گا۔

چھٹا معنی :......ماہیت اور اس کے وجود سے مرکب ہو۔ ذہن ثابت کرتا ہے کہ یہ دونوں الگ چیزیں ہیں؛ لیکن خارج میں کیا کسی ذات کا وجود سے مجرد ہونا؛ یا وجود کا ذات کے بغیر ہونا ممکن ہے؟ یہ تو بالکل محال ہے۔ پس متکلمین کہتے ہیں: کیا اللہ تعالیٰ کی ذات اس کا وجود ہے یا اس کے وجود کا غیر ہے؟۔ اس مسئلہ میں متکلمین حواس باختہ ہیں جب کہ اس مسئلہ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ توقف اختیار کیا جائے؛ شک وشبہ میں نہ پڑا جائے۔ جب کہ عام مسائل میں تفصیل اور وضاحت سے غلط باتوں کی نشاندہی ہوتی ہے اور باطل کی قلعی کھل جاتی ہے۔

گمراہی کا اصل سبب:

ان لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کلام پر تدبر سے روگردانی کرنا ہے۔ بس ان کا سرمایۂ فلسفۂ یونان اور پریشان افکار میں لگے رہنا ہے۔ ان کو اہل کلام [یعنی گپی لوگ] کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ انھوں نے [ان] علوم سے کوئی ایسا فائدہ نہیں اٹھایا جو پہلے سے معروف نہ تھا۔ بلکہ اس لیے کہ بے فائدہ کلام کا اضافہ کیا۔ یہ لوگ اس کی وضاحت کے لیے قیاس سے جو مثالیں پیش کرتے ہیں؛ وہ احساسات سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔ اگرچہ بعض صورتوں میں اس قیاس اور اس امثال کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا؛ یہ ان کے ساتھ بھی نفع بخش ہیں جو محسوسات کا انکار کرتے ہیں۔ پر ہر وہ انسان جو نص کی موجودگی میں اپنی رائے؛ ذوق یا سیاست کو دخل دیتا ہے یا جو لوگ نص کا معقول سے معارضہ کرتے ہیں؛ [نص کے مقابلہ میں اپنی رائے اور اپنے فہم پیش کرتے ہیں] وہ ابلیس کے ہمنوا اور پیروکار ہیں اس نے بھی اپنے رب کے حکم کو تسلیم نہ کیا تھا؛ اللہ تعالیٰ اس کا قول نقل فرماتے ہیں:

﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۝﴾ (الاعراف: ۱۲)

''میں اس شخص سے افضل ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے۔''

ارشاد ربانی ہے:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا﴾ (النساء: ۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی یقیناً اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے منہ موڑ لیا؛ تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آل عمران: ۳۱)

''اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تعالیٰ بھی تمھیں دوست رکھے گا اور تمھارے گناہ بھی معاف کر دے گا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (النساء: ٦٥)

''آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمھیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان نہ لیں؛ تب تک مومن نہیں ہوں گے۔''

یاد رہے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم اٹھا کر فرمایا ہے کہ: ''یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے نبی ﷺ کو حاکم نہیں مانتے اور آپ کے فیصلوں پر رضا مندی کا اظہار نہیں کرتے اور سر تسلیم خم نہیں ہو جاتے''۔

علم کلام کا انجام:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''......علم کلام کا قائل کفر، ایمان تصدیق، تکذیب اور اقرار، انکار کے مابین مذبذب رہتا ہے وسوسوں میں مبتلا رہتا ہے؛ حیرانگی اور شکوک وشبہات کی زندگی بسر کرتا ہے وہ نہ سچی تصدیق کرنے والا مومن تو ہوتا ہے اور نہ ہی جھٹلانے والا منکر؛ اس میں انکار تو ہوتا ہے لیکن بظاہر تکذیب نہیں کرتا''۔

تشریح: امام طحاوی رحمہ اللہ نے یہ جو حالت بیان کی ہے؛ یہ ان تمام لوگوں کا حال ہے جو کتاب وسنت سے روگردانی کر کے علم کلام کی جانب رجحان رکھتے ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ کتاب وسنت اور علم کلام دونوں کو یکجا کر کے تعارض کے وقت نص میں تاویل کر کے اپنی رائے یا دیگر مختلف آراء کی طرف لوٹائیں۔ اس کا نتیجہ حیرانگی؛ گمراہی اور شکوک وشبہات کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس رائے کا اظہار ابن رشد الحفید (۵۲۰-۵۹۵ھ) کرتا ہے جو فلاسفہ کے مذاہب اور ان کے عقائد کا خوب واقف ہے۔ اور جس نے تهافت التهافة (ص ۸۸) میں فلاسفہ پر مقالے تحریر کیے ہیں اور جس نے الٰہیات میں قابل ذکر عمدہ اصول ذکر کیے ہیں۔ ایسے ہی علامہ آمدی رحمۃ اللہ علیہ (۵۵۱-۶۳۱ھ) جو اپنے دور کا بہت بڑا فلسفی تھا؛ ہم دیکھتے ہیں وہ بھی علم کلام کے مسائل کلامیہ میں

حیران وسرگرداں دکھائی دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح امام غزالی رحمہ اللہ (۴۵۰-۵۰۵ھ) عمر کے آخری حصہ میں علم کلام کے مسائل میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتے۔ بلکہ توقف اختیار کرتے ہیں۔ پھر ان سب مسائل سے اعراض کرتے ہیں ان کی مکمل توجہ احادیث رسول کی طرف ہو جاتی ہے چنانچہ جب وہ فوت ہوئے تو بخاری شریف ان کے سینہ پر تھی اسی طرح امام ابوعبداللہ تعالیٰ محمد بن عمر رازی رحمہ اللہ (۵۴۴-۶۰۶ھ) اقسام اللذات میں رقم طراز ہیں۔

نهاية اقدام العقول عقال — وغاية سعى العالمين ضلال
وارواحنا فى وحشة من جسومنا — وحاصل دنيانا اذى و وبال
ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا — سوى ان جمعنا فيه قيل وقالوا
فكم قد رأينا من رجال و دولة — فبادوا جميعا مسرعين وزالو
وكم من جبال قد علت شرفا تها — رجال فزالوا والجبال جبال

''عقل کی آخری منزل رک جانا ہے اور عالمین کی آخری کوشش گمراہی ہے ہمارے جسموں سے ہماری روحیں وحشت میں ہیں اور ہماری دنیا کا حاصل رنج ومحن ہے لمبی عمر ہم نے بحث وتمحیص میں گزار دی لیکن سوائے قیل وقال جمع کرنے کے ہم نے کچھ کام نہ کیا ہم نے کثرت کے ساتھ حکمرانوں کو دیکھا کہ وہ تمام سرعت رفتاری کے ساتھ تباہ وبرباد ہوگئے اور فنا ہوگئے لیکن کتنے ایسے پہاڑ ہیں جن کی چوٹیوں کو لوگوں نے سر کیا۔ سر کرنے والے تو ختم ہوگئے لیکن پہاڑ اپنی جگہ پر قائم ہیں۔''

میں نے متکلمین کے انداز اور فلاسفہ کے طریقہء کار پر غور کیا؛ لیکن میں نے نہیں دیکھا کہ اس سے کوئی بیمار شفایاب ہو سکتا ہو اور یا کسی کی علمی پیاس بجھ سکتی ہو؛ میں نے دیکھا کہ سمجھنے کے لیے مختصر [اور آسان] راستہ تو قرآن کا راستہ ہے۔

[میں نے صفات کے اثبات میں] اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھتا ہوں:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰىo﴾ (طٰهٰ: ۵)

''اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا۔''

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (فاطر: ۱۰)

''اسی کی جانب پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔''

اور تمثیل [صفات] کی نفی میں پڑھتا ہوں [فرمایا]:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًاo﴾ (طٰهٰ: ۱۱۰)

''اور وہ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

اس کے بعد فرماتے ہیں: ''جس شخص کو میرے جیسا تجربہ حاصل ہوا اسے میرے جیسی معرفت حاصل ہوگی۔

انہی خیالات کا اظہار شیخ ابوعبداللہ تعالیٰ محمد بن عبدالکریم شہرستانی رحمہ اللہ (۴۷۰-۵۴۸ھ) کرتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں کہ: ''فلاسفہ اور متکلمین کی مجلس سے تو سوائے حیرانگی اور ندامت کے کچھ نہیں ملا''۔ نیز ان کے اشعار ہیں:

لعمری لقد طفت المعاهد کلها وسیرت طرفی بین تلك المعالم

فلم ار الا واضعاً کف حائر علی ذقن اوقارعاً سن نادم

''مجھے اپنی زندگی کی قسم! میں تمام مدارس میں گھومتا پھرتا رہا اور میں نے اپنی نگاہ کو تمام بڑے بڑے علمی اداروں میں متحرک رکھا میں نے صرف یہ دیکھا کہ اہل علم تحیر و درماندگی کے عالم میں اپنی ٹھوڑی پر ہتھیلی رکھے ہوئے ہیں یا پشیمانی کے عالم میں دانت پیس رہے ہیں۔''

امام ابوالمعالی جوینی رحمہ اللہ کا قول:

مرے ساتھیو! علم کلام کے ساتھ مشغولیت اختیار نہ رکھو اگر مجھے علم ہوتا کہ علم کلام مجھے یہاں تک پہنچا دے گا جہاں اب میں ہوں؛ تو میں کبھی اس کے ساتھ مشغولیت اختیار نہ کرتا''۔ انہوں نے بوقت مرگ کہا: ''میں گہرے سمندر میں غوطہ زن ہوا میں نے اہل اسلام اور ان کے علوم کو خیر باد کہا؛ اور اس علم میں مشغول ہو گیا جس سے انھوں نے مجھے روکا تھا۔ اب اگر اس وقت مجھے اللہ تعالیٰ اپنے رحمت نہ بچایا تو ابن جوینی کے لیے بربادی ہے''۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ اب اس وقت میں اپنی والدہ کے عقیدہ پر یا نیشاپور کی بوڑھی عورتوں کے عقیدہ پر فوت ہو رہا ہوں''۔

شمس الدین خسروشاہی رحمہ اللہ کا قول:

[شمس الدین خسروشاہی رحمہ اللہ (۵۸۰-۶۵۲ھ)] امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کے جلیل القدر تلامذہ سے ہیں۔ ان کے ہاں ان کے ایک فاضل دوست آئے انھوں نے ان سے ان کے عقیدہ کے بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے جواباً کہا: ''میرا عقیدہ وہی ہے جو عام مسلمانوں کا ہے''۔ انھوں نے دریافت کیا

:''اس عقیدہ پر آپ کو انشراح صدر ہے؟۔ اور یقین کی کیفیت موجود ہے؟''۔ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔

تو امام خسروشاہی رحمہ اللہ نے ایسی نعمت کے حصول پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور کہا: ''لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کی قسم کچھ علم نہیں کہ میرا عقیدہ کیا ہے؟ لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کی قسم کچھ علم نہیں کہ میرا عقیدہ کیا ہے؟ لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کی قسم کچھ علم نہیں کہ میرا عقیدہ کیا ہے؟ [تین بار یہی کلمات دہرائے]''۔ یہاں تک کہ آنسوؤں سے ریش مبارک بھیگ گئی۔

عراق کے مشہور عالم ابن ابی الحدید رحمہ اللہ:

[ابن ابی الحدید ۵۸۶-۶۵۶ھ]؛ آپ کے اشعار ہیں:

فيك يا اغلوطة الفكر حار امرى وانقضىٰ عمرى
سافرت فيك العقول فما ربحت إلا اذى السفر
فلحى الله تعالىٰ الا ولى زعموا انك المعروف بالنظر
كذبوا ان الذى ذكروا خارج عن قوة البشر

''اے غلط فکر تیری وجہ سے مجھے حیرانی ہے اب میری عمر بھی ختم ہو رہی ہے۔ عقل نے تیرے بارے میں سوچا لیکن عقل کو سوائے سوچ کی تکلیف کے کچھ حاصل نہ ہوا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو برباد کرے جن کا خیال یہ ہے کہ تیرا فکر صحیح ہے وہ جھوٹ کہتے ہیں وہ جس چیز کا ذکر کرتے ہیں وہ انسانی قوت سے باہر ہے۔''

خونجی رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

[۵۹۰-۶۴۶ھ]؛ جب موت کا قریب آیا تو کہنے لگے:

''میں زندگی بھر فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتا رہا لیکن مجھے اس سے زیادہ کچھ حاصل نہ ہو سکا کہ ممکن کسی مرجح کا محتاج ہے۔ اور احتیاج سلبی وصف ہے۔ اب میں فوت ہو رہا ہوں لیکن میں علم سے بے بہرہ ہوں''۔

اسی قسم کے خیالات کا اظہار ایک دوسرا فلسفی کرتا ہے وہ کہتا ہے:

''میں اپنے بستر پر جب لیٹتا ہوں اور اپنے چہرے کو لحاف سے ڈھانپتا ہوں تو میں فلاسفہ کے مختلف دلائل کے تقابل میں مصروف رہتا ہوں یہاں تک کہ صبح صادق نمودار ہو جاتی ہے اور میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پاتا۔ پس حقیقت یہ ہے جو شخص فلسفۂ علم کلام میں اس حد تک مستغرق ہے اگر اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمت سایہ افگن نہ ہو تو وہ زندیق ہو جاتا ہے''۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

''جو شخص علم کلام میں دین اسلام کو طلب کرتا ہے وہ زندیق ہے اور جو شخص کیمیا گری اس لیے اختیار کرتا ہے کہ اسے مال مل جائے وہ مفلس ہے اور جو شخص غریب حدیثوں کو طلب کرتا ہے وہ جھوٹا ہے''۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

علم کلام والوں کے بارے میں میرا فیصلہ یہ ہے کہ ان پر کوڑے برسائے جائیں انھیں جوتے لگائے جائیں اور ان کی آبادیوں میں پھرایا جائے اور منادی کی جائے اس شخص کا یہ حال ہوگا جو کتاب وسنت چھوڑ کر علم کلام میں دلچسپی لے۔

نیز وہ فرماتے ہیں: مجھے علم کلام والوں سے ایسی باتوں کے سننے اتفاق ہوا ہے میرا خیال نہیں کہ کسی مسلمان کی زبان سے اس قسم کی باتیں نکل سکتی ہیں۔ نیز اگر کوئی شخص شرک کے ماسوا تمام گناہوں میں مبتلا ہو بہتر ہے اس سے کہ وہ علم کلام میں مشغولیت رکھتا ہو۔

ان مذکورہ اقوال پر غور وفکر کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ متکلمین میں سے کچھ لوگ موت کے وقت اقرار کرتے ہیں کہ ان کا وہی عقیدہ

ہے جو بوڑھی عورتوں کا ہے گویا کہ وہ عمر کے آخری حصہ میں فلسفیانہ موشگافیوں سے اعراض کرتے ہیں جن میں وہ زندگی بھر مصروف رہے اب انھیں معلوم ہوا کہ وہ خیالات درست نہ تھے اب عذاب باری تعالیٰ سے بچاؤ کی راہ اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو بچوں، بوڑھی عورتوں، جنگلیوں کی صف میں کررہے ہیں جو اہل علم کی اتباع کرتے ہیں۔

علم کلام کی بیماری کا علاج:

اس بیماری کو دور کرنے کے لیے وہی نفع بخش علاج تجویز کیا جائے جو دلوں کے طبیب رسول اکرم ﷺ نے تجویز فرمایا ہے۔ جب آپ رات کو اٹھتے؛ نوافل ادا کرتے اور ذیل کی دعا کے ساتھ نماز کا افتتاح فرماتے:

((اَللّٰھُمَّ رَبَّ جِبْرَآئِیْلَ وَمِیْکَائِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَةِ اَنْتَ تَحْکُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ اِھْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَھْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ .))[1]

[1] صحیح مسلم ۷۷۔ اس حدیث کو ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں بیان کیا۔

''اے اللہ! اے جبرائیل اور میکائیل اور اسرافیل کے رب! پیدا کرنے والے آسمانوں اور زمین کے! جاننے والے چھپی اور ظاہر باتوں کے تو ہی فیصلہ کریگا، اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کا جس میں اختلاف کرتے رہے تھے، ہدایت دے مجھے، حق کی ان باتوں میں جن میں اختلاف ہوگیا ہے اپنے حکم کیساتھ یقیناً تو ہی ہدایت دیتا ہے جسے چاہے صراط مستقیم کی طرف''۔

اس دعا میں رسول اکرم ﷺ اپنے رب کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے جبریل، میکائل اسرافیل کا رب ہونے کا ذکر فرماتے ہیں ؛اور اختلافی مسائل میں اس کے حکم سے صحیح راہ کی ہدایت کا سوال کرتے ہیں۔اس لیے کہ دلوں کی زندگی ہدایت کے ساتھ ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے ان تینوں فرشتوں کی ذمہ داری زندگی سے متعلق مختلف کاموں پر لگا رکھی ہے۔

حضرت جبریل علیہ السلام وحی کے ذمہ دار ہیں جس سے دلوں کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت میکائیل علیہ السلام بارش پر مقرر ہیں جس سے ابدان اور تمام حیوانات کو زندگی ملتی ہے۔

حضرت اسرافیل علیہ السلام کا کام صور پھونکنا ہے؛ جس سے تمام عالم کو زندگی ملے گی اور ارواح اجسام میں لوٹ آئیں گی۔

پس اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان ارواح عظیمہ کی ربوبیت کا وسیلہ لے جانا؛ جن کا بہر صورت زندگی کے ساتھ تعلق ہے؛ مطلوب کے حصول میں بہت بڑا موثر ہے''۔و اللہ تعالیٰ المستعان۔[زاد المعاد ٤/ ٢٠٥]

جنت میں دیدار الٰہی

۳۷۔((وَلَا يَصِحُّ الْإِيمَانُ بِالرُّؤْيَةِ لِأَهْلِ دَارِ السَّلَامِ لِمَنِ اعْتَبَرَهَا مِنْهُمْ بِوَهْمٍ ❶ أَوْ تَأَوَّلَهَا بِفَهْمٍ ❷ ، إِذْ كَانَ تَأْوِيلُ الرُّؤْيَةِ وَتَأْوِيلُ كُلِّ مَعْنًى يُضَافُ إِلَى الرُّبُوبِيَّةِ بِتَرْكِ التَّأْوِيلِ وَلُزُومِ التَّسْلِيمِ ، وَعَلَيْهِ دِينُ الْمُسْلِمِينَ ، وَمَنْ لَّمْ يَتَوَقَّ النَّفْيَ وَالتَّشْبِيهَ ، زَلَّ وَلَمْ يُصِبِ التَّنْزِيهَ ❸ . فَإِنَّ رَبَّنَا جَلَّ وَعَلَا مَوْصُوفٌ بِصِفَاتِ الْوَحْدَانِيَّةِ ، مَنْعُوتٌ بِنُعُوتِ الْفَرْدَانِيَّةِ ، لَيْسَ فِي مَعْنَاهُ أَحَدٌ مِنَ الْبَرِيَّةِ))

❶ ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''وہم سمجھتا ہے''۔یعنی جو کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ ''بیشک اللہ تعالیٰ اس حالت میں نظر آئیں گے'' اور وہ اس کو تشبیہ گمان کرتا ہے۔[شرح عقيدة الطحاوية]

دراصل ان جملوں میں سابقہ پیرائے کی تاکید و تائید ہے: ''ہم اپنی تأویل یا آراء سے دخل اندازی نہیں کرتے''۔اس جملہ یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی رؤیت کو ظاہر نصوص کے خلاف پر ثابت کرتا ہے؛ یا ان کی کیفیت کو وہم خیال کرتا ہے؛ یا اپنے فہم سے اس میں تأویل کرتا ہے جیسے رؤیت کے منکرین معطلہ کرتے ہیں؛ تو اس کا اللہ تعالیٰ کے دیدار پر ایمان درست نہیں۔صراط مستقیم اور منہج قویم تأویل اور ذاتی فہم کی دخل اندازی کو ترک کرنا ہے۔

❷ ۔امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''...... یا اس کی تاویل فہم کے ساتھ کرتا ہے''۔یعنی یہ دعوی کرے کہ اسے اس کی ایسی تاویل سمجھ میں آئی ہے جو اس کے ظاہر کے خلاف ہے؛ اور ہر عربی اس کا معنی نہیں سمجھ سکتا۔

❸ ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: منکرین دیدار الٰہی معتزلہ اور دیگر لوگ اپنے تئیں ان صفات کی نفی تشبیہ سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان کرنے کے لیے کرتے ہیں؛ یہ بہت بڑی گمراہی اور کجی اور خلل ہے۔یہ تنزیہ کیسے ممکن ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ سے صفات کمال کی نفی کرتے ہیں۔اور ان ہی صفات کمال میں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی ہی۔کیونکہ معدوم کو نہیں دیکھا جا سکتا۔کمال تو رؤیت کے اثبات میں جو کہ کتاب وسنت سے ثابت ہے۔مشبہ کی گمراہی کی وجہ اثبات صفات میں غلو کرنا اور خالق کو مخلوق سے تشبیہ دینا تھا۔جب کہ حق ان دونوں گروہوں کے درمیان میں ہے؛ یعنی بغیر تشبیہ کے ثابت کرنا اور بغیر تعطیل کے تنزیہ بیان کرنا۔اور کتنی ہی بہترین بات کہی گئی ہے: معطل عدم کا پجاری ہے؛ اور مجسم صنم کا پجاری ہے۔

''......اہل جنت کے لیے اللہ تعالیٰ کی رؤیت پر ایمان درست نہیں ہوسکتا جو کوئی اس کو وہم سمجھتا ہے یا اس کی تأویل فہم کے ساتھ کرتا ہے۔اس لیے کہ رؤیت کی تاویل اور دیگر ان تمام معانی کی تاویل جن کی اضافت ربوبیت کی طرف ہے؛ ان کی تاویل کو ترک کرنا اور ان کو بلا چوں و چراں تسلیم کرنا ہی مسلمانوں کا دین [عقیدہ] ہے۔اور جو شخص ان معانی میں نفی اور تشبیہ سے نہ بچا وہ پھسل گیا اور تنزیہ تک نہ پہنچ سکا۔بلاشبہ ہمارا رب بزرگ و برتر ہے وہ وحدانیت کی صفات سے موصوف ہے نیز فردانیت کی صفات کے ساتھ بھی موصوف ہے مخلوق کا کوئی فرد اس کے معنی میں نہیں ہے''۔

تشریح: امام طحاوی رحمہ اللہ معتزلہ اور ان کے ہم خیال فرقوں کی تردید کرتے ہیں جو رؤیت کی نفی کرتے ہیں اور ان پر رد ہے اللہ تعالیٰ کو مخلوقات میں سے کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جس طرح چودھویں کی رات چاند کو دیکھتے ہو''۔ ❶

❀ حدیث میں ''کما ترون'' میں؛ کاف تشبیہ ما مصدریہ موصولہ پر داخل کیا گیا ہے؛ جس سے فعل مصدر کے معنی میں ہو گیا ہے۔یعنی

تشبیہ رؤیت میں ہے مرئی میں نہیں۔ یہ انتہائی صاف اور واضح ہے کہ مراد رؤیت کا اثبات اور اس کی تحقیق ہے۔ اور دیگر احتمالات کو ختم کرنا ہے؛ پس اس کے بعد کون سا بیان اور کون سی وضاحت ہوگی؟۔ اگر ایسی نص پر تاویل مسلط کر دی جائے تو پھر کوئی نص استدلال کے قابل نہ رہے گی۔ اور کیا اس نص میں یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ اس نص کا بھی معنی یہ ہو کہ: ''تم اپنے رب کو بھی ایسے ہی جان لو گے؛ ہو جیسے چودھویں کے چاند کو جانتے ہو''۔ اور پھر اس فاسد تاویل پر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا جاتا ہے:

❶ بخاري، مسلم، ظلال الجنة (٤٤٦، ٤٥١، ٤٦١).

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ﴾ (الفيل: ١)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔''

اور اس جیسی دوسری نصوص جن میں (رَأَی) افعال قلوب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ (تَــرَأَی) بالمقابل دیکھنا؛ کبھی بصری ہوتا ہے؛ اور کبھی قلبی۔ اور کبھی خواب دیکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر معانی بھی ہیں؛ لیکن ایسے قرآئن سے خالی نہیں ہوتا جن کی وجہ سے ایک معنی متعین ہو جاتا ہو۔ اگر متکلم کلام کو ایک معنی متعین کرنے کے قرائن سے خالی چھوڑ دے؛ تو کلام میں اجمال اور ابہام ہوتا ہے؛ وضاحت مفقود ہوتی ہے۔ لیکن مذکورہ حدیث میں وضاحت موجود ہے اس سے بڑھ کر اور کون سا قرینہ ہوگا کہ حدیث میں ہے:

((إِنَّكُمْ تَرَونَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ الشَّمْسَ فِي الظَّهِيْرَةِ لَيْسَ دُوْنَهَا سِحَابٌ .))

''بیشک تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے تم دوپہر کے وقت سورج کو دیکھتے ہو؛ اور بادل بھی نہ ہوں''۔

تو اب کیا اس رؤیت سے مراد رؤیت بصری ہے؟ یا رؤیت قلبی؟ اور کیا یہ معنی اس شخص کے علاوہ کسی پر مخفی رہ سکتا ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے نابینا کر دیا ہو؟۔

معتزلہ کا سوال اور اس کا جواب:

اگر [معتزلہ] کہیں: ''ہم نے یہ تأویل عقل کے ہاتھوں مجبوراً اس وجہ سے کی ہے؛ چونکہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت محال ہے؛ اس کے امکان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

[جواب]: یہ صرف تمھارا دعویٰ ہے؛ اکثر عقلمند اس میں تمھارے مخالف ہیں؛ اور عقل اس کو محال نہیں سمجھتی۔ بلکہ اگر عقل پر پیش کیا جائے کہ ایک موجود بذات خود قائم ہے؛ لیکن اس کو دیکھا جانا ممکن نہیں تو عقل کا فیصلہ ہوگا دیکھے جانے کا ممکن نہ ہونا محال ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''......اور جو کوئی اس کو وہم خیال کرتا ہے''۔ یعنی جو کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ ''بیشک اللہ تعالیٰ اس حالت میں نظر آئیں گے'' اور وہ اس کو تشبیہ گمان کرتا ہے؛ پھر اس وہم کے بعد وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر اس نے اسے ثابت مانا تو وہ مشبہ میں شمار ہوگا۔ اور اگر رؤیت کے انکار کی اصل وجہ یہ وہم اور خیال ہے؛ تو ایسا انسان منکر اور معطل ہے۔ بلکہ واجب یہ ہے کہ انسان صرف اکیلے اس گمان کو ختم کرے۔ اس نفی کو حق اور باطل کے لیے عام نہ کر دے کہ باطل ثابت کرنے والوں کی نفی میں ان دونوں کی ہی نفی کر دے۔ بلکہ واجب یہ ہوتا ہے کہ حق کو ثابت کرے اور باطل کو رد کرے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے اپنے اس قول میں اسی جانب اشارہ کیا ہے: ''اور جو کوئی نفی اور تشبیہ سے نہ بچا؛ [اور وہ سیدھی راہ سے] بھٹک گیا اور اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کو نہ پاسکا۔''

بے شک معتزلہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان کرتے ہیں۔لیکن کیا اوصافِ کمال کی نفی کرنا تنزیہ [منزہ قرار دینا] ہے؟ رؤیت کی نفی تو کمال کی صفت نہیں۔ اس لیے کہ معدوم کو دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ صفت کمال تو رؤیت کے اثبات اور دیکھنے والے کے ادراک کی نفی میں ہے؛ یعنی ایسا ادراک جو اس کا احاطہ کر سکے۔ جیسا کہ علم کے مسئلہ میں ہے؛ اللہ تعالیٰ سے علم کی نفی میں کوئی کمال نہیں؛ بیشک کمال تو علم کے اثبات میں؛ اور علم سے اس کا احاطہ کرنے کی نفی میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا احاطہ نہ تو رؤیت میں کیا جا سکتا ہے نہ ہی علم میں ہوسکتا ہے۔

تاویل کے معانی:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''...... یا اس کی تاویل فہم کے ساتھ کرتا ہے''۔ یعنی یہ دعوی کرے کہ اسے اس کی ایسی تاویل سمجھ میں آئی ہے جو اس کے ظاہر کے خلاف ہے؛ اور جو معنی ہر عربی سمجھ سکتا ہے۔ بیشک اب متأخرین کی اصطلاح میں تاویل ان ہی معانی میں ہے کہ لفظ کو اس کے ظاہری معنی سے بدل لیا جائے۔ اور یوں اہل تحریف نے نصوص پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ برملا کہتے ہیں: ''ہم ان نصوص کی تاویل کریں گے جو ہمارے اقوال کے مخالف ہوں گی''۔ اس طرح انھوں نے تحریف کا نام تاویل رکھا تاکہ اس کی تزئین و آرائش کر کے قابل قبول بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو باطل کو خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ (الانعام: ۱۱۲)

''اور اسی طرح ہم نے شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنایا تھا وہ دھوکہ دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی ہوئی باتیں ڈالتے رہتے تھے۔''

حالانکہ اعتبار معانی کا ہوتا ہے الفاظ کا نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کتنے باطل نظریات ہیں جن کے اثبات میں بظاہر مزین دلائل پیش کیے گئے ہیں جن سے حق کا معارضہ کیا گیا ہے۔ یہاں پر مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اس کے سابقہ کلام کی طرح ہے: ''اس بارے میں ہم اپنی رائے کو دخل دے کر تاویلات نہیں کریں گے اور نہ ہی اپنی خواہشات سے وہم و گمان کا عمل دخل کریں گے''۔ پھر ان معانی کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''رؤیت اور دیگر ان تمام معانی کی تاویل جن کی اضافت ربوبیت کی طرف ہے؛ ان کی تاویل کو ترک کرنا اور ان کو بلا چوں و چراں تسلیم کرنا ہی مسلمانوں کا دین [عقیدہ] ہے''۔

[یہاں پر] ترک تأویل سے مراد وہ ہے جسے یہ لوگ تأویل کا نام دیتے ہیں؛ حقیقت میں وہ تحریف ہے۔ لیکن شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ادب کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اچھے طریقہ سے رد کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [النحل ۱۲۵]

''اوران سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو سب سے اچھا ہے''۔

یہ مراد نہیں کہ جس کو بھی وہ تاویل کہیں؛ اس کو ترک کر دیا جائے۔ اور نہ ہی یہ کہ جب کسی چیز پر کتاب وسنت سے راجح دلیل موجود ہو تو بعض لوگوں کی وجہ سے ظواہر میں سے کچھ بھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔ بیشک یہاں پر مراد فاسد اور بدعتی تاویلات ہیں جو سلف صالحین کے طریقہ کے خلاف ہو؛ اور جن کی خرابی پر کتاب وسنت سے دلائل موجود ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ پر بغیر علم کے بات کو ترک کرنا مراد ہے۔

ان فاسد تأویلات میں سے: رؤیت [دیدار الٰہی] کے دلائل کی تاویل؛ یا علو [اللہ تعالیٰ کے مخلوق پر بلند ہونے] کے دلائل کی تاویل؛ اور یہ کہ: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے'' اور ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنانے کی فاسد تاویلات میں شامل ہیں۔ اب تو یہ حال ہو گیا کہ تأویل کو اس کے اصلی معنی سے ہٹ کر استعمال کیا جانے لگا۔

کتاب وسنت میں تاویل سے مراد:

کتاب وسنت میں تاویل سے مقصود وہ حقیقت ہے جس کی طرف کلام کا لوٹنا ہوتا ہے۔ پس خبر کی تاویل سے مراد مخبر بہ سے متعلق حقیقی خبر ہے۔ امر کی تاویل سے مراد نفس فعل ہے جس کا حکم دیا گیا ہے [1]۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

[1]۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تأویل'' تین معانی میں استعمال ہوتا ہے:
اول: اکثر متأخر متکلمین کی اصطلاح میں فقہ اور اصول فقہ میں اس کا معنی یہ لیا جاتا ہے کہ: ''لفظ کو اس کے راجح استعمال سے کسی دلیل کی بنا پر مرجوح استعمال کی طرف لوٹانا تأویل کہلاتا ہے''۔
دوم: تأویل بمعنی تفسیر۔ مفسرین رحمہم اللہ کی اصطلاح میں یہی استعمال غالب ہے۔
سوم: تأویل: بمعنی وہ حقیقت جس کی طرف کلام کو موڑا جاتا ہے''۔ [التدمریہ ۳۰۹؛ باختصار]
ان میں سے دوسرے اور تیسرے معانی کا استعمال ماثور ہے۔ جب کہ اس کا پہلا معنی ایک بدعت اور نئی چیز ہے۔ اگرچہ اس میں تفسیر کی ایک قسم پائی جاتی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ کلام کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے۔ اور کسی ایسی دلیل کے بغیر اس میں کوئی تصرف جائز نہیں جو اس کا دوسرا معنی لینا واجب کرتی ہو۔ پس ان نصوص کو ان کے ظاہر سے کسی دوسری طرف موڑنا جائز نہیں۔ بلکہ ان کو ان کے ظاہر پر جاری کرنا واجب ہوتا ہے۔ جیسے صفات کی دوسری تمام نصوص میں کیا جاتا ہے۔ ان کے ظاہر سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل ایمان بروز قیامت اپنے رب کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھیں گے۔ پس اب ان سے ظاہر کے علاوہ کوئی دوسری چیز مراد لینا جائز نہیں۔ اور نہ ہی اس کا انکار کرنا جائز ہے۔

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع اور سجدہ میں فرمایا کرتے تھے:

((سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ))۔

''پاک ہے تو اے اللہ تعالیٰ اے ہمارے رب، اپنی تعریف کے ساتھ اے اللہ تعالیٰ! مجھے معاف فرما دے''۔

آپ قرآن پاک کی تاویل فرماتے''۔ (البخاری ۸۱۷؛ مسلم) [حدیث میں تاویل سے مراد اصل مقصود معنی ہے۔]

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ (الاعراف: ۵۳)

''کیا وہ اس کے وقوع کے منتظر ہیں جس دن وہ واقع ہو جائے گا تو جو لوگ اس کو پہلے سے بھولے ہوئے ہوں گے وہ بول

اٹھیں گے کہ بے شک ہمارے رب کے رسول حق لے کر آتے تھے۔''

تاویل کا معنی خواب کی تعبیر، اور تاویل عمل بھی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ﴾ (یوسف : ۱۰۰)

''یہ میرے خواب کی تعبیر ہے جو پہلے دیکھا تھا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ يُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ (یوسف : ٦)

''اور وہ آپ کو (خواب کی) باتوں کی تعبیر کا علم سکھائے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ (النساء: ۵۹)

''یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کی تاویل بھی اچھی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾ (الکھف : ۷۸)

''(مگر) جن باتوں پر تم صبر نہ کر سکے میں ان کا تمھیں بھید بتائے دیتا ہوں۔'' نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾ (الکھف : ۸۲)

''یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جن پر تم صبر نہ کر سکے۔''

تو کون ہے جو اس قسم کی تاویل کا انکار کرتا ہے جس کا تعلق امر و نہی سے ہے؟۔ ہاں اگر تاویل کا تعلق خبر سے ہو؛ جیسے اللہ تعالیٰ کے متعلق یا آخرت کے دن کے متعلق خبر ہے؛ تو اس کی تاویل [یعنی اس کی حقیقت] کا علم کسی کو نہیں۔ ظاہر ہے کہ صرف خبر دینے سے یہ حقیقت منکشف نہیں ہو سکتی۔ بیشک جب خبر دیے گئے کو مخبر بہ کا تصور نہ ہو؛ یا پہلے سے اس کی معرفت نہ ہو؛ تو وہ اس کی حقیقت کو نہیں جان سکتا؛ جو کہ اصل میں اس کی تاویل ہے؛ وہ صرف خبر دینے سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ تاویل ہے جسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن علمِ تاویل کی نفی سے اس علم معانی کی نفی لازم نہیں آتی؛ جس سے مقصود متکلم کا مخاطب کو وہ چیز سمجھانا ہے؛ [یعنی اس میں تدبر کیا جائے]۔

تاویل بمعنی تفسیر:

قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں جس میں تدبر کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے نہ دیا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی آیت نازل نہیں کی مگر وہ چاہتا ہے کہ اس کے معانی و مراد کو سمجھا جائے۔ اگرچہ اس میں ایسی تاویل بھی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب؛ رسول اللہ ﷺ کی سنت اور سلف صالحین رحمہم اللہ کے کلام میں تاویل کا یہ معنی ہے۔ بھلے یہ تاویل اس کے ظاہر کے موافق ہو یا مخالف۔

اکثر مفسرین ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ تاویل سے مراد کلام کی تفسیر اور اس کے معنی بیان کرنا لیتے ہیں؛ خواہ وہ ظاہر کے موافق ہو یا

مخالف؛ یہ اصطلاح معروف ہے۔اس معنی میں تاویل اگر حق ہوتو محمود ہےاور اگر باطل ہوتو قابل رد ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾ (آل عمران : ۷)

''اوراس کی حقیقت کوسوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا؛اور علم میں پختہ لوگ......''

اس آیت کی دوقراءتیں ہیں ایک قرائت میں (اِلَّا اللّٰـــهُ) پروقف ہے؛اوردوسری قراءت میں وقف نہیں۔دونوں قرائتیں درست ہیں۔پہلی قراءت میں متشابہ فی نفسہ مراد ہےجس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔اوردوسری قراءت میں متشابہ اضافی ہے جس کی تاویل وتفسیر کوراسخ علم والے ہی جانتے ہیں۔لیکن جوحضرات (اِلَّا اللّٰـــهُ) پروقف کرتے ہیں؛ وہ اس صورت میں تاویل کا معنی معنوی تفسیر کانہیں لیتے۔کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ پر ایسا کلام نازل فرمایا ہوجس کا معنی نہ امت کومعلوم ہے نہ ہی رسول اکرم ﷺ کو۔اورراسخ فی العلم کوبھی اس کے معنی کا کچھ پتہ نہیں۔بس وہ کہتے ہیں:﴿اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾''ہم اس پر ایمان لائے ؛ یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے''۔اتنی بات تو غیرراسخ عوام اہل ایمان بھی کہہ سکتے ہیں۔جبکہ راسخ فی العلم کا عام اہل ایمان سے الگ امتیازی وصف ہوناضروریہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''میں ان راسخ فی العلم لوگوں میں سے ہوں جواس کی تاویل کاعلم رکھتے ہیں''۔یقیناً آپ نے ایک سچی بات کہی ہے۔

بےشک رسول اکرم ﷺ نے آپ کےحق میں یہ دعافرمائی تھی:

''اے اللہ!اس کو دین کی سمجھ عطا کراوراس کوتاویل کاعلم دے''۔[البخاری]

اورآپ ﷺ دعاردنہیں ہوتی۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کےشاگردمجاہد رحمہ اللہ [۲۱-۱۰۴ھ] فرماتے ہیں:

''میں نے اول سے آخرتک ابن عباس رضی اللہ عنہما پرقرآن پاک پیش کیا؛ہرآیت پرٹھہرتااوراس کے متعلق آپ سےسوال کرتا''۔

چنانچہ متواترآثارموجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قرآن پاک کےتمام معانی منقول ہیں اورکسی آیت کے بارے میں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ:''وہ متشابہ ہےاوراس کی تاویل اللہ تعالیٰ کےعلاوہ کوئی نہیں جانتا''۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے اصحاب کے فرامین:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہ کے تلامذہ کا قول الاصول میں موجود ہے کہ متشابہ سے مرادسورتوں کےشروع میں حروف مقطعات ہیں۔یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔حالانکہ اکثرمفسرین نے ان کے معانی ذکر کیے ہیں۔پس ان کے بیان کردہ معانی اگر معروف ہیں تو متشابہ کامعنی معروف ہوگیا۔اگرمعروف نہیں ہیں تو متشابہ ہوئے۔معلوم ہوا کہ ان کے علاوہ معانی معلوم ہیں۔یہی ہمیں ثابت کرنا تھا۔نیز اللہ تعالیٰ نے آیات کومتشابہ کہا ہے﴿ومنه آياتٌ محكماتٌ هنَّ اُمُّ الكتاب وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ﴾۔''اس میں کچھ محکم آیات ہیں؛ جوکہ اس کتاب کی اصل ہیں؛اورکچھ دوسری آیات متشابہ ہیں''۔حروف کومتشابہ نہیں کہا۔جب کہ حروف مقطعات تمام شمارکنندگان کے ہاں آیات نہیں ہیں[حروف ہیں]۔

متاخرین فقہاءاورمتکلمین کے ہاں تاویل کا معنی یہ ہے کہ کسی لفظ کا راجح معنی ترک کر کے مرجوح معنی مراد لینا؛ایسی دلیل کی وجہ سے جوعمل کوواجب کرتی ہے؛ یہ وہ تاویل ہےجس میں بہت سارے امورخبریہ اورطلبیہ میں لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔[خبرانشاء

دونوں میں] تاویل صحیح وہ ہے جو کتاب وسنت کے نصوص کے موافق ہو اور جو مخالف ہو وہ تاویل فاسد ہے۔ یہ گفتگو اپنی جگہ پر تفصیل کے ساتھ ہو چکی ہے۔

عمرو بن اسماعیل رحمہ اللہ کا قول:

تبصرہ (ص ۱۳۰) میں مرقوم ہے: نصیر بن یحیٰ بلخی نے عمرو بن اسماعیل بن حماد بن ابی حنیفہ رحمہ اللہ سے؛ انہوں نے محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ (۱۳۱-۱۸۹ھ) سے دریافت کیا: ''وہ آیات اور احادیث جن میں صفات باری تعالیٰ کا ذکر ہے ان کا ظاہر معنی تشبیہ کی خبر دیتا ہے [ان کا کیا حکم ہے؟]۔ تو آپ نے فرمایا: ''ہم ان کو ایسے ہی لیتے ہیں جیسے وارد ہوئی ہیں [یعنی ظاہر پر محمول کرتے ہیں]؛ ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے: کیفیت کیا ہے؟ [کیفیت کا ہمیں علم نہیں]۔ یہ علم رکھنا بھی واجب ہے کہ ظاہر نص کا معنی کبھی بھی فاسد اور کفریہ نہیں ہوتا؛ اور نہ ہی یہ ظاہر نص کا تقاضا ہوتا ہے۔ اور جو شخص نص سے ایسے فاسد معنی اخذ کرتا ہے؛ یہ اس کی کج فہمی اور کوتاہ علمی ہے۔ بعض لوگوں کے متعلق شاعر کہتا ہے:

وکم من عائب قولا صحیحا وآفتہ من الفہم السقیم

''اور کتنے ہی لوگ صحیح قول کو معیوب گردانتے ہیں اصل بیماری یہ ہے کہ ان کا فہم صحیح نہیں ہے''۔ نیز کہا گیا ہے:

عَلَیَّ نحتُ القوافی من معادنها وما علَیَّ اذا لم تفهم البقر

''میری ذمہ داری تو بس اتنی ہے کہ قوافی ومقاطع کو بنا سنوار کر پیش کروں لیکن میری یہ ذمہ داری نہیں کہ گائے وغیرہ کو میرا کلام سمجھ آئے''۔

تو اللہ تعالیٰ کا کلام جو سب سے سچا اور عمدہ کلام ہے؛ اس کی تعریف کرتے ہوئے خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍo﴾ (هود: ۱)

''اس کی آیتیں محکم ہیں پھر حکمت والے خبر رکھنے والے (اللہ) کی جانب سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔''

بے ان کے کلام کی حقیقت یہ ہے؛ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ (قرآن اور حدیث کے ظاہر میں گمراہی ہے) اس میں ایسا بیان نہیں جس سے عقائد کی اصلاح ہو سکے نہ ہی اس میں توحید، تنزیہ کا ذکر ہے''۔ یہ تو متأولین کے عقیدہ کی حقیقت ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جن علوم کی قرآن پاک نے خبر دی ہے وہ صحیح اور برحق ہیں؛ اور جو باطل تھا؛ اس کی طرف کوئی رہنمائی نہیں کی۔ لیکن مخالفین کا دعویٰ ہے کہ قرآن پاک کی دلالت باطل پر ہے لہٰذا اس کی تاویل ضروری ہے۔

ان سے کہا جائے گا: ''یہ دروازہ جو تم نے کھول رکھا ہے؛ اگر تم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ تم اس طرح اپنے ایماندار بھائیوں پر چند خفیہ مواقع میں غلبہ حاصل کر لو گے۔ لیکن یاد رکھو اس طرح تم نے اپنے اوپر کئی اقسام کے شرک و بدعت کے دروازے کھول دیے ہیں؛ جن کو بند کرنے کی تم میں طاقت نہیں۔ بے شک جب تم بلا دلیل شرعی قرآن پاک کے الفاظ کو اس کی قابل فہم دلالت وضعی سے پھیرنے کو جائز سمجھتے ہو تو پھر جائز اور ناجائز تاویلات کے درمیان امتیاز قائم کرنے کے لیے کون سا قاعدہ ہو گا؟۔ اگر تم کہو: قطعی عقلی دلیل؛ عقل جس دلالت کو محال کہے گی ہم اس کی تاویل کریں گے وگرنہ ہم اس کو تسلیم کر لیں گے۔

تو تم سے پوچھا جائے گا: کس کی عقل کو [اس دلیل کے پرکھنے] میزان قرار دیا جائے گا؟ جبکہ باطنی قرمطی ذہن والا کہتا ہے ایسے قطعی دلائل موجود ہیں جو شریعت کے ظواہر کو باطل قرار دیتے ہیں۔ اور فلسفی کا خیال ہے کہ اجسام کی حشر نشر کی عدم صحت پر قطعی دلائل موجود ہیں۔ معتزلی کا عقیدہ ہے اللہ تعالیٰ کی رؤیت کے امتناع پر قطعی دلائل موجود ہیں۔ اسی طرح علم اور کلام اور رحمت کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ قیام کے امتناع پر قطعی دلائل پائے جاتے ہیں۔ اس طرح تأویلات کا وہ دروازہ کھل جائے گا جسے یہ لوگ معقول کا نام دیتے ہیں؛ اور یہ اتنا وسیع باب ہے کہ یہاں پر اس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ نیز یہاں پر دو بہت بڑی قباحتوں کا سامنا کرنا پڑے گا:

اول: یہ کہ ہم کتاب وسنت کے مشمولات کی صحت کا اس وقت تک اقرار نہ کریں گے جب تک اس سے پہلے ہم اپنی عقل کے ساتھ اس کے امکان پر طول وعریض بحث نہ کرلیں۔ نتیجتاً مختلف مکتب فکر کے حاملین میں سے ہر ایک کا دعویٰ ہوگا کہ ہمارا مسلک عین عقل کے مطابق ہے۔ اس کے نتیجہ میں ممنوعہ بے چینی کی کیفیت رونما ہوگی؛ [اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکے گا]۔

دوم: ہمارے دلوں سے ان [امور] کی صحت کا پختہ یقین ختم ہو جائے گا جن کی خبر رسول اکرم ﷺ نے دی ہے؛ کیونکہ الفاظ سے جو ظاہری معنی معلوم ہوتا ہے وہ قابل اعتماد نہ رہا۔ اور تاویلات اضطراب کا شکار ہیں۔ اس طرح کتاب وسنت سے اللہ تعالیٰ کا مقصود جو معانی بندوں کو بتانے تھے؛ ان سے دوری لازم آئے گی۔ نبی کی خصوصیت ہی خبر دینا ہوتا ہے [رسول اللہ ﷺ جن باتوں سے خبردار کیا ہے]؛ نیز قرآن کریم خود ایک نبأ عظیم [بہت بڑی خبر] ہے؛ [ان کا ترک کرنا بھی لازم آئے گا]۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاویل کرنے والے کتاب وسنت کی نصوص اپنے مؤقف کی تقویت کے لیے ذکر کرتے ہیں نہ کہ ان پر اعتماد کی وجہ سے۔ اگر نصوص عقل کی دلالت کے ساتھ موافق ہیں تو اسے قبول کرتے ہیں اگر مخالف ہیں تو نصوص کی تاویل کرتے ہیں۔ پس یہیں سے بے دینی اور زندیقیت کا دروازہ کھلتا ہے۔ (نسأل الله تعالىٰ العافية .)

تشبیہ کی نفی کی اہمیت:

((وَمَنْ لَّمْ يَتَوَقَّ النَّفْيَ وَالتَّشْبِيْهَ ، زَلَّ وَلَمْ يُصِبِ التَّنْزِيْهَ .))

''جو شخص نفی اور تشبیہ سے نہ بچ سکا؛ اس کا قدم پھسل گیا اور وہ تنزیہ تک نہ پہنچ سکا'' ❶۔

تشریح: نفی اور تشبیہ دونوں دل کی بیماریاں ہیں۔ دل کی بیماریاں دو طرح کی ہیں: اولاً شبہات کی بیماری۔ ثانیاً: شہوات کی بیماری۔ دونوں کا قرآن پاک میں ذکر ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

❶۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے ہیں:

اول: معطلہ: منکرین اسماء وصفات؛ جو کہ جہمیہ سے چلے ہیں۔ ان کا سرغنہ جہم بن صفوان تھا۔ اور پھر معتزلہ اور ان کے موافقین اسی راہ پر چلے۔

دوم: مشبہہ: جو اللہ تعالیٰ کو مخلوق سے مشابہ کہتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں۔ معطلہ کا خیال ہے کہ وہ جب اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیس وتنزیہ بیان کرتے ہیں۔ پس اس طرح وہ باطل کو حق کی صورت میں سامنے لاتے ہیں۔ اور ایسے تنزیہ باری تعالیٰ میں افراط کا شکار ہوئے کہ تمام حدود سے تجاوز کرتے ہوئے الحاد اور گمراہی میں واقع ہوئے۔ اور مشبہہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو تو ثابت مانتے ہیں؛ مگر وہ انہیں مخلوق

سے تشبیہ دیتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی سماعت ایسے ہی ہے جیسے ہماری سماعت؛ اور بصارت بھی ہماری بصارت جیسی ہے۔ پس وہ خالق کو مخلوق سے تشبیہ دے کر گمراہی کا شکار ہوئے۔

سوم: اہل صراط مستقیم - اہل سنت والجماعت - جو ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں جن کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق دی ہے؛ یا پھر رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے متعلق بتایا ہے۔ پس وہ بغیر کسی تعطیل و تحریف اور بغیر کسی تمثیل و تشبیہ کے اللہ تعالیٰ کے وہی اوصاف بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے یا رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیان کئے ہیں۔ پس صراط مستقیم پر گامزن رہنے کا تقاضا ہے انسان تعطیل و تشبیہ سے اجتناب کرے۔

﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ﴾ (الاحزاب: ۳۲)

''تو نرم باتیں نہ کرو کہ مریض القلب شخص کوئی امید (نہ) پیدا کرے۔''

یہ شہوت کی بیماری کا ذکر ہے۔ نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا﴾ (البقرۃ: ۱۰)

''ان کے دلوں میں مرض تھا اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَى رِجْسِهِمْ﴾ (التوبۃ: ۱۲۵)

''اور جن کے دلوں میں مرض ہے ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا۔''

یہ شبہ کی بیماری کا ذکر ہے؛ جو شہوت کی بیماری سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ اس لیے کہ شہوت کی بیماری سے شفا حاصل کرنا ممکن ہے جب شہوت پوری کر لی جائے۔ لیکن شبہ کی بیماری سے اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا تدارک نہ کرے تو اس سے شفاء نہیں مل سکتی۔ وہ شبہ جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے مسئلہ میں ہے؛ یعنی صفات کی نفی اور تشبیہ کا شبہ۔ ان دونوں میں سے صفات کے انکار کا شبہ؛ تشبیہ کے شبہ سے زیادہ نقصان دہ ہے؛ کیونکہ نفی کے شبہ میں اس شریعت کا رد ہے جس کو رسول اکرم ﷺ نے پیش فرمایا۔ لیکن تشبیہ کے شبہ میں ان حدود سے تجاوز کرنا اور ان میں غلو کرنا ہے جن کا آپ نے تعین فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینا کفر ہے۔ بے شک ارشاد ربانی ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اس کا مثل کوئی نہیں۔''

اس طرح صفات کی نفی کرنا بھی کفر ہے۔ کیونکہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝﴾ (الشوریٰ: ۱۱)

''اور وہ (اللہ تعالیٰ) سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

یہ بھی تشبیہ کی دو اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ بیشک تشبیہ کی دو قسمیں ہیں:

اول: پہلی قسم: خالق کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینا۔ اس کے رد اور ابطال میں اہل کلام کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ذہن کے لوگ دوسری قسم کے لوگوں کی نسبت کم ہیں۔

دوم: وہ لوگ ہیں جو مخلوق کو خالق کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں؛ جیسے حضرت عیسی اور حضرت عزیز علیہما السلام کے پجاری، سورج، چاند، اصنام،

فرشتوں، آگ، پانی، گائے، قبروں، جنوں وغیرہ کی عبادت کرنے والے؛ ان کو خالق کے برابر قرار دیتے ہیں۔
ان کی جانب انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے گئے کہ انھیں صرف ایک اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی عبادت کی طرف دعوت دیں۔

توحیدِ صفاتِ باری تعالیٰ:

3/37: امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ((فَإِنَّ رَبَّنَا جَلَّ وَعَلاَ مَوْصُوفٌ بِصِفَاتِ الْوَحْدَانِيَّةِ، مَنْعُوتٌ بِنَعُوتِ الْفَرْدَانِيَّةِ، لَيْسَ فِي مَعْنَاهُ أَحَدٌ مِنَ الْبَرِيَّةِ۔))

''...... بلاشبہ ہمارا رب بزرگ و برتر وحدانیت کی صفات کے ساتھ موصوف ہے نیز فردانیت کی صفات کے ساتھ بھی موصوف ہے مخلوق کا کوئی فرد اس کے معنی میں نہیں''۔

تشریح: امام طحاوی رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کی اس تنزیہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جو صفات کی نفی اور اثبات میں اس کا وصف ہے۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا کلام سورۂ اخلاص کے معانی سے ماخوذ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ وحدانیت کے ساتھ موصوف ہے اس کو (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) سے اخذ کیا ہے۔ وہ فردانیت کی صفات کے ساتھ موصوف ہے اس کو (اَللّٰهُ الصَّمَدُ (2) لَمْ يَلِدْ ۵ وَلَمْ يُوْلَدْ) سے اخذ کیا ہے۔ مخلوق کا کوئی فرد اس کے معنی میں نہیں۔ اس کو (وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ) سے اخذ کیا ہے۔ نیز اس سے سابقہ بیان کردہ اثبات صفات کی اور تشبیہ کی نفی کی بھی تاکید ہوتی ہے۔ لفظ وصف اور نعت دونوں مترادف ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں متقارب ہیں۔ لفظ وصف ذات پر بولا جاتا ہے جب کہ لفظ نعت فعل کے لیے ہے۔ اسی طرح وحدانیت اور فردانیت میں ترادف کا معاملہ بھی ہے؛ بعض اس میں فرق کرتے ہیں۔ بے شک وحدانیت ذات کے ساتھ خاص ہے؛ جب کہ فردانیت صفات کے لیے ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں متوحد ہے اور اپنی صفات میں منفرد ہے۔ اس کا یہ معنی برحق ہے۔ اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ لفظاً ایک قسم کا تکرار موجود ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ کے کلام میں اس قسم کے تکرار کی مثالیں موجود ہیں۔ [یہ انداز] بہ نسبت عقائد کے خطبوں اور دعاؤں میں تکرار نسب ہے جب کہ خطبوں میں موزوں [مسجع] الفاظ مناسب ہیں۔ اسی طرح ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ جملہ اللہ تعالیٰ کو منزہ قرار دینے میں لیس فی معناہ أحد من البریة سے اکمل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے حد کا مسئلہ:

۳۸۔ ......((وَتَعَالَى عَنِ الْحُدُوْدِ وَالْغَايَاتِ ❶، وَالْأَرْكَانِ وَالْأَعْضَاءِ وَالْأَدْوَاتِ، لَا تَحْوِيْهِ الْجِهَاتُ السِّتُّ كَسَائِرِ الْمُبْتَدِعَاتِ. ❷))

''اللہ تعالیٰ حدود وارکان اعضاء اور ادوات سے بلند ہے؛ اور چھ جہات اس کو حاوی نہیں جس طرح تمام مخلوقات کو حاوی ہیں''۔

❶۔مصنف رحمہ اللہ کا فرمان: (وَتَعَالَى عَنِ الْحُدُوْدِ وَالْغَايَاتِ وَالْأَرْكَانِ وَالْأَعْضَاءِ وَالْأَدْوَاتِ، ...... كَسَائِرِ الْمُبْتَدِعَاتِ.)۔یہ مجمل کلام ہے جس سے اہل تأویل اور اسماء وصفات میں ملحدین فائدہ اٹھاتے ہیں۔حالانکہ اس میں ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں۔اس لیے کہ مصنف رحمہ اللہ کی مراد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مخلوق سے مشابہت سے تنزیہ بیان کرنا ہے۔لیکن وہ ایک ایسی مجمل عبارت لائے ہیں جس کے لیے تفصیل کی ضرورت ہے تا کہ یہ شبہ ختم ہو سکے۔آپ حدود سے آپ کی مراد بشری علم کی حدود ہیں۔پس اللہ تعالیٰ کی حدود کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾(طه ۱۱۰)''وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے''۔پس سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے جنہوں نے استواء وغیرہ میں اثبات حد کا کہا ہے؛ تو اس سے مراد وہ حد ہے جو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں؛ بندے اس کو نہیں جانتے۔

اور جہاں تک (وَالْغَايَاتِ وَالْأَرْكَانِ وَالْأَعْضَاءِ وَالْأَدْوَاتِ) کی بات ہے؛ تو مصنف رحمہ اللہ کی مراد اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی صفات ذاتیہ جیسے: چہرہ؛ ہاتھ؛ اور قدم وغیرہ میں مخلوق کی مشابہت سے تنزیہ بیان کرنا ہے۔اللہ تعالیٰ ان صفات سے موصوف ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات مخلوق کی صفات کی طرح نہیں ہیں۔اور ان کی کیفیت کو بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔پس اہل بدعت ایسے الفاظ کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں تا کہ وہ دوسرے الفاظ میں ان صفات کی نفی کر سکیں جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کے لیے ثابت کی ہیں؛ اور ان کے متعلق کلام کیا ہے؛ تا کہ انہیں رسوائی نہ اٹھانا پڑے؛ اور اہل حق کے سامنے انہیں پسپائی نہ ہو۔مؤلف امام طحاوی رحمہ اللہ کا مقصد صفات کو ثابت کرنا ہے کیونکہ وہ اہل سنت والجماعت میں سے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو ثابت مانتے ہیں۔اور اس عقیدہ میں آپ کا کلام دوسری جگہ پر خود اس کی وضاحت کر رہا ہے اور کلام کا ایک حصہ دوسرے کی تفسیر کر رہا ہے؛ اور محکم سے متشابہ الگ ہو رہے ہیں۔

ایسے ہی (لَا تَحْوِيْهِ الْجِهَاتُ السِّتُّ كَسَائِرِ الْمُبْتَدِعَاتِ)''اور چھ جہات اس کو حاوی نہیں جس طرح تمام مخلوقات کو حاوی ہیں'' کا معاملہ بھی ہے۔آپ کی مراد یہ ہے کہ چھ جہات مخلوق ہیں؛ آپ کی مراد اللہ تعالیٰ کے بلند و عالی ہونے اور عرش پر مستوی ہونے کی نفی کرنا ہرگز نہیں۔اس لیے اس کو چھ جہات میں شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔بلکہ وہ تمام عالم سے بلند و بالا ہے اور ان سب کو محیط ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنے بلند و عالی ہونے پر ایمان کی فطرت پر پیدا کیا ہے۔اور بیشک اللہ تعالیٰ بلندی کی جانب ہیں۔اور تمام اہل سنت والجماعت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور پھر تابعین کے دور سے آج تک اس پر اجماع ہے۔اور کتاب و سنت متواترہ کے صحیح دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلندی پر ہیں۔پس قارئین کرام کو اس عظیم الشان امر کی طرف متنبہ رہنا چاہیے اور جان لینا چاہیے کہ حق یہی ہے؛ اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ باطل ہے۔واللہ تعالیٰ الموفق۔

❷۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: اس فقرہ سے مؤلف رحمہ اللہ کی مراد دو گروہوں پر رد کرنا ہے:

پہلا گروہ: مجسمہ اور مشبہ؛ جو اللہ تعالیٰ کو جسم؛ بدن اور اعضاء اور دیگر صفات سے موصوف کرتے ہیں۔تعالی اللہ عما یقولون علواً کبیراً۔

دوسرا گروہ: معطلہ: جو اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق پر [علو] بلند ہونے کی نفی کرتے ہیں۔بلکہ ان میں سے تو بعض کھل کر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ بذات خود ہر چیز میں موجود ہے۔اللہ تعالیٰ کے مخلوق میں حلول کر جانے کا یہی مطلب ہے۔اور یہ کہ چھ مخلوق جہات نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہے۔وہ ان جہات سے بلند و بالا نہیں۔پس مؤلف رحمہ اللہ نے اس کلام کی نفی کی ہے۔لیکن بعض اہل بدعت اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی تاویل کرتے ہیں؛ جس کا نتیجہ تعطیل کی صورت میں نکلتا ہے۔جیسے شارح رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے؛ اور شیخ محمد مانع رحمہ اللہ نے اس کا خلاصہ پیش کیا ہے؛ فرماتے ہیں (ص ۱۰):

''اس سے مراد مشبہ پر رد کرنا ہے؛ لیکن یہ کلمات مجمل اور مبہم ہیں۔اہل سنت والجماعت کے ہاں متعارف الفاظ نہیں۔ان مبہم الفاظ؛ جن سے خلاف حق معنی کا وہم پیدا ہوتا

ہے؛ کی نسبت زیادہ بہتر اور حق یہ تھا کہ کتاب وسنت کی نصوص سے ان پر رد کرتے۔ پس اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوری: ۱۱) ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔'' معطلہ اور مشبہ دونوں پر رد ہے۔ پس حق کے طالب کے مناسب نہیں کہ وہ ایسے الفاظ کی طرف التفات کرے یا ان پر اعتماد کرے۔ بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ صفات کمال اور نعوت عظمت وجلال سے موصوف ہیں۔ اللہ تعالیٰ بذات خود اپنی تمام مخلوق سے بلند وبالا اور اپنے بزرگی والے عرش پر مستوی ہے؛ اپنی مخلوق سے جدا ہے۔ اور ہر رات دنیاوی آسمان پر نازل ہوتے ہیں۔ اور قیامت والے دن [فیصلہ کرنے کے لیے] تشریف لائیں گے۔ یہ تمام چیزیں اپنی حقیقت پر ہیں۔ ہم ان میں تأویل نہیں کرتے؛ جیسا کہ ہاتھ کی تأویل قدرت سے کرتے ہیں۔ اور نزول کی تأویل اوامر کے نزول سے کرتے ہیں؛ یہی معاملہ دوسری صفات میں تأویل کا بھی ہے۔ بلکہ ہم ان کو ثابت مانتے ہیں۔ یعنی ان کے وجود کو ثابت مانتے ہیں؛ مگر کیفیت کو ثابت نہیں مانتے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس قسم کے ان مجمل؛ مبہم اور وہم میں ڈالنے والے من گھڑت کلمات کے استعمال سے کتنے ہی بے نیاز ہو سکتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ الفاظ ان کے کلام میں داخل کر دیے گئے ہیں؛ ان کے ذاتی الفاظ نہیں؛ تو میرے نزدیک یہ کوئی بعید بات نہیں۔ کیونکہ ہم اس امام سے خیر وبھلائی کی امید رکھتے ہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو باطل اس کے کہنے والے مردود ہے؛ بھلے کہنے والا کوئی بھی ہو۔ اور جو کوئی مصنف رحمۃ اللہ علیہ امام طحاوی کے حالات زندگی پڑھے گا؛ خصوصاً لسان المیزان میں؛ تو اسے پتہ چلے گا کہ آپ اکابر علماء اور بڑے لوگوں میں سے تھے۔ ہم ان چیزوں کو ان تمام مقامات پر حسن ظن پر محمول کرتے ہیں جہاں کہیں نقاد کے لیے کوئی بھی راہ نکل سکتی ہے''۔ [انتہی کلام ابن مانع رحمۃ اللہ علیہ]۔

تشریح: امام طحاوی رحمہ اللہ کے کلام کی شرح سے پہلے سمجھنے میں آسانی کے لیے ہم ایک مقدمہ ذکر کرتے ہیں:

مقدمہ:

خیال رہے اللہ تعالیٰ پر اس قسم کے الفاظ کے اطلاق میں علمائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کے تین اقوال ہیں:

اول: ایک گروہ ان الفاظ کی نفی کرتا ہے۔ دوم: ایک گروہ ان الفاظ کو ثابت کرتا ہے۔

سوم: ایک گروہ اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ یہ حضرات سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کے تابع ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ان الفاظ کی نفی اور اثبات مطلق نہیں ہے۔ مگر جب واضح ہو جائے کہ جو الفاظ شرعاً ثابت ہیں؛ انھیں ثابت کیا جائے جو منفی ہیں ان کی نفی کی جائے۔ اس لیے کہ متاخرین کے ہاں ان الفاظ کی اصطلاحات میں اجمال اور ابہام موجود ہے؛ جیسے دوسرے اصطلاحی الفاظ میں بھی پایا جاتا ہے۔ پس یہ تمام حضرات ان تمام الفاظ کو ان کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ نفی کرنے والے اس سے حق وباطل ہر دو کی نفی کرتے ہیں۔ اور اثبات صفات والوں کے متعلق ایسی باتیں کرتے ہیں جو وہ نہیں کہتے۔ اور بعض اثبات کرنے والے اس میں باطل کو بھی داخل کر دیتے ہیں جو کہ سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کے عقیدہ کے خلاف ہوتا ہے۔ اور کتاب وسنت کے میزان پر بھی پورا نہیں اترتا''۔ (منہاج ۲/۳۲۱)

کتاب وسنت میں نہ تو ان کے اثبات میں نص وارد ہوئی ہے نہ ہی نفی میں۔ اس لیے ہم اللہ تعالیٰ کو ان صفات کے ساتھ موصوف نہیں کر سکتے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو موصوف نہیں کیا اور نہ اس کے رسول نے اس کو موصوف کیا ہے۔ بس ہم تو سلف کی اتباع کرنے والے ہیں بدعتی نہیں ہیں۔

❀ اس باب؛ یعنی صفات کے باب میں غور وفکر کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ جن صفات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ثابت کیا ہے ہم ان کا اثبات کریں گے؛ اور جن کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے نفی کی ہو ہم ان کی نفی کریں گے۔ جو الفاظ نصوص شریعت میں وارد ہوئے ہیں؛ نفی اور اثبات کے سلسلہ میں ہم ان کے ساتھ مضبوط وابستگی رکھیں گے۔ پس جن الفاظ اور معانی کا اثبات اللہ تعالیٰ اور رسول سے وارد ہوگا؛ ہم ان کو ثابت کریں گے؛ اور جن الفاظ ومعانی کی نفی وارد ہوگی؛ ہم ان کی نفی کریں گے۔ اور جن

الفاظ کا نفی اور اثبات میں ذکر نہیں؛ ان کا اطلاق نہیں کیا جائے گا حتی کہ ان کے قائل کا مقصود دیکھ لیا جائے۔ اگر اس کا معنی درست ہو؛ تو اسے قبول کیا جائے گا۔ لیکن ہونا یہ چاہیے کہ ان کی تعبیر منصوص الفاظ کے ساتھ کی جائے؛ نہ کہ مجمل الفاظ کے ساتھ۔ ہاں ضرورت کے وقت؛ ایسے قرائن کی موجودگی میں جو مجمل الفاظ سے مراد اور ضرورت کو واضح کر رہے ہوں۔ مثلاً ہم جس سے مخاطب ہیں جب تک ہم مجمل الفاظ استعمال نہیں کرتے ہیں وہ ہمارے مقصد سے واقف نہیں ہوتا؛ یا اس طرح کے دیگر احوال۔

یہاں پر اس کلام سے شیخ رحمہ اللہ کا مقصود مشبھۃ کی تردید ہے؛ جیسے داؤد جواربی اور اس کے ہم خیال لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا جسم ہے نیز اس کا بدن اور اعضاء ہیں۔ ﴿تعالی اللہ تعالیٰ عما یقولون علوا کبیرا﴾

پس شیخ رحمہ اللہ کی مراد یہاں پر جس معنی کی نفی کرنا ہے؛ وہ برحق ہے۔ لیکن بعد میں کچھ نوخیزوں نے اس نفی کے عموم میں حق اور باطل کو داخل کر دیا۔ جس کے بیان کی ضرورت ہے۔ یہ کہ:

سلف صالحین رحمہم اللہ کا مسلک:

سلف صالحین رحمہ اللہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی حد کا علم نہیں رکھتے۔ اور نہ وہ اس کی صفات کی حد مقرر کرتے ہیں۔ امام ابوداؤد طیالسی رحمہ اللہ (۱۳۳-۲۰۴ھ) فرماتے ہیں:

''حضرت سفیان (۹۷-۱۶۱ھ) وشعبہ (۸۲-۱۶۰ھ)، حماد بن زید (۹۸-۱۷۹ھ)، حماد بن سلمہ (۱۶۷ھ)، شریک (۹۵-۱۷۷ھ)، ابوعوانہ (بعد ۷۰-۱۷۶ھ) رحمہم اللہ کا قول ہے کہ: ''وہ نہ اللہ تعالیٰ کی حد کا ذکر کرتے ہیں؛ اور نہ اس کی تشبیہ اور تمثیل کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ صفات کی احادیث روایت کرتے ہیں لیکن ان کی کیفیات کا ذکر نہیں کرتے اور جب ان سے دریافت کیا جاتا ہے تو وہ آثار پیش کرتے ہیں''۔

چنانچہ ذرا آگے چل کر امام طحاوی رحمہ اللہ کے اس جملے پر اس کی تفصیل آئے گی:

''اللہ تعالیٰ کی مخلوق اس کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے؛ تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے کہ کوئی شخص اس کی حد کا احاطہ کر سکے؛ اس لیے نہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے الگ ہے منفصل ہے اور اس سے مباین ہے''۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا بیان:

(۱۱۸-۱۸۱ھ)۔ ان سے دریافت کیا گیا ہم اپنے رب کی کیسے معرفت حاصل کریں؟۔ آپ نے فرمایا:

''وہ عرش پر ہے اپنی مخلوق سے مبائن ہے'' [1]۔

پھر دریافت کیا گیا: ''کیا اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان حد ہے؟''۔ فرمایا: ''ہاں حد ہے''۔ (انتھی)

[1] ۔حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ''کیا اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان کے اوپر عرش پر ہے اور اپنی مخلوق سے الگ اور جدا ہے؟ اور اس کا علم ہر جگہ پر ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''ہاں وہ عرش پر ہے؛ اور اس کے علم سے کوئی مکان خالی نہیں''۔ اصول الاعتقاد ۲/ ۴۴۵۔
اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے متعلق ہی منقول ہے؛ آپ استواء کا معنی یوں بیان کرتے تھے: ''استواء کا مطلب رفعت اور بلندی ہے؛ اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہی بلند ورفیع ہے۔ وہ عرش کی تخلیق سے پہلے بھی بلند وعالی تھا۔ وہ ہر چیز پر فوقیت رکھتا ہے؛ اور تمام اشیاء سے بلند وبالا ہے''۔ طبقات حنابلہ ۲/ ۲۵۶۔

اور ہم سب جانتے ہیں کہ حد کا اطلاق ایسی چیز پر ہوتا ہے جس کے ساتھ کوئی ایک چیز دوسری چیز سے جدا ہو؛ اور ان کے درمیان فرق اور تمیز قائم ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں حلول کرنے والا نہیں۔ بلکہ وہ بذات خود قائم ہے؛ بلکہ وہ قیوم ہے یعنی بذات خود قائم اور اپنے ماسویٰ کو قائم رکھنے والا ہے۔ اس اعتبار سے ''حد'' کے معنی میں اختلاف کرنا بالکل سرے سے ناجائز ہے۔ اس لیے کہ اس کی نفی کے بعد تو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی حقیقت کی نفی ہے۔ ہاں لفظ حد کا معنی علم اور قول بھی ہے کہ بندے اس کی حد کریں اس معنی کے لحاظ سے حد کی اللہ تعالیٰ سے نفی کرنے میں تمام اہل سنت کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

ابوالقاسم قشیری (٣٧٦-٤٦٥ھ) نے اپنے رسالہ (٥٨٥ پر تحریر کیا ہے؛ کہتے ہیں: میں نے ابوعبدالرحمٰن سلمی (٣٢٥-٤١٢ھ) سے سنا؛ وہ کہتے ہیں میں نے منصور بن عبداللہ سے سنا؛ انہوں نے ابوالحسن العنبری سے سنا؛ وہ کہتے ہیں: میں نے سہل بن عبداللہ تستری (٢٠٠-٢٨٣ھ) سے سنا؛ ان سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں سوال کیا گیا''۔

تو انھوں نے جواب دیا: ''اللہ تعالیٰ کی ذات علم کے ساتھ موصوف ہے احاطہ کے ساتھ اس کا ادراک نہیں ہوسکتا اور نہ دنیا میں ان آنکھوں سے اس کو دیکھا جاسکتا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ایمانی حقائق کے ساتھ موجود ہے یعنی وہ حد کے بغیر؛ بلا احاطہ؛ اور بغیر حلول کے ہے۔ اور آخرت میں آنکھیں اس کا دیدار کرسکیں گی وہ ذات اپنی بادشاہت اور قدرت کے لحاظ سے ظاہر ہوگا۔ لیکن اس نے مخلوق کو [اس دنیا میں] اپنی ذات کی حقیقت کی معرفت سے حجاب میں کردیا ہے؛ البتہ آیات کے ساتھ اپنی ذات پر راہنمائی کی ہے۔ پس دل اس کی معرفت رکھتے ہیں آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتی۔ مومن [آخرت میں] آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے؛ لیکن اس کا احاطہ ادراک بالکل نہیں کرسکیں گے''۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''ارکان، اعضا، ادوات'' اس سے بعض منکرین صفات؛ ایسی صفات کی نفی پر استدلال کرتے ہیں جو قطعی دلائل کے ساتھ ثابت ہیں جیسے ہاتھ اور چہرہ۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

فقہ اکبر میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس [یعنی اللہ تعالیٰ] کا ہاتھ، چہرہ اور نفس ہے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہاتھ، چہرہ اور نفس کا ذکر قرآن مجید میں بھی کیا ہے۔ یہ ایسی صفات ہیں کہ ان کی کیفیت معلوم نہیں۔ اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''یــــد'' یعنی ہاتھ سے مراد قدرت اور نعمت ہے۔ کیونکہ اس طرح صفات کا ابطال ہوتا ہے''۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ادلہ قطعیہ کے ساتھ ثابت ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص: ٧٥)

''جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اسے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ﴾ (الزمر: ٦٧)

''اور قیامت کے دن تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (القصص: ۸۸)

''اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (الرحمن: ۲۷)

''اور تیرے رب عزت اور بزرگی والے کی ذات باقی رہے گی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ﴾ (المائدة: ۱۱۶)

''جو بات میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے اور جو تیرے ضمیر میں ہے اسے میں نہیں جانتا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام: ٥٤)

''اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي﴾ (طٰہٰ: ٤١)

''اور میں نے اپنی ذات کے لیے تیرا انتخاب کر لیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ﴾ (آل عمران: ۲۸)

''اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنے نفس سے ڈراتا ہے۔''

نیز رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی شفاعت کی حدیث میں ہے کہ:

''جب لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے؛ اور ان سے کہیں گے: آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ کے ساتھ پیدا کیا اور فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا نیز آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے''۔ [1]

پس جو شخص ''ید'' یعنی ہاتھ کی تاویل قدرت سے کرتا ہے اس کی تاویل درست نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص: ۷۵) ''جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔'' میں قدرت کا معنی درست نہیں جب کہ لفظ ید [''یدیَّ''] ''میرے دونوں ہاتھ'' یہاں تثنیہ واقع ہے؛ نیز اگر اس کا معنی قدرت درست سمجھا جائے تو پھر ابلیس کہہ سکتا تھا کہ: ''مجھے بھی تو نے قدرت کے ساتھ پیدا کیا ہے؛ پس اس کی مجھ پر فضیلت کس لیے ہے؟۔ معلوم ہوتا ہے: ابلیس کو اپنے کفر کے باوجود اللہ تعالیٰ کی

معرفت جہمیہ سے زیادہ تھی۔ ہاں اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ o﴾ (یٰس: ۷۱)

''کیا انھوں نے نہیں دیکھا ہے کہ جو چیزیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ان ہی میں سے ہم نے ان کے لیے چار پائے پیدا کر دیئے اور یہ ان کے مالک ہیں۔''

سے بھی ان کا استدلال درست نہیں اس لیے کہ اس آیت میں لفظ اَيْـدِىْ جمع ہے؛ اس کی اضافت جمع کی ضمیر [ضمیر جمع متکلم] کی طرف ہے تاکہ تناسب قائم رہے۔ اور ان دونوں کی دلالت اللہ تعالیٰ کی بادشاہت اور عظمت پر ہے اسی طرح (ایـدی) کی اضافت مفرد کی ضمیر کی جانب نہیں کی ہے نہ ہی تثنیہ کا صیغہ لا کر ضمیر جمع کی طرف مضاف کیا ہے پس ﴿مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ﴾ ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ کی نظیر [مثال] نہیں ہے۔ نیز رسول اکرم ﷺ اپنے رب کا وصف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس کا حجاب بھی نور کا ہے اگر وہ حجاب کو اتار دے تو اس کے چہرے کے انوار اس کی مخلوق کو؛ تا حد نگاہ جلا کر رکھ دے''۔ [2]

لیکن ان صفات کو اعضاء، جوارح، ادوات، ارکان کا نام نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ رکن ماہیت کا جزء ہوتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے؛ وہ بے نیاز ہے؛ اس کے اجزاء نہیں ہیں؛ وہ پاک اور بلند ہے اعضاء میں الگ الگ کرنا اور ٹکڑے ٹکڑے کے جو معانی موجود ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بھی بلند ہے اس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں موجود ہے:

[1] صحیح بخاری (٤/ ٤٥٤، ٤٦٤)، مسند احمد (٣/ ١١٦).

[2] مسلم، ابن ماجه.

﴿الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ o﴾ (الحجر: ٩١)

''وہ لوگ جنھوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔''

جوارح میں اکتساب اور انتفاع کا معنی موجود ہے اسی طرح ادوات ان آلات کو کہا جاتا ہے جن کے ذریعہ فوائد حاصل ہوتے ہیں اور نقصانات سے دور رہا جاتا ہے۔ یہ تمام معانی اللہ تعالیٰ سے منفی ہیں اسی لیے صفات باری تعالیٰ میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ پس صحیح معانی پر مبنی شرعی الفاظ ان فاسد احتمالات سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اسی لیے واجب ہوتا ہے کہ نفی یا اثبات میں الفاظ شرعیہ سے اعراض نہ کیا جائے؛ تاکہ فاسد معنی ثابت نہ ہو جائے؛ یا صحیح معنی کی نفی نہ ہو جائے۔ اور یہ تمام مجمل الفاظ بظاہر حق و باطل دونوں کے لیے ممکن ہیں''۔ [مدار السالكين ٣/ ١٦٦]

جہت کی وضاحت:

کبھی جہت سے موجود چیز مراد لی جاتی ہے اور کبھی معدوم۔ ظاہر ہے کہ خالق اور مخلوق کے سوا کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اگر جہت سے مراد اللہ تعالیٰ کے ماسوا کوئی موجود چیز لی جائے تو وہ مخلوق ہوگی۔ لیکن کوئی چیز اللہ تعالیٰ کا حصر نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی مخلوق میں سے کوئی چیز اس کا احاطہ کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے۔ اور اگر جہت سے مراد عدمی چیز ہے یعنی ما فوق العالم مراد ہے تو وہاں ایک اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں۔ تو جب کہا جاتا ہے کہ وہ اعتبار سے جہت میں ہے؛ تو یہ صحیح ہے۔

اس کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ عالم سے مافوق ہے جہاں مخلوق کی انتہا ہے وہ سب سے اوپر اور سب سے بلند ہے۔ اور لفظ جہت کی نفی کرنے والے جو صفت علو کی نفی کرنا چاہتے ہیں؛ وہ اپنے دلائل میں ذکر کرتے ہیں کہ: تمام جہات مخلوق ہیں اللہ تعالیٰ جہات سے پہلے تھا اور جو شخص اس کو جہت میں مانتا ہے؛ اس پر عالم کی کسی چیز کو قدیم ماننے کا عقیدہ لازم آتا ہے۔ اور یہ کہ بے شک اللہ تعالیٰ جہت سے مستغنی تھا پھر جہت میں چلا گیا۔ اس قسم کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں سے کسی بھی چیز میں نہیں ہے۔ خواہ اس کا نام جہت رکھا جائے یا کوئی اور۔ یہی مسلک صحیح ہے''۔[منهاج السنة لابن تيمية ۲ / ۳۲۳۔]

لیکن جہت امر وجودی نہیں ہے بلکہ امر اعتباری ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جہات کی انتہا نہیں ہے اور لا متناہی سلسلہ کی جو چیز اس میں نہیں پائی جاتی؛ وہ حقیقت میں موجود ہی نہیں۔

جہات کے متعلق امام طحاوی رحمہ اللہ کا عقیدہ:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''اللہ تعالیٰ کو چھ جہات حاوی نہیں' جس طرح کہ مخلوقات کو حاوی ہوتی ہیں؛ یہ بات حق ہے؛ اس اعتبار سے کہ اس کی مخلوقات میں کوئی بھی چیز اس کا احاطہ نہیں کر سکتی؛ بلکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو محیط اور اس پر بلند ہے''۔ امام طحاوی رحمہ اللہ علیہ کی مراد بھی یہی معنی ہے؛ اسی لیے آگے چل کر وہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ ہر چیز کو محیط اور اس کے اوپر ہے''۔

پس جب شیخ رحمہ اللہ علیہ کے کلام کے ان دونوں جملوں کو جمع کر لیا جائے کہ: ''چھ جہات اس کو حاوی نہیں؛ جیسے ساری مخلوقات کو حاوی ہوتی ہیں''۔ اور ''اللہ تعالیٰ ہر چیز کو محیط اور اس کے اوپر ہے'' تو اس سے آپ کی حقیقی مراد معلوم ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز حاوی نہیں نہ اس کا کسی نے احاطہ کیا ہوا ہے جیسے مخلوقات کا احاطہ ہوتا ہے''۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ وہ ہر چیز سے اوپر ہے۔

البتہ اس مقام میں دو باتیں غور طلب باقی رہ جاتی ہیں:

اولاً :...... چونکہ اس لفظ میں اجمال اور احتمال ہے؛ اس لیے اس کا اطلاق ترک کرنا زیادہ بہتر ہے۔ وگرنہ آپ [کی دلیل] پر غلبہ ہو جائے گا؛ اور احاطہ، فوقیت کے اثبات اور علو کی جہت کی نفی دونوں تناقضات لازم آئیں گے۔ اگر اس کا بھی وہی پہلے والا جواب دیا جائے کہ: یہ مخلوقات میں سے کسی چیز کے اس پر حاوی ہونے کی نفی ہے؛ لیکن پھر بھی شرعی الفاظ اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے''۔

ثانیاً:...... امام طحاوی رحمہ اللہ کا یہ فرمان کہ: (کسائر المبتدعات) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی مبتدع یعنی مخلوق ایسی نہیں جس کا احاطہ نہ ہوا ہو۔ یہ قول محل نظر ہے۔ اس لیے کہ اگر اس سے مراد اس کا احاطہ وجودی چیز کے ساتھ ہے؛ تو یہ ممنوع [نا قابل تسلیم] ہے۔ اس لیے کہ یہ عالم کسی دوسرے عالم میں نہیں۔ وگرنہ تسلسل لازم آئے گا۔ اگر مراد امر عدمی ہے تو کوئی مخلوق عدم میں نہیں۔ بلکہ بعض [مخلوقات] تو دوسری [مخلوقات] میں داخل ہیں جیسے آسمان و زمین، کرسی میں داخل ہیں۔ اور بعض چیزیں تو مخلوقات کا منتہیٰ ہیں؛ جیسے عرش۔ اس لحاظ سے عالم کی سطح اپنے علاوہ کسی دوسری مخلوق میں نہیں؛ تا کہ تسلسل کا خاتمہ ہو۔ جیسا کہ گزر چکا۔ اور اس اشکال کا یہ جواب بھی ممکن ہے کہ لفظ: '' سائر '' باقی کے معنی میں ہے؛ تمام [جمیع] کے معنی میں نہیں۔ یہی اس کا اصل لغوی معنی ہے اسی سے لفظ سؤر استعمال ہوتا ہے؛ جس کا معنی ہے: پینے والا جو برتن میں باقی چھوڑتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مقصود اکثر مخلوق ہے تمام مخلوق نہیں۔ اس لیے کہ لفظ سائر کی دلالت اکثر [غالب] پر بہ نسبت تمام [جمیع] کے زیادہ ہے۔ تو معنی یوں ہوگا کہ

اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز حاوی نہیں [یعنی وہ کسی چیز کے گھیرے میں نہیں]؛ جیسا کہ اکثر مخلوقات گھیرے میں ہوتی ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پر تو کوئی چیز حاوی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے بلند و بالا ہے۔

❀ امام طحاوی رحمہ اللہ کے متعلق ہمارا خیال نہیں کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ نہ عالم میں داخل نہ خارج ہے''یعنی دونوں کی نفی ہے کسی کی تعین نہیں۔ جیسے بعض شارحین کا یہی خیال ہے۔ بلکہ آپ کی مراد اللہ تعالیٰ کی اس چیز سے تنزیہ بیان کرنا ہے کہ اس کا کسی مخلوق نے احاطہ کیا ہوا ہو؛ اور وہ کسی چیز کا محتاج ہو؛ یعنی عرش وغیرہ کا بھی محتاج نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر غلط الزام:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس قسم کے کلام کا ثابت ہونا محل نظر ہے؛ بیشک آپ کے دشمنوں نے آپ پر اس سے زیادہ گھناؤنے الزامات عائد کئے ہیں؛ اس لیے اگر ان سے اس قسم کا قول سنا ہوتا تو ان کے مخالفین لازماً اس کو لے اڑتے؛ اور آپ پر اعتراضات کی بوچھاڑ کردیتے۔ چنانچہ ابومطیع بلخی (۱۱۵-۱۹۹ ھ) نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اللہ تعالیٰ کے لیے علو کا اثبات نقل کیا ہے۔ جیسا کہ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس کلام کا ظاہر اس کی نفی کا تقاضا کرتا ہے۔ کتاب وسنت میں بھی ایسا کچھ بھی وارد نہیں ہوا۔ پس اسی لیے میں کہتا ہوں: ''امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس قسم کے کلام کا ثابت ہونا محل نظر ہے۔ اور زیادہ بہتر ان الفاظ کے اطلاق کو ترک کرنا ہے۔ بیشک اس قسم کا کلام بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو الفاظ شریعت میں استعمال ہوتے ہیں: جیسے لفظ استواء اور نزول؛ اور اس طرح کے دیگر الفاظ۔ اور جو کوئی جاہل یہ خیال کرتا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ جب آسمان دنیا کی جانب نزول کرتا ہے''[1] تو عرش اس سے اوپر ہو جاتا ہے؛ اللہ تعالیٰ عالم کے دو طبقات میں محصور ہو جاتا ہے'' اس کا یہ قول اجماع سلف کے مخالف ہے بلکہ کتاب وسنت کے مخالف ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابو عثمان اسماعیل بن عبدالرحمٰن صابونی (۳۷۳-۴۴۹ ھ) کہتے ہیں: میں نے اپنے استاد ابومنصور بن حمشاذ (۳۱۶- ۳۸۸ ھ) سے سنا: وہ اللہ تعالیٰ کے نزول کی حدیث بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے نزول کے بارے میں سوال ہوا؛ آپ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نزول فرماتے ہیں لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں''۔ [انتہی]

پس جس کسی نے علو کی نفی میں توقف اختیار کیا ہے؛ دراصل اس نے کتاب وسنت کے معانی اور اقوال سلف کی معرفت میں کمزوری کی وجہ سے توقف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے عرش کے اوپر ہونے کا انکار کرتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں: ''نہ مباین ہے نہ اس میں ملا ہوا ہے؛ نہ عالم میں داخل ہے نہ عالم سے خارج۔ وہ اللہ تعالیٰ کو عدم اور ممتنع کی صفت سے موصوف کرتے ہیں؛ وہ اللہ تعالیٰ کو ان کے ساتھ موصوف نہیں کرتے جن صفات کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے؛۔ مثلاً اس کا علو؛ اور عرش پر مستوی ہونا۔ بعض کا عقیدہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ ہر موجود چیز میں حلول کئے ہوئے ہے۔ بعض نے اس کو ہر موجود کا وجود قرار دیا ہے۔

تعالیٰ الله عما يقول الظالمون وابى الجاحدون علوا كبيرا.

اللہ تعالیٰ کی صفت علو کے اثبات کی مزید تفصیل اور بیان آگے آئے گا۔ جب شیخ ''محيط بكل شئى'' ذکر کریں گے۔

[1] متفق عليه: حديث متواتر هے۔ ارواء الغليل (۴۵۰)، صحيح الجامع الصغير (رقم ۱۹۱۴).

اسراء ومعراج:

۳۹۔:((وَالْمِعْرَاجُ حَقٌّ، وَقَدْ أُسْرِيَ بِالنَّبِيِّ ﷺ، وَعُرِجَ بِشَخْصِهِ فِي الْيَقْظَةِ إِلَى السَّمَاءِ، ثُمَّ إِلَى حَيْثُ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الْعُلَا، وَأَكْرَمَهُ اللّٰهُ بِمَا شَاءَ، وَأَوْحَى إِلَيْهِ ﴿مَا اَوْحٰی ۰ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى﴾❶ (النجم: ۱۱) فَصَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ فِي الآخِرَةِ وَالأُوْلَى.))

❶ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھی۔ اور یہ کہنا کہ اس رات آپ ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا تھا؛ یہ ثابت نہیں؛ جیسا کہ اس سے پہلے اس پر تنبیہ گزر چکی ہے۔ اسی لیے ابن ابی العز رحمہ اللہ اور دیگر شارحین نے کہا ہے: صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے دل کی آنکھوں سے دیکھا سر والی آنکھوں سے نہیں دیکھا''۔

''اور معراج کا واقعہ حق ہے؛ رسول اکرم ﷺ کو اسراء کروایا گیا۔ اور پھر بیداری کے عالم میں آسمان کی جانب آپ کا معراج ہوا۔ پھر جس بلندی پر اللہ تعالیٰ نے چاہا آپ کو لے جایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس طرح چاہا عزت عطا کی؛ اور آپ کی جانب جو وحی کرنا چاہی اس کی وحی کی دل نے جو دیکھا اس کو جھوٹ نہ جانا آپ پر آخرت اور دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں''۔

تَشْرِیح: لفظ معراج ''العروج'' سے مفعال کے وزن پر ہے۔ اس سے مراد وہ آلہ ہے جس کے ذریعہ بلندی کی طرف جایا جاتا ہے؛ اوپر چڑھا جاتا ہے؛ وہ سیڑھی کی طرح ہوتا ہے۔ لیکن اس کی کیفیت معلوم نہیں۔ اس کا بھی وہی حکم ہے جو دیگر غائب چیزوں کے بارے میں ہے کہ ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کی کیفیت میں سر نہیں کھپاتے۔

اسراء کا ذکر:

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اکرم ﷺ کو بیداری کے عالم میں اسراء کروایا گیا''۔ اسراء کے مسئلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے:

[پہلا قول]: اسراء روح کے ساتھ ہوا؛ آپ کا جسم یہاں سے غائب نہیں ہوا۔ یہ قول ابن اسحٰق (۱۵۱ ھ) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ (۲۱-۱۱۰ ھ) سے بھی ایسے ہی منقول ہے۔ لیکن یہاں پر ایک فرق سمجھنا ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ: اسراء نیند کی حالت میں ہوا؛ اور یہ کہنا کہ آپ کی روح کو لے جایا گیا؛ جسم نہیں لے جایا گیا'' دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں فرمایا کہ: ''اسراء نیند کی حالت میں ہوا؛ بلکہ یہ دونوں فرماتے ہیں: ''آپ ﷺ کی روح کو لے جایا گیا جسم وہاں سے غائب نہیں ہوا''۔ ان دونوں باتوں میں فرق ہے۔ اس لیے کہ نیند میں انسان کو بعض معلوم چیزیں کی امثال کو محسوس شکل میں دیکھایا جاتا ہے۔ تو گویا آپ نیند میں دیکھتے ہیں کہ آپ کو آسمان کی جانب چڑھایا گیا؛ اور آپ کو مکہ سے لے جایا گیا؛ لیکن آپ کی روح کو نہ اوپر [آسمانوں میں] چڑھی؛ اور

نہ ہی کہیں گئی۔ صرف اتنا ہوا کہ خواب پر مقرر فرشتہ نے آپ کے سامنے امثال کو پیش کر دیا۔ تو ان دونوں حضرات کی مراد یہ نہ تھی کہ آپ کو اسراء نیند کے عالم میں ہوا۔ بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ اسراء میں آپ کی روح کو لے جایا گیا؛ روح جسم سے علیحدہ ہوگئی؛ پھر آپ کے جسم میں واپس آ گئی۔ اور یہ حضرات اس سارے واقعہ کو آپ ﷺ کی خصوصیت شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے غیر کی روح کا اس دنیا سے آسمان کی جانب کامل صعود موت کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔

[دوسرا قول]: یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اسراء دو بار ہوا ہے ایک بار عالم بیداری میں؛ اور دوسری بار حالت خواب میں۔ لگتا ہے کہ اس قول کے کہنے والے چاہتے ہیں کہ باقی روایات میں اور حضرت شریک رحمہ اللہ کی روایت (ثم استیقظت) ''پھر میں بیدار ہوگیا'' کے مابین جمع و تطبیق کی صورت نکل آئے۔

[تیسرا قول]: ان میں سے بعض حضرات کا خیال ہے [اسراء] دو بار ہوا تھا؛ ایک بار نزول وحی سے پہلے دوسری بار نزول وحی کے بعد۔

[چوتھا قول]: بعض حضرات کا خیال ہے [اسراء] تین بار ہوا؛ ایک بار وحی سے پہلے دو بار نزول وحی کے بعد۔ [اس قول کے حاملین کو] جب انہیں کسی لفظ میں اشتباہ ہو جاتا تو وہ ایک بار اور بڑھا دیتے۔ تاکہ روایات میں جمع و تطبیق ممکن ہو سکے۔ یہ طریقہ علم حدیث میں کمزور لوگوں کا ہے۔ ورنہ ائمہ منقولات [محدثین رحمہم اللہ] کے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ واقعہ اسراء صرف ایک بار مکہ میں پیش آیا؛ جب آپ مبعوث ہو چکے تھے؛ یہ ہجرت سے دو سال قبل کا واقعہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک سال دو ماہ قبل کا واقعہ ہے''۔ (ابن عبدالبر ۳۶۸-۳۶۸-٤٦٣؛ الاستعیاب ۱ / ۲۸)۔

حافظ شمس الدین ابن قیم رحمہ اللہ (۶۹۱-۷۵۱ھ) فرماتے ہیں:

''ان لوگوں پر تعجب ہے جو کہتے ہیں اسراء کئی بار ہوا؛ بھلا اس بات کو کیسے جائز سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر بار پچاس نمازیں فرض ہوئی ہوں؛ اور آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان چکر لگاتے رہے ہوں حتی کہ نمازیں پانچ رہ گئیں پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''أَمْضَيْتُ فَرِيْضَتِي وَ خَفَفْتُ عَنْ عِبَادِي'' ❶۔

''میں نے اپنے فریضہ [نماز] کو جاری کر دیا اور اپنے بندوں پر تخفیف کر دی''۔ اور پھر دوسری بار بھی ایسے ہی ہوا؛ کے پچاس سے قصہ شروع ہوا؛ اور پھر پانچ تک تخفیف کی گئی۔ چنانچہ تعدد کے الفاظ کی غلطی کو حفاظ نے شریک کی جانب منسوب کیا ہے۔ امام مسلم نے اسراء کی حدیث کو مسند ذکر فرمایا ہے؛ اور واضح کیا کہ: ''ان سے الفاظ کی تقدیم، تاخیر اور کمی اور زیادتی ہوئی ہے''۔ امام مسلم نے بڑی عمدہ بات کہی ہے'' ❷۔ [زاد المعاد ۳/۴۳؛ انتہی کلام ابن قیم رحمہ اللہ]

---

❶۔ قصہ اسراء و معراج میں نماز کی عظمت اور اعلی شان کی دلیل ہے۔ کہ نماز نبی کریم ﷺ پر براہ راست سات آسمانوں کے اوپر اعلیٰ ترین مقام پر فرض ہوئی۔ نیز اس قصہ میں اللہ تعالیٰ کے بلند ہونے اور آسمانوں سے اوپر ہونے کی بھی دلیل ہے۔ کہ فرشتے بھی آسمانوں کی جانب چڑھتے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کو چڑھا کر اوپر لے جایا گیا۔ نیز اس قصہ میں ہمارے نبی کریم ﷺ کی تمام انبیائے کرام علیہم السلام پر فضیلت اور برتری کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ ساتوں آسمان پر جہاں آپ کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی؛ آپ وہاں سے بھی آگے بڑھ گئے۔

❷۔ اس سے پہلے حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے: ''یہ طریقہ ارباب نقل میں سے ظاہر یہ کے کمزور لوگوں کا طریقہ ہے؛ جنہیں جب کسی قصہ میں کوئی ایسا لفظ نظر آتا ہے جو دوسرے سیاق کے الفاظ کے مخالف ہو تو وہ اسے ایک دوسری بار کا قصہ قرار دیتے ہیں۔ پس جتنی روایات کے الفاظ میں اختلاف پایا جائے وہ اسے ایک دوسرا واقعہ قرار دیتے ہیں۔ اہل علم کے ہاں حق بات یہ ہے کہ اسراء کا واقعہ ہجرت سے پہلے مکہ میں صرف ایک ہی بار پیش آیا۔

واقعہ اسراء کی حقیقت:

❀ صحیح روایت کے مطابق رسول اکرم ﷺ کو جسم مبارک کے ساتھ اسراء عالم بیداری میں ہوا۔ آپ کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک براق پر سوار کرایا گیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ مسجد اقصیٰ میں آپ نے نزول فرمایا؛ انبیائے کرام علیہم السلام کی امامت کرائی۔ وہاں براق کو مسجد کے دروازہ پر ایک حلقہ سے باندھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سفر میں آپ بیت اللحم میں اترے؛ وہاں بھی آپ نے نماز ادا کی؛ یہ بات بالکل صحیح نہیں۔ پھر اسی رات آپ کو بیت المقدس سے آسمانی دنیا کی طرف لے جایا گیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کے لیے دروازہ کھولنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ ان دونوں کے لیے دروازہ کھولا گیا؛ دونوں کو اوپر جانے کی اجازت مل گئی۔ پہلے آسمان میں آپ ﷺ نے حضرت آدم ابوالبشر علیہ السلام کو دیکھا؛ انھیں سلام کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا اور مرحبا کہا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

❀ پھر آپ کو دوسرے آسمان کی طرف لے جایا گیا آپ کے لیے دروازہ کھولنے کا مطالبہ کیا گیا۔ وہاں آپ نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو دیکھا؛ ان سے ملاقات کی؛ آپ نے انھیں سلام کہا انھوں نے سلام کا جواب دیا اور آپ کو مرحبا کہا نیز آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

❀ پھر آپ کو تیسرے آسمان کی طرف لے جایا گیا؛ وہاں آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا حضرت یوسف علیہ السلام نے آپ کو سلام کیا اور مرحبا کہا۔ نیز آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

❀ پھر آپ کو چوتھے آسمان کا معراج کرایا گیا وہاں آپ نے حضرت ادریس علیہ السلام کو دیکھا؛ حضرت ادریس علیہ السلام نے آپ کو سلام کیا اور مرحبا کہا نیز آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

❀ پھر آپ کو پانچویں آسمان پر لے جایا گیا وہاں آپ نے حضرت ہارون بن عمران علیہ السلام کو دیکھا؛ حضرت ہارون علیہ السلام نے آپ کو سلام کیا اور مرحبا کہا نیز آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

❀ وہاں سے آپ کو چھٹے آسمان کا معراج کرایا گیا وہاں آپ کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی۔ انہوں نے بھی آپ کو سلام کیا مرحبا اور آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔ جب وہاں سے آگے جانے لگے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رو دیئے۔ ان سے دریافت کیا گیا آپ کو کس چیز نے رلا دیا؟ تو جواب دیا: ”میں اس لیے رو دیا ہوں کہ میرے بعد ایک نوجوان مبعوث ہوا کہ اس کی امت سے بہ نسبت میری امت کے زیادہ تعداد میں لوگ جنت میں جائیں گے۔

❀ پھر آپ کو ساتویں آسمان کا معراج کرایا گیا وہاں آپ کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوتی ہے اس نے آپ کو سلام کیا؛ مرحبا کہا نیز آپ کی نبوت کا اقرار کیا۔

❀ پھر آپ کو سدرۃ المنتہیٰ کی جانب لے جایا گیا وہاں آپ کے سامنے بیت المعمور بلند کر کے پیش کیا گیا؛ پھر وہاں سے آپ کو اللہ تعالیٰ جبار تقدست اسماءٗ کی طرف لے جایا گیا۔ پھر آپ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوئے؛ ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى (9) فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى﴾ ”قریب دو کمان یا اس سے بھی کم فاصلہ ہوگا وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی طرف جو

وحی کرنا تھی وحی کی''۔ نیز آپ پر پچاس نمازیں فرض کیں۔

❀ پھر آپ واپس لوٹے؛ حتی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے؛ تو انھوں نے دریافت کیا آپ کو کیا حکم ملا ہے؟ فرمایا: پچاس نمازوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ کی امت میں اس کی استطاعت نہیں ہے آپ اپنے رب کی جانب واپس جائیں اور اپنی امت کے لیے تخفیف کی درخواست کریں۔ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام کی جانب یوں دیکھا گویا کہ آپ ان سے مشورہ طلب کر رہے ہیں؛ تو حضرت جبریل علیہ السلام نے مشورہ دیا: ''درست ہے؛ اگر آپ چاہتے ہوں''۔ چنانچہ حضرت جبرائیل آپ کو اللہ تعالیٰ جبار کے اسی مقام کی جانب لے گئے'' (یہ الفاظ بخاری کے ہیں [1]۔)

❀ بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں معاف کر دیں۔ پھر آپ نیچے اترے؛ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرے انھیں بتایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مشورہ دیا کہ آپ پھر واپس جائیں اور تخفیف کا مطالبہ کریں۔ چنانچہ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان آتے جاتے رہے؛ یہاں تک کہ نمازیں پانچ رہ گئیں۔ پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واپس جانے اور تخفیف کا مطالبہ کرنے کا مشورہ دیا؛ اس پر آپ نے فرمایا: ''مجھے اپنے رب سے شرم آرہی ہے؛ اب میں اس پر رضا مندی کا اظہار کرتا ہوں اور تسلیم کرتا ہوں''؛ جب اس حکم کا نفاذ کامل ہو گیا تو منادی کرنے والے نے منادی کر دی کہ: '' أَمْضَيْتُ فَرِيْضَتِي وَ خَفَفَّتُ عَنْ عِبَادِي ''۔ ''میں نے اپنا فریضہ نافذ کر دیا ہے اور اپنے بندوں پر تخفیف کر دی ہے''۔ [1]

کیا معراج میں آپ نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا؟

اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا اختلاف گزر چکا ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کو سر کی ان آنکھوں سے دیکھا [یا نہیں]؟ صحیح بات یہ ہے کہ آپ نے دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا؛ سر والی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے قول ﴿مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝﴾ (النجم: ۱۱) ''جو کچھ دیکھا ہے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا۔'' اور ارشاد ربانی: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝﴾ (النجم: ۱۳) ''اور انھوں نے اس کو ایک اور بار بھی دیکھا ہے۔'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ: یہ دیکھے جانے والے حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے۔ آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی تخلیقی صورت میں دوبارہ دیکھا تھا۔ سورۂ نجم میں اللہ تعالیٰ کے قول: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝﴾ (النجم: ۸) ''پھر قریب ہوئے اور اور آگے بڑھے۔'' [2] []

اس دنو [قریب آنے] اور تدلی [اترنے] سے مراد وہ دنو اور تدلی نہیں جس کا ذکر اسراء کے قصہ میں ہے [3]۔

جبکہ سورۂ نجم میں مذکور دنو اور تدلی سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا قریب آنا اور اترنا مراد ہے۔ یہی قول حضرت عائشہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝﴾

''ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا طاقتور نے پھر وہ پورے نظر آئے اور وہ اونچے کنارے میں تھے پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔''

اس میں تمام ضمائر کا مرجع شدید القویٰ معلم یعنی حضرت جبریل علیہ السلام ہیں البتہ واقعہ اسراء میں یہ صراحت ہے کہ ''دنی فتدلی'' سے

اللہ تعالیٰ مراد ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے قریب ہوا۔ جبکہ سورہ نجم میں ہے: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ○ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى﴾ (النجم: ۱۳) ''اورانھوں نے اس کو ایک اور بار بھی دیکھا ہے؛ سدرۃ المنتہی کے پاس۔'' ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ○﴾ (النجم: ۸) ''پھر قریب ہوئے اور اور آگے بڑھے۔'' اس سے مراد حضرت جبرائیل ہیں؛ انہیں ان کی اصل صورت میں دو بار دیکھا: ایک بار زمین میں اور ایک بار سدرۃ المنتہی کے پاس''۔

آپ کو اسراء جسم کے ساتھ بیداری میں ہوا اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کررہا ہے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى﴾ (الاسراء: ۱) ''وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک لے گیا۔'' اس لیے کہ لفظ عبد کا اطلاق جسم، روح دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے؛ جیسا کہ انسان بھی جسم، روح کے مجموع کا نام ہے۔ عندالاطلاق یہی استعمال معروف ہے؛ اور یہی چیز درست بھی ہے۔

❶ حدیث صحیح ہے متفرق احادیث کے الفاظ یکجا کر دیئے گئے ہیں البتہ آپ کا اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کے بارے میں الفاظ شریک کی روایت کے ہیں جس پر حفاظ نے خاص طور پر اس حدیث کو محل تنقید بنایا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: زاد المعاد ۳/۳۴۔ الاسماء والصفات للبیہقی ۴۴۰-۴۴۲۔

❷ [البخاری ٤٨٥٥ ؛ مسلم ١٧٧۔]

❸ یہاں شارح کو غلطی لگی ہے۔ سورۂ اسراء میں تو اس کا ذکر ہی نہیں۔

پھر عقلاً بھی یہ بات ممتنع نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر بشر کے آسمانوں میں چڑھ جانے کو مستبعد کہنا جائز ہوتا تو پھر یہ کہنا بھی جائز ہوتا کہ فرشتے آسمانوں سے نازل نہیں ہوسکتے۔ یہ چیز نبوت کے انکار کی طرف لے جاتی ہے؛ جو کہ کفر ہے۔

بیت المقدس کی طرف اسراء میں حکمت:

اگر یہ کہا جائے کہ آپ کو پہلے بیت المقدس کی سیر کرائی گئی؛ اس میں کیا حکمت تھی؟۔

[جواب]: - واللہ اعلم - یہ سب کچھ آپ کے دعوائے نبوت کی صداقت کے اظہار کے لیے تھا۔ اس لیے کہ جب قریش نے آپ سے بیت المقدس کے نشانات کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے انھیں بتایا۔ مزید اس قافلہ کے متعلق بھی آپ نے بتایا کہ جو آپ کو راستہ میں ملا تھا۔ اگر آپ کو مکہ سے ہی آسمانوں کی معراج کروائی جاتی تو یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ کیونکہ اگر آپ آسمان کے واقعات کے متعلق بتاتے؛ تو وہ ان واقعات سے باخبر نہ تھے؛ [پھر وہ کیسے آپ کی تصدیق کرتے؟]۔ انہوں نے بیت المقدس دیکھا ہوا تھا؛ اس لیے آپ نے اس کی نشانیاں بتائیں؛ جن سے وہ متعارف تھے تو اس سے آپ کی صداقت نمایاں ہوگئی۔ حدیث معراج میں تدبر اور تفکر کرنے والے کے لیے کئی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے وصف پر دلیل موجود ہے۔ وباللہ تعالیٰ التوفیق۔

حوض وکوثر

٤٠۔((وَالْحَوضُ الَّذِی أَکْرَمَهُ اللّٰهُ تَعالَی بِهٖ= غِیَاثاً لِأُمَّتِهٖ= حَقٌّ ①۔))

''جوحوض اللہ تعالیٰ نے آپ کو-اپنی امت کو پلانے کے لیے-بطور عزت بخشا ہے؛وہ حق ہے''۔

تَشْرِیح: جن احادیث میں حوض کوثر کا ذکر ہے وہ حد تواتر تک پہنچتی ہیں۔تیس سے زائد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے انہیں روایت کیا ہے۔

ہمارے شیخ؛ شیخ حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ (۷۰۱-۷۷٤ھ) نے تاریخ سے متعلق اپنی عظیم الشان کتاب البدایہ والنہایہ کے آخر میں وہ تمام روایات جمع کی ہیں۔

❀ ان جملہ روایات میں سے: ایک یہ بھی ہے؛ امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے: حضرت انس سے بیان کرتے ہیں؛ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میرے حوض کی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ اور صنعاء کے درمیان مسافت ہے حوض کوثر پر آسمان کے ستاروں کے برابر آبخورے ہوں گے''۔ ❶

❀ نیز حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ضرور مجھ پر کچھ لوگ میرے صحابہ سے وارد ہونگے جب میں ان کو پہچان لوں گا؛ توانھیں مجھ سے الگ کر دیا جائے گا میں کہوں گا:''یہ تو میرے صحابہ تھے'' جواب ملے گا:''آپ نہیں جانتے ہیں انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا بدعات ایجاد کر لی تھیں''۔ ❷

❀ نیز امام احمد رحمہ اللہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں انھوں نے بیان کیا:

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہلکی سی غنودگی طاری ہوئی؛ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے سر اونچا فرمایا؛ (راوی کو شک ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا؛ یا انھوں نے آپ سے دریافت کیا: آپ کیوں مسکرائے؟ آپ نے فرمایا:''ابھی مجھ پر سورۂ کوثر کا نزول ہوا آپ نے تلاوت فرمائی: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿إِنَّا أَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ o....﴾(الکوثر: ۱)''۔

---

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: وہ احادیث مبارکہ جن میں حوض کا ذکر آیا ہے وہ بہت زیادہ ہیں؛ اور حد تواتر تک پہنچتی ہیں؛ جیسا کہ ائمہ محدثین کی ایک جماعت نے اس کی صراحت کی ہے۔اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے یہ روایات منقول ہیں؛ ان کی تعداد تیس سے زیادہ ہے۔حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان تمام اسناد کا احاطہ کیا؛ اور اپنی کتاب ''النہایہ کے آخر میں اس پر ایک پورا باب قائم کیا ہے۔اور ابن ابی عاصم نے ''کتاب السنہ'' میں سات ابواب (از ۱۵۵ تا ۱۶۱) اس پر قائم کئے ہیں۔ان کے آخر میں ان کے متواتر ہونے کی جانب اشارہ کیا ہے۔اور کہا ہے:''جو احادیث ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض کے بارے میں ذکر کی ہیں؛ وہ علم یقینی کو واجب کرتی ہیں''۔

میں کہتا ہوں: یہ حوض میدان حشر میں ہوگا۔اور لوگ جب حشر میں جمع ہوں گے تو وہ گرمی کے مارے اور پیاسے ہوں گے۔اور وہ پانی پینے کے لیے حوض پر وارد ہوں گے۔ہر نبی کے لیے الگ حوض ہوگا جس پر وہ اپنی امت کی ضیافت کرے گا۔ان میں سب سے بڑا حوض ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوگا۔جو اصل میں جنت کی نہر میں سے دو پرنالوں کی شکل میں بہا کر میدان حشر تک لایا گیا ہوگا۔اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: شرح شرح السنہ از علامہ بربہاری؛ میری شرح وتعلیق کے ساتھ۔

پوری سورت کی تلاوت کی۔ پھر آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: تم جانتے ہو کوثر کیا ہے؟
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے جواب دیا: ''اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ خوب جانتے ہیں''۔ آپ نے فرمایا:
''بے شک وہ جنت میں ایک نہر ہے؛ جو میرے رب نے مجھے عطیہ کر دی ہے۔ وہاں بہت زیادہ خیر ہوگی۔ بروز قیامت میری امت وہاں پر وارد ہوگی۔ حوض کوثر کے آبخورے ستاروں کی گنتی کے برابر ہوں گے۔ وہاں داخل ہونے والوں میں سے ایک بندے کو ہٹایا جائے گا۔ میں کہوں گا: ''اے میرے رب! بیشک یہ تو میری امت میں سے ہے''۔
تو مجھ سے کہا جائے گا: ''بے شک آپ نہیں جانتے ہیں انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا بدعات نکال لی تھیں''۔ ❸

❀ نیز صحیح مسلم کے الفاظ یوں ہیں:
''وہ ایک نہر ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے۔ اس پر بہت زیادہ بھلائی ہوگی۔ یہ وہی حوض ہے جہاں پر قیامت کے روز میری امت وارد ہوگی''۔ باقی الفاظ اس کے مثل ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ نہر کوثر سے دو پرنالے اس حوض میں گر رہے ہوں گے۔ حوض محشر کے میدان میں پل صراط سے پہلے ہوگا۔ جبکہ ثابت ہے کہ کچھ لوگوں کو روک دیا جائے گا؛ کچھ منع کر دیا جائے گا۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو [اس دین سے] اپنی ایڑیوں کے بل پھر گئے تھے۔ تو ایسے لوگ پل صراط پر سے نہیں گزر سکیں گے۔

❀ حضرت جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے:

❶ صحیح: مسند احمد: (۳/ ۲۲۵)، بخاری (٤/ ٢٤٨). مسلم میں سونے چاندی کے آبخوروں کا ذکر ہے۔ اور جو اس حوض سے ایک بار پی لے گا وہ دوبارہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔

❷ صحیح بخاری (۴/ ۲۴۸)، مسلم (۷/ ۷۰۔ ۷۱) مؤلف اگر بخاری رحمہ اللہ کا ذکر فرماتے تو بہتر تھا اس لیے کہ حدیث کے بعینہٖ الفاظ بخاری کے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا کہ اس حوض پر وہی لوگ وارد ہوں گے جو سنت کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوں۔ کیونکہ ان کا آخری انجام جنت میں ہوگا۔ جب کہ اہل بدعت کو اس حوض سے دور روک لیا جائے گا یہ ان کی سزا ہے۔

❸ صحیح: مسند احمد (۳/ ۱۰۲)۔ مسلم کی شرط پر صحیح سند کے ساتھ۔ امام مسلم نے اسے صحیح مسلم میں بھی روایت کیا ہے۔

''میں تم سے پہلے حوض پر [منتظر] ہوں گا''۔ ❶
حدیث میں وارد لفظ ''فرط'' کا معنی ہے: پانی پر سبقت لے جانے والا۔

❀ امام بخاری رحمہ اللہ حضرت سہل بن سعد الانصاری رضی اللہ عنہ (۹۱ھ) سے بیان کرتے ہیں؛ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''میں تم سے پہلے حوض پر ہوں گا جس شخص کا مجھ پر گزر ہوگا؛ وہ پانی پی لے گا؛ اور جس نے پانی پی لیا؛ وہ کبھی پیاسا نہیں ہوگا؛ کچھ لوگ مجھ پر وارد ہوں گے جن کو میں پہچانتا ہوں گا وہ مجھے پہچانتے ہوں گے پھر میرے اور ان کے درمیان پردہ حائل ہوگا''۔
امام ابوحازم (۱۴۰ھ) کہتے ہیں: مجھے نعمان بن ابی عیاش رحمہ اللہ نے یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا تو کہنے لگے کہ:
کیا تم نے اسی طرح یہ حدیث سہل سے سنی ہے؟۔ میں نے کہا: جی ہاں۔ تو وہ کہنے لگے: ''میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ پر یہ گواہی دیتا ہوں؛ میں ان سے سنا ہے؛ وہ اس پر یہ کلمات زیادہ کر رہے تھے: ''میں کہوں گا: ''یہ تو میری امت میں سے ہیں''۔ جواب ملے گا: ''آپ نہیں جانتے انھوں نے آپ کے بعد کیا نئے کام کیے'' اس پر میں کہوں گا: ''دوری ہو؛ دوری ہو ان لوگوں

کے لیے جنھوں نے میرے بعد تبدیلیاں کیں''۔ ❷

حوض کے بیان میں مروی احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ بہت بڑا حوض اور شرف وعظمت والا پانی کا گھاٹ ہے؛ جس کا اصل منبع جنت کی نہر کوثر ہے؛ وہ پانی اس حوض میں گرے گا؛ جو دودھ سے زیادہ سفید برف سے زیادہ ٹھنڈا شہد سے زیادہ میٹھا؛ اور کستوری سے زیادہ خوشبودار ہوگا۔ بہت زیادہ وسیع عریض ہوگا اس کا طول اور عرض مساوی ہوگا؛ اس کے ایک زاویہ کی مسافت ایک ماہ میں طے ہو گی۔ ایک روایت میں ہے: ''اس سے جس قدر پی لیا جائے گا اس سے اس کی وسعت میں اضافہ ہوگا۔ اس کے وسط سے کستوری موتی اور سونے کی سلاخیں اگیں گی۔ رنگا رنگ کے موتی نمودار ہوں گے پس پاک ہے وہ خالق جو کسی چیز کے پیدا کرنے سے عاجز نہیں''۔

نیز احادیث میں وارد ہے کہ: ''ہر نبی کو ایک حوض ملے گا لیکن ہمارے پیغمبر ﷺ کا حوض سب سے بڑا؛ سب سے شریں؛ سب سے زیادہ ازدحام/ رش والا ہوگا''۔ ❸ جعلنا اللہ تعالیٰ منهم بفضله وکرمه .

علامہ ابوعبداللہ قرطبی رحمہ اللہ (م ۶۷۱ھ) نے ''التذکرۃ ص ۲/ ۱۲۲'' میں رقم طراز ہیں:

''ترازو اور حوض کے بارے میں اختلاف ہے کہ کون پہلے ہوگا؟ بعض نے ترازو کا ذکر کیا ہے اور بعض نے حوض کا ذکر کیا ہے۔ ابوالحسن قابسی رحمہ اللہ (۳۲۴-۴۰۳ھ) کہتے ہیں: ''صحیح یہ ہے کہ حوض پہلے ہوگا''۔

---

❶ متفق علیه: حدیث متواتر ہے۔ ظلال الجنة (۱/ ۳۴۷) السنة لابن ابی عاصم من تسعة من الصحابة ص ۷۳۶-۷۴۶ ؛ و زدت علیه تسعة آخرین فی ظلال الجنة مع تخریجها۔

❷ مسلم (۷/ ۶۶) الظلال (۱/ ۷۴-۷۴۳).

❸ حدیث حسن ہے۔ ترمذی (۲/ ۶۷؛ ح: ۲۵۷۳)، وقال: غریب؛ ثم ذکر أنه ورد مرسلاً؛ وقال: وهو أصح۔ ورواه الطبرانی (۷۰۵۳) الاحادیث الصحیحة (۱۵۸۹).

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''[وقت] معنی کا تقاضا اسی چیز کا ہے؛ اس لیے کہ لوگ قبروں سے نکلیں گے تو پیاسے ہوں گے -جیسا کہ پہلے گزر چکا- پس ترازو اور پل صراط سے پہلے انھیں حوض کوثر سے گزرنا ہوگا''۔

ابوحامد امام غزالی رحمہ اللہ (۴۵۰-۵۰۵ھ) اپنی کتاب ''کشف علم الاخرۃ ص ۱۰۵'' میں فرماتے ہیں:

''بعض اہل قلم سلف رحمہم اللہ کا قول ہے کہ حوض پل صراط کے بعد ہوگا۔ قائل کی یہ بات غلط ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ، امام غزالی رحمہ اللہ کی تائید فرماتے ہیں؛ اور کہتے ہیں: ''بات ایسے ہی ہے جیسے آپ نے کہی ہے؛ اس غلط فہمی سے بچنا چاہیے کہ اس کا محل وقوع دنیا کی اس زمین پر ہوگا بلکہ وہ تبدیل شدہ زمین پر ہوگا جو چاندی کی طرح سفید ہوگی جس پر کسی نے کسی کا نہ خون بہایا ہے نہ کبھی اس کی پشت پر کسی نے کسی پر ظلم کیا ہوگا؛ اس قسم کی زمین کا ظہور اس وقت ہوگا جب اللہ تعالیٰ جبار فیصلہ فرمانے کے لیے نزول فرمائیں گے''۔ (انتہیٰ)

اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو تباہ و برباد فرمائے جو حوض کوثر کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ ان کی سزا یہ ہونی چاہیے کہ انھیں قیامت کے روز اس عظیم تشنگی کے دن حوض کوثر پر آنے سے روک دیا جائے۔

مسئلہ شفاعت اور عقیدہ اہل سنت والجماعت

41۔:((وَالشَّفَاعَةُ الَّتِي ادَّخَرَهَا لَهُمْ حَقٌّ، كَمَا رُوِيَ فِي الأَخْبَارِ ①۔))

''شفاعت جوکہ آپ ﷺ نے ان کے لیے ذخیرہ کررکھی ہے؛حق ہے''۔جیسا کہ احادیث میں اس کا ذکر ہے''۔

تَشْرِیح: شفاعت کی کئی اقسام ہیں:

ایک قسم وہ ہے جس پر امت کے لوگوں کے درمیان اتفاق موجود ہے۔ایک شفاعت وہ ہے جس میں معتزلہ اور ان جیسے دیگر بدعتی فرقے اختلاف کرتے ہیں۔

پہلی قسم: شفاعت عظمیٰ:

شفاعت عظمی؛ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام برادر انبیائے کرام ومرسلین عظام علیہم السلام میں سے یہ قسم صرف رسول اکرم ﷺ کے ساتھ خاص ہے''۔[النہایۃ ۲/۱۶۹]

صحیحین اور دیگر کتب احادیث میں شفاعت کی جن احادیث میں اس کا ذکر ہے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی ایک جماعت سے مروی ہیں۔چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں

❀ رسول اللہ ﷺ کے پاس گوشت لایا گیا؛ آپ کو اس میں سے دستی کا گوشت پیش کیا گیا؛؛ آپ کو دستی کا گوشت پسند تھا۔آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس سے ایک بار تناول فرمایا۔پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: احادیث شفاعت بھی متواتر ہیں ابن ابی عاصم نے ''السنہ'' میں اس پر چھ ابواب قائم کئے ہیں (از ۱۶۳ تا ۱۶۸؛ احادیث نمبر ۷۸۴ تا ۸۳۲)۔ان میں سے کچھ احادیث شارح ابن ابی العز رحمہ اللہ نے اپنی شرح میں نقل کی ہیں جو کہ شفاعت کی آٹھ اقسام کو شامل ہیں۔جو کہ تحقیق چاہے وہ اصل کتاب کا مراجع کرلے؛ یہ موضوع بہت اہم ہے۔

میں کہتا ہوں: بعض علماء کرام رحمہم اللہ نے اسے وہی مقام محمود قرار دیا ہے جس کا آپ سے اس آیت میں وعدہ کیا گیا ہے:﴿ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ [اسراء ۷۹] ''قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کرے''۔حدیث شریف میں اذان کے بعد کی دعا میں ہے: جو کوئی اذان کے بعد ان الفاظ میں دعا کرے: ((اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّآمَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ اٰتِ مُحَمَّدَانِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَانِ الَّذِیْ وَعَدْتَّهٗ (اِنَّكَ لَاتُخْلِفُ الْمِيْعَادَ)) ''اے اللہ! اس مکمل دعوت اور کھڑی ہونے والی نماز کے رب! عطا کر محمد ﷺ کو خاص قرب اور خاص فضیلت اور انہیں پہنچادے اس مقام محمود پر جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔یقیناً تو وعدہ خلافی نہیں کرتا''۔''اس کیلئے روزِ قیامت میری شفاعت حلال ہوجائے گی''۔(البخاری ۶۱۴)۵۔اس کیلئے آپ کی شفاعت واجب/حلال ہوجائیگی))۔(مسلم ۳۸٤)

''قیامت کے روز میں تمام لوگوں کا سردار ہوں گا؛ تمھیں معلوم ہے ایسا کیونکر ہوگا؟۔اللہ تعالیٰ اگلوں اور پچھلوں کو ایک زمین پر اکٹھا کریں گے۔تو لوگ آپس میں باتیں کریں گے؛ کہیں گے:''تم دیکھتے نہیں ہو تم کس حال میں ہو؟ تم دیکھتے نہیں ہو کہ تمہیں کتنی تکلیف پہنچ چکی ہے؟ کیا تم غور نہیں کرتے کہ تمھارے رب کے سامنے تمھاری شفاعت کون کرے گا؟ کچھ لوگ آپس

میں ایک دوسرے سے کہیں گے: تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام [یہ کام کریں گے]۔ چنانچہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے؛ اور ان سے کہیں گے: اے آدم علیہ السلام! آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں؛ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ کے ساتھ پیدا فرمایا؛ اور آپ میں اپنی روح پھونکی۔ فرشتوں کو حکم دیا کہ آپ کو سجدہ کریں۔ آپ اپنے رب کے سامنے ہماری شفاعت کریں؛ آپ دیکھ نہیں رہے ہمارا کیا حال ہے؟ آپ کو معلوم نہیں ہم کس تکلیف میں مبتلاء ہیں''۔

حضرت آدم علیہ السلام جواب دیں گے: ''میرا رب آج جس قدر ناراضگی میں ہے اس سے پہلے اس طرح وہ ناراض نہیں ہوا اور نہ ہی ہرگز بعد میں اس قدر ناراض ہوگا۔ بے شک اس نے مجھے درخت سے روکا تھا؛ میں نے اس کی نافرمانی کی (نفسی ، نفسی ، نفسی) [یعنی مجھے نجات مل جائے تو غنیمت ہے]۔ مجھے چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف جاؤ۔ تم حضرت نوح علیہ السلام پیغمبر کے پاس جاؤ۔ چنانچہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے؛ ان سے کہیں گے: اے نوح علیہ السلام! آپ زمین میں پہلے پیغمبر ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو شکر گزار بندے کا لقب دیا ہے۔ آپ اپنے رب کے ہاں ہماری شفاعت فرمائیں؛ کیا آپ نہیں دیکھتے نہیں ہم کس حال میں ہیں؟ کیا آپ نہیں دیکھتے ہم پر کس قدر تکلیف آئی ہوئی ہے؟۔ حضرت نوح علیہ السلام جواب دیں گے: '' میرا رب آج جس قدر غضب میں ہے؛ نہ اس قدر اس سے پہلے غضب میں تھا نہ ہی ہرگز آج کے بعد اتنے غضب میں ہوگا۔ بے شک میرے رب نے مجھے ایک [مقبول] دعا دی تھی؛ میں نے اپنی قوم کے حق میں بد دعا کر دی؛ (نفسی ، نفسی ، نفسی) (مجھے اپنے مقام پر رہنے دو)؛ تم مجھے چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف جاؤ۔ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف جاؤ''۔

چنانچہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے؛ ان سے کہیں گے: ''اے ابراہیم علیہ السلام! آپ اللہ تعالیٰ کے نبی اور زمین والوں سے اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں۔ آپ ہمارا حال نہیں دیکھ رہے ہیں ہم کس حال میں ہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام جواب دیں گے: '' میرا رب آج جس قدر غیظ وغضب میں ہے اس سے پہلے نہ وہ اس قدر غیظ وغضب میں آیا نہ اس کے بعد آئے گا؛ پھر اپنے چند جھوٹوں کا ذکر کریں گے؛ کہیں گے: (نفسی ، نفسی ، نفسی)۔ (مجھے چھوڑ دو) میرے علاوہ کسی دوسرے کے پاس جاؤ۔ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ''۔ چنانچہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے؛ ان سے کہیں گے: '' اے موسیٰ علیہ السلام! آپ اللہ کے رسول ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کا رسالت کے لیے انتخاب فرمایا؛ آپ کی لوگوں پر فضیلت دی؛ آپ سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوئے۔ اپنے رب کے پاس ہماری شفاعت کرو۔ کیا آپ دیکھتے نہیں ہم کس حال میں ہیں؟ کیا آپ دیکھتے نہیں ہم پر کیا تکلیف آئی ہوئی ہے؟۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے کہیں گے: '' آج ہمارا رب اتنا ناراض ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی اتنا ناراض ہوا نہ بعد میں اتنا ناراض ہوگا۔ میں نے ایک انسان کو قتل کیا۔ جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ (نفسی ، نفسی ، نفسی) (مجھے اپنے حال پر رہنے دو) میرے علاوہ کسی دوسرے کے پاس جاؤ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ چنانچہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ ان سے کہیں گے: '' اے عیسیٰ علیہ السلام! آپ اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس کے کلمہ ہیں؛ جس کا القاء حضرت مریم علیہا السلام کی طرف ہوا۔ اور آپ اللہ تعالیٰ کے روح ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب دیں گے: '' واقعی اسی طرح ہے''۔ پھر لوگ کہیں گے: آپ نے لوگوں سے پنگھوڑے میں کلام کیا۔ آپ اپنے رب کے پاس ہماری

شفاعت کریں؛ کیا آپ دیکھتے نہیں ہم کس حال میں ہیں؟ کیا آپ دیکھتے نہیں ہم پر کیا تکلیف آئی ہوئی ہے؟۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام انھیں جواب دیں گے: ''میرا رب آج جتنا ناراض ہے اتنا نہ کبھی پہلے ہوا نہ بعد میں ہوگا اپنے کسی گناہ کا ذکر نہ کریں گے (اور کہیں گے) میرے علاوہ کسی دوسرے کے پاس جاؤ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔ چنانچہ لوگ میرے پاس آئیں گے کہیں گے: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ! آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں خاتم الانبیاء ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے پہلے اور پچھلے تمام گناہ معاف کردیے ہیں۔ ہماری اپنے رب کے پاس شفاعت کیجیے؛ کیا آپ دیکھتے نہیں ہم کس حال میں ہیں؟ کیا آپ دیکھتے نہیں ہم پر کیا تکلیف آئی ہوئی ہے؟۔
اس پر میں اٹھوں گا؛ عرش کے نیچے آؤں گا؛ وہاں اپنے رب کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھ پر [نئے الفاظ] آشکار کریں گے؛ اور مجھ پر اپنی حمد وثنا کا ایسا انکشاف اور الہام فرمائیں گے جو اس سے پہلے کسی پر کبھی اس کا انکشاف نہ ہوا ہوگا۔ پھر کہا جائے گا: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ! اپنا سر اٹھا کر سوال کرو: آپ کا سوال پورا ہوگا: شفاعت کرو؛ آپ کی شفاعت قبول ہو گی''۔ تو میں کہوں گا: ''اے رب میری امت، میری امت، اے رب میری امت، میری امت، اے رب میری امت، میری امت''۔ (اس پر) اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''اپنی امت میں سے ان لوگوں کو جن پر کوئی حساب نہیں؛ جنت کے دائیں دروازہ سے داخل کردو؛ جبکہ یہ لوگ دوسرے دروازوں سے بھی عام لوگوں کے ساتھ داخل ہو سکتے ہیں''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جنت کے دروازہ کے دونوں کناروں کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی مکہ اور ہجر میں مسافت ہے یا مکہ اور بصریٰ میں ہے''۔ [1]

[1] أخرجاه في الصحيحين ؛ (البخاري ٤٣١٢ ؛ مسلم ١٩٤) بمعناه ؛ واللفظ للإمام أحمد في مسند احمد (٢/ ٤٣٥)، ظلال الجنة في تخريج السنة (٨١١).

تعجب ہی تعجب ہے ان ائمہ پر جو اس حدیث شفاعت کو مختلف اسناد سے ذکر کرتے ہیں لیکن پہلی شفاعت کا ذکر نہیں کرتے جب اللہ تعالیٰ فیصلوں کے لیے آئیں گے۔ جیسا کہ اس کا ذکر (صور اسرافیل) کی حدیث میں ہے۔ اور بیشک اس مقام پر اس کا مقصد یہ ہے۔ سیاق حدیث کی ابتداء کا تقاضا بھی یہی ہے۔ بیشک تمام لوگ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کے بعد دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے ہاں شفاعت کے لیے جائیں گے؛ تاکہ لوگوں میں فیصلہ ہو جائے اور انھیں اس مقام پر آرام حاصل ہو۔ جیسا کہ مختلف اسناد سے مختلف احادیث کا سیاق اس پر دلالت کرتا ہے۔ پس جب جزاء کے مرحلہ پر پہنچیں گے تو اس وقت اس شفاعت کا ذکر کرتے ہیں جو امت کے گنہگار لوگوں کے لیے ہوگی؛ اور انھیں دوزخ سے نکالے جانے کا ذکر بھی کرتے ہیں۔
گویا کہ ائمہ سلف رحمہم اللہ کا اس حدیث کے صرف اس حصہ تک ذکر پر اقتصار کرنے کا مقصد خوارج اور ان کے متبعین معتزلہ کا رد کرنا ہے؛ جو کسی کے بھی دوزخ میں داخل ہونے کے بعد وہاں سے نکلنے کا انکار کرتے ہیں۔ وہ اس قدر حدیث ذکر کرتے ہیں جس میں صراحت کے ساتھ ان کا رد موجود ہے؛ کہ جس طرف وہ گئے ہیں وہ عقیدہ بدعت اور حدیث کے مخالف ہے؛ اس کی وضاحت حدیث نفخ صور میں بھی موجود ہے۔ طوالت کا ڈر نہ ہوتا تو میں وہ ساری احادیث بیان کر دیتا۔ لیکن اس کے مضمون میں یہ بھی ہے کہ: لوگ حضرت آدم علیہ السلام، پھر حضرت نوح علیہ السلام، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس؛ اور ان کے بعد حضرت

محمد ﷺ کے پاس جائیں گے۔ آپ عرش کے نیچے ایک مقام پر جائیں گے وہاں سجدہ کریں گے؛ اسے مقام فحص کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا بات ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: میں عرض کروں گا: ''اے اللہ! آپ نے مجھ سے شفاعت کا وعدہ کر رکھا ہے تو اپنی مخلوق میں میری شفاعت قبول فرما؛ ان میں فیصلہ فرما''۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں نے آپ کی شفاعت قبول کی؛ میں تمہارے پاس آتا ہوں اور ان کے درمیان فیصلہ کرتا ہوں''۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں: ''میں واپس آ کر لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا''۔ اس کے بعد آپ نے آسمانوں کے پھٹ جانے اور فرشتوں کے بادلوں میں اترنے کا ذکر کیا۔ پھر فیصلوں کے لیے اللہ تعالیٰ آئیں گے۔ اس وقت کروبیون اور مقربین فرشتے مختلف الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ جہاں چاہیں گے زمین پر اپنی کرسی رکھیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: 'جب سے میں نے تمھیں پیدا کیا اس وقت سے لے کر تمہارے آج کے دن تک میں خاموش رہا؛ تمھاری باتیں سنتا رہا، تمھارے اعمال دیکھتا رہا۔ اب تم میرے سامنے خاموش ہو جاؤ تمھارے سامنے تمھارے اعمال اور اعمال نامے ہیں جو تم پر پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ پس جو شخص بھلائی دیکھے وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے اور جو شخص برے اعمال دیکھے وہ اپنے آپ کو ہی ملامت کرے''۔[النہایة ۱/۳۳۴]

(اختصار کے پیش نظر کچھ حصہ چھوڑتے ہوئے آگے ذکر کرتے ہیں)۔ جب جنت والے جنت کی طرف جائیں گے تو کہیں گے:

''ہمارے رب کے پاس ہماری کون سفارش کرے کہ ہم جنت میں داخل ہو جائیں؟۔

خود ہی کہیں گے: ''تمھارے باپ آدم علیہ السلام سے زیادہ اور کس کو اس کا استحقاق ہو سکتا ہے؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا؛ ان میں اپنی روح کو پھونکا اور اس سے آمنے سامنے کلام کیا۔ چنانچہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے؛ اس سے شفاعت کا مطالبہ کریں گے۔ پھر حضرت نوح علیہ السلام، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور پھر حضرت محمد ﷺ کا ذکر ہے۔ آپ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میں جنت کی طرف آؤں گا؛ اور اس کے دروازہ کے حلقہ کو پکڑوں گا۔ پھر دروازہ کھولنے کا مطالبہ کروں گا۔ تو میرے لیے جنت کا دروازہ کھل جائے گا۔ مجھے خوش آمدید اور مرحبا کہا جائے گا۔ جب میرا داخلہ جنت میں ہو جائے گا تو میں اپنے رب کو دیکھتے ہی سجدہ میں گر پڑوں گا۔ [اللہ تعالیٰ] مجھے اپنی تحمید و تمجید کے ایسے کلمات معلوم کرائے گا جن کا علم کسی دوسرے انسان کو نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھ سے فرمائیں گے: ''اے محمد ﷺ! اپنا سر اٹھائیں شفاعت کریں آپ کی شفاعت قبول ہو گی۔ سوال کریں آپ کا سوال پورا کیا جائے گا۔ جب میں سجدہ سے سر اٹھاؤں گا تو اللہ تعالیٰ - اگرچہ خوب علم رکھتے ہیں - دریافت کریں گے: آپ کا حال کیسا ہے؟۔ میں کہوں گا: ''اے رب! تو نے میرے ساتھ شفاعت کا وعدہ کر رکھا ہے؛ پس جنت والوں میں میری شفاعت قبول فرما تاکہ ان کا جنت میں داخلہ ہو جائے''۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''میں نے آپ کی شفاعت قبول کی اور انھیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی''[1]۔

شفاعت کی دوسری قسم: رسول اکرم ﷺ ان لوگوں کی سفارش کریں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہیں تو آپ اس لیے سفارش

فرمائیں گے تاکہ انھیں جنت میں داخلہ مل جائے ❷۔

شفاعت کی تیسری قسم: کچھ لوگوں کے بارے میں حکم ہوا ہوگا کہ انھیں دوزخ میں ڈال دیا جائے؛ مگر آپ ﷺ سفارش کریں گے کہ انھیں دوزخ میں نہ ڈالا جائے"۔[النہایة ۲/ ۱۷۱]

شفاعت کی چوتھی قسم: جو لوگ جنت میں داخل ہوگئے ان کے درجات کی بلندی کے لیے؛ یعنی جس مقام کا ان کے اعمال کے ثواب کا تقاضا ہوگا؛ اس سے اعلیٰ مقام ملنے کی آپ ﷺ سفارش فرمائیں گے۔ معتزلہ خاص طور پر اس شفاعت کے سلسلہ میں ہمارے ہمنوا ہیں؛ اس کے علاوہ دیگر شفاعتوں کے مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں حالانکہ ان کے بارے میں متواتر احادیث مروی ہیں۔[النہایة ۲/ ۱۷۳]

شفاعت کی پانچویں قسم: کچھ لوگوں کے بارے میں آپ شفاعت فرمائیں گے کہ انھیں بلا حساب جنت میں داخل کر دیا جائے۔ اس کے شاہد کے طور پر حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ (م۱۲ھ) کی حدیث کا ذکر کرنا سب سے بہتر ہوگا۔ جب آپ ﷺ نے ان کے حق میں دعا کی کہ: "اللہ تعالیٰ انھیں ان ستر ہزار لوگوں میں جگہ عطا فرمائیں جن کا جنت میں بلا حساب داخلہ ہوگا"۔ ❷

---

❶ تفسير ابن جرير (۲/ ۳۳۰؛ ۳۳۱) من حديث أبي هريرة مرفوعاً، طبراني، ابويعلى الموصلي، بيهقي وغيرهم. (اس حدیث کی سند ضعیف ہے) اسمٰعیل بن رافع، یزید بن ابی زیاد دونوں ضعیف راوی ہیں لیکن حافظ ابن کثیر کا کہنا کہ یہ حدیث مشہور ہے اس سے حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا؛ یہ بات اہل علم پر مخفی نہیں۔ أنما أخرجه الطبرانی؛ تفسير ابن كثير (۱/ ۲٤۸، ٤/ ٦۳).

❷۔ علامہ عبدالرحمٰن بن ناصر البراک نے دوسرے مرحلہ کی شفاعت کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے: "یہ شفاعت اہل جنت کے جنت میں داخلہ کے لیے ہوگی۔ جب انہیں پل صراط عبور کرنے کے بعد جنت اور جہنم کے درمیان ایک ٹیلے کے پاس روک کر پاک صاف کر دیا جائے گا؛ تو اب ان کی سفارش ہوگی کہ انہیں جنت میں داخل ہونے دیا جائے"۔[رواہ البخاری ۲۴۴۰؛ مسلم ۱۹۵ من حدیث انس رضی اللہ عنہ]

متفق عليه: حدیث صحیح ہے۔[البخاری ٥٨١١؛ مسلم ۲/ ۱۷۲۔]

شفاعت کی چھٹی قسم: عذاب کے مستحق لوگوں سے عذاب کی تخفیف میں شفاعت؛ جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے بارے میں شفاعت کی تو اس کے عذاب میں تخفیف کر دی گئی۔ ❶

علامہ قرطبی رحمہ اللہ "التذکرہ ۲/ ۳۲" میں اس شفاعت کے ذکر کے بعد رقم طراز ہیں:

اگر یہ کہا جائے کہ: "اللہ تعالیٰ کا قول: ﴿فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ٥﴾ (مدثر: ٤٨) "پس ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش فائدہ نہ دے گی۔" کفار کی شفاعت کا رد کرنا ہے۔

جواب: آپ ﷺ کی شفاعت کفار کو دوزخ سے نکالنے میں ویسے فائدہ نہ دے گی؛ جیسے نافرمان موحدین کو فائدہ دے گی۔ اور وہ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور جنت میں داخل کیے جائیں گے"۔ ❷

شفاعت کی ساتویں قسم: آپ تمام ایمانداروں کے جنت میں داخلہ کی سفارش فرمائیں گے اس کا ذکر صحیح مسلم پہلے ہو چکا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جنت میں داخلہ کے لیے سب سے پہلے میں سفارش کروں گا" ❸۔

شفاعت کی آٹھویں قسم: گناہ کبیرہ کے مرتکب امتیوں کے حق میں آپ کی شفاعت؛ جو لوگ دوزخ میں داخل ہو چکے ہوں گے؛ آپ کی شفاعت سے انھیں نکالا جائے گا۔ اس مضمون کی احادیث حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ یقیناً ان احادیث کا علم خوارج اور معتزلہ پر مخفی

رہا۔تو اس لیے وہ اس کے مخالف ہیں۔وجہ ان احادیث کی صحت سے ان کی لاعلمی ہے؛اور جن کو علم ہے؛ان کی طرف سے عناد کارفرما ہے۔اوراس عناد کی وجہ سے وہ اپنی بدعت پر قائم ہیں۔شفاعت کی اس قسم میں آپ کے ساتھ فرشتے، انبیاء، اور اہل ایمان بھی شریک ہوں گے۔نیز آپ چار بار تکرار کے ساتھ یہ شفاعت فرمائیں گے"۔(النهاية ٢/ ١٧٥).

اس قسم کی احادیث میں سے ایک حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: آپ بیان کرتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں کے مرتکب لوگوں کے لیے ہوگی"۔ ❹

امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب التوحید (۷۵۱۰) میں سلیمان بن حرب سے نقل کیا ہے؛ ان سے حماد بن زید نے بیان کیا؛ ان سے معبد بن ھلال عنزی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں؛ میری معیت میں بصرہ کے کچھ لوگ جمع ہوئے اور ہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس

---

❶ مسلم[٢٠٩٦ ؛ بخاری ٣٨٨٣ ؛ النهاية ٢/ ١٧٤]عن ابی سعید الخدری۔ احادیث الصحیحة ، رقم (٥٤، ٥٥).

❷ مسند احمد (٣/ ١٤٠)

❸(مسلم ١٩٦ : النهاية ٢/ ١٧٦).

❹ مسند احمد. حدیث صحیح ہے۔ المشکاة (٥٥٩٨-٥٥٩٩)، ظلال الجنة (٨٣١). یہ ان بہت ساری احادیث میں سے ایک ہے جن کا انکار عزالدین بلیق نے اپنی کتاب "المنهاج" ربیع بن حبیب اباضی کی تقلید میں کیا ہے۔

❀ یہ شفاعت چار بار ہوں گی۔ ہر بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سامنے سر سجدہ میں رکھیں گے؛ دعا کریں گے اور سفارش کریں گے۔ ہر بار یہی کہا جائے گا: آپ سر اٹھائیں؛ مانگیں؛ جو مانگو گے دیا جائے گا؛ اور سفارش کریں؛ آپکی سفارش قبول کی جائے گی۔ پس پھر آپ کے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی؛ اور آپ ان لوگوں کو جہنم کی آگ سے نکالیں گے"۔[البخاری ۶۵۶۵؛ مسلم ۱۹۳]

متواتر احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ ان شفاعات کے نتیجہ میں وہ انسان جہنم کی آگ سے نکالا جائے گا جس نے لا إلہ إلا اللہ کہا ہوا اور اس کے دل میں رائی کے دانے برابر ایمان ہو؛ یا جو کے دانے کے برابر ایمان ہو؛ یا گندم کے دانے کے برابر ایمان ہو۔ پس وہ دوزخ سے نکالے جائیں گے اور وہ جل کر سیاہ ہو چکے ہونگے، پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیئے جائیں گے، تب وہ تر وتازہ ہو جائیں گے، جس طرح دانہ تر وتازگی کے ساتھ پانی کے ساتھ اگتا ہے"۔[رواہ البخاری ۷۴۳۹؛ مسلم ۱۸۳؛ من حدیث ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ]

یہ شفاعت اہل توحید کے لیے ہوگی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تو نہیں؛ البتہ اس میں بہت بڑا اور عظیم تر حصہ آپ کا ہوگا۔ پس جو لوگ آپ کی شفاعت کی وجہ سے نکالے جائیں گے ان کی تعداد ان سے زیادہ ہوگی جو دوسروں کی شفاعت کے نتیجہ میں نکالے جائیں گے۔ اس موقع پر فرشتے بھی سفارش کریں گے؛ انبیاء بھی اور نیک اہل ایمان بھی۔ ہر ایک کی سفارش اس کے لیے متعین کردہ حد کے اندر ہی ہوگی۔ اس لیے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اس کی بارگاہ میں سفارش نہیں کر سکے گا۔ معتزلہ اور خوارج اس شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔[مجموع الفتاوی ۱/ ۱۱۶؛ اقتضاء الصراط المستقیم ۲/ ۳۵۹]

بہر حال شفاعت کے لیے یہاں پر دو بنیادی شرطیں ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ شفاعت گزار کو شفاعت کی اجازت دیں۔ ۲۔ مشفوع کے لیے سفارش پر اللہ تعالیٰ راضی ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴾ (النجم 26) "اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش کچھ کام نہیں آتی مگر اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور (جسے) پسند کرے"۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾ (الانبیاء ۲۸) "اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے اور وہ اسی کے خوف سے ڈرنے والے ہیں"۔ پس اس سے ابو طالب کی شفاعت پر وارد اشکال بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ شفاعت اسے عذاب سے نکالنے کے لیے؛ بلکہ عذاب میں کمی اور تخفیف کے لیے ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا اشارہ اس شفاعت کی طرف ہے جس میں اہل توحید میں سے گنہگار لوگوں کو جہنم سے نکالنے کی بات کی گئی ہے۔ کیونکہ معتزلہ اور خوارج اور اہل سنت والجماعت کے مابین محل نزاع یہی چیز ہے۔

گئے۔ہم ثابت بنانی رحمہ اللہ (م ۱۲۳ھ) کو ساتھ لے کر گئے تا کہ وہ ہماری طرف سے حدیث شفاعت کے بارے میں استفسار کریں۔ جب ہم حضرت انس رضی اللہ عنہ کے محل میں پہنچے تو آپ چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے۔ہم نے اجازت طلب کی؛ تو آپ نے ہمیں اجازت دی۔آپ اپنے بستر پر تشریف فرما ہوئے؛ ہم نے ثابت سے کہا: آپ حدیث شفاعت سے پہلے کوئی سوال نہ کریں۔ چنانچہ ثابت رحمہ اللہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوئے:''اے ابوحمزہ! یہ لوگ بصرہ سے ہیں آپ کے پاس شفاعت کی حدیث سننے کے لیے آئے ہیں''۔

انھوں نے بیان کیا:''ہم سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا:''قیامت کے دن لوگ سخت اضطراب میں [ایک دوسرے سے ٹکرا رہے] ہوں گے۔تو وہ آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے؛ان سے شفاعت کی درخواست کریں گے۔وہ جواب دیں گے میں اس مقام کا اہل نہیں ہوں ؛البتہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ؛وہ خلیل الرحمٰن ہیں۔ چنانچہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے ؛وہ کہیں گے : میں اس کا اہل نہیں ہوں،البتہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاں جاؤ وہ کلیم اللہ تعالیٰ ہیں۔ چنانچہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔وہ جواب دیں گے:''مجھے یہ مقام حاصل نہیں ہے؛لیکن تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ؛ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کا روح اور اس کا کلمہ ہیں۔ چنانچہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاں جائیں گے۔وہ بھی کہیں گے:'' میں اس کا اہل نہیں البتہ تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔تو لوگ میرے پاس آئیں گے۔میں کہوں گا:''ہاں میں اس کا اہل ہوں''۔میں اپنے رب سے اجازت طلب کروں گا مجھے اجازت دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ مجھے تعریف کے کلمات کا الہام فرمائیں گے؛ جن سے میں اس کی حمد بیان کروں گا؛اس وقت مجھے ان [کلمات] کا علم نہیں۔میں ان کلمات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تعریف کروں گا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا۔مجھ سے کہا جائے گا:''اے محمد! اپنا سر اٹھائیں، کہیں؛آپ کی بات سنی جائے گی۔شفاعت کریں؛آپ کی شفاعت قبول ہوگی۔سوال کریں؛آپ کا سوال پورا کیا جائے گا''۔

میں کہوں گا:''اے میرے رب! میری امت، میری امت''۔اس پر مجھے کہا جائے گا:''آپ دوزخ سے ان لوگوں کو نکال لیجیے جن کے دل میں جو کے دانے کے برابر ایمان موجود ہے۔ چنانچہ میں جاؤں گا؛ اور ایسا ہی کروں گا۔ پھر دوبارہ میں اللہ تعالیٰ کی وہی حمد و ثنا کروں گا سجدہ میں گر پڑوں گا۔مجھ سے کہا جائے گا:''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنا سر اٹھائیں؛ کہیں آپ کی بات سنتے ہیں۔ شفاعت کریں آپ کی شفاعت قبول کرتے ہیں۔سوال کریں آپ کا سوال پورا ہوگا۔

میں کہوں گا:''اے رب! میری امت، میری امت''۔تو اس پر مجھ سے کہا جائے گا:''آپ دوزخ سے ان لوگوں کو باہر لائیں جن کے دل میں ذرہ بھر یا رائی کے دانے برابر بھی ایمان موجود ہے''۔ چنانچہ میں جاؤں گا؛اور ایسا ہی کروں گا''

''پھر میں اللہ تعالیٰ کی وہی حمد و ثنا کروں اور سجدہ میں گر پڑوں گا۔تو کہا جائے گا:''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنا سر اٹھائیں؛ کہیں؛ آپ کی بات سنی جائے گی۔سوال کریں؛ آپ کا سوال پورا کیا جائے گا۔ شفاعت کریں؛ آپ کی شفاعت قبول ہوگی۔ میں کہوں گا:''اے رب! میری امت، میری امت''۔

اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:''جس کے دل میں ادنیٰ سے بھی ادنیٰ رائی کے دانے کے برابر ایمان ہے اس کو دوزخ سے نکال لو

چنانچہ میں ان کو نکال لوں گا''۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ: ''جب ہم وہاں سے نکلے تو میں نے اپنے رفقاء سے کہا: ''کیوں نہ ہم حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ملاقات کریں۔ آپ ابو خلیفہ کے گھر میں چھپے ہوئے تھے؛ پس ہم نے ان سے وہی حدیث بیان کریں؛ جو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ہم سے بیان کی ہے۔ چنانچہ ہم ان کے پاس آئے؛ ہم نے آپ کو سلام کیا۔ آپ نے ہمیں آنے کی اجازت دی۔ ہم نے کہا: اے ابو سعید! ہم ابھی ابھی آپ کے بھائی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس سے آرہے ہیں۔ جس طرح انھوں نے ہمیں شفاعت کی حدیث سنائی ہے؛ ہم نے کبھی اس طرح نہیں سنی تھی۔ انھوں نے کہا: لاؤ؛ کیا حدیث ہے۔ ہم نے حدیث بیان کی۔ جب ہم اس مقام پر پہنچے تو انہوں نے کہا: آگے بھی بیان کرو''۔ ہم نے کہا: اس سے زیادہ انہوں نے ہم سے کچھ نہیں بیان کیا۔ اس پر انھوں نے کہا: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ہمیں بیس سال ہوئے حدیث بیان کی تھی؛ میں نہیں جانتا کیا وہ بھول گئے ہیں؛ یا انھوں نے ناپسند کیا کہ تم بھروسہ نہ کرلو۔

ہم نے ان سے کہا: ''آپ بیان فرمائیں''۔ اس پر وہ مسکرادیئے اور کہنے لگے:

''انسان خلقۃً کمزور ہے۔ اس تذکرہ سے میرا مقصد یہی تھا کہ تم سے اپنی حدیث اسی طرح بیان کروں جس طرح انہوں نے تم سے حدیث بیان کی ہے۔ آپ نے مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں چوتھی بار پھر اللہ تعالیٰ کی بارہ گاہ میں جاؤں گا؛ اور اس کی وہی حمد وثنا کروں گا؛ پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا۔ مجھ سے کہا جائے گا: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنا سر اٹھائیں؛ آپ کہیں؛ آپ کی بات سنی جائے گی۔ سوال کریں آپ کا سوال پورا ہوگا۔ شفاعت کریں؛ آپ کی شفاعت قبول ہوگی۔'' اس پر میں کہوں گا: ''اے رب! مجھے اجازت دیجیے میں ان لوگوں کو دوزخ سے نکالوں جنھوں نے لا إلـه إلا الله کہا ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''مجھے اپنی عزت، جلال کبریائی، عظمت کی قسم! میں ضرور بالضرور دوزخ سے ان لوگوں کو نکالوں گا جنھوں نے لا اله الا الله کہا ہوگا''۔ (صحیح مسلم ۱۹۳؛ ۳۲٦)

حافظ ابو یعلی نے روایت کیا ہے؛ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے روز تین گروہ سفارش کریں گے۔ انبیاء ان کے بعد علماء پھر شہداء''۔ [1]

صحیح مسلم میں ہے؛ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ مرفوعاً بیان کرتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''فرشتوں نے شفاعت کی؛ انبیاء نے شفاعت کی؛ ایمانداروں نے بھی شفاعت کی؛ اب صرف ارحم الراحمین باقی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ دوزخ سے ایک مٹھی بھر کر ایسے لوگوں کو نکالیں گے جنھوں نے کبھی کوئی نیک کام نہیں کیا''۔ [2]

---

1 موضوع: ابن ماجة (۳/ ٤۳)، عقیلی الضعفاء (ص ۳۳۱)، الضعیفه (۱۹۷۸). عنبسہ بن عبدالرحمٰن قرشی راوی حدیثیں وضع کیا کرتا تھا؛ یہ حدیث موضوع ہے۔ امام بخاری نے اسے متروک کہا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: یہ احادیث گھڑا کرتا تھا۔

2 بخاری، مسلم (۱/ ۱۱۵-۱۱٦)، احمد (۳/ ۹٤).

مسئلہ شفاعت میں اختلاف:

اس مسئلہ میں تین قول ہیں: مشرک، عیسائی اور مشائخ کی تعظیم میں غلو کرنے والے بدعتی سمجھتے ہیں کہ جن مشائخ کی ہم تعظیم کرتے ہیں وہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری شفاعت ایسے ہی کریں گے جیسا کہ دنیا میں بھی شفاعت کا کام معروف ہے۔ جبکہ معتزلہ، خوارج، اہل کبائر کے لیے ہمارے نبی کریم ﷺ اور دیگر کی شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔

جبکہ اہل سنت والجماعت اہل کبائر کے لیے رسول اکرم ﷺ اور دیگر کی شفاعت کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن کوئی [کسی کی] شفاعت نہ کر سکے گا حتی کہ اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دیدیں اور اس کے لیے ایک حد مقرر کر دیں۔

جیسے شفاعت کی صحیح حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ: ''تمام لوگ حضرت آدم، پھر حضرت نوح، پھر حضرت ابراہیم، پھر حضرت موسیٰ، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان سے کہیں گے: ''آپ سب حضرت محمد ﷺ کے پاس جاؤ؛ وہ اللہ تعالیٰ کا ایسا بندہ ہے کہ جس کے تمام پہلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ تو سب لوگ میرے پاس آئیں گے۔ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جاؤں گا؛ جب میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو سجدہ میں گر پڑوں گا۔ میں اپنے رب کی حمد و ثنا ایسے کلمات سے کروں گا جن کا اللہ تعالیٰ مجھ پر القاء فرمائیں گے۔ اس وقت مجھے وہ کلمات اچھی طرح محفوظ نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:

''اے محمد ﷺ! اپنا سر اٹھائیں؛ اور کہیں؛ آپ کی بات سنی جائے گی۔ شفاعت کریں؛ آپ کی شفاعت قبول ہوگی۔ میں کہوں گا: ''اے میرے رب! میری امت''۔ تو میرے لیے حد مقرر ہوگی؛ میں انھیں جنت میں لے جاؤں گا۔ اس کے بعد پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا؛ تو میرے لیے ایک حد مقرر ہوگی''۔ آپ نے تین بار اس کا ذکر فرمایا''۔ [1]

کیا بحق نبینا کے ساتھ شفاعت درست ہے؟

دنیا میں رسول اکرم ﷺ آپ کے علاوہ دیگر نیک لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت لے کر جانے اور ان کے وسیلہ سے دعا کرنے کے مسئلہ میں تفصیل ہے۔ بے شک دعا کرنے والا کبھی دعا میں کہتا ہے: بحق نبيك یا بحق فلاں؛ اور اللہ تعالیٰ کو اس کی مخلوق میں سے کسی کی قسم دیتا ہے؛ تو دو وجہ سے یہ ناجائز ہے:

اولاً: بے شک [ایسا کرنے میں] غیر اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی گئی ہے جو ناجائز ہے۔

ثانیاً: اس کا یہ اعتقاد کہ کسی کا اللہ تعالیٰ پر حق ہے۔ پس نہ تو غیر اللہ تعالیٰ کی قسم کھانا جائز ہے نہ ہی اللہ تعالیٰ پر کسی کا حق ہے کہ اسے جتایا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس پر جس حق کا ذکر کیا ہے؛ وہ صحیح [مگر ایک دوسری چیز] ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الروم: ٤٧)

''اور ایمانداروں کی مدد کرنا ہم پر فرض ہے۔''

نیز رسول اکرم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ (۲۰ ق ھ-۱۸ھ) سے کہا (وہ آپ کے پیچھے سوار تھے):

[1] بخاری ٤٤٧٩، ٧٤٤٠ مسلم ١٩٣؛ ٣٢٠ حديث ابی سعيد الخدری. الرسالة الصفدية ٢/ ٢٩٠۔

''اے معاذ! آپ جانتے ہیں اللہ تعالیٰ کا اس کے بندوں پر کیا حق ہے؟۔ میں نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول خوب

جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا حق اس کے بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں''۔[پھر فرمایا] کیا تو جانتا ہے؟ بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے جب وہ یہ کام کریں؟۔میں نے کہا:''اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں''۔

فرمایا:''بندوں کا اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ وہ ان کو عذاب میں مبتلا نہ کرے''۔ ❶

تو یہ حق اللہ تعالیٰ پر اس کے کلمات تامہ اور سچے وعدہ کے ساتھ ہوا ہے''۔[اقتضاء الصراط المستقیم ۴۰۹]

نہ یہ کہ بندے کا اللہ تعالیٰ پر کچھ حق ہے جیسا کہ مخلوق کا مخلوق پر حق ہوتا ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ تو تمام بندوں پر ہر قسم کے خیر کا انعام کرنے والا ہے۔بندوں کا واجب حق اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے لحاظ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا۔اور ان کو عذاب میں نہ ڈالنا ایسا معنی ہے کہ اس کے ساتھ قسم کھانا درست نہیں۔اور نہ ہی اس کے ذریعہ سوال ہوسکتا ہے؛ اور نہ ہی اس کو وسیلہ بنایا جاسکتا ہے۔اس لیے کہ سبب اصل میں وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سبب بنایا ہو۔اسی طرح مسند أحمد ۲/ ۲۱ میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث ہے؛ جس میں نماز کے لیے جانے والا دعا کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میں تجھ سے اپنے اس چلنے کے حق اور جو تجھ پر سوال کرنے والوں کا حق ہے اس کے ساتھ سوال کرتا ہوں''۔ ❷

تو وہ حق وہ ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ پر لازم کیا ہے تو اس نے سائلین کو حق بخشا ہے کہ وہ ان کی دعا قبول فرمائے گا؛ اور عبادت گزار لوگوں کو بدلہ دے گا۔[القاعدة الجلیلة فی التوسل و الوسیلة ٤٨] کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

مَا لِلْعِبَادِ عَلَيْهِ حَقٌّ وَاجِبٌ ... كَلَّا وَلَا سَعْيٌ لَدَيْهِ ضَائِعٌ

إِنْ عُذِّبُوا فَبِعَدْلِهِ أَوْ نُعِّمُوا ... فَبِفَضْلِهِ وَهُوَ الْكَرِيْمُ الْوَاسِعُ

''بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کوئی حق واجب نہیں؛ ہرگز نہیں اس کے ہاں کسی کی کوشش ضائع نہیں ہے۔اگر عذاب میں گرفتار کیے جائیں تو یہ اس کا عدل ہے یا انعامات میں ہوں تو یہ اس کا فضل ہے وہی کریم سننے والا ہے۔''

بحق السائلین کا جواز بحق نبیك کا عدم جواز:

اگر یہ کہا جائے کہ دعا کرنے والے کے اس قول:''بحق السائلین''اور''بحق نبیک''یا اس جیسے کلمات میں کیا فرق ہے؟

❶ بخاری، مسلم، حدیث ابن عباس۔ الارواء الغلیل (٨٥٥).

❷ حدیث ضعیف ہے۔سلسلة الاحادیث الضعیفہ،(رقم:۲۴).

[جواب]: بحق السائلین علیک کا معنی یہ ہے کہ [دعا کرنے والا اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے]:''بے شک تو نے سوال کرنے والوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ان کا سوال پورا کیا جائے گا۔پس میں بھی ان جملہ سائلین میں سے ہوں تو میری دعا قبول فرما''۔

لیکن بحق فلاں کے؛ اگر اس کا اللہ تعالیٰ پر کوئی حق ہے تو وہ اس کے سچے وعدہ کی وجہ سے ہے۔لیکن اس میں اور اس سائل کی دعا کے قبول کرنے میں کچھ مناسبت نہیں ہے۔گویا کہ دعا کرنے والا یوں کہتا ہے چونکہ فلاں تیرا نیک بندہ ہے؛ اس لیے تو میری دعا قبول فرما۔ان میں کونسی مناسبت ہے اور کونسی باہمی ملازمت ہے؟ بے شک ایسا کرنا دعا میں [ممنوع] زیادتی ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿اُدۡعُوۡا رَبَّکُمۡ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡیَۃً ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ﴾ (الاعراف : ٥٥)

''اپنے رب کو پکارو گڑگڑا کر اور چپکے سے؛ بے شک وہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

اس قسم کی دعائیں اپنی ایجاد ہیں۔ جو نہ تو رسول اکرم ﷺ سے منقول ہیں اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے، اور نہ ہی تابعین، اور ائمہ رحمہم اللہ میں سے کسی ایک سے۔ اس قسم کی دعائیں تعویذات اور منتروں [جنتریوں] وغیرہ میں پائی جاتی ہیں جن سے جاہل قسم کے صوفی نقل کر کے لکھا کرتے ہیں۔ حالانکہ دعا افضل عبادات میں سے ہے۔ عبادات کی بنیاد کتاب وسنت اور اتباع پر ہے خواہشات اور بدعات پر نہیں''۔[مجموع الفتاوی ٢٧/ ٨٦]

اگر بحق فلاں سے مقصود اللہ تعالیٰ کی قسم مراد ہے تو یہ بھی ناجائز ہے اس لیے کہ مخلوق کی قسم کھانا ناجائز ہے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی قسم دی جائے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''جس نے غیر اللہ کی قسم کی کھائی اس نے شرک کیا۔'' [1]

ائمہ ثلاثہ کا مسلک:

یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں: یہ مکروہ ہے کہ دعا کرنے والا یوں کہے: (أسألك بحق فلان؛ أو بحق أنبيائك ورسلك وبحق البيت الحرام والمشعر الحرام) ''میں تجھ سے فلاں کے حق سے سوال کرتا ہوں؛ یا تیرے انبیاء اور رسولوں کے حق سے سوال کرتا ہوں' بیت الحرام یا مشعر الحرام کے حق سے سوال کرتا ہوں''۔ ہاں امام ابو حنیفہ، امام محمد رحمہما اللہ تو (اللهم إني أسألك بمعقد العز من عرشك) ''اے اللہ تعالیٰ! میں تجھ سے اپنے عرش کے مقام عزت کی بندش گاہ کے وسیلہ سوال کرتا ہوں'' کو بھی مکروہ جانتے ہیں؛ جبکہ امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ مکروہ نہیں۔ ان کے ہاں اس کے جواز پر ایک اثر موجود ہے۔ [2]

[1] مسند احمد ٢/ ٦٢، حاکم ١/ ١٨۔ حدیث صحیح ہے۔ ورواہ ابوداؤد ۳۲۵۱؛ الارواء الغلیل (٢٥٦١).

[2] امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور محمد بن حسن نے یہ بات مکروہ قرار دی ہے کہ آدمی اپنی دعا میں یہ کہے کہ ''اے اللہ میں تیرے عرش کی عزت کی بندش گاہ کے واسطے سے سوال کرتا ہوں'' کیونکہ اس کی اجازت کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے، البتہ ابو یوسف نے اس کو جائز کہا ہے، کیونکہ انہیں سنت سے نص مل گئی تھی، جس میں یہ ہے کہ نبی علیہ السلام کی دعا یہ تھی کہ ''اے اللہ! میں تجھ سے تیرے عرش کی بندش گاہوں، اور تیری کتاب کی منتہائے رحمت کے وسطے سوال کرتا ہوں'' یہ اثر موضوع ہے۔ اس حدیث کو بیہقی نے کتاب الدعوات الکبیر میں روایت کیا ہے، جیسا کہ بنایہ ٩/ ٣٨٢، اور نصب الرایۃ ٤/ ٢٧٢ میں ہے، مگر اس کی سند میں تین خامیاں ہیں: (١) داود بن عاصم نے ابن مسعود سے نہیں سنا۔ (٢) عبدالملک بن جریج مدلس ہے اور ارسال کرتا ہے۔ (٣) عمر بن ہارون جھوٹ کے ساتھ متہم ہے، جیسا کہ ابن جوزی نے کہا ہے، جیسا کہ بنایہ ٩/ ٣٨٢ میں ہے، کہ یہ حدیث بلاشبہ موضوع ہے اور اسکی سند رائیگاں ہے جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ دیکھئے تھذیب التھذیب ٣/ ١٨٩، ٦/ ٤٠٥، ٧/ ٥٠١، تقریب التھذیب ١/ ٥٢٠۔

اسی طرح کبھی کہتے ہیں: ''بجاه فلان عندك'' واتوسل بالانبياء والرسل والاولياء'' ''تیرے نزدیک جو فلاں کا مقام و مرتبہ ہے؛ یا یوں کہتا ہے: ''اے اللہ تعالیٰ! میں تیری بارگاہ میں تیرے انبیاء اور مرسلین اور تیرے اولیاء کا وسیلہ پیش کرتا ہوں'' [1]؛ مقصود اس توسل سے یہ ہے کہ چونکہ فلاں انسان کو آپ کے ہاں مرتبہ اور وجاہت حاصل ہے تو اس کے شرف کی وساطت سے ہماری دعا قبول فرما۔ ایسا کرنا بھی ممنوع ہے۔

[1] التوسل والوسیلہ ص ٨٢، اور دیکھئے شرح الفقہ الاکبر از ملا علی القاری ص ١٩٨.

اس لیے کہ اگر یہ ایسا توسل تھا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین آپ ﷺ کی زندگی میں پیش کیا کرتے تھے؛ تو وہ آپ ﷺ کی موت کے بعد بھی ضرور ایسا کرتے۔ بے شک حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں آپ کی دعا کو وسیلہ بناتے تھے۔ وہ آپ ﷺ سے گزارش کرتے کہ آپ ان کے لیے دعا کریں؛ تو آپ ﷺ دعا کرتے؛ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین آمین کہتے۔ جیسا کہ نماز استسقاء میں اور دیگر مقامات کے متعلق مروی ہے۔

جب آپ ﷺ فوت ہو گئے؛ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ - جب نماز استسقاء کے لیے نکلے- تو آپ نے یوں دعا فرمائی:

''یا اللہ! جب ہم قحط سالی میں مبتلا ہوتے تھے تو ہم تیرے ہاں اپنے پیغمبر کا وسیلہ لاتے تھے؛ اور تو ہمیں سیراب کرتا تھا؛ اب ہم نبی کریم ﷺ کے چچا کا وسیلہ لائے ہیں''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں گے اور شفاعت فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ سے مانگیں گے''۔ [بخاری ۱۰۱۰]

اس سے مراد یہ نہیں ہوتی تھی کہ ہم اللہ تعالیٰ کو ان کی قسم دیتے ہیں؛ یا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا مقام و مرتبہ ہے اس کے وسیلہ سے سوال کرتے ہیں۔ اگر جاہ و منزلت کا واسطہ پیش کرنا جائز ہوتا تو رسول اکرم ﷺ کی جاہ و مرتبت تو بہر حال حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی جاہ سے زیادہ تھی [تو وہ آپ ﷺ کی جاہ کا توسل اختیار کرتے]۔

البتہ کبھی انسان یوں کہتا ہے: ''میری آپ کے رسول کی اتباع سنت، اور ان سے محبت، ان پر اور دیگر آپ کے تمام انبیاء و مرسلین پر ایمان اور ان کی تصدیق کے وسیلہ سے؛ یا اس طرح کے دیگر کلمات؛ تو یہ دعا میں وسیلہ اور شفاعت اختیار کرنے کا سب سے بہترین طریقہ ہے۔ لیکن کسی دوسرے انسان کی شخصیت کا وسیلہ پیش کرنے؛ اس کی جاہ کے ساتھ متوجہ ہونے کے لفظ میں اجمال ہے۔ اور جو اس کا معنی نہیں سمجھ سکے وہ اس میں غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اگر اس سے مراد اس لیے اس کو سبب بنا کر پیش کرنا ہے کہ وہ دعا کرنے اور شفاعت کرنے والا ہے: اور اگر ایسا کرنا بھی اس کی زندگی میں ہو؛ یا اس لیے ہو کہ وہ دعا کرنے والا اس کو محبوب ہے؛ اور وہ اس کا حکم مانتا ہے؛ اور اس کی اقتداء و اطاعت کرتا ہے؛ اور وہ اس محبت و اقتداء کا مستحق بھی ہے؛ تو اب توسل یا تو اس کی دعا اور شفاعت سے ہوگا؛ یا سائل کی اس سے محبت اور اس کی اطاعت کا وسیلہ ہوگا۔ اور اس سے مراد اس کی قسم دینا اور اس کی ذات کا وسیلہ پیش کرنا ہوگا۔ [یعنی وہ نیک انسان زندہ ہے لیکن آپ اس سے دعا نہیں کرواتے بلکہ اس کے ساتھ آپ کو جو محبت اور عقیدت ہے آپ اس کا واسطہ دے کر دعا کرتے ہیں] تو یہ دوسری قسم مکروہ ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ ایسی ہی کسی چیز کا واسطہ دیکر سوال کرنا بھی ہے۔ کبھی اس سے مراد اس کا سبب اختیار کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ چیز مطلوب کے حصول کے لیے سبب سمجھی جاتی ہے۔ اور کبھی اس سے مراد قسم دینا ہوتا ہے۔

پہلی قسم کی مثال: نیک اعمال کے ساتھ شفاعت:

ان تین آدمیوں کا قصہ جنھوں نے غار میں پناہ لی تھی۔ صحیح حدیث میں ہے: ''تین انسانوں نے ایک غار میں پناہ لی تھی؛ تو غار کے منہ میں پتھر آ گیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا۔ تو انھوں نے اپنے اعمال صالحہ کا ذکر کر کے ان کا توسل اختیار کیا [اور اللہ کی بارگاہ میں دعا کی]۔ ان میں سے ہر ایک نے کہا:

''اگر میں نے یہ نیک کام تیری رضا کے لیے کیا ہے تو ہمیں اس مصیبت سے نجات عطا فرما''۔

چنانچہ پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا؛ اور وہ غار سے باہر نکل آئے''۔[متفق عليه، بخاری ۲۲۱۵؛مسلم ۲۷۴۳؛عن ابن عمر]

پس ان تینوں نے نیک اعمال کا وسیلہ پیش کر کے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ بے شک اعمال صالحہ بہت بڑا ہتھیار ہیں جن کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ اختیار کرتا ہے؛ ان کے ذریعہ متوجہ ہوتا ہے؛ اور ان کا حوالہ دیکر اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

﴿وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ﴾[الشورى ۲۵]

''وہ ان کی دعا قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دیتا ہے''۔[اقتضاء۴۱۶]

حاصل کلام! اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت ایسے نہیں ہے جیسے کسی بشر کے پاس شفاعت کی جاتی ہے۔ کسی انسان کے پاس شفاعت کرنے والا جیسا کہ وہ درخواست گزار کی شفاعت کرتا ہے اسی طرح درخواست گزار اس سے بھی درخواست کر رہا ہے گویا کہ مطلوب منہ اب ایک نہیں دو ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے ہاں شفاعت کرنے والے کو سمجھا جائے کہ وہ بھی طالب کا مطلوب منہ ہے تو اس لحاظ سے مطلوب منہ دو ہو جائیں گے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ تنہا ہے کوئی اس کو جوڑ نہیں۔ معلوم ہوا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی شفاعت نہیں کر سکتا۔ تمام امور اس کے ہاتھ میں ہیں۔ کسی لحاظ سے اس کا کوئی شریک نہیں۔ رسول اکرم ﷺ سید الشفعاء ہیں آپ قیامت کے روز جب سجدہ میں گریں گے؛ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں گے؛ تو اللہ تعالیٰ آپ سے کہیں گے: ''آپ اپنا سر اٹھائیں؛ کہیں آپ کی بات سنی جائے گی۔ سوال کریں آپ کا سوال پورا ہوگا۔ شفاعت کریں آپ کی شفاعت قبول ہوگی۔ اور آپ کے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔ آپ محدود تعداد کو جنت میں داخل فرمائیں گے جن کا تعین اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوگا۔ اس لیے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ﴾ (آل عمران: ۱۵٤)

''کہہ دو بے شک تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾ (آل عمران: ۱۲۸)

''آپ کو کسی امر میں اختیار نہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ (الاعراف: ٥٤)

''خبردار اس کے لیے ہی پیدا کرنا اور حکم دینا ہے۔''

پس جب اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی شفاعت نہیں کر سکتا۔ البتہ جب شفاعت کرنے والے کی شفاعت قبول ہو جاتی ہے تو اس سے اس کی عند اللہ تعالیٰ عزت وقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

''آپ شفاعت کریں آپ کو ثواب حاصل ہوگا؛ ہاں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی زبان پر بھی جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے۔''[1]

نیز صحیح بخاری کی روایت میں ہے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اے عبد مناف! میں تمھارے لیے اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔ اے صفیہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی! میں تیرے لیے بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ اے عباس رسول اللہ ﷺ کے چچا! میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں''۔ ❷

نیز صحیح روایت میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''قیامت کے دن میں تم میں سے کسی شخص کو اس حالت میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر اونٹ ہو جو آواز کر رہا ہو۔ یا بکری آواز کر رہی ہو۔ یا کپڑے حرکت کر رہے ہوں۔ وہ کہے گا: ''اس مشکل میں آپ میری مدد فرمائیں آپ میری مدد فرمائیں''۔ میں جواب دوں گا: ''میں نے تو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا؛ میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں''۔ ❸

پس جب تمام مخلوق کے سردار اور سید الشفعاء ﷺ اپنے خاص قریبی رشتہ داروں سے کہتے ہیں: ''میں تمھارے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا تو غیر کا کیا حال ہوگا؟۔

پس جب دعا کرنے والا اس سے دعا کرتا ہے؛ اور شفاعت کرنے والا شفاعت کرتا ہے؛ اور وہ اس کی دعا سن لے؛ اور شفاعت قبول کر لے؛ تو یہ [دعا یا شفاعت] اس کے ہاں ایسے مؤثر نہیں ہوتی جس طرح مخلوق کی مخلوق کے ہاں شفاعت مؤثر ہوتی ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے ہی کسی ایک کو دعا مانگنے والا بنایا۔ کسی ایک کو شفاعت کرنے والا بنایا۔ وہی تمام بندوں کے افعال کا خالق ہے۔ وہی ہے جس نے کسی کو توبہ کی توفیق دی۔ پھر اس کی توبہ قبول بھی وہی کرتا ہے۔ وہی ہے جس نے عمل کرنے توفیق بخشی پھر اس پر ثواب دیا۔ وہی ہے جس نے دعا کرنے کی توفیق عطا کی پھر اس کو شرف قبولیت بخشا۔ اہل سنت تقدیر پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ سیدھے راہ پر گامزن ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق ہے''۔ [الفتاوی العراقیۃ ۲/ ۱۰۶۷]

❶ بخاری (٤٣٢٢) مسلم (٢٦٢٧) عن ابی موسیٰ۔ الاحادیث الصحیحۃ (١٤٦٤). الفتاوی العراقیۃ ٢/ ١٠٦٦۔

❷ بخاری ()٢٧٥٣ مسلم (١/ ١٣٣ح: ٢٠٤) حدیث ابی ہریرۃ.

❸ بخاری (٢/ ٢٦٦ح: ٣٠٧٣)، مسلم (٦/ ١٠؛ ح: ١٨٣١)، احمد (٢/ ٤٢٦).

میثاق توحید

42۔((وَالْمِيْثَاقُ الَّذِی أَخَذَهُ اللّٰهُ تَعَالَى مِنْ آدَمَ وَذُرِّيَّتِهِ حَقٌّ①۔))۔

''وہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد سے لیا برحق ہے''۔

تشریح: ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ (الاعراف: ۱۷۲)

''اور جب تمھارے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی؛ اور خود ان کو اپنی جانوں پر گواہ بنایا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ وہ کہنے لگے: ضرور؛ ہم گواہ ہیں؛ کہ بروز قیامت یہ نہ کہنے لگو کہ ہم کو اس کی خبر ہی نہ تھی۔''

اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اس نے اولاد آدم کو ان کے آباء کی پشتوں سے نکالا وہ اپنے آپ پر گواہی دے رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کا رب اور بادشاہ ہے اور اس کے سوا ان کا کوئی معبود برحق نہیں۔ اس مضمون کی احادیث مروی ہیں جن میں اولاد آدم کو ان کی پشت سے نکالنے کا؛ اور دائیں جانب والوں اور بائیں جانب والوں میں فرق کرنے کا ذکر ہے۔ اور بعض احادیث میں ان کو اپنے نفسوں پر گواہ بنانے کا ذکر ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہی ان کے رب ہیں۔ احادیث ملاحظہ فرمائیں:

مسند احمد میں ہے؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا:

''عرفہ کے دن وادی نعمان میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے تمام اولاد نکال کر انھیں اپنے سامنے پھیلا کر بالمشافہ ان سے کلام کرتے ہوئے وعدہ لیا: ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قالوا بلى شهدنا....﴾ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟۔ سب نے اثبات میں جواب دیا: ہاں ہم اس کی گواہی دیتے ہیں''۔[الى ....المبطلون﴾] ②

مسند امام احمد رحمہ اللہ میں ہی ہے: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس روایت کے بارے میں دریافت کیا گیا:

''انھوں نے کہا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا؛ آپ سے بھی اس روایت کے بارے میں سوال ہوا تھا آپ نے فرمایا:

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس میں بعض ان احادیث کی طرف اشارہ ہے جو اس باب میں صاف واضح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا۔ ان میں سے چار احادیث اس کی شرح میں ذکر کی گئی ہیں۔ اور ان کی تخریج میری تحقیق کے ساتھ ہو چکی ہے۔ اور تخریج ''السنۃ'' (از ۱۹۵ تا ۲۰۵) یہ احادیث موجود ہیں۔ میں نے چوتھی طبع کی تحقیق میں اس حدیث میں سے پشت پر ہاتھ پھیرنے کو صحت سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ یہ مجھ سے سہو ہو گیا تھا۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے معاف کر دے۔ پھر میری توجہ اس طرف دلائی گئی کہ اس حدیث کے شواہد حسن درجہ کی سند کے ساتھ موجود ہیں جو کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اور یہ اس شرح کے آخر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضعیف سند کے ساتھ موجود ہے۔ (السنۃ (۲۰۳)۔ پس اس پر تنبیہ کرنا اس کا تقاضا تھا۔

② نسائی (۱۱۹۱)، ابن جرير، ابن ابی حاتم، مستدرك حاكم (٥٤٤٢). حاکم نے کہا سند صحیح ہے۔ الصحيحة (١٦٢٣).

''بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا؛ پھر اس کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیر کر اس سے اولاد کو نکالا اور فرمایا: ''میں نے ان کو جنت کے لیے پیدا کیا ہے ان کے عمل بھی جنتیوں والے ہوں گے''۔ پھر پشت پر ہاتھ پھیرا اس سے اولاد کو نکالا؛ فرمایا: ''میں نے ان کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے یہ دوزخیوں والے کام کریں گے''۔

ایک آدمی نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تو عمل کی کیا ضرورت ہے؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے جس بندے کو جنت کے لیے پیدا فرمایا ہے؛ وہ اس سے اعمال بھی جنتیوں والے کرواتا ہے؛ حتی کہ وہ جنتیوں کے عمل پر فوت ہوتا ہے تو اس کو جنت میں داخلہ مل جاتا ہے۔ اور جب کسی بندے کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہو تو اس سے اعمال بھی دوزخیوں والے کراتا ہے یہاں تک کہ وہ دوزخیوں کے عمل پر فوت ہوتا ہے؛ تو اس کو دوزخ میں داخل کر دیا جاتا ہے''۔ [1]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا فرمایا؛ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ تو اس کی پشت سے وہ روحیں نکلیں جو ان کی اولاد سے قیامت تک پیدا ہونے والی تھیں۔ نیز تمام انسانوں کو آنکھوں کے درمیان روشنی کی چمک پیدا فرمائی پھر ان کو حضرت آدم پر پیش کیا۔

حضرت آدم علیہ السلام نے سوال کیا: ''اے رب! یہ کون ہیں؟۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ آپ کی اولاد ہے''۔ ان میں سے ایک انسان کی آنکھوں کے درمیان چمک نے حضرت آدم علیہ السلام کو تعجب میں ڈالا، حضرت آدم علیہ السلام نے سوال کیا: ''اے رب! یہ کون ہے؟۔ فرمایا: ''یہ آپ کی اولاد میں سے آخری امتوں میں سے ایک آدمی ہے جسے داؤد علیہ السلام کہا جاتا ہے''۔ حضرت آدم علیہ السلام نے سوال کیا: ''اے رب اس کی عمر کتنی ہے؟''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اس کی عمر ساٹھ سال ہے''۔

حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ''اے رب! اس کی عمر میں میری عمر سے چالیس سال اضافہ کر دیجیے''۔

جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر اختتام کو پہنچی؛ تو ان کے پاس ملک الموت آیا؛ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا: ''کیا میری عمر سے ابھی چالیس سال باقی نہیں ہیں؟''

انھیں جواب دیا گیا: ''آپ نے وہ عمر اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دی تھی''؟۔

راوی بیان کرتے ہیں: ''حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کیا تو اس کی اولاد نے بھی انکار کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام بھول گئے تو ان کی اولاد بھی بھول گئی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے خطا کی تو اس کی اولاد نے بھی خطا کی''۔ [2]

---

[1] صحیح ہے۔ ابو داؤد (۴۷۰۳)، ترمذی (۳۲۸٤)، نسائی (۱۱۹۰)، ابن ابی حاتم، ابن جریر، صحیح ابن حبان، (٦١٣٣) الضعیفہ (۳۰۷۰). یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے؛ سوائے پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے کے الفاظ کے؛ یہ الفاظ اس کے بعد والی بعض احادیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے وارد ہوئے ہیں۔ اور اس کی سند کو امام حاکم نے حسن صحیح کہا ہے۔ میں نے تخریج السنہ میں اس کی تخریج کر دی ہے؛ برقم ۲۰۵؛ اور اس میں ۲۰۳ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت بھی ہے؛ مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ مختصراً حضرت آدم علیہ السلام کی پشت مبارک سے ان کی اولاد کے نکالے جانے کی احادیث بہت زیادہ ہیں؛ اور یہ سب مل کر ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں۔ شیخ براک حفظہ اللہ فرماتے ہیں: شارح ابن ابی العز نے اس سلسلہ میں کافی احادیث نقل کی ہیں؛ جن میں سے کچھ تو ثابت ہیں؛ اور کچھ روایات ثابت نہیں ہیں۔ شرح عقیدۃ طحاویہ ۱۵۹۔

[2] ترمذی حدیث حسن صحیح ہے۔ حاکم نے کہا حدیث صحیح مسلم کی شرط پر ہے؛ مگر انہوں نے نقل نہیں کی۔ السنة لابن ابی عاصم (۲۰٤).

امام احمد (۱۲۲۷۴) نے روایت کیا ہے؛ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''دوزخی کو قیامت کے دن کہا جائے گا: ''اگر تجھے زمین کی کسی چیز پر ملکیت دی جائے کیا تو اس کا فدیہ دینے کے لیے تیار ہے؟ وہ کہے گا: ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میں نے تجھ سے اس سے معمولی چیز کا مطالبہ کیا تھا؛ میں نے تجھ سے جب تو آدم کی پیٹھ میں تھا وعدہ لیا تھا کہ تو نے میرے ساتھ شرک نہیں کرنا ہوگا؛ لیکن تو نے انکار کیا؛ اور میرے ساتھ شرک کا ارتکاب کیا''۔ ❶

ان کے علاوہ کثیر احادیث ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد کو اس کی پشت سے نکالا اور دوزخیوں جنتیوں کے درمیان امتیاز کیا یہیں سے بعض لوگ استدلال کرتے ہیں کہ ارواح کی تخلیق اجسام سے پہلے ہوئی ❷۔ لیکن یہ آثار ارواح کے تقدم یا اجسام پر دلالت نہیں کرتے کہ کس کو ایسا تقدم حاصل ہے جو ثابت ہو؛ اور استقرار والا ہو۔ زیادہ سے زیادہ ان کی دلالت اس بات پر ہے کہ ان کو پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ نے ارواح کو اشکال عطا کیں پھر ان کی پیدائش ان کے مشاغل اور ان کی اجل کو مقدر فرمایا اور مادہ سے ان کی صورتوں کو نکالا۔ پھر اس کی طرف ان کو واپس لوٹا دیا۔ اور پھر اس کے افراد میں سے ہر فرد کے نکلنے کا وقت مقرر کیا۔ لیکن یہ اس بات دلالت نہیں کرتی کہ تمام ارواح کی تخلیق علیحدہ/مستقل اور ایک ہی جگہ میں ہوئی اور وہ وہیں موجود اور ناطق بھی تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں اجسام کی طرف تدریجی طور پر بھیجا جیسا کہ ابن حزم رحمہ اللہ (۳۸۴-۴۵۶ھ) کا خیال ہے۔[الفصل ٥ / ٥٨]

آثار بھی اس پر دلالت نہیں کرتے۔ ہاں اللہ تعالیٰ جملہ ارواح میں سے تدریجی طور پر بعض ارواح کو پیدا فرماتا رہتا ہے جیسا کہ پہلے سے تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ پس خارج اور واقع میں جو کچھ پیدا ہوتا رہتا ہے وہ سابق تقدیر کے مطابق ہے۔ جیسا کہ تمام مخلوقات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہی طریقہء کار ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان سب کی تقدیریں بنا دی ہیں؛ اور ان کی اجل متعین کر دی ہے؛ اور ان سب کی ہیئات، وصفات کا تعین فرما دیا ہے؛ پھر طے شدہ تقدیر کے مطابق انھیں صورت وجود میں ظاہر کیا۔

پس ذکر کردہ آثار تو سابق تقدیر پر دلالت کرتے ہیں اور بعض اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی صورتوں؛ امثال کو نکالا؛ اور خوش بخت اور بد بخت لوگوں میں فرق کیا''۔[الروح / لابن قیم ١٦٠]

اس موقع پر ان کی ان پر گواہی کا ذکر دو حدیثوں میں موجود ہے؛ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہیں۔ پھر سلف اور خلف کی ایک جماعت کا یہی عقیدہ رہا ہے کہ اس اشہاد سے مراد دراصل ان کی فطرت سلیمہ/توحید پر پیدا کیا جانا ہے۔ سابقہ اوراق میں اسی آیت کے تحت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مفسرین کا کلام گزر چکا ہے''۔[تفسیر ابن کثیر]

پس (شھدنا) کا معنی یوں ہے: کیوں نہیں؛ ضرور ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں۔'' یہ قول حضرت ابن عباس اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کا ہے۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ: ''ان کے بعض کو بعض پر گواہ بنایا''۔ بعض نے کہا ہے کہ (شھدنا) فرشتوں کا قول ہے؛ لفظ بلی پر وقف ہے یہ قول مجاہد اور ضحاک اور سدی رحمہم اللہ کا ہے۔ نیز سدی رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے: ''یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات اور اس کے فرشتوں کی طرف سے خبر ہے کہ انھوں نے بنو آدم کے اقرار پر گواہی دی۔ پہلا معنی زیادہ واضح ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی احتمالات ہیں ان پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ نیز ظاہر آیت بھی پہلے معنی پر شاہد ہے۔

---

❶ بخاری، مسلم، المسند (٣/ ١٢٧، ١٢٩).

❷ امام عفیفی فرماتے ہیں اس مسئلہ کو معلوم کرنے کے لیے ابن القیم رحمہ اللہ کی کتاب الروح (۱۸) اور تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تفسیر کا مطالعہ کریں۔

جان لیجیے کہ کچھ مفسرین ایسے بھی ہیں جنہوں نے صرف اس کا قول ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی اولاد کو اس کی پشت سے نکالا پھر ان پر ان کو ہی گواہ بنایا پھر ان کو واپس لوٹا دیا۔ جیسے ثعلبی (۴۲۷ھ)؛ بغوی (۵۱۶ھ) رحمہم اللہ وغیرہ؛ اور کچھ مفسرین نے اس قول کا ذکر تک نہیں کیا۔ اس کے بجائے کہا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے اپنی ربوبیت اور وحدانیت پر دلائل بیان فرمائے؛ ان کی عقلوں اور بصیرتوں نے اس پر گواہی دی؛ جو اللہ تعالیٰ نے ان میں ودیعت کر رکھی تھی؛ جیسے زمخشری (۴۶۷ھ-۵۳۸ھ) اور دیگر۔ لیکن بعض نے دونوں قول ذکر کیے ہیں جیسے: واحدی (۴۶۸ھ)، رازی (۵۴۴) اور قرطبی رحمہم اللہ اور دیگر حضرات۔

علامہ رازی رحمہ اللہ نے پہلے قول کو اہل سنت کی طرف منسوب کیا ہے جب کہ دوسرا قول معتزلہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

کچھ شبہ نہیں کہ آیت مذکورہ پہلے قول پر دلالت نہیں کرتی۔ بعض روایات میں یہ ذکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا؛ بلکہ صرف اس قدر وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو بنو آدم کی پیٹھوں سے نکالا۔ ہاں بے شک بعض احادیث میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکالا؛ اور انہیں اس پر گواہ بنایا؛ اور بعض روایات میں ان سے عہد لینے؛ اور ان میں سے بعض کے جنتی اور جہنمی ہونے کے فیصلہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث۔ اور بعض احادیث میں ارواح کو نکالنے اور انہیں حضرت آدم علیہ السلام کو دکھانے کا ذکر ہے۔ ان میں گواہ بنانے اور فیصلہ کرنے کا ذکر نہیں۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس کا ذکر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر اور وہ حدیث موقوف ہے جس میں گواہ بنانے کا ذکر ہے۔ جیسے پہلے قول والے حضرات کا کہنا ہے۔ محدثین رحمہم اللہ نے اس حدیث پر جرح کی ہے؛ سوائے امام حاکم رحمہ اللہ کے کسی صحت کا خیال رکھنے والے امام نے اس حدیث کا ذکر نہیں کیا؛ جبکہ اس مسئلہ میں امام حاکم رحمہ اللہ کی سست روی مشہور ہے۔

جس حدیث میں ذکر ہے کہ بعض کو جنت اور بعض کو دوزخ کی جانب بھیجے جانے کا فیصلہ کیا گیا؛ اس سے مسئلہ تقدیر ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے شواہد بھی کافی تعداد میں ہیں۔ اور اہل سنت میں اس بارے میں کچھ اختلاف نہیں۔ اس میں صرف باطل پرست اہل بدعت قدریہ مخالفت کرتے ہیں۔

پہلے قول میں اہل سنت کے متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ہے اگر اختصار کا التزام ملحوظ خاطر نہ ہوتا تو میں اس سلسلہ میں وارد احادیث کا تفصیل سے ذکر کرتا۔ نیز اعتراضات، معانی معقولہ اور آیات کے الفاظ کی دلالت کا تفصیل سے ذکر کرتا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ کی وضاحت:

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ آیت کو مشکل مقامات میں سے ہے''۔ علماء نے اس آیت کی تاویل میں کلام کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے؛ اس میں سے ہم اپنے علم کی حد تک کچھ وضاحت کرتے ہیں۔

فریق اول: نے کہا ہے: آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو ایک دوسرے کی پشت سے نکالا۔ اس آیت کا معنی:

﴿وَ اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ (الاعراف: ۱۷۲)

''اور خود ان کو اپنی جانوں پر گواہ بنایا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟۔''

یہ ہے کہ: ان کی توحید کی جانب رہنمائی کی۔ اس لیے کہ ہر بالغ، عاقل فطرتاً جانتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے۔ پس یہ رہنمائی گواہ بنانے

کے قائم مقام ہے۔ جیسا کہ آسمانوں اور زمین کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِينَ﴾ ''انھوں نے کہا ہم بخوشی آتے ہیں''۔ نیز امام قفال رحمہ اللہ (۲۹۱-۳۶۵ھ) کا مسلک یہی ہے۔

فریق دوم: کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اجسام کی تخلیق سے پہلے ارواح کو نکالا؛ پھر ان میں معرفت کو ودیعت فرمایا؛ جس سے وہ اللہ تعالیٰ کے خطاب کو سمجھ سکیں۔ اس کے بعد علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں مروی احادیث کا ذکر کیا ہے۔

❀ البتہ پہلے قول کی صحت پر سب سے قوی دلالت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے جو بخاری و مسلم میں مذکور ہے جس میں ہے کہ: ''میں نے تجھ سے اس سے بھی معمولی کام کا مطالبہ کیا یعنی میں نے تجھ سے وعدہ لیا جب تو آدم کی پیٹھ میں تھا کہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا ہوگا لیکن تو نہ مانا اور شرک پر ڈٹ گیا''۔ [1]

❀ ایک دوسری سند سے مروی ہے کہ: ''میں نے تجھ سے اس سے نہایت کم اور آسان کام کا مطالبہ کیا لیکن تو نے اس کو پورا نہ کیا''؛ تو اسے دوزخ لے جایا جائے گا''۔ [مسند أحمد ۱۳۱٤۷]

❀ اس حدیث میں آدم علیہ السلام کی پشت کا ذکر نہیں ہے۔ نیز پہلی روایت میں ارواح کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا ذکر اس طرح نہیں جس طرح پہلے قول والوں نے بیان کیا ہے۔ بلکہ پہلے قول دو عجیب باتیں پائی جاتی ہیں:

اولاً: اس میں ہے کہ لوگوں نے اس وقت کلام کیا، ایمان کا اقرار کیا۔ اسی اقرار کی وجہ سے قیامت کے دن ان پر حجت قائم ہوگی۔

ثانیاً: [ان کے بقول] آیت اس پر دلالت کرتی ہے؛ لیکن آیت کے دلالت نہ کرنے کے ہمارے پاس چند اسباب ہیں:

سبب اول :......اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کہا ہے؛ آدم نہیں کہا۔

سبب ثانی :......اللہ تعالیٰ نے من ظهورهم فرمایا ہے؛ من ظهره نہیں فرمایا؛ یہ بدل بعض یا بدل اشتمال ہے۔ اس کے احسن ہونے میں کچھ کلام نہیں۔

سبب ثالث :......اللہ تعالیٰ نے جمع کا لفظ ذرياتهم استعمال کیا ہے اس کا واحد ذريته استعمال نہیں کیا۔

سبب رابع :......بے شک اللہ تعالیٰ نے اشهدهم على انفسهم کہا ہے۔ پس ضروری ہے کہ شاہد کو اپنی شہادت یاد ہوتی ہے کہ اس نے کیا گواہی دی تھی۔ اور بے شک وہ اس دنیا میں آنے کے بعد شہادت کو یاد رکھتا۔ اس چیز کی طرف اشارہ آگے آئے گا کہ اسے پہلے کی شہادت یاد نہیں۔

سبب خامس :......اللہ تعالیٰ نے بتایا اس اشہاد میں حکمت ان پر حجت قائم کرنا تھا [فرمان ربانی ہے:]

﴿اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ (الاعراف: ۱۷۲)

''تا کہ قیامت کے دن (کہیں یوں نہ) کہنے لگو کہ ہم کو اس کی خبر ہی نہ تھی۔''

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام بھیج کر؛ نیز پیدائشی فطرت سلیمہ کے ذریعہ سے بھی ان پر حجت قائم کیے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء: ۱٦٥)

''پیغمبروں کو خوشخبری سنانے اور ڈرانے والے؛ تا کہ انبیاء کے آنے کے بعد لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر الزام کا موقع نہ رہے۔''

[1] صحیح مسلم (۸/ ۱۳٤)، بخاری (٤/ ۲۳۹)، الصحیحة، رقم (۱۷۲).

سبب سادس :......ان کو یہ یاددلانا: ﴿ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴾ ''تاکہ قیامت کے دن (کہیں یوں نہ) کہنے لگو کہ ہم کو اس کی خبر ہی نہ تھی۔'' اور یہ معلوم ہے کہ وہ اپنے آدم کی پشت سے نکالے جانے نیز اس وقت ان تمام کی گواہی دینے سے غافل ہیں۔ چنانچہ اس کا ذکر ان میں سے کوئی بھی نہیں کررہا ہے۔

سبب سابع :......ارشاد ربانی ﴿اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ﴾(الاعراف : ۱۷۲) ''یا یہ نہ کہو کہ بے شک شرک تو پہلے ہمارے آباء نے بھی کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ان کی اولاد تھے۔'' اس اشہاد میں دو حکمتوں کا ذکر ہے تاکہ وہ غفلت یا تقلید کا دعویٰ نہ کریں۔ غافل میں شعور نہیں ہوتا اور مقلد تقلید میں دوسروں کے تابع ہوتا ہے۔ اور ان دونوں حکمتوں کا ترتب صرف ان چیزوں پر ہے جن پر پیغمبروں نے دلیلیں پیش کی ہیں مزید فطرت سلیمہ سے بھی اس پر حجت موجود ہے۔

سبب ثامن :......ارشاد ربانی ہے: ﴿اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾(الاعراف : ۱۷۳) ''کیا تو ہمیں اس وجہ سے ہلاک کررہا ہے جو کچھ باطل پرستوں نے کیا''۔ اگر اللہ تعالیٰ انہیں ان کے شرک اور کفر/ انکار کی وجہ سے عذاب دیتا تو وہ ایسی بات نہ کہتے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس لیے ہلاکت کرتا ہے کہ انہوں نے رسولوں کی مخالفت اور ان کی تکذیب کرتے رہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ: ﴿ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴾ ''وہ بستیوں کو ظلم کے ساتھ برباد نہیں کرتا جب کہ بستیوں والے غافل ہوتے ہیں''۔ بے شک وہ ان میں رسول بھیج کر انہیں ڈرانے اور عذر ختم کرنے کے بعد ہلاک کرتا ہے۔

سبب تاسع :......اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو اس کے نفس پر گواہ بنایا ہے کہ وہ اس کا رب اور خالق ہے اس پر اپنی کتاب میں کئی مقامات پر دلیل پیش کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (لقمان : ۲۵)

''اگر تو ان سے دریافت کرے کہ آسمانوں اور زمین کا کون خالق ہے تو وہ کہیں گے اللہ تعالیٰ (خالق) ہے۔''

پس یہی وہ محبت ہے جس کے مضمون پر خود ان کو اپنے آپ پر گواہ بنایا ہے۔ پھر پیغمبروں نے ان کو اس گواہی کی یاددہانی بھی کرائی ہے؛ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (ابراهيم : ۱۰)

''کیا اللہ تعالیٰ میں شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔''

سبب عاشر :......اللہ تعالیٰ نے اس گواہی کو ایک نشانی/ آیت قرار دیا ہے؛ اور اس کی آیات اپنے مدلول کے مستلزم پر واضح دلالت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آیات کا یہی عالم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۝﴾ (الاعراف : ۱۷٤)

''اور اسی طرح ہم آیتوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ لوٹ آئیں۔'' [الروح ۱۶۷]

نیز اس کا تعلق فطرت کے ساتھ ہے: ﴿الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ ''وہ فطرت جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ کے خلق میں کچھ تبدیلی نہیں''۔ کوئی بچہ بھی ایسا نہیں جو فطرت پر پیدا نہ ہوتا ہو۔ کوئی بچہ بغیر فطرت کے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایسی چیز ہے جس سے فارغ ہوا گیا ہے۔ [یعنی وہ پہلے سے طے شدہ ہے۔] اس میں تغیر، تبدل نہیں ہوسکتا۔ نیز اس کا ذکر

پہلے اشارۃً ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم

ابن عطیہ رحمہ اللہ [۴۸۱-۵۴۲ھ] وغیرہ نے آیت کا معنی سمجھا؛ لیکن وہ خوفزدہ ہو گئے کہ کس طرح ان احادیث صریحہ کے ظاہر کی مخالفت کی جائے جن میں واضح طور پر مذکور ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے ان کو نکالا اور ان کو ان کی جانوں پر گواہ بنایا؛ پھر ان کو لوٹا دیا۔ نیز اسی طرح شیخ ابو منصور ماتریدی (۳۳۳ھ) نے ان دونوں اقوال کو ''شرح التاویلات ۲/ ۳۰۵'' میں ذکر کیا ہے۔ اور دوسرے قول کو ترجیح دی اس پر مزید بحث کی ہے؛ جس سے اس طرف ان کے میلان کا پتہ چلتا ہے۔

قال الشیخ عفیفی: انظر مسئلة رقم ۱۸ فی کتاب الروح لابن قیم رحمہ اللہ۔

ربوبیت کا فطری اقرار:

کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرنا فطری امر ہے؛ اور شرک بعد میں پیدا ہونے والی عارض چیز ہے۔ عام طور پر اولاد اسے ماں باپ کی تقلید میں پاتے ہیں۔ پس جب قیامت کے دن وہ حجت پیش کریں گے کہ ہم نے اس لیے شرک کیا کہ ہمارے باپ دادا شرک کرتے تھے؛ ہم ان کے رسم و رواج پر چلتے رہے؛ جیسے عام طور پر لوگ کھانے پینے؛ لباس رہائش وغیرہ میں اپنے ماں باپ کو بود و باش کو پسند کرتے ہیں۔ تو ان سے کہا جائے گا: ''بے شک تم صانع کا اقرار کرتے تھے۔ نیز تم مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمھارا رب ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ تم نے یہ گواہی اپنی جانوں پر دی تھی۔ ظاہر ہے کہ آدمی کی گواہی اس کے نفس پر یہی تو ہے کہ وہ اس کا اقرار کرے؛ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ﴾(النساء: ۱۳۵)

''اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے سچی گواہی دو خواہ وہ تمھارے اپنے خلاف ہو۔''

اس سے یہ مقصود نہیں کہ انسان کہے میں اپنے آپ پر اس چیز کی گواہی دیتا ہوں؛ بلکہ جس نے بھی کسی چیز کا اقرار کیا تو اس نے اپنے نفس پر اس چیز کی گواہی دی۔ پس تم اس معرفت اور اقرار کو چھوڑ کر جو تم نے اپنے نفسوں پر گواہی دی تھی؛ شرک کی جانب کیوں چلے گئے؟ بلکہ تم ایک یقینی اور معلوم چیز چھوڑ کر ایسی چیز کی جانب کیوں چلے گئے جس کی حقیقت معلوم نہیں کی جا سکتی؟۔ بس ان کی تقلید میں جن کے پاس کوئی دلیل نہیں؛ بخلاف دنیاوی عادات میں ان کی پیروی کے؛ کیونکہ اس میں تمہارے پاس اتنا علم نہیں تھا جس سے اس کی خرابی معلوم ہو سکے۔ اور اس میں تمھاری مصلحت تھی۔ برخلاف شرک کے؛ بیشک اس کے متعلق تمھیں معرفت حاصل تھی اور تمہاری اپنے آپ پر گواہی موجود تھی؛ جس سے شرک خرابی؛ اور تمہارے راہ حق سے تجاوز کی خرابی واضح تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک بچہ اپنے ماں باپ کی طرف سے جو دین پاتا ہے: وہ تربیت اور عادت کا دین ہے۔ جو کہ دنیاوی مصلحت کے لیے ہوتا ہے۔ بلا شک و شبہ بچے کے لیے کفیل کا ہونا ضروری ہے؛ اور اس کفالت کے سب سے بڑے حق دار اس کے والدین ہوتے ہیں۔ اسی لیے شریعت میں وارد ہوا ہے کہ بچہ ظاہری دنیاوی احکام میں اپنے والدین کے ساتھ ان کے دین پر ہوتا ہے۔ اور اس دین میں صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس وقت تک سزا نہیں دیتے جب تک وہ بالغ اور عقل مند نہ ہو جائے؛ اور اس پر حجت قائم نہ ہو جائے۔ تو اس وقت اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ [اسلام] دین عقل و علم کو اختیار کرے۔ اگر وہ عقل سے غور کرے تو معلوم ہو

جائے گا کہ اسلام ہی صحیح دین ہے۔ اب اگر ماں باپ ہدایت یافتہ ہیں تو بہت اچھا ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آباء کے دین پر ہونے کا اقرار کیا۔ فرمایا:

﴿وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِ یْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ﴾ (یوسف: ۳۸)

''ہم تیرے اللہ تعالیٰ اور تیرے باپ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے۔''

اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے ان سے کہا تھا:

﴿ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ ﴾[البقرة ۱۳۳]

''ہم تیرے معبود کی؛ اور تیرے باپ دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے''۔

اور اگر والدین انبیاء کے مخالف تھے؛ تو اس کے لیے پیغمبروں کی اتباع کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًا وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ (العنکبوت: ۸)

''اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا؛ اگر تیرے ماں باپ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک بنائے جس کی حقیقت کی تجھے واقفیت نہیں تو ان کا کہنا نہ مانو۔''

پس جو شخص بغیر بصیرت اور علم اپنے باپ دادا کے دین کی اتباع کرتا ہے؛ بلکہ معلوم شدہ دین حق کو چھوڑ کر ان کی راہ اختیار کرتا ہے؛ وہ اپنی خواہش کی اتباع کرتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ۝﴾ (البقرة: ۱۷۰)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کی پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا تو وہ کہتے ہیں ہم اس دین کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا بھلا اگر ان کے باپ دادا کسی چیز کا عقل نہ رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔''

دار اسلام؛ اختیار اسلام:

یہ اکثر ان لوگوں کا حال ہے جو اسلام پر پیدا ہوتے ہیں؛ ان میں سے ہر کوئی اپنے باپ دادا کی اتباع کرتا ہے؛ جو بھی ان کا اعتقاد اور مذہب ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ غلط بھی ہو؛ تو اسے اس میں بصیرت نہیں ہوتی۔ ایسا شخص دار [گھر بار/ معاشرہ و ماحول] کے حساب سے مسلمان ہے؛ اختیاری مسلمان نہیں۔ اس شخص سے جب قبر میں سوال ہوگا کہ تیرا رب کون ہے؟ تو کہے گا: افسوس افسوس! مجھے اس کا علم نہیں، میں نے جو کچھ لوگوں سے سنا اسی طرح کہہ دیا''۔ [بخاری ۸۶؛ مسلم ۹۰۵]

صاحب بصیرت انسان کو چاہیے کہ اس مقام پر غور و فکر کرے۔ اور اپنے آپ کی خیر خواہی کرے؛ اور پھر اس کا ساتھ دے؛ اور وہ عقل سے سوچے کہ: وہ کس فریق میں شامل ہونا چاہتا ہے؟۔ توفیق دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

بیشک توحید ربوبیت [سمجھنے] کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ یہ تو فطرت انسانی میں مرکوز ہے۔ انسان کو پہلے تو اپنی تخلیق پر غور

کرنا چاہیے۔ جب وہ نطفہ تھا؛ پھر وہ کمر اور سینے کی ہڈیوں سے نکلا۔ پھر یہ نطفہ مضبوط آرام کی جگہ میں چلا گیا جہاں وہ تین اندھیروں میں رہا۔ وہاں اس سے والدین اور دیگر تمام مخلوق کی تدبیر ختم ہو کر رہ گئی۔ اگر اس نطفہ کو تختہ یا لکڑ پر رکھ دیا جائے؛ اور پھر پوری دنیا کے حکیم/ ڈاکٹر اس پر جمع ہو جائیں کہ وہ اس نطفہ سے کسی چیز کو پیدا کریں؛ تو وہ اس پر قدرت نہیں رکھتے۔ جب کہ اس میں طبیعت سازی کے عمل کا وہم وگمان بھی محال ہے۔ کیونکہ نطفہ ایک قسم کا بے جان فضلہ ہے؛ اسے زندہ نہیں کہا جا سکتا۔ نہ اس پر کسی کے فعل اور تدبیر کا کچھ اثر ہے۔ جب انسان اس پر غور کرے؛ اور سوچے کہ یہ نطفہ کیسے ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتا ہے۔ تو اسے اللہ تعالیٰ کی توحید ربوبیت کا پتہ چلتا ہے؛ توحید ربوبیت سے انسان توحید فی الوہیت کی طرف پہنچتا ہے۔ جب عقل سے معلوم ہوا کہ اس کا ایک رب ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے؛ تو پھر کیسے روا ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے کی عبادت کرے؟ اور جس قدر وہ زیادہ تفکر، تدبر کرتا جائے گا اس کے یقین میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور اس کی توحید پختہ ہو جائے گی و اللہ تعالیٰ الموفق لا رب غیرہ ولا الہ سواہ . [اس کے علاوہ کوئی رب نہیں؛ اس کی علاوہ کوئی معبود نہیں]

تقدیر پر ایمان کا وجوب

۴۳۔((وَقَدْ عَلِمَ اللّٰهُ تَعَالٰی فِیمَا لَمْ یَزَلْ عَدَدَ مَنْ یَّدْخُلُ الْجَنَّةَ وَ عَدَدَ مَنْ یَّدْخُلُ النَّارَ جُمْلَةً وَّاحِدَةً فَلَا یُزَادُ فِی ذٰلِكَ الْعَدَدِ وَلَا یُنْقَصُ مِنْهُ①))۔

''اللہ تعالیٰ کو ازل سے علم ہے کہ کتنی تعداد جنت میں داخل ہو گی اور کتنی تعداد دوزخ میں داخل ہوں گی؛ یہ حتمی بات ہے؛ نہ اس تعداد میں زیادتی ہو گی نہ اس میں کمی کی جائے گی۔''

تَشْرِیح: ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ٥﴾ (الانفال : ۷۵)

''بے شک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مؤلف رحمہ اللہ اس حدیث کی طرف اشارہ کر رہے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے؛ آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم لوگ جانتے ہو کہ یہ کتابیں کیا ہیں؟۔ہم نے عرض کیا: ''نہیں مگر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں بتائیں''۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا: ''یہ ربِ العالمین کی طرف سے ہے اور اس میں اہل جنت اور ان کے آباء واجداد اور ان کے قبیلوں کے نام ہیں۔پھر اجمالی ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ''ان میں نہ کمی ہو گی اور نہ زیادتی ہو گی''۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بائیں ہاتھ والی کتاب کے متعلق فرمایا: ''یہ بھی ربِ العالمین کی طرف سے ہے اس میں اہل دوزخ اور ان کے آباء واجداد اور قبائل کے نام مذکور ہیں؛ پھر کچھ اجمالی سا بیان کر کے فرمایا: ''ان میں کمی نہ ہو گی اور نہ زیادتی''۔صحابہ کرام نے عرض کیا: ''تو پھر عمل کا کیا فائدہ؛ اس سے تو فراغت ہو چکی ہے''۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سیدھی راہ چلو میانہ روی اختیار کرو کیونکہ جنتی کا خاتمہ جنت والوں ہی کے عمل پر ہو گا۔اگر اس سے پہلے کیسے بھی عمل ہوں اور اہل دوزخ کا خاتمہ دوزخ والوں کے اعمال پر ہی ہو گا؛ خواہ اس سے پہلے اس نے کسی طرح کے بھی عمل کئے ہوں''۔پھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھوں سے اشارہ کیا: اور دونوں کتابوں کو پھینک دیا پھر فرمایا: ''تمہارا رب بندوں سے فارغ ہو چکا ہے ایک فریق جنت میں اور دوسرا دوزخ میں ہے''۔[الترمذی/مخرج فی صحیحہ ۸۴۸]

❀ ایمان کے اصولوں میں سے چھٹا اصول تقدیر پر ایمان ہے۔تقدیر پر ایمان کے چار مراتب ہیں:

۱۔ پہلا مرتبہ: علم سابق: اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ کو ہر ہونے والی چیز کے بارے میں علم تھا۔پس اسے بندوں کے احوال اور ان کی اطاعت گزاری یا نافرمانی کا پہلے سے قدیم میں ہی ازلی علم تھا۔اور وہ ہمیشہ سے اس کا عالم رہا ہے۔

۲۔ دوسرا مرتبہ: تحریر تقدیر: اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیریں مقرر کر دی تھیں۔یہ سب کچھ اس نے اپنے علم کے حساب سے مخلوق کے پیدا کئے جانے سے پچاس ہزار سال قبل ہی تحریر کر دی تھیں۔جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا مرتبہ: عموم مشیئت: یعنی کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کی مشیئت / چاہت سے باہر نہیں ہو سکتی۔پس اس عالم وجود میں جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی چاہت سے ہو رہا ہے۔پس ہر حرکت اور سکون؛ ہر کمی اور زیادتی؛ اور ہر ایک تبدیلی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مشیئت سے ہی ہو رہی ہے۔

۴۔ چوتھا مرتبہ: عمومِ تخلیق: یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہر ایک چیز کے خالق ہیں؛ اور کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ ہے۔

ان چار مراتب پر ایمان رکھنا ایک مسلمان کے لیے بہت ضروری ہے۔مصنف رحمہ اللہ نے یہی چیزیں مختلف اور متفرق پیرائے میں بیان کی ہیں۔

﴿وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا﴾ (الاحزاب : ٤٠)
''اور اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ سے ہر چیز کا علم ہے۔''

اللہ تعالیٰ اس صفت کے ساتھ موصوف ہے کہ اس کو ہر چیز کا ازلی اور ابدی علم ہے۔ کبھی بھی اس علم سے قبل جہل کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَ مَا کَانَ رَبُّكَ نَسِیًّا﴾ ''تیرا رب کبھی بھولنے والا نہیں ہے''۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''ہم بقیع الغرقد قبرستان میں ایک جنازہ میں تھے؛ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے؛ آپ بیٹھ گئے ہم بھی آپ کے گرد بیٹھ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چھڑی تھی؛ آپ نے سر جھکایا ہوا تھا؛ اور چھڑی کے ساتھ زمین کریدنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو نفس پیدا ہو چکا ہے اس کا ٹھکانا جنت یا دوزخ لکھا جا چکا ہے؛ نیز اس کا نیک بخت یا بد بخت ہونا بھی لکھا جا چکا ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا ازلی اور محیط علم

٤٤ ۔ وَکَذٰلِكَ أَفْعَالُهُمْ فِیْمَا عَلِمَ مِنْهُمْ أَنْ یَّفْعَلُوْهُ وَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَهٗ① وَالْأَعْمَالُ بِالْخُوَاتِیْمِ ② وَالسَّعِیْدُ مَنْ سَعِدَ بِقَضَاءِ اللّٰهِ وَالشَّقِیُّ مَنْ شَقِیَ بِقَضَاءِ اللّٰهِ③ .

''اس طرح ان کے افعال بھی؛ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ لوگ کیا کام کریں گے؟ ہر شخص کے لیے وہی کام آسان ہوتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ اور اعمال کا تعلق خاتمہ کے ساتھ ہے۔ اور نیک بخت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں نیک بخت ہے اور بد بخت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں بد بخت ہے''۔

① ۔ آگے مصنف رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ((فَلَا یُزَادُ فِی ذٰلِكَ الْعَدَدِ وَلَا یُنْقَصُ مِنْهُ))۔ ''نہ اس تعداد میں زیادتی ہوگی نہ اس میں کمی کی جائے گی۔'' ان کی تعداد حتمی طور پر طے ہو چکی ہے۔ اور بشریت کی یہ تعداد اللہ تعالیٰ کے سابق علم میں تھی؛ اور اس کی کتابت ہو چکی؛ جو حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر دنیا کے آخری بشر تک سب کو شامل ہے۔ پس آیت کریمہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ (الانفال : ۷۵) ''بے شک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے۔'' میں اللہ تعالیٰ کو علم تام سے موصوف کرنے کا تقاضا ہے کہ اس کا علم ما کان وما سیکون سب کو ہر لحاظ سے من کل وجوہ شامل ہو۔

① ۔ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ صحیحین میں مروی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے؛ میں نے تخریج السنہ میں (۱۷۱) اس کی تخریج کی ہے۔ صحیح سند سے یہ ثابت ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی تو کہنے لگے: ''اب ہم خوب کوشش کریں گے''۔ اور بعض روایات میں ہے: کہنے لگے: ''پس اب ہم اسے پا لیں گے؛ پس اب ہم اسے پا لیں گے؛ پس اب ہم اسے پا لیں گے''۔ [السنہ ۱۶۱ تا ۱۶۷]۔ اس میں ان جبریہ متوکلہ پر بھی رد ہے جو فہم صحابہ کے برعکس اس کو سمجھتے ہیں۔

② ۔ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ والی حدیث کی طرف اشارہ ہے؛ جو مسند امام احمد اور بخاری میں ہے۔ (۲۱۶)۔

③ ۔ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث مسند بزار؛ اور دیگر کتب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے؛ اس کے الفاظ یہ ہیں: ''بد بخت وہ ہے جسے ماں کے پیٹ میں بد بخت لکھ دیا گیا؛ اور نیک بخت وہ ہے جسے ماں کے پیٹ میں نیک بخت لکھ دیا گیا''۔ اس کی سند صحیح ہے؛ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ (الروض النضیر ۱۰۹۸؛ تخریج السنة ۱۸۸)۔

اس پر ایک آدمی نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! تو کیا ہم لکھے ہوئے پر بھروسہ نہ کریں اور عمل چھوڑ دیں؟ آپ نے فرمایا: ''جو شخص نیک بختوں میں سے ہوگا؛ وہ نیک بختوں والے اعمال پر چل پڑے گا؛ اور جو شخص بد بختوں میں سے ہوگا وہ بدبختوں جیسے عمل کرے گا'' پھر آپ نے فرمایا: ''عمل کرو ہر ایک کے لیے وہی عمل آسان کر دیا گیا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ نیک بخت لوگوں کے لیے نیکوکاروں کے کام آسان کر دیے گئے ہیں؛ اور اہل شقاوت کے لیے اہل شقاوت کے کام آسان کر دیے گئے ہیں''۔ اس کی تصدیق میں آپ ﷺ نے آیت تلاوت فرمائی:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰیo وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰیo فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰیo وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی o وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰیo فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰیo﴾ (اللیل: ٥۔١٠) [1]

''پس لیکن جس نے دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور جنت کی تصدیق کی ہم اس کو آسانی کی توفیق عطا کریں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ ہوا اور جنت کی تکذیب کی اس کو مشکل کی توفیق دیں گے۔'' [الحدیث]

[1] بخاری ١٣٦٢، مسلم ٢٦٤٧، ظلال الجنة (١٧١).

تقدیر کا فیصلہ:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: ((وَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَهٗ وَالأَعْمَالُ بِالْخُوَاتِيْمِ وَالسَّعِيْدُ مَنْ سَعِدَ بِقَضَاءِ اللّٰهِ وَالشَّقِيُّ مَنْ شَقِيَ بِقَضَاءِ اللّٰهِ .))

''ہر شخص کے لیے وہی کام آسان ہوتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ اور اعمال کا تعلق خاتمہ کے ساتھ ہے۔ اور نیک بخت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں نیک بخت ہے اور بد بخت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں بد بخت ہے''۔

تَشْرِیح: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان اور حدیث نبوی گزر چکے: ((وَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَهٗ))۔

نیز حضرت زہیر ابوزبیر سے وہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں؛ فرمایا:

''حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا؛ عرض کیا:

((يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! ، بَيِّنْ لَنَا دِيْنَنَا كَأَنَّا خُلِقْنَا الآنَ ، فِيْمَا الْعَمَلُ الْيَوْمُ؟ أَفِيْمَا جَفَّتْ بِهِ الاَقْلَامُ وَجَرَتْ بِهِ الْمَقَادِيْرُ؟ أَمْ فِيْمَا نَسْتَقْبِلُ؟ قَالَ: لاَ ، بَلْ فِيْمَا جَفَّتْ بِهِ الاَقْلَامُ وَجَرَتْ بِهِ الْمَقَادِيْر ، قَالَ: فَفِيْمَ الْعَمَلُ؟ ، قَالَ زَهَيْرٌ: ثُمَّ تَكَلَّمَ أَبُو الزَّبَيْرِ بِشَيءٍ لَمْ أَفْهَمْهُ ، فَسَأَلْتُ مَا قَالَ؟ فَقَالَ: اِعْمَلُوا ، فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ))۔

''یارسول اللہ ﷺ! ہمارا دین بیان کیجئے؛ گویا ہم اب پیدا ہوئے؛ ہم جو عمل کرتے ہیں تو اس مقصد کے لیے کرتے ہیں جس کو لکھ کر قلم سوکھ گئی اور تقدیر جاری ہو گئی ہے؟ یا اس مقصد کے لیے جو آگے ہونے والا ہے؟ [اور پہلے سے اس کی نسبت کچھ قرار نہیں پا سکتا]، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں بلکہ اس مقصد کے لیے عمل کرو جس کو لکھ کر قلم سوکھ گئی اور تقدیر جاری ہو چکی ہے''۔ سراقہ نے کہا: ''پھر عمل سے کیا فائدہ ہے؟ زہیر نے کہا: ابوالزبیر نے کچھ بات کہی؛ جس کو میں نہیں سمجھ سکا، میں

نے [لوگوں سے] پوچھا: کیا کہا؟ تو کہا: ''عمل کرو ہر ایک شخص کے لیے توفیق کی ارزانی ہوتی ہے'' ❶۔

❶ صحيح مسلم، فی القدر (٨/ ٤٨)، مسند احمد (٣/ ٢٩٢-٣٩٣)، صحيح ابن حبان (١٨٠٨، ١٨٠٩).

مسلم میں ہے: حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک آدمی بظاہر لوگوں کے سامنے جنتیوں والے کام کرتا ہے حالانکہ وہ دوزخی ہوتا ہے اور ایک آدمی بظاہر لوگوں کے سامنے دوزخیوں کے کام کرتا ہے حالانکہ وہ جنتی ہوتا ہے''۔ ❶

❶ بخاری ٦٤٩٣، مسلم ١١٢، الظلال (٢١٦).

یہ متفق علیہ روایت ہے؛ بخاری میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ: ''بے شک اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے''۔

نیز صحیحین میں ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: صادق ومصدوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حدیث سنائی:

''تم میں سے ہر شخص کا اصل مادہ اس کی ماں کے رحم میں چالیس دن تک نطفہ کی حالت میں رہتا ہے۔ پھر چالیس روز منجمد خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر چالیس روز گوشت کے لوتھڑے کی حالت میں رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کی جانب ایک فرشتہ بھیجتے ہیں جو اس میں روح پھونکتا ہے۔ اسے چار چیزوں کے لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے: ۱۔ اس کا رزق، ۲۔ موت، ۳۔ عمل نیز اس کا ۴۔ نیک بخت یا بد بخت ہونا بھی لکھا جاتا ہے۔

پس اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں! بیشک ایک شخص جنتیوں والے عمل کرتا ہے اس شخص اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر تقدیر غالب آتی ہے تو وہ دوزخیوں کے عمل کرنے لگتا ہے چنانچہ وہ دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور ایک شخص دوزخیوں والے عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس شخص اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فرق رہ جاتا ہے تو اس پر تقدیر غالب آ جاتی ہے وہ جنتیوں کے عمل شروع کر دیتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے''۔ ❶

❶ بخاری، مسلم، الظلال (١٧٥، ١٧٦).

اس مضمون کی احادیث اور سلف صالحین رحمہم اللہ سے آثار کثرت کے ساتھ مروی ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ التمهيد ٦/ ١٢ میں رقمطراز ہیں:

''اس باب میں لوگوں نے کثیر تعداد میں آثار ذکر کیے ہیں۔ نیز متکلمین نے بھی اس میدان میں بہت بحثیں کی ہیں۔ اور اہل سنت کا ان آثار پر ایمان لانے اور ان کے مطابق اعتقاد رکھنے پر اور ان میں ہر قسم کا جھگڑا مباحثہ ترک کرنے پر اتفاق ہے۔ وبالله العصمة والتوفيق.

تقدیر کی معرفت سے مخلوق کی عاجزی

[تقدیر مخلوق میں اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے]

۴۵۔((وَأَصْلُ الْقَدَرِ سِرُّ اللّٰهِ تَعَالیٰ فِی خَلْقِهِ لَمْ يَطَّلِعْ عَلَى ذَلِكَ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَلا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ . وَالتَّعَمُّقُ ①وَالنَّظْرُ فِی ذَلِكَ ذَرِيْعَةُ الْخِذْلاَنِ وَسُلَّمُ الْحِرْمَانِ وَدَرَجَةُ الطُّغْيَانِ فَالْحَذَرَ كُلَّ الْحَذَرِ مِنْ ذَلِكَ نَظْراً وفِكْراً وَوَسْوَسَةً؛ فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالیٰ طَوَى عِلْمَ الْقَدَرِ عَنْ أَنَامِهِ وَنَهَاهُمْ عَنْ مَرَامِهِ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالیٰ فِی كِتَابِهِ:﴿لا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ ② (الانبیاء: ۲۳) فَمَنْ سَأَلَ : لِمَ فَعَلَ؟ فَقَد رَدَّ حُكْمَ الكِتَابِ ، وَمَنْ رَدَّ حُكْمَ الكِتَابِ كَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ .))

''تقدیر میں اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں ایک راز ہے۔ نہ تو تقدیر کا کسی مقرب فرشتے کو علم ہے نہ ہی کسی نبی ورسول کو اس کا علم ہے۔ اس مسئلہ میں بحث کرنا گہرائی میں جانا اللہ تعالیٰ کی توفیق سے محرومی کا سبب اور ناکامی کا پیش خیمہ ہے؛ اور سرکشی کا مقام ہے۔ پس اس مسئلہ میں غور وفکر اور ہر قسم کے وسوسہ سے بالکل پرہیز کیا جائے اور دور رہا جائے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے تقدیر کے علم کو لوگوں سے لپیٹ لیا ہے۔ اور اس کو مقصود بنانے سے روک دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ٥﴾ (الانبیاء: ۲۳)

''وہ جو کام کرتا ہے اس کی پرسش نہیں ہوگی اور ان سے پوچھ گچھ ہوگی۔''

پس جس شخص نے سوال کیا کہ: یوں کیوں ہے؟ اس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کے حکم کا رد کیا اور جس نے کتاب کے حکم کا رد کیا وہ کفار میں سے ہوگیا''۔

تشریح: تقدیر اصل میں مخلوق میں اللہ تعالیٰ کا راز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہی مخلوق کو پیدا فرمایا اسی نے فنا کیا؛ اسی نے فقیر کیا؛ اسی نے مالدار بنایا اسی نے مارا اسی نے زندہ کیا؛ اسی نے گمراہ کیا اسی نے ہدایت دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''تقدیر اللہ تعالیٰ کا راز ہے ہم اس کو نہیں جان سکتے''۔

---

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: -واللہ تعالیٰ اعلم- شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعمق سے مراد یہی ہے [جیسا کہ حدیث میں ہے] ''جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو اپنی زبانوں کو روک لو''۔ (یہ حدیث صحیح ہے؛ اسے صحابہ کرام کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ الصحیحہ ۳٤)۔

② ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یعنی اپنی کمال حکمت؛ رحمت اور عدل کی وجہ سے؛ محض غلبے اور قدرت کی وجہ سے نہیں؛ جیسا کہ جہم اور اس کے پیروکار کہتے ہیں۔ اس کی شرح میں بھی ایسے ہی ہے؛ وہاں پر اس کا مراجعہ کر لیں۔ وہاں لکھا ہے: حقیقت یہ ہے کہ عبودیت کی بنیاد ایمان وتسلیم اور اوامر اور نواہی میں اور شرائع میں حکمت کی تفصیل سے متعلق سوال نہ کرنے پر استوار ہے۔ یہ بہت ہی اہم بات ہے۔ اگر یہاں پر تنگی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اس کا لفظ لفظ ضرور نقل کرتا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

جو کچھ فرماتے ہیں؛ اختصار کے ساتھ اس کے بعض فقرات پیش ہیں: [مجموع الفتاوی ۱/۱۴۸]:

ا۔تقدیر پر ایمان کے دو درجے ہیں؛ اور ان میں سے ہر ایک درجہ دو چیزوں کو شامل ہے: پہلا درجہ: اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ کو ازل سے علم ہے کہ مخلوق نے کیا عمل کرنا ہے۔اور اللہ تعالیٰ اپنے ازلی علم سے موصوف ہے؛ وہ تمام احوال اطاعت؛ ومعصیت؛ رزق اور اجل کا علم رکھتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں مخلوق کی تقدیریں لکھ دی ہیں۔پس جب اللہ تعالیٰ نے پہلے قلم کو پیدا کیا تو اس سے کہا: لکھ۔قلم نے کہا: کیا لکھوں۔فرمایا: قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے؛ اسے لکھ دے۔پس انسان پر جو مصیبت آتی ہے وہ ٹلنے والی نہ تھی؛ اور جو چیز اس سے ٹل گئی وہ اس پر آنے والی نہ تھی۔قلم خشک ہو چکے اور صحیفے لپیٹ لیے گئے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (الحج ۷۰) ”کیا تو نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔بے شک یہ ایک کتاب میں درج ہے، بے شک یہ اللہ تعالیٰ پر بہت آسان ہے“۔

یہ تقدیر اللہ تعالیٰ کے علم کے تابع ہے؛ اور وہ اجمالی اور تفصیلی طور پر اپنے موقع پر ہوگی۔اس نے جو چاہا وہ لوح محفوظ میں لکھ دیا۔اور جب اللہ تعالیٰ جنین کا جسم پیدا کرتے ہیں؛ تو اس میں روح پھونکنے سے پہلے فرشتے کو بھیجتے ہیں؛ اور اس کو چار باتیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے: ”اس کا رزق لکھ دو؛ اور اس کی اجل اور عمل لکھ دو۔اور اس کا نیک بخت یا بد بخت ہونا لکھ دو“۔پس تقدیر کی اس قسم کے پرانے غالی قدریہ بھی انکار نہیں کرتے تھے۔اس دور میں بھی اس کے منکر بہت کم ہیں۔

دوسرا درجہ: اللہ تعالیٰ کی نافذ مشیئت اور شامل قدرت۔یعنی اس بات پر ایمان رکھنا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہو گیا؛ اور جو کچھ نہیں چاہا؛ وہ نہیں ہوا۔اور زمین و آسمان میں جتنی بھی حرکت اور جتنا بھی سکون ہے؛ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی چاہت سے ہے۔اور اس کی بادشاہی میں صرف وہی ہو سکتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ موجودات اور معدومات میں سے ہر ایک چیز پر قادر ہے۔

مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کا اور اپنے رسولوں کی اطاعت کا حکم دیا ہے؛ اور ان کی نافرمانی سے منع کیا ہے۔وہ متقین؛ محسنین؛ اور مقسطین سے محبت کرتا ہے؛ اور ان لوگوں سے راضی ہوتا ہے جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں؛ اور وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا؛ اور نہ ہی فاسق لوگوں سے راضی ہوتا ہے؛ اور نہ ہی ان لوگوں سے جو برائی کرنے کا حکم دیتے ہیں۔وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پر بھی راضی نہیں ہوتا۔اور نہ ہی فساد کو پسند کرتا ہے۔حقیقی فاعل بندے ہیں؛ اور اللہ تعالیٰ ان کے افعال کے خالق ہیں۔بندہ وہ مؤمن ہو یا کافر؛ نیک ہو یا فاجر؛ نماز روزہ والا عبادت گزار؛ بندوں کو اپنے اعمال پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔اور ان کا اپنا ارادہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کا بھی خالق ہے؛ اور ان کے اندر قدرت اور ارادہ کا بھی خالق ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (تکویر 29) ”اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھا چلے۔اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے“۔

عام طور پر قدریہ لوگ تقدیر کے اس درجہ کی تکذیب کرتے ہیں۔یہ وہی لوگ ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے اس امت کے مجوسی قرار دیا ہے۔اور اس مسئلہ میں کچھ تقدیر کے قائلین بھی غلو کا شکار ہوئے ہیں؛ حتی کہ انہوں نے بندے کی قدرت اور اختیار کی نفی کر دی؛ وہ اللہ تعالیٰ کے افعال اور اس کے احکام سے حکمتیں اور مصلحتیں نکالتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: مؤلف نے اپنے کلام کے آخر میں اشاعرہ کی طرف اشارہ کیا ہے جنہوں نے غلو کیا؛ اور حکمت کا انکار کر دیا۔اس کی تفصیل ابن قیم رحمہ اللہ نے شفاء العلیل میں بیان کی ہے۔وہاں پر اسے دیکھ لیا جائے؛ یہ بہت اہم ہے۔

اہل سنت کا مسلک اور مسئلہ تقدیر:

اس مسئلہ میں لوگوں میں جو اختلاف ہے وہ مشہور ہے۔

اہل سنت والجماعت اس بات کے قائل ہیں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قضاء و تقدیر کے ساتھ ہے۔نیز اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝﴾ (القمر: ٤٩)

”بے شک ہم نے ہر چیز کو تقدیر کے ساتھ پیدا کیا۔“

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝﴾ (الفرقان: ٢)

''اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی تقدیر بنائی۔''

لیکن کافر سے اللہ تعالیٰ کفر کا ارادہ کرتا ہے؛ اور اسے چاہتا ہے۔ جبکہ اس کو ناپسند کرتا ہے اور نہ اچھا جانتا ہے یعنی بلحاظ تکوین کے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مشیئت ہے بلحاظ دین کے اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں فرماتے۔

قدریہ اور معتزلہ کا مذہب اس مسئلہ میں اہل سنت کے خلاف ہے؛ وہ کہتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ نے تو کافر سے چاہا تھا کہ وہ ایمان لائے؛ لیکن کافر نے کفر چاہا۔ اس تاویل کی انھیں اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اگر کافر سے اللہ تعالیٰ کفر چاہے؛ تو پھر اس کو عذاب میں کیسے گرفتار کرسکتا ہے؟۔ لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ بارش سے بھاگا؛ پرنالے کے نیچے کھڑا ہوگیا''۔ وہ جس اعتراض سے بچنا چاہتے تھے اس سے عظیم اعتراض ان پر وارد ہوتا ہے۔ ان کی بیان کردہ دلیل اور ان کے مسلک سے تو یہ لازم آتا ہے کہ کافر کی مشیئت اللہ تعالیٰ کی مشیئت پر غالب آگئی۔ یعنی ان کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے تو کافر سے ایمان چاہا؛ اور کافر نے کفر چاہا؛ اور کافر کی مشیئت وقوع پذیر ہوگئی اللہ تعالیٰ کی مشیئت مغلوب ہوگئی ان کا یہ عقیدہ نہایت قبیح اور بلا دلیل ہے۔ بلکہ صحیح منصوص دلیل کے خلاف بھی ہے۔

لالکائی رحمہ اللہ نے بقیہ کی حدیث اوزاعی سے روایت کی ہے؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے علاء بن حجاج نے بیان کیا؛ وہ محمد بن عبید مکی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں؛ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں:

''ان سے کہا گیا کہ ہمارے پاس ایک شخص آیا ہے جو تقدیر کی تکذیب کررہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''مجھے اس کے بارے میں بتاؤ وہ کہاں ہے؟۔ اس عمر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نابینا ہوچکے تھے۔ لوگوں نے دریافت کیا: ''آپ اسے کیا کہیں گے؟ فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر مجھے اس پر قدرت حاصل ہوجاتی ہے تو میں اس کا ناک پھوڑ دوں گا۔ اور اگر اس کی گردن میرے ہاتھ آگئی؛ تو میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے:

''مجھے بنوفہر قبیلہ کی عورتیں دکھائی دے رہی ہیں؛ جو خزرج کا طواف کررہی ہیں؛ مشرکہ ہیں؛ ان کے چوتڑ حرکت کررہے ہیں؛ مجھے اسلام میں یہ پہلا شرک نظر آرہا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میری جان ہے! یہ لوگ اس قسم کے برے اعتقادات سے باز آجائیں گے حتی کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو اس سے نکال دیا ہے کہ وہ خیر مقدر کرتا ہے جیسا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اس سے نکال دیا ہے کہ وہ شر کو مقدر کرتا ہے''[1]۔

[1]۔ ضعیف ہے علاء بن حجاج مجہول ہے۔ السنة لا بن ابی العاصم (۷۹).

یہ قول: (مجھے اسلام میں یہ پہلا شرک نظر آرہا ہے......) یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا کلام ہے۔ یہ آپ کے اس قول کے موافق ہے کہ: ''تقدیر دراصل توحید کا ایک نظام ہے۔ پس جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو ایک مانا اور تقدیر کو جھٹلایا؛ تو تقدیر کو جھٹلانے نے اس کی توحید کو توڑ ڈالا''۔[1]

❀ عمرو بن الہیثم بیان کرتے ہیں: ''ہم ایک کشتی میں سوار ہوئے ہمارے ساتھ ایک قدریہ اور ایک مجوسی تھا۔ قدری نے مجوسی سے کہا: تم مسلمان ہوجاؤ۔ مجوسی نے کہا: ''اللہ تعالیٰ اگر ارادہ کرے''۔ قدری نے کہا: ''اللہ تعالیٰ تو ارادہ کرتا ہے لیکن شیطان ارادہ نہیں کرتا''۔ مجوسی نے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا اور شیطان نے بھی ارادہ کیا؛ شیطان کا ارادہ پورا ہوگیا؛ تو شیطان قوی رہا۔ پس

میں تو اس کے ساتھ ہوں جو قوی رہا‘‘۔

❀ ایک اعرابی ایک ایسی مجلس میں آ کھڑا ہوا جس میں عمرو بن عبید بھی تھا۔ اعرابی نے لوگوں سے کہا: ’’اے لوگو! میری اونٹنی چوری ہو گئی ہے تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ مجھے واپس دلا دے‘‘۔ عمرو بن عبید نے کہا: ’’اے اللہ! تو نے ارادہ نہیں کیا تھا کہ اس کی اونٹنی چوری ہو؛ لیکن چوری ہو گئی؛ پس اس پر اس کی اونٹنی واپس کر‘‘۔ اعرابی نے کہا: ’’مجھے تیری دعا کی ضرورت نہیں۔ اس نے دریافت کیا: کیوں؟ اس نے جواب دیا: ’’میں ڈرتا ہوں جیسا کہ اس نے ارادہ کیا کہ اونٹنی چوری نہ ہو؛ لیکن چوری ہو گئی؛ اسی طرح وہ ارادہ کرے کہ وہ اس کو لوٹائے؛ لیکن نہ لوٹائی جائے۔

❀ ایک آدمی نے ابو عصام قسطلانی سے کہا: مجھے بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے ہدایت روک لے اور مجھے گمراہی میں مبتلا کر دے؛ پھر وہ مجھے عذاب میں گرفتار کرے تو کیا اس کا انصاف ہوگا؟۔ ابو عصام نے جواب دیتے ہوئے کہا: اگر ہدایت اس کے اختیار میں ہے تو وہ جس کو چاہے اس کا عطیہ دے اور جس سے چاہے اس کو روک لے۔

کتاب وسنت سے دلائل:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۝﴾ (السجدة: ۱۳)

’’اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ دوزخ کو جنوں اور انسانوں سب سے بھروں گا۔‘‘

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۝﴾

(یونس: ۹۹)

’’اور اگر تمھارا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو کہ وہ مومن ہو جائیں۔‘‘

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا۝﴾ (الدھر: ۳۰)

’’اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے ہو مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ علم والا حکمت والا ہے۔‘‘

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ وَ مَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۝﴾ (الانعام: ۳۹)

’’جس شخص کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس شخص کو چاہتا ہے سیدھے راستے پر رکھتا ہے۔‘‘

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ﴾ (الانعام: ۱۲۵)

''تو جس شخص کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہدایت بخشے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جب چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔''

ارادہ؛ مشیئت؛ محبت اور رضا میں فرق:

گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ مشیئت ارادہ اور محبت اور رضا کو مساوی سمجھ لیا گیا ہے۔ پھر اس میں بھی ان کا اختلاف ہے۔ چنانچہ جبریہ کہتے ہیں: تمام امور کائنات اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور فیصلہ کے ساتھ ہیں؛ پس جو کچھ ہے وہ محبوب اور پسندیدہ ہے۔ قدریہ کہتے ہیں: '' نافرمانیاں اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں؛ وہ ان پر راضی ہے۔ لہٰذا وہ قضا، تقدیر میں داخل نہیں ہیں۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور اس کے خلق سے خارج ہیں۔ حالانکہ قضا، ارادہ، محبت، مشیئت میں کتاب وسنت اور فطرت سلیمہ کے تقاضوں کے مطابق فرق ہے۔ مشیئت و ارادہ کے نصوص کا ذکر پہلے ہو چکا ہے محبت، رضا کے نصوص ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾ (البقرة: ۲۰۵)

''اور اللہ تعالیٰ فساد کو اچھا نہیں جانتا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ (الزمر: ۷)

''وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو ناپسند جانتا ہے۔''

نیز شرک، ظلم، فواحش اور تکبیر سے منع کرنے کے بعد فرمایا:

﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا﴾ (الاسراء: ۳۸)

''ان سب (عادتوں) کی برائی تیرے رب کے نزدیک بہت ناپسند ہے۔''

صحیح حدیث میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے؛ آپ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے تین چیزوں کو مکروہ قرار دیا ہے: فضول بحث مباحثہ، زیادہ سوال کرنا اور مال کا ضیاع''۔ [1]

نیز مسند احمد میں ہے:

''بے شک اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس کی رخصتوں پر عمل کیا جائے جیسے اسے ناپسند ہے کہ اس کی نافرمانی کے کام کیے جائیں''۔ [2]

رسول اللہ ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰهُمَّ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ))[مسلم (486)]

''اے اللہ! میں تیری رضا مندی کے ساتھ تیری ناراضگی سے اور تیرے معاف کرنے کے ساتھ تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں اور تیری ذات کے ساتھ تجھ سے پناہ مانگتا ہوں''❸۔

غور کیجیے؛ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی صفت رضا کے ساتھ اس کی ناراضگی سے اور معافات کے ساتھ اس کے فعل عقوبت سے پناہ طلب کی ہے۔ اس میں رضا صفت ہے؛ اور ناراضگی سے مراد صفت نہیں بلکہ اس کا اثر مراد ہے۔ پھر ان سب کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مربوط کر دیا ہے؛ ان تمام کا مرجع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے؛ کسی دوسرے کی طرف نہیں۔ پس میں جس سے پناہ طلب کرتا ہوں؛ وہ تیری مشیئت اور تیرے ارادہ کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔ اور تیری رضا اور معافات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں؛ وہ بھی تیری مشیئت اور تیرے ارادہ کے ساتھ ہے۔ اگر تو چاہے تو اپنے بندے سے راضی ہو جائے اور اس کو معاف کر دے۔ اور اگر تو چاہے تو اس پر ناراض ہو جائے اور اس کو سزا دے۔

پس میرا ہر اس چیز سے پناہ طلب کرنا جس کو ناپسند جانتا ہوں اور اسے روکنے کا مطالبہ کہ وہ مجھ پر اترے یہ بھی تیری مشیئت کے ساتھ ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر محبوب اور مکروہ تیری قضا اور مشیئت سے وابستہ ہے۔ پس میرا تیرے ساتھ تجھ سے پناہ طلب کرنا؛ اور میرا تیری قوت؛ غلبہ اور رحمت کے ساتھ پناہ طلب کرنا؛ جو کچھ بھی ہوگا وہ تیری قوت؛ تیری توفیق؛ اور تیرے عدل اور تیری حکمت کے ساتھ ہوگا۔ تیرے غیر کے ساتھ تیرے غیر سے پناہ طلب نہیں کرتا۔ اور نہ تیرے ساتھ ایسی چیز سے پناہ طلب کرتا ہوں جو تیری مشیئت کے بغیر صادر ہو۔ بلکہ وہ تجھ سے ہی ہے۔ پس ان کلمات میں کس قدر توحید معارف، عبودیت کے خزانے موجود ہیں ان کا علم صرف ان لوگوں کو ہے جو علم، معرفت الٰہی، معرفت عبودیت میں راسخ ہیں۔

❶ بخاری، فی الاستقراض، مسلم فی الأقضية.
❷ مسند احمد، سند صحیح ھے۔ الارواء الغلیل (٥٦٤).
❸ صحیح ابو داؤد (٨٣٣).

ارادہ کی دو اقسام:

[ارادہ کی دو اقسام ہیں: اپنے نفس کے لیے ارادہ؛ اور اپنے علاوہ کسی دوسرے کے لیے ارادہ]۔

❀ اگر یہ کہا جائے: یہ کس طرح ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرمائیں لیکن اس پر وہ راضی نہ ہو اور اس کو پسند نہ کرتا ہو؟۔ وہ کیسے کسی چیز کو چاہتا ہے؛ اس کی تکوین/تخلیق کرتا ہے؟ اور کیسے کسی چیز کا اس کا ارادہ؛ اور اس کی ناپسندیدگی اور بغض جمع ہو سکتے ہیں؟۔

❀ جواب: یہی وہ سوال ہے جس نے لوگوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور اس میں ان کے عقائد اور طور طریقے باہم جدا ہو چکے ہیں۔

= جان لیجیے کہ: مراد کی دو اقسام ہیں: اپنے نفس کے لیے مراد؛ اور کسی دوسرے کے لیے مراد۔

❀ اپنے نفس کے لیے مراد؛ وہ ارادہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات کی وجہ سے محبوب ہوتا ہے؛ کیونکہ اس میں خیر و بھلائی ہوتی ہے۔

یہ مراد غایات اور مقاصد کا ارادہ ہوتی ہے۔

❀ دوسرا ارادہ لغیرہ ہے۔کبھی اس کے ارادہ سے یہ اس کا مقصود نہیں ہوتا۔اور نہ ہی بادی النظر میں اس ذات کے اعتبار سے کوئی مصلحت ہوتی ہے۔اگر چہ وہ اس کی مراد اور مقصود تک رسائی کا وسیلہ ہوتا ہے۔پس یہ ارادہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لحاظ سے بذات خود تو مکروہ ہے؛ لیکن اس کی قضاء اور مراد تک رسائی اور ادراک کے لحاظ سے مراد ہوتا ہے۔پس اس میں دونوں باتیں جمع ہو جاتی ہیں؛ اس کا ارادہ اور اس کا بغض۔اور ان دونوں سے متعلقات کے مختلف ہونے کی وجہ ان میں کچھ منافات/ اختلاف نہیں۔[اس کو ایک مثال سے سمجھیں] مثلاً: ایک دواء جو بظاہر بد بودار اور کڑوی ہے لیکن جب اس کے استعمال کرنے والے کو علم ہو جاتا ہے کہ اس میں شفاء ہے؛[تو وہ اس دواء کو استعمال کرتا ہے]۔ایسے ہی جسم کا گلتا ہوا عضو؛ جب یہ علم ہو جائے کہ اس کے کاٹنے میں باقی جسم کی بقاء ہے؛[تو اسے کاٹ دیا جاتا ہے؛ بظاہر عضو کا کاٹنا اگر چہ مکروہ ہے لیکن در حقیقت مفید ہے]۔اسی طرح دور دراز کے پر مشقت سفر طے کرنا؛ جب معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے مقصود و محبوب حاصل ہوتا ہے[تو سفر کی مشقت گوارا کر لی جاتی ہے]۔بلکہ عقل مند انسان تو ایسی مکروہ/ ناپسندیدہ چیز کو صرف غالب گمان کی بنا پر ترجیح دیتا ہے؛ اگر چہ اس کا انجام ابھی مخفی ہو۔تو پھر اس کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں جس پر کوئی بھی چیز مخفی نہ ہو۔

پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی چیز کو ناپسند کرتے ہیں؛ مگر کسی دوسرے کی وجہ سے اس کے ارادہ کے منافی نہیں؛ کیونکہ وہ اس امر تک رسائی کا ایک سبب ہے؛ جس کا ہو جانا نہ ہونے سے زیادہ محبوب ہے۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا جو کہ بد اعمالیوں اور دین میں خرابی؛ بدعملی؛ اور بداعتقادی اور برے ارادوں کی اصل بنیاد اور اس کا مادہ ہے۔اور وہ بہت سے بندگان خدا کی گمراہی/ بدبختی کا سبب ہے؛ اور ان کے ایسے اعمال کا سبب بنتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ ناراض/غصہ ہوتے ہیں۔ ❶ نیز ابلیس ایسی چیزوں میں اختلاف پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند اور اس کی رضامندی کی ہیں۔

لیکن دوسری طرف وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں کے اثبات کا وسیلہ بھی بنتا ہے جو اس کی مخلوق پر مرتب ہوتی ہیں۔جن کا وجود اللہ تعالیٰ کو ان کے عدم سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے۔ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کا اظہار ہے کہ وہ دو متضاد اور باہم مقابل چیزوں کے پیدا کرنے پر قادر ہے۔پس اللہ تعالیٰ نے ہی یہ ذات پیدا کی ہے جو کہ خبیث ترین ذات اور شریر ترین ذات ہے۔جو تمام شرور اور فسادات کا منبع ہے؛ اس کے مقابل میں دوسری ذات حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔جو بہترین؛ اشرف ترین اور اطہر اور پاک مخلوقات میں سے ہیں۔ان کا مادہ ہر خیر و بھلائی کا منبع ہے۔پس اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے جس نے شیطان کو بھی پیدا کیا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی پیدا فرمایا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار رات اور دن کے پیدا کرنے؛ بیماریوں اور ادویات کی تخلیق، زندگی، موت؛ خوبصورتی، بدصورتی، نیکی، برائی کی تخلیق سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت، غلبہ؛ بادشاہت، سلطنت کی سب سے بڑی اور واضح دلیل ہیں۔بیشک اللہ تعالیٰ نے ہی ان متضاد چیزوں کو پیدا کیا؛ اور ایک دوسرے کے مقابل بنایا۔اور انہیں اپنے تصرفات اور تدابیر کا مقام/محل بنایا۔ان میں سے بعض سے وجود کا بالکل/کلی طور پر خالی ہونا اللہ تعالیٰ کی حکمت؛ اس کے کمال تصرف اور اس کی بادشاہی کی تدبیر کو معطل کرنا ہے۔

ان میں سے ایک حکمت: اللہ تعالیٰ کے اسماء قہریہ کے آثار کا ظہور ہے؛ جیسے: القهار المنتقم ؛ العدل ؛ الضار ؛ شديد

العقاب ؛ سریع الحساب ؛ ذو البطش الشدید ؛ الخافض ؛ المذل ۔ بے شک یہ اسماء وافعال اپنے اندر کمال درجہ پر فائز ہیں۔تو ان کے متعلقات کے وجود کا ہونا لازمی ہے۔اگر جنات اور انسان ملائکہ کی طبیعت پر ہوتے تو ان اسماء کے آثار ظاہر نہ ہوتے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء جو اس کے: حلم ،عفو؛ مغفرت ، (ستر) پردہ پوشی ، اپنے حق کا معاف کرنا؛ اور اپنے بندوں میں سے جس کو وہ چاہے؛ اسے آزاد کرنے کے معانی کو شامل ہیں۔اگر ان ناپسندیدہ اسباب کی تخلیق نہ ہوتی جو ان اسماء کے آثار کے ظہور تک لے جاتے ہیں؛ تو یہ حکمت اور فوائد ختم ہو کر رہ جاتے۔ چنانچہ اس معنی کی طرف نبی کریم ﷺ اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

✪ مزید وضاحت کے لیے مدارج السالکین (۱/ ۲۵۲) کا مطالعہ کریں مزید مشاھد الخلق فی المعصیة امام ابن القیم کی کتاب کا مطالعہ کریں جس کی تحقیق استاد نذیر عتمہ نے کی ہے۔

''اگر تم گناہ نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو لے جائے گا اور ایسے لوگوں کو لے آئے گا جو گناہ کریں گے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں گے تو ان کو معاف کر دیا جائے گا''۔ ❶

✪ مسلم (۸/ ۹٤)۲۷٤۹؛ ۲۷٤۸ ، الصحیحة (۹٦۸ ، ۹٦۹) . وله شواهد۔

اسی طرح: اللہ تعالیٰ کے اسماء حکمت وخبر کے آثار کا ظاہر ہونا بھی ہے بیشک اللہ تعالیٰ حکیم وخبیر بھی ہیں۔ وہ تمام چیزوں کو ان کے مقام پر رکھتے ہیں۔اور ان کے ساتھ ان کی منزلت کے مطابق برتاؤ کرتے ہیں۔پس کوئی چیز اس کے غیر لائق جگہ پر نہیں رکھتے۔اور نہ ہی اس کے اس مقام ومنزلت کے خلاف اس سے سلوک کیا جاتا ہے جس کا تقاضا اس کے کمال علم وحکمت اور خبر داری[آگاہی] کرتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ کون رسول بننے کا مستحق ہے؟ اور وہ جانتے ہیں کہ کون اس ذمہ داری کو قبول کرنے کا اہل ہے۔اور وہ اس مرتبہ پر فائز ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرے گا۔ نیز وہ خوب جانتے ہیں کہ کون اس کا اہل نہیں؟ ۔اگر تسلیم کر لیا جائے کہ مکروہ اسباب موجود ہی نہ ہوں تو اس سے بے شمار حکمتیں بے کار ہو جائیں۔اور بہت سی مصلحتیں ختم ہو جائیں۔اگر ان اسباب کو صرف اس وجہ سے معطل کر دیا جائے کہ ان میں شر ہے؛ تو وہ خیر بھی معطل ہو جائے گی جو ان اسباب میں پائے جانے والے شر سے زیادہ بڑی اور اہم ہے۔ یہ سورج ، بارش اور ہوا؛ ان میں جو مصلحتیں پائی جاتی ہیں؛ وہ اس برائی سے کئی گنا زیادہ ہیں جو ان کی وجہ سے پائی جاتی ہیں۔

ان ہی مصلحتوں میں سے مختلف قسم کی عبودیت کا حصول ہے جو کہ اگر ابلیس کو نہ پیدا کیا گیا ہوتا؛ تو یہ عبودیت حاصل نہ ہوتی۔ظاہر ہے کہ جہاد کی عبودیت دیگر تمام انواع عبودیت سے اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ محبوب ہے۔اگر تمام لوگ ایماندار ہوتے تو جہاد کی عبودیت اور اس سے متعلقہ عبادات ختم ہو کر رہ جاتیں؛ جیسے اللہ تعالیٰ کے لیے دوستی اور دشمنی؛ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی عبودیت ،صبر، خواہش نفسانی کی مخالفت اور اللہ تعالیٰ کی پسند کو ترجیح دینے کی عبودیت ،توبہ اور استغفار کی عبودیت ؛ دشمن کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی عبودیت ؛ کہ وہ اسے اس کے دشمن سے بچائے اور اس کے مکر وفریب اور ایذا رسانی سے محفوظ رکھے۔ان کے علاوہ بھی ایسی عبودیتیں ہیں جن کی حکمتوں کے ادراک سے انسانی عقل جائز ہے۔

امام شیخ عفیفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''اس اعتراض اور اس کے جواب کی تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن قیم رحمہ اللہ کی کتب: الجواب الکافی ؛ اور مدارج السالکین۔

[سوال ۱] :اگر یہ کہا جائے کہ کیا ان اسباب کے بغیر ان حکمتوں کا وجود ممکن ہے؟۔

[جـــواب] :یہ سوال سرے سے فاسد ہے۔ جس میں ملزوم کے وجود بغیر لازم کو فرض کرنا پڑتا ہے۔جیسے باپ کے بغیر بیٹے کا وجود

فرض کر لینا؛ کسی متحرک کے بغیر حرکت کا وجود؛ توبہ کرنے والے کے بغیر توبہ کا وجود فرض کرنا۔

[سوال ۲] :جب یہ اسباب مطلوبہ حکمتوں تک پہنچنے کے لیے مقصود ہیں؛ تو کیا اس لحاظ سے پسندیدہ اور محبوب بھی ہیں؟ یا پھر ہر لحاظ سے ناپسندیدہ ہی ہیں؟۔ یہ سوال دو طرح سے وارد ہوتا ہے:

اول : اللہ تعالیٰ کی جانب کے لحاظ سے: تو کیا اللہ تعالیٰ ان اسباب کو اس لیے محبوب جانتا ہے کہ یہ اسباب اس کے ایک محبوب مقصد کی جانب لے جاتے ہیں؟ اگرچہ اسباب کی ذات کے لحاظ سے ان کو ناپسند جانتا ہے۔

دوم: بندوں کی جانب کے لحاظ سے؛ یعنی کیا بندہ کے لیے ان اسباب پر اس لحاظ سے رضامندی جائز ہے؟۔

یہ ایک اہم سوال ہے۔

[جواب] :جان لیجیے کہ ہر قسم کے شر کا مرجع عدم کی طرف ہے۔ میری مراد یہ ہے خیر و بھلائی اور اس تک رسائی کے اسباب کے معدوم ہونے کے اعتبار سے ہے۔ اس اعتبار سے وہ شر ہی ہیں۔ لیکن محض ان کے اپنے وجود کے اعتبار سے ان میں کوئی شر اور برائی نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھیں: شریر نفوس کا وجود بلحاظ ان کے موجود ہونے کے خیر ہے۔ ان سے شر کا حصول تب ہوتا ہے جب ان سے خیر کا مادہ ختم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ نفوس اصل میں متحرک پیدا کئے گئے ہیں۔ اگر علم اور خیر کے الہام کے ساتھ انھیں مدد ملتی رہے تو وہ حرکت میں رہتے ہیں۔ اگر انھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے؛ تو وہ اپنی طبیعت کے تقاضے کے لحاظ سے خیر کے برعکس حرکت میں آتے ہیں۔ ان کا اپنے طور پر متحرک ہونا بحیثیت محض حرکت کے؛ تو خیر ہے۔ ان میں شر اضافی ہے بلحاظ حرکت کے شر نہیں۔ اور شر تمام تر ظلم ہے۔ ظلم کا مطلب ہے کسی چیز کو اس کے ٹھکانے سے ہٹا کر رکھنا۔ اگر اسے اپنے ٹھکانہ پر رکھا جائے تو وہ شر نہیں ہوگی۔ تو معلوم ہوا کہ اس میں شر ایک اضافی نسبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کی مقرر کردہ سزائیں اپنی جگہ پر بذات خود خیر ہیں؛ اگرچہ وہ موقع و محل [مجرم] کے لحاظ سے بری اور شر ہیں۔ اس لیے کہ سزاؤں سے جسم کو تکلیف ہوتی ہے؛ جبکہ جسم طبعی طور پر اس کے برعکس لذت کو قبول کرتا ہے اور اس کے لیے تیار رہتا ہے۔ پس یہ سزا [عقوبت]، تکلیف، بہ نسبت لذت کے شر ہے۔ اور بہ نسبت فاعل کے خیر ہے؛ اس لیے کہ سزا اپنی جگہ پر واقع ہوئی ہے [یعنی مجرم نے جرم کیا تو اس کو سزا دی گئی]۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام وجوہ اور ہر اعتبار سے کوئی چیز شر نہیں پیدا کی۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی حکمت اس کا انکار کرتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی جناب میں یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ایسی چیز کا ارادہ کرے جو ہر لحاظ سے شر ہو؛ اور اس میں مخلوق کے لیے کسی بھی لحاظ مصلحت کا کوئی پہلو کارفرمانہ ہو یہ تو واضح طور پر محال ہے۔ بے شک تمام خیر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور شر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں۔ بلکہ جو کچھ شر اور برائی اس کی طرف منسوب ہے؛ وہ سب خیر ہی خیر ہے۔ اور شر تو اس وجہ سے شر ہے کہ اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت نہیں۔ اگر اس کی نسبت اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ کی طرف ہو جاتی تو وہ شر نہ رہتا۔ اس پر غور و فکر کریں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب اس کی نسبت کے ختم ہونے نے اس کو شر بنایا۔

[سوال ۳] :اگر کہا جائے کہ شر کی نسبت بلحاظ اس کی تخلیق و مشیئت کے قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں کرتے ہو؟۔

[جواب] :تو کہا جائے گا: اس لحاظ سے وہ شر نہیں؛ شر کے وجود کی نسبت تو اللہ تعالیٰ کی طرف ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ شر نہیں۔ شر وہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ خیر اور اس کے اسباب کے ساتھ مدد نہیں فرماتے۔ عدم کی کوئی حقیقت نہیں کہ اس کی نسبت ایسی ذات کی

طرف ہو جس کے ہاتھ میں تمام بھلائیاں ہیں۔

خیر کے تین اسباب:

[خیر کے تین اسباب ہیں: ایجاد؛ اعداد؛ امداد]

اگر آپ اس کی مزید وضاحت چاہتے ہوں تو جان لیجیے کہ خیر کے اسباب تین ہیں ایجاد [پیدا کرنا] اعداد [تیار کرنا]، امداد [مدد کرنا]۔ [اس کا] ایجاد کرنا خیر ہے؛ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اور ایسے ہی اس کا اعداد [تیار کرنا]، امداد [مدد کرنا] بھی ہے۔ پس اگر وہ اس اعداد [یعنی اہلیت] کا مادہ نہ پیدا کرے؛ اور نہ ہی اس کی امداد کرے تو اس میں ان اشیاء کی عدم موجودگی کی وجہ سے شر پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی نسبت سے وہ فاعل نہیں؛ بلکہ وہ اس کی ضد یعنی خیر کا فاعل ہے۔

[سوال ٤] : جب شر کو اللہ تعالیٰ نے ایجاد کیا تو اس کی امداد کیوں نہیں کی؟۔

[جواب] : اللہ تعالیٰ کی حکمت نے اس کے ایجاد، امداد دونوں کا تقاضا نہیں کیا۔ اس کی حکمت کا تقاضا صرف اس کو ایجاد کرنا اور اس کی امداد ترک کرنے کا تھا۔ اس کی ایجاد خیر ہے؛ عدم امداد کی وجہ سے اس میں شر واقع ہوا ہے۔

[سوال ٥] : اللہ تعالیٰ نے تمام موجودات کی مدد کیوں نہ فرمائی؟

[جواب] : یہ تو سوال ہی فاسد ہے؛ یہ سوال کرنے والے کا خیال ہے کہ تمام موجودات میں مساوات حکمت کے اعتبار سے زیادہ بلیغ ہوتی۔ یہ تو عین جہالت ہے۔ بلکہ حکمت باری تعالیٰ کا تو اس عظیم الشان فرق میں ہے جو ان چیزوں میں پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نوع کے پیدا کرنے میں کوئی تفاوت/فرق نہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک قسم کی تخلیق میں فرق نہیں۔ بے شک یہ تفاوت تو عدمی امور میں ہے جن کے ساتھ پیدا کرنے کا تعلق نہیں۔ ورنہ پیدا کرنے میں تو کچھ تفاوت نہیں اگر آپ پر اس کا سمجھنا دشوار ہو اور آپ اس اس کو ایسے نہ سمجھ سکیں جیسے سمجھنے کا حق ہے؛ تو ذیل کے شعر سے سمجھنے کی کوشش کریں

إذا لم تستطع شيئًا فدعه وجاوزه إلى ما تستطيع

''جب تجھ میں کسی کام کی استطاعت نہ ہو تو اس کو ترک کر دیجیے اور اس کام کی طرف آگے بڑھیں آپ میں جس کی طاقت ہے۔''

[سوال ٦] : اگر کہا جائے کہ: اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے کسی چیز کو کیسے پسند فرماتا ہے جبکہ وہ اس پر اس کی اعانت نہیں کرتا؟۔

[جواب] : اللہ تعالیٰ کا کسی کام پر اعانت کرنا کبھی ایسی محبوب چیز کے فوت ہونے کو مستلزم ہوتا ہے جو اس فرمانبرداری کے حصول سے زیادہ عظمت والی ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پسند فرمایا ہے۔ اور کبھی اس فرمانبرداری کا وقوع ایسی خرابی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو فرمانبرداری کی محبت سے زیادہ مکروہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ﴾ (التوبة: ٤٦)

''اور اگر وہ نکلنے کا ارادہ کرتے تو اس کے لیے سامان تیار کرتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کا اٹھنا پسند ہی نہ کیا''۔

اللہ تعالیٰ اس چیز کی خبر دے رہے ہیں کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کے میدان جہاد میں نکلنے کو ناپسند کیا؛ حالانکہ یہ اطاعت گزاری کا کام تھا؛ پس جب اسے ان کا نکلنا ناپسند تھا تو اس لیے ان کو ہلنے جلنے ہی نہ دیا۔[اور ان میں سستی پیدا کر دی]۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بعض ان خرابیوں کی نشان دہی فرمائی ہے جو ان کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ [جہاد پر] جانے کی صورت میں مرتب ہوتے۔ارشاد فرمایا:

﴿لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَ فِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ﴾ (التوبة: ٤٧)

''اگر وہ تم میں (شامل ہو کر) نکل بھی کھڑے ہوتے تو تمھارے حق میں شرارت کرتے اور تم میں فساد ڈلوانے کی غرض سے دوڑتے پھرتے اور تم میں ان کے جاسوس بھی ہیں۔''

یعنی اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمھارے درمیان صرف فتنہ فساد ہی زیادہ کرتے ؛تمہارے درمیان شرارتیں کرتے پھرتے۔پھر تم میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو ان کی باتوں پر کان دھرنے والے اور ان کی ماننے والے تھے۔تو ان کی شر انگیزی اور ان سے متاثرین کی شر پسندی کے نتیجہ میں اتنی بڑی خرابی پیدا ہوتی؛ جو ان کے جہاد پر جانے کی مصلحت سے کہیں بہت زیادہ بڑی ہوتی۔اس لیے مصلحت باری تعالیٰ تقاضا یہ ہوا کہ ان کو جانے سے روک دیا جائے۔اس مثال سے مذکورہ قاعدہ کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔مزید فرعی چیزوں کو اس پر قیاس کریں۔

دوسری وجہ: تو بندے کی نسبت سے ہے: ایسا ہونا بھی ممکن ہے۔بلکہ واقع حال [اس پر شاہد] ہیں۔اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بندہ فسق و فجور گناہوں کو بندے کا فعل ہونے کے لحاظ ناپسند کرتا ہے اور ان پر ناراضگی کا اظہار کرتا ہے۔جب کہ یہ کام اس کا ذاتی فعل اور ہاتھ کی کمائی ہیں؛ اور اس کے ارادہ اور اختیار سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔لیکن اللہ تعالیٰ کے علم اس کی مشیئت ، ارادہ؛ امر تکوینی پر راضی رہتا ہے۔پس جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے؛ وہ اس کو پسند کرتا ہے؛ اور ان چیزوں پر ناراض ہوتا ہے جس اس کی ذات کی طرف سے ہوتی ہیں۔اہل معرفت کے ایک گروہ کا یہی مسلک ہے۔جب کہ دوسرا گروہ مطلق طور پر گناہوں کو ناپسند جانتا ہے۔ان کے عقیدہ کا مرجع یہی قول ہے؛ اس لیے کہ جب وہ مطلق طور پر مکروہ بولتے ہیں تو اس سے ان کی مراد اللہ تعالیٰ کو اس گناہ کا علم ہونا؛ اس کی کتابت اور مشیئت کو شامل ہونا نہیں ہوتی۔اس مسئلہ میں اسرار کی بات یہ ہے کہ فسق و فجور جس چیز کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مکروہ نہیں اور جس کی نسبت بندے کی طرف ہو تو مکروہ ہے''۔

شیخ عفیفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' شارح کے ذکر کردہ اعتراضات اور ان کے جوابات اور اس مسئلہ کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے مدارج السالکین ۲/ ۱۹۸ کی طرف رجوع کریں۔

[سوال ٦] : اگر یہ کہا جائے کہ بندے کا ان برے کاموں میں کچھ اختیار نہیں؟ تو:

[جواب] : کہا جائے گا کہ یہ تو باطل جبر محض ہے۔جو لوگ اس کے قائل ہیں ان کے لیے اس مختصر مقام میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہے۔بلکہ قدری یعنی تقدیر کے منکرین بہ نسبت جبریہ کے اس سے چھٹکارہ کے زیادہ قریب ہیں۔جبکہ اہل سنت جو جبریہ،

قدر یہ دونوں کے درمیان ہیں راہ اعتدال پر گامزن ہیں۔ اوران کا اس[اعتراضات کے] جھنجھٹ سے چھٹکارا جلدی ممکن ہے۔

[سوال ۷] :اگر کہا جائے کہ: ندامت اور توبہ کیسے ہو سکتے ہیں جب کہ تقدیر اور حکمت پیش پیش ہیں؛ اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ قیوم[قائم ونگہبان] ہیں۔ اوراس کی مشئیت [چاہت] ہر چیز میں نافذ ہے؟۔

[جواب] :یہی وہ تصور ہے جس نے بصیرت کے اندھوں کو خلاف حقیقت امر میں ڈال دیا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری ہیں؛ اس لیے کہ تقدیر اور مشئیت کے مطابق ہی ہور ہے ہیں۔ تو کہنے والا کہتا ہے: درست ہے کہ میں نے اس کے حکم کی تو نافرمانی کی ہے لیکن اس کے ارادہ ،مشیئت کی تو اطاعت کی ہے۔ چنانچہ اس معنی کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

اصبحت منفعلا لما يختاره　　　　منی ؛ ففعلی كله طاعات

''جو کچھ اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے مجھ سے وہی کچھ ہورہا ہے پس میرے تمام افعال میں اسی کی اطاعت کی جلوہ گری ہے۔''
[مجموع الفتاوى ٨/ ٢٥٧]

❀ یہ وہی لوگ ہیں جو تمام مخلوق میں بصیرت کے سب سے بڑے اندھے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے؛ اس کے دینی اور تکوینی احکام سے سب سے بڑے جاہل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی شرعی امور کی موافقت کا نام اطاعت ہے، تقدیر اور مشیئت کی موافقت کا نام اطاعت نہیں۔ اگر تقدیر کی موافقت کا نام اطاعت ہوتا تو ابلیس بھی اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے اطاعت گزاروں میں سے ہوتا۔ تو پھر اسی طرح قوم نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب علیہم السلام اور قوم فرعون بھی اطاعت گزرا شمار ہوتے۔ [حالانکہ کوئی بھی انہیں اطاعت کرنے والوں میں نہیں سمجھتا۔ پس یہ فرق نہ کرنے والے] انتہائی درجہ کی جہالت ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اپنے نفس کی عاجزی کا اعتراف کرتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے نفاذ کو تسلیم کرتا ہے؛ اور رب کی بارگاہ میں اپنی حد درجہ نیاز مندی [اور حاجت] کو تسلیم کرتا ہے؛ اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ سے اور اس کی حفاظت سے پلک جھپکنے کے برابر بھی بے نیاز نہیں ہوسکتا؛ تو وہ اس حالت میں وہ اپنے رب کے ساتھ [یعنی اسی پر اعتماد کئے ہوئے] ہوتا ہے اپنے نفس کے ساتھ نہیں ہوتا[یعنی نفس پر کلی اعتماد نہیں کرتا ہے]۔ اس حالت میں اس سے گناہ کا صدور بالکل نہیں ہوتا۔ بیشک اس پر ایک مضبوط قلعہ اور پناہ گاہ ہوتی ہے۔ [ایسے ہی انسان کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:]؛ وہ میرے ساتھ ہی سنتا ہے؛ میرے ساتھ وہ دیکھتا ہے؛ اور میرے ساتھ وہ پکڑتا ہے۔ میرے ساتھ وہ چلتا ہے''۔ [الصحيحة ١٦٤٠]

[پس] اس حال میں اس سے گناہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ پس جب اس کو اس مشہد سے روک دیا جاتا ہے؛ اور وہ اپنے نفس کے ساتھ [اکیلا] رہ جاتا ہے؛ تو اس پر نفس کا حکم حاوی ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر اس پر جال اور کانٹے ڈالے جاتے ہیں؛ اور اس پر شکاری اپنا جال پھینکتے ہیں۔ جب کبھی اس سے اس طبعی وجود کے یہ حجابات دور ہو جاتے ہیں؛ تو اس موقع پر ندامت؛ توبہ اور انابت الی اللہ تعالیٰ کا داعیہ ابھرتا ہے۔ بیشک اس داعیہ کو گناہ کی حالت میں نفس نے اپنے رب سے پردے میں کر دیا تھا۔ پس جب وہ اس وجود کو چھوڑ کر ایک دوسرے وجود میں منتقل ہو گیا؛ تو اب وہ اپنے رب کے ساتھ ہے؛ اپنے نفس کے ساتھ نہیں''۔
[مدارج السالكين ٢/ ١٩٣-٢٠٤]

راضی اور ناراض کرنے والے فیصلے:

[جو فیصلے راضی کرتے ہیں اور جو ناراض کرتے ہیں]:

[سوال ۸] :اگر یہ کہا جائے: جب کفر بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ/ قضاء اور تقدیر سے ہوتا ہے؛ اور ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی رہیں؛ تو ہم اس کا انکار کیسے کر سکتے ہیں؟ اور کیسے اس کو مکروہ سمجھ سکتے ہیں؟

[جواب] :اول: یہ جواب دیا جائے گا کہ: ہمیں اس بات کا حکم نہیں دیا گیا ہے اور کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ اور اس کی تقدیر پر رضا مندی کا اظہار کریں۔ اور نہ ہی ایسا کرنے کا حکم کتاب وسنت میں موجود ہے۔ بلکہ بعض فیصلے ایسے ہیں جن پر رضا مندی کا اظہار کیا جائے جبکہ بعض ایسے فیصلے ہیں جن پر ناراضگی اور خفگی کا اظہار کیا جائے۔ جیسا کہ یہ فیصلہ کرنے والا اسبحانہ وتعالیٰ خود اپنے فیصلہ پر راضی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بعض فیصلوں پر ناراض ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعض فیصلہ کی گئی چیزیں ایسی ہیں جن پر غصہ اور خفگی کا اظہار؛ کیا جاتا ہے؛ اور ان پر لعنت اور ان کی مذمت کی جاتی ہے۔

دوم: یہاں پر دو چیزیں ہیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ/ اس کی قضاء ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو کہ اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اور دوسرا مقضی [جس کے متعلق فیصلہ کیا گیا ہے]؛ وہ مفعول ہے؛ جو اس سے جدا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کا فیصلہ: تمام تر خیر، عدل اور حکمت ہے ہم اس تمام قضا/ فیصلے پر راضی ہیں۔

مقضی [جس کا فیصلہ کیا گیا ہے] اس کی دو قسمیں ہیں: بعض وہ ہیں جن پر رضا کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ اور بعض امور وہ ہیں جن پر رضا کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔

سوم: قضاء [فیصلہ] کی دو وجوہ/ دو رُخ ہیں: **اول** :اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور اس کی طرف نسبت۔ اس لحاظ سے اس پر راضی رہنا ہے۔

دوم: قضا کا تعلق بندے کے ساتھ اور اس کی طرف نسبت: اس لحاظ سے اس کی دو اقسام ہیں:

۱۔ وہ جن پر رضا مندی کا اظہار ہو سکتا ہے۔ ۲۔ وہ جن پر رضا مندی کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال کے لیے دیکھیں: کسی نفس کو قتل کرنا۔ اس کے دو رخ ہیں: پہلا رخ: اس اعتبار سے کہ وہ تقدیر الٰہی ہے؛ اس نے اس کا فیصلہ کیا؛ اور اس کو لکھ دیا ہے؛ اس کی چاہت تھی؛ اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو مقتول اجل اور اس کی عمر کی انتہا کے طور پر بنا دیا۔ پس اس پر رضا کا اظہار کیا جائے گا۔

❀ لیکن اس لحاظ سے کہ قاتل سے یہ جرم اس کے اختیار سے ہوا؛ وہ براہ راست اس کا مرتکب ہوا؛ اور یہ اس کی کمائی ہے اس نے یہ جرم کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے ہم اس پر ناراض ہوں گے رضا کا اظہار نہیں کر سکتے''۔ [مدارج السالکین ۱/ ۲۵۶]

اسرار تقدیر میں بحث وتکرار رسوائی اور گمراہی کا ذریعہ:

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ((وَالتَّعَمُّقُ ①وَالنَّظْرُ فِی ذَلِكَ ذَرِیعَةُ الْخِذْلَانِ وَسُلَّمُ الْحِرْمَانِ وَدَرَجَةُ الطُّغْیَانِ.

))''مسئلہ تقدیر میں گہرائی میں جانا اور بحث وتکرار کرنا محرومی کا سبب ہے......'' الخ۔

(تعمق): گہرائی میں جانے کا مطلب ہے: کسی چیز کی طلب میں مبالغہ سے کام لینا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ: تقدیر کے معلومات حاصل کرنے میں مبالغہ سے کام لینا؛ اوراس کے متعلق بحث وتکرار کرتے ہوئے بہت گہرائی میں چلے جانا رسوائی کا ذریعہ ہے۔

ذریعہ: وسیلہ کو کہتے ہیں۔ذریعہ درجہ اور سیڑھی؛ قریب المعانی الفاظ ہیں۔ایسے ہی خذلان 'حرمان اور طغیان بھی قریب المعانی الفاظ ہیں۔لیکن لفظ خذلان ' نصرت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔اور حرمان ؛ کامیابی کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ اور طغیان؛ استقامت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔

❀ امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''پس خبردار! اس میں زیادہ غور وفکر کرنے اور وسوسوں سے اجتناب کیا جائے''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔انھوں نے آپ سے دریافت کیا کہ:'' ہمارے دلوں ایسے خیالات ابھرتے ہیں کہ جن کے اظہار کو ہم گناہ سمجھتے ہیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا:''کیا حقیقت میں تم یہ محسوس کرتے ہو؟۔انھوں نے جواب دیا:''ہاں''۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''یہی تو صریح ایمان کی علامت ہے''۔ ❶

☼ مسلم (۱/ ۸۳)، احمد (۲/ ٤٥٦).

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان:''یہی تو صریح ایمان کی علامت ہے'' میں ان کی اس بات کی طرف اشارہ ہے:''جن کے اظہار کو ہم گناہ سمجھتے ہیں''۔نیز صحیح مسلم میں ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وسوسے کے بارے میں دریافت کیا گیا؛ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وسوسے کو وسوسہ سمجھنا عین ایمان کی علامت ہے''۔ ❶

یہ حدیث بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کے ہم معنی ہے۔اس لیے کہ دل میں وسوسے آنا: یا پھر ان شیطانی وسوسوں کو دفع کرنے کی کوشش کرنا؛ اس طرح ہے جیسے دو آدمیوں کے مابین گفتگو کی جارہی ہو۔پس شیطانی وسوسوں سے دفاع کرنا؛ اور انہیں گناہ سمجھنا یہ صریح ایمان ہے؛ خالص ایمان ہے۔یہ طریقہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین ،اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا دستور اور طریقہ تھا۔جب کہ بعد میں آنے والے نالائق لوگوں نے وسوسوں،شکوک وشبہات سے ورق کالے کئے [یعنی غلط قسم کی کتابیں تحریر کیں]۔بلکہ دلوں کو بھی سیاہ کردیا۔اس طرح باطل کی سرپرستی کرتے ہوئے انھوں نے حق کو دبانے کی کوشش کی ہے''۔اسی لیے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ تقدیر کو قدرے طوالت سے بیان کیا ہے۔اور اس مسئلہ میں مبالغہ آرائی کے ساتھ بحث وتمحیص کو مذموم قرار دیا ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ انسان ناپسندیدہ ہے جو جھگڑا کرنے والا ہٹ دھرم ہے''۔ ❷

☼مسلم ، احمد (٦/ ١٠٦) من حديث عائشه .

❁ بخاری ، مسلم .

حضرت امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم سے ابو معاویہ نے حدیث بیان کی؛ ان سے داؤد بن ابی ہند نے؛ وہ عمرو بن شعیب؛ وہ اپنے والد سے؛ وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں؛ آپ فرماتے ہیں:

''ایک روز رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے لوگ مسئلہ تقدیر میں بحث کر رہے تھے۔-[راوی بیان کرتے ہیں]: غصہ کی وجہ سے آپ کا چہرہ یوں سرخ تھا گویا انار نچوڑا گیا ہے-۔آپ ﷺ نے ان سے کہا: ''تمھیں کیا ہو گیا ہے تم کتاب اللہ تعالیٰ کے بعض حصے کو بعض حصے سے ٹکرار ہے ہو؛ اسی وجہ سے تم سے پہلی امتیں ہلاک ہوئی ہیں''۔

[حضرت عبداللہ تعالیٰ بن عمرو رضی اللہ عنہ] فرماتے ہیں: میں نے کبھی بھی آپ ﷺ کی مجلس سے غیر حاضر ہونے کی خواہش نہیں کی ؛سوائے اس مجلس کے؛ میں نے آرزو کی کاش میں اس مجلس میں شریک نہ ہوتا''۔ ❶

یہ حدیث ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے۔اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

☼ صحيح: احمد، ابن ماجه ح: ٥٨، اس کی سند جید ہے۔

﴿فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا﴾(التوبة: ٦٩)

''جس طرح تم سے پہلے لوگ اپنے حصے سے فائدہ اٹھا چکے ہیں اسی طرح تم نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھالیا ہے۔اور جس طرح وہ باطل میں ڈوبے رہے اسی طرح تم بھی باطل میں ڈوبے رہے۔''

خلاق: کا معنی ہے نصیب۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾[البقرة ٢٠٠]

''اور اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں''۔

یعنی تم نے اپنے دنیاوی حصے کا فائدہ اٹھایا جیسے تم سے پہلے لوگوں نے اپنے حصے کا فائدہ اٹھالیا تھا۔اور تم نے بھی اسی طرح بحث و تکرار کی؛ جس طرح انھوں نے اس بحث میں اپنے آپ کو داخل کیا۔یا جیسے ایک فوج کی مانند؛ یا صنف؛ یا نسل جو گہرائی میں چلے گئے۔

[دین میں خرابی کی وجہ: شبہات اور شہوات]:

پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں اپنے حصے کا فائدہ اور بلا وجہ غور وخوص کو یکجا بیان کر دیا ہے۔اس لیے کہ دین کے فساد یا تو عمل میں ہوتا ہے یا پھر عقیدہ میں۔عمل میں فساد: شہوات کی وجہ سے ہوتا ہے۔اور عقیدہ میں فساد شبہات کی وجہ سے ہوتا ہے۔[اقتضاء الصراط المستقیم ٢٣-٢٤] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَتَأْخُذَنَّ أُمَّتِي مَآخِذَ القُرُونِ قَبْلَهَا شِبراً بِشِبرٍ ، وَذِراعًا بِذِرَاعٍ ، قالوا: فارِس والرُّومُ؟ قال: ((فمنِ الناس إِلَّا أُولئِكَ))۔

''میری امت پہلے لوگوں کے راہ پر چلے گی؛ بالشت در بالشت؛ اور ہاتھ در ہات:۔صحابہ نے دریافت کیا:'' آپ کی مراد فارس

اور روم کے لوگ ہیں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہی تو ہیں اور کون ہیں''۔ ❶

❶ بخاری، فی الاعتصام، احمد (۲/ ۳۲۵، ۳۶۷).

نیز حضرت عبداللہ تعالیٰ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لیأتینَّ علی أُمّتی ما أتی علی بنی إسرائیل حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ، حتّٰی إنْ کَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتیٰ أُمَّه عَلانِیَةً کَانَ مِنْ أُمَّتِی مَنْ یَّصْنَعُ ذٰلِكَ، وَإِنَّ بَنِی إِسْرَائِیلَ تَفَرَّقُوا عَلَی إِثْنَتَیْنِ وَسَبْعِینَ مِلَّةٍ، وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِی عَلَی ثَلاثٍ وَّسَبْعِینَ مِلَّةٍ، کُلُّهُمْ فِی النَّارِ إِلَّا مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ۔ قَالُوا: مَنْ هِیَ یَا رَسُولَ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَا أَنَا عَلَیْهِ وَأَصْحَابِی۔))رواہ الترمذی۔

''میری امت کا وہی حال ہوگا؛ جو نبی اسرائیل کا ہوا کچھ فرق نہ ہوگا؛ جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے عین برابر ہوتا ہے۔ حتی کہ اگر ان میں سے کسی شخص نے اعلانیہ اپنی ماں سے زنا کیا ہوگا؛ تو میری امت میں بھی ضرور ایسا کرنے والا شخص ہوگا۔ نیز یاد رکھو بنی اسرائیل کے بہتر فرقے ہوئے اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے جو سب کے سب دوزخ میں ہوں گے سوائے ایک جماعت کے''۔ صحابہ نے دریافت کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! وہ کون ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں''۔ ❶

❶ ترمذی، قال الترمذی ۲۷۹۲: حدیث حسن صحیح۔ صحیح الجامع (۵۲۱۹)، الصحیحة (۱۳۴۸).

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''یہودیوں کے اکہتر یا بہتر فرقے ہوئے؛ اور اسی طرح نصاریٰ بھی اتنے ہی فرقوں میں بٹ گئے۔ اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی''۔ ❶

❶ صحیح ابوداؤد ۴۵۹۶، ابن ماجه ۳۹۹۱، ترمذی ۲۷۹۱، الصحیحة (۱۳۴۸). وقال حدیث حسن صحیح۔

حضرت معاویہ بن ابوسفیان (۲۰ ق ھ-۶۰ ھ) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بیشک اہل کتاب اپنے دین کے سلسلہ میں بہتر فرقوں میں تقسیم ہوگئے اور بیشک یہ امت عنقریب تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی؛ تمام فرقے خواہش پرست ہوں گے؛ سارے فرقے جہنمی ہوں گے؛ سوائے ایک کے؛ وہی ایک جماعت ہوگی''۔ ❶

❶ مسلم، الصحیحة، رقم (۵۴، ۵۵). ابو داؤد ۴۵۹۷.

وہ بڑے مسائل جن میں امت کا اختلاف واقع ہوا ہے ان میں سب سے بڑا مسئلہ تقدیر کا ہے۔ اس لحاظ سے اس مسئلہ میں بحث بہت زیادہ طوالت اختیار کر گئی ہے۔

عبودیت کی بنیاد ایمان وتسلیم:

شیخ طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ((فَمَنْ سَأَلَ: لِمَ فَعَلَ؟ فَقَدْ رَدَّ حُکْمَ الْکِتَابِ، وَمَنْ رَدَّ حُکْمَ الْکِتَابِ کَانَ مِنَ الْکَافِرِینَ۔))

''جس شخص نے دریافت کیا کہ ایسا کیوں کیا؟ ❶ تو اس نے کتاب اللہ تعالیٰ کے حکم کو رد کر دیا اور جس نے کتاب اللہ تعالیٰ کے

حکم کو رد کیا وہ کافروں سے ہو گیا''۔

تشریح: یاد رہے کہ عبودیت کی بنیاد اور اللہ تعالیٰ پر ایمان؛ اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان کی بنیاد بلا چوں و چراں سر تسلیم خم کرنے؛ اور شرائع اور اوامر ونواہی کی حکمت کے بارے میں سوال نہ کرنے پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی ایسے نبی کی امت کے بارے میں خبر نہیں دی جس نے اپنے پیغمبر کی تصدیق کی ہو؛ اور اس کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان لائی ہو؛ اور اس امت نے جو کچھ انہیں حکم دیا گیا یا جس چیز سے منع کیا گیا؛ اور جس شریعت کی اپنے رب کی طرف سے تبلیغ کی؛ اس کی حکمت کے بارے میں بھی سوال کیا ہو۔ اگر کوئی امت ایسے سوال کرتی تو وہ اپنے نبی پر ایمان لانے والی نہ ہوتی۔ بلکہ وہ اس حکمت کے سامنے سر تسلیم خم کرتی؛ اسے مانتی؛ اور اس کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے جس کی معرفت اسے حاصل ہوئی ہے۔ اور جو چیز مخفی رہ گئی ہے اس کو مان لینا اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اس کی معرفت پر موقوف نہ رکھتی ہو۔ اور نہ ہی ایسا کرنے کو اپنی شان سمجھتی ہے حالانکہ ہر امت کے پیغمبر کا ان کے ہاں مقام اس سے بلند ہے کہ وہ اس سے ایسا سوال کریں۔ چنانچہ انجیل میں ہے:

''اے بنی اسرائیل! تم یہ سوال نہ کرو کہ ہمارے رب نے یہ حکم کیوں دیا ہے؟ لیکن یہ سوال کرو کہ ہمارے رب نے ہمیں کس چیز کا حکم دیا ہے''۔

❶۔ اگر کوئی سوال کرتا ہے کہ اس کو ہدایت کیوں دی؟ اور اس کو گمراہ کیوں کیا؟ اس کو غریب کیوں رکھا؟ اس کو امیر کیوں بنایا؟ تو اس کے یہ سوالات اعتراض کے طور پر ہوتے ہیں۔ جس کے لیے وہ عقل سے ٹکرا اور رکھنے کا دعوی کرتے ہیں۔ ہاں دوسری طرح کا سوال معرفت اور علم کی جانچ کے لیے ہوتا ہے۔ جو کہ سر تسلیم وخم پر مبنی ہوتا ہے مگر انسان اطمینان قلب اور معرفت کے لیے علت یا وجہ جاننا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی ایسی قباحت نہیں سوائے اس قباحت کے کہ یہ بلا وجہ تکلف اور اللہ تعالیٰ کے مخفی علم کو جاننے کی بلا سود کوشش ہے۔ سب سے بڑی قباحت بطور اعتراض سوال کرنے میں ہے۔ یا کسی ایسی چیز کے بارے میں سوال کرنا ہے جس کی معرفت کا کوئی ذریعہ ہی نہ ہو؛ درحقیقت ایسا سوال کرنا اللہ احکم الحاکمین کے حکم پر اعتراض ہے جو کہ حرام اور کفر ہے۔ [دراوی]

یہی وجہ ہے کہ امت محمدیہ کے سلف صالحین رحمہم اللہ جو تمام امتوں سے عقل، علوم، معارف کے لحاظ سے اکمل ہے تھے؛ انہوں نے اپنے نبی سے یہ سوال نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں حکم کیوں دیا؟ یا فلاں کام سے کیوں منع کیا؟ اور یہ چیز مقدر میں کیوں لکھی ہے؟ اور یہ کام کیوں کیا؟۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ ایسا کرنا ایمان، اسلام [سر تسلیم خم کرنے] کے مخالف/ منافی ہے۔ نیز اسلام کے قدم درجہ تسلیم پر ہی ثابت رہ سکتے ہیں۔ پس حکم کی تعظیم کا پہلا درجہ اس کی تصدیق کرنا ہے۔ پھر اس کے سرانجام دینے کا پختہ عزم؛ پھر اس کی تعمیل کے لیے جلدی کرنا؛ اور اس راہ کی رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود اسے بجالانے کے لیے مسابقت کرنا۔ پھر اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے خیر خواہی کے ساتھ اسے کامل ترین شکل میں بجالانے کی کوشش کرنا۔ پھر یہ کام اس لیے کر گزرنا کہ اس کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح اس فعل کا ادا کرنا اس کی حکمت کی معرفت پر موقوف نہ ہو کہ اگر حکمت معلوم ہو تو کر گزرے؛ وگرنہ نہ کرے۔ یہ طرز عمل انقیاد کے منافی ہے اور اس سے حکم کی تعمیل میں قدح وارد ہوتی ہے''۔ [الصواعق المرسلہ ۱۵۶۰]

ابن عبدالبر رحمہ اللہ کا قول:

علامہ قرطبی رحمہ اللہ، ابن عبدالبر رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جو شخص اس لیے دریافت کرتا ہے تاکہ اسے علم حاصل ہو اور اس کی ذات سے جہالت دور ہو؛ اور وہ ان معنی کی تلاش میں ہے

جن پر دین میں توقف کرنا واجب ہے؛ تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں؛ ''جہالت کا علاج سوال کرنا ہے''۔[ابوداؤد۳۳۶:حسن]
اور جو کوئی کٹ حجتی کے لیے سوالات کرے؛ وہ نہیں سمجھنا چاہتا ہو؛ اور نہ ہی علم حاصل کرنا چاہتا ہو؛ تو یہ وہ شخص ہے جس کے لیے نہ ہی تھوڑا سوال کرنا جائز ہے اور نہ ہی زیادہ''۔

ابن عربی رحمہ اللہ [محمد بن عبداللہ المعافری الاشبیلی؛ ۴۶۸ھ-۵۴۳ھ] نے کہا ہے: ''عالم کو چاہیے کہ وہ تفصیل کے ساتھ دلائل پیش کرے؛ اور نقطۂ نظر کی وضاحت کرے اجتہاد کے مقدمات کا ذکر کرے؛ اور ان وسائل کا ذکر کرے جن سے اصل مسئلہ کی معرفت میں مدد مل سکے۔ پس جب کوئی نیا واقعہ رونما ہو تو اس کے حل کے لیے صحیح راہ اختیار کی جائے اور اس کی جستجو میں جدوجہد کی جائے تاکہ اس کا صحیح حل ہو سکے اس طرح یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے سامنے حق وصواب کے دروازے کھول دے گا''۔
[انتهى ؛ عند تفسير آية المائدة ۱۰۳/ احكام القرآن ؛ التمهيد ۲۱/ ۲۹۲]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے:

''انسان کے اچھے اسلام کی نشانی یہ ہے کہ لایعنی باتوں کو ترک کر دے''۔ ❶

☼ صحیح ترمذی۲۴۳۳ ، الروض النضير (۲۹۳ ، ۳۲۱) . اسے صحابہ کی ایك جماعت نے روایت کیا ھے۔

کتاب اللہ تعالیٰ کے حکم میں شبہ کی وجہ سے تاویل پر عدم تکفیر:

جو شخص کتاب اللہ تعالیٰ کا حکم رد کرتا ہے اس کے کافر ہونے میں کچھ شک وشبہ نہیں ❶۔ البتہ جو شخص کسی شبہ پیش آنے کی وجہ سے کتاب اللہ تعالیٰ کے حکم کی تاویل کرتا ہے؛ تو اس کے سامنے راہ صواب واضح کیا جائے گا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کرے۔ پس اللہ تعالیٰ سے اس کے کمال حکمت؛ اور رحمت اور عدل کی وجہ سے سوال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کیا کرتا ہے؛ نہ کہ صرف اس کے قہر اور قدرت کی وجہ سے۔ جیسا کہ جہم اور پیروکار کہتے ہیں۔ مزید وضاحت آگے: اس اس جملہ کی تشریح میں آئے گی:

" لا نكفر أحداً من أهل القبلة بذنب ما لم يستحله "۔

❶۔ کتاب اللہ کا حکم دراصل اللہ تعالیٰ کا ہی حکم ہے۔ اور جو کوئی اس حکم کا انکار کرتا ہے؛ وہ کافر ہے۔ فرمان الٰہی ہے:
﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ (7) اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (8)﴾[التین] '' پس اس کے بعد کون سی چیز تجھے جزا کے بارے میں جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟''۔

کتاب وسنت سے وابستگی کا وجوب

46۔:((...... فَهٰذَا جُمْلَةُ ❶ مَا يَحْتَاجُ إِلَيهِ مَنْ هُوَ مُنَوَّرٌ ❷ قَلْبُهُ مِنْ أَوْلِياءِ اللّٰهِ تَعَالىٰ، وَهِيَ دَرَجَةُ الرَّاسِخِينَ فِي الْعِلْمِ، لِأَنَّ الْعِلْمَ عِلْمَانِ: عِلْمٌ فِي الخَلْقِ مَوجُودٌ، وَعِلْمٌ فِي الخَلْقِ مَفْقُودٌ ❸، فَإِنْكَارُ العِلْمِ المَوجُودِ كُفْرٌ، وَادِّعاءُ العِلْمِ المَفْقُودِ كُفْرٌ، وَلاَ يَثْبُتُ الإِيْمَانُ إِلَّا بِقَبُولِ العِلْمِ المَوجُودِ، وَتَرْكِ طَلَبِ العِلمِ المَفْقُودِ)).

''پس یہ وہ مسائل ہیں جن کی ضرورت اولیاء اللہ تعالیٰ میں سے روشن دلوں والے محسوس کرتے ہیں۔ یہ راسخین فی العلم کا مقام و مرتبہ ہے۔ اس لیے کہ علم کی دو اقسام ہیں: ایک علم تو وہ ہے جو مخلوق میں پایا جاتا ہے۔ اور دوسرا وہ علم ہے جو مخلوق میں مفقود ہے۔ پس موجود علم کا انکار کرنا کفر ہے اور مفقود علم کا دعویٰ کرنا بھی کفر ہے۔ ایمان تب ثابت ہوگا جب آپ موجود علم کو قبول کرلیں اور مفقود علم کو طلب کرنا چھوڑ دیں''۔

❶۔ اس سے مراد وہ امور ہیں جن کا جاننا ازبس ضروری ہے؛ اور ان کا بیان اس سے پہلے گزر چکا ہے۔

❷۔ اس نور سے معنوی نور مراد ہے؛ حسی نور مراد نہیں۔ معنوی نور ایمان کا نور ہے جو انسان کے دل میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾[التغابن 8] ''سو تم اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، خوب باخبر ہے''۔ ایمان اور علم کا نور دل میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾[الانعام ۱۲۲] '' اور کیا وہ شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایسی روشنی بنادی جس کی مدد سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں ہے، ان سے کسی صورت نکلنے والا نہیں''۔ اور یہ صورت تب ہی بن سکتی ہے جب اللہ تعالیٰ کسی ان اندھیروں سے باہر نکال لائیں۔ فرمان الٰہی ہے: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾[البقرہ ۲۵۷] ''اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے''۔

اس کی اگر مزید تفصیل اور دلوں کی اقسام کے متعلق معلومات حاصل کرنی ہوں تو پھر ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ''إجتماع الجيوش الاسلامية'' اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''الوابل الصیب'' ص ۳۹ کا مطالعہ بہت ہی مفید رہے گا۔

❸۔ علم مفقود سے مصنف رحمہ اللہ کی مراد غیب کا علم ہے؛ جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اور جو کوئی علم غیب جاننے کا دعوی کرتا ہے؛ وہ کفر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾[الانعام ۵۹] '' اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾[النمل ۶۸] ''فرما دیجیے: اللہ تعالیٰ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا''۔ اور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے: ''غیب کنجیاں پانچ چیزیں ہیں؛ جن کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا'' اور پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾[لقمان ۳۴] '' بے شک اللہ، اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہ بارش برساتا ہے''۔ اس باب میں بہت ساری صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں؛ جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ غیب کا علم نہیں جانتے تھے؛ حالانکہ آپ تمام مخلوق سے افضل اور تمام رسولوں کے سردار تھے۔ تو پھر کوئی دوسرا تو بالاولیٰ اس علم سے بے خبر ہے۔ آپ ﷺ کو بھی وہی علم تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا تھا۔ جب اہل ''افک'' نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق باتیں بنانی شروع کیں؛ تو آپ ﷺ کو وحی کے نازل ہونے تک ان کی برأت کا علم نہ ہوسکا۔ اور ایک سفر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہوگیا؛ آپ نے اس کی تلاش کے لیے ایک گروہ کو روانہ فرمایا؛ آپ کو اس ہار کی جگہ کا علم نہیں تھا۔ حتی کہ جب انہوں نے اونٹ کو اٹھایا تو ہار اس کے نیچے سے مل گیا۔ اس سلسلہ کتاب وسنت دلائل کی بہتات ہے۔ والحمد للہ۔

تَشْرِیح: مصنف کے قول: '' فَهَذَا '' سے ان امور کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر ہو چکا۔ وہ امور جن کا اعتقاد رکھنا اور ان کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔ جو باتیں شریعت مطہرہ لے کر آئی ہے۔

❀ مصنف کے قول: '' وَهِيَ دَرَجَةُ الرَّاسِخِينَ '' [1] سے مراد وہ حضرات ہیں؛ جو نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے علم سے نفی اور اثبات میں اجمالاً اور تفصیلاً آگاہ ہیں۔

[1] ۔ راسخون فی العلم وہ لوگ ہیں جو ان تمام امور پر ایمان رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ اور جن امور کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے؛ یا پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق آگاہ کیا؛ ان پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کرتے۔ بلکہ اسے بسر و چشم تسلیم کرتے اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

علم مفقود سے مراد تقدیر کا علم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے لپیٹ لیا ہے اور اس میں بحث کرنے سے منع کیا ہے۔

اور علم موجود سے مراد شریعت اور اس کے اصولوں اور فروعات کا علم ہے۔

پس جو شخص اس علم کا انکار کرتا ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے پیش فرمایا؛ تو وہ کافروں میں سے ہے اسی طرح وہ انسان بھی کافروں میں سے ہے جو مفقود علم یعنی علم غیب کا دعوی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًاۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (الجن: ۲۶، ۲۷)

'' (وہی) غیب کی بات جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ﴾ (لقمان: ۳۶)

'' اللہ تعالیٰ ہی کو قیامت کا علم ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ رحم میں کیا ہے؟ اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں اسے موت آئے گی بے شک اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہیں۔''

کسی حکمت کے ہم پر مخفی رہ جانے سے اس کا معدوم ہونا لازم نہیں آتا۔ اور نہ ہی ہماری لاعلمی کی وجہ سے حکمت کی نفی لازم آتی ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ مثلاً سانپ، بچھو، چوہے اور حشرات الارض کے پیدا فرمانے میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہم پر مخفی ہیں؛ ان کے تو صرف نقصان کا ہی ہمیں علم ہے۔ پس کوئی اس کا انکار نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے خالق ہی نہیں۔ اور اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ ان کے پیدا کرنے میں کوئی حکمت ہی نہ ہو جو ہم مخفی رہ گئی ہو۔ اس لیے کہ علم کے نہ ہونے سے معدوم کے علم کی نفی نہیں ہوسکتی۔

لوح محفوظ اور قلم پر ایمان:

47۔ :((ونؤمن باللَّوح ① والقَلَم ②، وبجميع ما فيه قد رُقِم .))

''لوح وقلم؛ اور جو کچھ اس میں مرقوم ہے ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں''۔

'' ونؤمن باللَّوح والقَلَم، وبجميع ما فيه قد رُقِم . ''

''ہم لوح وقلم؛ اور جو کچھ اس میں مرقوم ہے سب پر ایمان رکھتے ہیں''۔

تشریح: ارشاد ربانی ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ o فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ o﴾۔ ❶ (البروج: ۲۱، ۲۲)

''بلکہ وہ قرآن ہے بزرگی والا؛ لوح محفوظ میں ہے۔''

حافظ ابوالقاسم؛ امام طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ کو سفید رنگ کے موتی سے پیدا فرمایا؛ جس کے صفحات سرخ رنگ کے یاقوت کے ہیں؛ اس

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مذکور ہے: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ o فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ o﴾ (البروج: ۲۱، ۲۲) ''بلکہ وہ قرآن ہے بزرگی والا؛ لوح محفوظ میں ہے''۔ یہ اس غیب میں سے ہے جس پر ایمان رکھنا واجب ہے اور اس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ اعتقاد رکھنا کہ بعض نیک بندے اس کی اطلاع پالیتے ہیں؛ حقیقت میں یہ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے کفر ہے۔ ان میں تصریح موجود ہے کہ غیب کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

② ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں یہاں پر شارح رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ: علماء کا اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاً قلم کو پیدا فرمایا یا عرش کو۔ اس میں دو قول ہیں؛ کوئی تیسرا قول نہیں۔ اور میرے نزدیک اگرچہ راجح پہلا قول تھا؛ اور میں نے اپنی تعلیق (ص ۲۹۵) پر اس کی صراحت بھی کی تھی۔ مگر اب میں کہتا ہوں: بھلے راجح یہ قول ہو؛ یا وہ قول؛ اس میں مذکور اختلاف اپنے مفہوم کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علماء کا اتفاق ہے کہ کوئی مخلوق پہلی بھی ہے۔ اور جو حضرات یہ کہتے ہیں: حوادث کی کوئی ابتداء نہیں؛ وہ اس اجماع امت کے خلاف ہیں۔ اس لیے کہ وہ کھلے لفظوں میں کہہ رہے ہیں: کوئی بھی مخلوق ایسی نہیں ہے جس سے پہلے کوئی دوسری مخلوق نہ ہو؛ اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ اور اس کی کوئی ابتداء نہیں۔ جیسا کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی بعض کتابوں میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اگر وہ کہتے ہیں: عرش پہلی مخلوق ہے؛ جیسا کہ شارح کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے تو وہ اپنے ہی قول میں تناقض کا شکار ہوتے ہیں کہ حوادث کی کوئی ابتداء نہیں ہوتی۔ اور اگر وہ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تو اجماع امت سے اختلاف کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس پر غور کرنا چاہیے یہ بہت ہی اہم ہے۔ واللہ تعالیٰ الموفق۔

اَقول: درحقیقت لوح وقلم کا موضوع بھی تقدیر کے مسئلہ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور اس پیرائے کا تعلق بھی سابقہ مختلف پیرائے سے ملتا ہے۔

❶ ۔اس کی شاہد ایک دوسری آیت بھی ہے؛ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (الحج ۷۰) '' کیا تو نے نہیں جانا کہ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ بے شک یہ ایک کتاب میں درج ہے، بے شک یہ اللہ تعالیٰ پر بہت آسان ہے''۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس کتاب یعنی لوح محفوظ کے بارے میں خبر دی ہے؛ اس پر ایمان رکھنا واجب ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس میں قیامت تک کے لیے ہر ایک چیز کی تقدیر لکھ دی گئی ہے۔ اور قیامت تک ہونے والے تمام امور اس میں درج ہیں۔ اسے تقدیر اول یا تقدیر عام کہتے ہیں جو تمام مخلوقات کو شامل ہے۔

کا قلم نور ہے اور اس کی کتاب بھی نور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر روز اس میں تین سو ساٹھ بار دیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے رزق عطا کرتا ہے مارتا ہے زندہ کرتا ہے عزت بخشتا ہے ذلت دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے کرتا ہے''۔ ❶

❶ حدیث ضعیف ہے زیاد بن عبداللہ البکائی اور لیث ابن ابی سلیم دونوں راوی ضعیف ہیں۔ البتہ موقوف روایت کی سند حسن ہے۔ الطبراني المعجم الکبیر (۳/ ۱۶۵/ ۱)، الثقات لابن حبان (۲/ ۳۲) ۔اس روایت کو نقل کرنے احمد شاکر رحمہ اللہ والے نسخہ میں تحریف واقع ہوئی ہے۔ انہوں نے اسے ''مجمع الزوائد'' میں وارد حدیث سے اس کو صحیح کہا ہے؛ جو کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔ ہم نے المعجم سے اس کی تصحیح کی ہے۔ اور یہی درست ہے۔ اس لیے کہ مؤلف نے اسے مرفوع سند سے روایت کیا ہے۔ تو اس صورت میں موقوف سند کے اعتبار سے اس کو صحیح کہنا درست نہیں۔ اور ان دونوں روایات کے الفاظ میں بھی اختلاف ہے؛ جس کی طرف ہم نے ''نحوہ'' کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

مذکورہ لوح محفوظ سے مراد وہ کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کی تقدیر لکھی دی ہے۔ اور مذکورہ قلم سے مراد وہ قلم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور اس کے ساتھ لوح محفوظ میں تقدیر تحریر فرمائی۔ جیسا کہ سنن ابی داؤد میں ہے؛ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ (۳۸ ق ھ-۳۴ ھ) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرمایا اس سے کہا تحریر کرو اس نے دریافت کیا: یا اللہ! میں کیا لکھوں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قیامت قائم ہونے تک ہر چیز کی تقدیر تحریر کرو''۔ ❶

❶ صحیح ہے۔ ابوداؤد (۴۷۰۰)، الصحیحة، رقم (۱۳۳) . ۔لیکن مجھے ان حروف کے متعلق توقف تھا جن سے مؤلف رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے؛ یعنی " فقال " کے الفاظ۔ چونکہ بعض روایات میں یوں وارد ہوا ہے: ''ثم قال''۔ پس امام ابوداؤد نے ابوحفص کی سند سے روایت کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے فرمایا؛ اس میں " فقال " کے الفاظ ہیں۔
میں کہتا ہوں: ابوحفص کا نام حبیش بن شریح الشامی ہے۔ ابن حبان کے علاوہ کسی نے اس کی توثیق نہیں کی۔ ''التقریب'' میں اسے مقبول کہا ہے؛ یعنی متابعت کی صورت میں۔ وگرنہ حدیث کی روایت میں بہت کمزور ہے۔ جیسا کہ مقدمہ میں اس کے بارے میں دوٹوک مؤقف اختیار کیا ہے۔ اس کی تابع روایات بھی ہیں۔ لیکن ان تابع روایات کی اسناد صحیح نہیں ہیں۔ امام طیالسی (۵۷۷) میں کہا ہے: حدثنا عبد الواحد بن سلیم عن عطاء ابن أبي رباح، حدثني الولید بن عبادة بن الصامت عن أبیه به ۔اور طیالسی کے ذریعہ سے ہی امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے؛ اور ساتھ ہی کہا ہے: "حدیث حسن غریب، وفیه عن ابن عباس''۔
میں کہتا ہوں: اس میں عبدالواحد ضعیف ہے جیسا کہ تقریب میں بھی ہے۔ اور ایوب بن زیاد نے اس کی مخالفت کی ہے؛ وہ کہتا ہے: حدثني عباد بن الولید بن عبادة حدثني أبي به، لکنه قال: ثم قال: اکتب ......" وهذا أخرجه أحمد ﴿5/ 317﴾ وسنده حسن ۔اس کے تمام راوی ثقہ اور معروف ہیں؛ سوائے اس زیاد کے۔ اس سے علماء کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے؛ اور ابن حبان نے اس کو ثقہ کہا ہے۔ اور یہ روایت ان شاء اللہ حسن درجہ کی ہے۔ اسے امام آجری رحمہ اللہ نے ''کتاب الشریعة ص ۱۷۷'' پر اسی سند سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ''فقال له: اجر''۔
اور اسے یزید بن ابی حبیب نے ولید بن عبادہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے: ثم قال: اکتب ......" ۔اس کے راوی بھی ثقہ ہیں؛ سوائے ابن لھیعہ کے؛ اس کا حافظہ خراب تھا۔ اس کی شہادت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ملتی ہے؛ جس کے الفاظ ہیں: ''إن أول شيء خلق الله عز وجل القلم، ثم خلق النون وهي الدواة، ثم قال: اکتب ...... ؛ الحدیث. رواه الآجری والواحدی فی تفسیره ﴿4/ 157﴾ ۔اس روایت میں حسن بن یحیٰ خشنی ہے؛ جس کے بارے میں اختلاف ہے۔ تقریب میں لکھا ہے: صدوق کثیر الغلط ۔''ہے تو سچا؛ مگر غلطیاں بہت زیادہ کرتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ: اس حرف کے اعتبار سے روایات مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی روایت کے ساتھ مصنف کا استدلال پورا نہیں ہوسکتا کہ عرش کو قلم کی تخلیق پر تقدیم حاصل ہے؛ حتی کہ وہ اس دوسری روایت کا راجح ہونا ثابت کردیں جس میں ہے: ''پھر اس سے فرمایا''۔ کیونکہ اکثر روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور اس کی شہادت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی سابقہ روایت سے بھی ملتی ہے۔ اور یہ معانی کے زیادہ ہونے کو متضمن ہے۔
پس اس صورت میں اس روایت اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث میں کوئی تعارض باقی نہیں رہ جاتا۔ کیونکہ یہ روایت صاف بتا رہی ہے کہ نوشتہ تحریر ہونے کا وقت تخلیق عرش سے بعد کا ہے۔ اور راجح روایت کے مطابق حدیث صحیح میں صراحت ہے کہ سب سے پہلی مخلوق قلم ہے؛ پھر اسے حکم دیا گیا کہ وہ ہر

اس چیز کو لکھ دے جو ہونے والی ہے؛ اسی میں عرش بھی آتا ہے۔ میرے نزدیک راجح یہی ہے کہ قلم کو عرش پر تقدیم حاصل ہے۔ واللہ اعلم۔ مزید برآں اس حدیث میں ایک لطیف اشارہ ہے؛ یہ ان علماء/ سائنس دانوں پر رد ہے جو کہتے ہیں: حوادث کی کوئی ابتداء نہیں۔ اور کوئی بھی مخلوق ایسی نہیں ہے جس سے پہلے کوئی دوسری مخلوق موجود نہ ہو۔ اور اس سلسلہ کی کوئی ابتداء نہیں رہتی۔ اس پر غور و فکر کریں۔

پہلی تخلیق میں اختلاف: اول مخلوق قلم ہے یا عرش؟

علماء کا اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاً قلم کو پیدا فرمایا یا عرش کو؟۔ اس میں دو قول ہیں؛ جن کو حافظ ابو العلاء ہمدانی رحمہ اللہ (۴۸۸ھ-۵۶۹ھ) نے ذکر کیا ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قلم سے قبل عرش کو پیدا فرمایا۔ صحیح حدیث میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''آسمانوں زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیر تحریر فرمائی تب اس کا عرش پانی پر تھا''۔ [1]

یہ حدیث صریح ہے کہ عرش پیدا فرمانے کے بعد تقدیر لکھے جانے کا واقعہ پیش آیا۔ تقدیر کا آغاز قلم پیدا فرمانے کی ابتداء سے ہوا۔ یہ بات حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے قلم کے متعلق یہ کہنا کہ: ''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرمایا''۔ یہ دو احتمال سے خالی نہیں: یا تو یہ ایک جملہ میں ہوگا یا دو جملوں میں۔ اگر ایک ہی جملہ میں ہے؛ اور یہی صحیح بات ہے؛ تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کرتے ہی شروع میں ہی کہہ دیا: ''اکتب یعنی لکھ''۔ جیسا کہ حدیث کے الفاظ ہیں:

((أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالٰى الْقَلَمَ قَالَ لَهٗ: أُكْتُبْ))۔

''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرمایا؛ اور اس سے کہا لکھ''۔

اس میں لفظ ''اولَ'' کے لام پر اور القلمَ کے میم پر زبر ہے۔ اور اس کو اولُ اور القلمُ؛ اول کے لازم پر اور قلم کے میم پر پیش کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے۔ پس اس صورت میں اس کو اس پر محمول کرنا متعین ہو جاتا ہے کہ بیشک قلم ہی اس عالم کی سب سے پہلی مخلوق ہے۔ پس اس صورت میں دونوں حدیثیں متفق ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق عرش کی تخلیق تقدیر لکھنے سے پہلے ہو چکی تھی۔ اور تقدیر کی تحریر تخلیق قلم کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا تو اس سے کہا تحریر کرو۔ پس یہ قلم پہلا قلم ہے اور ان سب سے افضل اور جلیل القدر ہے۔ نیز کئی ایک مفسرین کا قول ہے کہ یہی وہ قلم ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1] صحیح، احمد (۲/ ۱۶۹).

﴿نٓ ۚ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ (القلم: ۱)

''ن قلم اور ان (کلمات) کی قسم جن کو وہ لکھتے ہیں۔''

دوسری قلم: اس کو قلم وحی کہا جاتا ہے جس کے ساتھ وحی لکھی جاتی ہے جو انبیاء و مرسلین کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ اس قلم والوں کو تمام عالم پر حاکم ہونے کا شرف حاصل ہے اور باقی تمام اقلام ان کی اقلام کی خادم ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسراء کی رات ایسے ہموار مقام پر لے جایا گیا جہاں آپ کو اقلام کی آوازیں سنائی دیتی تھیں تو دراصل یہی وہ اقلام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکامات (جو عالم علوی اور سفلی کی تدابیر کے بارے میں ہیں) تحریر کرتی ہیں''۔ [التبیان فی أقسام القرآن ۱۲۹]

صحیفہ تحریر اور قیامت تک کے احوال

مؤلف رحمہ اللہ کا فرمان:

((فَلَوِ اجْتَمَعَ الْخَلْقُ كُلُّهُمْ عَلَى شَيْءٍ كَتَبَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيهِ أَنَّهُ كَائِنٌ، لِيَجْعَلُوْهُ غَيْرَ كَائِنٍ- لَمْ يَقْدِرُوا عَلَيْهِ.وَلَوِ اجْتَمَعُوا كُلُّهُمْ عَلَى شَيْءٍ لَمْ يَكْتُبْهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيهِ، لِيَجْعَلُوْهُ كَائِناً -لَمْ يَقْدِرُوا عَلَيْهِ.جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى يَوْمِ القِيَامَةِ .))

''پس اگر تمام مخلوق اس بات پر جمع ہو جائے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ وہ مستقبل میں ہونے والا ہے اس کو نہ ہونے دیں تو وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتے؛ اور اگر تمام اس پر جمع ہو جائیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نہیں لکھا اس کو کر کے دکھائیں تو وہ اس پر بھی قادر نہیں ہو سکتے۔ جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے قلم تحریر کر کے خشک ہو چکی ہے''۔

تشریح:...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث پہلے گزر چکی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں؛ فرمایا: حضرت سراقہ بن مالک بن جعشم رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں ہمارے دین سے آگاہ فرمائیں گویا کہ ہم ابھی پیدا ہوئے ہیں آج جو ہم عمل کر رہے ہیں کیا اس کو پہلے سے اقلام نے لکھ دیا ہے اور تقدیر میں ثابت ہو چکا ہے؟ یا عمل کرنے سے اس کا وجود مستقبل میں ظاہر ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا:

((لَا، بَلْ فِيمَا جَفَّتْ بِهِ الأَقْلَامُ وَجَرَتْ بِهِ المَقَادِيْرُ .))

''نہیں؛ بلکہ اقلام اس کو لکھ کر خشک ہو چکی ہیں اور تقدیر میں ثابت ہو چکا ہے''۔ [1]

[1] حدیث صحیح ہے۔ مسلم (۸/ ۴۸؛ح :۲۶۴۸)، احمد (۳/ ۲۹۲).

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے [سواری پر] تھا آپ نے فرمایا:

((يَا غُلَامُ! أَلَا أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ؟ اِحْفِظِ اللّٰهَ يَحْفِظْكَ اِحْفِظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تَجاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَ إِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الأُمَّةَ لوِ اجتَمَعَتْ على أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيءٍ لَم يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ لكَ، ولوِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُوكَ بِشَيءٍ لَمْ يَضُرُوكَ إِلَّا بِشَيءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللهُ عَلَيكَ، رُفِعَتِ الأَقْلَامُ، وَجَفَّتِ الصُّحُفُ .))

''اے نوجوان! کیا میں تجھے چند کلمات کی تعلیم نہ دوں؟ تو اللہ تعالیٰ کو یاد رکھ؛ اللہ تعالیٰ تیری حفاظت کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو یاد رکھ؛ تو اس کو اپنے ساتھ پائے گا۔ اور جب تو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کر؛ اور جب تو مدد مانگے تو صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ۔ نیز یاد رکھو اگر تمام امت اس بات پر جمع ہو جائے کہ وہ تجھے کچھ فائدہ پہنچانا چاہیں؛ تو تجھے کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے

مگر جس قدر اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے۔ اور اگر وہ اس بات پر جمع ہو جائیں کہ تجھے کچھ کسی چیز میں نقصان دیں؛ تو تجھے کسی چیز کا نقصان نہیں دے سکتے مگر جتنا اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے۔ اقلام اٹھائی جا چکی ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں''۔ ❶

❶ ترمذی؛ ۲۶۴۸/ قال حدیث حسن صحیح ہے۔ السنة لا بن ابن عاصم (۳۱۶-۳۱۸). پس تقدیر کا نوشتہ تحریر ہو چکا ہے۔ اگر ساری کائنات کے لوگ مل جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی تحریر کو بدلنے پر قادر نہیں ہو سکتے۔ یہ بات ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں ہے۔ پس اب انسان پر واجب ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی امید اللہ تعالیٰ سے وابستہ رکھے؛ اور اسی کا خوف اپنے دل میں رکھے اسباب اور افراد کا نہ خوف رکھے؛ اور نہ ہی ان سے امیدیں وابستہ رکھے۔ اس لیے کہ اگر کسی بندے سے کوئی فائدہ انسان کو ملتا بھی ہے تو اس کو چلانے اور جاری کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی نے اس کے اسباب کو آسان فرمایا ہے۔ اور یہی حال نقصان کا بھی ہے۔

ترمذی کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں ہے:

''تو اللہ تعالیٰ کو یاد رکھ؛ تو اس کو اپنے سامنے پائے گا۔ خوشحالی میں اللہ تعالیٰ کی معرفت پیدا کر وہ بدحالی میں تیری پہچان رکھے گا۔ اور جان لے کہ جو مصیبت تجھ سے ٹل گئی؛ وہ تجھے پہنچنے والی نہ تھی اور جو مصیبت تجھے پہنچ چکی ہے اس نے تجھ سے ٹلنا نہیں تھا۔ اور جان لے کہ مدد کا ملنا صبر کے ساتھ ہے؛ مصیبت کے ساتھ خوشحالی ہوگی اور تنگی کے بعد آسانی حاصل ہوگی۔''

[مسند عبد بن حمید ٦٣٦ ؛ مسند أحمد ٢٨٠٣]

قلم کی اقسام:

مذکورہ احادیث کے علاوہ دیگر احادیث میں بھی اقلام جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد ہے؛ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قلم اول کے علاوہ - جس کا ذکر لوح محفوظ کے ساتھ گزر چکا ہے - تقدیر کے دیگر اقلام بھی ہیں۔ سنت سے پتہ چلتا ہے کہ اقلام چار ہیں لیکن یہ تقسیم سابقہ بیان کردہ تقسیم کے علاوہ ہے۔

پہلا قلم: یہ قلم عام اور تمام مخلوقات کو شامل ہے اس کا ذکر لوح محفوظ کے ذکر کے ساتھ ہو چکا ہے۔

دوسرا قلم: جس وقت حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے؛ [یہ بھی اس وقت تخلیق ہوا]۔ یہ بھی عام قلم ہے؛ البتہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے اثبات میں چند آیات وارد ہوئی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا فرمانے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے اعمال، رزق، اجل، سعادت وغیرہ کو مقدر فرمایا تھا۔

تیسرا قلم: جب فرشتے کو ماں کے پیٹ میں جنین کی جانب بھیجا جاتا ہے وہ اس میں روح پھونکتا ہے؛ چار باتوں کے تحریر کرنے کا حکم ملتا ہے: ''بچے کا رزق، اجل، عمل، نیک بخت، بدبخت ہونا لکھا جاتا ہے''۔ ❶ جبکہ احادیث صحیحہ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔

❶ متفق علیه البخاری ۳۲۰۸ ؛ مسلم ۲٦٤۳: حدیث ابن مسعود۔ الظلال (۱۷۵ و ۱۷٦).

چوتھا قلم: جو انسان کی بلوغت کے وقت اس پر رکھا ہوتا ہے وہ قلم کراماً کاتبین کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس سے وہ ان تمام کاموں کو لکھتے ہیں جو کام بنی آدم کرتے ہیں'' ❶۔ جیسا کہ اس کا ذکر کتاب وسنت میں موجود ہے۔

❶۔أبو داؤد ٤٤٠١ ؛ عن عمر و علي؛ ٤٣٩٨ عن عائشة ۔ الحاكم ٤/ ٣٨٩۔

اللہ تعالیٰ کی توحید اور تقویٰ وخشیت کا وجوب:

جب بندہ یقین کر لیتا ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے؛ تو پھر اس پر تقوی اور خشیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید بجالانا واجب ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ﴾ (المائدة: ٤٤)

''تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ﴾ (البقرة: ٤٠)

''اور مجھ ہی سے ڈرو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِيَّایَ فَاتَّقُوْن﴾ (البقرة: ٤١)

''اور مجھ ہی سے بچو [تقوی اختیار کرو]۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقِيهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ (النور: ٥٢)

''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اس سے ڈرے تو وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ﴾ (المدثر: ٥٦)

''وہ اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور اس سے مغفرت طلب کی جائے۔''

اس مضمون کی آیات قرآن پاک میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ تو ہر انسان کے لیے کچھ چیزوں سے اجتناب کرنا انتہائی ضرور ہے؛ بیشک وہ اکیلا تو زندگی بسر نہیں کر رہا۔ اگر چہ کوئی شخص صاحب اطاعت بادشاہ ہی کیوں نہ ہو؛ اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی رعیت کا خیال رکھتے ہوئے کچھ چیزوں سے اجتناب کرے۔ پس اس لیے ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کرے۔ اور اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا ڈر نہیں رکھتا اور مخلوق کا ڈر رکھتا ہے؛ تو تمام لوگوں کی محبت یا ان کی نفرت [دشمنی] ایک ساتھ نہیں ہوسکتی۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ جس کو چاہتا ہو؛ وہ اس کو ناپسند کرتا ہو۔ پس تمام لوگوں کو راضی کرنا ناممکن ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول:

آپ فرماتے ہیں: ''تمام لوگوں کو خوش رکھنا ایسی غایت ہے جس کو پانا ممکن نہیں۔ پس آپ پر وہ چیز لازم ہے جس سے آپ کی اصلاح ہوتی ہو۔ باقی باتوں کو چھوڑ دیں ان کی پرواہ نہ کریں۔ پس مخلوق کو راضی رکھنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی اس کا حکم دیا گیا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی ممکن بھی ہے؛ اور اس کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ نیز مخلوق انسان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ کام نہیں آسکتی۔ پس اگر بندہ اپنے رب سے ڈر کر رہے تو اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کی محتاجی سے کفایت کر جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف تحریر کیا تھا؛ یہ مرفوعاً اور موقوفاً مروی ہے''۔

[الترمذی ۲۵۴۰؛ موقوفاً ۲۵۴۱ مرفوعاً؛ صحیح۔ عبدالوہاب بن الورد کی سند سے اہل مدینہ کے ایک آدمی سے مروی ہے؛ وہ کہتا ہے: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خط لکھا کہ مجھے وصیت لکھ بھیجو؛ مگر بہت زیادہ لمبی وصیت نہ ہو۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام لکھا: السلام علیک۔ امابعد: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے: ''جس شخص نے لوگوں کو ناراض کر کے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیا؛ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاتا ہے؛ اور لوگوں کو بھی اس سے راضی کر دیتے ہیں۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی تلاش میں رہتا ہے اور لوگوں کو ناراض کر دیتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کی طرف سے پریشانی میں کفایت کر جاتے ہیں۔ اور جو شخص لوگوں کی رضا مندی کی تلاش میں رہتا ہے؛ اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ والسلام علیک''۔ پھر اسے ہشام بن عروہ کی سند سے ان کے والد سے روایت کیا ہے؛ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت امیر معاویہ کے نام خط لکھا؛ اور اسی معنی میں حدیث بیان کی؛ اور اسے مرفوع نہیں کیا۔

میں کہتا ہوں: اس مرفوع روایت کی سند اس آدمی کی وجہ سے ضعیف ہے جس کا نام نہیں لیا گیا۔ جب کہ موقوف روایت کی سند صحیح ہے۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ نیز اسے عثمان بن واقد نے اپنے والد سے روایت کیا ہے؛ وہ محمد بن المنکدر سے وہ عروہ بن زبیر سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ اس میں یہی الفاظ ہیں: ''جس شخص نے لوگوں کو ناراض کر کے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیا؛ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاتا ہے؛ اور لوگوں کو بھی اس سے راضی کر دیتے ہیں۔ اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے لوگوں کی رضا مندی کو تلاش کیا تو اللہ تعالیٰ بھی اس پر ناراض ہو جاتے ہیں؛ اور لوگوں کو بھی اس پر ناراض کر دیتے ہیں''۔] اسے امام قضاعی نے مسند شہاب میں ۴۲/۲ مشرق بن عبداللہ کی حدیث میں روایت کیا ہے۔ ابن عساکر ۱۵/ ۲۷۸۔ میں کہتا ہوں: یہ سند حسن ہے۔ اس کے تمام راوی ثقہ اور معروف ہیں۔ عثمان بن واقد میں کلام ہے مگر اس کی وجہ سے حدیث کا مرتبہ حسن درجہ سے نیچے نہیں آتا۔ تقریب میں ہے: ''صدوق؛ ربما وھم''۔ سچا انسان ہے کبھی کبھار وہم کا شکار ہو جاتا ہے''۔ اس کا کچھ حصہ ابن بشران نے امالی میں ص ۱۴۴ پر؛ اور ابن الاعرابی نے اپنی معجم میں ۱/ ۸۲ پر اور ابوالقاسم المہرانی نے الفوائد المنتخبہ میں ۳/ ۳۲ پر؛ اور ابن شاذان الأزجی نے الفوائد المنتقاۃ ۲/ ۱۱۸ پر اور قضاعی نے مسند میں ۲/ ۴۲ پر قطبہ بن علاء بن منہال الغنوی کی سند سے اپنے والد سے؛ اور انہوں نے عروہ بن ہشام سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے: ''جو کوئی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے لوگوں سے حمد و ثناء کا طلب گار ہوتا ہے؛ تو اس کی تعریف کرنے والے بھی اس کی مذمت کرنے لگ جاتے ہیں۔

مہرانی نے کہا ہے: ''یہ حدیث غریب ہے؛ میرے علم کے مطابق ہشام سے علاء بن منہال کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کی''۔ نیز یہ روایت ان الفاظ میں بھی منقول ہے: ''من التمس محامد الناس بمعاصي الله تعالى عاد حامده من الناس ذاماً له''۔ رواه الخرائطي في مساوىء الأخلاق ۲/ ۵۔ والعقيلي في الضعفاء ۳۲۵؛ وابن عدي في الكامل ق 2/ 272۔ اور ابوالحسن ابن صلت نے ابن عبدالعزیز ہاشمی کی روایت میں ۱/ ۶۷؛ عقیلی نے کہا ہے: ''علاء بن منہال کی اس روایت میں متابعت نہیں کی گئی؛ اور وہ صرف اسی روایت کی وجہ سے معروف ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے: قوی نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں: ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ پھر عقیلی نے کہا ہے: ''اس باب میں کوئی مسند روایت صحیح نہیں؛ یہ قول ہے جو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر موقوف ہے۔

میں کہتا ہوں: میرے نزدیک درست بات یہی ہے: یہ حدیث موقوف اور مرفوع دونوں طرح سے صحیح ہے۔ موقوف روایت کا صحیح ہونا ظاہر ہے۔ جبکہ مرفوع روایت اس لیے کہ یہ عثمان بن واقد کی روایت سے حسن درجہ کی سند سے مروی ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ پس جب اس کے ساتھ ترمذی کی سند بھی ملا لی جائے تو حدیث کا مرتبہ صحت کے درجہ تک ترقی کر جاتا ہے۔ ان شاء اللہ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول:

''جس شخص نے لوگوں کو ناراض کر کے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیا؛ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جاتا ہے؛ اور لوگوں کو بھی اس سے راضی کر دیتے ہیں۔ اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی کیا تو اس کی تعریف کرنے والے بھی اس کی مذمت کرنے لگ جاتے ہیں'' ❶۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کو راضی رکھا اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کی تکلیفوں سے محفوظ کرے گا اور اس سے راضی ہو جائے گا۔ پھر لوگ بھی اس سے راضی ہو جائیں گے۔ آخر کار بہترین انجام تقویٰ کے لیے ہی ہوتا ہے؛ اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کریں گے تو لوگ بھی اس سے محبت کریں گے''۔ ❷

❷ موقوف کی سند صحیح ہے لیکن مرفوع کی سند ضعیف ہے۔ ترمذی (۲/ ۲۷).

جیسا کہ صحیحین میں ہے؛ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں؛ تو آواز دیتے ہیں: اے جبریل! میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ تو حضرت جبریل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرتے ہیں؛ پھر جبریل علیہ السلام آسمانوں میں منادی کرتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتے ہیں؛ پس تم بھی اس سے محبت کرو''۔ تو آسمانوں والے بھی اس سے محبت کرتے ہیں پھر زمین میں بھی اسے قبولیت حاصل ہو جاتی ہے''۔ [1]

یہی صورت حال بغض کی حالت میں بھی ہوتی ہے۔

یہ واضح ہو چکا کہ ہر مخلوق کے لیے ضروری ہے: یا تو وہ مخلوق سے ڈر کر رہے یا پھر خالق سے ڈرے۔ لیکن مخلوق سے ڈرنے کا نقصان کئی اعتبار سے اس کے نفع پر غالب ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا ڈر اختیار کرنے سے دنیا و آخرت کی سعادتیں حاصل ہوتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ہی اس کے اہل ہیں کہ ان سے ڈرا جائے اور اسی سے مغفرت طلب کی جائے۔ بیشک وہی ذات گناہوں کو معاف کرتی ہے۔ جبکہ مخلوق کسی دوسرے کے گناہ بخشنے اور اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ دینے کی قدرت نہیں رکھتی۔ پس اللہ تعالیٰ ہی پناہ دیتے ہیں؛ اس کے خلاف کسی کو پناہ حاصل نہیں۔ بعض سلف صالحین رحمہم اللہ کا فرمان ہے: ''متقی انسان کبھی محتاج نہیں ہوتا''[1]۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1] متفق علیه: البخاری ۳۲۰۹؛ مسلم ۲٦۳۷؛ من حدیث ابوهریرة . الضعیفه (۲۲۰۷) . تحت حدیث آخر عن أنس مخالف لهذا فی اللفظ .

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا o وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق: ۲،۳)

''اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے راہ پیدا کر دے گا اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے گمان بھی نہ ہو گا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے متقین کو ضمانت دی ہے کہ جب لوگ تنگی میں ہوں گے تو وہ ان کے لیے نجات کی راہیں پیدا کر دیگا۔ اور انہیں ایسی جگہ سے رزق عطا کریگا جہاں کا انہیں وہم و گمان بھی نہ ہو۔ پس اگر انسان کو یہ مقام حاصل نہیں ہوتا؛ تو یہ دلیل ہے کہ اس کے تقویٰ میں خلل ہے۔ پس اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے اس کی طرف توبہ کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ (الطلاق: ۳)

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے تو وہ اس کو کافی ہوتا ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ اس کو کافی ہو جاتے ہیں اس کو کسی غیر کا محتاج نہیں بناتے۔

اسباب مہیا کرنا توکل کے منافی نہیں:

کچھ لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ [اکتساب] وسائل اور اسباب مہیا کرنا توکل کے منافی ہے۔ اور جب امور مقدر ہیں تو اسباب کی ضرورت نہیں۔ یہ فاسد عقیدہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض وسائل فرض ہیں اور بعض مستحب اور بعض مباح ہیں جبکہ بعض مکروہ اور بعض حرام ہیں۔ ان کی تفصیل اپنی جگہ پر موجود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل [بڑھ کر] متوکل تھے۔ لیکن آپ میدان جنگ میں جب جاتے تو زرہ زیب تن فرماتے۔ ضروریات کے حصول کے لیے بازار جاتے۔ حتی کہ کفار نے آپ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان: ۷)

''یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔''

اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ وسائل کی فراہمی کو توکل کے منافی قرار دیتے ہیں؛ ان کی کثیر تعداد کی ضرورتیں لوگوں کے عطیات سے یا تو صدقہ خیرات سے پوری ہوتی ہیں ہدیہ وغیرہ سے۔ اور کبھی یہ مال ٹیکس وصولی کا ہوتا ہے؛ اور کبھی پولیس حکام کی طرف سے۔ یا اس قسم کے دیگر لوگ ہوتے ہیں؛ [جن کی حلال آمدنی کا اعتبار نہیں ہوتا]۔ یہ امور اپنی جگہ پر مفصل بیان ہو چکے ہیں؛ اس مختصر مقام پر اس کی تفصیل ممکن نہیں۔ اشارۃً بعض اقوال ذکر اس آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے:

﴿یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ۝﴾ (الرعد: ۳۹)

''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور ثابت رکھتے ہیں اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔''

البتہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ۝﴾ (الرحمٰن: ۲۹)

''وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔''

اس کی تفسیر میں امام بغوی رحمہ اللہ (۵۱۶ھ) فرماتے ہیں: امام مقاتل رحمہ اللہ (۱۵۰ھ) نے فرمایا ہے:

''یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی؛ جب انھوں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ ہفتہ کے روز کوئی کام نہیں کرتا''۔

مفسرین کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ زندہ کرتا اور موت دیتا ہے، رزق دیتا ہے ایک قوم کو عزت بخشتا ہے جبکہ دوسروں کو ذلیل کرتا ہے۔ بیماروں کو شفا دیتا ہے قیدیوں کو رہائی دیتا ہے۔ مصیبت زدہ لوگوں کے مصائب دور کرتا ہے دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہے مانگنے والوں کو عطا کرتا ہے گنہگاروں کے گناہ معاف کرتا ہے ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے افعال اس کی مشیئت کے لحاظ سے ہیں جو شمار نہیں کیے جا سکتے''۔

((وَمَا أَخْطَأَ الْعَبْدُ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَهُ وَمَا أَصَابَهُ لَمْ يَكُنْ لِّيُخْطِئَهُ .))

''جو مصیبت کسی انسان سے ٹل گئی وہ اس پر آنے والی نہ تھی؛ اور جو چیز اس کو حاصل ہو گئی وہ اس سے ٹلنے والی نہ تھی''۔

تشریح: ......جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ تقدیر ہر صورت میں ہو کر رہتی ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے

ما قضى الله كائن لا محالة — والشقی الجهول من لام حاله

''اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ لامحالہ ہو کر رہے گا اور بد بخت جاہل ہے جو اپنے حال پر ملامت کناں ہے۔''

ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے

اقنع بما ترزق یا ذا الفتى — فليس ينسى ربنا نمله

ان اقبل الدهر فقم قائما — وإن تولى مدبرا نم له

''اے نوجوان! جو رزق تجھے دیا جا رہا ہے اس پر قناعت اختیار کر ہمارا رب چیونٹی کو بھی بھولنے والا نہیں، اگر زمانہ تجھے صاحب اقبال کر دے تو تجھے اس کے لیے اپنے آپ کو کھڑا کرنا چاہیے اور اگر زمانہ پیٹھ پھیر جائے تو بیٹھ جائیے۔ اس لیے کہ سب کچھ تقدیر کے ساتھ ہے۔''

کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ کا سابق علم

48۔((وَعَلَى الْعَبْدِ أَنْ يَّعْلَمَ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ سَبَقَ عِلْمُهُ فِي كُلِّ كَائِنٍ مِنْ خَلْقِهِ ، فَقَدَّرَ ذٰلِكَ تَقْدِيراً مُحْكَماً مُبْرَماً ، لَيْسَ فِيهِ نَاقِضٌ ، وَلاَ مُعَقِّبٌ وَلاَ مُزِيْلٌ وَلاَ مُغَيِّرٌ وَلاَ نَاقِصٌ وَلاَ زَائِدٌ مِنْ خَلْقِهِ فِي سَمَاوَاتِهِ وَأَرْضِهِ .))

''انسان پر لازم ہے کہ وہ یقینی طور پر جان لے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کے بارے میں اس کا علم پہلے سے موجود ہے؛ پس اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر کو نہایت محکم اور مضبوط انداز میں مقدر کر دیا ہے۔اس میں کوئی تناقض نہیں۔اور نہ ہی کوئی اس کو ٹال سکتا ہے؛ نہ ہی ختم کر سکتا ہے نہ ہی بدل سکتا ہی؛ نہ ہی پھیر سکتا ہے؛اس کے آسمان اوراس کی زمین میں ؛اس کی مخلوقات میں نہ کوئی کمی ہو سکتی ہے نہ ہی زیادتی''۔



تَشْرِیح:......جیسے پہلے بیان ہو چکا کہ کائنات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا علم ازلی ہے اور کائنات کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر لکھ دی ہے۔جیسا کہ رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

((قَدَّرَ اللّٰهُ تعالىٰ مَقَادِيرَ الْخَلْقِ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضَ بِخَمسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ، وَعَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ .))

''اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوق کی تقدیر مقدر کر دی تھی اوراس کا عرش پانی پر تھا''۔[1]

[1] حدیث صحیح ہے۔مسلم۲۶۵۳؛احمد (۲/ ۱٦۹) .

پس معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ چیزیں اپنے اپنے وقت پر ایسے ہی وجود میں آئیں گی؛ جیسے اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا تقاضا ہوگا۔پس اس کے علم کے مطابق تمام چیزیں وجود میں آئی ہیں۔بے شک تمام مخلوقات کے وجود میں آنے میں جو عجائبات موجود ہیں؛ان کے ایجاد کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا؛مگر اسی صورت میں کہ ان کی ایجاد سے پہلے موجِد کو ان کا علم ہو۔[یعنی اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق ہی چیزیں وجود میں آئی ہیں]۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيْرُo﴾ (الملك : ١٤)

''بھلا جس نے پیدا کیا وہ تو پوشیدہ باتوں کا جاننے والا اور (ہر چیز سے) آگاہ ہے۔''

لیکن غالی معتزلہ اللہ تعالیٰ کے ازلی علم کا انکار کرتے ہیں۔ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کو نہیں جانتا ہے،حتی کہ بندے کوئی کام کر لیتے ہیں[تو پھر اللہ تعالیٰ کو علم ہوتا ہے]۔تعالیٰ الله عن ذلك علواً كبيراً ۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا فرمان:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قدریہ کا مقابلہ علم سے کرو اگر وہ اقرار کریں تو مغلوب ہو گئے اگر انکار کریں تو کافر ہو گئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ فلاں شخص استطاعت رکھتا ہے؛ اور وہ وہ کام کرتا ہے جس کی استطاعت رکھتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کو ثواب دیتا ہے۔ اور فلاں استطاعت تو رکھتا ہے؛ مگر وہ استطاعت بھر عمل نہیں کر رہا؛ تو اس کو عذاب دے گا۔ پس وہ عذاب اسی لیے دے گا کہ اس نے قدرت ہوتے ہوئے بھی عمل نہیں کیا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کو پہلے سے ہی اس کا علم تھا۔ ہاں اگر کسی میں استطاعت نہیں تو نہ اللہ تعالیٰ اس کو حکم دیتا ہے نہ ہی استطاعت سے باہر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اس کو عذاب دے گا۔

[اعتراض]: اگر کہا جائے: اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے علم کو تبدیل کرنے پر قادر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا علم تو یہ ہے کہ بندہ یہ فعل نہیں کرے گا؛ لیکن جب بندے کو فعل پر قدرت حاصل ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کے علم تبدیل کرنے پر بھی قدرت ہے۔

[جواب]: ہم کہتے ہیں: یہ تو ایک مغالطہ ہے۔ کسی فعل پر صرف قدرت کا حاصل ہونا علم کی تبدیلی کو مستلزم نہیں۔ اور جو شخص فعل کے وقوع پر علم کی تبدیلی کا خیال کرتا ہے؛ وہ یہ خیال تب کرتا ہے جب فعل وقوع پذیر ہو جائے۔ اگر فعل واقع ہو جائے تو اس کے واقع ہونے کا علم ہوتا ہے نہ کہ عدم وقوع کا۔ پس یہ ممتنع ہے کہ کوئی ایسا فعل واقع ہو جائے جس کے واقع نہ ہونے کا علم اللہ تعالیٰ کو پہلے سے ہے۔ بلکہ فعل اگر وقوع پذیر ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ کا علم بھی یہی تھا کہ وہ وقوع پذیر ہوگا۔ اور اگر وقوع پذیر نہیں ہوا تو بھی اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ وہ وقوع پذیر نہیں ہوگا۔ پس کسی ایسی چیز کا وقوع ممتنع ہے جو [اللہ تعالیٰ کے] علم کی تبدیلی کو مستلزم ہو۔ بلکہ جو چیز بھی وقوع پذیر ہوگی وہ معلوم ہوگی۔ اور وہ بندہ جو کوئی فعل نہیں کرتا؛ تو وہ کوئی ایسی چیز نہیں کرتا جو علم کو تبدیل کر دے۔ بلکہ وہ ایسے فعل پر قادر ہے جو وقوع پذیر نہیں ہوا۔ اگر وقوع پذیر ہو گیا ہے تو بھی اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ وقوع پذیر ہوگا نہ یہ کہ وقوع پذیر نہیں ہوگا۔

[اعتراض]: اگر کہا جائے: فعل کے عدم وقوع پر تو اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ وہ فعل وقوع پذیر نہیں ہوگا۔ پس اگر بندے کو اس کے وقوع پر قدرت حاصل ہو گئی؛ تو علم کی تبدیلی پر بھی قدرت حاصل ہو گی؟۔

[جواب]: بات یوں نہیں ہے بلکہ بندہ فعل کے واقع کرنے پر قادر تو ہے لیکن اس نے فعل کو واقع نہیں کیا۔ اگر وہ فعل کو واقع کرے تو جو چیز معلوم ہے وہ فعل کا وقوع ہے۔ پس انسان کا مقدور جب واقع ہو جائے تو اس کا صرف واقع ہونا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور انھوں نے فعل کا وقوع فرض کیا ہے؛ حالانکہ اس کے عدم وقوع کا علم تھا۔ یہ ایک محال چیز کا فرض کر لینا ہے؛ اس کی صورت بالکل اس طرح ہے کہ کوئی شخص کہتا ہے میں اس فعل کے عدم وقوع کے باوجود اس کا وقوع فرض کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت جمیع بین النقیضین کی ہے۔

[اعتراض]: اگر کہا جائے: جب کسی فعل کا وقوع اللہ تعالیٰ کے اس کے عدم وقوع کے علم کے باوجود محال ہے؛ تو وہ مقدور نہ ٹھہرا؟۔

[جواب]: لفظ محال مجمل ہے۔ یہ محال اس لیے نہیں کہ نہ تو اس کی استطاعت ہے نہ اس سے عاجز ہے؛ اور نہ ہی فی نفسہ وہ ممتنع ہے۔ بلکہ وہ ممکن اور مقدور ہے؛ اور استطاعت بھی موجود ہے لیکن جب فعل وقوع پذیر ہوا تو اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ وقوع پذیر ہوگا۔ اور جب وقوع پذیر نہیں ہوا تو اللہ تعالیٰ کو اس کے عدم وقوع کا علم تھا۔ جب فعل کے وقوع کو فرض کیا جائے؛ حالانکہ وقوع فعل کا لازم

منتفی ہے؛ تو فعل کا وقوع محال ہوگا اس لیے کہ ملزوم کا اثبات لازم کے بغیر محال ہے۔ اور جو چیزیں بھی اس طرح ہوں گی؛ وہ اس اعتبار سے محال ہوں گی۔ اس سے ان پر لازم آتا ہے کہ کوئی بھی کسی بھی چیز پر قادر نہ رہے؛ نہ ہی اللہ تعالیٰ؛ اور نہ ہی مخلوق۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ جب علم رکھتا ہے کہ وہ فلاں کام کرے گا تو اس کے علم سے اس کے ترک پر اس کی قدرت کا نہ ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی طرح جب وہ اپنے متعلق علم رکھتا ہے کہ وہ فلاں کام نہیں کرے گا؛ تو اس سے اس کے فعل پر اس کی قدرت کی نفی لازم نہیں آتی''۔ [مجموع الفتاوی ۱۴/۱۰۳]۔ اسی طرح بندوں کے افعال کا معاملہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے مقدر فرما دیا ہے۔ واللہ اعلم

[ایمان کی بنیاد اور معرفت کا اصول: اللہ تعالیٰ کی توحید اور ربوبیت کا اعتراف:]

[توحید اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتے جب تو اس کی صفات پر ایمان نہ رکھا جائے۔]

امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان:

وَذٰلِكَ مِنْ عَقْدِ الْإِيْمَانِ وَأُصُولِ الْمَعْرِفَةِ وَالِاعْتِرَافِ بِتَوحِيدِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَرَبُوبِيَّتِهِ كَمَا قَالَ تَعَالٰى فِي كِتَابِهِ:﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيْرًا﴾ (الفرقان: ۲) وَقَالَ تَعَالٰى: ﴿وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا﴾ (الاحزاب: ۳۸)۔))

''انسان پر لازم ہے کہ وہ جان لے اعتقاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کے بارے میں اس کا علم پہلے سے موجود ہے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر کو نہایت محکم اور مضبوط انداز میں مقدر کر دیا ہے۔ اس میں کوئی تناقض نہیں۔ اور نہ ہی کوئی اس کو ٹال سکتا ہے؛ نہ ہی ختم کر سکتا ہے نہ ہی بدل سکتا ہی؛ نہ ہی پھیر سکتا ہے؛ اس کے آسمان اور اس کی زمین؛ اس کی مخلوقات میں نہ کوئی کمی ہو سکتی ہے نہ ہی زیادتی''۔ مذکورہ چیزیں (ایمان کے عقائد اور معرفت کے اصول نیز اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ربوبیت کا اعتراف کہلاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا﴾ (الفرقان: ۲)

''وہ ہر چیز کا خالق ہے اور اس نے ان کی تقدیر بنائی ہے۔''

﴿وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَنِ﴾ (الاحزاب: ۳۸)

''اور اللہ تعالیٰ کا حکم تقدیر میں مقدر ہے۔''

تشریح: یہ اشارہ ایمان بالقدر اور تخلیق کائنات کے متعلق اللہ تعالیٰ کے سابق [یعنی پہلے سے] علم کی طرف ہے۔

ایمان کے متعلق پوچھنے والے کا جواب دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر؛ اور آخرت کے دن پر ہو، نیز یہ کہ تم ایمان لاؤ تقدیر پر؛ اس کی طرف سے بھلائی اور برائی پر''۔

اس حدیث کے آخر میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمر! تجھے معلوم ہے سائل کون تھا؟

انہوں نے عرض کی: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ جانتے ہیں''۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جبریل علیہ السلام تھے تمھارے پاس تمھیں دین کی تعلیم دینے آئے تھے''۔ ❶

❶ صحیح مسلم۸، حدیث عمر۔ بخاری ۵۰، مسلم حدیث ابی ہریرۃ.

امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: ''اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ربوبیت کا اعتراف''یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ربوبیت کا اعتراف اس کی صفات پر ایمان لائے بغیر پورے نہیں ہوسکتے۔ پس جس شخص نے خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے؛ تو اس نے شرک کیا۔ تو پھر اس کا کیا حال ہوگا جو خیال کرتا ہے کہ ہر شخص خود اپنے فعل کا خالق ہے؟۔ اسی لیے قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں۔ ان کے متعلق احادیث سنن کی کتابوں میں موجود ہیں۔

[قدریہ کی مذمت میں وارد احادیث مبارکہ]

امام ابوداود رحمہ اللہ [ح:۴۶۹۱] نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں اگر وہ بیمار ہوجائیں تو ان کی بیمار پرسی نہ کرو؛ اگر فوت ہوجائیں تو ان کے جنازہ پر نہ جاؤ''۔ ❶

نیز امام ابوداود رحمہ اللہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ہر امت میں مجوسی ہوتے ہیں؛ اور اس امت کے مجوسی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: ''تقدیر کوئی چیز نہیں ہے''۔ جو شخص ان میں سے فوت ہوجائے تم ان کے جنازہ پر نہ جاؤ اور ان میں سے جو بیمار ہوجائے اس کی بیمار پرسی نہ کرو، یہ لوگ دجال کے ساتھی ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے کہ وہ ان کو دجال کے ساتھ ملائے گا''۔ ❷

نیز امام ابوداود رحمہ اللہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''نہ قدریہ کے پاس بیٹھو اور نہ ان سے سلام میں پہل کرو[گفتگو میں ابتداء نہ کرو]''۔ ❸

نیز امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آدم کی اولاد سے دو قسم کے لوگوں کا اسلام میں کچھ حصہ نہیں؛: مرجئہ اور قدریہ''۔ ❹

لیکن قدریہ کے بارے میں مروی تمام مرفوع احادیث ضعیف ہیں؛ ان میں سے موقوف احادیث صحیح ہیں۔ ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بھی ہے۔

❶ ابوداود، حدیث ضعیف ہے البتہ طرق کثیرہ کے ساتھ مروی ہے جس سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی تخریج میں نے الظلال الجنۃ فی تخریج السنۃ میں کی ہے۔ رقم (۳۲۸۔۳۴۲).

❷ ابوداود(۴۶۹۲) حدیث ضعیف ہے۔ الظلال الجنۃ (۳۲۹).

❸ ابوداود(۴۷۱۰)، حدیث ضعیف ہے۔ المشکاۃ (۱۰۸)، الظلال (۳۳۰).

❹ ترمذی ۲۲۵۳؛ یہ حدیث ضعیف ہے۔ تخریج السنۃ (۳۴۴، ۳۴۵).

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان:

''تقدیر توحید کا ایک نظام ہے؛ جس نے اللہ تعالیٰ کی توحید کو مانا؛ اور تقدیر کا انکار کیا؛ تو اس کے اس انکار نے اس کی توحید کو ختم کر دیا''۔ ❶

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان بالقدر، اللہ تعالیٰ کے قدیم علم پر ایمان کو متضمن ہے۔ اور اس نے اپنے علم میں سے جو کچھ ظاہر کیا ہے؛ اس کا احاطہ نہیں ہوسکتا۔ اور مخلوق کی تقدیر کا لکھا جانا[جس علم کو ظاہر نہیں کیا]۔ یقیناً اس مقام پر بہت سارے مشرک، صابی، فلاسفہ اور دیگر وہ لوگ گمراہی کا شکار ہوگئے جو جزئیات میں؛ اور اس طرح کی دیگر چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے علم کے منکر ہیں۔ بے شک ان کا یہ انکار تکذیب بالقدر میں داخل ہے۔ قدریہ اجمالی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادر ہونے کو بالکل جھٹلاتے ہیں۔ اس طرح سے کہ وہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق نہیں۔ پس وہ بندوں کے افعال کو اس کی قدرت اور خلق سے خارج قرار دیتے ہیں۔

تقدیر کہ جس پر کتاب اللہ؛ سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع کی روشنی میں کوئی شک نہیں؛ اور بے شک اس کے منکرین قدریہ محضہ [تقدیر کے منکر] بلا اختلاف اس تقدیر کا انکار کرتے ہیں؛ یہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے مقدر کر دی ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور ائمہ رحمہم اللہ کے کلام میں کثرت کے ساتھ جو قدریہ کی مذمت پائی جاتی ہے؛ اس سے مراد یہی لوگ ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما؛ آپ سے پوچھا گیا کہ: ''قدریہ کہتے ہیں تقدیر کوئی چیز نہیں تمام امور مستقبل کے ساتھ وابستہ ہیں''۔ تو انھوں نے فرمایا: ''انھیں میری طرف سے بتادو کہ: ''بے شک میں ان سے بری ہوں اور وہ مجھ سے بری ہیں''۔

☼ ضعیف: شرح السنة (١/ ١٤٢/ ١)، الضعیفه (٤٠٧٢). مسند أحمد ٥٨٥٠ ؛ مسلم ٨(٢٨٣)۔

تقدیر کے عظیم اصول:

قدر تقدیر کے مطابق علم کو کہا جاتا ہے؛ یہ چند اہم اور عظیم اصولوں کو متضمن ہے:

پہلا اصول: بیشک اللہ تعالیٰ کو مقدر شدہ امور کا علم ان کے ہونے سے پہلے ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ کا قدیمی علم ثابت ہوتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کا بھی رد ہے جو اللہ تعالیٰ کے علمِ قدیم کا انکار کرتے ہیں۔

دوسرا اصول: بے شک تقدیر مخلوقات کی مقادیر کو شامل ہے۔ مقادیر سے مراد مخلوقات کی متعین صفات ہیں جو انہی کے ساتھ خاص ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر بنائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا﴾ (الفرقان : ٢)

''اور ہر چیز کو پیدا کیا؛ اور اس نے ان کی تقدیر مقرر کی۔''

پس تخلیق تقدیر کو شامل ہے۔ کسی چیز کی فی نفسہٖ تقدیر؛ اس طرح کہ: اس کی تقدیر کو بنایا اور اس کے وجود سے پہلے اس کا مقدر طے کیا ہے۔ پس جب اس نے ہر مخلوق کے لیے اس کی تقدیر لکھ دی ہے؛ جو اس کی کمیت اور کیفیت میں اسی کے ساتھ خاص ہے؛ تو یہ تقدیر امور جزئیہ معینہ کا علم ہونے میں زیادہ بلیغ ہے۔ برخلاف اس کے جو اس کا منکر ہے؛ اور اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کلیات کا علم ہے: جزئیات کا نہیں۔ پس تقدیر، علم قدیم اور علم بالجزئیات کو شامل ہے۔

تیسرا اصول: تقدیر پر ایمان اس بات کو بھی شامل ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے وجود سے پہلے ان کے بارے میں تفصیلی خبریں دی ہیں؛ اور اسے ظاہر کیا ہے۔ تو یہ چیز اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان امور کے بارے میں ان کے وجود سے قبل ہی مفصل اطلاع دیدے۔ پس یہ طریقہ [استدلال] اس بات کی طرف متنبہ کرتا ہے کہ خالق کو بطریق اولیٰ ان کا تفصیلی علم حاصل

ہوگا؛ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ان کا مفصل علم عطا کر دیا ہے تو اسے ان چیزوں کا علم کیسے نہیں ہوسکتا؟۔

چوتھا اصول: یہ ایمان اس حقیقت کو بھی شامل ہے اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتے ہیں؛ اس میں مختار ہیں؛ وہ اپنی مشیئت اور ارادہ سے فاعل [خالق] ہیں؛ یہ [تخلیق اور فعل] اس کی ذات کے لوازم میں سے نہیں۔

پانچواں اصول: بیشک یہ اس حدوث [تخلیق] کے مقدور ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور بیشک ان کو عدم سے وجود ملا ہے۔ سو بلا شک وہ شبہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اس کی تقدیر بنائی اور پھر اسے پیدا فرمایا۔

دل کی زندگی:

[دل کی زندگی؛ اور اس کی بیماری اور شفا]۔

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس انسان کے لیے ہلاکت ہے جس نے تقدیر کے بارے میں قلب سلیم ضائع کر دیا۔ -اور ایک نسخہ میں ہے-: اس انسان کی لیے ہلاکت ہے جس کا دل تقدیر کے بارے میں بیمار پڑ گیا۔ اور وہ اپنے وہم کی بنا پر غیب کی انتہائی مخفی چیزوں کی تلاش میں لگ گیا؛ اور [نتیجہ میں] جو باتیں اس نے کیں ان کی وجہ سے ان میں وہ جھوٹا گناہگار رہے''۔

تشریح: جان لیجیے کہ دل کی زندگی اور موت بھی ہے؛ اور بیماری، تندرستی بھی؛ جو کہ بدن [کے لیے ان عوارضات سے] بہت بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾ (الانعام: ۱۲۲)

''بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لیے روشنی کر دی جس سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے؛ وہ اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اندھیرے میں پڑا ہوا ہو اور اس سے نکل ہی نہ سکے۔''

یعنی وہ شخص کفر کی وجہ سے مردہ تھا؛ ہم نے اس کو ایمان کے ساتھ زندگی عطا کی۔ پس تندرست اور زندہ دل وہ ہے جس پر جب باطل اور قبیح چیزیں پیش کی جائیں؛ تو وہ اپنی طبیعت کی بنا پر ان سے نفرت اور ناپسندیدگی کا اظہار کرے؛ اور ان کی جانب دھیان نہ کرے۔ برخلاف مردہ دل کے؛ بیشک مردہ دل اچھائی اور برائی میں فرق نہیں کرتا۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

''وہ شخص ہلاک ہوا جس کا دل ایسا نہ ہو جو معروف اور منکر کی معرفت حاصل کر سکے''۔

الطبرانی فی الکبیر ۸۵٦٤ ؛ مجمع الزوائد ۷/ ۲۷۵ ؛ اس کی سند کے راوی صحیح إسناد کے راوی هیں۔

ایسا ہی حال مرضِ شہوت میں مبتلا دل کا ہے؛ وہ بیشک یہ دل اپنی کمزوری کی وجہ سے ان [برائیوں] کی طرف میلان رکھتا ہے جو اس پر پیش ہوئی۔ اور یہ میلان اس بیماری کی قوت اور کمزوری کے حساب سے ہوتا ہے''۔ [إغاثة اللفهان ۱/ ۳۱]

دل کی بیماری کی دو اقسام ہیں؛ جیسا کہ گزر چکا:

شہوت کی بیماری شبہ کی بیماری۔

[شبہ کی بیماری]:

❀ ان میں سب سے بری شبہ کی بیماری ہے۔ اوراس میں سب سے برا شبہ تقدیر کے بارے میں ہوتا ہے۔ کبھی دل بیمار پڑتا ہے؛ اور اس کا مرض بڑھتا جاتا ہے؛ مگراس انسان کواس کا شعور[احساس] نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ دل کی صحت اوراس کے اسباب کی جانب متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی تو دل پر موت طاری ہو جاتی ہے؛ مگراس انسان کواس کی موت کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ برائیوں کے زخم اسے تکلیف نہیں دیتے؛ اور نہ ہی حق بات سے جہالت اوراپنے باطل عقائد پر اسے کچھ صدمہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب دل میں زندگی موجود ہوتو برائیوں کے سامنے آنے پر اسے تکلیف ہوتی ہے۔ اور جس قدر دل میں زندگی ہوگی؛ حق سے لاعلمی پراسی قدر اسے صدمہ ہوتا ہے۔: شاعر کہتا ہے:

''مرے ہوئے انسان کوزخم لگنے سے کیا تکلیف ہوگی''۔[من كلام أحمد بن حسين المتنبى ۳۰۳ھ - ۳۵۴ھ]

❀ کبھی دل بیماری کومعلوم کر لیتا ہے لیکن دوا کی کڑواہٹ اوراس پر صبر کرنا اس پر گراں گزرتا ہے۔ تو وہ بیماری کی تکلیف کو دوا پر ترجیح دیتا ہے۔ بیشک اس کی دواء خواہشات کی مخالفت میں ہے۔ اور یہ مخالفت اس کے نفس پر بڑی دشوار ہے۔ حالانکہ اس کے لیے اس سے زیادہ نفع بخش کوئی چیز نہیں۔

❀ اور کبھی وہ اپنے نفس کوصبر پر آمادہ کرتا ہے لیکن اس کا عزم ٹوٹ جاتا ہے؛ اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ اس کی وجہ علم، بصیرت اورصبر میں کمزوری ہے۔ جس طرح کوئی ایسی خوفناک راہ پر چلتا ہے؛ جوانتہائی پرامن منزل تک پہنچاتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اس پر صبر کرے گا؛ تو خوف ختم ہوکر رہے گا اوراس کے بعد امن میسر ہوگا۔ پس اس انسان کوصبر کی قوت اوراس کے انجام کے لیے قوت یقین کی ضرورت ہے۔ جب بھی اس کے صبر اور یقین میں کمزوری آ گئی تو وہ واپس پلٹ جائے گا؛ اوراس کی مشقت کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ خصوصاً جب ساتھی بھی نہ ہوں؛ تو اسے تنہائی سے وحشت ہوگی۔ اور یہ کہنا شروع کر دے گا: لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟ وہ میرے لیے نمونہ ہیں۔ اکثر لوگوں کا یہی حال ہے۔ اوراسی چیز انہیں ہلاک کر دیا ہے۔ پس سچا صاحب بصیرت انسان رفقاء کی قلت یاان کے نہ ہونے سے گھبراتا نہیں؛ جب اس کا دل سلف صالحین کی محبت کی مرافقت کے شعور سے سرشار ہو۔ جن کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء: ٦٩)

'' جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا؛ جوانبیاء اور صدیق اور شہید اور صالحین میں سے ہیں؛ اوران کی رفاقت بہت ہی خوب ہے۔''

ابو محمد ابو شامہ کا قول: ابومحمد عبدالرحمٰن بن اسماعیل المعروف ابوشامہ[۵۹۹ھ-۶۶۵ھ] نے اپنی کتاب ''الحوادث و البدع ''میں کتنی ہی اچھی بات کہی ہے؛ فرماتے ہیں:

''جہاں بھی جماعت کے ساتھ وابستگی کا حکم آیا ہے؛ اس سے مراد حق کے ساتھ وابستگی اوراس کی اتباع ہے۔ اگرچہ حق کے ساتھ وابستگی اختیار کرنے والے بہت کم ہی کیوں نہیں؛ اور مخالفت کرنے والے زیادہ ہوں۔ اس لیے کہ حق وہی ہے جس پر پہلی جماعت عہد نبوی اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے لوگ تھے؛ اگران کے بعد باطل پرست لوگ کثرت میں ہیں تو ہم ان کی

جانب نہیں دیکھیں گے''۔['الحوادث و البدع ؛ ص ۲۲']

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول: فرماتے ہیں:

''اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں! سنت غالی اور جفا کار کے مابین ہے۔تم پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے! تم اسی راہ پر صبر کرو۔ بیشک گزشتہ زمانہ میں بھی اہل سنت کی تعداد سب سے کم رہی ہے۔اور آئندہ بھی وہ لوگوں میں سب سے کم ہوں گے۔وہ نہ تو غالیوں کے ساتھ ان کے غلو میں گئے ؛ اور نہ ہی بدعات میں اہل بدعت کے ساتھ چلے۔ وہ سنت پر صابر قدم رہے ؛حتیکہ وہ اپنے رب سے جا ملے۔ پس تم بھی ان ہی کی طرح ہو جاؤ''۔[سنن الدارمی ۲۱۶]

[بیمار دل کی علامت:]

بیمار دل کي علامت :ایسی غذاؤں سے نفرت کرنا ہے، جو اس کے لیے مفید اور موافق ہوں۔اور ایسی غذاؤں کی طرف میلان کرنا جو اس کے لیے نقصان دہ ہوں۔اور نفع بخش ادویات کو چھوڑ کر نقصان دہ کی طرف جانا ہے۔

❀ پس یہاں پر چار چیزیں ہیں؛ مفید غذا؛ شفا دینے والی دوا؛ اور نقصان دہ غذا اور مہلک دوا۔پس صحت مند دل نفع بخش شفاء دینے والی چیز کو نقصان دہ اور ضرر رساں چیز پر ترجیح دیتا ہے۔جبکہ بیمار دل اس کا الٹ ہوتا ہے۔تمام غذاؤں میں نفع بخش غذا ایمان ہے اور تمام دواؤں سے زیادہ مفید دوا قرآن ہے۔ان میں سے ہر ایک غذا بھی ہے اور دوا بھی۔ پس جو شخص کتاب و سنت سے ہٹ کر شفا طلب کرتا ہے وہ جاہلوں میں سے بڑا جاہل اور گمراہوں میں سے بہت بڑا گمراہ ہے''۔[إغاثة اللفهان ۱/ ۳۱]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ﴾ (حم السجدة: ٤٤)

''فرما دیں: جو ایمان لائے ان کے لیے یہ ہدایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں گرانی ہے؛ اور اسی پر اندھا پڑا ہے۔یہی لوگ ہیں جن کو دور کی جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَ لَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾(الاسراء: ۸۲)

''اور ہم قرآن (کے ذریعہ) سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالموں کے حق میں تو اس سے نقصان ہی بڑھتا ہے۔''

من القرآن میں لفظ ''من'' بیان جنس کے لیے ہے۔تبعیض کے لیے نہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس: ۵۷)

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت اور سینوں کی شفاء اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آ پہنچی

ہے۔''

پس قرآن کریم ہر قسم کی قلبی اور بدنی ؛اور دنیا و آخرت کی بیماریوں کی کامل شفا ہے۔ ہر ایک اس سے شفاء حاصل کرنے کا اہل نہیں ۔جب مریض اس سے اچھی طرح علاج کرنا جانتا ہو؛ اور پورے صدق و ایمان ؛مکمل قبولیت اور پختہ اعتقاد کے ساتھ اس کی شرائط کو پورا کرتے ہوئے اسے مرض پر رکھتا ہے؛ تو کوئی بھی بیماری اس [دواء] کا مقابلہ کبھی بھی نہیں کر سکتی۔ بھلا کوئی بیماری آسمانوں اور زمین کے رب کے کلام کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے؟۔ وہ کلام جو اگر پہاڑوں پر نازل ہوتا تو ان کو ریزہ ریزہ کر دیتا؛ اگر زمین پر نازل ہوتا تو اس کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا۔ پس قلوب اور ابدان کا کوئی مرض ایسا نہیں جس سے دوائی کی راہنمائی اور اس کے اسباب اور اس سے بچاؤ کا طریقہ قرآن پاک میں موجود نہ ہو۔لیکن یہ اسے ہی مل سکتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی سمجھ دی ہو''۔(زاد المعاد ۴/۳۵۲)

امام طحاوی رحمہ اللہ **کا قول** :......''یقیناً اس نے اپنے وہم سے انتہائی مخفی غیب کو تلاش کرنے کی کوشش کی''۔یعنی جس نے اپنے وہم کے ساتھ غیب کے اسرار سے پردہ کشائی کی کوشش کی؛ اس لیے کہ تقدیر مخلوق میں اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے۔تو تقدیر پر بحث کرنے والا غیب پر مطلع ہونے کی کوشش کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًاo اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (جن: ۲۶، ۲۷)

''غیب جاننے والا؛ پس کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں پیغمبروں میں سے جس کو پسند فرمائے۔''

پس اس بنیاد پر وہ جو کچھ تقدیر کے بارے میں کہتا ہے: اس میں وہ جھوٹا اور گنہگار رہتا ہے۔

[عرش اور کرسی پر ایمان]

۴۹۔((وَالْعَرْشُ وَالْكُرْسِيُّ حَقٌّ①۔))

''عرش اور کرسی برحق ہیں''۔

①۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جان لیجیے کہ عرش اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مخلوق ہے؛ جیسا کہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے دلائل سے واضح ہوتا ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے؛ ارشاد فرمایا:﴿ذو العرش﴾ ۔''وہ عرش والا ہے''۔شرح ابن ابی العز رحمہ اللہ میں دیگر بھی بہت ساری آیات ذکر کی گئی ہیں۔عربی لغت میں عرش شاہی تخت کو کہتے ہیں۔اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے عرش کا یہ وصف بیان ہوا ہے:

﴿وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ﴾ (الحاقة: ۱۷) ''اور اس روز تیرے رب کے عرش کو آٹھ فرشتوں نے اٹھا رکھا ہوگا۔''

اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر ہے۔اور احادیث مبارکہ میں وارد ہوا ہے کہ: حاملین عرش میں سے ایک فرشتہ ہے جس کے کان کی لو اور گردن کے مابین پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔اور اس عرش کے پائے بھی ہیں؛ اور یہ عرش جنت الفردوس کی چھت ہے۔اس کے بیان میں صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں؛ جو کہ اس کتاب کی شرح میں مذکور ہیں۔جو ان لوگوں کی تأویلات کو باطل قرار دیتی ہیں کہ عرش سے مراد اس کا ملک اور بادشاہی کی وسعت ہے۔

جبکہ کرسی کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ﴾(البقرة: ۲۵۵)''اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو وسیع ہے۔''

کرسی عرش کے سامنے ہے؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت میں ہے؛ فرمایا:''کرسی دونوں قدموں کی جگہ ہے؛ اور عرش کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں''۔اس اثر کی تحقیق و تخریج ''مختصر العلو للذهبی''میں ہو چکی ہے۔اللہ تعالیٰ اس کی طباعت میں آسانی پیدا کردے۔اس سلسلہ میں اس حدیث کے علاوہ کوئی روایت صحیح سند سے ثابت نہیں۔وہ حدیث یہ ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''اللہ تعالیٰ کی کرسی کے سامنے ساتوں آسمانوں کی مثال ایسے ہی جیسے ایک کڑا کسی صحرا میں پھینک دیا گیا ہو۔اور عرش کی فضیلت اس کرسی پر ایسے ہی ہے جیسے اس صحرا کی فضیلت اس کڑے پر ہے''۔اس سے ان لوگوں کی تأویلات بھی باطل ہو جاتی ہیں جو کہتے ہیں: کرسی سے مراد علم ہے۔تأویل والا اثر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔جیسا کہ ''الصحیحۃ (۱۰۳)''میں میں نے بیان کر دیا ہے۔جبکہ یہ حدیث صحیح سند کے ثابت ہے۔دیکھو: (شرح/طبع مکتب اسلامی (برقم ۱۰۹؛ ص ۱۷۳)۔

أقول: باقی امور کی طرح عرش الٰہی پر ایمان رکھنا بھی واجب ہے، جس کی مدح اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر کی ہے۔جیسا کہ آگے اس کے دلائل آرہے ہیں۔یہ کہ یہ عرش سات آسمانوں سے اوپر ہے؛ اور اس کے پائے ہیں؛ اور اسے فرشتوں نے اٹھایا ہوا ہے۔

تشریح: جیسا کہ عرش کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے؛ ارشاد فرمایا:

﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُo فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ (البروج: ۱۵)

''عرش کا مالک بڑی شان والا ہے؛ وہ کرنے والا ہے جو کچھ وہ چاہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ﴾ (غافر: ۱۵)

''بلند درجات والا عرش کا مالک ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰىo﴾ (طٰهٰ: ۵)

"رحمان عرش پر مستوی ہوا۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (الاعراف: ٥٤)

"پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔"

اس مضمون کی متعدد آیات قرآن پاک میں ہیں۔ ☆ قرآن کریم کی دوسری آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

☆ سورۂ اعراف: ٥٣، یونس: ٣، الرعد: ٢، الفرقان: ٥٩، الم السجدة: ٤، الحدید: ٤ .

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ﴾ (المومنون: ١١٦)

"اس کے سوا کوئی اللہ تعالیٰ نہیں وہ عرش کا مالک ہے عزت والا ہے۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ (النمل: ٢٦)

"اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ عظمت والے عرش کا مالک ہے۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ (غافر: ٧)

"جو عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے گرداگرد ہیں؛ وہ اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ﴾ (الحاقة: ١٧)

"اور تیرے رب کے عرش کو اس دن آٹھ فرشتوں نے اٹھا رکھا ہوگا۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ﴾ (الزمر: ٧٥)

"تو دیکھا ہے کہ عرش کے گرداگرد فرشتوں نے حلقے باندھ رکھے ہیں اور وہ اپنے رب کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔"

مصیبت زدہ کی دعا صحیح حدیث میں ان الفاظ کے ساتھ ہے:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۔)) [1]

"اللہ تعالیٰ عظمت والے اور بردبار کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اللہ تعالیٰ عرش عظیم کے رب کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اللہ تعالیٰ آسمانوں کے رب، زمین کے رب اور عرش کریم کے رب کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں"۔

[1] متفق علیہ: [بخاری (2346) مسلم (2730)] حدیث ابن عباس۔ الضعیفہ (٥٤٤٣) .اس تخریج ضعیفہ میں ان منکر اور زیادہ

الفاظ کی وجہ سے ہوئی ہے جو دوسری روایت میں طبرانی نے نقل کیے ہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث اوعال میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔فرمایا:

سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو آسمان، زمین میں کتنا فاصلہ ہے؟

ہم نے عرض کیا: ''اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول کو خوب علم ہے''۔

آپ نے فرمایا ''ان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے؛ اور ہر دو آسمان کے درمیان بھی پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اور ہر آسمان کی موٹائی کا حجم بھی پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی نچلی تہہ اور بالائی سطح کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ ہے۔ پھر اس کے اوپر عرش ہے۔ جس کی نچلی تہہ اور بالائی کی سطح کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا فاصلہ زمین وآسمان کے درمیان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اوپر ہیں۔ اس پر بنی آدم کے اعمال میں سے کوئی بھی چیز نہیں ہے''[1]۔

[1] سند ضعیف ہے۔ظلال الجنة (٥٧٧). رواه ابوداؤد٤٧٢٣؛ ٤٧٢٦، والترمذی ٣٥٥٤، و ابن ماجة ١٩٣.

امام ابوداؤد اور دیگر ائمہ نے ان ہی کی سند سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ''چرچراہٹ والی حدیث'' میں روایت کیا ہے۔ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کا عرش آسمانوں پر (انگلیوں کا قبا بنا کر فرمایا) اس طرح ہے۔''[1]

نیز بخاری میں ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو، بیشک یہ جنت کا سب سے اونچا مقام ہے؛ اور جنت کی سب سے بہترین جگہ ہے۔ اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا عرش ہے''[2]۔

(فَوْقَه) اور (فَوْقُه): (قُ) پیش کے ساتھ؛ پیش اس کے مبتداء ہونے کے لیے ہے [یعنی یہاں سے نئی بات شروع ہو رہی ہے] اور (قَ) زبر کے ساتھ اس کی ظرفیت کی وجہ سے ہے [یعنی اس کے اوپر چھت عرش کی ہے]۔

[1] ابوداؤد، ترمذی، حدیث ضعیف ہے۔الظلال (٥٧٥).

[2] صحیح: مسند احمد، الاحادیث الصحیحة (٩٢١)، الظلال (٥٧١).

عرش کے بارے میں متکلمین کی رائے اور لفظ عرش کی لغوی تحقیق:

متکلمین کی رائے یہ ہے کہ عرش بھی تمام جوانب سے گول فلک ہے۔ اور تمام عالم کو ہر طرف سے محیط ہے۔ بسا اوقات اس کو فلک اطلس اور فلک تاسع [نوواں آسمان] بھی کہتے ہیں۔ ان کی یہ رائے صحیح نہیں۔ بے شک شریعت میں ثابت ہے کہ عرش کے لیے پائے بھی ہیں، اس کو فرشتوں نے اٹھا رکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک لوگ بے ہوش ہو جائیں گے سب سے پہلے میں ہوش آؤں گا۔ تو میں اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا، انھوں نے عرش کے پائیوں میں سے ایک پائے کو پکڑا ہوگا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں کیا وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے یا کوہ طور کی بے ہوشی کا ان کو بدلہ دیا گیا''[1]۔

۞ متفق علیه ؛بخاری ، کتاب التوحید (٤/ ٤٧٤) مسلم کتاب الفضائل (٧/ ١٠١) مسند احمد (٢/ ٢٦٤).

لغت میں عرش شاہی تخت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ بلقیس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ﴾ (النمل : ٢٣)

''اور اس کا تخت عظیم ہے۔''

اس لحاظ سے عرش آسمان نہیں؛ اور اہل عرب بھی عرش سے آسمان مراد نہیں لیتے۔ قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس عرش ایک تخت ہے جو پایوں والا ہے فرشتوں نے اس کو اٹھا رکھا ہے وہ اس تمام عالم پر قبہ کی مانند ہے؛ اس لحاظ سے اسے مخلوقات کی چھت کہنا چاہیے۔ امیہ بن ابی الصلت کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مجدوا الله فهو للمجد اهل ربنا في السماء امسٰی کبیرا

بالبناء العالی الذی بهر الناس وسوّی فوق السماء سریرا

شرجعا لا يناله بصر العين تری حوله الملائك صورا

''تم اللہ تعالیٰ کی بزرگی بیان کرو، وہ بزرگی کا حق دار ہے ہمارا رب آسمان میں ہے بڑائی والا ہے، اونچی عمارت کے ساتھ اس نے لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا اور آسمانوں کے اوپر عرش بنایا جو بہت اونچا ہے اس تک نظر نہیں جا سکتی اس کے گرد فرشتوں کو دیکھنے والا گردن جھکا کر دیکھتا ہے۔''

صورا: یہاں پر أَصْوَرٍ؛ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ ہے جس کی گردن اوپر دیکھنے کی وجہ سے ٹیڑھی ہو گئی ہو۔

شرجع: کا مطلب ہے اونچا اور دور۔

سریر: [چارپائی] تخت؛ لغت میں عرش یعنی تخت کو کہتے ہیں۔

نیز حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے اشعار ملاحظہ فرمائیں انھوں نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے تعریضاً کہے تھے جب اس نے اس کو اپنی لونڈی کے ساتھ متہم کیا۔

شهدت بان وعد الله حق وان النار مثوی الکافرینا

وان العرش فوق الماء طاف وفوق العرش رب العالمینا

وتحمله ملائکة شداد ملائکة الإله مسومینا

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور دوزخ کفار کا ٹھکانہ ہے اور عرش پانی کے اوپر ہے اور عرش پر رب العالمین ہے اور عرش کو مضبوط فرشتوں نے اٹھایا ہوا ہے؛ وہ فرشتے جو ہمارے رب کی طرف سے علامتوں والے ہیں۔''

یہ اشعار ابن عبدالبر رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ محدثین رحمہم اللہ نے ذکر کئے ہیں۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے اجازت دی گئی کہ میں حاملین عرش فرشتوں میں سے ایک فرشتے کے بارے میں وضاحت کروں؛ بے شک اس کے کندھوں اور کان کی لوؤں کے درمیان سات سو سال کی مسافت ہے''۔ [1]

نیز ابن ابی حاتم میں یہ الفاظ ہیں: ''پرندے کی سات سو سال تک اڑنے کی مسافت ہے''۔

☼ حدیث صحیح ہے۔ابو داؤد ٤٧٢٧، الصحیحة (١٥١).

لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف کرتے ہیں اور عرش سے مراد بادشاہت لیتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا کیا جواب دیں گے:

﴿وَيَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّكَ فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَئِذٖ ثَمَٰنِيَةٞ﴾ (الحاقة: ١٧)

''اور اس روز تیرے رب کے عرش کو آٹھ فرشتوں نے اٹھا رکھا ہوگا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَّكَانَ عَرۡشُهُۥ عَلَى ٱلۡمَآءِ﴾ (هود: ٧)

''اور اس کا عرش پانی پر تھا۔''

اگر عرش سے مراد بادشاہت ہے تو کیا مذکورہ آیت کا معنی یوں ہوگا کہ اس دن اس کی بادشاہت کو آٹھ فرشتوں نے اٹھایا ہوگا؟ اور اس کی بادشاہت پانی پر تھی؟۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بادشاہت کے پائے کو پکڑا ہوگا؟۔ کیا کسی عقلمند سے ممکن ہے کہ وہ سلامتی عقل کے ساتھ ایسی بات کہے؟۔

جبکہ کرسی کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

﴿وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ﴾ (البقرة: ٢٥٥)

''اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو وسیع ہے۔''

بعض کہتے ہیں کرسی سے مراد عرش ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ دونوں الگ الگ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات سے یہی منقول ہے۔ ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ [۲۱۰-۲۹۷ھ] نے کتاب ''صفة العرش [ص ٦١]'' میں روایت کیا ہے؛ اور امام حاکم نے ''مستدرک [۲/۲۸۳]'' میں روایت کیا ہے؛ اور فرمایا ہے: ''یہ شیخین کی شرط پر ہے؛ مگر انہوں نے اس کو ذکر نہیں کیا''۔ [1]

[1] ۔کرسی کے بارے میں کچھ مفسرین میں اختلاف واقع ہوا ہے؛ صحیح بات وہی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے؛ اور جس پر اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ بے شک کرسی اللہ تعالیٰ کی بہت عظیم مخلوق ہے؛ اور وہ اللہ تعالیٰ کے قدموں کی جگہ ہے۔[السنه لعبدالله بن أحمد ١/ ٣٠١؛ وصححه ابن خزيمة في التوحيد ص ١٠٧؛ والحاكم ٢/ ٢٨٢؛ والضياء في المختارة ١٠/ ٣١١۔ یہ روایت ثوری نے عمار الدہنی سے روایت کی ہے؛ وہ مسلم البطین سے روایت کرتے ہیں؛ انہوں نے سعید بن جبر سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں؛ آپ نے فرمایا: ''کرسی سے مراد قدموں کی جگہ ہے اور عرش کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا''۔ اہل علم کا اس روایت کے صحیح ہونے پر اتفاق ہے۔ فتح الباری ۸/۱۹۹۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کرسی سے عرش بڑا ہے۔

نیز حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے:

﴿وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ﴾ (البقرة: ٢٥٥)

''اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو وسیع ہے۔''

آپ نے فرمایا: ''کرسی سے مراد قدموں کی جگہ ہے اور عرش کے تعین، تشخص کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے''۔ [1]

یہ حدیث مرفوعاً بھی روایت کی گئی ہے؛ مگر حق بات یہ ہے کہ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے: ''آسمان زمین کی کرسی کے دائرہ [پیٹ] میں ہیں؛ اور کرسی عرش کے آگے ہے۔''

ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کرسی، عرش کے مقابلہ میں لوہے کے ایک گول کڑے کی طرح ہے جو چٹیل میدان میں پڑا ہوا ہے''۔ ❷

یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اس کی کرسی سے مراد اس کا علم ہے۔ اور یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی منسوب کیا جاتا ہے۔ جبکہ ان سے محفوظ قول وہی مروی ہے جو ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے؛ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ اور جو کوئی اس کے علاوہ کوئی بات کہتا ہے؛ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں؛ وہ محض ظن ہے۔ اور یہ ظاہر لگتا ہے کہ یہ مذموم علم کلام کی تھیلی سے نکلی ہوئی بات ہے۔ جیسے عرش کے متعلق بھی ایسی باتیں کی گئی ہیں۔ صحیح بات یہ ہے جیسا کہ اکثر علمائے سلف رحمہم اللہ کا قول ہے کرسی عرش کے سامنے سیڑھی کی طرح ہے۔

❶ ابن ابی شیبہ، کتاب صفة العرش۔ مستدرك حاكم، حديث صحيح موقوف هے۔ الظلال (۱۰۲/ ۳٦).
❷ صحيح هے۔ الضعيفه (۱۰۹).

[عرش سے اللہ تعالیٰ کی بے نیازی]

[اللہ تعالیٰ سے بے نیاز ہیں؛ اور وہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے اور اس سے اوپر ہیں:]

۵۰۔((وَهُوَ مُسْتَغْنٍ عَنِ الْعَرْشِ وَمَا دُوْنَهٗ.

۵۱۔ مُحِيطٌ بِكُلِّ شَيْءٍ وَفَوْقَهٗ① وَقَدْ عَجَزَ عَنِ الإِحَاطَةِ خَلْقُهٗ.))

''وہ عرش اور اس کے علاوہ ہر چیز سے بے پرواہ ہے''۔

''وہ ہر چیز کو محیط اور اس کے اوپر ہے اور مخلوق اس کا احاطہ کرنے سے عاجز ہے''۔

①۔ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کلمہ میں مختلف نسخوں میں فرق واقع ہوا ہے۔ اس نسخہ میں (وَفَوْقَه) کے الفاظ ہیں؛ جبکہ ایک نسخہ میں لفظ (واوَ) نہیں ہے۔ جہاں تک اس کے معنی کا تعلق ہے تو وہ شارح نے بیان کر دیا ہے۔

تشریح: مصنف رحمہ اللہ کا فرمان: ''اللہ تعالیٰ، عرش اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں سے بے نیاز ہیں''۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ٥﴾ (العنکبوت: ٦)

''بے شک اللہ تعالیٰ جہان والوں سے بے پراہ ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ٥﴾ (فاطر: ۱۵)

''اور اللہ تعالیٰ ہی بے نیاز تعریف والا ہے۔''

شیخ رحمہ اللہ اس کلام کو یہاں پر لائے ہیں۔ اس لیے کہ جب آپ نے عرش اور کرسی کا ذکر کیا؛ تو اس کے بعد عرش اور اس کے علاوہ جتنی بھی چیزیں ہیں؛ ان سے اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کا ذکر فرمایا؛ تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش کو پیدا فرمانا؛ اور اس پر مستوی ہونا ان کی کسی ضرورت یا حاجت کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ اس کے پیدا کرنے میں حکمت کار فرما ہے۔ اور بلند کے نیچے والے سے اوپر ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نیچے والا اوپر والے پر حاوی ہے؛ اسے اٹھائے ہوئے اور اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور نہ ہی [اوپر والے] اعلیٰ کا، [نیچے والے] سافل کا محتاج ہونا لازم آتا ہے۔ آپ غور کریں آسمان زمین کے اوپر ہے لیکن آسمان زمین کا محتاج نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ عظمت شان والا ہے اور وہ اس سے بلند وبالا ہے کہ اس کے سے ایسی بات لازم آتی ہو۔ بلکہ علو [بلند ہونا] اللہ تعالیٰ کے خصائص میں سے؛ اور اس نے اپنی قدرت کے ساتھ سافل کو اٹھایا ہوا ہے اور سافل اس کا محتاج ہے۔ وہ سافل سے مستغنی ہے سافل نے اس کا احاطہ نہیں کیا ہوا۔ پس وہ عرش پر ہے اس نے اپنی قدرت کے ساتھ عرش اور حاملین عرش کو اٹھایا ہوا ہے۔ وہ عرش سے مستغنی ہے جبکہ عرش اس کا محتاج ہے اس نے عرش کا احاطہ کیا ہوا ہے عرش نے اس کا احاطہ نہیں کیا ہوا؛ اس نے عرش کا حصر [گھیراؤ] کیا ہوا ہے عرش نے اس کا حصر نہیں کیا ہوا۔ لیکن یہ لوازمات مخلوق سے منتفی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے علو کے منکرین معطلہ ہیں۔ اگر وہ بھی اس تفصیل سے کام لیتے تو انھیں راہ حق کی ہدایت حاصل ہو سکتی تھی۔ اور اگر وہ جان لیتے کہ عقل حقیقت میں کتاب اللہ تعالیٰ کے عین مطابق ہے؛ تو وہ دلیل کی اتباع کرتے۔ لیکن وہ دلیل سے دور رہے تو سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔ حالانکہ حقیقت وہی ہے جو امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے؛ جب اس کے متعلق پوچھا گیا:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ (الاعراف: ٥٤)

''پھر وہ عرش پر مستوی ہوا'' کہ استواء کیسے ہے؟۔

تو فرمایا: ''استواء معلوم ہے اور کیفیت مجہول ہے''۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے بھی یہی جواب موقوف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع؛ ہر دو طرح سے مروی ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا اور ہر چیز کے اوپر ہے''۔ ایک نسخہ میں لفظ (واؤ) نہیں ہے۔ جبکہ پہلا نسخہ ہی صحیح ہے۔ پہلی صورت میں معنی یوں ہوگا: ''اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے اور ہر چیز کے اوپر ہے''۔ جبکہ دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ: ''وہ عرش کے اوپر ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے''۔

❀ -واللہ تعالیٰ اعلم-؛ لگتا یہ ہے کہ اس نسخہ بعض کاتبین سے لفظ واؤ گر گیا ہے یا بعض گمراہ قسم کے لوگوں نے قصداً واؤ کو گرا دیا ہے۔ تا کہ معنی فاسد [ان کی مرضی کے مطابق] ہو جائے؛ اور عرش کو فوقیت ثابت نہ ہو حالانکہ دلائل شرعیہ موجود ہیں کہ عرش تمام مخلوقات کے اوپر ہے عرش پر کوئی مخلوق نہیں جس نے عرش کا احاطہ کیا ہو۔ لہٰذا (واؤ) کا ہونا ضروری ہے تا کہ معنی میں فساد پیدا نہ ہو پس صحیح معنی یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے اور ہر چیز کے اوپر ہے۔

ذات باری تعالیٰ کے احاطہ سے عاجزی

امام طحاوی رحمہ اللہ **کا قول** :......((مُحِيطٌ بِكُلِّ شَيْءٍ وَفَوْقَهُ① وَقَدْ عَجَزَ عَنِ الإِحَاطَةِ خَلْقُهُ .))

''اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے''۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌO﴾ (البروج : ۲۰)

''اور اللہ تعالیٰ (ہی) ان کو گردا گرد سے گھیرے ہوئے ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌO﴾ (حم السجدة : ٥٤)

''خبردار بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًاO﴾ (النساء: ١٢٦)

''اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے (وہ) اللہ تعالیٰ کے ملک میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق کو محیط ہونے سے مراد یہ نہیں کہ وہ فلک کی طرح ہے۔ اور مخلوقات اس کی ذات مقدس کے داخل میں ہیں۔ تَعَالَى اللهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا .

بلکہ احاطہ سے مراد اس کی عظمت؛ وسعت اور علم وقدرت؛ کے ذریعہ احاطہ ہے۔ اور یہ کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ کی عظمت کے مقابلہ میں رائی کے دانہ کے برابر ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ فرمایا:

''ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اور جو کچھ ان میں؛ اور ان کے درمیان ہے؛ وہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ایسے ہی ہے جیسے رائی کا دانہ تم میں سے کسی انسان کے ہاتھ میں ہو''۔

یہ تو معلوم ہے کہ - اللہ تعالیٰ ہی کے لیے اعلیٰ مثالیں ہیں -؛ جب ہم میں سے کسی کے پاس رائی کا دانہ ہو؛ وہ جب چاہے تو اس کو مٹھی میں بند کرلے؛ اور مٹھی اس دانے کا احاطہ کرلے۔ اور اگر چاہے تو اس کو اپنے نیچے کردے؛ دونوں احوال میں وہ رائی کا دانہ ہاتھ سے جدا ہوگا۔ اور ہاتھ ہر لحاظ سے اس پر بلند ہوگا''۔ [مجموع الفتاوی ٦/ ٥٦٤]

پس اللہ تعالیٰ عظمت والے کے اوصاف کیسے کوئی بیان کرسکتا جس کی عظمت کا احاطہ ہی نہیں ہوسکتا۔ پس اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو آسمانوں اور زمینوں کو آج بھی اپنی مٹھی میں بند کرلیں؛ اور ان کے ساتھ اسی طرح کریں جیسے قیامت کے دن کریں گے۔ بے شک جس چیز پر اس وقت قدرت نہیں؛ قیامت کے دن اس قوت میں کوئی تجدید نہیں ہوگی۔ تو پھر عقل اس بات کو کیسے بعید قرار دے سکتی ہے کہ اللہ

تعالیٰ بعض اجزاء عالم کے قریب ہونگے؛ اور وہ اپنے عرش پر آسمانوں کے اوپر ہونگے؛ یا اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہیں گے اپنے قریب کر لیں گے۔ پس جو کوئی ان باتوں کی نفی کرتا ہے اس نے اللہ تعالیٰ کی قدر ایسے نہیں کی جیسے اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ ابورزین کی مشہور حدیث میں ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا ذکر ہے؛ ابورزین نے آپ سے پوچھا:

''یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ کی ذات تو واحد ہے اور ہم سارے ہونگے؛ تو ہم اللہ تعالیٰ کا دیدار کیسے کریں گے؟

تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں اس کے سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک مثال بیان کروں گا۔

''یہ چاند دیکھیں؛ وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک ہے ہم تمام اس کا مشاہدہ یوں کرتے ہیں جیسے صرف ہم ہی اس کو دیکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو چاند سے کہیں بہت بڑی ہے۔ اور جب یہ واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز سے بڑے اور عظیم تر ہیں'' ❶۔

جب یہ سمجھ آ گئی ہے کہ وہ ہر ایک چیز سے بڑا اور عظیم تر ہے تو اس مثال سے تمام اشکالات زائل ہو جاتے ہیں اور تمام خیال باطل ہو جاتے ہیں۔

❶ یہ سند ضعیف ہے؛ اور متن صحیح ہے۔ الظلال (٤٥٩ ، ٤٦٠) . أبو داؤد ٤٧٣١ .

[فوقیت کی بحث]:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات سے اوپر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ﴾ (الانعام: ١٨، ٦١)

''اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ﴾ (النحل: ٥٠)

''وہ اپنے اوپر سے اپنے رب سے خائف ہیں۔''

سابقہ بیان کردہ حدیث اوعال میں ہے؛ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''عرش تمام کائنات سے اوپر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان سب سے اوپر ہے''۔ ❶

نیز حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے سامنے وہ اشعار کہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ تو آپ ﷺ نے ان اشعار کو برقرار رکھا؛ انھیں سن کر ہنس دیئے۔ ❷

اس طرح حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار کہے تھے:

❶ حدیث ضعیف ہے۔ الظلال (٥٧٧) .

❷ ضعیف ہے۔ العلو للذهبی (ص ١٠٦)

شهدت بإذن الله أن محمدا ... رسول الذی فوق السموات من عل

وأن أبا يحيىٰ كلاهما ... له عمل من ربه متقبل

وأن الـذی عـادی اليهـود ابن مريم ‏ ‏ رسول أتى من عند ذی العرش مرسل

وأنـا أخـاالاحـقـاف إذ قـام فيهم ‏ ‏ يـجـاهـد فـی ذات الإلـه ويعدل

''میں اللہ کے حکم سے گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس ذات کی جانب سے رسول ہیں جو آسمانوں کے اوپر بلند ہے، اور بے شک حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام دونوں کا عمل ان کے رب کے ہاں مقبول ہے، نیز میں گواہی دیتا ہوں کہ جس پیغمبر سے یہود نے دشمنی کی وہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہیں جن کو عرش والے کی جانب سے بھیجا گیا تھا، نیز میں گواہی دیتا ہوں کہ احقاف والوں کے پاس آنے والا پیغمبر ان میں کھڑا ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے جہاد کرتا رہا اور عدل وانصاف کرتا رہا۔''

آپ ﷺ نے ان اشعار کو سنا تو فرمایا: ''میں بھی گواہی دیتا ہوں''۔ ❶

نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو عرش کے اوپر ایک کتاب میں تحریر کیا کہ: ''میری رحمت میرے غصہ سے سبقت لے گئی ہے''۔ ❷

ایک روایت میں ہے: ''میرے غصہ پر غالب ہے''۔ ❸ [رواہ البخاری؛ وغیرہ]

نیز سنن ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ذکر ہے؛ فرمایا:

''یوں ہوگا کہ جب جنتی اپنی نعمتوں میں ہوں گے؛ ان کے سامنے نور روشن ہوگا؛ وہ اپنے سر بلند کر کے اس کی جانب دیکھیں گے؛ تو جبار [اللہ] جل جلالہ ان کے اوپر سے ان کی جانب جھانکیں گے؛ اور فرمائیں گے:

''اے جنت والو تم پر سلام ہو''۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

❶ سند ضعیف اور منقطع ہے۔ طبقات ابن سعد .

❷ متفق عليه: الظلال (٦٠٨، ٦٠٩).

❸ صحيح بخاری ٣١٢٤؛ مسلم ٢٧٥١ .

﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ (يس: ٥٨)

''سلامتی والا کلمہ پانے والے مہربان کی طرف سے ہے۔''

پس اللہ تعالیٰ ان کی جانب دیکھے گا وہ اللہ تعالیٰ کی جانب دیکھیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کی جانب دیکھتے رہیں گے وہ کسی نعمت کی جانب التفات نہیں کریں گے''۔ ❶

نیز مسلم میں رسول اللہ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر مروی ہے:

﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾ (الحديد: ٣)

''وہی اول ہے اور آخر ہے اور ظاہر اور باطن ہے۔'' [آپ نے فرمایا:]

((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَّاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَّاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَّاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ .)) ❷

''اے اللہ! تو ہی اوّل ہے، پس نہیں تجھ سے پہلے کوئی چیز، اور تو ہی آخر ہے پس تیرے بعد کوئی چیز نہیں، اور تو ہی غالب ہے، پس تیرے اوپر کوئی چیز نہیں، اور تو ہی باطن ہے، پس ہے تجھ سے پوشیدہ کوئی چیز نہیں''۔

یہاں پر ظہور سے مراد بلندی ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

✪ سند ضعیف ہے شیخ احمد شاکر کا اس کی سند کو جید قرار دینا درست نہیں ہے۔ ابن ماجه (١٨٤)، العلو للذهبی (٩٩).
✪ صحیح سند ہے۔ مسلم[برقم :2713] (٨/ ٧٨-٨٩)

﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ﴾ (الکهف : ٩٧)

''ان کو اس پر جانے کی طاقت نہ (میسر) آئی۔'' اس آیت میں ظہور کا معنی علو[بلندی] کا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کے ان چاروں اسماء میں تقابل ہے۔ ان میں سے دو نام اللہ تعالیٰ کی ازلیت اور ابدیت کے لیے ہیں۔ اور دو نام اللہ تعالیٰ کے علو اور اس کے قرب کے لیے ہیں۔

امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے حضرت جبیر بن محمد بن جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ وہ اپنے باپ اور وہ ان کے دادا سے روایت کیا ہے؛ وہ فرماتے ہیں:

''ایک بدو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا؛ اور عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! لوگ مشقت میں ہیں اہل وعیال کمزور ہو رہے ہیں اموال ختم ہو رہے ہیں چوپائے ہلاک ہو رہے ہیں؛ آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے بارش کی دعا کریں؛ ہم آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی لے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو آپ کے ہاں سفارشی لاتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تجھ پر افسوس ہے! کیا تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو''۔ آپ نے تسبیح کے کلمات کہنے شروع کیے مسلسل ان کلمات کو دہراتے رہے یہاں تک کہ آپ کے صحابہ کے چہروں پر اس کے آثار دکھائی دینے لگے۔

پھر آپ نے فرمایا: ''تجھ پر افسوس ہے! اللہ تعالیٰ کو اس کی کسی مخلوق کے پاس بطور سفارشی نہیں لے جایا جا سکتا اللہ تعالیٰ کی شان تو اس سے بلند ہے۔ تجھ پر افسوس ہے! کیا تجھے علم ہے کہ اللہ تعالیٰ کون ہے؟۔ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے اور عرش آسمانوں پر ہے ۔ پھر انگلیوں کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''وہ آسمانوں پر قبہ کی طرح ہے۔ اور عرش اللہ تعالیٰ کے ساتھ یوں چرچراتا ہے جیسے نیا پالان سوار کی وجہ سے چرچراتا ہے''۔ ❶

نیز بنو قریظہ کے دن حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں ہے جب انہوں نے ان کے بارے میں فیصلہ کیا کہ ان میں جو لڑائی کے قابل ہیں انھیں قتل کیا جائے؛ اور ان کے بچوں کو قید کیا جائے، اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تو نے ان کے متعلق وہ فیصلہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ بادشاہ کا فیصلہ کیا ہے جو سات آسمانوں کے اوپر ہے''۔ ❷

یہ حدیث صحیح ہے۔ اس حدیث کو اموی نے مغازی میں ذکر کیا ہے نیز اس کا اصل صحیحین میں ہے۔ نیز بخاری میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی بیویوں پر فخر کرتی ہوئی کہا کرتی تھیں:

''تمھارا نکاح تو تمھارے گھر والوں نے کرا دیا اور میرا نکاح سات آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ نے کرایا''۔ ❸

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے: ان کا گزر ایک بڑھیا کے پاس سے ہوا؛ اس نے آپ کو روک لیا؛ آپ بھی کھڑے ہو کر

اس کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ ایک آدمی نے عرض کیا: ''اے امیر المومنین! آپ نے اس بڑھیا کی وجہ سے لوگوں کو روک رکھا''۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''تجھ پر افسوس ہے کیا تجھے معلوم ہے کہ یہ عورت کون تھی؟ یہ وہ عورت تھی جس کے شکوہ کو اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے سن لیا؛ اس کا نام خولہ رضی اللہ عنہا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

✪ حدیث ضعیف ہے۔ الظلال (۵۷۵، ۵۷٦). مختصر الصواعق المرسلة ۲/ ۲۰۹.

✪ یہ حدیث صحیح ہے؛ مسند احمد میں سات آسمانوں سے اوپر کے الفاظ زیادہ وارد ہوئے ہیں۔ اس زیادتی میں محمد بن صالح التمار منفرد ہے۔ جیسا کہ کتاب ''العلو'' میں ص ۱۰۲ پر ہے۔ امام ذہبی نے اسے صدوق کہا ہے۔ تقریب میں ہے: ''صدوق یخطی''۔ میں کہتا ہوں: ایسے آدمی سے تفرد والی حدیث قبول نہیں کی جاسکتی؛ اگرچہ اس کو مؤلف اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے صحیح بھی کہا ہے۔ فوقیت کے اثبات میں اتنی احادیث ہیں جو ایسی چیزوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر مؤلف رحمہ اللہ کریں گے۔ متفق علیه: البخاری ۳۸۰٤ ؛ مسلم ۱۷٦۸ ؛ مسند احمد ۳/ ۲۲، عن أبی سعید مختصر العلو (۸۷/ ۱۱).

✪ حدیث صحیح ہے۔ بخاری ۷٤۲۰؛ من حدیث انس، کتاب التوحید.

﴿قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْٓ اِلَی اللّٰهِ﴾ (المجادله: ۱)

''یقیناً اللہ تعالیٰ اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے متعلق بحث کرتی تھی؛ اور اللہ تعالیٰ سے (اس رنج و ملال) شکایت کرتی تھی۔'' ❶

✪ حدیث ضعیف ہے۔ درامی نے اس کو روایت کیا۔ الرد علی الجهمية (۲٦)، یہ سند صالح ہے مگر اس میں انقطاع ہے۔ ابو یزید کی عمر سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس فرمان الٰہی کی تفسیر روایت کی ہے:

﴿ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ﴾ (الاعراف: ۱۷)

''پھر ان لوگوں کے پاس ان کے آگے سے اور پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے آؤں گا۔''

فرمایا: ''یہ نہیں کہہ سکا کہ: تمہارے اوپر کی جانب سے'' چونکہ شیطان کو علم تھا کہ اوپر کی جانب اللہ تعالیٰ ہیں''۔

اور جو کوئی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین رحمہم اللہ کا کلام سنے گا؛ تو پتہ چلے گا اللہ تعالیٰ کی فوقیت کے اثبات میں بے شمار اقوال ہیں۔ نیز اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا فرمایا تو اس نے ان کو اپنی پاک ذات میں پیدا نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات اس سے کہیں بہت بلند ہے۔ بیشک وہ ایک ہے بے نیاز ہے نہ اس نے کسی کو جنا ہے نہ وہ جنا گیا۔ پس یہ بات دوٹوک طور پر متعین ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنی ذات سے باہر پیدا کیا ہے۔

اگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات فوقیت کے ساتھ موصوف نہ ہوتی؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ بذات خود قائم ہے؛ اور عالم کے ساتھ اس کا اختلاط نہیں۔ تو پھر بھی وہ اس مخالف وصف کے ساتھ موصوف ہوتا۔ اس لیے کہ جو ذات کسی چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ ذات اس سے یا اس کے مخالف سے بہرحال خالی نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ فوقیت [اوپر/ بالا] کا مخالف تو سفل [نیچا/ زیریں] ہے؛ اور ایسا ہونا [یعنی اللہ تعالیٰ کا نچلے عالم میں ہونا] مطلقاً مذموم ہے۔ اس لیے کہ نیچے کا جہاں تو ابلیس اور اس کے اتباع کاروں کا اور اس کے لشکر کا ٹھکانہ ہے۔

[اعتراض]: اگر کہا جائے کہ: ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات فوقیت کو قبول کرنے والی ہے؛ حتیٰ کہ اس کی نفی سے اس کے مخالف وصف کا ثابت ہونا لازم آئے؟

[جواب]: یہ کہا جائے گا کہ اگر وہ ذات علو اور فوقیت کو قبول کرنے والی نہ ہوتی؛ تو بذات خود قائم ہونے کی کچھ حقیقت نہ ہوتی۔ جب آپ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بذات خود قائم ہے؛ اس کا عالم کے ساتھ کچھ اختلاط نہیں؛ اور خارج میں وہ موجود ہے؛ اس کا وجود صرف ذہنی نہیں؛ بلکہ قطعاً اس کا وجود اذہان سے خارج ہے۔ اور تمام عقلاء بدیہی طور پر اس بات کا علم رکھتے ہیں کہ جس کا وجود اس طرح کا ہو وہ یا عالم میں داخل ہوتا ہے یا اس خارج۔ اور اس کا انکار کرنا حقیقت میں بلا شک وشبہ ضروری بدیہات کے سب سے جلی اور واضح ترین امور کا انکار ہے۔ پس اس پر کسی بھی دلیل سے استدلال نہیں کیا جا سکتا؛ مگر اس دلیل میں اس کی مباینت [اس عالم سے جدا ہونے] کا علم زیادہ واضح اور ظاہر روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگا۔ اور جب فوقیت اور علو کا وصف کمال کا وصف ہے؛ نہ اس میں کچھ نقص ہے نہ وہ کسی نقص کو مستلزم ہے؛ اور نہ ہی کسی ناجائز چیز کو واجب کرتا ہے؛ اور نہ ہی کتاب و سنت اور اجماع کا مخالف ہے۔ پس اس کی حقیقت کی نفی بالکل وہی باطل اور محال چیز ہے جس کو شریعت اسلامی نے ذکر تک نہیں کیا۔ پس کس طرح اس کو تسلیم نہ کیا جائے جب کہ اس کے وجود کا اقرار اور اس کے رسولوں کی تصدیق اور اس کی کتاب اور جس چیز کو پیغمبروں نے بتایا اس پر ایمان لانا بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ اور پھر اس وقت کیسے ہوگا جب اس کے ساتھ سلیم عقول اور مستقیم فطرت کی گواہی بھی شامل ہو جائے''۔[مختصر الصواعق المرسلة ۲/ ۲۱٤]

[عالی اور بلند ہونے کے اثبات میں مختلف نصوص]

مختلف اقسام کی محکم نصوص ایسی بھی وارد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اپنی مخلوق پر بلند ہونے؛ اور اپنے بندوں کے اوپر ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔ یہ تقریباً بیس اقسام کی نصوص اللہ تعالیٰ کی فوقیت پر دلالت کرتی ہیں۔

اول: صراحتاً فوقیت کا ذکر ہو جو لفظ " مِنْ " کے ساتھ وارد ہوا ہو؛ تو مراد ذات الٰہی کی فوقیت ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ﴾ (النحل : ٥٠)

''اور وہ اپنے رب سے خائف ہیں جو اوپر ہے۔''

دوم: کسی بھی معاون لفظ کے بغیر فوقیت کا ذکر ہو؛ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ﴾ (الانعام: ١٨، ٦١)

''اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے۔''

سوم: صراحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف عروج کا ذکر ہو؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ﴾ (المعارج : ٤)

''جس کی طرف روح (الامین) اور فرشتے چڑھتے ہیں۔''

اور ارشاد نبوی ﷺ ہے:

((يعرج الذين باتوا فيكم فيسألهم .)) ❶

❶ بخاری ٥٥٥ ، مسلم ٦٣٢ ، الظلال (٤٩١) . یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے؛ جس میں ہے: 'تمہارے پاس فرشتے آتے رہتے ہیں؛ کچھ فرشتے دن کو آتے ہیں؛ اور کچھ رات کو......''۔

''جن فرشتوں نے تم میں رات بسر کی ہوتی ہے وہ عروج کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے سوال کرتے ہیں۔''

چہارم: صراحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف صعود [اوپر کی جانب] چڑھنے کا ذکر ہو؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِلَيۡهِ يَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (فاطر: ١٠)

''اس کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں۔''

پنجم: بعض مخلوقات کو اوپر اٹھانے کا ذکر ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿بَلۡ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيۡهِ﴾ (النساء: ١٥٨)

''بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف اٹھالیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنِّىۡ مُتَوَفِّيۡكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ﴾ (آل عمران: ٥٥)

''میں تجھ کو پورا پورا اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔''

ششم: علو مطلق کا ذکر ہو؛ جو کہ ذات؛ قدر؛ شرف؛ غرض کہ علو کی تمام اقسام پر دلالت کرتا ہے؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَهُوَ الۡعَلِىُّ الۡعَظِيۡمُ۝﴾ (البقرة: ٢٥٥)

''اور وہ بہت بلند ہے عظمت والا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَهُوَ الۡعَلِىُّ الۡكَبِيۡرُ۝﴾ (سباء: ٢٣)

''اور وہ بلند ہے کبریائی والا۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّهٗ عَلِىٌّ حَكِيۡمٌ۝﴾ (الشوریٰ: ٥١)

''بے شک وہ بلندی والا اور حکمت والا ہے۔''

ہفتم: اس کی طرف سے کتاب نازل ہونے کی تصریح۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ۝﴾ (غافر: ٢)

''اللہ تعالیٰ غالب حکمتوالے کی طرف سے کتاب کو نازل کرتا ہے۔''

نیز اس آیت کی تائید درج ذیل آیات سے بھی ہو رہی ہے:

﴿تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ۝﴾ (الزمر: ١)

''اللہ تعالیٰ غالب حکمت والے کی طرف سے کتاب نازل کرنا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝﴾ (فصلت : ۲)

''رحمٰن اور رحیم کی طرف سے اتارنا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلۡ نَزَّلَهٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّكَ﴾ (النحل : ۱۰۲)

''فرما دیں: اس کو تیرے رب کی طرف سے روح القدس نے نازل کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿حٰمٓ ۝ وَالۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۝ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ ۝ فِيۡهَا يُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ ۝ اَمۡرًا مِّنۡ عِنۡدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرۡسِلِيۡنَ ۝﴾ (الدخان : ۱۔۵)

''حٰم۔ اس کتاب روشن کی قسم کہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا ہے ہم تو راستہ دکھانے والے ہیں۔ اسی رات میں تمام حکمت کے کام فیصل کیے جاتے ہیں (یعنی) ہمارے ہاں سے حکم ہو کر بے شک ہم ہی (پیغمبر کو) بھیجتے ہیں۔''

ہشتم: یہ تصریح کہ بعض مخلوقات کو اختصاص حاصل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں؛ اور بعض مخلوقات کو کچھ دوسروں کی نسبت زیادہ قربت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ عِنۡدَ رَبِّكَ﴾ (الاعراف : ۲۰۶)

''بے شک وہ جو تیرے رب کے ہاں ہیں۔''

اس کی تائید دوسری آیت میں موجود ہے۔ فرمایا:

﴿وَ لَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَنۡ عِنۡدَهٗ﴾ (الانبياء : ۱۹)

''اور اسی کے ملک میں ہیں جو آسمانوں اور زمین میں اور جو اس کے پاس ہیں۔''

پس لفظ (من له) اور (من عنده) میں فرق کیا ہے۔ (من له) عموم کے لیے ہے اور (من عنده) سے مراد مخصوص فرشتے اور اس کے خاص فرمانبردار بندے ہیں۔ نیز اس کتاب کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر لکھ رکھی ہے؛ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''بیشک وہ کتاب اللہ تعالیٰ کے پاس عرش کے اوپر ہے''۔ [1]

نہم: یہ صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں ہے۔ اہل سنت مفسرین کے نزدیک اس کی دو توجیہات ہیں: یا تو لفظ (فی) (علی) کے معنی میں ہو؛ یا پھر سماء سے مراد علو [بلندی] لیا جائے۔ اس میں ان کا کوئی اختلاف نہیں ہے؛ اور نہ ہی اسے کسی دوسرے معنی پر محمول کرنا جائز ہے۔

دہم: اس کے عرش پر مستوی ہونے کی صراحت جو کہ (علی) کے لفظ کے ساتھ مل کر آئی ہے؛ جو عرش کے ساتھ خاص ہے؛ جو تمام مخلوقات سے بلند ہے۔ اکثر و بیشتر اس کا استعمال (ثم) کے ساتھ ہوتا ہے جو ترتیب اور مہلت پر دلالت کرتا ہے۔

یازدہم: اللہ تعالیٰ کی جانب ہاتھ اٹھانے کی صراحت؛ جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے حیا کرتا ہے؛ جب کہ وہ اس کی طرف اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے؛ کہ وہ انھیں خالی لوٹائے''۔ [2]

اور یہ کہنا کہ علو[بلندی] فقط دعا کا قبلہ ہے؛ یہ بات فطرت کی روشنی میں اور ضرورت کے تحت باطل ہے۔ یہ تو ہر دعا کرنے والے کے دل میں احساس پایا جاتا ہے[کہ اس کا رب بلندی پر ہے]۔اس کا بیان آگے آئے گا۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔

دوازدہم: ہر رات دنیاوی آسمان پر نازل ہونے کی صراحت۔تمام امتوں کے ہاں یہ بات معقول ہے کہ نزول کا اطلاق بلندی سے پستی کی جانب اترنے پر ہوتا ہے۔

سیزدہم: [اس کی طرف] حسی طور پر اوپر کی جانب اشارہ کرنا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس ہستی نے اشارہ کیا تھا؛ جو اپنے رب کے؛ اور اس کے لیے کیا واجب اور کیا ممتنع ہے؛ اس بارے میں مخلوق میں سب سے بڑھ کر علم رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ جب ایسے بہت بڑے مجمع میں تھے کہ ایسا مجمع کوئی نہ ہوگا؛ عظمت والے مقام پر عظمت والے دن موجود تھے؛ تو آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ''تم سے میرے بارے میں سوال ہوگا؛ تم کیا جواب دو گے؟''۔

لوگوں نے کہا: ''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا؛ حق ادا کر دیا اور خیر خواہی کی''۔ ❸

تو آپ ﷺ نے اپنی انگلی مبارک کو آسمان کی جانب بلند کرتے ہوئے ایسی ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے؛ آسمان ہی سے نہیں؛ بلکہ تمام مخلوق سے اوپر ہے۔ یعنی گویا کہ ہم اس انگشت شہادت کو دیکھ رہے اور وہ آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہے۔اور آپ اپنی مبارک زبان سے اس ذات سے کہہ رہے ہیں: ''اے اللہ! گواہ ہو جا''۔

اور ہم بھی گواہی دیتے ہیں کہ: آپ ﷺ نے کمال طریقہ سے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو پہنچایا؛ اپنے رب کی رسالت کو ایسے ادا کیا جیسے آپ کو حکم دیا گیا تھا۔اور امت کی نہایت درجہ خیر خواہی کی، پس آپ کے بیان، وضاحت، تبلیغ وانکشاف کے بعد کسی تکلف اور خواہ مخواہ باتیں بنانے والے؛ اور ماہرین لغت کے چکروں میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔والحمدللہ رب العالمین۔

چہاردہم: ''لفظ''این[یعنی کہاں]'' کی صراحت۔جیسا کہ مخلوق میں سب سے بڑے عالم اور اپنی امت کے سب سے بڑے خیر خواہ؛ اور سب سے بڑے فصیح اللسان نے صحیح معنی میں ایسے لفظ کے ساتھ بیان فرمایا ہے جس میں کسی بھی لحاظ سے باطل کا وہم تک نہیں پایا جاتا۔فرمایا: ''أین اللہ''؟[اللہ تعالیٰ کہاں ہیں؟]۔''یہ بات آپ ﷺ نے کئی مواقع پر ارشاد فرمائی''۔

پنج دہم: اس انسان کو آپ ﷺ نے مومن قرار دیا جس نے کہا تھا: ''بے شک اس کا رب آسمان میں ہے''۔ ❹

شش دہم: اللہ تعالیٰ کا فرعون کے متعلق خبر دینا کہ اس نے آسمانوں کی طرف چڑھنے کی کوشش کی تھی تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رب کو دیکھے اور پھر جو کچھ آپ بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر ہیں؛ اس کو جھٹلا سکے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں[فرعون نے کہا تھا]:

❶ متفق علیہ: الظلال (٦٠٨، ٦٠٩).

❷ حدیث صحیح ہے۔حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے۔

❸ حدیث صحیح ہے۔ یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث کا ایک حصہ ہے جو صحیح مسلم/ کتاب حجۃ النبی میں، ابوداؤد، دارمی، ابن ماجہ اور دیگر کتب میں موجود ہے۔[علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں] میں نے ان روایات کو ایک علیحدہ کتابچہ کی شکل میں جمع کیا ہے؛ اور اس کے دوسری روایات؛ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی روایت میں ثابت شدہ زیادات کو جمع کر دیا ہے۔اور اس پر مفید تبصرے بھی لکھ دیے ہیں۔اور یہ کتاب مکتب اسلامی سے طبع ہو چکی ہے۔

❹ حدیث صحیح ہے۔مسلم (٢/ ٧١)۔اور دیگر کتب میں حضرت معاویہ بن حکم السلمی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت موجود ہے؛ آپ نے ایک باندی سے پوچھا: ''اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ تو اس نے کہا: ''آسمان میں ہے''۔ پوچھا: میں کون ہوں؟۔ کہنے لگی: آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔تو آپ نے فرمایا: یہ ایمان والی ہے؛ اسے آزاد کر دو''۔اس کی تخریج الظلال (٤٨٩، ٤٩٠) میں ہو چکی ہے۔مختصر العلوص ۸۱ پر علامہ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے؛

اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

﴿ یٰہَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ o اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓی اِلٰہِ مُوْسٰی وَاِنِّیْ لَاَظُنُّہٗ کَاذِبًا ﴾ (المؤمن: ۳۵، ۳۶)

''اے ہامان! میرے لیے ایک محل بناؤ تا کہ میں (اس پر چڑھ کر) راستوں پر پہنچ جاؤں (یعنی) آسمانوں کے راستوں پر پھر موسیٰ کے اللہ تعالیٰ کو دیکھ لوں اور میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں۔''

پس جہمیہ میں سے جو شخص علو کی نفی کرتا ہے وہ فرعونی ہے اور جو شخص علو کو ثابت کرتا ہے وہ موسوی اور محمدی ہے۔

بفت دہم: رسول اللہ ﷺ کا خبر دینا کہ آپ ﷺ نماز کی تخفیف کے لیے کئی بار اپنے رب کے اور موسیٰ علیہ السلام کے مابین آتے جاتے رہے۔ اپنے رب کی جانب صعود فرماتے [عالم بالا کی طرف جاتے]؛ اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب آتے۔ ایسا کئی بار ہوا۔ [1]

ہشت دہم: کتاب وسنت کی واضح نصوص دلالت کرتی ہیں کہ اہل جنت بروز قیامت اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح سورج کو، اور چودھویں کے چاند کو اس وقت دیکھتے ہیں جب بادل نہ ہوں''۔ تو لوگ اللہ تعالیٰ کو صرف بلندی میں ہی دیکھیں گے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا:

''جنتی اپنی نعمتوں میں مگن ہوں گے اچانک ان کے سامنے نور نمودار ہوگا؛ وہ اپنا سر بلند کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر بلندی سے دیکھ رہے ہوں گے؛ اور فرمارہے ہوں گے: اے جنت والو! تم پر سلام ہو، اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

[1] متفق علیہ: بخاری ۳۲۰۷؛ مسلم ۱۶۴؛ مختصر العلو (رقم ۱۷).

﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ o ﴾ (یٰس: ۵۸)

''سلامتی والا قول اللہ تعالیٰ رحم کرنے والے کی طرف ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ ان سے پردے میں ہو جائے گا؛ لیکن اس کی رحمت اور برکت ان کے دیار میں رہے گی''۔ [1]

[1] ابن ماجہ (۱۸٤)، العلو للذہبی (۹۹). یہ حدیث ضعیف ھے۔

اسے امام احمد رحمہ اللہ نے مسند میں (۱۸۴) اور دیگر کتب میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ کی فوقیت کا انکار تب ہی ہو سکتا ہے جب اس کی رؤیت کا بھی انکار کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جہمیہ ان دونوں چیزوں کا انکار کرتے ہیں جبکہ اہل سنت ان دونوں باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور جو لوگ رؤیت کا اقرار کرتے ہیں لیکن علو کی نفی کرتے ہیں وہ متذبذب ہیں نہ وہ ان میں داخل ہیں نہ ان میں۔ یہ مختلف اقسام کے دلائل تھے۔ اگر اس مسئلہ کے دلائل کو تفصیل سے ایک ایک کر کے بیان کیا جائے تو تقریباً ایک ہزار دلائل تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور تاویل کرنے والے پر واجب ہوتا ہے کہ وہ ان تمام دلائل کا جواب دے۔ مگر افسوس ہے ان کے لیے کہ وہ ان چند دلائل کا بھی صحیح جواب نہیں دے سکتے''۔ [الاعلام الموقعین ۲/۳۰۰؛ الصواعق ۲۹۴]

[سلف صالحین رحمہم اللہ اور علوئے باری تعالیٰ پر ایمان:]

صفت علو کے اثبات میں سلف صالحین رحمہم اللہ کا کلام بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل انصاری رحمہ اللہ (۳۹۶ھ-۴۸۱

ھ) اپنی کتاب (الفاروق) میں اپنی سند سے مطیع بلخی رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جو کہتا ہے: ''میں نہیں جانتا کہ میرا رب آسمان میں ہے یا زمین میں؟''۔

تو امام صاحب رحمہ اللہ نے جواب دیا؛ فرمایا: ''وہ یقیناً کافر ہو گیا؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰہٰ: ۵)

''رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا عرش ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے''۔

میں نے پھر سوال کیا: اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے؛ لیکن میں نہیں جانتا کہ عرش آسمان میں ہے یا زمین میں؟''۔

تو امام صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا: ''تو وہ کافر ہے؛ اس لیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے کا انکار کیا۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو آسمان میں نہیں مانتا وہ کافر ہے''۔

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں: ''اس لیے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں ہے؛ اس کو بلندی میں پکارا جاتا ہے۔ اسفل [نیچے] میں اس کا تصور کرتے ہوئے نہیں پکارا جاتا''۔ (انتھیٰ)

جو لوگ اس کے انکار کرتے ہیں؛ اور خود کو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی جانب منسوب کرتے ہیں؛ ان کی بات کی طرف التفات تک نہیں کیا جائے گا۔ معتزلہ اور کچھ دوسرے لوگ بھی اپنے آپ کو امام صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ جو کہ بہت سارے عقائد میں امام صاحب رحمہ اللہ کے مخالف ہیں۔ اسی طرح امام مالک، شافعی، احمد رحمہم اللہ کی طرف اپنی نسبت کرنے والے لوگ بعض اعتقادات میں ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا بشر مریسی سے توبہ کروانے کا واقعہ مشہور ہے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے عرش کے اوپر ہونے کا انکار کرتا تھا۔ یہ واقعہ ابوعبدالرحمٰن ابن ابی حاتم رحمہ اللہ اور دیگر محدثین نے ذکر کیا ہے۔ [مختصر الصواعق ۲/۲۱۲]

[اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہونے کی تاویل]:

جو کوئی ''فوق'' [یعنی کے اوپر ہونے] کی یہ تأویل کرتا ہے کہ ''فوق'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بہتر اور افضل ہونا ہے۔ یا وہ عرش سے افضل اور بہتر ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے امیر، وزیر سے اوپر ہے؛ اور دینار، درہم کے اوپر ہے۔ [مختصر الصواعق ۲/۲۱۲]

ان کی یہ تاویل ایسی ہے جس سے عقول سلیمہ نفرت کرتی ہیں۔ صحیح مستقیم دل کے اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بے شک کسی شخص کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بہتر ہے اور عرش سے بھی بہتر ہے؛ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی کہتا ہے: برف ٹھنڈی ہے؛ آگ گرم ہے؛ اور سورج چراغ سے زیادہ روشن ہے۔ آسمان مکان کی چھت سے بلند ہے۔ پہاڑ کنکر سے بوجھل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں یہودی سے افضل ہیں۔ آسمان زمین سے بلندی پر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کلام میں نہ ہی بزرگی ہے؛ نہ ہی تعظیم ہے؛ اور نہ ہی مدح۔ بلکہ یہ تو نہایت ردی؛ قبیح اور گھٹیا کلام ہے۔ تو پھر [ایسا کچھ] کلام اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیسے یہ شایان شان ہو سکتا ہے؟۔ [وہ کلام اللہ کہ] اگر تمام جنات اور انسان جمع ہو جائیں کہ وہ اس کی مثال پیش کر سکیں؛ تو وہ کبھی اس جیسا کلام نہیں پیش کر سکیں گے اگر چہ وہ سب جمع ہو کر ایک دوسرے کی معاونت بھی کریں۔ بلکہ یہ انداز تو نہایت معیوب ہے۔ جیسا کہ عام ضرب المثل ہے

الـم تـر أن السيف يـنـقـص قـدره إذا قيل أن السيف أمضى من العصا

''کیا آپ نہیں جانتے ہیں کہ تلوار کی قدر و منزلت اس وقت گر جاتی ہے جب اس کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ تلوار لاٹھی سے زیادہ تیز ہے''۔[مختصر الصواعق ۲/۲۰۶]

اسی طرح اگر کہنے والا یوں کہے: جواہر پیاز کے چھلکے اور مچھلی کے چھلکے سے قیمتی ہیں؛ تو اس بات کو سن کر عقلمند لوگ ہنس دیں گے۔ اس لیے کہ دونوں میں فرق ظاہر ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ خالق اور مخلوق کے مابین فرق اس سے بہت زیادہ بڑا اور بڑھ کر ہے۔بخلاف اس کے کہ اگر کسی مقام کا ایسا ہی تقاضا ہو؛ یعنی کسی باطل پرست پر حجت قائم کرنی ہو۔[تو پھر اس طرح کا فرق بیان کیا جا سکتا ہے]۔جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ہے:

﴿ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ (یوسف : ۳۹)

''بھلا کئی جدا جدا خدا اچھے ہیں یا صرف ایک اللہ تعالیٰ یکتا و غالب۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ءٰ آللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ (النمل: ۵۹)

''کیا اللہ تعالیٰ بہتر ہے یا جن کو وہ شریک بناتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ (طٰہٰ: ۷۳)

''اور اللہ تعالیٰ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔''

بے شک فوقیت کے اس معنی کا ثبوت؛ ہر لحاظ سے مطلق فوقیت کے ثبوت کے ضمن میں کیا جاتا ہے۔پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو غلبہ کی فوقیت؛ قدر کی فوقیت؛ اور ذات کی فوقیت حاصل ہے۔اور جو کوئی اس میں سے کچھ چیزیں ثابت مانتا ہے؛ اور کچھ کا انکار کرتا ہے؛ تو یقیناً وہ کوتاہی کا مرتکب ہے۔اور اللہ تعالیٰ کا علو/ بلند ہونا ہر لحاظ [ہر اعتبار] سے مطلق ہے۔اگر کوئی کہے کہ: اس کا علو (مکانۃ) یعنی مرتبہ کے لحاظ سے ہے [مکان] جگہ کے لحاظ سے نہیں''۔

[اس لیے کہ عربی میں لفظ] (مکانة) مکان کی تانیث ہے؛ اور منزلة، منزل کی تانیث ہے۔اور لفظ (المكانة والمنزلة) کا استعمال نفسانی اور روحانی مراتب میں ہوتا ہے۔جیسا کہ (المكان اور المنزل) کے الفاظ کا استعمال جسمانی اماکن پر ہوتا ہے۔پس اس لحاظ سے جب کہا جاتا ہے (لك فی قلوبنا منزلة) ''آپ کا ہمارے دل میں مقام ہے'' اور فلاں کا مقام و مرتبہ ہمارے دلوں میں ہے؛ اور اس کا مرتبہ ہمارے نفوس میں فلاں کے مرتبہ سے زیادہ ہے۔جیسا کہ ایک اثر میں مروی ہے؛ ارشاد فرمایا:

((إِذَا أَحَبَّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّعْرِفَ كَيْفَ مَنْزِلَتُهُ عِنْدَ اللّٰهِ ، فَلْيَنْظُرْ كَيْفَ مَنْزِلَةُ اللّٰهِ فِي قَلْبِهِ ، فَإِنَّ اللّٰهَ يُنَزِّلُ الْعَبْدَ مِنْ نَفْسِهِ حَيْثُ أَنْزَلَهُ الْعَبْدُ مِنْ قَلْبِه .)) [1]

''جب تم میں سے کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کا مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں کتنا ہے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا مقام کتنا ہے؟۔ بے شک اللہ تعالیٰ بندے کو وہی مقام عطا فرماتے ہیں جو بندہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کو دیتا ہے''۔

اس جملہ کا معنی کہ: ''اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا مقام'' اس سے مراد اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کی تعظیم اور محبت وغیرہ کا موجزن ہونا ہے۔ پس جب معلوم ہو گیا کہ لفظ (المکانة والمنزلة) لفظ مکان اور منزل کی تانیث ہے۔ اور مونث لفظ اور معنی میں مذکر کی فرع اور اس کی تابع ہوتی ہے۔ پس کسی مماثل کا ذہن میں بلند ہونا حقیقت میں اس کے بلند ہونے کے تابع ہوتا ہے۔ جب ذہن اور حقیقت میں مطابقت ہو تو وہ حق ہے؛ اگر مطابقت نہ ہو تو باطل۔

❀ اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ کے علو سے مراد دلوں میں اس کی بلندی ہے۔ بیشک وہ قلوب میں ہر ایک چیز سے اونچا اور بلند ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے: ''بالکل ایسے ہی؛ حقیقت میں بھی اللہ تعالیٰ کا مقام بہت اونچا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ علو بالکل اس کے مطابق ہے جو نفس میں اس کا ہر چیز پر علو موجود ہے۔ اگر وہ اپنی ذات کے ساتھ ہر ایک چیز پر عالی اور بلند نہ ہو؛ تو اس کا [ذاتی] علو دل میں پانے جانے والے علو کے ساتھ مطابق نہ ہو۔ جیسے کوئی ایسی چیز کو اعلیٰ کہتا ہے جو اعلیٰ نہیں ہے۔

☼ میں اس اثر کو نہیں جان سکا۔ لیکن بعد میں بہت بھائیوں کی رہنمائی کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ اثر مستدرک حاکم (۱/۴۹۴-۴۹۵) میں ہے اور امام حاکم کے نزدیک صحیح ہے۔ الضعیفه (٥٤٢٧)۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس پر تعاقب کیا ہے؛ اس لیے کہ اس کی سند میں عمر بن عبداللہ تعالیٰ مولی غفرہ ہے؛ جو کہ ضعیف راوی ہے۔ اور اسی کی سند سے ابو یعلیٰ نے بھی روایت کیا ہے؛ اس کی تخریج الضعیفة (٥٤٢٧)؛ میں بھی ہے۔ یہ بھی بہت ساری ضعیف اور موضوع روایات میں سے ایک ہے جن سے عزالدین بلیق نامی مؤلف نے اپنی کتا ''منہاج'' کے صفحات کالے کئے ہیں۔ اس میں تقریباً چار سو ضعیف اور موضوع احادیث ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس کتاب کے مقدمہ میں وہ یہ دعوی کرتا ہے کہ اس کی کتاب میں وارد تمام احادیث صحیح ہیں۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس پر رد کے ساتھ یہ کتاب نشر کرنے کی توفیق دے۔ امید ہے کہ عنقریب ہی اس کام سے فراغت ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کی بلندی جیسے کتاب وسنت کے دلائل سے ثابت ہے ایسے ہی عقل اور فطرت سے بھی ثابت ہے۔ عقلی دلائل کے ساتھ اس کے علو کا ثابت ہونا کئی زاویوں سے ہے:

اول: یہ بات دوٹوک اور یقینی ہے کہ ہر دو موجود چیزوں میں سے یا تو ایک چیز دوسری میں سرایت کرنے والی اور اس کے ساتھ قائم ہوتی ہے جیسے صفات۔ یا پھر وہ اپنی ذات کے ساتھ قائم اور دوسری چیز سے الگ ہوتی ہے۔

دوم: یہ کہ جب [اللہ تعالیٰ نے] اس عالم کو پیدا کیا؛ تو اس کا پیدا کرنا یا اس کی اپنی ذات کے اندر [داخل میں ہوگا] یا اس کی ذات سے باہر۔ پہلی چیز باطل ہے۔ [اس کی دو وجہ ہیں:] اول: اس کے باطل ہونے پر [تمام اہل علم کا] اتفاق ہے۔ دوم: اس سے لازم آتا ہے کہ وہ خسائس اور گندی چیزوں کی بھی جگہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بلند ہے۔

دوسرے نکتے کا تقاضا ہے کہ کائنات اللہ تعالیٰ کی ذات سے خارج اور جدا ہو۔ تو اب جدا ہونا متعین ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کہنا کہ: اللہ تعالیٰ نہ اس عالم [کائنات] کے ساتھ متصل ہے اور نہ اس سے منفصل ہے؛ یہ بات غیر معقول ہے۔

سوم: [یہ عقیدہ کہ] اللہ تعالیٰ نہ عالم میں داخل ہے اور نہ اس سے خارج؛ کلی طور پر اللہ تعالیٰ کے وجود کی نفی کا تقاضا کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ بات ہی غیر معقول ہے۔ پس وہ موجود ہے یا عالم کے داخل میں ہوگا یا خارج میں۔ پہلی بات یعنی داخل میں ہونا تو باطل ہے۔ دوسری بات: [خارج میں ہونا] تو اب اس کا جدا ہونا متعین ہو گیا۔

[یعنی جب اللہ تعالیٰ اس کائنات سے باہر [بلند و بالا] ہے؛ تو اللہ تعالیٰ کے درمیان لازمی طور پر دوری یعنی فاصلہ بھی ہوگا۔]

اللہ تعالیٰ کے علو پر دلائل فطرت:

اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام مخلوق اپنی طبیعت اور فطرت سلیمہ کی بنیاد پر دعا کے وقت؛ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گریہ وزاری کرتے ہوئے ہاتھ [اوپر] اٹھاتے ہیں؛ اس سے ان کا مقصود ان کے دلوں میں بلندی کی سمت ہوتی ہے۔

محمد بن طاہر مقدسی رحمہ اللہ (۴۴۸ھ-۵۰۷ھ) بیان کرتے ہیں کہ شیخ ابو جعفر ہمدانی رحمہ اللہ (۴۴۰-۵۳۱ھ)؛ ابوالمعالی الجوینی المعروف امام الحرمین رحمہ اللہ (۴۱۹-۴۷۸ھ) کی مجلس میں حاضر ہوئے؛ جو ان کے استاد ہیں۔ امام الحرمین صفت علو کی نفی میں بحث کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے اللہ تعالیٰ تھا عرش نہ تھا؛ اب بھی اللہ تعالیٰ اسی چیز پر ہے جس پر پہلے تھا۔ تو شیخ ابو جعفر نے کہا: استاذ محترم! آپ ہمیں اس ضرورت کے تعلق بتائیں جو ہم اپنے دلوں میں پاتے ہیں۔ اس لیے کہ کوئی بھی معرفت رکھنے والا یا اللہ تعالیٰ کہتا ہے؛ مگر وہ اپنے دل میں طلب علو کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ وہ دائیں بائیں التفات تک نہیں کرتا۔ تو ہم اپنے دل کے اس داعیہ کو کیسے ختم کر سکتے ہیں؟۔ راوی بیان کرتا ہے کہ امام الحرمین نے اپنا سر پیٹا؛ اور مسند سے نیچے اتر آئے؛ بلکہ (شاید یہ کہا کہ) وہ رو پڑے۔ اور بولے: ''مجھے حیران کر دیا؛ ہمدانی نے حیران کر دیا''۔ شیخ کی مراد یہ تھی کہ: بے شک یہ ایسا معاملہ ہے؛ کہ اس فطرت پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا کیا ہے؛ یہ [یعنی یہ احساس اور خواہش] انہیں مرسلین کی طرف سے نہیں ملا۔ لوگ اپنے دلوں میں ضروری طور پر یہ احساس اور شعور پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اس کو بلندی کی جانب میں تلاش کرتے ہیں۔

[دلیل عقلی پر ایک اعتراض:] دلیل عقلی کے بدیہی ہونے پر اعتراض کیا جاتا ہے؛ اس لیے کہ جمہور عقلاء اس کا انکار کرتے ہیں۔ اگر یہ دلیل بدیہی ہوتی تو عقلاء کے درمیان اس میں اختلاف نہ ہوتا بلکہ یہ تو وہمی اور خیالی معاملہ ہے۔

جواب:......اس اعتراض کا جواب اپنی جگہ پر نہایت وضاحت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں پر میں مختصر سا اشارہ ہی کروں ہو گا۔ ان سے کہا جائے گا: ''اگر تمھاری عقل تمھاری بات کو درست مانتی ہے تو ہماری بات کو اس سے زیادہ درست تسلیم کرے گی۔ اور اگر عقل ہماری بات کو رد کر دے؛ تو وہ سب سے بڑا رد تمہاری بات پر ہوگا۔ اگر ہمارا قول عقلی طور پر باطل ہے تو تمھارا قول اس سے بھی بڑا باطل ہے۔ اگر تمھارا قول عقلی طور پر حق اور مقبول ہے؛ تو ہمارا قول زیادہ حق دار ہے کہ وہ عقل کے لحاظ سے قابل قبول ہو۔ بے شک اس مسئلہ میں ضرورت [بدیہی ہونے] کا دعویٰ مشترک ہے۔ بے شک ہم کہتے ہیں: ہم ضروری طور آپ کا قول باطل ہونے کا علم رکھتے ہیں۔ اور آپ لوگ بھی ایسی ہی بات کہتے ہیں [یعنی ہمارے قول کو باطل کہتے ہو]۔ پس جب تم کہتے ہو کہ یہ ایسی بدیہی چیز ہے کہ ہمارے قول کو باطل قرار دیتی ہے؛ یہ وہم کا فیصلہ ہے عقل کا فیصلہ نہیں۔ ہم تم سے تمھارے قول کے مقابلہ میں اس جیسا قول ہی پیش کرتے ہیں۔ لوگ - جو نہ ہم میں سے ہیں؛ نہ تم میں سے ہیں -؛ عام طور پر فطرت کے مطابق ہماری ہی موافقت کرتے ہیں۔ اگر انسانوں کی فطرت کی بات تسلیم ہے؛ تو ہم تم پر غالب آ گئے۔ اور اگر یہ بات مردود ہے؛ مقبول نہیں؛ تو تمھارا قول بالکل ہی باطل ہو گیا۔ کیونکہ آپ نے اس قول کی بنیاد ہی اس چیز پر رکھی ہے جس کے متعلق تمہارا دعوی ہے کہ یہ ایسے مقدمات ہیں؛ جو انسانی فطرت کے ساتھ معلوم ہیں۔ مزید برآں ہماری عقلی باتیں بھی باطل ہو گئیں۔ اور جو شریعت انبیائے کرام علیہم السلام لائے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہے تمھارے ساتھ نہیں۔ پس ہم سمع [یعنی شریعت کے دلائل] کے ساتھ مخصوص ہیں؛ آپ لوگ نہیں۔ اور عقل تو ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہے۔

[اعتراض:] اگر تم یہ بات کہو کہ: ''اکثر عقلاء وہی بات کہتے ہیں جو ہم کہتے ہیں''۔

[جواب:] ایسی بات نہیں؛ بے شک جو لوگ صراحت کرتے ہیں کہ عالم کا خالق موجود ہے؛ وہ عالم سے اوپر نہیں؛ اور بے شک وہ نہ عالم سے جدا ہے اور نہ ہی عالم میں حلول کیے ہوئے ہے۔ یہ مناظرین کا ایک گروہ ہے؛ [جو اسلام کے نظریات سے متصادم نظریات رکھتا ہے]۔ سب سے پہلے اسلام میں اس نظریے کے حامل جس انسان کو جانا گیا ہے وہ جہم بن صفوان اور اس کے رفقاء ہیں۔

دلیل فطری پر اعتراض:

❀ دلیل فطری پر اعتراض کیا گیا ہے کہ: [دعا میں ہاتھ اوپر کو اٹھانا] اس لیے ہے کہ آسمان دعا کا قبلہ ہے؛ جیسا کہ نماز کا قبلہ کعبہ ہے۔

❶ پھر یہ قانون اسی وقت الٹ جاتا ہے جب پیشانی زمین پر رکھی جاتی ہے؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ زمین کی جہت میں نہیں ہے؟۔

اس اعتراض کا جواب کئی طرح سے دیا گیا ہے:

اول: تمھارا یہ کہنا کہ آسمان دعا کا قبلہ ہے؛ سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے کسی ایک نے یہ بات نہیں کہی؛ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے اس کی کوئی دلیل نازل کی ہے۔ یہ مسئلہ شرعی دینی ہے؛ یہ جائز نہیں کہ اس قسم کا مسئلہ سلف امت اور ان کے تمام علماء سے پوشیدہ رہا ہو۔

دوم: دعا کا قبلہ وہی ہے جو نماز کا قبلہ ہے؛ اسلام میں دعا کرنے والے کے لیے مستحب ہے کہ وہ قبلہ رخ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بہت سارے مواقع پر دعا کرتے ہوئے قبلہ کی جانب منہ کرتے تھے ❷۔ پس جو کوئی کہتا ہے کہ دعا کا قبلہ نماز کے قبلہ کے علاوہ ہے؛ یا اپنے دو قبلے بتاتا ہے؛ ایک قبلہ کعبہ اور دوسرا آسمان؛ تو یقیناً اس نے دین بدعت ایجاد کی اور مسلمانوں کے اجماع کی مخالفت کی۔

☼ حدیث صحیح ہے۔ مفتق عليه .

❋ ۔ صحیح: اس سلسلہ میں بہت ساری احادیث وارد ہوئی ہیں؛ ان میں سے ایک روایت یہ ہے: حضرت عبداللہ تعالیٰ بن زید فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز استسقاء کے لیے نکلے اور عیدگاہ تشریف لائے؛ آپ نے دعا کی اور بارش مانگی۔ پھر آپ نے قبلہ کی طرف منہ کیا''۔ متفق علیہ۔ اس کو امام بخاری نے کتاب الدعوات کے اس باب میں نقل کیا ہے: ''باب الدعاء مستقبل القبلة''۔ وضاحت کے لیے ابن القیم کی کتاب مختصر الموصلی للصواعق المرسلة (۲/ ۵۱) دیکھیں۔

سوم: قبلہ اس کو کہتے ہیں جس کی طرف عابد منہ کرتا ہے؛ جیسا کہ نماز اور دعا کے وقت؛ ذکر اور ذبح کے وقت کعبہ کی جانب منہ کیا جاتا ہے؛ اور جیسے مرنے والے کو اور دفن کئے جانے والے کو کعبہ رخ کیا جاتا ہے۔ اس لیے قبلہ کا نام وِجهةً یعنی منہ موڑنے کی سمت بھی ہے۔ استقبال کا معنی استدبار کے معنی کے برعکس ہے۔ استقبال چہرہ اس طرف موڑ کر ہوتا ہے؛ اور استدبار پیٹھ پھیر کر۔ لیکن انسان کے سر ہاتھ پہلو کے برابر سامنے کو قبلہ نہیں کہا جاتا؛ نہ حقیقت میں نہ مجاز میں۔ اگر آسمان دعا کا قبلہ ہوتا تو پھر یہ مشروع ہونا چاہیے تھا کہ دعا کرنے والا اپنے چہرے کو آسمان کی جانب کرے؛ ایسا تو مشروع نہیں۔ اور جس سمت کو ہاتھ بلند کیے جاتے ہیں؛ اسے قبلہ نہیں کہا جاتا؛ نہ حقیقت میں نہ مجاز میں۔ دعا میں قبلہ [رخ ہونا] ایک شرعی چیز ہے جس میں شریعت ہی کی پیروی کی جاتی ہے۔ پیغمبروں نے اس بات کا حکم نہیں دیا کہ دعا کرنے والا اپنا منہ آسمان کی طرف کرے۔ بلکہ اس سے تو روکا ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ دل کے ساتھ توجہ کرنا؛ پناہ چاہنا؛ اور طلب کرنا جو دعا کرنے والے کے جی میں ہوتا ہے؛ یہ ایک فطری چیز ہے؛ مسلمان اور کافر؛ عالم اور جاہل سبھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ اکثر طور پر پریشان حال؛ اللہ تعالیٰ سے مشکل کشائی چاہنے والا؛ ایسے ہی کرتا ہے۔ جیسے اس کی فطرت میں یہ بھی ہے کہ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے۔ حالانکہ قبلہ کا معاملہ ان

معاملات میں سے رہا ہے جو نسخ [منسوخ ہونے] اور تحویل [تبدیلی] کو قبول کرتے ہیں۔ جیسا کہ صخرہ [بیت المقدس] سے کعبہ کی طرف تبدیل کیا گیا۔ لیکن دعا میں بلندی کی سمت توجہ کرنا ایک فطرتی معاملہ ہے۔ [نماز میں] قبلہ کی طرف رخ کرنے والا جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں پر [یعنی کعبہ کی عمارت میں/ یا مکہ میں] نہیں ہے؛ اس کے برعکس دعا کرنے والا؛ بے شک وہ اپنے رب اور خالق کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور امید کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت کا نزول ہوگا۔ اور یہ اعتراض کرنا پیشانی زمین پر رکھنا اس عقیدہ کا ناقض ہے؛ تو یہ کتنا ہی فاسد [اور باطل] ناقض ہے۔ بے شک پیشانی زمین پر رکھنے والے کا مقصد اس ذات کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کرنا اور جھکنا ہوتا ہے جو اس کے اوپر ہے۔ نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے نیچے ہے؛ اور وہ اس کی طرف جھک رہا ہے۔ کسی سجدہ کرنے والے کے دل میں کبھی ایسا خیال بھی نہیں آتا۔ البتہ بشر مریسی معتزلی سے منقول ہے؛ اسے سنا گیا؛ وہ سجدہ کی حالت میں کہہ رہا تھا: ''سبحان ربی الاسفل ''میرا رب پاک ہے جو نیچے ہے''۔ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے بلند ہے جو ظالم اور منکر کہتے ہیں؛ بہت ہی زیادہ بلند ہے۔

اور بے شک جس شخص کو انکار نے اس حال تک پہنچا دیا ہو؛ وہ اس بات کا حق دار کہ وہ زندیق ہو جائے۔ اگر اس کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت بچا نہ لے؛ تو اس جیسے کی اصلاح بہت بعید کی بات ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ نُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (الانعام: ۱۱۰)

''اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو الٹ دیں گے جیسے یہ اس پر پہلی دفعہ ایمان ہی نہیں لائے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ (الصف: ۵)

''پس جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔''

جو شخص ہدایت کو اس کی جگہ سے طلب نہیں کرتا؛ اس کا انجام محرومی ہے۔ نسأل اللہ تعالیٰ العفو والعافیة.

[رؤیت اور علم سے احاطہ کی نفی]

علامہ طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: ''مخلوق اس کے احاطہ سے عاجز ہے؛ یعنی لوگ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے نہ ہی علم کے اعتبار سے اور نہ ہی رؤیت کے اعتبار سے۔ اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی اور لحاظ سے اس کا احاطہ ہوسکتا ہے۔ بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے؛ اس کا کسی چیز نے احاطہ نہیں کیا ہوا''[1]۔

[1]۔ پس بندے اپنے رب کو اپنی فطری معرفت کی وجہ سے جانتے ہیں۔ اور دوسرا ذریعہ علم رسولوں کی بعثت ہے جنہوں نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بتایا اور اس کی توحید کی دعوت دی۔ ایسے ہی بندے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا احاطہ بھی نہیں کر سکتے۔ اور نہ ہی وہ اس کی ذات کی یا اس کی صفات کی کیفیت کو جانتے ہیں۔

[اللہ تعالیٰ کے لیے صفت کلام اور خلت کا اثبات]

۵۲۔((وَنَقُولُ :إِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَ إِبْرَاهِيْمَ خَلِيلاً وَّكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيْماً إِيْمَاناً وَّتَصْدِيْقًا وَتَسْلِيْماً .))

''ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا ہم کلام ہو کر؛ اس پر ہمارا ایمان ہے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کو تسلیم کرتے ہیں''۔

تشریح: ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ (النساء: ۱۲۵)

''اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ (النساء: ۱۶۴)

''اور اللہ تعالیٰ موسیٰ سے ہم کلام ہوا۔''

ان دونوں آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے خلت اور تکلیم کی صفات کے ساتھ ساتھ ان دونوں انبیاء کرام علیہم السلام کی فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے۔ اور یہی فضیلت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ثابت ہے۔ صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے ہی خلیل بنایا ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا تھا''۔ [رواہ مسلم ۵۳۲]

اور ایک دوسری روایت میں ہے؛ ارشاد فرمایا: ''بے شک تمہارا یہ ساتھی اللہ تعالیٰ کا خلیل ہے''۔ [مسلم ۲۳۸۳]

اہل سنت والجماعت اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کو بھی ایسے ہی ثابت مانتے ہیں جیسے اس کے لیے کلام کی صفت کو ثابت مانتے ہیں۔ خلت محبت میں کمال درجہ کا نام ہے۔ جو کہ اس کا اعلیٰ ترین مقام شمار ہوتا ہے۔

خلت کمال محبت کا نام ہے۔ لیکن جہمیہ نے جانبین سے محبت کی حقیقت کا انکار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ محبت کے لیے محبّ اور محبوب کے درمیان مناسبت کا ہونا ضروری ہے۔ جبکہ قدیم اور محدث کے درمیان کوئی ایسی مناسبت نہیں جو اس محبت کو واجب کرتی ہو۔ اسی طرح جہمیہ نے [اللہ تعالیٰ کے] کلام [کرنے] کی حقیقت کا بھی انکار کیا ہے۔ اسلام میں پہلا وہ شخص جس نے اس بدعت کو رائج کیا وہ جعد بن درہم [م ۱۱۸ھ] ہے؛ دوسری صدی کے آغاز میں۔ خالد بن عبداللہ القسری (۶۶-۱۲۶ھ) امیر عراق اور مشرق نے اسے شہر واسط میں ذبح کر دیا تھا۔ اس نے عید الاضحیٰ کے دن لوگوں کو خطبہ دیا؛ اور کہا:

''اے لوگو! تم قربانی کرو، اللہ تعالیٰ تمھاری قربانیوں کو قبول فرمائے۔ لیکن میں تو جعد بن درہم کی قربانی کرنے والا ہوں۔ اس کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست نہیں بنایا اور نہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی ہے''۔ پھر وہ

نیچے اترا اس نے جعد کو ذبح کر دیا۔

اس زمانے کے تابعین علماء رحمہم اللہ کے فتویٰ کی روشنی میں جعد کو ذبح کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ خالد بن عبداللہ تعالیٰ کو دین اور دین والوں کی طرف سے بہتر بدلہ دے۔

جعد کے بعد جہم بن صفوان نے اس کے مذہب کا پرچار کیا۔ اور اس کی اشاعت کی؛ اور اس پر مناظرے کئے۔ اسی لیے جہمیہ کا مذہب اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کو بھی امیر خراسان مسلم بن احوز نے خراسان میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد یہ مذہب معتزلہ کی طرف منتقل ہوگیا؛ جو کہ عمرو بن عبید (۸۰-۱۴۴ھ) کے پیروکار ہیں۔ مامون (۱۷۰-۲۱۸ھ) کے دورِ خلافت میں ان عقائد کو عروج حاصل ہوا۔ حتی کہ اس دور میں ائمہ اسلام کو بھی مبتلائے آزمائش ہوئے۔ اور انہیں معتزلہ کی موافقت پر مجبور کیا گیا۔

جھمیه کے عقائد درحقیقت مشرکین اور صابیہ سے ماخوذ ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے خلیل تھے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے کلیم تھے، اس لیے کہ خلت ایسی کامل محبت کا نام ہے کہ اس میں محبّ اس محبت میں مستغرق ہوتا ہے۔ جیسا کہا گیا ہے [شعر:]

قد تخللت مسلك الروح منی ولذا سمی الخليل خليلا

''میرے جسم میں تیری محبت اس طرح سرایت کر گئی ہے۔ جیسا کہ روح میرے جسم میں سرایت کر چکی ہے۔ اسی محبت کے پیش نظر خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے۔''

لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت اور خلت تو اسی طرح ہے جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی دوسری تمام صفات ہیں۔ آیت کریمہ کے مدلول کی گواہی صحیح حدیث ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اگر میں نے زمین والوں سے کسی کو اپنا خلیل بنانا ہوتا تو میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیل بناتا۔ لیکن آپ کا یہ ساتھی تو اللہ تعالیٰ کا خلیل ہے''۔ ❶ [ساتھی سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔]

❶ حدیث صحیح ہے۔ بخاری كتب الخصومات (۲/ ۸۹)ح:۳۵۵٤، مسلم، كتاب الفضائل (۷/ ۱۰۱)۲۳۸۳، مسند احمد (۲/ ۲٦٤).

ایک دوسری روایت میں ہے: ''میں کسی سے بھی خلت کا تعلق نہیں رکھتا میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ اگر میں نے زمین والوں سے کسی کو اپنا خلیل بنانا ہوتا تو میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیل بناتا''۔ [مسلم ۲۳۸۲]

ایک روایت میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے ہی خلیل بنایا ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا تھا''۔

یہ واضح ہوگیا کہ آپ کے لیے مخلوق میں سے کسی کو خلیل بنانا مناسب نہیں تھا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو اس کے سب سے زیادہ حقدار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وضاحت فرمادی ہے کہ مجھے چند انسانوں سے محبت ہے۔ مثلاً آپ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اللہ تعالیٰ کی قسم مجھے تجھ سے محبت ہے''۔ ❶

❶ حدیث صحیح ہے مسند احمد۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح کہا۔ صحيح ابو داؤد (رقم: ١٣٦٢).

اسی طرح آپ نے انصار سے کہا کہ: ''مجھے تم سے محبت ہے''۔ ❶

نیز حضرت زید بن حارثہ اوران کا بیٹا اسامہ رضی اللہ عنہما دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب تھے۔اس کی مثالیں کافی ہیں۔

چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے آپ سے دریافت کیا: لوگوں میں سے کون آپ کو زیادہ پیارا ہے؟۔

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عائشہ رضی اللہ عنہا''۔

پھر آپ سے دریافت کیا: ''مردوں میں سے کون؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کا باپ''۔ ❷

❶ بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کی طرف اشارہ ہے؛ آپ فرماتے ہیں: ''ایک انصاری عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی؛ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا؛ تو آپ نے اس سے گفتگو کی؛ اور دو بار ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! آپ لوگ مجھے لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب ہو''۔[بخاری 3786 مسلم 2509]

❷ بخاری 3662، مسلم 2384۔ حديث عمرو بن العاص .

معلوم ہوا کہ خلت کا مقام مطلق محبت سے کہیں زیادہ خاص ہے۔جس شخص سے خلت کے انداز کی محبت ہوتی ہے، وہ کامل محبت ہے۔اوراس کی ذات کی وجہ سے محبت ہوتی ہے؛ کسی دوسری چیز کی وجہ سے نہیں ہوتی۔اس لیے جس کو [کسی سے] محبت کسی دوسری چیز کی وجہ سے ہوتی ہے؛ وہ محبت میں اس چیز سے پیچھے ہوتا ہے۔جبکہ خلت [کامل محبت] کا کمال یہ ہے کہ یہ نہ شرکت اور مزاحمت کو قبول نہیں کرتی۔کیونکہ محبت تو سرایت کر چکی ہوتی ہے۔اس میں کمال توحید بھی ہے اور کمال محبت بھی۔[مجموع الفتاوی ۱۰/۶۶]

یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے درخواست کی کہ اسے نیک لڑکا عطا کرے،تو اللہ تعالیٰ نے انھیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا عطیہ دیا۔حضرت اسمٰعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں کچھ جگہ بنالی۔تو خلیل کو اپنے خلیل کے دل میں دوسرے کے لیے اس جگہ پر غیرت ہوئی۔تو اللہ تعالیٰ نے امتحان لیا کہ وہ بچے کو ذبح کرے تا کہ پتہ چلے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی محبت کو مقدم رکھتے ہیں یا اپنے خلیل کی محبت کو ترجیح دیتے ہیں۔لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے رب کے حکم پر سر تسلیم خم ہو گئے؛ اور بچے کو ذبح کرنے عزم کر لیا؛ تو بیٹے کو ذبح کرنے کی تیاری سے اس خالص محبت کی دلیل ظاہر ہو گئی کہ آپ اپنے رب کی محبت/ خالص دوستی کو بیٹے کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں؛ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم کو منسوخ کر دیا۔اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بدلے اس کا فدیہ ایک بہت بڑی قربانی کی صورت میں بھیج دیا۔ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عزم بتا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہیں؛ اور آپ کا دل اس حکم کی تعمیل پر مطمئن ہے۔جب مصلحت حاصل ہو گئی تو اب ایک جان کو ذبح کرنے خرابی تھی۔تو اس لیے یہ حکم ان کے حق میں منسوخ کر دیا۔اور قیامت تک کے لیے ذبح؛ قربانی اور ہدی کو آپ کے پیروکار میں ایک سنت مقرر کر دیا گیا''۔[جلاء الأفہام ۲۷۴]

اور جس طرح خلت کا وصف حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ثابت ہے؛ اس وصف میں ان کے ساتھ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہیں؛ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے لیے کلام کرنے کا مقام ثابت ہے؛ اور اس میں بھی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہیں۔جیسا کہ اسراء کی حدیث میں اس کا ذکر موجود [اور ثابت] ہے۔

ایک سوال اوراس کا جواب:

[سوال]: یہاں پر ایک مشہور سوال ہے کہ: اس میں کچھ شک نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے افضل ہیں؛ تو پھر درود

شریف میں یوں کیوں کہا جاتا ہے: ''ان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا درود بھیج''۔ حالانکہ مشبہ بہ اصل میں مشبہ سے اوپر ہوتا ہے؟۔ اوران دونوں متنافی امور کے درمیان جمع کیسے ممکن ہے؟۔ [جلاء الأفہام ۲۷۸]

[جواب]: علماء نے اس سوال کے متعدد جواب دیئے ہیں؛ یہ جگہ ان تمام جوابات کا احاطہ کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ ان میں سب سے احسن جواب یہ ہے کہ: ''آل ابراہیم میں متعدد انبیائے کرام علیہم السلام داخل ہیں جبکہ آل محمد میں کوئی نبی داخل نہیں؛ ظاہر ہے جب یہ طلب کیا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر بھیجا جانے والا درود اس درود کے مماثل ہو؛ تو جو درود حضرت ابراہیم اور آل ابراہیم پر بھیجا گیا ہے؛ اس میں تو آل ابراہیم میں انبیاء کی شمولیت ہے؛ پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کے لیے بھی وہی کچھ حاصل ہوتا ہے جو ان کے لیے مناسب ہے۔ اس لیے کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو انبیاء کے مراتب کو نہیں پہنچ سکتے۔ اوران کے لیے وہ خیر و برکت باقی رہتی ہے؛ جو ان انبیائے کرام علیہم السلام کے لیے ہے۔ اور آل ابراہیم میں تو آپ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں؛ تو اس بنا پر آل محمد کو وہ خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے؛ جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔

❀ اس سے بھی زیادہ بہترین جواب یہ بھی ہے کہ: حضرت ابراہیم کی اولاد میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں؛ بلکہ آپ آل ابراہیم میں دیگر حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے افضل ہیں۔ تو اس صورت میں ہمارا یہ کہنا: ''کما صلیت علی آل ابراهیم'' صلاۃ وسلام میں آپ کو بھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دیگر آل کو بھی شامل ہوگا؛ اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی شامل ہوگا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ إِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (آل عمران: ۳۳)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو جہان والوں پر منتخب کرلیا ہے۔''

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام آل ابراہیم میں اور حضرت عمران علیہ السلام آل عمران میں داخل ہیں؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِلَّا آلَ لُوطٍ نَّجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ﴾ (القمر: ۳۴)

''سوائے لوط کے گھر والوں کے، انھیں ہم نے بوقت سحر نجات دی۔''

آل لوط میں حضرت لوط علیہ السلام بھی داخل ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ (البقرة: ٤٩)

''جب ہم نے تم کو قوم فرعون سے نجات دلائی۔'' اور فرمان الٰہی ہے:

﴿اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۝﴾ (المومن: ٤٦)

''فرعون والوں کو سخت عذاب میں داخل کرو۔''

بے شک فرعون بھی آل فرعون میں داخل ہے''۔

یہی وجہ ہے کہ - واللہ تعالیٰ اعلم - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود والی حدیث کے اکثر طرق میں (علی آل ابراهیم) کے الفاظ ہیں۔ جبکہ کثیر طرق میں علیٰ ابراہیم کے الفاظ موجود ہیں۔ اور بہت کم روایات میں (کما صلیت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ [1]

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ (کما صلیت علی ابراهیم) میں حضرت ابراہیم کی آل آپ کی اتباع میں داخل شمار ہوتی ہے۔ اور (کما صلیت علی آل ابراهیم) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شامل ہیں۔ اوراسی طرح وارد ہے کہ جب حضرت ابواوفی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں صدقہ لے کر حاضر ہوئے؛ تو نبی کریم ﷺ نے ان کے حق میں دعا کرتے ہوئے فرمایا: (اللھم صل علی آل أبی أوفی) ''اے اللہ! آل ابی اوفی پر رحمت فرما❷۔''

❶ تفصیل کے لیے علامہ البانی کی کتاب صفة الصلاۃ (ص: ۱٤۷) کا مطالعہ کریں۔
❷ حدیث صحیح ہے۔ بخاری، حدیث عبد الله تعالیٰ بن ابی اوفیٰ.

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان تمام عالم کے خاندانوں میں اشرف [وافضل] تھا؛ اللہ تعالیٰ نے اس خاندان کو نہایت عمدہ خصوصیات سے نوازا تھا۔ ان میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ: ان میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کوئی بھی پیغمبر ایسا نہیں آیا جو آپ کی اولاد [اہل بیت] میں سے نہ ہو۔

دوسری خصوصیت: اللہ تعالیٰ نے ان کو پیشوائے ہدایت بنایا تھا؛ جو قیامت تک اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق راہ ہدایت دیکھاتے رہیں گے۔ پس ان کے بعد جو بھی اللہ تعالیٰ کا دوست جنت میں داخل ہوگا؛ تو یقیناً وہ ان کے ذریعہ سے اوران کی دعوت کے نتیجہ میں جنت میں داخلہ ہوگا۔

تیسری خصوصیت: اللہ تعالیٰ نے ان میں سے دو خلیل بنائے تھے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

چوتھی خصوصیت: اس گھر کے مالک اللہ تعالیٰ نے انھیں لوگوں کا پیشوا بنایا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَo﴾(البقرة: ١٢٤)

''بے شک میں آپ کو لوگوں کا پیشوا بنانے لگا ہوں۔ انھوں نے کہا: میری اولاد میں سے بھی (پیشوا بنائیو)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ہمارا اقرار ظالموں کے لیے نہیں ہوا کرتا۔''

پانچویں خصوصیت: اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں وہ گھر تعمیر کرایا؛ جس گھر کو لوگوں کے لیے قیام گاہ [عبادت کی جگہ]؛ حصول ثواب اورامن کی جگہ بنایا ہے۔ اوراسے تمام عالم کا قبلہ اورحج کی جگہ بنایا ہے۔ تو اس گھر کا ظہور انتہائی عزت والے ہاتھوں سے ہوا۔

چھٹی خصوصیت: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اس گھر والوں پر درود بھیجیں۔ [جلاء الأفہام ۳۰۹]

ان کے علاوہ بھی بہت ساری خصوصیات ہیں۔

[ملائکہ؛ انبیاء اور کتابوں پر ایمان لانے کا وجوب]

۵۳۔((وَنُؤْمِنُ بِالْمَلائِکَةِ وَالنَّبِیِّیْنَ وَالْکُتُبِ الْمُنْزَلَةِ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَنَشْهَدُ أَنَّهُمْ کَانُوا عَلَی الْحَقِّ الْمُبِینِ .))

''ہم فرشتوں پر اور انبیاء علیہم السلام پر؛ رسولوں پر نازل کردہ کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں؛ اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک وہ واضح حق پر تھے''۔

تَشرِیح:...... مذکورہ امور ایمان کے ارکان میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ﴾ (البقرة: ۲۸۵)

''رسول اس کتاب پر جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی سب اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ لٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِکَةِ وَ الْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ....﴾ (البقرة: ۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق و مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ پر فرشتوں پر اور اللہ تعالیٰ کی کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں۔''

پس اللہ تعالیٰ نے ان مذکورہ بالا امور پر اجمالی ایمان کو ہی اصل ایمان قرار دیا ہے۔ اور جو کوئی ان پر اجمالی طور پر ایمان لے آئے؛ اسے مومن کا نام دیا ہے۔ جیسا کہ ان کا اجمالی طور پر انکار کرنے والوں کو کافر قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی ہے:

﴿وَ مَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا﴾ (النساء: ۱۳۶)

''اور جو شخص' اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں سے اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں اور روز قیامت سے انکار کرے تو وہ رستے سے بھٹک کر دور جا پڑا۔''

نیز متفق علیہ حدیث؛ جسے حدیث جبریل کے نام سے جانا جاتا ہے؛ میں ارشاد نبوی ہے:

''جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ سے ایمان کے متعلق سوال کیا؛ تو آپ نے فرمایا: ''یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے۔ نیز اچھی بری سب تقدیر پر ایمان لائے''۔ [1]

پس ان اصولوں پر تمام پیغمبروں اور رسولوں کا اتفاق ہے اور ان پر حقیقی ایمان صرف رسولوں کے پیرو کاروں کا ہے۔

۞ متفق علیہ۔ البخاری ۵۰؛ مسلم ۸؛ من حدیث ابی ہریرۃ.

[فلاسفہ اور دیگر اہل بدعت کے نظریات]:

جبکہ اہل سنت کے دشمنان اور ان کی راہوں پر چلنے والے فلاسفہ اور اہل بدعت؛ ان اصولوں کا انکار کرنے میں مختلف [درجات پر] ہیں۔ ان امور کے لوگوں میں سب سے بڑے منکر فلاسفہ ہیں؛ جن کی تعظیم کرنے والے ان کو حکماء کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بیشک جو کوئی ان کے عقیدہ کی حقیقت جانتا ہے؛ اسے علم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں، اور اس کے فرشتوں اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مجرد وجود ہے جس کی نہ کوئی ماہیت ہے اور نہ کوئی حقیقت۔ اور وہ جزئیات کے اعیان کا علم نہیں رکھتا۔ اور خارج میں موجود ہر چیز جزئی ہے۔ اور ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور مشیئت کے ساتھ کوئی کام نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک تمام عالم اللہ تعالیٰ کو ازلاً ابداً لازم ہے۔ اگرچہ وہ اہل سنت کے ساتھ مصالحت اور اتفاق کے اظہار کے لیے بظاہر اس کو لفظی طور پر مفعول لہ کا نام دے بھی دیں؛ وہ درحقیقت ان کے ہاں نہ تو مفعول لہ ہوتا ہے نہ ہی مخلوق اور نہ ہی مقدور۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی صفات سمع؛ بصر اور دیگر تمام صفات کی نفی کرتے ہیں۔ یہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے۔ جہاں تک کتب الٰہیہ پر ایمان کی بات ہے؛ تو وہ اللہ تعالیٰ کو وصف کلام سے موصوف نہیں کرتے؛ نہ ہی اس نے کبھی کلام کیا؛ اور نہ ہی کبھی وہ کلام کرتا ہے۔ نہ ہی اس نے کچھ کہا ہے؛ نہ ہی کچھ کہے گا۔ ان کے نزدیک قرآن پاک ایسا فیض ہے جو عقل فعال میں سے سب سے پاکباز اور پاکیزہ ہستی کے دل پر نازل ہوا ہے۔

اور وہ [اللہ تعالیٰ کو] نوع انسانی سے تین خصوصیات کی وجہ سے ممتاز اور جداگانہ حیثیت کا حامل سمجھتے ہیں:

۱۔ قوتِ دراک اور سرعت: تاکہ وہ ان تمام سے بڑھ کر علم حاصل کر سکے جو کوئی دوسرا حاصل کرے گا۔

۲۔ قوت نفس: تاکہ اس قوت کی وجہ سے وہ کائنات عالم پر اثر انداز ہو؛ اور ہیولیٰ عالم کو ایک سے دوسری شکل میں بدل سکے۔

۳۔ قوت تخیل: [خیالات کی طاقت]: تاکہ وہ عقلی قوتوں کو اشکال محسوسہ میں خیال کر سکے [یعنی عقلی قوت کو حقیقی شکل میں بدل دے]۔ یہ [عقلی قوتیں] ان کے ہاں فرشتے ہیں۔ [ان کے ہاں] خارج میں ان کی کوئی ایسی جداگانہ ذات موجود نہیں جو [آسمان کی طرف] چڑھتی ہو اور نزول کرتی ہو؛ آتی اور جاتی ہو؛ دیکھتی ہو؛ اور رسولوں سے مخاطب ہوتی ہو۔ ان کے نزدیک یہ صرف ذہنی امور ہیں؛ ان کا اعیان میں کوئی وجود نہیں۔ جہاں تک آخرت پر ایمان کی بات ہے؛ تو وہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر آخرت کو جھٹلاتے اور اس کی حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق یہ دنیا خراب نہیں ہوگی۔ نہ آسمان پھٹیں گے؛ نہ ہی اس کے ٹکڑے ہوں گے۔ نہ ہی ستارے گریں گے، اور نہ ہی سورج اور چاند لپیٹے جائیں گے۔ نہ ہی لوگ قبروں سے اٹھیں گے اور نہ ہی جنت دوزخ کی جانب روانہ کیے جائیں گے۔ ان کے ہاں یہ سب کچھ تمثیلات ہیں صرف عوام کو سمجھانے کے لیے باتیں بنائی گئی ہیں؛ خارج میں ان کی کچھ حقیقت نہیں جیسے رسولوں کے ماننے والے سمجھتے ہیں۔ خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ پر؛ اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دین پر اس ذلیل وحقیر گروہ کے ایمان کا یہ حال ہے۔ گویا کہ یہ لوگ دین

کے پانچ بنیادی اصولوں [اصول خمسہ] کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

معتزلہ کے نظریات:

معتزلہ نے بھی [ان پانچ بنیادی اصولوں] کو اپنے ان پانچ اصولوں سے بدل ڈالا جن کی وجہ سے انہوں نے کافی سارے دین کو منہدم کر دیا۔ بے شک انہوں نے اپنے دین کی بنیاد جسم اور عرض پر قائم کی ہے۔ان کے نزدیک جسم موصوف اور عرض صفت ہے۔اور انہوں نے صفات [اعراض] موصوف [جسم] کے مخلوق ہونے پر بطور دلیل پیش کیا ہے۔

اسی اصول کو بنیاد بنا کر انہوں نے مسئلہ توحید پر کلام کیا ہے؛ اور اللہ تعالیٰ سے ہر صفت کی نفی کر دی ہے تاکہ موصوفات یعنی اجسام میں موجود صفات سے [اللہ تعالیٰ کی صفات کی] مشابہت [تشبیہ لازم] نہ ہو۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے افعال میں بھی بحث کی؛ [افعال سے] مراد تقدیر ہے۔ وہ تقدیر کو عدل کہتے ہیں۔ پھر وہ مسئلہ نبوت، شرائع اوامر، نواہی، وعد وعید میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔ یہ اسماء اور احکام کے مسائل ہیں؛ اسے وہ دو منزلوں کی درمیانی منزل (منزلة بين منزلتين) کا نام دیتے ہیں۔ یہ وعید کے نفاذ کا مسئلہ ہے۔ پھر وہ دوسروں پر اس کے لازم ہونے کو (الزام الغير بذلك) زیر بحث لائے۔ یہ دراصل اور امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا مسئلہ ہے۔ پھر [تشدد کرتے ہوئے] حکمرانوں کے خلاف بغاوت اور ان سے جنگ کے جائز ہونے کو بھی اس بحث میں شامل کر لیا۔ ان کے ہاں یہ پانچ اصول ہیں؛ جو ان پانچ اصولوں کو مقابلہ میں ہیں جنہیں دیگر رسولوں کو مبعوث کیا گیا تھا۔

جبکہ متاخرین روافض نے ان کو صرف چار اصول قرار دیا ہے: توحید، عدل، نبوت، امامت۔

اہل سنت والجماعت کے اصول:

اہل سنت والجماعت کے اصول رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے تابع ہیں۔ دین کی بنیاد ہی رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان رکھنے پر قائم ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان گزر چکا۔ اسی لیے سورۃ بقرہ کے آخر کی دو آیات؛ جو ان عظیم الشان اصولوں کو شامل ہیں۔ ان دو آیات کی وہ شان ہے جو دوسری آیات کی نہیں۔ صحیحین میں حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص رات کو سورہ بقرہ کے آخر کی دو آیات کی تلاوت کرتا ہے وہ اس کو کافی ہو جاتی ہیں'' [1]

نیز صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں:

''ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام جناب نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف فرما تھے تو انھوں نے آسمان سے ایک آواز سنی۔ جبریل علیہ السلام نے سر آسمان کی جانب اٹھایا اور کہا: ''آسمان کا جو دروازہ آج کھولا گیا ہے وہ آج سے قبل کبھی نہیں کھلا''۔ اور اس سے ایک فرشتہ نازل ہوا؛ تو [جبریل علیہ السلام نے] کہا: ''یہ جو فرشتہ زمین پر نازل ہوا ہے؛ یہ آج سے قبل کبھی نازل نہیں ہوا۔ اس [فرشتے] نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا؛ اور بشارت دی کہ: ''آپ کو دو نور عطا ہوئے ہیں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے؛ ایک نور سورت فاتحہ ہے دوسرا نور سورۃ بقرہ کی آخری آیات ہیں''۔ آپ ان دونوں نوروں میں سے کسی ایک

حرف کی تلاوت ہرگز نہیں فرمائیں گے؛ مگر آپ کو وہی کچھ دیا جائے گا''۔ ❷

❶ صحیح: متفق علیہ۔ صحیح الجامع (٦٣٤١). البخاری ٤٠٠٨؛ مسلم ٨٠٨.

❷ صحیح مسلم (٢/ ١٩٨).

ابو طالب مکی رحمہ اللہ کا قول: آپ فرماتے ہیں: ''ایمان کے سات رکن ہیں پانچ کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے؛ اور باقی دو سے مراد تقدیر پر ایمان اور جنت اور جہنم پر ایمان ہے۔ یہ بات تو حق ہے۔ اس پر قطعی اور محکم دلائل موجود ہیں۔ مسئلہ توحید و رسالت کے دلائل کا ذکر اشارۃً پہلے ہو چکا ہے۔

فرشتوں کی ذمہ داریاں:

جب کہ فرشتوں کو آسمان، زمین میں کچھ کاموں کی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں۔ اس عالم میں جو حرکت ہوتی ہے اس کی ابتداء ان فرشتوں کی جانب سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا﴾ (النازعات: ٥)

''پھر (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرنے والے۔''

ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا﴾ (الذاریات: ٤)

''پھر حکم کی تقسیم کرنے والے۔''

اہل ایمان اور رسولوں کے متبعین کے نزدیک ان آیات میں مراد ملائکہ کا ذکر ہے۔ لیکن رسولوں کی تکذیب کرنے والے؛ اللہ کے منکرین کہتے ہیں: اس سے مراد ستارے ہیں۔ کتاب و سنت کی نصوص فرشتوں کی مختلف اقسام پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یہ کہ انہیں مختلف قسم کی مخلوقات پر ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ نے کچھ فرشتوں کو پہاڑوں کا ذمہ دار بنایا ہے؛ بعض کو بادلوں پر؛ کچھ فرشتے بارش پر مقرر ہیں؛ کچھ فرشتے عورت کے رحم پر مقرر ہیں؛ جو نطفہ کی تدبیر کرتے ہیں حتی کہ ان کی تخلیق پوری ہو جاتی ہے۔ پھر ہر انسان کے ساتھ کچھ فرشتے مقرر ہیں جو اس کے اعمال محفوظ کرتے ہیں؛ انہیں شمار کرتے ہیں اور لکھ رکھتے ہیں۔ نیز کچھ فرشتے موت پر اور کچھ قبر میں سوال و جواب پر مقرر ہیں۔ کچھ فرشتے افلاک پر مقرر ہیں جو انہیں حرکت دیتے ہیں۔ کچھ فرشتے سورج، و چاند پر، اور کچھ فرشتے دوزخ، اور اس کو بھڑکانے پر؛ اور دوزخیوں کو عذاب دینے پر؛ اور اسے آباد مقرر رکھنے پر مقرر ہیں۔ نیز کچھ فرشتے جنت اور اس کی آبادی اور اس میں شجر کاری؛ اور وہاں کی چیزیں بنانے پر مقرر ہیں فرشتے اللہ تعالیٰ کا عظیم لشکر ہیں۔ ان کا ذکر قرآن پاک میں یوں ہے:

﴿وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا o فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا o وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا o فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا o فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا﴾ (المرسلات)

''ہواؤں کی قسم جو نرم نرم چلتی ہیں۔ اور بادلوں کو پھاڑ کر پھیلا دیتی ہیں۔ پھر ان کو پھاڑ کر جدا جدا کر دیتی ہیں۔ پھر فرشتوں کی قسم جو وحی لاتے ہیں۔''

اور ان میں سے کچھ فرشتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًاo وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًاo وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًاo فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًاo﴾(النازعات)

''ان فرشتوں کی قسم جوڈوب کر کھینچ لیتے ہیں۔اوران کی قسم جوآسانی سے کھول دیتے ہیں۔اوران کی قسم جوتیرتے ہیں۔پھر لپک کرآگے بڑھتے ہیں۔''

اور کچھ فرشتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿وَالصّٰفّٰتِ صَفًّاo فَالزّٰجِرَاتِ زَجْرًاo فَالتّٰلِیَاتِ ذِکْرًاo﴾ (الصافات : ۱۔۳)

''قسم ہے صف باندھنے والوں کی براجمان ہوکر پھرڈانٹنے والوں کی جھڑک کر پھرذکر پڑھنے والوں کی۔''

ان تمام آیات میں جمع مؤنث کے لفظ کا معنی: فرق[ٹولیاں]،طوائف[گروہ]اور[بڑی]جماعتیں ہیں[تمام جگہ جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں]؛جن کا مفرد فرقہ[ٹولی]طائفہ[گروہ]اور جماعت ہے۔

ان میں سے کچھ فرشتے رحمت پراور کچھ عذاب پر مامور ہیں؛اور کچھ فرشتوں کوعرش اٹھانے کی ذمہ داری ملی ہے۔اور کچھ فرشتوں کی ذمہ داری آسمانوں کونماز،تسبیح،اور تقدیس کے کلمات کے ساتھ معمور کرنا ہے۔ان کے علاوہ بے شمار فرشتے ہیں جن کا شمار اللہ تعالیٰ ہی کرسکتا ہے۔خیال رہے کہ لفظ(مَـلَك)یہ احساس دلارہا ہے کہ پیغام رساں؛اوراللہ تعالیٰ کے حکم کونافذ کرنے والا ہے؛اسے کسی قسم کا کوئی اختیار[من مرضی کا]نہیں۔اورتمام اختیارات اللہ تعالیٰ واحد غالب کے ہاتھ میں ہیں فرشتے تو صرف اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَo﴾ ....الی....﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ﴾(الانبیاء: ۲۷)

''اس کے آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے ہیں اوراس کے حکم پرعمل کرتے ہیں۔''......آگے تک......''وہ ان کے آگے اور پیچھے کا علم رکھتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَ هُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَo﴾(الانبیاء: ۲۸)

''اوروہ سفارش نہیں کرسکتے ہیں مگراس کی جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہواوروہ اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَo﴾ (النحل : ۵۰)

''اوروہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اوپر سے؛اور جوان کوحکم ملتا ہے اس پرعمل کرتے ہیں۔''

پس فرشتے اللہ تعالیٰ کے عزت والے بندے ہیں؛ کچھ صفیں باندھے ہیں؛ تو کچھ تسبیح کرنے والے ہیں۔ان میں کوئی ایسا نہیں جس کا مقام معلوم نہ ہو۔وہ اس جگہ سے نہیں ٹلتا۔اوراس کام پرلگا ہوا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے۔نہ اس سے کمی کرتا ہے نہ ہی زیادتی۔ان میں بلند مرتبہ وہ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا یَسْتَحْسِرُوْنَo یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَo﴾ (الانبیاء: ۱۹، ۲۰)

''وہ فرشتے جو اس کے پاس ہیں؛ وہ اس کی عبادت سے نہ شیخی کرتے ہیں اور نہ اکتاتے ہیں؛ رات دن تسبیح کرتے رہتے؛ اس میں وقفہ نہیں کرتے''۔

سب سے اونچے مرتبہ والے [ان کے سردار] تین فرشتے ہیں: جبرئیل علیہ السلام، اسرافیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام ہیں۔
یہ تینوں زندگی پر متعین ہیں۔ پس حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی پر متعین ہیں؛ جس سے قلب و روح کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اور حضرت میکائیل علیہ السلام بارش پر متعین ہیں جس سے زمین، نباتات، حیوانات کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اور حضرت اسرافیل علیہ السلام صور میں پھونک مارنے پر مقرر ہیں جس سے تمام مخلوق مرنے کے بعد زندہ ہو جائے گی''۔[إغاثه اللفهان ۲/ ۱۶۱]

پس یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں اس کے احکام کو مخلوق تک پہنچانے میں اس کے نمائندہ ہیں۔ وہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سفیر ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے احکام لیکر اُقطار عالم میں اترتے ہیں؛ اور [زمین سے] معاملات لیکر آسمانوں کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔ آسمان فرشتوں کی کثرت سے آواز کرتے ہیں اور حق بھی یہی ہے کہ وہ آواز کریں کسی آسمان پر بھی چار انگلی کے بقدر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی فرشتہ نہ ہو بلکہ کچھ حالت قیام میں کچھ حالت رکوع میں کچھ حالت سجود میں ہیں''۔[ابن ماجه ٤١٩٠]
اور وہ ان میں سے بیعت المعمور میں روزانہ ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں پھر ان کے داخل ہونے کی نوبت نہیں آئے گی''۔
البخاری ۳۲۰۷؛ مسلم ۱٦۲۔

قرآن پاک میں فرشتوں ان کی اصناف، ان کے مراتب کا کثرت کے ساتھ ذکر ہے۔[إغاثة اللفهان ۲/ ۱۷٦]
کبھی اللہ تعالیٰ اپنا نام ان کے نام کے ساتھ ملا کر لاتے ہیں؛ اور اپنی صلوٰۃ کا ان کی صلوٰۃ کے ساتھ ملا کر ذکر کرتے ہیں۔ اور کبھی مقام تشریف میں ان کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور کبھی ذکر کرتے ہیں کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے عرش کو ڈھانپ رکھا ہے۔ اور اسے اٹھائے ہوئے ہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے بہت قریب ہیں۔ اور کبھی ان کی عزت افزائی کرتے ہوئے ان کو شرف و کرم کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے۔ اور کبھی ان کے قرب، علو، طہارت، قوت، اخلاص جیسے اوصاف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ﴾ (البقرة: ۲۸۵)
''ہر ایک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لایا۔''
نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ﴾ (آل عمران: ۱۰۸)
''اللہ تعالیٰ تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ۔''
نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (الاحزاب: ٤۳)
''وہی جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لائے۔''
نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾

(غافر: ۷)

''جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرداگرد ہیں؛ وہ اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنوں کے لیے بخشش مانگتے رہتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿بَلۡ عِبَادٌ مُّکۡرَمُوۡنَ﴾ (الانبیاء: ۲۶)

''بلکہ وہ عزت والے لوگ ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِہٖ وَ یُسَبِّحُوۡنَہٗ وَ لَہٗ یَسۡجُدُوۡنَ﴾ (الاعراف: ۲۰۶)

''جو لوگ تمھارے رب کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے اور اس کے آگے سجدے کرتے رہتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنِ اسۡتَکۡبَرُوۡا فَالَّذِیۡنَ عِنۡدَ رَبِّکَ یُسَبِّحُوۡنَ لَہٗ بِالَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ ہُمۡ لَا یَسۡـَٔمُوۡنَ﴾(فصلت: ۳۸)

''اگر لوگ تکبر کریں تو جو تمھارے رب کے پاس ہیں وہ رات دن اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور (کبھی) تھکتے ہی نہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ﴾ (الانفطار: ۱۱)

''عزت والے منشی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ﴾ (عبس: ۱۶)

''عزت والے نیکوکار۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یَّشۡہَدُہُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ﴾ (المطففین: ۲۱)

''جس کے پاس مقرب (فرشتے) حاضر رہتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا یَسَّمَّعُوۡنَ اِلَی الۡمَلَاِ الۡاَعۡلٰی﴾ (الصافات: ۸)

''کہ وہ اوپر کی مجلس کی طرف کان نہ لگا سکے۔''

ایسے ہی احادیث مبارکہ میں فرشتوں کے ذکر سے بھرپور ہیں۔ اسی لیے فرشتوں پر ایمان لانے کو ایمان کے پانچ بنیادی اصولوں میں سے ایک رکن شمار کیا گیا ہے۔

[ملائکہ اور صالحین بشر میں افضلیت؟]:

علمائے کرام رحمہ اللہ علیہم نے ملائکہ اور صالحین بشر کے مابین مفاضلت [افضلیت] پر گفتگو کی ہے۔ اہل سنت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ وہ صرف انبیاء صلحاء کو فرشتوں پر فضیلت دیتے ہیں۔ معتزلہ فرشتوں کو فضیلت دیتے ہیں۔ اور اشاعری پیروکاروں کے اس میں دو قول ہیں: ان میں سے بعض انبیاء واولیاء کو فضیلت دیتے ہیں۔ اور بعض توقف اختیار کرتے ہیں۔ قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہتے۔ اور بعض سے حکایت کیا گیا ہے ان کا رجحان فرشتوں کی فضیلت کا ہے۔ یہ قول بعض اہل سنت اور صوفیاء کا ہے۔

شیعہ کہتے ہیں: تمام ائمہ تمام فرشتوں سے افضل ہیں۔ کچھ حضرات نے ایک اور تفصیل بیان کی ہے۔ جن حضرات کا قول حجت سمجھا جاتا ہے؛ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ فرشتے بعض انبیاء سے افضل ہیں۔ بعض انبیاء سے نہیں۔ مجھے اس مسئلہ میں کلام کرنے میں تردد رہا۔ اس لیے کہ اس میں فائدہ بہت کم تھا۔ اور یہ اختلاف لایعنی باتوں سے زیادہ قریب ہے۔ اور ''انسان کے حسن اسلام میں سے ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دے''۔ [1]

یاد رہے شیخ رحمہ اللہ نے اس پر نفی یا اثبات میں کچھ بھی نہیں کہا۔ غالباً آپ نے عمداً اس پر بحث نہیں کی۔ اس لیے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں توقف اختیار کیا ہے؛ جیسا کہ مآل [2] الفتاویٰ میں اس کا ذکر ہے۔ وہاں اس نے چند مسائل کا ذکر کیا ہے جن کا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے قطعیت کے ساتھ جواب نہیں دیا۔ ان میں فرشتوں اور پیغمبروں میں کے مابین افضلیت کا مسئلہ بھی ہے۔ اس مسئلہ میں صحیح اور حق راہ یہی ہے۔ بے شک ہم پر یہ واجب فرشتوں اور انبیاء پر ایمان لانا ہے۔ ہم پر یہ عقیدہ رکھنا ضروری نہیں کہ ان میں سے کون افضل ہے؟۔ اگر اس کا جاننا ہمارے لیے ضروری ہوتا تو ہمیں نصوص کی روشنی میں اس کو بیان کیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

[1] حدیث صحیح ہے۔ مسند احمد ۱۷۳۶۔ الترمذی ۲٤۳۳ کثیر صحابہ کرام سے یہ روایت مروی ہے۔ الروض النضیر (۲۹۳، ۳۲۱)

[2] مال الفتاوی کے متعلق کشف الظنون میں ہے کہ یہ کتاب امام ناصر الدین سمرقندی حنفی رحمہ اللہ علیہ کی تالیف ہے اس نے اس کتاب کو سن ۵٤۹ ہجری شعبان میں مکمل کیا۔ نسخہ ظاہریہ ۷۷۷۷۔

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ﴾ (المائدہ: ۳)

''آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِیًّا﴾ (مریم: ٦٤)

''تیرا رب بھولتا نہیں ہے۔''

صحیح حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض فرض فرمائے ہیں؛ ان کو ضائع نہ کرو۔ اور کچھ حدود متعین فرمائی ہیں؛ ان سے تجاوز نہ کرو۔ کچھ محرمات کیے ہیں؛ ان کو حلال نہ جانو۔ اور کچھ باتوں سے خاموشی اختیار کی ہے؛ -تم پر مہربانی کرتے ہوئے بھول کر نہیں- ان کے بارے میں سوال نہ کرو''۔ [1]

[1] حسن لغیرہ ھے دارقطنی ۱۸٤۱٤ وغیرہ۔ غایة المرام (٤). مستدرك الحاكم ٤/ ١١٥.

پس جب یہ حال ہے تو بہتر یہی ہے کہ اس مسئلہ میں نفی یا اثبات میں کلام کرنے سے خاموشی اختیار کی جائے۔ یہ کہنا مناسب نہیں

کہ یہ مسئلہ بھی ان دیگر مسائل کی طرح ہے جن کا کتاب وسنت سے استنباط کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں پر دونوں طرف کثرت کے ساتھ دلائل موجود ہیں۔ اگر توفیق ایزدی شامل حال ہوئی تو ہم ان کا اشارتاً ذکر کریں گے۔ ان شاءاللہ۔[مجموع الفتاوی ٤/ ٣٥٠]

بعد ازاں بعض جاہل بے ادب لوگوں کے رویہ نے مجھے مجبور کر دیا کہ اس پر تفصیلی بحث کی جائے۔ بعض لوگ بے ادبی کرتے ہوئے کہتے تھے: [جبرئیل علیہ السلام] فرشتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم تھا۔ یا بعض فرشتے بنی آدم کے خدام ہوتے ہیں؛ اس سے ان کی مراد وہ فرشتے ہوتے ہیں جن کی ذمہ داریاں بشر کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اسی قسم کے کلمات خلاف شرع بھی ہیں اور ادب سے بھی بہت دور ہیں۔ اگر پیغمبروں کی فرشتوں پر فضیلت کا سبب حمیت یا نسلی تعصب ؛ یا ان کی شان میں تنقیص ہو؛ تو بلا شک وشبہ یہ صورت حال مردود ہے۔ اس مسئلہ میں انبیاء کے مابین فضیلت کی کوئی نظیر/ مثال نہیں۔ کیونکہ انبیائے کرام علیہم السلام کی ایک دوسرے پر فضیلت پر نص موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ (البقرة: ٢٥٣)

''یہ پیغمبر ہیں ہم نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾ (الاسراء: ٥٥)

''ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔''

اس پر بحث سابقہ اوراق میں (و سید المرسلین) کے جملہ میں بھی گزر چکی ہے۔

یہاں پر اعتبار دلیل کی ترجیح کو ہوگا؛ کسی قول کو اس لیے نہیں چھوڑا جاسکتا کہ بعض اہل بدعت نے اس کی موافقت ہے۔ یہ مسئلہ اہل سنت والجماعت کے مابین ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ یاد رہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پہلے پہل تو فرشتوں کو انسانوں پر فضیلت دیتے تھے؛ پھر ان کی رائے میں تبدیلی آگئی؛ پھر ظاہر ہے کہ اس مسئلہ میں توقف بھی ان کا ایک قول ہے۔ فریقین کی جانب سے ذکر کردہ دلائل مطلق فضیلت پر تو دلالت کرتے ہیں؛ افضلیت پر نہیں۔ اس میں کوئی اختلاف بھی نہیں۔ اس مسئلہ پر شیخ تاج الدین فزاری[۶۲۴-۶۹۰ھ] کی ایک کتاب ہے: (الاشارة فی البشارة فی تفضیل البشر علی الملك)۔

اس کتاب کے آخر میں وہ کہتے ہیں:

''جان لیجیے! یہ مسئلہ علم کلام کی ان بدعات میں سے ہے؛ جن پر امت کے سلف صالحین نے؛ اور پھر ان کے بعد کے ائمہ اعلام رحمہم اللہ نے کوئی کلام نہیں کیا۔ اور نہ ہی اصولِ عقائد میں سے کوئی اصول اس پر موقوف ہے۔ اور نہ ہی دینی امور میں سے کسی بڑے مقصد کا اس سے کچھ تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جیسے مسائل کی کتابوں میں اس مسئلہ کا ذکر تک نہیں۔ نیز ائمہ دین کی ایک جماعت نے اس مسئلہ پر بحث سے کرنے گریز کیا ہے۔ اور اگر کسی معمولی عالم نے اس پر کلام کیا بھی ہے تو اس کا کلام ضعف اور اضطراب سے خالی نہیں''۔ انتہی و اللہ تعالیٰ الموفق للصواب

جن دلائل سے پیغمبروں کی فرشتوں پر برتری پر استدلال کیا گیا ہے؛ ان میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ

حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر فضیلت کی دلیل ہے۔اسی لیے ابلیس نے سجدہ نہ کیا اور تکبر کیا اور کہا:

﴿اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ﴾ (الاسراء: ٦٢)

''کیا تو دیکھتا ہے یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔''

دوسرے حضرات کہتے ہیں: فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں اس کی عبادت؛ تسلیم اور اطاعت گزاری تھا۔اوراس میں حضرت آدم علیہ السلام کی تکریم و تعظیم تھی؛اس سے افضلیت لازم نہیں آتی۔جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اپنے بیٹے کو سجدہ کرنے سے بیٹے کی ان پر فضیلت لازم نہیں ہوتی۔اور نہ ہی کعبہ کو اپنے رب کے حکم سے اس کی طرف سجدہ کرنے سے بنی آدم پر فضیلت حاصل ہے۔البتہ ابلیس کا سجدہ نہ کرنا اس بنا پر ہے کہ اس نے اپنی رائے اور فاسد قیاس کے ساتھ نص کا مقابلہ کیا؛ کہ وہ اس [حضرت آدم علیہ السلام] سے بہتر ہے۔یہ مقدمہ صغریٰ ہے؛ کبریٰ یہاں محذوف ہے؛ وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ: فاضل مفضول کو سجدہ نہیں کرسکتا۔جبکہ یہ دونوں مقدمات فاسد ہیں۔

پہلا مقدمہ اس لیے فاسد ہے کہ مٹی کئی اوصاف میں آگ پر فوقیت رکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ابلیس کے [عناصر ترکیبی میں سے ایک]عنصر نے خیانت کی؛ تو اس نے تکبر کیا اور انکار کردیا۔آگ کے اوصاف میں بلندی کی طرف جانا ہے؛اس میں چھچھورا پن اور رعونت اور طیش ہوتی ہے۔نیز جس چیز سے آگ ہمکنار ہوتی ہے اس کو خراب کر دیتی ہے؛ مٹا دیتی ہے؛ جلا دیتی ہے۔لیکن حضرت آدم علیہ السلام کو [اس اصل کے]عنصر نے فائدہ دیا؛ وہ تائب ہوئے؛ مسکنت کا اظہار کیا؛ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھک گئے؛ اور فرمانبرداری کرلی؛ اور غلطی کا اعتراف کرکے معافی کے خواستگار ہوئے۔بے شک یہ بات واضح ہے کہ مٹی میں ثبات؛ سکون، مضبوطی، تواضع، خشوع و خضوع اور تذلل پایا جاتا ہے۔جو چیز اس کے قریب ہوتی ہے؛ وہ اگتی اور پھلتی پھولتی ہے؛اس میں نشو ونما ہوتی اور برکت ہوتی ہے۔یہ اوصاف آگ کے اوصاف کے خلاف ہیں۔

دوسرا مقدمہ کہ فاضل مفضول کو سجدہ نہیں کرتا؛ یہ بھی باطل ہے۔اس لیے کہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کا حکم تسلیم کرنے کا نام ہے۔اگر اللہ تعالیٰ حکم دیتا کہ تم کسی پتھر کو سجدہ کرو؛ تو بندوں پر واجب ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے میں جلدی کریں۔یہ اس کی دلیل نہیں کہ مسجود لہ [جس کو سجدہ کیا گیا]؛ وہ ساجد [سجدہ کرنے والے] سے افضل ہے۔اگرچہ اس میں مسجود لہ کی تعظیم و تکریم تو ظاہر ہے؛اس میں فقط اس کی فضیلت ثابت ہوتی ہے [افضلیت نہیں]۔

تو اس بنا پر ابلیس کا راندہ درگاہ ہونے اور سجدہ نہ کرنے کے بعد یہ اعتراض کرنا کہ:

﴿هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ﴾ (الاسراء: ٦٢)

''یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔''

یہ سجدہ سے انکار کے بعد ہے؛ پہلے نہیں۔پس یہ خود ہی اس سے اس استدلال کی نفی ہوتی ہے۔

نیز فرشتوں میں عقل موجود ہے شہوت نہیں اور پیغمبروں میں عقل اور شہوت دونوں موجود ہیں۔پس جب انبیائے کرام علیہم السلام نے اپنے آپ کو شہوات سے اور ان چیزوں سے روکا جن کی طرف طبیعت کا میلان ہوتا ہے؛ تو اس وجہ سے وہ افضل ٹھہرے۔

دوسرے حضرات کہتے ہیں: ممکن ہے کہ فرشتوں کا ہمیشہ اطاعت کرنا عبادت پر تحمل کرنا؛ اور اس سستی نہ کرنا نہ تھکنا؛ [ایسے اوصاف افضیلت ہیں] کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی شہوات سے اجتناب کرتے ہوئے ان پر پورا اترتے ہیں۔ جبکہ فرشتے لمبی مدت تک عبادت بھی کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو انبیائے کرام علیہم السلام کے لیے اپنا پیامبر اور اپنے اور انبیاء کے درمیان سفیر بنایا ہے۔ لیکن اس قول میں ان لوگوں کے حق میں علت پائی جاتی ہے؛ جو اس سے ملائکہ کی افضلیت پر استدلال کرتے ہیں؛ اور ان کا استدلال قوی ہے؛ بیشک انبیاء علیہم السلام اللہ کے رسول ہیں؛ اگر انبیاء علیہم السلام جن کی طرف مبعوث ہوئے ہیں؛ ان سے بوجہ رسالت کے افضل ہیں؛ تو اس سے ان ملائکہ کی فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے؛ جو ان کی پیغام رسالت لائے ہیں۔ کیونکہ اس میں فرشتہ پیامبر بشری پیغمبر کی طرف رسول ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (البقرة: ۳۱)

''(اللہ) نے آدم علیہ السلام کو تمام نام سکھا دیئے۔'' [انبیاء کے افضل ہونے کی دلیل ہے]۔

دوسرے گروہ کا کہنا ہے: یہ فضیلت کی دلیل ہے افضلیت کی نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام اور فرشتے صرف وہی علم رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کیا ہے۔ اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہیں؛ کہ وہ ان چیزوں کا علم تھا؛ جن کا علم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں تھا۔ اور یقیناً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے شاگرد نے طلب علم کے لیے حضرت خضر علیہ السلام کی طرف سفر کیا؛ اس کے لیے زاد راہ ساتھ لیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے صراحتاً علم طلب کیا؛ لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے جواب دیا: آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم موجود ہے............الخ۔ [البخاری ٤٧٢٧؛ مسلم ٢٣٨٠]

اسی طرح ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے افضل نہیں کہ اس کو اس چیز کا علم تھا؛ جس کا علم حضرت سلیمان علیہ السلام کو نہیں تھا۔ اسی کی ایک دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص: ۷۵)

''اے ابلیس! تجھے کس نے روکا کہ اس کو سجدہ کرے جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔'' [پتہ چلا کہ انسان افضل ہیں]۔

دوسرے گروہ کا کہنا ہے: یہ فضیلت کی دلیل ہے افضلیت کی نہیں۔ وگرنہ لازم آئے گا کہ آدم علیہ السلام کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی فضیلت حاصل ہو۔ اگر کوئی شخص کہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔

[جواب]: یقیناً ان کی اولاد میں نیک اور بد سبھی ہیں۔ بلکہ قیامت کے روز جب حضرت آدم علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ: ''اپنی اولاد میں سے ایک جماعت دوزخ میں بھیجو'۔ تو آپ ہر ایک ہزار میں سے نوسو ننانوے افراد کو دوزخ میں بھیجیں گے اور ایک فرد جنت میں جائے گا'' ❶۔

تو کیا وجہ ہے کہ ہزار میں سے صرف ایک کو فضیلت مل سکی ہے۔

نیز حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

''اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی مخلوق کو پیدا نہیں فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عزت والی ہو''۔ ❷

پس معاملہ اس حدیث کے صحت کے ساتھ ثابت ہونے کا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق بنی اسرائیل کی روایات سے ہے۔

اس کی ایک دلیل حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے؛ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''فرشتوں نے کہا: ''اے ہمارے رب تو نے بنو آدم کو دنیا عطا کی ہے وہ کھاتے پیتے ہیں؛ لباس پہنتے ہیں۔ اور ہم تیری حمد و تسبیح بیان کرتے ہیں؛ نہ کھاتے پیتے ہیں؛ اور نہ ہی کھیل تماشہ کرتے ہیں۔ پس جس طرح تو نے ان کو دنیا دی ہے؛ ہمیں آخرت عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا؛ اس کی اولاد میں سے نیک لوگوں کو میں ان کے برابر نہیں کرسکتا جن کو میں نے کلمۂ کن سے پیدا کیا''۔ ❸

---

❶ بخاری ۳۳٤۸؛ مسلم ۲۲۲، حديث ابی هريرة.

❷ مستدرك: ٤/ ٥٦٨-٥٦٩ سند صحیح ہے حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا۔

❸ حدیث ضعیف ہے۔ تفسير ابن كثير (٥/ ٢٠٦)۔ مجمع الزوائد للهيثمی (١/ ٨٢)، كتاب الرد علی المريسی (ص ٣٤) . ۔ شیخ احمد شاکر نے اس پر تعاقب کرتے ہوئے کہا ہے: ''شارح نے اس حدیث کو اسی بنا پر سند و متن کے اعتبار سے معلول کہا ہے۔ مگر وہ اس میں حق بات تک رسائی نہیں کرسکا۔ کیونکہ اس سے حدیث کی تخریج میں کوتاہی ہوگئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طبرانی کی روایت بہت سخت ضعیف ہے۔ بلکہ ضعف کے انتہائی درجہ پر ہے۔ اسے ابن کثیر رحمہ اللہ نے تفسیر میں ۵/ ۲۰۶؛ سند کے ساتھ معجم الکبیر سے نقل کیا ہے۔ اور ہیثمی نے مجمع الزوائد میں ۱/ ۸۱؛ میں نقل کیا ہے؛ اور کہا ہے: ''اسے طبرانی نے الکبیر میں اور الاوسط میں روایت کیا ہے؛ اس کی سند میں ابراہیم بن عبداللہ بن خالد المصیصی ہے؛ وہ کذاب اور متروک ہے۔ اور الاوسط کی سند میں طلحہ بن زید ہے؛ وہ بھی کذاب ہے۔ یہ دونوں اسناد ناقابل اعتماد ہیں۔ لیکن امام عثمان بن سعد الدارمی نے ''الرد علی المریسی'' میں ص ۳۴ پر صحیح سند سے ایک لمبی روایت نقل کی ہے۔ [اس کے متعلق شیخ احمد شاکر فرماتے ہیں:] رواه عن عبد الله بن صالح، عن الليث بن سعد، عن هشام بن سعد، عن زيد بن أسلم، عن عطا بن يسار، عن عبد الله بن عمرو بن العاص .وهذا إسناد لا مغمز فيه، وقد شأار إليه الحافظ ابن كثير فی التاريخ ١/ ٥٥۔ مختصرا، من رواية عثمان بن سعيد، وأشار إلى صحته ۔ اور عبداللہ بن احمد بن حنبل کی روایت؛ ان کی زیادات میں سے ہے؛ جو کہ ان کی کتاب ''السنہ'' ص ۱۴۸؛ طبع سلفیہ؛ میں ہے؛ عبداللہ کہتے ہیں: حدثنی الهيثم بن خارج، حدثنا عثمان بن علاق، وهو عثمان بن حصن بن علاق (وكتب فی المطبوع: محصن؛ خطأ) سمعت عروة بن رويم يقول:" أخبرنی الأنصاری، عن النبی صلى الله عليه وسلم ...
۔ ظاہر میں لگتا ہے کہ یہ سند صحیح ہے؛ اگرچہ میں دوٹوک طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے کہ عروہ بن رویم نے صراحت نہیں کی کہ ان سے حدیث بیان کرنے والا انصاری صحابی ہے؟ اس لیے کہ صحابی کا مجہول ہونا نقصان دہ نہیں ہوتا۔ اور وہ حضرت انس بن مالک انصاری سے روایت بھی کرتے ہیں۔ اگر وہ انہی سے کنایہ لے رہے ہیں؛ تو سند صحیح ہوگی۔ اس کا بھی بہت بڑا احتمال ہے۔ اگرچہ میں حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے کہ اس حدیث کا ذکر ابن کثیر رحمہ اللہ نے تفسیر میں ۵/ ۲۰۶-۲۰۷ پر ابن عساکر سے نقل کرتے ہوئے کیا ہے؛ وہ اپنی سند سے عثمان بن علاق سے روایت کرتے ہیں: ''میں عروہ بن رویم لخمی سے سنا؛ [وہ کہتے تھے] مجھ سے انس بن مالک نے حدیث بیان کی؛ وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ اس سے اس بات کو ترجیح ملتی ہے کہ عبداللہ بن احمد کی سند میں انصاری حضرت انس بن مالک انصاری ہیں۔ لیکن ابن عساکر کی سند کے صحیح یا ضعیف ہونے کا مجھے پتہ نہیں چل سکا۔ صورت حال جو بھی ہو؛ عبداللہ بن احمد اور ابن عساکر ان دونوں کی روایات استشہاد کے قابل ہیں۔ اور یہ دونوں دارمی کی سند سے حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث کے صحیح ہونے کی تائید کرتی ہیں۔ اس کو متن اور معنی کے اعتبار سے معلول کہنا درست نہیں اور نہ ہی قابل قبول ہے۔ اس لیے کہ ملائکہ نے اپنے رب پر یہ اعتراض نہیں کیا تھا؛ اور نہ ہی انہیں ان کے احوال پر کوئی حسد تھا۔ بلکہ انہوں نے رب سے ایک چیز مانگی تھی؛ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بندے ہیں؛ اور اس پر راضی رہتے ہیں جو کچھ رب سبحانہ و تعالیٰ انہیں حکم دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی دعا کو قبول نہ بھی کیا جائے۔ اس کی مثال سورت بقرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے قصہ کے ابتدائی آیات میں ہے۔ کہنے لگے: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ ۳۰-۳۳) '' کیا تو اس میں اس کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور بہت سے خون بہائے گا اور ہم تیری تعریف کے ساتھ ہر عیب سے پاک ہونا بیان کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ فرمایا بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔ (انتہی کلامہ)
میں کہتا ہوں: اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے حدیث کی تصحیح ہوسکتی ہو۔ اس کا مختصر بیان پیش خدمت ہے۔

ا۔ دارمی کی سند کے متعلق یہ کہنا: ''یہ سند صحیح ہے؛ اس میں کوئی شک نہیں؛ اور اس کے صحیح ہونے کی طرف ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ دو وجہ سے محل نظر ہے: !۔ اول: ہم اس کی سند میں عبداللہ بن صالح کے موجود ہونے کی وجہ سے اس کی صحت کو تسلیم نہیں کرتے۔ بیشک اگرچہ امام بخاری نے ان کی سند سے اپنی صحیح میں روایت نقل کی ہے؛ مگر اس کے حفظ کی وجہ سے اس پر کلام کیا گیا ہے۔ یہ مختصر تعلیق ائمہ کے اقوال ذکر کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''التقریب'' میں اس کے حالات زندگی میں جو کچھ لکھا ہے؛ اس لیے کہ آپ عموماً جس کے حالات زندگی تحریر کرتے ہیں؛ اس کے متعلق ائمہ کے اقوال کا خلاصہ لکھتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: "صدوق ؛ كثير الغلط ؛ ثبت في كتابه ؛ و كانت فيه غفلة"۔ دوم: ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ ابن کثیر نے اس حدیث کے صحیح ہونے کے طرف اشارہ کیا ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا: ''وھو اصح''۔ یہ قول مطلق تصحیح کا فائدہ نہیں دیتا؛ بلکہ یہ ایک نسبتی تصحیح ہے۔ اور یہ اس کے صحیح ہونے کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ بہت ساری احادیث کے متعلق فرماتے ہیں: '' وهو أصح الشئى فى هذا الباب ''۔ یہ اس باب میں سب سے زیادہ صحیح روایت ہے۔ پس اس سے اس روایت کے مطلقاً صحیح ہونے کا حکم نہیں لیا جا سکتا۔ جیسا کہ اصول حدیث میں یہ بات طے شدہ ہے۔ پس ابن کثیر کا قول بھی ایسے ہی ہے۔

۲۔ عبداللہ بن احمد کی اپنی سند سے انصاری سے روایت؛ تو ان کی عدالت میں کوئی شک تک نہیں؛ سوائے انصاری کے۔ بحث تو اس بات میں ہے کہ کیا وہ انصاری حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں؟ اس لیے کہ اگر یہ انصاری حضرت انس ہیں؛ تو پھر یہ سند متصل ہے؛ اور صحیح ہے جیسا کہ شیخ احمد نے کہا ہے۔ لیکن اس پر ابن عساکر کی روایت لے کر آنا؛ جو کہ تفسیر ابن کثیر سے نقل کی گئی ہے؛ یہ روایت استشہاد کے قابل نہیں۔ اس لیے کہ ابن عساکر نے (۱۵/۶۶) پر محمد بن ایوب بن الحسن الصید لانی کے حالات زندگی میں اس حدیث کو لائے ہیں۔ اور اس میں کوئی جرح و تعدیل نہیں کی۔ اس کے علاوہ بھی راویوں کی ایک جماعت ہے جن کے حالات زندگی میں نے نہیں پائے۔ پس ایسی کمزور سند کی موجودگی میں یہ نہیں لگتا کہ یہ انصاری حضرت انس ہوں۔ حالانکہ اس کی ایک اور سند بھی ابن عساکر میں مجھے ملی ہے؛ وہ سند بھی ضعیف ہے۔ اس سند میں انصاری کا نام عبداللہ بن جابر الانصاری بتایا ہے۔

۹/ ۴۰۷ میں ہشام بن عمار کی سند سے یوں روایت کیا ہے: نا عبد ربه بن صالح القرشي قال: سمعت عروة بن رويم يحدث عن جابر بن عبد الله الأنصاري مرفوعا به ۔ اس قرشی کے حالات زندگی مجھے نہیں ملے۔ اور ہشام بن عمار؛ اگرچہ اس کی روایت امام بخاری نے بھی روایت کی ہیں؛ لیکن اس میں بھی کلام کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے تقریب میں کہا ہے: '' صدوق ، مقرئي ، كبر فصار يتلقن ''۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ: ابن رویم کی حدیث انصاری راوی کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اور دوسری دونوں روایات بھی اس کا تعین کرنے میں مضطرب ہیں۔ ان میں سے پہلی روایت میں ہے کہ وہ حضرت انس تھے۔ اور دوسری میں ہے: وہ حضرت جابر تھے۔ میری نزدیک اس کو عبداللہ بن صالح کی حدیث سے تقویت دینا درست نہیں۔ کیونکہ اس میں بھی کچھ احتمال ہے کہ اس کلام میں کچھ دخل اندازی ہوئی ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے: وہ فی نفسہ صدوق تھا؛ مگر اس کے ایک پڑوسی کی وجہ سے اس کی روایات میں منکر روایات بھی آ گئی ہیں۔ ان دونوں کے مابین دشمنی تھی۔ پس وہ اپنے شیخ ابو صالح کے نام سے حدیثیں گھڑتا؛ اور انہیں اس عبداللہ کے خط سے مشابہ خط میں تحریر کر دیتا۔ اور پھر اسے ان کے گھر میں کتابوں کے درمیان پھینک کر چلا جاتا۔ اور عبداللہ یہ گمان کرتا تھا کہ شاید یہ بھی اس کا ہی خط ہے؛ تو وہ احادیث بیان کر دیتا۔

اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اصل میں یہ حدیث اسرائیلیات میں سے ہو؛ جو مسلمان ہو جانے والے اہل کتاب حضرات بیان کیا کرتے تھے۔ پھر بعض راویوں سے غلطی ہوگئی؛ اور وہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع بیان کرنے لگے۔ جیسا کہ ہاروت و ماروت کے قصہ میں ہوا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہ حدیث طبرانی میں ہے؛ اور عبداللہ بن احمد بن محمد بن حنبل رحمہ اللہ نے عروہ بن رویم سے روایت کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

انصاری نے مجھے خبر دی ہے کہ: ''فرشتوں نے کہا وہ............: [اس حدیث میں آگے ہے:]

''وہ بھی محو خواب و استراحت ہونا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہیں۔ فرشتوں نے تین بار اپنا مطالبہ دہرایا۔ لیکن ہر دفعہ انھیں نفی میں جواب ملا''۔ [الطبراني في الأوسط ٦١٧٣]

یہاں پر مسئلہ اس حدیث کے ثابت ہونے کا ہے۔ لیکن دونوں طریق کی اسانید میں ضعف ہے؛ اور ان کے متون پر بھی اعتراض ہے۔ فرشتوں کی بابت یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ بار بار ذات باری تعالیٰ پر اعتراض کریں گے؛ جبکہ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق خود خبر دے رہے ہیں:

﴿لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَ هُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾(الانبیاء۲۷)

''وہ بات میں اس سے آگے نہیں بڑھتے اور وہ اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں''۔

تو کیا فرشتوں کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے احوال پر کبیدہ خاطر ہوں؛ اور انسانوں کی شہوت رانیوں کے مناظر دیکھنے کے متمنی ہوں؛ جب کہ نیند تو موت کی بہن ہے۔ تو ان امور کی وجہ سے وہ انسانوں پر کیسے رشک کر سکتے ہیں؟۔ اور یہ کیسے سوچا جا سکتا ہے کہ: وہ کھیل تماشہ پر رشک کرتے ہیں؟۔ جبکہ کھیل تماشا تو ایک باطل چیز ہے''۔

ان [دوسرے گروہ] کا کہنا ہے: ''بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے؛ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا اور وسوسہ ڈالا؛ اور آپ کو اس وقت دھوکہ دیا جب آپ کو اس نے درخت کا پھل کھلایا کہ آپ فرشتہ بن جائیں گے۔ اور اس نے کہا:

﴿مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ۝﴾ (الاعراف: ۲۰)

''تم کو تمھارے رب نے اس درخت سے صرف اس لیے منع کیا کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ جیتے نہ رہو۔''

معلوم ہوا کہ فرشتوں کی افضلیت ایک معلوم شدہ اور فطرت میں ثابت شدہ چیز ہے۔ اس کی شہادت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے جس میں ان عورتوں کا ذکر ہے جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ دیے؛ اور برملا کہنے لگیں:

﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ (یوسف: ۳۱)

''اللہ کی قسم! یہ کوئی بشر نہیں؛ بلکہ یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔''

نیز [رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم ملا تھا کہ آپ کفار قریش سے یہ کہہ دیں:] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ﴾ (الانعام: ۵۰)

''فرما دیں: میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔''

پہلے گروہ کے حضرات کہتے ہیں: ''بیشک یہ اس وجہ سے تھا لوگوں کے ذہنوں میں فرشتوں کی عظمت اور خوبصورتی مرکوز تھی؛ اور یہ کہ وہ خوفناک کام کو لمحہ بھر میں سرانجام دیتے ہیں۔ خاص طور پر عرب لوگوں کے ذہنوں میں فرشتوں کی بہت زیادہ عظمت تھی؛ حتی کہ وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ تعالیٰ الله عن قولهم علواً کبیراً۔

[بنی آدم کی افضلیت کے قائل حضرات کی ایک اور دلیل:] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (آل عمران: ۳۳)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو جہان والوں سے چن لیا ہے۔''

لیکن مخالفین کہتے ہیں: یہ جو عالمین کا ذکر کیا گیا ہے؛ اس سے مقصود مطلق عموم نہیں؛ بلکہ ہر لفظ اپنے مقام پر سیاق وسباق کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۝﴾ (الفرقان: ۱)

''تا کہ وہ سارے جہاں والوں کو خبردار کرے۔'' [یہاں پر عالمین سے مراد آپ کے زمانہ کے لوگ ہیں]۔

اور ارشاد ربانی ہے:

﴿اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (الحجر: ۷۰)

''کیا ہم نے تم کو جہاں والوں سے منع نہیں کیا تھا۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (الشعراء: ۱۶۵)

''کیا تم اہل عالم میں سے لڑکوں کے پاس آتے ہو۔'' [العالمین سے مراد ان کے دور کے لوگ ہیں]۔

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝﴾ (الدخان: ۳۲)

''ہم نے ان کو علم کی روشنی میں سب جہاں والوں میں سے چن لیا تھا''۔

[اور ایک دلیل یہ] ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ۝﴾ (البینہ: ۷)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور صالح عمل کرتے رہے وہ تمام خلقت سے بہتر ہیں۔''

لفظ (بریہ) (برء) سے مشتق ہے۔ تو اس کا معنی ہے: مخلوق۔ ثابت ہوا کہ نیکوکار بشر بہترین مخلوق ہیں۔

مخالفین کہتے ہیں: ''وہ اس بنا پر [خیر البریہ] بہترین مخلوق کے لقب سے پکارے گئے کہ وہ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے۔ جبکہ فرشتے پہلے ہی سے اس وصف میں اکمل ہیں۔ وہ نہ تو اکتاتے ہیں نہ ہی وقفہ کرتے ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بشر فرشتوں سے افضل ہوں۔ یہ معنی اس قرأت کی بنیاد پر ہے کہ اگر (بـــریـــئۃ) یعنی ہمزہ کے ساتھ پڑھا جائے۔ اور جو لوگ اسے پڑھتے ہیں: (بریۃ) [بغیر ہمزہ کے]۔ اگر ہم کہیں کہ: یہ ''یاء'' ہمزہ سے مخفف ہے۔ اور اگر ہم کہیں کہ: اس کی نسب ''بر'' کی طرف ہے؛ [یعنی (بری) سے مشتق ہے] جس کا معنی مٹی ہے۔ فراء کا بھی یہی قول ہے؛ اس سے جوہری نے صحاح میں ذکر کیا ہے۔ تو پھر معنی یہ ہوگا کہ وہ ان تمام سے بہتر ہیں جو مٹی سے تخلیق شدہ ہیں۔ اس اعتبار سے اس میں عمومیت نہ رہتی۔ کیونکہ دوسری مخلوقات تو مٹی سے پیدا نہیں کی گئیں۔

پہلے گروہ کے حضرات کہتے ہیں: بے شک ہم نیک انسانوں کی بات کرتے ہیں؛ جب وہ کامل ہو جائیں؛ اور اپنی انتہاء کو پہنچ جائیں؛ اور اپنی غایت کو پالیں۔ اور بے شک ایسا تب ہوگا جب وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل ہو جائے۔ اور درجات اعلیٰ میں سکونت پالیں۔ اور اللہ تعالیٰ مزید قربت اور محبت سے نواز دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ ان پر تجلی فرمائیں گے تا کہ وہ اس کے چہرہ مبارک کے دیدار سے متمتع ہوں۔

دوسرے گروہ کے حضرات کہتے ہیں: جب وہ اس حالت کو پہنچ جائیں گے؛ تو کیا وہ فرشتوں کے مساوی ہوں گے یا پھر اس مرتبہ سے فرشتوں پر فوقیت پالیں گے؟۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بشر اس حالت میں فرشتوں پر فوقیت پالیتے ہیں؛ تو آپ کا دعوی تسلیم کر لیا

جائے گا؛ ورنہ نہیں۔

ملائکہ کی بشر پر فضیلت پر جن آیات سے استدلال کیا گیا ہے؛ ان میں سے ایک یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (النساء: ۱۷۲)

''مسیح ہر گز اس بات سے عار نہیں رکھتے کہ وہ اللہ کے بندے ہوں اور نہ ہی مقرب فرشتے (عار رکھتے ہیں)۔''

لغت میں یہ ثابت ہے کہ اس طرح کا کلام معطوف کے معطوف علیہ سے افضل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ عربی زبان میں یہ یوں کہنا درست نہیں:

"لن يستنكف الوزير أن يكون خادماً للملك ولا الشرطي أو الحارس"

''وزیر عار نہیں سمجھتا کہ وہ بادشاہ کا خدمت گزار ہو؛ اور نہ پولیس والا؛ اور نہ ہی پہرہ دار۔''

بلکہ عربی زبان میں یوں کہا جائے گا:

"لن يستنكف الشرطي أن يكون خادماً للملك ولا الوزيرُ"

''سپاہی اس بات میں عار میں نہیں سمجھتا کہ وہ بادشاہ کا خادم ہو؛ اور نہ ہی وزیر عار سمجھتا ہے''۔

اس جیسی ترکیب میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہوتی ہے۔ اس آیت میں جب فرشتوں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر افضلیت ثابت ہوگئی؛ تو دیگر پیغمبروں کے حق میں بھی یہ افضلیت ثابت ہوگئی۔ چونکہ کسی نے بھی یہ دعوی نہیں کیا کہ وہ بعض انبیاء سے افضل ہے اور بعض سے نہیں۔

دوسرے فریق نے اس کے کئے جوابات دیے ہیں؛ ان کا بہترین جواب؛ یا ان کے جوابات میں سے بہترین جواب یہ ہے:

''جہاں تک فرشتوں کی قوت مضبوطی اور عظیم الخلقت ہونے کا تعلق ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں؛ اور نہ ہی ان کی عبودیت؛ خضوع اور انکساری اور اطاعت گزاری میں کوئی شک ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرتے؛ اور نہ ہی وہ فرشتے جو قوت وقدرت اور عظیم الخلقت ہونے میں پیغمبروں سے برتر ہیں۔ تو اس قسم کی ترکیب سے ہر لحاظ سے مطلق طور پر افضلیت لازم نہیں آتی۔

[فرشتوں کی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر افضلیت کے قائلین] اس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں:

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ﴾ (الانعام: ۵۰)

''فرمادیں: میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔''

کہتے ہیں: اس قسم کی بات ان معانی میں کہی جاتی ہے کہ: ''اگر میں اپنے بارے میں فرشتہ ہونے کا دعویٰ کروں تو گویا میں اپنے آپ کو ایسا مرتبہ دوں گا جو میرے مرتبہ سے اوپر ہے۔ پس میں اس کا مدعی نہیں ہوں۔

دوسرا فریق اس کے جواب میں کہتا ہے: ''کفار نے پیغمبر پر اعتراض کیا تھا کہ:

﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان: ۷)

''اس پیغمبر کو کیا ہو گیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔''

تو پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ انہیں اس کا جواب یوں دیں: ''بے شک میں بھی تمھارے جیسا انسان ہوں؛ مجھے بھی وہ ضرورت پیش آتی ہے جس طرح تم سے کوئی بھی بشر اکتساب معیشت؛ اور کھانے پینے کی ضرورت کا سامنا کرتا ہے۔ میں ان ملائکہ میں سے نہیں ہوں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کی ضرورت سے بے نیاز رکھا ہے۔ تو اس صورت میں مطلق افضلیت لازم نہیں آتی۔ اس کی ایک دلیل وہ حدیث بھی ہے جو امام مسلم نے اپنی سند سے وایت کی ہے؛ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَّأَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ ، وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ .))

''طاقتور مومن اللہ تعالیٰ کے ہاں کمزور مؤمن سے زیادہ محبوب ہے؛ ان میں سے ہر ایک میں خیر ہے''۔ ❶

یہ بات معلوم شدہ ہے کہ انسانی قوت فرشتوں کی قوت کے برابر تو کیا؛ اس کے قریب بھی نہیں ہو سکتی۔

دوسرا فریق کہتا ہے: [ظاہر ہے] مؤمن سے صرف مؤمن انسان مراد ہیں؛ اس عموم میں فرشتے داخل نہیں۔

[ان کی ایک دلیل]: صحیح مسلم کی وہ حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے؛ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سبحانہ وتعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: [اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:]

''میں اپنے متعلق اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوتا ہوں۔ اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ اگر وہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اپنے نفس میں اس کو یاد کرتا ہوں۔ اور اگر وہ میرا ذکر کسی مجلس میں کرتا ہے۔ تو میں اس کا ذکر اس سے بہتر مجلس میں کرتا ہوں''۔ ❷

(اس مجلس سے مراد فرشتوں کی مجلس ہے۔) یہ حدیث فرشتوں کی افضلیت پر نص ہے۔

❶ مسلم کی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے ٢٦٦٤؛ (٨/ ٥٦) ظلال الجنة (٣٥٦) .

❷ حدیث صحیح ہے۔ متفق عليه۔ الاحاديث الصحيحة (٢٢٨٧) . البخاری ٧٤٠٥؛ مسلم ٢٦٧٥ .

دوسرا فریق کہتا ہے: ''یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد اس مذکور [جس کا ذکر کیا جا رہا ہے یعنی اللہ تعالیٰ] کی وجہ سے یہ مجلس بہتر ہو؛ اور اسے مطلق طور پر خیر [بہتر ہونا] مراد نہ ہو۔

[فریق اول کے دلائل میں سے]: ایک دوسری حدیث بھی ہے؛ جسے امام الائمہ محمد بن خزیمہ، نے اپنی سند سے کتاب التوحید میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک دفعہ میں بیٹھا ہوا تھا؛ اچانک حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے؛ انھوں نے میرے کندھوں پر ہاتھ مارا۔ چنانچہ میں ایک درخت کی جانب چل دیا؛ جو پرندے کے دو گھونسلوں کی طرح تھا۔ ایک میں حضرت جبرئیل علیہ السلام بیٹھ گئے دوسرے میں میں بیٹھ گیا۔ درخت بلند ہوتا چلا گیا؛ حتی کہ مشرق، مغرب کی دوریوں میں پھیل گیا میں نظر اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ اگر میں آسمان کو ہاتھ لگا کر چھونا چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا۔ میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مثل چٹائی کے چمٹے ہوئے ہیں۔ تو مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا علم مجھ پر فضیلت رکھتا ہے''۔ ❶

❶ حدیث ضعیف ہے۔ الضعيفه (٥٤٤٤)۔ اس کی سند میں حارث بن عبید ایادی راوی کمزور اور حافظہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ شیخ احمد شاکر کا اس

میں کلام کرنا بغیر کسی حجت کے ہے۔[یہ کہنا کہ] راجح اس راوی کی توثیق ہے؛ یہ قول مردود ہے۔امام احمد رحمہ اللہ نے اس کے متعلق کہا ہے:'' حدیث میں مضطرب ہے۔اور ابوحاتم نے کہا ہے:'' حدیث میں قوی نہیں؛ اس کی حدیث لکھی جاسکتی ہے؛ مگر اس سے حجت نہیں پیش کی جاسکتی۔اور ابن حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:'' بہت زیادہ وہم کا شکار تھا۔حتی کہ وہ جملہ طور پر ان لوگوں سے باہر ہوگیا جن کی انفرادی روایات سے دلیل پیش کی جاسکتی ہے۔اور اصول حدیث میں یہ بات طے شدہ ہے کہ:'' تفصیلی جرح تعدیل پر مقدم ہوتی ہے۔اور اس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ وہ اپنے وہم کی وجہ سے ضعیف ہے۔اور بڑی غریب بات یہ ہے کہ کسی امام سے اس کی توثیق منقول نہیں ہے اس میں سب سے بہترین قول امام نسائی کا قول ہے: نیک انسان تھا''۔تو کیا ایسی نص کی وجہ سے ائمہ جرح کی بات رد کردی جائے گی۔پھر اس حدیث کی ایک دوسری علت کا بھی مجھے پتہ چلا ہے؛ اور وہ ہے: مخالفت اور ارسال؛ اس طرف امام بیہقی نے اشارہ کیا ہے: ۱/ ۱۰۹؛ طبع ہندیہ۔اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔دیکھیں: الضعیفة ٥٤٤٤۔

فریق ثانی کہتا ہے: اس حدیث کی سند میں مقال ہے؛ ہم اس وقت تک اس سے حجت کو درست تسلیم نہیں کرتے حتی کہ اس کی سند درست ثابت ہو جائے۔

خلاصۂ کلام: یہ مسئلہ کچھ زیادہ اہمیت کا حامل نہیں۔اسی لیے اکثر اصولی علماء نے اس طرف توجہ نہیں دی۔اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی اس مسئلہ میں جواب دینے سے توقف کیا تھا۔جیسا کہ گزر چکا۔واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جہاں تک انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی بات ہے؛ تو جن مرسلین علیہم السلام کا ذکر نام لے کر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے؛ ان پر ایمان لانا ہمارے لیے ضروری ہے۔اور اس بات پر بھی ایمان رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے علاوہ بھی انبیاء و مرسلین علیہم السلام کو مبعوث کیا تھا؛ جن کے اسماء اور تعداد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا جس نے انہیں مبعوث کیا تھا''۔

1۔ یہ بات صحیح ثابت ہے کہ رسولوں کی تعداد تین سو پندرہ ہے؛ جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔صحیح ابن حبان ٦٦٩٠؛ مسند أحمد ٥/ ٢٦٥؛ الحلية لأبی نعيم ١/ ١٦٦؛ مستدرك الحاكم ٢/ ٥٩٧؛ عن أبی ذر رضی اللہ عنہ؛ الصحيحة ٢٦٦٨۔

ہم پر واجب ان پر اجمالی ایمان رکھنا ہے۔اس لیے کہ ان کی تعداد کے بارے میں کوئی نص موجود نہیں۔فرمان الٰہی ہے:

﴿وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ﴾ (النساء: ١٦٤)

''اور ایسے رسول جن کے حالات پہلے ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں اور وہ رسول بھی ہیں جن کے حالات ہم نے آپ سے بیان نہیں کیے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ (غافر: ۷۸)

''اور ہم نے آپ سے پہلے بھی پیغمبر بھیجے؛ ان میں سے کچھ کے حالات آپ سے بیان کر دیئے ہیں اور کچھ کے حالات آپ سے بیان نہیں کیے۔''

ہم پر یہ ایمان رکھنا ضروری ہے کہ ان انبیاء علیہم السلام نے ان تمام احکام کی تبلیغ کردی تھی جن کے ساتھ انہیں مبعوث کیا گیا؛ اور جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا۔اور بے شک انہوں نے لوگوں میں اتنے واضح انداز میں کھول کر بیان کر دیا تھا جس کے بعد کوئی جہالت باقی نہیں رہتی۔اور اس کے خلاف کرنا حلال نہیں۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (النحل: ٣٥)

''پس پیغمبروں کے ذمہ ظاہر پہنچا دینا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (النحل: ۸۲)

''اگر وہ روگردانی کریں تو تجھ پر ظاہر پہنچا دینا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِنْ تُطِيعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ﴾ (النور: ۵٤)

''اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے اور پیغمبر پر تو صرف ظاہر پہنچا دینا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَأَطِيعُوا الرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْا أَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ (التغابن: ۱۲)

''اور تم رسول کی اطاعت کرو؛ اگر تم نے روگردانی کی تو جان لو کہ ہمارے پیغمبر علیہ السلام کے ذمہ کھول کر پہنچا دینا ہے۔''

[اولوالعزم انبیاء علیہم السلام]

اور جہاں تک اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کی بات ہے؛ ان کے بارے مختلف اقوال ہیں۔ ان میں سب سے بہتر قول وہ ہے جس کو امام بغوی رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، کہ اس سے مراد حضرت نوح، حضرت ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ ان کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّإِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ (الاحزاب: ۷)

''اور جب ہم نے انبیاء سے پختہ عہد لیا؛ اور آپ سے بھی اور نوح سے اور ابراہیم اور موسی اور عیسی بن مریم [علیہم السلام] سے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ إِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى أَنْ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ إِلَيْهِ﴾ (الشوری 13)

''اس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی وصیت نوح کو کی تھی؛ اور جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ مشرکوں پر وہ بات بھاری ہے جس کی طرف آپ انھیں بلاتے ہیں''۔

جبکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے مراد: آپ کی تصدیق کرنا؛ اور جو شرائع آپ لے کر آئے ہیں؛ اجمالاً اور تفصیلاً ان کی اتباع کرنا ہے۔

اور جہاں تک رسولوں پر نازل کردہ کتابوں پر ایمان کا تعلق ہے: پس ہو ہم ان کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں جن کے نام اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بتائے ہیں؛ جیسے: تورات، زبور، انجیل۔ اور ہم اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے علاوہ بھی کتابیں

اپنے انبیاء پر نازل کی ہیں؛ ان کے نام اور ان کی تعداد کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

جہاں تک قرآن پر ایمان؛ اس کے اقرار؛ اور اس میں موجود تعلیمات کی اتباع کا تعلق ہے؛ تو یہ اتنی قدر دوسری کتابوں پر ایمان سے زیادہ ہے۔ اور ہمارے لیے ان تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولوں کے پاس آئی ہیں۔ اور بے شک یہ کتابیں: حق اور ہدایت؛ نور اور بیان اور شفاء تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾.....﴿وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ (البقرة: ١٣٦)

''کہو ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور جو ہم پر اتارا گیا؛...... اور جو پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ملا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الٓمّٓ o اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ o..... إلى..... وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ (آل عمران: ١-٤)

''الٓمّٓ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ حیّ قیوم ہے...... اور قرآن نازل کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ (البقرة: ٢٨٥)

''پیغمبر اس کتاب پر ایمان لایا جو اس کے رب کی طرف سے نازل کی گئی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا o﴾ (النساء: ٨٢)

''وہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے اگر یہ غیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔''

ان کے علاوہ متعدد آیات ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات کے ساتھ کلام کیا ہے؛ یہ آیات اسی کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ اس میں صفت کلام اور علو کا بیان بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ (البقرة: ٢١٣)

''تمام لوگ ایک امت تھے پس اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو خوشخبری سنانے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا اور ان پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ o لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ (السجدة: ٤١، ٤٢)

''اور بے شک وہ عالی رتبہ کتاب ہے اس پر باطل کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے اور نہ پیچھے سے؛ دانا اور خوبیوں والے اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ يَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ﴾ (سبا : ٦)

''اور جنہیں علم دیا گیا وہ جانتے ہیں کہ جو آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا؛ وہ حق ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾ (یونس: ۵۷)

''اے لوگو! تمھارے پاس رب کی طرف سے نصیحت اور سینوں کی بیماریوں کی شفاء اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آ پہنچی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ﴾ (حم السجده : ٤٤)

''فرما دیجیے: وہ مؤمنوں کے لیے ہدایت اور شفاء ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا﴾[التغابن ٨]

''سو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا''۔

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

[اہل قبلہ مسلمان مؤمن]

۵۴۔((وَنُسَمِّي أَهْلَ قِبْلَتِنَا مُسْلِمِيْنَ مُؤْمِنِينَ مَا دَامُوا بِمَا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ مُعْتَرِفِينَ وَلَهُ بِكُلِّ مَا قَالَهُ وَأَخبَرَ مُصَدِّقِيْنَ ①۔))

''ہم تمام اہل قبلہ کو مسلمان اور مومن کہتے ہیں جب تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو تسلیم کریں اور آپ کے تمام اقوال اور خبروں کی تصدیق کریں''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کلام میں شیخ طحاوی رحمہ اللہ اشارہ فرماتے ہیں کہ اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہیں اور مسلمان کسی گناہ کے ارتکاب پر اسلام سے خارج نہیں ہوسکتا جب تک وہ اس گناہ کو حلال نہ سمجھے۔ اور اہل قبلہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اسلام کے دعویدار ہیں؛ اور قبلہ رخ ہوتے ہیں؛ اگر چہ وہ اہل بدعت میں شمار ہوتے ہوں یا گنہگاروں کے زمرہ میں سمجھے جاتے ہوں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی تکذیب نہ کرتے ہوں۔

أقول: تمام اسلامی فرقوں کو اہل قبلہ کہا جاتا تھا؛ جو کہ خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے؛ اور انہیں مسلمان ہی شمار کیا جاتا تھا۔ پس اس قاعدہ کی بنیاد پر اسلام اور ایمان میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ ہر مؤمن مسلمان اور ہر مسلمان مؤمن شمار ہوتا تھا۔ اور یہ کہ ایمان اور اسلام ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔ یہ بہت بڑا اور معروف مسئلہ ہے۔ حتی کہ ان فرقوں کا ظہور ہوا جو اس قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز تو پڑھتے تھے مگر دیگر ضروریات دین کا انکار کرتے تھے؛ جیسے مرزائی۔ یہ عقیدہ ختم کے منکر ہیں؛ جو کہ ضروریات اسلام میں سے ایک اہم عنصر شمار ہوتا ہے۔ ان فرقوں کو باتفاق مسلمین کافر کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ اور ان لوگوں کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں۔

۞ حدیث صحیح ہے۔بخاری ۳۹۱، کتاب الصلاۃ، حدیث انس، ابوداؤد ۲۶٤۱، الأحادیث الصحیحة (۳۰۳).

تَشْرِیح:......رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلَّى صَلاتَنَا، وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا، وَأَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا، فَهُوَ الْمُسْلِمُ، لَهُ مَا لَنَا وَعَلَيْهِ مَا عَلَيْنَا.)) ❶

''جس شخص نے ہمارے ساتھ نماز ادا کی ہمارے قبلہ کی طرف منہ کیا ہمارے ذبیحہ کو کھایا وہ مسلمان ہے اس کو وہی حقوق حاصل ہیں جو ہمیں حاصل ہیں اور اس پر وہی ذمہ داریاں ہیں جو ہم پر ہیں۔''

اس کلام میں شیخ طحاوی رحمہ اللہ اشارہ فرماتے ہیں: ''اسلام اور ایمان دونوں ایک ہی چیز ہے۔ اور یہ کہ کوئی مسلمان کسی گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کی بنا پر اسلام سے خارج نہیں ہوسکتا؛ جب تک وہ اس گناہ کو [حلال] جائز نہ سمجھے۔

❀ اور ہمارے اہل قبلہ سے وہ مراد ہے جو اسلام کا دعویدار ہو۔ اور کعبہ رخ ہوتا ہو [یعنی نماز میں]؛ اگر چہ وہ اہل بدعت میں سے ہو۔ یا پھر گنہگاروں کے زمرہ میں ہو۔ جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی تکذیب نہ کرے۔ ان دونوں جملوں کی تفصیل آئندہ اوراق میں اس پیرائے کی تشریح میں ملاحظہ فرمائیں:

((وَلا نُكَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ بِذَنْبٍ مَا لَمْ يَسْتَحِلَّهُ))

اور اس پیرائے کی تشریح میں: ((وَالإِيْمَانُ وَاحِدٌ وَأَهْلُهُ فِي أَصْلِهِ سَوَاءٌ))

اللہ تعالیٰ کے دین میں بحث وتکرار؟]

۵۵۔((وَلاَ نَخُوضُ فِی اللّٰہِ وَلاَ نُمَارِی فِی دِیْنِ اللّٰہِ .))

''نہ تو ہم اللہ تعالیٰ کے بارے میں بحث کرتے ہیں اور نہ ہم اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں جھگڑتے ہیں''۔

تَشرِیح :...... شیخ طحاوی رحمہ اللہ باطل پرست متکلمین کے کلام سے رکنے اور ان کا علم مذموم ہونے کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔اس لیے کہ وہ ذات الٰہی کی معرفت کے بارے میں بغیر علم اور بغیر کسی آسمانی دلیل کے بحث کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَی الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَ هُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰیo﴾(النجم: ۲۳)

''یہ لوگ محض ظن (فاسد) اور خواہشات نفس کے پیچھے چل رہے ہیں حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔''

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں کوئی کلمہ کہے۔ بلکہ وہی اوصاف بیان کرے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنا وصف بیان کیا ہے۔بعض ائمہ رحمہم اللہ علیہم فرماتے ہیں:''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جس کسی کو میں اپنے اسماء حسنیٰ اور صفات کے ساتھ قیام کی توفیق دیتا ہوں؛ اس پر میں ادب کو لازم کردیتا ہوں۔اور جس کے لئے اپنی ذات کی حقیقت سے پردہ کشائی کرتا ہے اس پر تھکاوٹ کو لازم کردیتا ہوں۔اب تمہاری مرضی ادب کا قرینہ اختیار کرو یا پھر تھکاوٹ کا راستہ''۔

اس کی واضح شہادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب پہاڑ کو تجلی سے نوازا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور زمین بوس ہوگیا ذات الٰہی کی عظمت کے سامنے ثابت نہ رہ سکا۔

[مشہور صوفی] شبلی [۲۴۷-۳۳۴ھ] کا قول ہے:''اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں زیادہ لمبی بحث کرنا ادب کے منافی ہے''۔

امام طحاوی رحمہ اللہ علیہ کا قول:''ہم اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں جھگڑا نہیں کرتے''اس کا مطلب یہ ہے کہ: ہم اہل حق کے سامنے باطل پرستوں اور بدعتیوں کی شبہات پیش کرکے جھگڑا اور بحث نہیں کرتے؛ کہ ہم ان کے ساتھ بحث بازی اور انھیں راہ حق سے پھیرنا چاہتے ہوں۔ بے شک انھیں راہ حق سے پھیرنے کی کوشش انھیں باطل کی طرف دعوت دینے اور حق میں تلبیس کرنے اور دین اسلام کو فاسد بنانے کے مترادف ہے۔

[قرآن پاک میں بحث ومباحثہ]

۵۶۔((وَلاَ نُجَادِلُ فِی الْقُرْآنِ وَنَشْهَدُ أَنَّهُ كَلَامُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ①نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُ الأَمِينُ فَعَلَّمَهُ سَيِّدَ الْمُرْسَلِينَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ كَلَامُ اللّٰهِ تَعَالَىٰ لَا يُسَاوِيهِ شَيْءٌ مِنْ كَلَامِ الْمَخْلُوقِينَ وَلاَ نَقُولُ بِخَلْقِهِ وَلاَ نُخَالِفُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِينَ .))

''ہم قرآن پاک میں مجادلہ نہیں کرتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ وہ رب العالمین کا کلام ہے اس کو روح الامین لے کر اترے اور سید المرسلین محمد ﷺ کو اس کی تعلیم دی وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے مخلوق کا کلام اس کے برابر نہیں ہوسکتا؛ نیز ہم قرآن پاک کو مخلوق نہیں سمجھتے؛ اور نہ ہم اجماع مسلمین کی مخالفت کرتے ہیں''۔

تشریح:......مصنف رحمہ اللہ کا قول: ''ہم قرآن پاک میں مجادلہ نہیں کرتے'' اس میں احتمال ہے کہ آپ کی مراد یہ ہو کہ ہم قرآن پاک کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہتے جیسی باتیں [اہل زیغ] ٹیڑھے راستے پر چلنے والے کرتے ہیں پھر اختلاف میں پڑتے ہیں۔ وہ باطل کے ساتھ جھگڑتے ہیں تا کہ حق کو پسپا کر دیں۔ بلکہ ہم کہتے ہیں:

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: بے شک علم کلام کی وجہ سے بعض اسلامی فرقوں کو جن سب سے بڑے فتنوں کا سامنا کرنا پڑا؛ وہ یہ کہ اس کی وجہ سے لوگ اس ایمان سے منحرف ہوگئے کہ قرآن اللہ تعالیٰ رب العالمین کا حقیقی کلام ہے؛ اس میں کچھ بھی مجاز نہیں۔ جبکہ معتزلہ کہتے ہیں: قرآن مخلوق ہے۔ وہ اس مسئلہ میں گمراہی اور رسوائی کا شکار ہیں۔ لیکن اہل سنت والجماعت کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو معتزلہ کے اس عقیدہ پر اور دیگر ان عقائد پر رد کرتے ہیں جن میں وہ اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں۔ اور وہ ہیں اشاعرہ اور ماتریدیہ۔ حقیقت میں وہ اس مسئلہ میں در پردہ معتزلہ کے ہم خیال ہیں؛ کہ قرآن مخلوق ہے؛ اور اللہ تعالیٰ کا بولا ہوا قول نہیں؛ مگر وہ صاف الفاظ میں اس کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ کلام الٰہی کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں: یہ قدیم نفسی ہے؛ اور یہ کہ اسے کسی بھی فرشتے اور نبی نے نہیں سنا؛ اور بیشک یہ کہ جب چاہیں اللہ تعالیٰ کلام نہیں کرتے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ قدیم سے متکلم ہیں؛۔ میں نے اس تفسیر کے رد پر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا ایک رسالہ دیکھا ہے؛ جس میں انہوں نے کلام کا قدیم ہونا ثابت کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: '' کلام صفت کمال ہے۔ بے شک کلام کرنے والا گونگے سے افضل ہوتا ہے۔ اور جو کوئی جانتا اور قدرت رکھتا ہے؛ وہ اس سے افضل ہے جو نہ ہی جانتا ہے اور نہ ہی قدرت رکھتا ہے۔ اور جو کوئی اپنی چاہت اور قدرت سے کلام کرتا ہے وہ اس سے افضل ہے جو اپنی چاہت اور قدرت سے کلام نہیں کرسکتا۔ اگر چہ یہ بھی معقول ہے۔ اور سلف صالحین کے اصولوں کے مطابق اسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنی یہ کہا جائے کہ: یا تو وہ کلام پر قادر ہوگا؛ یا اس پر قادر نہیں ہوگا۔ اگر وہ کلام پر قادر نہ ہو تو گونگا ہے۔ اگر وہ کلام پر قادر ہے اور بولتا نہیں تو وہ خاموش ہے۔ جبکہ اس مسئلہ میں اشاعرہ کے پیروکار کلابیہ کے نزدیک کلام مقدور نہیں ہے؛ پس ان کے لیے اس سے دلیل پیش کرنا ممکن نہیں۔ تو ان سے کہا جائے گا کہ یہ تو کلام کے قدیم ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ لیکن اس کے مدلول کا کلام کا قدیم ہونا بغیر قدرت اور چاہت کے متعین ہے؛ یا پھر اس کا مدلول یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے اپنی قدرت اور چاہت سے متکلم رہا ہے۔

پہلا قول کلابیہ کا ہے۔ اور دوسرا قول سلف صالحین؛ اہل حدیث اہل سنت والجماعت کا ہے۔ تو کہا جائے گا: اس کا مدلول دوسرا قول ہے نہ کہ پہلا۔ اس لیے کہ متکلم کی ذات کے ساتھ اس کی قدرت اور چاہت کے بغیر کلام کا اثبات غیر معقول اور نا معلوم سی چیز ہے۔ جب کہ کسی چیز پر حکم لگانا اس سے متعلق تصور کی فرع ہوتا ہے۔ پس یہ دلیل پیش کرنے والے سے کہا جائے گا: نہ ہی تم اور نہ ہی کوئی عاقل انسان ایسے کلام کا تصور کر سکتے ہو جو متکلم کی مرضی اور قدرت کے بغیر اس کی ذات کے ساتھ قائم ہو۔ تو پھر معقول دلیل سے ایسی چیز کیوں کر ثابت ہوسکتی ہے جو غیر معقول ہو۔

نیز آپ کا یہ کہنا کہ: ''اگر وہ کلام سے متصف نہ ہوا تو سکوت اور گونگے پن سے موصوف ہوگا'' بیشک یہ ایسے کلام میں تو معقول ہوسکتا ہے جو حروف اور آوازں پر مشتمل ہو۔

بے شک جب کوئی زندہ ان چیزوں کو کھودے؛ تو وہ متکلم نہیں رہتا۔ تو اس صورت میں یا تو وہ کلام پر قادر ہوگا؛ مگر بولتا نہیں ہوگا تو وہ خاموش ہے۔ اور اگر وہ کلام پر قادر ہی نہیں تو وہ گونگا ہے۔ اور جس کلام نفسی کا یہ دعوی کرتے ہیں وہ غیر معقول چیز ہے۔ اس لیے کہ جو کلام سے خالی ہو وہ یا تو خاموش ہوگا؛ یا گونگا ہوگا۔ اور اگر اس کو ثابت مان بھی لیا جائے تو بھی اس پر دلالت نہیں کرتا کہ کلام سے خالی ہونے والے کا خاموش ہونا یا گونگا ہونا واجب ٹھہرتا ہے۔ مزید برآں جس قدیم کلام نفسی کو آپ ثابت کرنا چاہتے ہو؛ یہ تو ثابت نہیں کر سکے کہ وہ ہے کیا چیز؟۔ بلکہ تم اس کا تصور بھی نہیں پیش کر سکے۔ اور کسی چیز کو ثابت کرنا اس کے تصور کی فرع ہوتی ہے اور جس چیز کا تصور ہی آپ کے پاس نہیں؛ تو اس کو ثابت کیسے کر سکتے ہو؟۔ اسی لیے ابوسعید بن کلاب جو اس طائفہ اشاعرہ کا سرکردہ اور امام ہے؛ اس نے بھی اس مسئلہ کے بیان میں کوئی معقول چیز پیش نہیں کی۔ بلکہ وہ تو کہتا ہے: یہ معنی سکوت اور گونگے پن کے متناقض ہے۔ خاموشی اور گونگا پن تب تصور کئے جا سکتے ہیں جب کلام تصور کیا جائے۔ خاموش وہ ہے جو بات نہ کرتا ہو؛ اور گونگا وہ ہے جو بات کرنے سے عاجز ہو؛ یا اسے کوئی ایسی آفت پیش آ گئی ہو جس کی وجہ سے وہ کلام نہ کر سکتا ہو۔ پس اس صورت میں خاموش اور گونگے کی معرفت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کلام کی معرفت نہ ہو؛ اور کلام کی معرفت تب تک نہیں ہو سکتی جب تک خاموشی اور گنگ کی معرفت نہ ہو۔

پس یہ واضح ہو گیا کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں؛ نہ وہ اس کا تصور پیش کر سکے ہیں؛ اور نہ ہی اسے ثابت کر سکے ہیں۔ بلکہ وہ کلام کے مسئلہ میں عیسائیوں کے کلمہ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ وہ اقانیم اور تثلیث اور اتحاد میں ایسی باتیں کہتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں جن کا نہ تصور کر سکتے ہیں اور نہ ہی اسے بیان کر سکتے ہیں۔ جبکہ انبیاء علیہم السلام جب کسی چیز کی خبر دیتے ہیں؛ ہم اس کا تصور نہ بھی کر سکیں تو اس کی تصدیق کرنا واجب ہو جاتی ہے۔ اور جو چیز عقل سے ثابت ہوتی ہے؛ تو اس کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ اس کا قائل پہلے اس کا تصور پیش کرے۔ وگرنہ وہ بلا علم کلام کرنے والا ہوگا۔ پس عیسائیوں میں یہ مرض ہے کہ وہ بغیر علم کے کلام کرتے ہیں۔ تو ان کے کلام میں تناقض پایا جاتا ہے۔ اور ان کی کوئی بات معقول نہیں ہوتی۔ ایسے ہی جو کوئی اللہ تعالیٰ کے کلام کے متعلق بغیر علم کے بات کرتا ہے؛ اس کے کلام میں تناقض پایا جاتا ہے۔ اس کی کوئی بات معقول نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں پر یہ طعنہ اور عیب وارد ہوتا ہے کہ وہ دین کی اصل اور اللہ تعالیٰ کے کلام کی حقیقت اور تمام لوگوں کے کلام کی حقیقت کی معرفت کے لیے اخطل نامی ایک عیسائی شاعر کے شعر سے دلیل پیش کرتے ہیں؛ جو کہتا ہے: ''بیشک کلام دل میں ہوتا ہے؛ اور زبان کو دل کی بات کے اظہار پر دلیل بنایا گیا ہے''۔ اور ایک گروہ کہتا ہے: ''یہ اس شاعر کا شعر نہیں۔ اور اگر اسی شاعر کا شعر مان بھی لیا جائے تو پھر بھی عقلی حقائق اور لفظ کلام کا مسمی جس کے ساتھ تمام بنی آدم کلام کرتے ہیں؛ اس میں ہزار فاضل شاعروں کی بات کی طرف رجوع نہیں کیا جا سکتا؛ اس اخطل کو تو چھوڑیے''۔ یہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے کلام کا خلاصہ ہے۔ [مجموع الفتاوی ٥/ ٢٩٤۔- ٢٩٧]

﴿وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ٥ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ٥﴾ [شعراء ۱۹۲-۱۹۳]

''بے شک قرآن کریم رب العالمین کا کلام ہے۔ جس کو روح الامین لے کر نازل ہوئے .... الخ۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ: ''ہم ثابت شدہ قرأت میں بحث و مباحثہ نہیں کرتے۔ بلکہ صحیح اور ثابت قرأت پر ہی اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ ہر دو معانی [ومفہوم] برحق ہیں۔ دوسرے معنی کی صحت کی گواہی اس حدیث سے ملتی ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے؛ آپ فرماتے ہیں: ''میں نے ایک آدمی سے سنا وہ ایک آیت پڑھ رہا تھا۔ جبکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی آیت کی قرأت سنی تھی کہ آپ اس کے خلاف تلاوت فرما رہے تھے۔ میں نے اس کو ہاتھ سے پکڑا؛ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا؛ اور یہ واقعہ آپ کو کہہ سنایا۔ تو میں نے آپ کے چہرہ سے ناراضگی محسوس کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم دونوں درست قرأت کرتے ہو۔ یاد رکھو اختلاف نہ کیا کرو۔ بے شک تم سے پہلے لوگوں نے اختلاف کیا تو وہ تباہ ہو گئے''۔ [1]

[1] حدیث صحیح ہے بخاری نے روایت کیا ہے؛ مسلم میں نہیں۔ بخاری کا باب الخصومات نیز باب الانبیاء دیکھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے اختلاف سے منع کیا ہے جس میں ہر اختلاف کرنے والا دوسرے کا انکار کرتا ہو حالانکہ دوسرے فریق کے پاس بھی حق موجود ہے۔ پس زیر بحث مسئلہ میں دونوں قاری اپنی اپنی قرأت میں درست [اور حق وصواب پر] تھے۔ اور اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ ہم سے پہلے لوگوں نے اختلاف کیا؛ تو وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ اسی لیے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ''امت محمدیہ کا ادراک کرو؛ ان میں اختلاف رونما نہ ہونے پائے جس طرح پہلی امتوں میں اختلاف ہوا''۔ [البخاری ٤٩٨٧]

تو آپ نے تمام لوگوں کو ایک قرأت پر ایک مقبول اجتماع کی صورت میں جمع کر دیا۔ اہل اجماع معصوم ہیں؛ وہ غلطی پر جمع نہیں ہو سکتے۔ پھر اس سے نہ کوئی ترک واجب کا لازم آتا تھا اور نہ کسی ممنوع فعل کا ارتکاب لازم آتا تھا۔ جبکہ قرآن پاک کو سات قرأتوں پر پڑھنا جائز تو ہے؛ فرض نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک رخصت تھی۔ انھیں یہ اختیار دیا تھا کہ سات قرأتوں میں سے کوئی بھی قرأت اختیار کر لیں۔ جس طرح سورتوں کی ترتیب بھی ان پر منصوص واجب نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف کی ترتیب مصحف عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر مصاحف کی ترتیب سے مختلف تھی۔ البتہ سورتوں کی آیات کی ترتیب منصوص ہے۔ اور انھیں کسی آیت کو دوسری آیت سے مقدم کرنے کی اجازت نہ تھی۔ بخلاف سورتوں کی ترتیب کے۔ پس جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے محسوس کیا کہ اگر امت مسلمہ کو ایک قرأت پر مجتمع نہ کیا تو خطرہ ہے کہ ان میں اختلاف پڑ جائے گا؛ وہ گروہوں میں بٹ جائیں گے؛ اور معاملہ قتل و قتال تک پہنچ سکتا ہے؛ تو اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے امت مسلمہ کو ایک قرأت پر جمع کیا۔ یہ جمہور سلف میں سے علماء اور قراء کا قول ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات نے بھی یہی کہا ہے۔ بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ: ''بے شک سات قرأتوں پر پڑھنے کی اجازت اسلام کے شروع میں تھی۔ اس وقت ایک قراءت کی محافظت میں ان پر مشقت تھی۔ جب ان کی زبانیں قرأت پر رواں دواں ہو گئیں؛ تو ایک قرأت پر اتفاق ہونا آسان ہو گیا؛ اور یہی ان کے لیے زیادہ بہتر اور مناسب بھی تھا؛ تو وہ اس قرأت پر مجتمع ہو گئے جو بالکل آخری بار پیش کی جانے والی تھی''۔

فقہا اور متکلمین رحمہم اللہ کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ مصحف سات قرأتوں پر مشتمل ہے۔ ان سات قرأتوں میں سے کسی قراءت کو چھوڑنا جائز نہیں۔ اور یقیناً ان کا مصحف عثمان رضی اللہ عنہ کو نقل کرنے پر اتفاق ہو گیا تھا؛ تو دیگر مصاحف کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ اشارۃً پہلے بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ کہ سات قرأتوں پر پڑھنا جائز تو تھا؛ مگر فرض نہ تھا۔ یا اب وہ منسوخ ہو چکا ہے۔

اور رہا یہ مسئلہ جس کسی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا ہے کہ: ''آپ قرأت بالمعنیٰ کو جائز سمجھتے تھے'' تو یقیناً اس نے آپ رضی اللہ عنہ پر جھوٹ بولا ہے۔ انھوں نے صرف یہ کہا ہے: ''میں نے مختلف قراء کی قراءتوں کا جائزہ لیا تو انھیں باہم قریب پایا''۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے تم میں سے کوئی کہے: ''ھَلُمَّ؛ تعال اور اقبل ان تینوں الفاظ کا معنی ایک ہے۔ پس جیسے تم نے اس کی تعلیم حاصل کی ہے؛ اسی طرح قرأت کرو''۔ یا اس جیسی بات ارشاد فرمائی۔ [الطبرانی ۸۶۸۰؛ مجموع الفتاوی ۱۳/ ۳۹۵]

اور بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ: ﴿وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ﴾ [العنکبوت ٤٦] ''ہم اہل کتاب سے بحث و تکرار نہ کریں مگر احسن طریق سے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں''۔ [ان کے ساتھ سخت مجادلہ ہو سکتا ہے]۔ تو اہل قبلہ سے مجادلہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

مجموعی طور پر اہل قبلہ اہل کتاب سے تو بہتر ہیں۔ پس اہل قبلہ میں سے جو لوگ ظلم نہیں کرتے؛ ان کے ساتھ احسن طریق کے بغیر مناظرہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب وہ خطأ کرے جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ: ''بیشک وہ کافر ہے''۔ جب تک کہ اس پر وہ دلیل واضح نہ کر دی جائے جس کے ترک کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر ہونے کا حکم لگایا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت سے خطاء اور نسیان کو معاف کر دیا ہے''۔ [ابن ماجة ۲۰۵٤]۔ اسی لیے ایسے لوگوں کی سلف علماء نے مذمت کی ہے جو خواہشات کے تابع ہیں۔ اور بتایا ہے کہ ان کا

آخری انجام تلوار پر ہوتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت آئندہ اوراق میں اس بحث میں آئے گی:

((ونرى الجماعة حقاً وّصواباً، والفرقة زيغاً وعذاباً.)) ان شاء اللہ تعالیٰ۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول: "ہم گواہی دیتے ہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے" اس پر مفصل گفتگو پہلے اس پیرائے کی تشریح میں گزر چکی ہے: "بیشک قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے؛ اسی کی طرف سے شروع ہوا............" الخ۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ الشعراء (۱۹۳)۔ "قرآن پاک کو روح امین لے کر نازل ہوا"۔

روح الامین سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ ان کو روح اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بشری رسولوں علیہم السلام کی طرف حامل وحی ہیں جس سے دلوں کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اور آپ ایسے امین ہیں کہ امانت کا حق ادا ہو۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے درود و برکات ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ٥ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ٥ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ٥﴾ (الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۵)

"اس کو روح الامین فرشتہ لے کر اترا؛ آپ کے دل پر؛ تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔ فصیح عربی زبان میں۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ٥ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ٥ مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ٥﴾ (التكوير: ۱۹۔۲۱)

"بے شک یہ عالی فرشتہ کی زبان کا پیغام ہے جو قوت والا مالک عرش کے ہاں مقام والا ہے سردار اور امانت دار ہے۔"

ان آیات میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا وصف بیان ہوا ہے۔ بخلاف اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ٥ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ﴾ (الحاقه: ۴۰، ۴۱)

"بے شک یہ رسول کریم کی زبانی پیغام ہے۔ وہ کسی شاعر کی بات نہیں۔"

بلا شک وشبہ یہاں پر رسول سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

❀ امام طحاوی رحمہ اللہ کا یہ قول: "حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سید المرسلین کو تعلیم دی" اس میں صراحت ہے کہ حضرت جبریل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی تعلیم دی۔ اس پیرائے میں قرامطہ اور دیگر فرقوں کے اس خیال کو غلط قرار دے رہا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کے دل میں الہام کا تصور قائم کیا۔

❀ امام طحاوی رحمہ اللہ کا یہ قول: "ہم قرآن پاک کو مخلوق نہیں کہتے؛ اور نہ ہی ہم مسلمانوں کی جماعت کی مخالفت کرتے ہیں"۔ اس میں تنبیہ ہے کہ جو لوگ قرآن پاک کو مخلوق کہتے ہیں؛ وہ مسلمانوں کے جماعت کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سلف صالحین رحمہم اللہ امت کے تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا حقیقی کلام ہے؛ وہ مخلوق نہیں۔ [بلکہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ] کا قول: "ہم مسلمانوں کی جماعت کی مخالفت نہیں کرتے" یہ مطلق طور پر ہے۔ یعنی وہ تمام مسائل میں جن پر مسلمانوں کی جماعت کا اتفاق ہو چکا ہے؛ ان میں ہم ان کی مخالفت نہیں کرتے؛ اس لیے کہ اس اجماع کی مخالفت گمراہی؛ بدعت اور راہ حق سے دوری ہے۔

[مسئلہ تکفیر کی وضاحت:]

57 ¾ ((وَلاَ نُكَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ بِذَنْبٍ مَا لَمْ يَسْتَحِلَّهُ❺ .))①

''اہل قبلہ میں سے کسی کو کسی گناہ کے سبب ہم کافر نہیں کہتے جب تک کہ وہ اس کام کو حلال نہ جانے''۔

❺۔علامہ بن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مصنف رحمہ اللہ کا فرمان: (وَلاَ نُكَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ بِذَنْبٍ مَا لَمْ يَسْتَحِلَّهُ) ''اہل قبلہ میں سے کسی کو کسی گناہ کے سبب ہم کافر نہیں کہتے جب تک کہ وہ اس کام کو حلال نہ جانے''۔اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ بیشک اہل سنت والجماعت کسی مسلمان؛ توحید پرست مؤمن؛ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے کو کسی گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے کافر نہیں کہتے؛ جیسے زنا؛ شراب نوشی؛ سودخوری؛ والدین کی نافرمانی اور ان جیسے دوسرے گناہ؛ جب تک کہ وہ ان کو حلال نہ سمجھے۔اگر وہ ان کو حلال سمجھتا ہے تو کافر ہو گیا۔اس لیے کہ اب وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی بات کو جھٹلانے لگ گیا ہے۔اور دین سے خارج ہو گیا۔ہاں اگر وہ گناہ کو حلال نہیں سمجھتا تو اہل سنت والجماعت کے نزدیک وہ کافر نہیں ہوگا۔بلکہ وہ انتہائی کمزور ایمان والا مسلمان ہی رہے گا۔اور اس کے گناہ کے حساب سے اس پر فاسق ہونے کا حکم لگے گا؛ اور اس پر شرعی حدود قائم ہوں گی۔جیسے شریعت مطہرہ میں وارد ہوا ہے۔یہ تو اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔

خوارج اور معتزلہ اس کے خلاف ہیں؛ اور ان کا مسلک ایک باطل مسلک ہے۔اس لیے کہ خوارج گناہ کی وجہ سے انسان کو کافر کہتے ہیں۔اور معتزلہ اسے مسلمان اور کافر کے درمیان ایک منزل پر قرار دیتے ہیں۔یعنی وہ دنیا میں اسلام اور کفر کے درمیان میں رہے گا۔جب کہ آخرت کے متعلق ان کا عقیدہ بھی خوارج والا ہے؛ کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں چلا جائے گا۔ان دونوں گروہوں کا عقیدہ کتاب اللہ تعالیٰ؛ سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع سلف امت کی روشنی میں باطل ہے۔ان کا معاملہ بعض حضرات پر ان کی کم علمی کی وجہ سے شک وشبہ اور التباس میں پڑ گیا ہے۔لیکن یہ معاملہ اہل حق کے ہاں بڑا واضح ہے؛ جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا؛ والحمد للہ۔ وباللہ التوفیق۔

①۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: ''مطلب یہ ہے کہ دل اور عقیدہ سے اس کو حلال نہ سمجھے ورنہ ہر گنہگار جب عملی طور پر گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ اسے حلال سمجھ ہی لیتا ہے۔پس اس لیے یہ فرق کرنا ضروری ہے کہ اگر کوئی عقیدۃً بھی اس گناہ کو حلال سمجھے گا؛ تو وہ بہ اجماع مسلمین کافر ہو گیا۔اور اگر وہ صرف گناہ کا کام کرتا ہے؛ مگر عقیدۃً اس کو حلال نہیں سمجھتا تو وہ گنہگار رہے؛ اور اپنے اس گناہ پر عذاب کا مستحق ہے؛ ہاں اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو اسے معاف کر دیں۔اور اس کے ایمان کی وجہ سے اسے نجات مل جائے۔یہ عقیدہ خوارج اور معتزلہ کے عقیدہ کے برعکس ہے؛ جو کہتے ہیں: گنہگار ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔اگر چہ ان کے مابین بھی اس گنہگار کو کافر یا منافق کہنے کے بارے میں اختلاف ہے۔یہاں سے ایک نیا گروہ سامنے آیا؛ جو اس مسئلہ میں ان لوگوں کے پیروکار بنے؛ اور وہ جمہور مسلمین؛ حکمرانوں اور رعایا کو کافر قرار دینے لگے۔ان کے کچھ گروہ سوریا میں اور مکہ میں اور دیگر علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ان کے بھی بہت سارے شبہات خوارج کے شبہات کی طرح ہیں مثلاً وہ نصوص جن میں ہے کہ: فلاں فلاں کام کرنے والا کافر ہے۔شارح رحمہ اللہ نے ان نصوص کی کافی تعداد ذکر کی ہے۔اور اہل سنت؛ جو کہتے ہیں کہ: ایمان قول اور عمل کا نام ہے؛ گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ان سے بھی نقل کیا ہے کہ گناہ خواہ کوئی بھی ہو؛ وہ عملی کفر ہے اعتقادی کفر نہیں۔اور ان کے ہاں کفر کے مراتب ہیں۔کفر اصغر؛ کفر اکبر۔جیسا کہ ان کے ہاں ایمان کے مراتب ہیں۔پھر اس پر ایک اہم مثال بیان کی ہے؛ جس کو سمجھنے سے یہ نئی پود قاصر رہی ہے۔جس کی طرف شارح رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: یہاں پر ایک اہم قاعدہ سمجھنا چاہیے؛ وہ یہ ہے کہ: کتاب اللہ تعالیٰ کے خلاف فیصلہ کرنا کبھی ایسا کفر ہوتا ہے جو ملت اسلام سے خارج کر دے؛ اور کبھی صرف معصیت یعنی گناہ کا کام ہوتا ہے؛ خواہ یہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ۔اور کبھی کفر مجازی ہوگا اور کبھی کفر اصغر۔ان مذکورہ اقوال کے مطابق: فیصلہ کرنے والے کے حالات کے مطابق حکم لگایا جائے گا۔اگر ایک شخص اس اعتقاد کے ساتھ کتاب اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کرتا ہے کہ کتاب اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری نہیں؛ یا اس میں اختیار ہے؛ یا قرآن کے کلام اللہ تعالیٰ ہونے کے علم و یقین کے باوجود استخفاف کے طور پر اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو یہ کفر بہت بڑا کفر ہوگا۔اور اگر اعتقاد تو یہ ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق فیصلہ کرنا ضروری ہے؛ اور وہ اس وقعہ میں [قرآنی حکم کا] علم بھی رکھتا ہے؛ اور وہ سمجھتا ہے کہ مخالفت کی صورت میں وہ عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا؛ مگر اس کے باوجود تجاوز کر کے اس کے برعکس فیصلہ کرتا ہے؛ تو اس صورت میں اس کا اعراض معصیت سمجھا جائے گا اور اس کے کفر کو مجازی یا کفر اصغر سمجھا جائے گا۔اور اگر پوری کوشش کرنے کے باوجود اس کی نظروں سے کتاب وسنت کا فیصلہ مخفی رہا اور اس نے خطا کرتے ہوئے کتاب وسنت کے خلاف قدم اٹھایا تو یہ انسان خطا کار ہے اس کو کوشش کرنے کی بناء پر ثواب حاصل ہوگا اور اس کی غلطی معاف ہوگی۔

ایمان پر گناہ کے اثرات

58۔((وَلاَ نَقُولُ لاَ یَضُرُّ مَعَ الإِیْمَان ذَنْبٌ لِّمَنْ عَمِلَهٗ① .))

''اور ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ایمان کے ساتھ گناہ گنہگار کے لیے کچھ بھی ضرر رساں نہیں''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس لیے کہ اس سلسلہ میں مرجئہ کا عقیدہ گنہگار مسلمانوں کے حق میں وارد ہونے والی آیات وعید اور احادیث مبارکہ کی تکذیب کی طرف لے جاتا ہے۔اس لیے کہ بہت سارے گنہگار جہنم میں داخل ہوں گے۔پھر شفاعت یا کسی دوسری وجہ سے نجات پائیں گے۔

تَشْرِیح:......اہل قبلہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ ان کا ذکر پہلے اس پیرائے میں ہو چکا ہے:''ہم تمام اہل قبلہ کو مسلمان اور مومن سمجھتے ہیں جب تک وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو تسلیم کریں اور آپ کے اقوال وافعال کی تصدیق کریں''۔اس کلام سے شیخ رحمہ اللہ کا مقصود خوارج کی تردید ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کافر ہے۔

-اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائیں اور ہم پر بھی- جان لیجیے کہ: مسئلہ تکفیر اور عدم تکفیر ایک ایسا اہم باب ہے جس میں بہت بڑا فتنہ اور آزمائش پیدا ہوگئے ہیں؛ اور اس میں بہت زیادہ افتراق اور آراء وافکار میں شدید اختلاف سامنے آیا ہے۔اور اس کے دلائل میں بھی شدید تعارض ہے۔اس میں عام لوگوں کا بھی یہی عالم ہے۔ جو مختلف فرقوں اور فاسد عقائد؛ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کے ساتھ مبعوث کردہ حق کی مخالفت کے مرتکب؛ یا عقائد میں ان کے مخالفین؛ اہل کبائر کی تکفیر میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔اس میں لوگ دو انتہاؤں اور متوسط راہ پر ہیں [یعنی اس میں تین اقوال ہیں]۔یہ اختلاف بھی عملی کبیرہ گناہوں کے مرتکب افراد کی تکفیر میں اختلاف کی جنس سے ہے۔

پہلا قول: ایک فریق کا خیال ہے کہ ہم کسی اہل قبلہ کو کافر نہیں کہیں گے۔ یہ لوگ تکفیر کی عام نفی کرتے ہیں۔حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اہل قبلہ میں منافقین بھی ہیں؛ جن میں بعض تو کتاب وسنت اور اجماع کی روشنی میں یہود ونصاریٰ سے بھی بڑے کافر ہیں۔اور کچھ ایسے ہی بھی ہیں جب ان کے لیے ممکن ہو تو وہ شریعت بیزاری کا اظہار بھی کرتے ہیں؛ حالانکہ وہ بظاہر کلمہ شہادت پڑھتے ہیں۔مزید برآں اس مسئلہ میں کسی کو اختلاف نہیں کہ اگر کوئی شخص ظاہری فرائض متواترہ اور ظاہری محرمات متواترہ کا انکار کرتا ہے؛ یا اس جیسا کوئی دیگر کام کرتا ہے؛ تو ایسے شخص کو توبہ کرنے کا حکم دیا جائے گا؛ اگر توبہ کر لے تو بہتر ہے؛ وگرنہ اس کو کافر مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا۔خیال رہے نفاق اور ارتداد کا منشاء فسق و فجور اور بدعات ہیں۔جیسا کہ امام خلال رحمہ اللہ نے اپنی کتاب''السنۃ'' میں سند کے ساتھ محمد بن سیرین کا قول ذکر کیا ہے؛ آپ فرماتے ہیں:''اہل بدعت [خواہشات پرست] لوگوں میں سب سے جلدی مرتد ہونے والے ہوتے ہیں۔آپ کے نزدیک ذیل کی آیت کا شان نزول انہی کے حق میں ہوا ہے:

﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ﴾(الانعام: ۶۸)

''اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات میں اٹکل پچو مار رہے ہیں تو ان سے منہ موڑ لیں ؛حتی کہ وہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں۔''

یہی وجہ ہے کہ بہت سارے ائمہ کرام رحمہم اللہ مطلق طور پر یہ بات نہیں کہتے ہیں کہ: ''ہم اہل قبلہ میں سے کسی کو گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے''۔ بلکہ وہ کہتے ہیں: ہم ہر کبیرہ گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے ؛ جیسے خوارج کے کرتوت ہیں۔

پس نفیِ عموم اور نفیِ عام میں فرق واضح ہے۔اور واجب عموم کی نفی ہے؛ تاکہ خوارج کی بات کا رد ہو جائے جو ہر طرح کے گناہ کے مرتکب کو کافر کہتے ہیں۔یہی وجہ ہے- واللہ اعلم -کہ شیخ طحاوی رحمہ اللہ نے اس کے قید لگائی ہے: ''جب تک وہ حلال نہ سمجھے''۔حلال نہ سمجھنے میں اشارہ ہے کہ اس سے آپ کی مراد ہر عملی گناہ کی عام نفی ہے؛علمی گناہ مراد نہیں۔

لیکن یہاں ایک اشکال ہے کہ شارع نے مکلّف کے لیے عملیات میں صرف عمل کو کافی نہیں سمجھا؛ بلکہ علم کو بھی شامل کیا ہے اسی طرح علمیات میں عمل کے بغیر صرف علم کو کافی سمجھا ہے؛ اور عمل کا اطلاق صرف جوارح کے اعمال پر نہیں ہوتا بلکہ دل کے اعمال کو جوارح کے عمل کے لیے اصل قرار دیا ہے اور جوارح کے اعمال اس کے تابع ہوتے ہیں۔ہاں مصنف کا یہ قول گناہ کو حلال سمجھنا؛ اس کا عقیدہ رکھنے کو شامل ہے؛[تو پھر دل کے عمل کو ہی اصل کہا جائے گا]۔

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان:(وَلاَ نَقُولُ لاَ يَضُرُّ مَعَ الإِيْمَان ذَنْبٌ لِّمَنْ عَمِلَهُ .)

''ہم اس بات کے قائل نہیں کہ ایمان کے ساتھ گناہ گنہگار کے لیے ضرر رساں نہیں ......الخ''

اس میں مرجیۂ کا رد ہے۔ان کا عقیدہ ہے کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ نقصان دہ نہیں ہوتا۔جیسے کفر کے ساتھ اطاعت کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔یہ لوگ ایک انتہاء پر ہیں۔ان کے مقابلہ میں خوارج دوسری انتہاء پر ہیں؛ وہ کہتے ہیں: بے شک ہم ہر ایک گناہ کی وجہ سے یا پھر ہر کبیرہ گناہ کی وجہ سے مسلمان کو کافر کہتے ہیں۔بالکل اسی طرح معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے سارا ایمان مکمل طور پر ضائع ہو جاتا ہے۔اس کے پاس ایمان میں سے کچھ باقی نہیں رہتا۔لیکن [اتنا فرق ہے کہ] خوارج کہتے ہیں:''[کبیرہ گناہ کا مرتکب] ایمان سے نکل کر کفر میں داخل ہو جاتا ہے۔اور معتزلہ کے ہاں ایمان سے تو نکل جاتا ہے البتہ کفر میں داخل نہیں ہوتا۔اس کو وہ [دو منزلوں کی درمیانی منزل] ایمان اور کفر کے درمیان ایک زائد مرتبہ قرار دیتے ہیں۔اور ان کو ایمان سے خارج قرار دینے کی وجہ سے انھیں دائمہ جہنمی سمجھتے ہیں۔جبکہ متکلمین فقہاء اور محدثین رحمہم اللہ کا ایک گروہ اعمال میں اس نظریہ کا قائل نہیں ہے۔لیکن بدعتی اعتقادات؛ اگرچہ ان اعتقادات والا متأول ہی کیوں نہ ہو؛ ہر اس شخص کو کافر کہتے ہیں جو ان کا قائل ہے۔وہ اس سلسلہ میں خطا کار مجتہد اور کسی دوسرے میں کچھ فرق نہیں کرتے ؛ بلکہ وہ ہر مبتدع کو کافر کہتے ہیں۔

اس عمومی اثبات کے لحاظ سے ان پر بہت بڑے اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔بلا شک وشبہ نصوص متواترہ دلالت کرتی ہیں کہ ان لوگوں کو دوزخ کی آگ سے باہر نکالا جائے گا؛ جن کے دل میں ذرہ برابر ایمان موجود ہو گا''۔اسی طرح وہ نصوص وعد جن سے یہ لوگ استدلال پیش کرتے ہیں؛ وہ ان نصوص وعید سے ٹکراتی ہیں جن سے دوسرے لوگ استدلال کرتے ہیں۔اور وعید کے متعلق کلام اپنی جگہ پر تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔اس پر تفصیلاً بحث آئندہ اوراق میں ذکر کی جائے گی۔جب ہم ذکر کریں گے کہ:''اہل کبائر جہنم میں

ہمیشہ نہیں رہیں گے؛ جب وہ اس حال میں مرے ہوں کہ وہ موحد ہوں''۔

یہاں پر مقصود یہ ہے کہ بدعات بھی اسی جنس سے شمار ہوتی ہیں۔ بے شک ایک شخص ظاہری اور باطنی طور پر تو مومن ہے لیکن کہیں پر تأویل کرتا ہے؛ جس میں خطا کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ اب یا تو وہ مجتہد ہوگا؛ یا پھر راہِ اعتدال کو ترک کرنے والا گنہگار ہوگا۔ تو اس صورت میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ صرف اس بنا پر اس کا ایمان ضائع ہوگیا۔ ہاں اگر اس پر کوئی شرعی دلیل موجود ہو تو علیحدہ بات ہے۔ بلکہ یہ تو خوارج اور معتزلہ کے کلام کی جنس ہی ہے۔ اور ہم یہ نہیں کہتے: ''وہ کافر نہیں ہوتا''۔ بلکہ عدل تو راہ اعتدال اختیار کرنے میں ہے۔ یہ کہ بلاشک وشبہ باطل مبتدع اور حرام اقوال؛ جو ایسی چیز کی نفی کو شامل ہوں جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو؛ یا ایسی بات ثابت کرتے ہوں جن کی رسول اللہ ﷺ نے نفی کی ہو؛ یا ایسی بات کا حکم دیتے ہوں جن سے آپ ﷺ نے منع کیا ہو؛ اور ایسی چیز سے منع کرتے ہوں جس کا آپ نے حکم دیا ہو۔ تو ایسے لوگوں کے بارے میں حق بات کہی جائے گی۔ اور ان کے بارے میں ہم اسی وعید کے قائل ہیں جو نصوص سے ثابت ہے؛ اور ان نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ: ایسا کرنا / کہنا کفر ہے۔ تو اب کہا جائے گا: جو ایسی بات کہے گا: وہ کافر ہے۔ اکثر مشاہیر علمائے اہل سنت رحمہم اللہ ان لوگوں کو کافر کہتے ہیں جو قرآن کو مخلوق کہتے ہیں؛ اور جن کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو آخرت میں نہیں دیکھا جاسکے گا؛ اور یہ کہ اشیاء کے وقوع سے پہلے اللہ تعالیٰ بھی ان کو نہیں جانتا۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے؛ فرماتے ہیں: ''میں نے کافی عرصہ تک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مناظرہ کیا۔ اور پھر ہمارا اتفاق ہوگیا کہ جو کوئی قرآن کے مخلوق ہونے کا عقیدہ رکھے وہ کافر ہے''۔[مختصر العلو ۱۵۹]

جہاں تک کسی متعین شخص کے متعلق کہا جائے: کیا آپ اس کے اہل وعید میں سے ہونے کی گواہی دیتے ہو؛ اور یہ کہ وہ بے شک وہ کافر ہے؟۔ تو ایسے شخص کے بارے میں ہم ایسی کوئی گواہی نہیں دیتے؛ ہاں اگر ایسا کوئی امر/ دلیل موجود ہو جس کی روشنی میں ایسی گواہی دینا جائز ہو۔ بے شک یہ بہت بڑی سرکشی/ زیادتی ہوگی کہ کسی متعین شخص کی بابت گواہی دیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہیں فرمائیں گے؛ اور نہ اس پر رحم فرمائیں گے؛ بلکہ اسے دائمی طور پر جہنم میں رکھیں گے۔ بے شک ایسا حکم کافر پر اس کے مرنے کے بعد لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سنن ابوداؤد کی کتاب الادب میں باب النھی عن البغی: میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا؛ آپ فرماتے تھے:

((كَانَ رَجُلَانِ فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ مُتَوَاخِيَيْنِ فَكَانَ أَحَدُهُمَا يُذْنِبُ وَالآخَرُ مُجْتَهِدٌ فِي الْعِبَادَةِ فَكَانَ لَا يَزَالُ الْمُجْتَهِدُ يَرَى الآخَرَ عَلَى الذَّنْبِ . فَيَقُولُ أَقْصِرْ . فَوَجَدَهُ يَوْماً عَلَىٰ ذَنْبٍ فَقَالَ لَهُ أَقْصِرْ . فَقَالَ خَلِّنِي وَرَبِّي أَبُعِثْتَ عَلَيَّ رَقِيباً . فَقَالَ: وَ اللّٰهِ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ أَوْ لَا يُدْخِلُكَ اللّٰهُ الْجَنَّةَ . فَقُبِضَ أَرْوَاحُهُمَا فَاجْتَمَعَا عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ . فَقَالَ: لِهٰذَا الْمُجْتَهِدِ أَ كُنْتَ بِي عَالِماً؟ أَوْكُنْتَ عَلَىٰ مَا فِي يَدِي قَادِراً وَقَالَ لِلْمُذْنِبِ: اِذْهَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ؛ بِرَحْمَتِي . وَقَالَ لِلآخَرِ: اِذْهَبُوا بِهِ إِلَى النَّارِ . قال ابوهريرة رضي الله عنه: '' وَالَّذِيْ نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَوْبَقَتْ دُنْيَاهُ وَآخِرَتَهُ''۔ [1]

[1] یہ حدیث حسن ہے اس میں ایک راوی عکرمہ بن عمار ہے امام مسلم نے اس قابل حجت کہا ہے جب کہ اس میں ضعف ہے۔ ابوداؤد ۴۹۰۱۔

''بنی اسرائیل میں دو بھائی تھے ایک گنہگار تھا؛ دوسرا عابد زاہد۔ چنانچہ عابد زاہد جب اپنے گنہگار بھائی کو گناہ کرتے دیکھتا تو اس کو رکنے کی تلقین کرتا۔ ایک روز کا اس نے اس کو ایک گناہ پر پایا؛ اور اس سے کہا باز آجا۔ اس نے جواب دیا: ''میرا معاملہ میرے رب کے سپرد کرو تمھیں مجھ پر کوئی نگہبان تو مقرر نہیں کیا گیا''۔ اس نے کہا: ''اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا ؛ یا تجھے جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ پس ان کی ارواح کو قبض کر لیا گیا؛ اور وہ دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں اکھٹے ہو گئے۔ تو [اللہ تعالیٰ نے] عابد سے کہا: کیا تو میرے متعلق بہت زیادہ جانتا تھا؟ یا تجھے میرے کاموں پر قدرت حاصل تھی؟۔ اور گنہگار سے کہا : جاؤ میری رحمت کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اور عابد کے متعلق حکم دیا کہ اسے دوزخ میں ڈال دو''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اسی ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے!''اس عابد نے ایسا کلمہ کہا جس نے اس کی دنیا اور آخرت کو برباد کر ڈالا۔'' (یہ حدیث حسن ہے)۔

اس لیے کہ ایک متعین شخص کے متعلق امکان ہوتا ہے کہ اپنے اجتہاد سے کوئی غلط کام کر رہا ہو؛ وہ بخشا ہوا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کو [اس گناہ سے متعلق] روایات اور نصوص نہ پہنچی ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے اس کا بڑا ایمان ہو اور نیکی کے ایسے کام ہوں؛ جو اس کے لیے رحمت باری تعالیٰ کو واجب کرتے ہوں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو معاف کر دیا جس نے کہا تھا کہ:

''جب میں فوت ہو جاؤں تو مجھے پیس لینا؛ پھر مجھے ہوا میں اڑا دینا''۔ محض اس ڈر اور خوف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف کر دیا''۔ [1]

[1] صحیح بخاری ۳٤٨١ : مسلم ٢٧٥٦ .

حالانکہ وہ شخص سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوبارہ جمع کرنے اور اٹھانے پر قادر نہیں ہے۔ یا اس میں شک وشبہ کا شکار تھا۔ لیکن آخرت کے بارے میں یہ توقف ہمیں اس بات سے روکتا نہیں کہ ہم اس کو دنیا میں عذاب دیں تاکہ اسے بدعت سے روکا جائے۔ اور اس سے توبہ کروائیں؛ اگر توبہ کر لے؛ تو بہتر؛ وگرنہ ہم اسے قتل کر دیں گے۔ پھر جب کوئی بات بذات خود کفر ہو؛ تو کہا جائے گا: یہ بات کفریہ ہے۔ لیکن اس کا قائل چند شروط [پوری ہونے] اور رکاوٹیں [موانع] ختم ہونے کے بعد ہی کافر ہوگا۔ اور ایسا تب ہی ہوگا جب انسان منافق یا زندیق ہو جائے۔ پس یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر کہا جائے؛ اور وہ اسلام کا اظہار کر رہا ہو؛ ہاں اگر وہ منافق یا زندیق ہو جائے تو علیحدہ بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب یہ تمام امور واضح طور پر بیان کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلی قسم: کفار؛ جن کا تعلق مشرکین اور اہل کتاب میں سے ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کلمہ شہادت کا اقرار نہیں کرتے۔

دوسری قسم: جو ظاہراً اور باطناً پکے سچے مومن ہیں۔

تیسری قسم: جو بظاہر کلمہء شہادت کا اقرار کرتے ہیں؛ باطن میں نہیں۔

ان تین اقسام کا ذکر سورۂ بقرہ کے شروع میں موجود ہے۔

پس ہر وہ شخص جس کے متعلق ثابت ہو جائے کہ وہ نفس امر میں کافر ہے؛ اور وہ کلمہء شہادت کا اقرار بھی کرتا ہو: تو بے شک وہ زندیق کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اور زندیق منافق ہی تو ہوتا ہے۔

یہاں سے ان دونوں گروہوں کی غلطی ظاہر ہو رہی ہے۔ بے شک جو کوئی بھی ہر اس انسان کو کافر کہتا ہے جو باطن میں بدعتی عقیدہ کا قائل ہے؛ تو اس پر لازم آتا ہے وہ کہ ایسے لوگوں کو بھی کافر کہے جو باطن میں منافق نہیں۔ بلکہ وہ باطن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرتے ہیں؛ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر چہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''عہد رسالت مآب میں ایک شخص عبداللہ نامی تھا؛ اسے حمار کا لقب دیا جاتا تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہنسی مزاح کرتا تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کو شراب پینے کی وجہ سے حد لگائی۔ ایک روز اسے آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے اسے کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا: اے اللہ تعالیٰ اس پر لعنت بھیج، کس قدر کثرت کے ساتھ اسے شراب پینے کے جرم میں لایا جاتا ہے''۔

یہ بات سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس پر لعنت نہ بھیجو؛ بے شک یہ شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے''۔ ❶

☼ حدیث صحیح ہے۔ بخاری ٦٧٨٠، كتاب الحدود.

پس یہ حکم ائمہ علم و دین کے بہت سارے گروہوں کے ہاں یقینی ہے۔ اگر چہ ان میں جھمیہ، یا مرجیۂ؛ یا قدریہ؛ یا شیعہ، یا خوارج کے نظریات میں کوئی ایک بات بھی پائی جائے؛ لیکن [اہل سنت] ائمہ علم و دین بالجملہ ان بدعات پر قائم نہیں رہتے؛ بلکہ ان کے ہاں اس کی کوئی فرع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اہل بدعت فرقے مشاہیر سلف صالحین رحمہم اللہ کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔ اہل بدعت کے عیوب میں سے ایک عیب یہ ہے کہ: بدعتی فرقے تو ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں۔ جب کہ اہل علم کی قابل تعریف بات یہ ہے کہ: ''وہ ان کو خطا کار تو کہتے ہیں، لیکن کافر نہیں کہتے''۔ [منهاج السنة النبوية ٥/ ٢١٥]

ایک اشکال اور اس کا جواب:

یہاں پر شیخ رحمہ اللہ کے کلام پر وارد ہونے والا اشکال باقی رہتا ہے؛ کہ شارع نے تو یقیناً بعض گناہوں کو کفر کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾ (المائده: ٤٤)

''اور جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔''

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے''۔ ❶ [متفق علیہ]

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے؛ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن زدنی کرتے پھرو''۔ ❷

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب کوئی شخص اپنے بھائی کو یا کافر کہہ کر پکارتا ہے تو ان میں سے ایک ضرور کفر کے ساتھ لوٹتا ہے''۔ ❸

یہ حدیث متفق علیہ ہے؛ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص میں چار خصلتیں ہیں وہ خالص منافق ہے اور جس شخص میں ایک خصلت ہے تو اس میں اتنا ہی نفاق ہے جب تک کہ اس کو چھوڑ تا نہیں۔ جب بھی بات کرے تو جھوٹ بولے؛ اور جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب معاہدہ کرے تو دھوکا دے اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ بکے''۔ ❹

یہ حدیث بھی متفق علیہ ہے؛ اور حضرت عبداللہ تعالیٰ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور جب چوری کرنے والا چوری کرتا ہے تو وہ بھی مومن نہیں ہوتا اور شراب پینے والا شراب پیتا ہے تو وہ بھی مومن نہیں ہوتا۔ ان افعال کے بعد ان لوگوں پر توبہ پیش کی جاتی ہے''۔ ❺

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمان اور کفر کے درمیان فرق نماز چھوڑنے کا ہے''۔ ❻

اسے امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص کاہن کے پاس آیا اور اس کی باتوں کو سچا جانا۔ یا عورت کی دبر میں جماع کیا تو اس نے ان احکام کا انکار کیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے''۔ ❼

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے غیر اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھائی وہ کافر ہو گیا''۔ ❽

یہ حدیث ان الفاظ میں امام حاکم رحمہ اللہ نے روایت کی ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میری امت کے دو کام کفر کے کام ہیں: انساب میں عیب لگانا اور میت پر نوحہ کرنا اور رونا پیٹنا''۔ ❾

اس قسم کی احادیث کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

۞ حدیث صحیح ہے۔ متفق علیه: صحیح الجامع الصغیر (۳۵۸۹). البخاری ٤٨ مسلم ٦٤ .
۞ حدیث صحیح ہے۔ متفق علیه: غایة المرام (٤٤٣). البخاری ٤٤٠٣؛ ١٢١؛ ١٧٤١؛ عن أبی بکرة۔ مسلم ٦٦ (١٢٠) ٥٦ (١١٨)؛ ١٦٧٩۔
۞ حدیث صحیح ہے۔ متفق علیه. البخاری ٦١٠٤۔ مسلم ١١ (٦٠) عن ابن عمر .
❹ حدیث صحیح ہے۔ متفق علیه. البخاری ٣٤؛ مسلم ٥٨؛ عن ابن عمرو .
❺ حدیث صحیح ہے۔ متفق علیه. البخاری ٢٤٧٥؛ مسلم ٥٧؛ عن أبی هریرة .
❻ حدیث صحیح ہے۔ مسلم ٨٢؛ من حدیث جابر .
❼ حدیث صحیح ہے۔ آداب الزفاف ص ٣١. (للعلامة الالبانی). أبو داؤد ٣٩٠٤ .
❽ حدیث صحیح ہے۔ مستدرك حاکم ١/ ١٨۔ مسند احمد۔ الارواء الغلیل (٢٥٦١).
❾ حدیث صحیح ہے۔ مسلم (١/ ٥٨) برقم ٦٧ .

جواب:

تمام اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ایسا کافر نہیں ہوتا کہ وہ بالکلیہ اسلام سے خارج کر دے؛ جیسے خوارج

کا عقیدہ ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ ایسا کفر کرتا جو اسلام سے خارج کر دے؛ تو وہ مرتد ہو جاتا؛ اسے بہر صورت قتل کرنا ضروری ہوتا۔ پس مقتول کے اولیاء سے قصاص کی معافی قبول نہ ہوتی؛ اور زنا؛ چوری اور شراب خوری میں حدود کا نفاذ نہ ہوتا۔ حالانکہ دین اسلام کی تشریحات کی روشنی میں ان باتوں کا باطل اور ان کا فاسد ہونا ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے۔ اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ کبیرہ گناہ انسان کو ایمان اور اسلام سے خارج نہیں کرتا؛ اور نہ ہی اسے کفر میں داخل کرتا ہے؛ اور نہ ہی وہ کافروں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنے کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ ان کا یہ عقیدہ بالکل باطل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کبیرہ گناہ کے مرتکب انسان کو اہل ایمان میں شامل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى﴾ .... ﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (البقرة: ۱۷۸)

''اے مومنو! تم کو مقتولوں کے بارے میں قصاص کا حکم دیا جاتا ہے۔'' ...... ''پس جس کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو اسے نیکی کیساتھ پیروی کرنا چاہیے۔''

پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قاتل کو ایمان والوں سے خارج قرار نہیں دیا، بلکہ اس کو قصاص کے متولی انسان کا بھائی قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھائی چارہ دین کے لحاظ سے ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾ .... ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ (الحجرات: ۹۔ ۱۰)

''اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔'' ...... ''مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں تو تم اپنے بھائیوں میں صلح کروا دیا کرو۔''

نیز کتاب و سنت اور اجماع کے نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ زانی اور چور اور بہتان تراش؛ واجبِ قتل نہیں؛ بلکہ ان پر حدود کا نفاذ ہوگا۔ یہ دلیل ہے کہ یہ لوگ مرتد نہیں ہیں۔

صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آج جس شخص پر اس کے بھائی کی عزت یا مال کا کچھ حق ہے؛ تو وہ آج ہی اس حق کو ادا کر دے؛ اس سے پہلے کہ درہم و دینار نہ رہیں۔ اگر اس [ظالم] کا کوئی نیک عمل ہوگا؛ تو اس سے اس کے ظلم کے قدر وہ [نیک عمل] لے لیا جائے گا۔ اور اگر اس [ظالم] کی کوئی نیکی نہ ہوئی؛ تو اس کے مظلوم کی برائیاں لیکر اس پر ڈال دی جائیں گی؛ اور پھر اسے [دوزخ کی] آگ میں گرا دیا جائے گا''۔ ❶ [أخرجاه فی الصحیحین]

ثابت ہوا کہ ظالم کے پاس کچھ نیکیاں ہوں گی؛ جن سے مظلوم کو اس کا حق دیا جائے گا۔ اس طرح صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم اپنے میں سے کس شخص کو مفلس سمجھتے ہو؟ عرض گزار ہوئے: ''ہم میں وہ شخص مفلس ہے جس کے پاس نہ درہم ہے نہ

دینار۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''مفلس تو وہ ہے جو قیامت کے دن آئے گا اور پہاڑوں کے برابر اس کی نیکیاں ہوں گی۔لیکن اس حال میں آئے گا کہ اس نے اس کو گالی دی ہوگی؛ اس سے مال چھینا ہوگا، اس کا خون بہایا ہوگا، اس پر الزام لگایا ہوگا؛ اور اس کو مارا پیٹا ہوگا۔ پس یہ بھی اس کی نیکیاں کاٹ لے گا؛ اور یہ بھی اس کی نیکیوں میں سے لے لے گا۔ پس جب اس کی نیکیاں اس پر حساب ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگئیں؛ تو حقداروں کے گناہ لیکر اس پر لاد دیئے جائیں گے اور پھر اسے دوزخ میں گرا دیا جائے گا''۔ ❷

❶ حدیث صحیح ہے۔ بخاری ۲۴۴۹؛ ٦٥٣٤، کتاب المظالم، حدیث ابی ہریرۃ۔ مسند احمد (۲/ ٤٣٥)، احکام الجنائز (ص ٤) صحیح الجامع ٦٥١١۔

❷ حدیث صحیح ہے۔مسلم ۲۵۸۱، حدیث ابی ہریرۃ، الصحیحۃ (۸٤۷).

اور یقیناً اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (ھود: ١١٤)

''بے شک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں''۔

تو معلوم ہوا کہ کوئی شخص برائیوں کی حالت میں بھی نیک اعمال کرتا ہے جو اس کی برائیوں کو مٹا دیتے ہیں۔ یہ تفصیل اپنی جگہ پر موجود ہے۔

معتزلہ اور خوارج کا عقیدہ:

آخرت میں حکم کے اعتبار سے معتزلہ خوارج کے ساتھ یک زبان ہیں۔ وہ ان کے ساتھ موافقت کرتے ہیں کہ بے شک کبیرہ گناہ کا مرتکب ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔لیکن [دنیا کے لحاظ سے] خوارج کہتے ہیں: ہم اس کو کافر ہی کہیں گے۔اور معتزلہ کہتے ہیں: ''ہم اس کو فاسق کہتے ہیں''۔ان کے درمیان یہ اختلاف صرف لفظی ہے۔

لیکن اہل سنت اس بات پر متفق ہیں کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب اس گناہ پر مرتب ہونے والی وعید کا مستحق ہے؛ جیسا کہ کتاب وسنت کے نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں۔ ایسا نہیں جیسے مرجیۂ کا عقیدہ ہے کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا؛ اور نہ ہی کفر کے ساتھ اطاعت کا کچھ فائدہ ہوتا ہے۔ پس جب وعد کی وہ نصوص جمع ہو جائیں جن سے مرجئہ نے استدلال کیا ہے؛ اور وعید کی وہ نصوص جمع ہو جائیں جن سے خوارج اور معتزلہ استدلال کرتے ہیں؛ تو آپ کے سامنے ان دونوں اقوال کی خرابی واضح ہو جائے گی۔ اور ان لوگوں کے کلام میں کوئی فائدہ نہیں؛ ہاں اس کلام سے مستفید ہو سکتے ہیں کہ ہر گروہ کے کلام میں دوسرے گروہ کے مذہب کی خرابی [فساد] بیان ہوئی ہے۔

کفر کی اقسام: اعتقادی اور عملی:

اس اتفاق کے بعد اہل سنت والجماعت کے مابین کچھ لفظی اختلاف پایا جاتا ہے؛ جس پر کوئی بڑی خرابی یا فساد مرتب نہیں ہوتا۔ وہ

یہ ہے کہ کیا اہل سنت کے ہاں کفر کے بھی مراتب ہیں؛ جیسے کفر اکبر اور کفر اصغر؛ جیسے ایمان کے بارے میں بھی ان کا اختلاف ہے کہ کیا ایمان کے مراتب ہیں؟ یعنی ایمان سے کم ایمان؛ اور ایمان کم اور زیادہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟۔ دراصل یہ اختلاف ایمان کے مسمی اختلاف کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ کہ کیا ایمان قول اور عمل ہے؛ کم ہوتا اور بڑھتا ہے؟ یا نہیں؟۔ یہ سب کچھ اس بات پر ان کے اتفاق کے بعد ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے کافر کہا ہو؛ ہم اس کو کافر ہی کہیں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا؛ اللہ تعالیٰ اس کو کافر کہے؛ اور [سابقہ ذکر کردہ گناہوں کے ضمن میں] جن لوگوں کا ذکر گزر چکا ہے؛ رسول اللہ ﷺ ان کو کافر کہیں؛ مگر ہم ان پر کفر کا اطلاق نہ کریں۔ لیکن جو حضرات کہتے ہیں: ایمان قول اور عمل ہے؛ کم ہوتا اور بڑھتا ہے؛ وہ کہتے ہیں: یہ کفر عملی ہے اعتقادی نہیں۔ ان کے نزدیک کفر کے بھی ایسے ہی مراتب ہیں جیسے ایمان کے مراتب ہیں۔ [یعنی کفر دون کفر۔]

اور جو کوئی کہتا ہے: ''بے شک ایمان صرف تصدیق کا نام ہے؛ اور عمل مسمیٰ ایمان میں داخل نہیں ہوتا'' اور کفر کا مطلب ہے؛ انکار کرنا۔ یہ دونوں چیزیں نہ کم ہوتی ہیں اور نہ بڑھتی ہیں۔ تو وہ کہتا ہے: ''یہ کفر مجازی ہے؛ حقیقی نہیں۔ اس لیے کہ کفر حقیقی ملت اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ ایسے ہی اس کا قول بعض اعمال کو ایمان کا نام دینے کے متعلق بھی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ﴾ [البقرۃ ۱۴۳]

'' اور اللہ تعالیٰ کبھی ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے''۔

یعنی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی جانے والی تمہاری نمازیں''۔ [البخاری ٤٠ ؛ نسائی ١١٠٠٣]

بے شک یہاں پر انہیں ایمان کا نام مجازاً دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ عمل کی صحت ایمان پر موقوف ہوتی ہے۔ یا اس لیے کہ نماز ایمان پر دلالت کرتی ہے۔ یا نماز ادا کرنے والا مومن ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کافر ہماری طرح نماز پڑھے تو اس پر مسلمان ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔ پس فقہائے امت ﷺ کے مابین گنہگاروں کے مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں؛ جب وہ ظاہری اور باطنی طور پر محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت اور متواتر امور کا اقرار کرتے ہوں؛ تو وہ [گناہوں کی وجہ سے] اہل وعید میں شمار ہوں گے۔ لیکن منحرف عقائد کے حاملین؛ جیسے خوارج اور معتزلہ ان کو مخلد فی النار کہتے ہیں۔ لیکن اس میں سب سے بری چیز ان کا آپس میں انتہائی مذہبی تعصب اور ان میں سے ہر ایک دوسرے پر وہ چیز لازم کرتا ہے جو حقیقت میں اس پر لازم نہیں آتی؛ اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کرنا ہے۔ اس لیے کہ ہمیں کافروں کے ساتھ بھی مناظرہ اور بحث کرتے ہوئے عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے؛ اور یہ کہ ان کے ساتھ اچھے انداز میں گفتگو کی جائے۔ تو پھر ایسے معمولی اختلاف میں ہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ عدل کیوں نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ [المائدۃ ۸]

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی خاطر خوب قائم رہنے والے، انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں ہرگز اس بات کا مجرم نہ بنا دے کہ تم عدل نہ کرو؛ عدل کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے''۔

یہاں ایک قاعدہ ملحوظ خاطر رہے کہ کلام اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر فیصلہ کرنا کبھی ایسا کفر ہوتا ہے جو ملت اسلام سے خارج کر دیتا ہے؛ اور

کبھی صرف معصیت [گناہ] ہوتا ہے۔ خواہ وہ معصیت کبیرہ ہو یا صغیرہ۔ اور پھر کفر: یا تو مجازی ہوگا؛ یا کفر اصغر ہوگا۔ اس میں دو قول مذکور ہیں۔ یہ سب فیصلہ کرنے والے/ حاکم کے حال کے مطابق ہوگا۔ اگر اس کا اعتقاد ہے کہ کتاب اللہ تعالیٰ کے مطابق فیصلہ کرنا واجب نہیں ہے۔ اور اسے اس میں اختیار حاصل ہے۔ یا پھر یہ یقین ہونے کے باوجود کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے؛ پھر بھی بطور اہانت و حقارت ایسا کرتا ہے [یعنی کتاب اللہ تعالیٰ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا] تو یہ کفر بہت بڑا کفر ہوگا''۔ ❶ اور اگر اعتقاد تو یہ ہے کہ کلام اللہ کے احکام کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے؛ اور اسے اس واقعہ کے متعلق علم بھی ہے؛ اور اسے اعتراف ہے کہ ایسا کرنے پر اسے عقوبت کا سامنا کرنا پڑے گا؛ مگر پھر بھی اس [یعنی کتاب وسنت کے فیصلہ] سے تجاوز کرتا ہے؛ تو یہ انسان گنہگار ہے؛ اور اسے مجازی کافر/ یا کفر اصغر کہا جاسکتا ہے۔ اور اگر پوری کوشش کرنے کے باوجود اس کی نظروں سے کتاب وسنت کا فیصلہ مخفی رہا اور اس نے خطا کرتے ہوئے اس کے خلاف فیصلہ کردیا؛ تو یہ انسان خطا کار ہے اس کو کوشش کرنے کی بناء پر ثواب حاصل ہوگا اور اس کی غلطی معاف ہوگی''۔

[مدارج السالکین ۱/ ۳۳۶.]

---

❶ شیخ احمد شاکر فرماتے ہیں امت اسلامیہ کے بعض دانشور مرد اور عورتیں جن کے دلوں میں یورپ کی تہذیب رچ بس چکی ہے انھیں اس تہذیب سے گہرا رابطہ ہے اور ہمہ وقت اس کی طرف سے مدافعت کے لیے تیار رہتے ہیں اس کی اشاعت میں مشغول رہتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اسلام کے دشمن ہیں اسلام کے اصولوں کی بیخ کنی کرنے والے ہیں ان کا کفر بہت بڑا کفر ہے انھوں نے یورپ کے قوانین کو اس غرض سے حاصل کیا کہ وہ اس قانون کا تحفظ کریں گے اور اس کی تبلیغ کریں گے ان میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو کھلم کھلا یورپین تہذیب کی برتری کے گیت گاتے ہیں اور کچھ لوگ دبی زبان سے اس کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں یہ دونوں فریق برابر ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علامہ شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا یہ قول: ''ہم نہیں کہتے کہ: ایمان کے ساتھ کسی گناہ کا سرزد ہونا گنہگار کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا'' اس سے مراد مرجئہ کا رد ہے۔ ان کا شبہ پہلے دور کے کچھ لوگوں میں پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اتفاق کرلیا تھا کہ: اگر ایسے لوگ اس سے توبہ نہ کرے تو ان کو قتل کردیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ اور ایک گروہ نے شراب کی حرمت کے بعد شراب پی لی؛ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں تأویل کی:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾
(المائدۃ: ۹۳)

''اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان پر ان کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے ہیں جبکہ انھوں نے پرہیز کیا اور ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔'' [کہ ایمان اور عمل صالح کی موجودگی میں شراب پینے میں کوئی حرج نہیں]۔

جب انھوں نے اس کا ذکر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا تو حضرت عمر اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما اور دیگر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اگر وہ شراب کی حرمت کا اعتراف کریں تو انھیں کوڑے لگائے جائیں۔ اور اگر اس کو حلال سمجھنے پر اصرار کریں تو انھیں قتل کردیا جائے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قدامہ سے کہا:

''تو سیدھے راہ سے بھٹک گیا ہے؛ خبردار بلاشبہ اگر تو تقویٰ اختیار کرتا اور ایمان لاتا اور نیک اعمال کرتا تو کبھی شراب نہ پیتا۔ اس آیت کا سبب نزول دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب شراب کو حرام قرار دیا؛ تو جنگ احد کے بعد اس کی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے کہا کہ ہمارے ان ساتھیوں کا کیا حال ہوگا جو شراب پیتے تھے اور فوت ہوگئے؟ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت

نازل فرمائی‘‘۔[سنن الترمذی ۳۲۵۸ ؛ البخاری ۲٤٦٤ ؛ مسلم ۱۹۸۰ .]

اس میں بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص ایسی حالت میں حرام چیز تناول کر لیتا ہے جب وہ حرام نہ تھی؛ تو اس پر کچھ گناہ نہیں؛ جبکہ وہ ایمان دار اور پرہیز گار اور نیک اعمال کرنے والا ہو۔ جیسا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا مسئلہ تھا۔ پھر یہ لوگ جنھوں نے یہ کام کیا تھا؛ وہ نادم ہوئے؛ اور جان گئے کہ انہوں نے غلطی کی ہے؛ اور وہ توبہ سے مایوس ہو گئے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت قدامہ رضی اللہ عنہ کی طرف تحریر فرمایا:

﴿حٰمٓ o تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ o غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ﴾ (غافر)

’’حم۔ اس کتاب کا اتارا جانا اللہ تعالیٰ غالب ودانا کی طرف سے ہے جو گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا سخت عذاب دینے والا ہے۔‘‘

اس آیت کے بعد لکھا: میں نہیں جانتا کہ تیرے دو گناہوں میں سے کون سا گناہ بڑا ہے؟ پہلے تیرا حرام چیز کو حلال گردانا؟ یا بعد میں تیرا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید ہونا؟‘‘۔ پس اس عقیدہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق رہا؛ اور ان کے بعد حضرات ائمہ اسلام رحمہم اللہ کے مابین بھی یہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔

[مؤمن کا ضروری عقیدہ]

[مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کے متعلق اور دوسروں کے متعلق یہ عقیدہ رکھے۔]

59 ۔((وَنَرْجُو لِلْمُحْسِنِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْ يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَيُدْخِلَهُمُ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِهِ وَلَا نُؤْمِنُ عَلَيْهِمْ وَلَا نَشْهَدُ لَهُمْ بِالْجَنَّةِ❻ . ①وَنَسْتَغْفِرُ لِمُسِيئِهِمْ وَنَخَافُ عَلَيْهِمْ وَلَا نُقَنِّطُهُمْ))

''نیکوکار مؤمنین کے متعلق ہم امید رکھتے ہیں کہ وہ ان کو معاف فرمائے گا اور انھیں اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمائے گا؛ اور ان کی بابت بھی ہم بے خوف نہیں۔ اور نہ ہی ہم ان کے لیے جنت کی گواہی دیتے ہیں اور ان کے بدکاروں کے لیے ہم دعائے مغفرت کرتے ہیں اور ان کے بارے میں خوف رکھتے ہیں؛ اور ہم انہیں ناامید بھی نہیں کرتے''۔

❻ ۔علامہ بن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مصنف رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ ہم جنتی ہونے کی گواہی صرف ان کے لیے دیتے ہیں جن کے لیے یہ گواہی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ملی ہو؛ جیسے حضرات عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر۔ جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ عمومی طور پر اہل ایمان اور اہل تقوی کے لیے جنت کی گواہی دینا ہے؛ اور یہ کفار؛ منافقین اور مشرکین جہنم میں ہوں گے۔ جیسا کہ اس پر بہت ساری آیات اور رسول اللہ ﷺ کی متواتر احادیث مبارکہ دلالت کرتی ہیں۔ ان ہی آیات میں سے ایک یہ آیت بھی ہے: ﴿إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ﴾ (الطور 17)
''بے شک متقی لوگ باغوں اور بڑی نعمت میں ہیں''۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾[التوبة ۷۲]'' اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے، اور پاکیزہ رہنے کی جگہوں کا جو ہمیشگی کے باغوں میں ہوں گی''۔ اور دیگر بہت ساری آیات ان معانی پر دلالت کرتی ہیں۔ ایسے ہی کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے: ﴿وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ﴾ [فاطر ۳۶]''اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، نہ ان کا کام تمام کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ ان سے اس کا کچھ عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔ ہم ایسے ہی ہر ناشکرے کو بدلہ دیا کرتے ہیں''۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے: ﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا﴾ [النساء ۱۴۵]'' بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے اور تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا''۔ ان کے علاوہ دیگر آیات بھی ہیں جو ان معانی پر دلالت کرتی ہیں۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شیخ ابن مانع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جان لیجیے کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ وہ کسی بھی مرنے والے کے لیے جنت یا جہنم کی گواہی نہیں دیتے؛ ہاں اگر کسی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ایسی کوئی خبر دی ہو تو وہ اس پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اہل سنت نیکوکار لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھتے ہیں؛ اور اور بدکار کی بابت ڈرتے رہتے ہیں۔ اس اصول کی روشنی میں آپ کو بہت سارے ان لوگوں کا پتہ چل جائے گا جو جب کسی عالم کا ذکر کرتے ہیں؛ یا کسی بڑے یا بادشاہ یا کسی دوسرے کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں: المغفور لہ۔ یا ساکن بہشت؛ یا جنتی وغیرہ۔ اور ان میں سب سے بری بات کہ فلاں اپنے رفیق اعلی کی طرف انتقال کر گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ پر بغیر علم کے بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر بغیر علم کے بات کہنا شرک کے برابر برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:
﴿ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾(الاعراف : ۳۳)
''یہ کہ تم کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس کو بھی کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی باتیں کہو جس کا تمھیں کچھ علم نہیں''۔
اور جہاں تک مشرکین کی بات ہے؛ تو اہل سنت والجماعت گواہی دیتے ہیں کہ وہ جہنم میں ہوں گے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:
﴿ إِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾[المائدة ۷۲]
''بے شک جو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنائے؛ تو یقیناً اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا''۔

تَشْرِیح:......علامہ شیخ طحاوی رحمہ اللہ نے جس نظریے کا ذکر کیا ہے ہر مؤمن کے لیے اس کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے؛ اپنے حق میں بھی اور دوسروں کے حق میں بھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ یَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا۝﴾ (الاسراء: ۵۷)

''یہ لوگ جن کو پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب کے ہاں وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ ان میں کون اللہ تعالیٰ کا زیادہ مقرب ہے اور اس کی رحمت کی امید؛ اور اس کے عذاب کا خوف رکھتے ہیں۔ بے شک تمھارے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝﴾ (آل عمران: ۱۷۵)

''پس تم ان سے خوف نہ کرو اور مجھ سے خوف کرو اگر تم ایماندار ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ۝﴾ (البقرة: ۴۱)

''اور خاص مجھ سے ہی تقوی اختیار کرو۔''

﴿وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ۝﴾ (البقرة: ۴۰)

''اور خاص مجھ سے ہی ڈرو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِیْ﴾ (البقرة: ۱۵۰)

''تم ان سے نہ ڈرو تم مجھ سے ڈرو۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنے والوں کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ۝ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ۝ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِكُوْنَ۝ وَ الَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ۝ اُولٰٓئِكَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ۝﴾ (المؤمنون: ۵۷۔۶۱)

''جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرتے ہیں اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اپنے رب کے ساتھ شریک نہیں کرتے ہیں؛ جو لوگ انہیں دی گئی روزی میں سے خرچ کرتے ہیں؛ اور ان کے دل ڈرتے رہتے ہیں کہ ان کو اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے یہی لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور اس میں سبقت لے جاتے ہیں''۔

مسند احمد اور سنن ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے؛ فرماتی ہیں:

''میں نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ﴿وَ الَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ ''جو لوگ خرچ کرتے ہیں جو کچھ انہیں دیا گیا ہے؛ اور ان کے دلوں میں خوف ہوتا ہے''۔ کیا ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو زنا کرتے ہیں شراب پیتے ہیں،

چوری کرتے ہیں؟۔آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں اے صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی ! یہ لوگ مراد نہیں ہیں؛ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو روزہ رکھتے ہیں نماز ادا کرتے ہیں صدقہ خیرات کرتے ہیں ساتھ ساتھ ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان کے اعمال قبول نہ ہوں''۔ ❶

❶ حدیث حسن ہے۔الاحاديث الصحيحة (١٩٢).

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا قول: اللہ تعالیٰ کی قسم! اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اطاعت کرتے ہیں؛ اور نیکیوں میں کوشاں رہتے ہیں؛ اس کے ساتھ خوفزدہ بھی رہتے ہیں کہ کہیں ان کی نیکیاں قبول نہ ہوں۔ بے شک مومن نیک اعمال بھی کرتا رہتا ہے اور ڈرتا بھی ہے۔ اور منافق برے اعمال کرتا ہے اور بے خوف رہتا ہے''۔[انتہیٰ کلامہ]

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (البقرة: ٢١٨)

''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی؛ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا؛ وہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔''

غور کیجیے اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کی امید کو اطاعت اور ایمان کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ پس امید کرنا اس وقت درست ہے جب وہ اسباب کو بروئے کار لائے جائیں جن کا تقاضا اللہ تعالیٰ کی حکمت کرتی ہے؛ اس کی شریعت؛ اس کی قدرت؛ اس کے ثواب اور اس کی کرامت [کا حصول ہی ہے]۔

ایک مثال: اگر کسی آدمی کی زمین ہو؛ اور وہ امید رکھتا ہو کہ اس کی کمائی سے انہیں فائدہ حاصل ہوگا؛ مگر وہ کھیتی کو یوں ہی چھوڑ دیتا ہے۔ وہ نہ ہی ہل چلاتا ہے نہ بیج بوتا ہے۔ اور امید کرتا ہے کہ اس کو زمین کی کمائی سے کچھ فائدہ حاصل ہوگا جیسے اس آدمی کو فائدہ حاصل ہو رہا ہے جو کھیتی کے ساتھ لگا ہوا ہے؛ ہل چلاتا ہے بیج بوتا ہے۔ تو لوگ اس کو سب سے بڑا بے وقوف شمار کریں گے۔ اسی طرح اگر کوئی حسن ظن رکھتا ہو کہ بیوی کے ساتھ جماع کے بغیر ہی اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا؛ یا طلب علم میں کوشش نہیں کرتا اور پر امید ہے کہ وہ اپنے دور کا سب سے بڑا عالم بن جائے گا؛ اور اس کی اس میں کوئی حرص ہی نہ ہو۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ بالکل ان لوگوں کی مانند اس شخص کا حال ہے جو شخص حسن ظن رکھتا ہے اور پر امید ہے کہ وہ بلند درجات حاصل کرے گا اور ہمیشہ ہمیشہ انعامات باری تعالیٰ میں سرشار رہے گا؛ حالانکہ نہ ہی وہ اطاعت گزار ہے اور نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے احکام بجالاتا ہے نہ ہی منع کردہ چیزوں سے اجتناب کر کے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔

[کسی چیز کی امید اور اس کے لوازمات]

یہ جاننا ضروری ہے کہ: جو کوئی کسی چیز کی امید رکھتا؛ اس پر چند امور لازم آتے ہیں:

اول: اس کے ساتھ محبت کا جذبہ ہو۔

دوم: اس کے چھوٹ جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہو۔

سوم: اس کے حصول میں امکانی حد تک کوشاں رہے۔

صرف خالی ایسی امید رکھنا جس کے ساتھ ان تین امور میں سے کوئی بھی چیز نہ ہو؛ یہ محض آرزو ہے۔ امید دیگر چیز ہے اور آرزو دیگر چیز۔ پس ہر وہ شخص جو امید رکھتا ہے وہ [امید پوری نہ ہونے سے] ڈرتا بھی ہے۔ راہ گیر کو جب خوف محسوس ہو تو وہ تیز تیز چلتا ہے کہیں وہ راستہ میں ہی نہ رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء: ٤٨)

''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں معاف کریں گے کہ ان کے ساتھ شرک کیا جائے؛ اس سے کم جس کو چاہیں معاف کر دیں۔''

پس مشرک کے لیے مغفرت کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کی نفی کر دی ہے۔ اس سے کم جتنے بھی گناہ ہیں؛ وہ اللہ تعالیٰ کی چاہت پر منحصر ہیں؛ اگر وہ چاہے تو معاف کر دے؛ اور اگر چاہے تو عذاب میں مبتلا کرے۔ معجم الطبرانی میں ہے:

''قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں دیوان تین قسم کے ہیں: ایک وہ دیوان جس میں سے اللہ تعالیٰ کچھ بھی معاف نہیں کریں گے: پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ﴾ (النساء: ٤٨)

''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں معاف کریں گے کہ ان کے ساتھ شرک کیا جائے۔''

دوسرا دیوان وہ ہے جس میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑیں گے؛ یہ لوگوں کے باہم مظالم کا دیوان ہے۔

تیسرا دیوان وہ ہے: جس کی اللہ تعالیٰ کوئی پرواہ نہیں کریں گے۔ یہ دیوان بندے کے اپنے نفس پر ظلم؛ اور اس کے اور اس کے رب کے درمیان معاملات کا دیوان ہے''۔

صغیرہ اور کبیرہ گناہ میں علماء کرام رحمہم اللہ کے فرق کرنے میں عبارات میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ شیخ رحمہ اللہ کے اس قول کی شرح میں آئے گا: ''امت محمدیہ کے کبائر کے مرتکب مخلد فی النار نہیں ہیں''۔

لیکن یہاں ایک چیز غور طلب ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب کبھی اس قدر شرم و حیاء اور خوف محسوس کرتا ہے اور وہ اس گناہ کو بڑا قبیح گردانتا ہے؛ جس کی وجہ سے وہ [گناہ کبیرہ نہیں رہتا بلکہ] صغیرہ گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور کبھی صغیرہ گناہ کا مرتکب اس قدر قلت حیاء ؛ بے شرمی؛ اللہ تعالیٰ سے بے خوفی کا مظاہرہ کرتا ہے؛ اس گناہ کو حقیر سمجھتا ہے جس کی وجہ سے وہ گناہ صغیرہ نہیں رہتا بلکہ کبیرہ گناہوں کی فہرست میں شمار ہوتا ہے۔ معلوم ہوا اس معاملہ کا اصل تعلق دل کے ساتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محض فعل سے یہ چیز زائد ہے؛ اور اس بات کو ہر شخص اپنے نفس سے بھی خوب سمجھتا ہے اور دوسرا بھی [سمجھتا ہے]۔

[سزا ختم ہونے کے اسباب:]

یہ بات معروف ہے کہ کبھی کسی بڑی نیکی کرنے والے کا وہ گناہ معاف کر دیا جاتا ہے جو کسی دوسرے سے معاف نہیں ہوتا [1]۔ اس

میں بھی شک نہیں کہ تقریباً دس اسباب کی بنا پر گناہ کے مرتکب انسان سے گناہ کی سزا ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ اسباب کتاب اللہ تعالیٰ اور سنت رسول اللہ ﷺ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتے ہیں [2]:

[1] ۔مدارج السالکین ۱/ ۳۲۸۔

[2] ۔ شیخ عفیفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: انسان سے گناہ کی سزا ساقط ہونے کے اسباب کی تفصیل کے لیے مطالعہ کریں: کتاب ''الایمان الصغیر ص ۴۸۷=۵۰۴؛ مجموع الفتاوی لشیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ۔

پہلا سبب: توبہ: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِلَّا مَن تَابَ﴾ (مریم: ٦٠)

''اور جس نے رجوع کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا﴾ (البقرة: ١٦٠)

''مگر وہ لوگ جنھوں نے رجوع کیا۔''

توبة النصوح ؛ خالص توبہ کو کہتے ہیں۔ اس کا تعلق تمام گناہوں کے ساتھ ہے کسی ایک کے ساتھ خاص نہیں۔ لیکن کیا اس توبہ کا صحیح ہونا تمام گناہوں سے توبہ کرنے پر موقوف ہے؟ حتی کہ اگر کوئی شخص ایک گناہ سے توبہ کرتا ہے دوسرے گناہ پر اصرار کرتا ہے؛ تو اس کی یہ توبہ قبول نہیں ہوگی؟۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی توبہ مقبول ہے۔ اور کیا اسلام لانا اپنے سے پہلے کے تمام گناہوں شرک وغیرہ کو ختم کر دیتا ہے؟ اگر چہ وہ ان سے توبہ نہ بھی کرے؟۔ یا پھر اسلام کے ساتھ شرک کے علاوہ باقی گناہوں سے توبہ کرنا بھی ضروری ہے؟۔ مثلاً اگر ایک شخص مسلمان ہوتا ہے اور وہ زنا اور شراب پر مصر رہتا ہے؛ تو کیا اسلام لانے کے بعد حالت کفر میں ہونے والی زنا کاری اور شراب نوشی پر اس کا مؤاخذہ ہوگا؟ یا پھر اسلام لانے کے ساتھ ساتھ ان تمام گناہوں سے بھی توبہ کرنا لازمی ہے؟۔ یا پھر وہ تمام گناہوں سے عمومی توبہ کرے؟؛ یہی بات زیادہ درست ہے؛ اس لیے اسلام لانے کے ساتھ ساتھ تمام گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہے۔ توبہ کے گناہوں کی مغفرت کا سبب ہونے؛ اور ان گناہوں پر عدمِ مؤاخذہ کے متعلق امت میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ توبہ کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں جو تمام گناہوں کی مغفرت کا سبب بن سکتی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴾ (الزمر: ٥٣)

''فرما دیجیے: اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا اللہ تعالیٰ تو سب گناہوں کو بخش دے گا بے شک وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔''

یہ توبہ کرنے والوں کے لیے ہے۔ اسی لیے کہا: ﴿لَا تَقْنَطُوا﴾ ''تم مایوس نہ ہونا''۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿وَأَنِيبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ﴾ ''اور اپنے رب کی جانب انابت [توبہ] کرو''۔

دوسرا سبب: استغفار: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (الانفال : ۳۳)

''اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ تھا کہ وہ ان کو عذاب میں گرفتار کرے اور وہ بخشش مانگتے ہوں۔''

لیکن کبھی استغفار کا انفرادی ذکر ہوتا ہے اور کبھی توبہ کے ساتھ ملا کر۔ جہاں صرف استغفار کا ذکر ہو؛ تو وہ توبہ کو بھی شامل ہوتا ہے۔ جیسا کہ جہاں صرف توبہ کا ذکر ہوتا ہے تو وہ استغفار کو بھی شامل ہوتی ہے۔ پس توبہ استغفار کو شامل ہے اور استغفار توبہ کو۔ ان کے اطلاق پر ان میں سے ہر ایک دوسرے کے مسمیٰ میں داخل ہوتا ہے۔ لیکن جہاں دونوں کا ذکر ہو وہاں استغفار سے مراد ماضی کے گناہوں کے شر سے تحفظ طلب کرنا ہوتا ہے۔ اور توبہ کا معنی رجوع کرنا؛ اور مستقبل میں جن برے اعمال کا خوف ہے؛ ان سے حفاظت/ بچاؤ طلب کرنا ہوتا ہے۔ اس کی مثال: فقیر اور مسکین ہے۔ جب ان دونوں میں سے کسی ایک لفظ کا ذکر ہوتا ہے؛ تو اس میں دوسرا لفظ بھی شامل ہوتا ہے۔ اور جہاں کہیں دونوں کا ذکر ہوتا ہے تو دونوں کا الگ الگ معنی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ﴾ (المائدة : ۸۹)

''پس اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا﴾ (المجادلة : ٤)

''پس ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (البقرة : ۲۷۱)

''اور اگر تم اسے پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔''

اس میں کچھ اختلاف نہیں کہ ان آیات میں جبکہ ہر لفظ الگ استعمال ہوا ہے تو وہ کم مال والے اور بالکل خالی ہاتھ دونوں کو شامل ہے۔ [اور جب دونوں مل کر آئیں تو (اس میں اختلاف ہے)] [اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ﴾ (التوبة : ٦٠)

''بے شک صدقات (کے مستحق) فقیر اور مسکین ہیں۔''

فقیر سے مراد بالکل خالی دست انسان ہوتا ہے؛ اور مسکین سے مراد وہ ہوتا ہے جس کے پاس بہت کم مال ہو'' ۔ اسی طرح لفظ اثم اور عدوان ہے؛ اسی طرح البر اور التقویٰ؛ اسی طرح فسوق اور عصیان۔ اور اس معنی کے قریب قریب لفظ کفر اور نفاق ہیں۔ اگرچہ کفر عام ہے اس لیے کہ جب کفر کا لفظ ذکر کیا جائے تو وہ نفاق کو بھی شامل ہوتا ہے اور جب دونوں ذکر ہوں تو ہر ایک الگ معنی لیا جاتا ہے اسی طرح لفظ ایمان اور اسلام کا حال ہے۔ [1]

اس کی تفصیل آگے آئے گی؛ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

[1] تفصیل کے لیے اسباب سقوط العقوبة عن العبد (ص ۴۸۷/ ۵۰۱) کا مطالعہ کریں۔

تیسرا سبب: حسنات [نیکیاں]: بے شک ایک نیکی کا بدلہ دس گناہ زیادہ ملتا ہے۔ جب کہ برائی کا بدلہ اس کے برابر برابر ہوتا ہے۔ پس

اس شخص کے لیے تباہی و بربادی ہے جس کے ایک ایک اعمال دس دس نیکیوں پر غالب ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (هود: ١١٤)

''بے شک نیک اعمال برے اعمال کو مٹا دیتے ہیں۔''

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''برائی کے بعد نیک کام کرو؛ وہ [نیکی] اس کو مٹا دے گی''۔ ❶

❁ حدیث حسن ہے؛ سنن الترمذی ۲۰۷۰۔ (الروض النضير ٨٥٥).

دسواں سبب: دنیاوی مصائب: ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''مومن کو جب دکھ درد؛ پریشانی؛ اور غم وفکر لاحق ہوتا ہے؛ حتی کہ جب اسے کانٹا بھی چبھتا ہے تو ان کی وجہ سے اس کے گناہ ختم کردیے جاتے ہیں''۔ ❶

❁ بخاری، مسلم۔ حديث ابی هريرة وابی سعيد۔

مسند احمد بن حنبل میں ہے: جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ (النساء: ١٢٣)

''جو بھی برا عمل کرے گا (اس کو) اس کا بدلہ (ملے گا)۔'' تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا:

''یا رسول اللہ ﷺ! یہ آیت تو کمر کو توڑ دینے والی ہے۔ ہم میں کون ایسا شخص ہے جس سے برا فعل نہیں ہوا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! کیا تجھے تھکاوٹ نہیں ہوتی، کیا تجھے غم لاحق نہیں ہوتا؟ کیا تجھے مصائب نہیں پہنچتے؟۔ یہ سب کچھ ان گناہوں کا بدلہ ہوتا ہے'' ❷۔

❁ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے معنی کے لحاظ سے درست/صحیح ہے۔ مسند احمد (رقم ٦٨)، مسند ابی بكر المروزی (رقم ٢٠ و ١١١١)۔ احمد شاکر رحمہ اللہ اس مقام پر اپنی تعلیق میں فرماتے ہیں: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ روایات مسند میں ہماری شرح کے ساتھ ۶۸ نمبر کے تحت موجود ہے۔ لیکن وہاں پر اس کے شروع میں ہے کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اس آیت کے بعد اصلاح کیسے ہوگی؟ جب ہماری کی گئی ہر برائی کا بدلہ دیا جائے گا؟۔ یہاں پر کمر توڑنے والی کے الفاظ نہیں۔ وہ حدیث ضعیف ہے؛ اور اس کی سند منقطع ہے۔

شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ کو چاہیے تھا کہ وہ مسند میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث نمبر ۷۳۸۰ بھی ذکر کرتے؛ جس میں ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر بہت گراں گزری؛ انہیں کتنی تکلیف ہوئی یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکایت گزاری۔ تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''قریب قریب رہو؛ اور اصلاح کرو؛ ہر وہ تکلیف جو مسلمان پر آتی ہے؛ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔ حتی کہ اسے جو تکلیف دہ خیال آتا ہے''۔ یہ حدیث صحیح ہے؛ اسے امام مسلم نے صحیح مسلم میں روایت کیا ہے ۲/۲۸۲۔ اس روایت کے آخر میں ہے: ''حتی کہ کانٹا بھی جو کہ اسے چبھ جاتا ہے''۔ اگر شارح رحمہ اللہ تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تفسیر کا مطالعہ کرتے تو انہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت کے ساتھ ساتھ اس معنی میں دیگر کئی ایک روایات بھی مل جاتیں۔ جن میں سے بعض کی اسناد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ والی روایت کی اسناد سے زیادہ صحیح ہیں۔

پس مصائب بذات خود گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں۔ اور ان پر صبر کی وجہ سے بندے کو ثواب ملتا ہے۔ اور اظہار ناراضگی کرنے کی وجہ سے گنہگار رہوتا ہے۔ پس صبر کرنا یا ناراض ہونا مصیبت کے علاوہ علیحدہ چیز ہیں۔ پس مصیبت اللہ تعالیٰ کا فعل ہے بندے کا فعل نہیں ہے۔ یہ دراصل بندے کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے گناہ پر بدلہ ملتا ہے۔ اس مصیبت کی وجہ سے اس کے گناہ مٹا دیے جاتے ہیں۔ اور بندے کو گناہ یا ثواب اس کے فعل پر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صبر اور گریہ و ناراضگی بندے کا فعل ہے۔ ہاں کبھی اجر و ثواب بندے کے عمل بغیر

بھی اسے حاصل ہو جاتے ہیں؛ جو کسی دوسرے کی طرف سے ہدیہ ہوتا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے بلا سبب ثواب عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (النساء: ٤٠)

''اور اپنی طرف سے عظیم ثواب عطا کرے گا۔''

پس اس لحاظ سے بیماری بذات خود جزاء بھی ہے اور کفارہ بھی؛ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اجر وثواب سے مراد گناہوں کی معافی سمجھی جاتی ہے؛ یہ اس کا مدلول تو نہیں البتہ اس کے لوازم میں سے ضرور ہے۔

پانچواں سبب: عذاب قبر: اس پر مفصل بحث آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

چھٹا سبب: ایمانداروں کا اس کے حق میں دعا اور استغفار کرنا: زندگی میں بھی مرنے کے بعد بھی۔

ساتواں سبب: مرنے کے بعد اسے جو ثواب ہدیہ کیا جاتا ہے؛ جو کہ صدقہ، قرآن پاک کی تلاوت؛ یا حج وغیرہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس پر بھی بحث آگے آئے گی۔۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آٹھواں سبب: قیامت کے دن کی ہولناکیاں اور سختیاں۔

نواں سبب: [پل صراط کا عبور]: جیسا کہ حدیث میں ہے: ''مومن جب پل صراط پر سے گزریں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک ٹیلے پر کھڑے کیے جائیں گے؛ وہاں وہ آپس میں ایک دوسرے قصاص لیں گے۔ جب اچھی طرح چھان بین ہو جائے گی؛ صاف ہو جائیں گے؛ تو انھیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی''۔ [1]

[1] حدیث صحیح ہے۔ بخاری ٢٤٤٠، کتاب المظالم والرقاق، مسند احمد (٣/ ١٣، ٦٣) مسلم میں یہ حدیث نہیں ہے۔

دسواں سبب: شفاعت کرنے والوں کی سفارش۔ اس کا ذکر پہلے شفاعت اور اس کی اقسام میں گزر چکا ہے۔

گیارھواں سبب: بغیر شفاعت کے؛ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین کی طرف سے گناہوں کی معافی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء: ١١٦)

''اور اس کے سوا جس کو چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔''

پس اگر ایسا شخص ہے جس کے گناہ بہت بڑے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو معاف کرنا نہیں چاہتا؛ تو لازماً اس کو آگ بھٹی میں داخل ہونا پڑے گا؛ تاکہ اس کا پاکیزہ ایمان معاصی کی میل کچیل سے صاف ہو جائے۔ پس دوزخ میں وہ انسان ہمیشہ نہیں رہے گا جس کے دل میں ادنیٰ ادنیٰ ذرہ کے برابر ایمان ہے۔ بلکہ جس نے زبان سے لا الـه إلا الله کہا ہوگا؛ [وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ نہیں رہے گا] جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ [1]

پس جب حقیقت حال واضح ہو چکی ہے تو امت کے کسی معین فرد کے لیے یقین کے ساتھ جنت کا حکم لگانا درست نہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی شہادت دی ہے۔ البتہ نیک کام کرنے والوں کے لیے ہم جنت کے امیدوار ہیں اور ہم ان کے متعلق خطرہ بھی محسوس کرتے ہیں۔

[1] حدیث صحیح ہے۔ متفق علیه . البخاری ٧٥١٠ مسلم ١٩٣۔

[خوف اور امید کو جمع کرنا]

٦٠ ۔((وَالأَمْنُ وَالْيَأْسُ يَنْقُلانَ عَنْ مِلَّةِ الإِسْلامِ ؛وَسَبِيْلِ الْحَقِّ بَيْنَهُمَا لِأَهْلِ الْقِبْلَةِ .))

''......گناہ پر اطمینان اور [بخشش سے] مایوسی؛ دونوں ہی ملت اسلام سے خارج کر دیتے ہیں؛ جبکہ اہل قبلہ کے لیے راہ صواب ان کے درمیان ہے''۔

تشریح:...... ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خائف رہے اور جنت کا امیدوار بھی رہے۔ بے شک سچا اور قابل تعریف خوف وہ ہے جو اس انسان کے اور محرمات الٰہیہ کے درمیان حائل ہو جائے۔ پس جب اس سے تجاوز کر جائے تو خطرہ ہے کہیں نا امیدی اور مایوسی کا شکار نہ ہو جائے''۔[مدارج السالکین ۱/۵۱۴]

☆ اور قابل تعریف امید: اس انسان کی امید ہے؛ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور کی روشنی میں نیک عمل کرتا ہو؛ اور اس پر وہ اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتا ہو۔ یا پھر وہ آدمی جو گناہ کرے؛ اور گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے؛ اور اس کی مغفرت کا امیدوار رہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (البقرة : ٢١٨)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد فی سبیل اللہ کیا؛ وہی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحمت کرنے والا ہے۔''

لیکن جو شخص گناہوں اور خطاؤں میں ڈوبا ہوا ہو؛ اور وہ کسی نیک کام کے بغیر نیک اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہو؛ تو یہی حقیقی دھوکہ؛ بلا سود آرزو اور جھوٹی امیدیں ہیں۔

ابو علی روذباری رحمہ اللہ کا قول:

ابو علی روذباری رحمہ اللہ [۳۲۲ھ] فرماتے ہیں: ''خوف اور امید پرندے کے دو پروں کی مانند ہیں۔ جب تک دونوں پر مساوی رہیں اڑان درست رہے گی؛ اور پرواز پوری ہوگی۔ لیکن اگر کسی پر میں نقص ہوا؛ تو اڑان میں بھی نقص آ جائے گا۔ اور جب دونوں پر ضائع ہو جائیں تو پرندہ موت کے منہ میں چلا جائے گا''۔[مدارج السالکین ۲/۳۶]

یقیناً اللہ تعالیٰ نے خوف اور امید رکھنے والوں کی مدح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَائِمًا يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ﴾ (الزمر : ٩)

''بھلا وہ جو راتوں کو ڈرنے والا ہو؛ سجدہ کر کے اور کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے اور آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت

کی امید رکھتا ہے۔‘‘

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا﴾ (السجدة: ١٦)

’’ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔‘‘

پس امید خوف کو مستلزم ہے اگر خوف نہ ہو تو عذاب باری تعالیٰ سے بے خوف ہونا ہے۔ اور خوف امید کو مستلزم ہے اگر امید نہیں تو ناامیدی اور مایوسی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب آپ کسی سے ڈرتے ہیں تو اس سے بھاگتے ہیں۔ سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ جب آپ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں تو اس کی جانب دوڑتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا؛ اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگنے والا ہے‘‘۔[مدارج السالکین ۱/۵۱۳]

منازل السائرین کے مؤلف رحمہ اللہ کا قول ہے: ’’امید مرید کی کمزور منزل ہے‘‘۔

لیکن یہ بات محل نظر ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا وضاحت کے مطابق امید اور خوف مرید کی اشرف ترین منزل ہے۔

صحیح حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

’’میں اپنے متعلق اپنے بندے کے خیال کے قریب ہوتا ہوں وہ میرے متعلق جو چاہے خیال کرے۔‘‘ ❶

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ فرماتے ہیں:

’’میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وفات سے تین دن پہلے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

’’تم میں سے کسی شخص کو موت نہ آئے مگر وہ اپنے رب کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہو‘‘۔ ❷

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ بیماری کی حالت میں اس کی امید خوف پر غالب ہو: بخلاف زمانہ صحت کے۔ زمانہ صحت میں خوف اس کی امید پر غالب ہو۔ بعض حضرات کا کہنا ہے: ’’جس نے محض محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی وہ زندیق ہے۔ اور جس نے محض خوف کے ساتھ عبادت کی؛ وہ حروری ہے؛ اور جس نے صرف امید کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی وہ مرجئی ہے۔ اور جس کسی نے اللہ تعالیٰ کی عبادت؛ اس کی محبت میں؛ اس کے خوف کے ساتھ اور اس سے امید کرتے ہوئے کی؛ وہ مومن موحد ہے۔ محمود وراق نے خوب کہا ہے:

❶ حدیث صحیح ہے۔ متفق علیه۔ حدیث ابی هريرة۔ ان الفاظ میں یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مسند أحمد ۲/ ۳۹۱ میں وارد ہوئی ہے۔ اس میں ابن لہیعہ راوی مدلس/ضعیف ہے۔ لیکن اس کی شاہد روایت حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ سے مسند أحمد ۳/ ۴۹۱ میں وارد ہوئی ہے۔ اور دیگر کتب میں بھی صحیح سند کے ساتھ یہ روایت موجود ہے۔ صحیح ابن حبان ۶۳۵؛ الحاکم ۴/ ۲۴۰؛ سلسلہ صحیحہ ۱۶۶۳۔

❷ حدیث صحیح ہے۔ مسلم ٢٨٧٧، احکام الجنائز (ص ٣)

لو قد رأيت الصغير من عمل الـ ... خير ثواباً عجبت من كبره

أو قد رأيت الحقير من عمل الشْ ... شرِّ جزاءً أشفقت من حذره

’’اگر آپ کی چھوٹے سے نیکی کے کام کا ثواب دیکھیں گے تو تعجب کریں گے کہ اس کا ثواب کس نے بڑھا دیا۔ اور اگر آپ معمولی برے کام کے بدلہ کو دیکھیں گے تو آپ کو بہت زیادہ خوف لاحق ہوگا کہ اس سے کس ہستی نے منع کیا تھا۔‘‘

[ایمان سے خروج کب ہوگا؟]

٦١ـ((وَلاَ يَخْرُجُ الْعَبْدُ مِنَ الإِيْمَانِ إِلاَّ بِجُحُودِ مَا أَدْخَلَهُ فِيْهِ❼ .))

''اور بندہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا مگر جب ان چیزوں کا انکار کرے جن کے اقرار سے وہ ایمان میں داخل ہوا تھا''۔

❼. [علامہ بن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:] یہ حصر[تحدید] محل نظر ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ کافر کلمہ شہادت کے پڑھنے سے اسلام میں داخل ہوجاتا ہے؛ جب وہ کلمہ نہ پڑھتا ہو۔اور اگر کلمہ پڑھتا ہوتو وہ اس گناہ سے توبہ کرکے اسلام میں داخل ہوسکتا ہے جس کی وجہ سے کفر واجب ہوا ہے۔اور بیشتر اوقات بہت سارے اسباب کی بنا پر انسان بغیر کسی انکار کے بھی دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے؛ اہل علم نے یہ اسباب مرتد کے حکم کے باب میں بیان کردیے ہیں۔ان اسباب میں سے ایک اسلام پر طعنہ زنی کرنا بھی ہے؛ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا بھی ہے۔اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی کتاب کا؛ یا اس کی شریعت میں سے کسی بھی چیز کا مذاق کرنا بھی ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:﴿ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۞ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ﴾[التوبة ٦٥]''فرمادیں: کیا تم اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ مذاق کررہے تھے؟ بہانے مت بناؤ، بے شک تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا''۔

انہی امور میں سے بتوں یا مورتیوں کی عبادت کرنا؛ مُردوں کو پکارنا؛ اور ان سے مشکل کشائی چاہنا؛ ان سے مدد اور معاونت طلب کرنا اور اس طرح کے دوسرے امور بھی ہیں۔اس لیے کہ یہ امور کلمہ ''لا إلہ إلا اللہ'' کے اقرار کے متناقض اور منافی ہیں۔یہ کلمہ تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عبادت کا مستحق صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔انہی خلاف اسلام امور میں سے غیر اللہ تعالیٰ سے [مافوق الاسباب] دعا کرنا؛ اور مشکل کشائی چاہنا؛ اور انہیں رکوع یا سجدہ کرنا یا ان کے نام پر ذبح کرنا؛ یا ان کے نام کی نذر[منت] ماننا بھی ہے۔پس جو ان عبادات میں سے کوئی ایک عبادت بھی کسی بھی غیر اللہ تعالیٰ کے لیے بجالاتا ہے؛ جیسے بت: مورتیاں؛ ملائکہ؛ جنات اور اصحاب قبور اور دیگر مخلوقین؛ تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یقینی شرک کا ارتکاب کرتا ہے؛ اور لا إلہ إلا اللہ کے حقائق کو بجانہیں لاتا۔یہ تمام مسائل انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کردیتے ہیں۔اس پر اہل علم رحمہم اللہ کا اجماع ہے؛ یہ صرف کسی چیز کے انکار کا مسئلہ نہیں۔ان مسائل کے دلائل کتاب وسنت میں صاف واضح اور معلوم شدہ ہیں۔ان کے علاوہ دیگر بھی ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے مسلمان کافر ہوجاتا ہے۔مگر انہیں انکار نہیں کہا جاسکتا۔''حکم مرتد'' کے باب میں علماء کرام نے یہ مسائل بیان کئے ہیں۔آپ چاہیں تو وہاں مراجعت کرسکتے ہیں۔وباللہ تعالیٰ التوفیق۔

اُقول: یہ کہنا کہ صرف انہی امور سے انسان دین اسلام سے خارج ہوگا جن سے دین اسلام میں داخل ہوا ہے؛ یہ انتہائی خطرناک جملہ ہے۔اس لیے کہ انسان دل وزبان سے شہادتین کے اقرار سے دین اسلام میں داخل ہوتا ہے؛ اگر وہ زبان سے اقرار کرے دل سے نہ مانے تو وہ منافق ہے۔اور اگر اس نے دل سے تو تسلیم کرلیا ہے مگر زبان سے اس کا انکار کررہا ہے تو وہ منکر اور کافر ہے جیسے فرعون تھا۔نیز انسان مسلمان ہوکر بھی کسی شعائر اسلام کا مذاق اڑائے تو وہ کافر ہوجاتا ہے۔بھلے وہ ان کو تسلیم بھی کرتا ہو۔ایسے ہی علم کے ہوتے ہوئے کفریہ افعال کا ارتکاب کرنے سے بھی انسان کافر ہوجاتا ہے بھلے وہ شہادتین کا اقرار بھی کرتا ہو۔مثلاً غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا؛ یا اسے مشکل کشائی کے لیے پکارنا؛ غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور اس طرح کے دیگر۔

تشریح:...... شیخ طحاوی رحمہ اللہ یہاں خوارج اور معتزلہ کا رد کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ ان کے ہاں کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے انسان ایماندار نہیں رہتا۔اس میں سابقہ جملہ کی تائید ہے؛ جس میں آپ نے کہا تھا:''اہل قبلہ میں سے کسی ایک کو اس کے گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہا جاسکتا؛ جب تک وہ اسے حلال نہ سمجھے'' ①۔اس پر بحث گزر چکی ہے۔

① ۔میں کہتا ہوں:''ان جیسے ہی لوگ آج کل اسلامی ممالک کے تمام مسلمانوں پر بغیر کسی استثنا کے کفر کا حکم لگاتے ہیں۔اور ان کے ماننے والوں پر ان سے دوری اور علیحدگی کو واجب ٹھہراتے ہیں۔جیسا کہ اس سے پہلے خوارج بھی کرچکے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے؛ اور ان غلو کرنے والوں کی مغفرت کرے جو اس خطرناک انحراف اور گمراہی کا سبب بنے ہیں۔

[ایمان کس چیز کا نام ہے؟]

۶۲۔۶۴((وَالإِيْمَانُ هُوَ الإِقْرَارُ بِاللِّسَانِ وَالتَّصْدِيْقُ بِالْجَنَانِ ❸ . ①وَجَمِيْعُ مَا صَحَّ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ مِنَ الشَّرْعِ وَالْبَيَانِ كُلُّهُ حَقٌّ . ((وَ الإِيْمَانُ وَاحِدٌ وَأَهْلُهُ فِي أَصْلِهِ سَوَاءٌ ، وَالتَّفَاضُلُ بَيْنَهُمْ بِالْخَشْيَةِ وَالتُّقٰى وَمُخَالِفَةِ الْهَوٰى وَمُلازَمَةِ الأَوْلٰى .))

''......اور ایمان اقرار باللسان تصدیق بالقلب کا نام ہے۔''وہ تمام امور شریعت اور وضاحت جو رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں وہ سب حق ہیں''۔''اور ایمان ایک ہی چیز ہے؛ اہل ایمان اس کی اصل میں برابر ہیں؛ ان میں تفاوت بلحاظ خشیت پرہیزگاری اور خواہش نفس کی مخالفت؛ اور اولیٰ کے التزام کے اعتبار سے ہے''۔

❸۔ یہ تعرف محل نظر ہے؛ اس میں کچھ کمی رہ گئی ہے۔ حق بات وہی ہے جو اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے؛ بے شک ایمان قول و عمل اور عقیدہ کا نام ہے؛ اطاعت گزاری کرنے سے ایمان بڑھتا ہے؛ اور گناہ سے کم ہوتا ہے۔ کتاب و سنت میں اس عقیدہ پر بے شمار دلائل موجود ہیں۔ ابن ابی العز رحمہ اللہ نے ان میں سے کچھ دلائل اپنی شرح میں ذکر کئے ہیں۔ اعمال کو ایمان سے باہر سمجھنا مُرْجِئَہ کا عقیدہ ہے۔ اس میں اہل سنت والجماعت اور مُرْجِئَہ کے مابین صرف لفظی اختلاف نہیں؛ بلکہ لفظی اور معنوی اختلاف ہے۔ اس پر بہت سارے احکام مرتب ہوتے ہیں۔ ان کو وہی جان سکتا ہے جو اہل سنت والجماعت اور مُرْجِئَہ کے کلام پر غور و فکر کرے۔ واللہ تعالیٰ المستعان

①۔ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ سلف صالحین اور جمہور ائمہ جیسے امام مالک؛ امام شافعی؛ امام أحمد بن حنبل اور امام اوزاعی رحمہم اللہ کے مسلک کے برعکس حنفیہ ماتریدیہ کا مذہب ہے۔ یہ حضرات اقرار اور تصدیق پر ایک چیز کا اضافہ کرتے ہیں یعنی اعضاء سے عمل۔ ان دونوں مذاہب کے مابین صرف ظاہری الفاظ کا اختلاف نہیں جیسا کہ شارح رحمہ اللہ نے بھی اسی چیز کا اظہار کیا ہے۔ اور یہ دلیل یہ پیش کی ہے کہ ان تمام حضرات کے نزدیک کبیرہ گناہ کا مرتکب ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تحت ہوتا ہے؛ وہ چاہے تو اسے عذاب دے؛ اور چاہے تو معاف کر دے۔ اس لیے کہ اگرچہ یہ اتفاق صحیح ہے؛ اور حنفیہ اس انکار میں جمہور کے ساتھ حقیقی اختلاف نہ رکھتے ہوتے؛ کہ عمل ایمان کا حصہ نہیں ہے؛ تو وہ کم از کم اس بات میں تو جمہور کا ساتھ دیتے کہ ایمان گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ اور ایمان میں کمی و بیشی معصیت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس پر کتاب و سنت اور سلف صالحین کے اقوال سے بے شمار دلائل موجود ہیں۔ شارح رحمہ اللہ نے ان میں سے بعض عمدہ قسم کی دلیلیں پیش بھی کی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایمان کے کم ہونے اور بڑھتے پر ان صریح اور کھلم کھلا دلائل کے باوجود حنفیہ اپنی بات پر مصر ہیں۔ اور وہ ان دلائل میں بے تکلف تاویل کر رہے؛ بلکہ باطل تاویل کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ شارح رحمہ اللہ نے (ص ۳۸۵ پر) اس کی کچھ مثالیں پیش کی ہیں۔ بلکہ انہوں نے ابو معین نسفی کا حدیث: ((الإيمان بضع وسبعون شعبة ......)) کی صحت پر اعتراض نقل کیا ہے؛ حالانکہ جمہور محدثین جیسے امام بخاری؛ امام مسلم رحمہما اللہ؛ اور دیگر نے اس حدیث سے دلیل پیش کی ہے [اور اسے صحیح مانا ہے]۔ (الصحیحة ۱۷۶۹) ۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ حدیث ان کے مذہب کے صریح خلاف ہے۔ پھر یہ کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ اختلاف صرف صوری اختلاف ہے۔ جبکہ وہ فاجر ترین انسان کے لیے یہ کہنا روا قرار دیتے ہیں کہ میرا ایمان حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ایمان کی طرح ہے۔ بلکہ انبیاء و مرسلین اور جبریل و میکائیل علیہم السلام کے ایمان کی طرح ہے۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے جب کہ وہ اپنے مذہب کی بنیاد پر کسی ایک کے لیے۔ بھلے وہ کتنا ہی فاسق و فاجر کیوں نہ ہو۔ یہ کہنا جائز نہیں سمجھتے کہ: میں ان شاء اللہ تعالیٰ مؤمن ہوں۔ بلکہ اسے یوں کہنا چاہیے کہ میں سچا مؤمن ہوں؛۔ جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ o الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ o اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ﴾ (الانفال: ۲۔۴) ''مومن تو وہ ہیں جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب

انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اور وہ جو نماز پڑھتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں یہی سچے مومن ہیں۔''

[اور فرمان الٰہی ہے:]﴿ ومن أصدق من اللہ قیلا﴾[نساء ۱۲۲] ''اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر سچا کون ہوگا''۔ان تمام دلائل کے باوجود وہ اپنے تعصب میں سرگرداں ہیں۔اور کہتے ہیں: جو کوئی اپنے ایمان میں استثنیٰ کرتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے۔اور پھر اس پر ایک فرعی مسئلہ نکالا ہے کہ حنفی عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ شافعی مذہب کے مرد سے شادی کر لے۔حالانکہ یہ آپس میں بڑی رواداری کے دعوے کرتے ہیں۔اور شافعیہ پر مہربانی کر کے ان کے ساتھ اہل کتاب جیسا سلوک کرتے ہوئے ان کی عورتوں سے شادی کو جائز کہتے ہیں۔میں حنفی مشائخ میں سے ایک شخص کو جانتا ہوں جس کی بیٹی کا رشتہ ایک شافعی شیخ نے طلب کیا؛ تو اس نے یہ کہتے ہوئے جواب دیا......؛ کاش کہ تم شافعی نہ ہوتے؟ تو کیا اب شک کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتا ہے کہ یہ اختلاف صورت ظاہری/صوری اختلاف نہیں بلکہ حقیقی اختلاف ہے۔جو کوئی اس مسئلہ میں وسیع معلومات چاہتا ہوا سے چاہیے کہ شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی کتب کی طرف رجوع کرے۔اس موضوع پر آپ کی تحریریں بہترین علمی مواد ہیں۔

أقول: علامہ البانی رحمہ اللہ کی تحقیق کے ساتھ طبع ہونے والے شرح کے نسخہ میں پیرا نمبر ۶۲ سے لیکر ۶۴ تک کو متن میں یکجا کر دیا گیا ہے۔مگر دوسری شروح اور اصل متن ہر ایک پیرائے کو الگ الگ لائے ہیں۔چنانچہ میں نے بھی یہاں پر اسی نسخہ کی تقلید کی ہے جس سے میں ترجمہ کر رہا ہوں۔

تشریح:......اہل علم کے مابین بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ ایمان کس چیز کا نام ہے؟:

[اول]: حضرت امام مالک، شافعی، احمد؛ امام اوزاعی [۸۸-۱۵۷ھ] اسحاق بن راہویہ [۱۶۱-۲۳۸ھ] جملہ محدثین، اہل مدینہ، اہل ظاہر رحمہم اللہ اور متکلمین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ:''ایمان تصدیق بالقلب، اقرار باللسان عمل بالارکان کا نام ہے''۔

[دوم]: ہمارے اکثر فقہاء رحمہم اللہ کا وہی عقیدہ ہے جس کا ذکر امام طحاوی رحمہ اللہ نے کیا ہے کہ ایمان:''اقرار باللسان، تصدیق بالقلب کا نام ہے''۔

[سوم]: بعض حضرات کا قول ہے:''اقرار باللسان زائد رکن ہے اصلی نہیں۔یہ مذہب ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا ہے۔اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بھی روایت کیا گیا ہے۔

[چہارم]: کرامیہ کا عقیدہ ہے کہ ایمان صرف زبان سے اقرار کا نام ہے؛ فقط۔ان کے نزدیک منافق مومن ہیں بلکہ کامل ایمان ہیں۔لیکن وہ کہتے ہیں کہ وہ اس وعید باری تعالیٰ کے مستحق ہیں جو انہیں سنائی گئی ہے۔ان کا یہ قول واضح طور پر فاسد ہے۔

[پنجم]: جہم بن صفوان اور ابو الحسن صالحی قدریہ کا ایک سرغنہ؛ اس طرف گئے ہیں کہ: ایمان صرف دل کی معرفت کا نام ہے۔یہ قول پہلے قول سے بھی بڑھ کر فاسد ہے۔چونکہ اس قول سے لازم آتا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کو مومن کہا جائے۔اس لیے کہ انھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے سچا ہونے کی معرفت حاصل تھی۔اگرچہ وہ ان پر ایمان نہیں لائے تھے۔اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآئِرَ﴾ (الاسراء: ۱۰۲)

''تم یہ جانتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے رب کے سوا اس کو کسی نے نازل نہیں کیا؛ سمجھانے کو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۝﴾ (النمل: ۱۴)

''انہوں نے اس کا انکار کیا؛ اور ان کے دل ان کو مان چکے تھے سو دیکھ لو فساد کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔''

اسی طرح اہل کتاب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت بالکل اسی طرح حاصل تھی جس طرح کہ ان کو اپنے بیٹوں کی معرفت حاصل

تھی۔لیکن وہ آپ پر ایمان نہ لائے کفر اختیار کیے رکھا اور آپ کی مخالفت کرتے رہے۔اسی طرح ابو طالب بھی اس کے ہاں ایماندار ہوگا ۔بے شک اس نے برملا کہا تھا:

ولقد علمت بأن دين محمد من خير أديان البرية دينا

لو لا الملامة أو حِذارُ مسبةٍ لوجدتني سمحا بذاك مبيناً

''میں جانتا ہوں کہ دین محمد دنیا کے تمام ادیان سے بہتر ہے،اگر ملامت کا خیال یا عار کا خوف نہ ہوتا تو مجھے اس کی واضح طور پر موافقت کرنے والا پاتا۔''

بلکہ ابلیس بھی جہم کے نزدیک کامل مؤمن ہے: کیونکہ وہ اپنے رب کی معرفت رکھتا تھا اس سے جاہل نہ تھا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِيٓ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ۝﴾ (الحجر : ۳۶)

''کہا: اے میرے رب! مجھے اس دن تک مہلت عطا کر جس روز اٹھائے جائیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِي﴾ (الحجر : ۳۹)

''کہا: میرے رب اس سبب سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ۝﴾ (ص : ۸۲)

''کہا؛ تیری عزت کی قسم میں ان تمام کو ضرور گمراہ کروں گا۔''

جہم کے نزدیک کفر صرف رب تعالیٰ سے جاہل ہونے کا نام ہے۔اس لحاظ سے جہم سے زیادہ کوئی بھی رب تعالیٰ سے زیادہ جاہل نہیں۔بے شک اس نے رب تعالیٰ کو وجود مطلق سے تعبیر کیا ہے؛ اور اس کی تمام صفات کا انکار کر دیا۔اس سے بڑھ کر کوئی جہالت نہیں۔پس وہ خود اپنے نفس پر اپنی ہی گواہی کی روشنی میں کافر ہوگیا۔

ان مذاہب کے علاوہ دیگر مذاہب بھی ہیں جن کے ذکر سے میں نے عمداً اختصار کو اختیار کرتے ہوئے اعراض کیا ہے۔ان تمام کا ذکر ابو المعین نسفی ❶ نے ''تبصرة الادلہ'' میں کیا ہے۔

❶ نام میمون بن محمد ابو المعین نسفی الحنفی ھے۔ اصول اور علم کلام میں بہرۂ وافر رکھتا تھا سمرقند اور بخاریٰ میں رہائش پذیر تھا متعدد کتابیں تالیف کیں۔(۴۱۸۔۵۰۸)

[خلاصہ بحث]: اس تمام گفتگو کا خلاصہ اور حاصل یہ ہے کہ: بے شک ایمان: یا تو دل، زبان، جوارح کے ساتھ قائم ہوگا۔جیسے جمہور سلف صالحین تینوں ائمہ اور دیگر اہل علم رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

یا ایمان کا تعلق صرف دل اور زبان کے ساتھ تعلق ہے جوارح کے ساتھ نہیں۔جیسے امام طحاوی رحمہ اللہ نے امام ابو حنفیہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب سے بیان کیا ہے۔

یا پھر ایمان کا تعلق صرف زبان کے ساتھ تعلق ہے۔جیسا کہ کرامیہ کا مذہب ہونے کا گزر چکا۔

یا پھر ایمان کا تعلق دل سے ہے؛ جیسے یا تو معرفت کا نام دیتے ہیں۔ یہ مذہب جہم کا ہے۔

یا پھر ایمان صرف تصدیق کا نام ہے؛ جیسے ابو منصور ماتریدی کا مذہب ہے۔

خیال رہے کہ جہم (بن صفوان) اور کرامیہ کے مذہب کا بالکل باطل ہونا صاف ظاہر ہے۔

[امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمہ اہل سنت کے مابین اختلاف]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ اہل سنت کے درمیان اختلاف ظاہری صورت کا ہے۔ بے شک جوارح کے اعمال ایمان بالقلب کے لوازم میں سے ہیں۔ یا ایمان کا جزء ہیں۔ جبکہ اس بات پر اتفاق ہے کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت میں ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کو عذاب دے؛ اور اگر چاہے تو معاف کر دے۔ بہر حال یہ اختلاف لفظی ہے؛ اس پر اعتقاد کی خرابی مرتب نہیں ہوتی۔ اور جو لوگ تارک نماز کو کافر کہتے ہیں وہ اس اصل کے ساتھ دیگر ادلہ بھی ملاتے ہیں۔ وگرنہ یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زانی، چور؛ شرابی، اور اچکے سے ایمان کی نفی کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان سے بالکل اسم ایمان کا زوال واجب نہیں ہوتا۔ [یعنی وہ دائرہ سے خارج نہیں ہوتے]۔ اس پر تمام (اہل سنت والجماعت) کا اتفاق ہے۔

نیز اہل سنت والجماعت کے درمیان اس بات میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں سے مطلوب قول اور عمل دونوں ہیں۔ قول سے میری مراد تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ہے۔ اور یہی معنی ان کے اس قول کے اطلاق کے وقت ہوتا ہے کہ: ''ایمان قول اور عمل کا نام ہے''۔ لیکن بندوں سے جب اس کا مطالبہ کیا گیا ہے تو کیا اس کو ایمان کا نام شامل ہے؟ یا ان میں سے ایک کا نام ایمان ہے یعنی صرف قول ایمان ہے؟۔ اور عمل اس سے جدا ہے؛ اسم ایمان اس وقت اس کو شامل نہیں ہوتا؛ جب اکیلے ایمان کا ہی ذکر کیا جائے۔ اور اگر ان دونوں پر ایمان کا اطلاق ہوا ہے تو مجازاً ایسا ہوا ہے؟۔ یہ چیز محل اختلاف ہے۔

اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص دل میں تصدیق کرتا اور زبان کے ساتھ اقرار کرتا ہے لیکن عمل بالجوارح نہیں کرتا؛ تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا نافرمان ہے وعید باری تعالیٰ کا مستحق ہے۔ لیکن [اختلاف اس میں ہے] شخص جو کہتا ہے کہ اعمال ایمان کے مسمیٰ میں داخل نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ: جب ایمان ہی ایک چیز ہے؛ تو پھر میرا ایمان حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ایمان کے برابر ہے بلکہ انبیاء اور پیغمبروں، جبرئیل، میکائیل کے ایمان کے برابر ہے۔ یہ عقیدہ غلو کا شاہکار ہے۔ بے شک کفر اور ایمان کا باہمی تعلق وہی ہے جو بینائی اور اندھے پن کا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بصارت والے قوت اور ضعف کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں دن کو نظر نہیں آتا اور کچھ وہ ہیں جنھیں رات کو نظر نہیں آتا۔ اور بعض وہ ہیں جو موٹے حروف تو پڑھ لیتے ہیں باریک حروف کو عینک کے بغیر نہیں پڑھ سکتے اور بعض وہ ہیں جن کی قریب کی نظر کمزور ہے اور بعض وہ ہیں جن کی دور کی نظر کمزور ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شیخ طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہل ایمان اصل میں برابر ہیں'' یعنی یہ مساوات اصل ایمان میں ہے؛ اس سے ''من کل الوجوہ'' یعنی ہر لحاظ سے مساوات لازم نہیں آتی۔ بلکہ ''لا إله إلا الله'' پڑھنے والوں کے دلوں میں اس کلمہ کے نور کے درجات میں اتنا زیادہ فرق ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

چنانچہ بعض کے دلوں میں اس ''لا إلــه إلا الــلـه'' کی روشنی سورج کی مانند ہوتی ہے؛ اور بعض دلوں میں چمکتے ہوئے ستارہ کی

مانند؛اور بعض کے دلوں میں مشعل عظیم کی مانند؛اور بعض چمکتے ہوئے چراغ اور بعض کی ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مانند۔

یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن اسی مقدار کے مطابق ایمان کی روشنی ظہور پذیر ہوگی جس قدر کسی شخص کے دل میں ایمان اور توحید کی روشنی ہوگی اسی قدر اس علم وعمل کی شعاعیں قیامت کے روز ان کے دائیں جانب اور ان کے سامنے دکھائی دیں گی۔اور جس قدر اس کلمہ کی روشنی زیادہ اور عظیم ہوگی؛ وہ اپنی قوت کے حساب سے شبہات اور شہوات کو جلا کر رکھ دے گی۔اس طرح سے بسا اوقات اس حال کو پہنچ جاتی ہے کہ کوئی شبہ یا شہوت یا گناہ اس کا سامنا نہیں کر سکتی؛مگر یہ نور اسے جلا کر رکھ دیتا ہے۔یہ حال سچے توحید پرست کا ہوتا ہے۔ اس کے ایمان کے آسمان کو ہر چور کے رجم سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔[یعنی جب بھی کوئی چور اس کا رخ کرے اسے رجم کر دیا جاتا ہے]۔جس کو اس حقیقت کی معرفت حاصل ہوگئی؛تو اسے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی حقیقت کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے:

''اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر دوزخ کو حرام کر دیا ہے جس نے ''لا إلٰــه إلا الـلــه'' کا اقرار کیا؛اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا طالب ہو''۔ ❶

اور یہ حدیث مبارک کہ:''وہ انسان جہنم میں داخل نہیں ہوگا جس نے ''لا إله إلا الله'' کا اقرار کیا ہو''۔

اس مضمون کی دیگر احادیث بھی وارد ہوئی ہیں؛ جن کا فہم اکثر لوگوں کے لیے مشکل ہے۔حتی کہ بعض لوگ ان احادیث کو منسوخ خیال کرتے ہیں۔بعض کا خیال ہے کہ:یہ احادیث مبارکہ اوامر نواہی[احکام] سے قبل تھیں۔بعض نے اس آگ سے مشرکین اور کفار والی آگ مراد لی ہے۔بعض نے دخول کی تاویل خلود[ہمیشگی] سے کی ہے۔اس طرح کی دیگر تاویلات بھی ہیں۔

❶ حدیث صحیح ہے۔متفق عليه حديث عتبان بن مالك . البخاری ٤٢٥ ؛ مسلم ٣۔

اسی لیے شارع علیہ السلام نے صرف زبان کے ساتھ اقرار کو کافی نہیں سمجھا ہے۔یہ بات دین اسلام میں ضرورت کے تحت[بدیہی طور پر]معلوم شدہ ہے کہ بے شک منافق اپنی زبانوں سے اس کلمہ کا اقرار کرتے تھے؛مگر وہ اس کے باوجود[عام] کافروں سے بھی نیچے؛ جہنم کے نچلے درجے میں ہونگے۔بے شک اعمال اپنی شکل وصورت اور تعداد کے لحاظ سے آپس میں فضیلت نہیں رکھتے؛ بلکہ ان کی فضیلت کی وجہ دل میں ان کی فضیلت ہوتی ہے۔

[بطاقہ] کاغذی پرزہ والی حدیث پر غور کریں۔اس (بطاقہ) کے مقابلہ میں ننانوے دفاتر ہونگے؛اور ہر دفتر تا حد نظر پھیلا ہوا ہو گا۔مگر وہ کاغذ کا پرزہ بھاری ہو جائے گا۔اور وہ تمام دفاتر[رجسٹر] ہلکے پڑ جائیں گے۔پس اس بطاقہ والے کو عذاب نہ ہوگا''۔ ❶

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ:''لا الٰــه الا الـلــه'' والا پرزہ تو ہر موحد کے پاس ہوگا؛ پھر بھی بہت سارے لوگ دوزخ میں داخل ہوں گے۔اب سو انسانوں کے قاتل کے دل میں جو حقائق ایمانی تھے؛ان پر غور کریں۔یہ گناہ اسے اس بستی کی طرف جانے سے نہ روک سکے؛[جس کی طرف اس کی رہنمائی کی گئی تھی]۔اور اس حالت میں بھی اس کی ایمان کی کیفیت اس کو دل سے توبہ کرنے پر ابھار رہی تھی؛ حالانکہ وہ سکرات موت کے عالم میں تھا۔

❶ حدیث صحیح ہے۔حديث عبد الله بن عمرو۔ مسند احمد٢١٣٢ ، ترمذی٢٧٨٩ ، الاحاديث الصحيحة (١٣٥) . ۔ اس مکمل قصے کے لیے ملاحظہ فرمائیں:البخاری ۳۴۷۰؛مسلم ۲۷۶۶۔

اس زانیہ کے دل میں قائم ایمانی کیفیت پر غور کیجیے؛جب اس نے اپنا جوتا اتارا[اور اس کو ڈول بنا کر] کنوئیں کی منڈیر پر

(پیاسے) کتے کو پانی پلایا؛ تو اس کی مغفرت کردی گئی ۞۔

۞ اس مکمل قصے کے لیے ملاحظہ فرمائیں: البخاری ۳۴۰۷؛ مسلم ۲۲۴۵۔ مدارج السالکین ۱/ ۳۲۹۔

عقل کا معاملہ بھی ایسے ہی ہے۔ بے شک عقل تفاضل/ [افضیلت] کو قبول کرتی ہے۔ جبکہ عقل کے بنیادی عنصر میں تمام لوگ برابر ہوتے ہیں۔ وہ تمام اس امر میں برابر ہیں کہ وہ عقل مند ہیں؛ دیوانے نہیں۔ لیکن بعض لوگ زیادہ عقل والے ہوتے ہیں اور بعض ناقص عقل والے ہوتے ہیں۔ اسی طرح واجبات اور محرمات کا معاملہ بھی ہے۔ بعض واجبات زیادہ تاکیدی ہوتے ہیں؛ اور بعض کم۔ اور بعض محرمات بہت سخت ہوتی ہیں اور بعض کم۔ صحیح مسلک یہی ہے۔ اگر چہ عقل اور وجوب میں بعض اس کو رد کرتے ہیں۔

ایمان میں کمی بیشی کا اجمال اور تفصیل:

ایمان کے زیادہ ہونے کے اعتبار سے اس میں اجمال بھی ہے اور تفصیل بھی۔ یہ تو معلوم ہے کہ شروع اسلام میں وہ کچھ واجب نہیں تھا جو تمام قرآن نازل ہونے کے بعد واجب ہوا۔ اسی طرح ہر شخص پر واجب نہیں ہوتا کہ اس کا ایمان رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں پر اس طرح تفصیلی ہو؛ جس طرح اس کا ایمان ہے جس تک آپ ﷺ کے ارشادات پہنچتے ہیں۔ جیسا کہ نجاشی رحمہ اللہ اور اس جیسے دیگر حضرات کا معاملہ ہے۔

جہاں تک تصدیق اور عمل سے زیادتی کا تعلق ہے؛ جو دل اور دیگر اعضاء کے اعمال کو مستلزم ہے؛ تو وہ بہر حال اس شخص سے افضل ہے جو عمل کا التزام نہیں کرتا۔ پس جو کوئی اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہے؛ وہ اس انسان سے زیادہ کامل ہے جو علم کے مطابق عمل نہیں کرتا۔ جب لازم حاصل نہ ہو تو یہ اس کے ملزوم کے کمزور ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ اسی لیے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

''جس کو خبر دی جائے وہ انسان عینی مشاہدہ کرنے والے جیسا نہیں ہوتا۔'' [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب بتایا گیا کہ آپ کی قوم نے بچھڑے کو پوجنا شروع کر دیا ہے؛ تو انھوں نے [تورات کی] تختیوں کو زمین پر نہیں پھینکا؛ لیکن جب بچشم خود دیکھا کہ وہ بچھڑے کو پوج رہے ہیں؛ تو انھیں زمین پر دے مارا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے خبر دینے میں شک کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ مُخْبَر [خبر دیا گیا] اگر چہ مُخْبِر [خبر دینے والا] کی سچائی کا قطعی یقین رکھتا ہو؛ تب بھی کبھی اپنے دل میں اس خبر کا تصور بھی نہیں کر سکتا؛ جیسا کہ مشاہدہ کرنے کے وقت اس کا تصور بن جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

[1] حدیث صحیح ہے۔ مسند احمد (۱/ ۲۱۵، ۲۷۱)، طبرانی اور خطیب نے صحیح سند کے ساتھ انھیں الفاظ کے ساتھ بیان کی۔ تخریج المشكاة (٥٧٣٨).

﴿رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَ لٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ﴾ (البقرة: ۲۶۰)

''میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ فرمایا: کیا تم اس پر ایمان نہیں رکھتے؟ کیوں نہیں؛ لیکن میں چاہتا ہوں میرے کو دل اطمینان ہو جائے۔''

مزید وضاحت کے لیے غور فرمائیں؛ مثال کے طور پر: جس شخص پر حج اور زکوٰۃ فرض ہے اس کے لیے ان احکام کے علم پر ایمان

بھی ضروری ہے جن کا اسے حکم دیا گیا ہے؛ کہ اسے ان مسائل کی تفاصیل کا علم ہو اور ان پر ایمان بھی ہو۔ اور اسے یہ بھی ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر وہ چیز تفصیلاً واجب کی ہے جو دوسروں پر صرف اجمالاً واجب کی ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ان کی تفاصیل کا علم رکھتا ہو اس لیے کہ مجمل ایمان کافی ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو ابھی ابھی دائرہ اسلام میں داخل ہوا ہے اس کے لیے مجملاً اقرار کافی ہے جب نماز کا وقت آئے گا تو اس کے لیے نہ صرف یہ کہ نماز کے فرض ہونے کا علم ہونا چاہیے بلکہ نماز کی ادائیگی بھی ضروری ہوگی پس مامور بہ ایمان میں تمام ایماندار یکساں نہیں ہیں''۔[مجموع الفتاوی ١٣/ ١٥]

اس میں کچھ شک نہیں کہ جس کے دل میں ایسی تصدیق جازم موجود ہو تو کسی قسم کا کوئی شبہ اور شہوت اس پر حملہ آور نہیں ہوسکتا ہو؛ تو اس سے نافرمانی نہیں ہوگی۔ اور اگر انسان کے دل میں کوئی شہوت اور شبہ پیدا نہ ہو؛ یا ان دونوں میں سے کوئی ایک پیدا نہ ہو؛ تو وہ نافرمانی کا کوئی کام نہ کرے۔ لیکن جب اس کے دل پر شہوت یا اشتباہ کا غلبہ ہوگا تو اس وقت وہ معصیت میں گرفتار ہو جائے گا تصدیق اس کے دل سے غائب ہوگی اور وعید ربانی اس کی نظر سے اوجھل ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''زانی زنا کرتے وقت مومن نہیں ہوتا۔''❶

یعنی بوقت زنا اس سے زنا کی حرمت کی تصدیق غائب ہوگی؛ اگرچہ اصل تصدیق دل میں موجود رہے گی؛ اور پھر وہ دوبارہ لوٹ آئے گی۔ چنانچہ کتاب اللہ تعالیٰ میں پرہیزگاروں کا ذکر اس طرح موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

❶ حدیث صحیح ہے۔ متفق علیه۔ حدیث از عبد اللہ بن عمر . البخاری ٢٤٨٥ مسلم ٥٧۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ٥﴾ (الاعراف : ٢٠١)

''بیشک جو لوگ متقی ہیں جب انہیں کوئی شیطان وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو چونک پڑتے ہیں آنکھیں کھول کر دیکھنے لگتے ہیں۔''

حضرت امام لیث رحمہ اللہ (١٣٨ھ) نے مجاہد رحمہ اللہ (٢١-١٠٤ھ) سے اس کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

''اس سے مراد وہ شخص ہے جو گناہ کا خیال کرتا ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کی یاد آتی ہے تو وہ گناہ کو چھوڑ دیتا ہے اصل میں قوت شہویہ اور غضبیہ برائیوں کا منبع ہیں لیکن جب بصیرت حاصل ہو جائے تو وہ گناہ سے رجوع کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ٥﴾ (الاعراف : ٢٠٢)

''اور (ان کفار) کے بھائی انھیں گمراہی میں کھینچے جاتے ہیں پھر وہ کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔''

یعنی وہ شیطانوں کے بھائیوں کو گمراہی میں ڈبوئے رکھتے ہیں۔ اس میں وہ کچھ کمی نہیں کرتے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''نہ انسان نافرمانیوں سے باز رہتے ہیں اور نہ ہی شیاطین انھیں باز رہنے دیتے ہیں؛ [وہ ان کے ساتھ چپکے رہتے ہیں] تو جب بصیرت کام نہ آئے تو دل اندھے پن کا شکار ہو جاتا ہے؛ اور شیطان مزید گمراہی کی طرف کھینچتا ہے۔ اگرچہ دل میں اصل تصدیق موجود ہوتی ہے؛ اسے جھٹلایا نہیں ہوتا؛ لیکن روشنی، بصیرت، خشیت اور خوف دل سے نکل جاتا ہے۔ اس کی مثال بالکل اس طرح کی ہے کہ جب انسان اپنی آنکھ کو بند کر لیتا ہے تو اسے کچھ نظر نہیں آتا؛ جب کہ وہ نابینا بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب انسان کے دل پر گناہ کی تاریکی چھا جاتی ہے تو وہ حق کو دیکھ نہیں سکتا اگرچہ اس کا دل کفار کے دلوں کی مانند اندھا نہیں ہوتا۔ یہی مضمون ایک مرفوع حدیث میں اس طرح مذکور ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان اس سے خارج ہو جاتا ہے جب وہ توبہ کرتا ہے تو ایمان واپس آ جاتا ہے۔''❶

❁ حدیث صحیح ہے (ابوداؤد ۴۶۹۰، حاکم ۱/ ۲۲، حاکم ذہبی نے صحیح کہا)۔ (احادیث صحیحة ۵۰۹).

[ایمان میں کمی اور زیادتی کا لفظی اختلاف:]

اور جب اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کے درمیان نزاع/ اختلاف لفظی ہے؛ تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ البتہ اس وجہ سے ایک فریق کا دوسرے فریق پر زیادتی کرنا اور تفرقہ پھیلانا؛ درست نہیں۔ اور نہ ہی مذموم اہل کلام اہل ارجاء/ مرجیۂ اور ان جیسے دیگر فرقوں کی بدعات کا ذریعہ بنے؛ فسق و فجور اور گناہوں کے ظہور کا وسیلہ بنے؛ یوں کہے کہ: میں پکا سچا کامل ایمان والا اور اسلام والا مؤمن؛ اور اولیاء اللہ تعالیٰ میں سے ایک ولی ہوں۔ اور اس سے جتنے بھی گناہ سرزد ہوتے ہوں؛ ان کی کوئی پرواہ نہ کرے۔ جس طرح کہ مرجیۂ کہتے ہیں: ایمان کے ساتھ گناہ کا ارتکاب گنہگار کے لیے ضرر رساں نہیں ہے۔ یہ عقیدہ قطعی طور پر باطل ہے۔ پس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ میں فرق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ایمان کی لغوی حقیقت کے ساتھ ساتھ شارع کے ادلہ کا خیال رکھا ہے جبکہ دیگر ائمہ نے ایمان کی حقیقت میں شارع کے عرف کا خیال رکھا ہے۔ اس لیے کہ شارع نے تصدیق کے ساتھ چند اوصاف اور شرائط کو بھی شامل کیا ہے جیسا کہ نماز، روزہ، حج وغیرہ میں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دلائل:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تلامذہ ہاں ایمان کے تصدیق ہونے کے دلائل: وہ کہتے ہیں: ایمان لغت عرب میں تصدیق کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں: [انہوں نے کہا تھا:]

﴿وَ مَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا﴾ (یوسف: ۱۷)

''اور تو ہماری بات ماننے والا نہیں ہے۔''

یعنی آپ ہماری تصدیق نہیں کریں گے۔ بعض نے اس معنی پر اہل لغت کے اجماع کا دعوی کیا ہے۔ پس یہ لغوی معنی تصدیق بالقلب ہے۔ بندے پر اللہ تعالیٰ کا واجب حق ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ان تمام باتوں میں تصدیق کرے جو آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لے کر آئے ہیں۔ پس جو کوئی آپ ﷺ کی ان تمام باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں؛ وہ عند اللہ تعالیٰ مؤمن ہے۔ اور زبانی اقرار دنیا میں احکام اسلام کے اجراء کے لیے شرط ہے۔ یہ دو میں سے ایک قول ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ نیز اس لیے کہ ایمان کفر کی ضد ہے؛ اور کفر تکذیب اور انکار کا نام ہے۔ ان دونوں کا تعلق بھی دل کے ساتھ ہے۔ تو ان کی ضد کا تعلق بھی دل کے ساتھ ہوگا۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ (النحل: ۱۰۶)

''مگر جو (کفر پر زبردستی) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو۔''

یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ ایمان کا محل دل ہے زبان نہیں۔ نیز اگر ایمان قول اور عمل سے مرکب ہوتا تو جزء کے زوال سے سارا

ایمان ختم جا تا۔ نیز عمل کا عطف ایمان پر ہے؛ عطف مغائرت کا تقاضا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (البقرة: ۲۵)

''جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔''

اس قسم کی آیات قرآن میں کثرت کے ساتھ وارد ہیں۔

ان دلائل پر اعتراضات:

اس استدلال پر کہ ایمان لغت میں تصدیق ہے اور یہ دونوں مترادف ہیں؛ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں مطلق ترادف نہیں۔ تصور کریں؛ یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے؛ تو پھر آپ کیوں کہتے ہیں: اس سے مطلق ترادف واجب ہوتا ہے۔ ایسے ہی اسلام اور ایمان کے معنی میں ترادف/ [مترادف] پر اعتراض کیا گیا ہے۔ ان میں ترادف نہ ہونے پر کی دلیل یہ ہے کہ: جب خبر دیا گیا انسان خبر دینے والے کی تصدیق کرے تو کہا جاتا ہے: "صدَّقه" ''اس کی تصدیق کی''۔ یہ نہیں کہا جاتا: "آمنه" یعنی اس پر ایمان لایا۔ اور نہ ہی "آمن به" کہا جاتا ہے۔ ہاں کہا جاتا ہے "آمن له"؛ قرآن میں ہے:

﴿فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ﴾ (العنکبوت: ۲۶)

''اس کی لوط علیہ السلام نے تصدیق کی۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ﴾ (یونس: ۸۳)

''پس موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق صرف اس کی قوم میں سے چند لڑکوں نے فرعون سے ڈرتے ہوئے کی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (التوبة: ۶۱)

''وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اور مومنوں کی بات کی تصدیق کرتا ہے۔''

لفظ ''ایمان'' کے حرف ''با'' کے ساتھ متعدی ہونے میں اور حرف ''لام'' کے ساتھ متعدی ہونے میں فرق کیا گیا ہے۔ اگر حرف ''با'' کے ساتھ متعدی ہو تو مخبر بہ (خبر دیے گئے) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور حرف ''لام'' کے ساتھ متعدی ہو تو مخبر [خبر دینے والے کے لیے] استعمال ہوتا ہے۔ ایسا وارد نہیں ہوا؛ یعنی یوں کہنا جائز نہیں کہ: ﴿وَ مَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا﴾ ''اور تو ہماری بات ماننے والا نہیں ہے۔'' کہ لفظ تصدیق کا استعمال بھی لام کے ساتھ وارد نہیں ہوا ہے؛ اس لیے کہ یہاں لام کا دخول عامل کی تقویت کے لیے ہے۔ جیسا کہ جب معمول مقدم ہو؛ یا عامل اسم فاعل مقدم ہو؛ یا مصدر رہو۔ یہ بحث اپنی جگہ پر معروف ہے۔

حاصل کلام! [عربی زبان میں] یوں نہیں کہا جا سکتا: "آمَنْتُهُ" اور نہ ہی "صدَّقْتُ له"۔ بلکہ یوں کہا جاتا ہے: "آمنت له" ''میں نے اس کی تصدیق کی'' جیسا کہ کہا جاتا ہے: "اقررت له"۔ پس اقرار کے ساتھ اس کی تفسیر کرنا تصدیق کے ساتھ تفسیر کرنے سے زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ ان دونوں میں بھی فرق ہے۔ اور اس لیے بھی کہ ان کے مابین معنوی فرق ثابت شدہ ہے۔ کیونکہ ہر وہ

انسان جس کو کسی غیب یا مشاہد کی خبر دی جائے؛ اس کے لیے لغت میں صدقت کہا جاتا ہے؛ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے: کذبتَ۔ مثلاً اگر کسی نے کہا: آسمان ہمارے اوپر ہے؛ تو آپ کہہ سکتے ہیں: صدقتَ۔ ''آپ نے سچ کہا''۔ لیکن لفظ ایمان صرف غیب کی خبر کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ پس جو شخص خبر دے: سورج نکل آیا ہے؛ اس کے لیے کہا جائے گا: ''ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس کے لیے یہ نہیں کہا جائے گا: ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اس لیے کہ ایمان کا معنی اصل میں امن ہے اور لفظ الائتمان [ایمان لانا] اس وقت ہوتا ہے جب کسی غائب کے متعلق خبر دی جائے۔ غائب وہ چیز ہے جس کے متعلق بتانے والا امین کہلاتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک اور دیگر کتابوں میں لفظ (اٰمن له) کا صرف اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ ایمان کے بالمقابل کبھی بھی تکذیب کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ جس طرح یہ لفظ تصدیق کے مقابلہ میں آتا ہے۔ ایمان کے بالمقابل کفر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اور لفظ کفر تکذیب کے ساتھ خاص نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر کسی شخص نے کہا: ''میں جانتا ہوں؛ آپ سچے ہیں؛ مگر میں آپ کی اتباع نہیں کروں گا، بلکہ آپ سے دشمنی کروں گا، بغض رکھوں گا؛ اور آپ کی مخالفت کروں گا۔ تو یہ سب سے بڑا کفر ہوگا۔ پس معلوم ہوا ایمان صرف تصدیق کا نام نہیں۔ اور نہ ہی کفر صرف تکذیب کا نام ہے۔ بلکہ جب کفر ہوگا؛ تو تکذیب بھی ہوگی۔ لیکن مخالفت اور دشمنی تو بغیر تکذیب کے بھی ہوتی ہے۔ یہی حال ایمان کا ہے۔ ایمان تصدیق، موافقت، فرمانبرداری کا نام ہے صرف تصدیق کافی نہیں ہوتی۔ پس اس لحاظ سے اسلام ایمان کے مسمیٰ کا ایک جزء ہے۔ اور اگر مترادف ہونے کو تسلیم کر بھی لیا جائے؛ تو تصدیق کا تعلق افعال کے ساتھ ہوگا۔ جیسا کہ صحیح روایت میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''دونوں آنکھیں زنا کرتی ہیں ان کا زنا دیکھنا ہے۔ کان زنا کرتے ہیں ان کا زنا سننا ہے۔...... پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

''شرمگاہ ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔'' ❶

❶ بخاری ٦٢٤٣، مسلم ٢٦٥٧./ وتقدم۔

حسن بصری رحمہ اللہ [۲۱=۱۱۰ھ] فرماتے ہیں: ''ایمان ظاہری زیب و زینت اور آرزوؤں کا نام نہیں؛ بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں جا گزیں ہو اور اعمال سے اس کی تصدیق ہوتی ہو''۔

الایمان لابن أبی شیبه ص ٩٣؛ إقتضاء العلم و العمل ص ٥٦؛ ضعفه الألبانی :کتاب الإیمان لشیخ الإسلام ابن تیمیة رحمه الله۔ ٢٣٠؛ السلسلة الضعیفة ١٠٩٥۔

اگر ایمان تصدیق ہے؛ تو پھر بھی وہ مخصوص تصدیق ہے؛ جیسا کہ نماز میں اور دیگر احکام میں موجود ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ یہ نہ لفظ کو اس کے معنی سے پھیرنا ہے اور نہ اس میں تبدیلی لانا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں مطلق ایمان کا حکم نہیں دیا؛ بلکہ خاص ایمان کا حکم دیا ہے۔ پھر اس کی مواصفات بتائی ہیں؛ اور اسے واضح کیا ہے۔ پس وہ تصدیق جو ایمان کہلاتی ہے؛ اس کا ادنیٰ حال یہ ہو سکتا ہے کہ وہ عام تصدیق کی ایک قسم ہو۔ تو پھر اس کے ساتھ عموم و خصوص میں مطابقت نہیں ہوگی؛ جب تک زبان اور دل کی تبدیلی نہ ہو۔ بلکہ شارع کے کلام میں ایمان عام اور خاص سے مرکب ہوگا۔ جس طرح انسان حیوان ناطق کے ہونے کے ساتھ موصوف ہے۔ نیز اس لیے کہ مکمل تصدیق جو دل کے ساتھ قائم ہوتی ہے؛ وہ دل اور اعضاء کے واجب اعمال کو بھی مستلزم ہوتی ہے۔ بے شک یہ چیز مکمل ایمان کے لوازمات میں سے ہے۔ اور لازم کی نفی ملزوم کی نفی پر دلالت کرتی ہے۔ ہم کہتے ہیں: بے شک یہ لوازم کبھی لفظ کے مسمیٰ میں داخل

ہوتے ہیں اور کبھی اس سے خارج ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ لفظ لغت میں اپنے معنی پر قائم ہے؛ لیکن شارع نے اس میں چند احکام کا اضافہ کر دیا ہے۔ یا ہوسکتا ہے کہ شارع نے اس کو مجازی معنی میں استعمال کیا ہو۔ پس وہ حقیقت شرعی اور مجاز لغوی ہو۔ یا شارع نے اس کو اصل سے نقل کر دیا ہے۔ ❶ اس مسلک کے علماء کے یہ اقوال ہیں۔

❶ تفصیل کے لیے: مجموع الفتاویٰ کتاب الایمان (۷/ ۲۹۔۲۹۶) کا مطالعہ کریں۔

اعمال کے مسمیٰ ایمان میں داخل ہونے پر سنت سے دلائل:

ائمہ کرام کہتے ہیں: رسول اکرم ﷺ نے ہمیں ایمان کے معانی سے آگاہ فرمایا ہے۔ اور ہم نے آپ کی مراد کا علم ضروری حاصل کرلیا ہے۔ بے شک جس کے متعلق کہا جائے: اس نے تصدیق کی ہے؛ مگر وہ زبان سے ایمان کا اقرار نہ کرتا ہو؛ حالانکہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ نہ ہی وہ نماز پڑھتا ہے؛ اور نہ ہی روزہ رکھتا ہے۔ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے؛ اور نہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے بلکہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ بغض وعداوت رکھتا ہے؛ آپ سے دشمنی رکھتا ہے؛ اور لڑائی کرتا ہے؛ تو بے شک وہ انسان مومن نہیں۔ جیسا کہ ہم جان چکے ہیں کہ کامیابی اور نجات شہادتین کے اقرار اور اس کے مقتضی کے مطابق عمل اور اخلاص پر مرتب ہوتی ہے۔ بے شک نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''ایمان کی کچھ اور ستر سے زیادہ شاخیں ہیں؛ اعلیٰ ترین شاخ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرنا ہے اور ادنیٰ شاخ راہ سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنا ہے''۔ ❶

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''حیاء ایمان کی شاخ ہے''۔ ❷

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''کامل ایماندار وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق بہتر ہیں''۔ ❸

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''لباس میں تواضع ایمان ہے''۔ ❹

پس جب ایمان اصل [بنیادی عنصر] ہے؛ تو اس کی متعدد شاخیں ہیں؛ اور ان میں سے ہر شاخ کو ایمان کا ہی نام دیا جاتا ہے۔ پس نماز بھی ایمان میں سے ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ، روزہ، حج۔ اور باطنی اعمال جیسے حیاء، توکل، خشیت الٰہی؛ انابت الی اللہ ؛ حتی کہ ان شاخوں کی انتہاء راہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانے پر ہوتی ہے۔ بے شک یہ بھی ایمان کی شاخ ہے۔ یہ تمام ایمان کی شاخیں ہیں۔ لیکن بعض شاخوں کے زوال سے بالا جماع ایمان ختم ہو جاتا ہے؛ جیسے شہادتین کا اقرار۔ اور ان میں سے بعض شاخوں کے زوال سے بالا جماع ایمان زائل نہیں ہوتا؛ جیسے راہ سے تکلیف دہ چیز کو نہ اٹھانا۔ ان دونوں کے درمیان بہت سی شاخیں ہیں جن میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ شاخیں تو شہادتین کی شاخ کے قریب ہیں اور کچھ شاخیں راہ سے تکلیف دہ چیز کو اٹھانے والی شاخ کے قریب ہیں۔

❶ حدیث صحیح ہے۔ متفق علیہ۔ حدیث ابی هريرة۔ الاحاديث الصحيحة (۱۷۶۹) مسلم ۳۵ البخاری ۹ . باختلاف يسير .

❷ متفق عليه۔ یہ اس سے پہلی حدیث کا ٹکڑا ہے۔

❸ حدیث صحیح ہے۔ ابوداؤد ۲۶۸۲، ابن حبان ۴۷۹، مستدرك حاكم ۱/ ۳، مسند احمد ۲/ ۲۵۰ .

❹ حدیث حسن ہے۔ ابـوداؤد ۴۱۶۱، ابن ماجه ۴۱۱۸، مستدرك حاكم، احمد زهد ۷، طبرانی ۷۹۰، الاحاديث

الصحيحة (١٣٤١).

پس جس طرح ایمان کی شاخوں کو ایمان کہا جاتا ہے اسی طرح کفر کی شاخوں کو کفر کہا جاتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے کرنا ایمان کی شاخ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کرنا کفر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تم میں جو شخص کسی برائی کو دیکھے؛ تو اسے چاہیے کہ وہ اس کو ہاتھ کے ساتھ بدلنے دے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان کے ساتھ، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل کے ساتھ؛ اور یہ کمزور ایمان ہے''۔ ❶

ایک روایت میں ہے: ''اس کے بعد تو اس میں رائی کے دانے برابر بھی ایمان نہیں''۔ [رواہ مسلم ۵۰]

ترمذی میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرے اللہ تعالیٰ کے لیے بغض رکھے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے عطیہ کرے اللہ تعالیٰ کے لیے روک لے؛ تو یقیناً اس کا ایمان مکمل ہو گیا ہے''۔ ❷

❶ حدیث صحیح ہے۔ مسلم، تخريج مشكاة الفقر (٦٦)۔ صحيح ابوداؤد (١٠٣٤).
❷ حدیث صحیح ہے۔ تخريج المشكوٰة ٢٠-٢١، الاحاديث الصحيحة (٣٨٠). ترمذی ٢٦٥٥ أبو داؤد ٤٦٨١.

اس کا مطلب یہ ہے - واللہ تعالیٰ اعلم - کہ محبت اور بغض دراصل دل کی حرکت ہے۔ نیز مال خرچ کرنا اور مال کو روکنا ایمان کے کمال کی علامت ہے۔ بے شک مال نفس سے متعلق آخری چیز ہے۔ بدن دل اور مال کے درمیان میں ہے۔ پس جس کا اول و آخر سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہو گیا؛ تو ہر چیز میں اس کا معبود اللہ تعالیٰ ہی ہوا۔ اس میں شرک کی کوئی چیز نہ رہی۔ جیسے: غیر اللہ کا ارادہ؛ اس کا قصد اور اس سے امید رکھنا۔ تو یہ شخص کامل ایمان والا ہو گیا۔ اس مضمون کی دیگر احادیث بھی ہیں جو عمل کے لحاظ سے ایمان کی قوت یا کمزوری پر دلالت کرتی ہیں۔

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کے کلام ذکرِ شان صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس پیرائے میں آگے آئے گا: ''حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت رکھنا عین دین اور ایمان بلکہ احسان ہے اور ان سے دشمنی کفر، نفاق اور گمراہی ہے''۔

یہاں پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت کو ایمان اور ان سے بغض کو کفر کا نام دیا ہے۔

ابو المعین نسفی رحمۃ اللہ علیہ [نے اپنی کتاب تبصرہ ۸۰۳ میں] اور دیگر حضرات نے اس مذکورہ حدیث ''شعب الایمان'' سے استدلال کا جواب دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: راوی نے کہا ہے: ''ساٹھ سے زیادہ؛ یا ستر سے زیادہ''؛ راوی خود اپنی غفلت کی گواہی دے رہا ہے؛ کہ وہ شک میں مبتلا ہے؛ اور کہتا ہے: ''ساٹھ سے زیادہ؛ یا ستر سے زیادہ''۔ رسول اللہ ﷺ سے [ایسے امور میں] شک کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ اور بے شک یہ حدیث کتاب اللہ کے مخالف ہے۔

پس انہوں نے روایت پر راوی کی غفلت کی اور اس [روایت] کے کتاب اللہ کے مخالف ہونے کا طعن کیا ہے۔ آپ اس طعن پر غور کریں؛ یہ کتنا ہی عجیب طعن ہے؟۔ اس لیے کہ راوی کے ''ساٹھ سے زیادہ؛ یا ستر سے زیادہ'' کے عدد میں تردد سے اس کا عدم ضبط لازم نہیں آتا۔ جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس روایت کو بغیر شک کے؛ دوٹوک الفاظ میں ''ساٹھ سے زیادہ'' کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ❶

اور رہی بات کتاب اللہ کی مخالفت کی؛ تو کتاب اللہ میں کون سی آیت اس کے خلاف ہے۔ بلکہ کتاب اللہ کی آیات میں اس کی موافقت

پائی جاتی ہے۔ بے شک یہ اعتراض تو تعصب اور تقلید کی نحوست کا ثمرہ ہے۔

✪ حدیث صحیح ہے۔مسلم ٤٠٦ بلفظ بضع وسبعون ، حدیث ابی هریرۃ۔ الاحادیث الصحیحة (١٧٦٩).

مزید کہتے ہیں: یہاں پر ایک اور اصول بھی ہے؛ وہ یہ کہ قول کی دو قسمیں ہیں: دل کا قول؛ یہ اعتقاد ہے۔ اور زبان کا قول۔ یہ کلمہء اسلام کا اقرار کرنا ہے۔ اسی طرح عمل کی بھی دو قسمیں ہیں: ا۔ دل کا عمل، نیت اور اخلاص ہے۔۲۔ اور اعضاء کا عمل۔ جب یہ چاروں ختم ہوجائیں تو ایمان بھی مکمل طور پر ختم ہوجاتا ہے۔ اور جب دل سے تصدیق ختم ہوجائے تو باقی تینوں اجزاء کچھ بھی فائدہ نہیں دیتے۔ بے شک ان [اعمال] کے معتبر اور فائدہ مند ہونے کے لیے دل سے تصدیق شرط ہے۔ البتہ جب یہ تینوں [اجزاء] ختم ہوجائیں؛ لیکن دل میں تصدیق باقی ہو؛ تو یہ [اختلاف] مقام؛ مقام معرکہ ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ جوارح کی عدم اطاعت سے دل کی عدم اطاعت لازم آتی ہے۔ اس لیے کہ اگر دل اطاعت کرتا اور سر تسلیم خم کر لیتا؛ تو اعضاء بھی مطیع ہوجاتے اور سر تسلیم خم کر لیتے۔ پس دل کی عدم اطاعت وفرمانبرداری سے تصدیق کا نہ ہونا لازم آتا ہے؛ جو کہ اطاعت کو مستلزم ہے''۔ [الصلاۃ ۵۴]۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''بے شک جسم میں ایک ٹکڑا ہے؛ جب وہ درست ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے تمام جسم درست رہتا ہے؛ اور جب وہ فاسد ہوجاتا ہے تو اس کی وجہ سے تمام جسم فاسد ہوجاتا ہے۔ آگاہ رہو وہ ٹکڑا دل ہے۔'' ❶

✪ بخاری ٥٢ مسلم ١٥٩٩ ؛ عن النعمان بن بشیر۔ غایة المرام فی تخریج الحلال والحرام (رقم ٢٠).

بس جس کا دل درست ہوگیا؛ تو اس کا جسم بھی قطعی طور پر درست رہتا ہے۔ لیکن اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

البتہ یہ کہنا کہ: جزء [ایک حصہ] کے ختم ہونے سے کل [تمام] کا ختم ہونا لازم آتا ہے۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہیئت اجتماعی باقی نہیں رہتی؛ جیسے تھی؛ تو یہ بات مسلّم ہے۔ لیکن بعض اجزاء کے ختم ہونے سے تمام اجزاء کا ختم ہونا لازم نہیں آتا۔ اس صورت میں اس سے کمال کو زوال ہوجائے گا۔

ایمان کی کمی بیشی پر کتاب وسنت کے دلائل:

کتاب اللہ تعالیٰ؛ سنت رسول اللہ ﷺ اور سلف صالحین رحمہم اللہ کے آثار سے اس پر کثرت کے ساتھ دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان دلائل میں سے: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ (الانفال: ٢)

''اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى﴾ (مریم: ٧٦)

''اور اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں کو مزید ہدایت دیتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِيْمَانًا﴾ (المدثر: ۳۱)

''اور ایمانداروں کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ﴾ (الفتح: ٤)

''وہی تو ہے جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی نازل فرمائی تاکہ ان کے ایمان کے ساتھ اور ایمان بڑھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ (آل عمران: ۱۷۳)

''ان سے لوگوں نے کہا: لوگ تمھارے مقابلے کے لیے جمع ہو گئے ہیں؛ تو ان سے ڈرو۔ تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے ہم کو اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔''

مذکورہ آیت اور اس سے پہلی آیت کی تفسیر میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ: یہاں پر زیادہ سے مراد ایمان والوں کا زیادہ ہونا ہے۔ نیز لوگوں کے یہ کہنے میں کہ: ﴿قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ﴾ ''لوگ تمھارے مقابلے کے لیے جمع ہو گئے ہیں؛ تو ان سے ڈرو۔'' یہ زیادہ ہونا مشروع ہے؟۔ اور کیا مؤمنین کے دلوں پر سکون کے اتارنے میں زیادتی مشروع ہے؟۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے دلوں پر اس وقت سکون نازل فرمایا جب وہ حدیبیہ سے واپس آ رہے تھے تاکہ ان کے یقین واطمینان میں اضافہ ہو۔ اس کی تاکید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہو رہی ہے:

﴿لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ للإيمانِ﴾ (آل عمران: ۱٦٧)

''وہ اس دن ایمان سے زیادہ کفر کے قریب تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝﴾
(التوبہ: ۱۲٤، ۱۲٥)

''اور جب کوئی سورت نازل ہوئی تو بعض منافق (استہزاء کرتے اور) پوچھتے کہ اس سورت نے تم میں سے کس کا ایمان زیادہ کیا ہے؟ سو جو ایمان والے ہیں ان کا تو ایمان زیادہ کیا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں مرض ہے ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا اور وہ مرے بھی تو کفر پر۔''

اور جو کچھ اس آیت کی تفسیر میں فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر [۸۳/۲ میں] روایت کیا ہے؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے محمد بن الفضل اور ابو القاسم سابا ذی رحمہ اللہ نے بیان کیا؛ وہ دونوں کہتے ہیں: ہم سے فارس بن مردویہ نے حدیث بیان کی؛ وہ کہتے ہیں: ہم سے محمد بن فضل العابد نے؛ اور ان سے یحی بن عیسی نے؛ ان سے ابو مطیع [۱۱۵-۱۷۷ھ] نے؛ ان سے حماد بن سلمہ نے حدیث بیان کی؛

وہ ابن المہز م سے روایت کرتے ہیں؛ وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں؛ فرمایا:

''بنوثقیف قبیلہ کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا؛ انھوں نے دریافت کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفی میں جواب دیا اور فرمایا:

''ایمان دل میں مکمل ہے اس میں زیادتی کفر اور کمی شرک ہے''۔ ❶

اس حدیث کے بارے میں ہمارے استاذ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ [۷۰۱-۷۷۴ھ] سے دریافت کیا گیا؛ تو آپ نے فرمایا:

''اس کی سند میں ابواللیث سے ابومطیع راوی تک مجہول راوی ہیں۔ تاریخ کی مشہور کتابوں میں ان کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ جبکہ ابومطیع اس کا نام: حکم بن عبداللہ تعالیٰ بن مسلمہ بلخی ہے؛ اس کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے؛ اور یحی بن معین؛ اور عمرو بن علی الفلاس، اور امام بخاری، امام ابوداؤد؛ امام نسائی؛ امام ابوحاتم رازی، امام ابوحاتم محمد بن حبان بستی، امام عقیلی، اور ابن عدی، اور دارقطنی وغیرہ نے ضعیف کہا ہے ❷۔ نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والا ابوالمہزم نے کاتب کی تحریر میں تصحیف [تبدیلی] کی ہے۔ اس کا نام یزید بن سفیان ہے اس کو اکثر ائمہ نے ضعیف کہا ہے۔ شعبہ بن حجاج نے متروک قرار دیا ہے۔ امام نسائی فرماتے ہیں: متروک ہے۔ امام شعبہ نے اس پر احادیث گھڑنے کا الزام لگایا ہے۔ اور کہا ہے: اگر لوگ اس کو دو پیسے دے دیں؛ تو یہ لوگوں کو ستر حدیثیں بیان کر دے'' ❸۔

❶ حدیث موضوع ہے ابوالمہزم کو شعبہ نے متہم کہا۔ یعنی جھوٹا کہا ہے۔ جیسا کہ شارح نے ذکر کیا ہے۔ اور ابومطیع کو ابوجوزقانی نے اور حافظ ذہبی رحمہما اللہ نے اللسان میں جھوٹا کہا ہے۔ اور ابن حبان رحمہ اللہ نے بھی ایسا ہی کچھ کہا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

❷ المجروحين والضعفاء ١/ ٢٥٠؛۔ یہ مرجئہ فرقہ کا سرغنہ تھا؛ جو کہ سنت اور اہل سنت سے بغض رکھتے ہیں۔

❸ الضعفاء والمجروحين لابن حبان (١/ ٢٥٠).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں عورتوں کو [ناقصات العقل والدین] کم عقل اور کمزور دین والیاں کہا ہے۔

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اس کی اولاد، والد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں''۔ ❶

اس سے مراد کمال ایمان کی نفی ہے مطلق ایمان کی نفی نہیں ہے۔ اس مضمون کی حدیثیں کثرت کے ساتھ مروی ہیں۔

❶ بخاری ١٥، مسلم ٤٤، حديث انس بن مالك. ۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

اور حدیث شعب الایمان؛ حدیث شفاعت؛ اور یہ وضاحت کہ دوزخ سے وہ لوگ نکالے جائیں گے جن کے دل میں ادنیٰ ادنیٰ ادنیٰ ذرہ کے برابر ایمان ہوگا۔ پھر اس کے بعد کیسے کہا جاسکتا ہے کہ آسمان اور زمین والوں کا ایمان برابر ہے؟۔ اور ان میں تفاضل ایمان کے علاوہ دیگر اسباب کی بنا پر ہے؟۔

[ایمان کے گھٹنے اور بڑھنے میں صحابہ کے اقوال:]

ان معانی میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کثرت کے ساتھ ہیں۔ مثلاً:

1۔حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ [۳۲ھ] کا فرمان ہے: ''انسان کی فقاہت یہ ہے کہ اپنے ایمان کا اور اس میں کمی آنے کا خیال رکھے؛ اور یہ بھی انسان کی فقاہت ہے وہ جانچ پڑتال کرتا رہے کہ اس کا ایمان گھٹ رہا ہے یا بڑھ رہا ہے''۔

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے رفقاء سے کہا کرتے: ''آیئے ہم ایمان میں اضافہ کریں''۔اور وہ ذکر اذکار میں لگ جاتے''۔

ضعيف ؛ ابن أبى شيبة فى الإيمان ۱۰۸۔

۳۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ دعا کرتے ہوئے فرماتے: ''یا اللہ! ہمارے ایمان ویقین اور فقاہت میں اضافہ فرما''۔

الطبرى ۸۵٤۹۔

۴۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کسی بھی آدمی سے فرماتے: ''ہمارے ساتھ ایک گھڑی بیٹھو؛ ہم ایمان کی باتیں کریں'' ❶۔

ابن أبي شيبة فى كتاب الإيمان ۱۰۵؛ ۱۰۷ ۔ كتاب الإيمان أز أبو عبيد ۲۰؛ بسند صحيح ۔ وعلق عليه البخارى۔

۵۔ اسی مضمون کا قول عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

ابن أبى شيبة فى الإيمان ۱۱۶۔ضعيف۔

۶۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے؛ آپ نے فرمایا: ''جس شخص میں تین چیزیں ہوں؛ اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا: ۱۔اپنے آپ سے انصاف ۔۲۔تنگی کے وقت خرچ کرنا ۔۳۔اور عالم کو سلام کرنا''۔ ❷

❷۔ابن أبی شيبة فی كتاب الإيمان ۱۳۱؛ آپ سے صحیح سند کے ساتھ موقوف روایت ہی مروی ہے۔امام بخاری/کتاب الایمان ص ۲۸: معلقاً؛ بعض حضرات نے اسے مرفوعاً بھی روایت کیا ہے جو کہ غلطی ہے؛ جیسا کہ امام ابوزرعہ رازی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری ۱/۹۰ پر ذکر کیا ہے؛ اور کہا ہے: ''ایسی بات ذاتی رائے سے نہیں کہی جاسکتی؛ یہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہے''۔الکلم الطیب؛ تحقیق الالبانی ۱۹۶۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کا ذکر اپنی ''الصحیح'' میں کیا ہے۔اتنا بیان کافی ہے (وباللہ التوفیق)۔

ایمان اور عمل میں فرق:

لیکن یہ کہنا کہ اعمال کا ایمان پر عطف مغائرت/فرق کا تقاضا کرتا ہے؛ لہٰذا اعمال ایمان کے مسمیٰ میں داخل نہیں ہو سکتے: بلا شک وشبہ کبھی ایمان کا ذکر مطلق طور پر عمل اور اسلام کے ذکر کے بغیر ہوتا ہے۔اور کبھی اعمال صالحہ کے ساتھ اس کا ذکر ہوتا ہے۔اور کبھی اسے اسلام کے ساتھ ملا کر ذکر کیا جاتا ہے۔مطلق ایمان اعمال کو مستلزم ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ (الانفال : ۲)

''مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا﴾ (الحجرات : ۱۵)

''بے شک مومن تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے پھر شک میں نہ پڑے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ أَوْلِيَاءَ﴾ (المائدہ : ۸۱)

''اگر وہ اللہ تعالیٰ پر اور پیغمبر پر اور جو کتاب ان پر نازل ہوئی تھی اس پر یقین رکھتے تو ان کو دوست نہ بناتے۔''

ارشاد نبوی ﷺ ہے:((لا یزنی الزانی حین یزنی وهو مؤمن)).

''زانی زنا نہیں کرتا؛ جب وہ زنا کرتے اور وہ ایمان ہو۔'' ❶

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:((لَا تؤمِنُوا حَتّٰی تَحَابُوا .))

''تم مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم آپس میں محبت نہ کرو''۔ ❷

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:((مَنْ غَشَّنَا فَلَیْسَ مِنَّا .))

''جو شخص ہمیں دھوکہ دے؛ وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔ ❸

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:((مَنْ حَمَلَ عَلَیْنَا السِّلَاحَ فَلَیْسَ مِنَّا .))

''جس شخص نے ہم پر ہتھیار اٹھایا وہ ہم سے نہیں ہے''۔ ❹

اس شخص کا قول راہ صواب سے کتنا ہی بعید ہے جو کہتا ہے: ''ہم سے نہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے جیسا نہیں۔ کاش مجھے کوئی بتائے کہ جو دھوکہ بازی نہ کرے؛ کیا وہ کیسے نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسا ہے''؟۔

❶ حدیث صحیح ہے۔ متفق علیه۔البخاری ۲٤۷٥ مسلم ٥۷ حدیث ابی هریرة۔ ابن ابی شیبة (رقم ۳۸، ٤۱، ۷۸۳).

❷ حدیث صحیح ہے۔ مسلم ۵۷، ابوعوانہ، ترمذی نے صحیح کہا ہے۔ الارواء الغلیل (۷۷۷).

❸ حدیث صحیح ہے۔ مسلم، ابوعوانہ، ترمذی اور حاکم نے اسے صحیح کہا۔الارواء الغلیل (۱۳۱۹).

❹ حدیث صحیح ہے۔ متفق علیه . البخاری ٦۸۷ مسلم ۹۸؛ حاکم ۱/ ٦۱۔

جب ایمان پر عمل صالح کا عطف ہو؛ تو جان لیجیے کہ کسی چیز کا دوسری چیز پر عطف اس وقت معطوف اور معطوف علیہ کے مابین مغایرت کا تقاضا کرتا ہے؛ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں مذکورہ حکم میں مشترک ہوتے ہیں۔ خیال رہے کہ مغائرت کے کچھ مراتب ہیں: کتاب الإیمان لابن تیمیة رحمہ اللہ ۱۷۲۔

[اول:] اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے متبائن/ جدا ہوں۔ اور ان میں سے کوئی ایک بعینہ دوسرا [بالکل اصل] نہ ہو؛ یا اس کا جزء [ایک حصہ] نہ ہو۔ اور نہ ہی ان کے مابین تلازم ہو۔ جیسے فرمان الٰہی ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ﴾ (الانعام: ۱)

''اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو پیدا کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ۝﴾ (آل عمران: ۳)

''اس نے تورات اور انجیل کو نازل کیا ہے۔''

اس کا یہی استعمال کثرت سے ہے۔

[دوم]: دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کے مابین تلازم ہو۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝﴾ (البقرة: ٤۲)

''اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور سچی بات کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (المائدۃ: ۹۲)

''اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔''

[سوم]: تیسری صورت یہ ہے کہ بعض کا عطف کل پر ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی﴾ (البقرۃ: ۲۳۸)

'' نمازوں کی حفاظت کرو خصوصاً بیچ کی نماز (یعنی نماز عصر)۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِیْلَ وَ مِیْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ۝﴾(البقرۃ: ۹۸)

''جو شخص اللہ تعالیٰ کا اور اس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہو تو بے شک اللہ تعالیٰ ان کافروں کا دشمن ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ﴾ (الاحزاب: ۷)

''اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا اور آپ سے بھی''۔

اس جیسی صورت میں دو توجیہیں ہیں:

اول: معطوف اول میں داخل ہو؛ تو اس کا ذکر دو دفعہ کیا گیا ہو۔

دوم: اس پر عطف کا تقاضا ہو کہ وہ اس موقع پر پہلے میں داخل نہیں؛ اگر چہ وہ انفرادی طور پر اس میں داخل بھی ہو۔ جیسا کہ فقراء اور مساکین اور ان جیسے دوسرے الفاظ کے متعلق کہا گیا ہے جن کی دلالت حالت انفرادی اور اجتماعی میں متنوع ہوتی ہے''۔

مجموع الفتاوی لشیخ الاسلام ابن تیمیۃ رحمہ اللہ ۱۸/ ۱۶۶۔

چہارم: کسی چیز کا دوسری چیز پر عطف ان دونوں کی مواصفات میں اختلاف کی وجہ سے ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ﴾ (غافر: ۳)

''گناہ معاف کرنے والا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

اشعار میں عطف کی یہ صورت بھی ہے کہ الفاظ مختلف ہیں معنی ایک ہے۔ شاعر کہتا ہے:

((فأَلْفىٰ قَولَهَا كَذِبًا ومَيْناً .))

''اس نے اس کے قول کو جھوٹا پایا۔'' اس شعر میں کذب اور (مین) ہم معنی ہیں۔

کچھ حضرات کا خیال ہے کہ ایسی مثالیں قرآن پاک میں بھی موجود ہیں؛ اسی میں سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا﴾ (المائدۃ: ۴۸)

''تم میں سے ہر ایک کے لیے شریعت اور دین بنایا۔''

اس پر تفصیلی کلام اپنی جگہ پر معروف ہے۔

جب کلام میں عطف کی یہ سب صورتیں مستعمل ہیں تو ہم شارع کا کلام دیکھیں گے کہ اس میں لفظ ایمان کس طرح استعمال ہوا ہے؟ ۔تو ہم دیکھتے ہیں: جب مطلق ایمان کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد وہی معنی لیا جاتا ہے جو لفظ ''البر(نیکی) تقویٰ، دین؛ اور دین اسلام سے مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسباب النزول میں ذکر کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ایمان کے بارے میں دریافت کیا؛ تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ (البقرة: ۱۷۷)

''نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف کرو۔''

محمد بن نصر کہتے ہیں: حدثنا اسحق ابن ابراهيم ؛ حدثنا عبدالله بن يزيد المقرى ؛و الملائی ؛ قالا حدثناالمسعودی عن قاسم :[ان] سے نقل کرتے ہیں کہ: ''ایک شخص حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا؛ اور ان سے ایمان کے بارے میں دریافت کیا؟ ۔انھوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ﴾ ۔اس شخص نے کہا: میں نے آپ سے اس کے متعلق سوال نہیں کیا۔تو آپ نے فرمایا: ''ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا: اس نے آپ سے وہی سوال کیا جو تم نے مجھ سے کیا ہے؛ آپ ﷺ نے اس کے سامنے یہی آیت تلاوت فرمائی جو میں نے تمہارے سامنے پر تلاوت کی ہے۔ [1] اس نے بھی آپ ﷺ سے وہی بات کہی جو تم نے مجھ سے کہی ہے۔تو جب وہ مطمئن نہ ہوا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''مومن وہ شخص ہے کہ جب وہ نیک عمل کرتا ہے تو اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے؛ اور وہ ثواب کی امید رکھتا ہے۔ اور جب برائی کرتا ہے تو اس کو غم لاحق ہوتا ہے اور عذاب کا خوف محسوس کرتا رہتا ہے''۔ [2]

[1] تفصیل کے کتاب الایمان (ص۱۷۲) کا مطالعہ کریں۔

[2] اس سیاق اور سند کے ساتھ ضعیف ہے علت انقطاع اور مسعودی کا اختلاف ہے البتہ ابوامامہ سے مروی حدیث صحیح ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک انسان نے دریافت کیا: یارسول اللہ ﷺ! ایمان کیا ہے؟، آپ نے فرمایا: جب تجھے نیک کام کرنے سے خوشی حاصل ہو اور برائی بری معلوم ہو تو تو ایماندار ہے''۔اس نے دریافت کیا: یارسول اللہ ﷺ! گناہ کیا ہے، آپ نے فرمایا: ''جب تیرے دل میں کسی کام سے کھٹکا ہو تو اس کام کو ترک کر دے''۔ حاکم (۱/۱۴) نے روایت کیا ہے؛ اور کہا ہے: ''یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے''۔ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی موافقت کی ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ صرف مسلم کی شرط پر ہے اس لیے کہ ممطور راوی سے بخاری نے اپنی صحیح میں روایت نہیں کیا۔(احادیث صحیحہ ۵۵۰)

سلف صالحین رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے یہی جواب دیا ہے۔

وفد عبدالقیس والی حدیث میں ہے: آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

''میں تمھیں صرف ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہوں۔کیا تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا کیا ہے؟ اس بات کی گواہی دینا کہ: ''اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور نماز قائم کرنا؛ اور زکوٰۃ ادا کرنا اور یہ کہ تم مال غنیمت سے پانچواں حصہ [خمس] ادا کرو''۔ [1]

[1] بخاری ۵۳ ، مسلم ۱۷ عن ابن عباس .

یہ تو بات تو معلوم ہی ہے کہ آپ کی مراد ہرگز یہ نہیں کہ دل سے پختہ ایمان لائے بغیر یہ اعمال اللہ تعالیٰ پر ایمان ہو سکتے ہیں۔اس لیے کہ اس سے پہلے کئی مواقع خبر دے چکے ہیں کہ دل سے ایمان لانا ضروری ہے۔تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ امور دل سے ایمان کے ساتھ مل کر ہی [کامل] ایمان بنتے ہیں۔اور اس سے بڑھ کر کیا کوئی اور دلیل پیش کی جا سکتی ہے جس سے معلوم ہو کہ اعمال ایمان مسمیٰ میں داخل ہیں؟۔بلاشک وہ شبہ آپ نے ایمان کی تفسیر اعمال کے ساتھ فرمائی ہے؛ یہاں پر تصدیق کا یہاں ذکر تک نہیں۔اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ یہ اعمال انکار کے ساتھ [یعنی قلبی ایمان کے بغیر] ہرگز فائدہ مند نہیں ہو سکتے''۔

[دین میں ایمان؛ اسلام اور احسان کی تنظیم]:

مسند أحمد [۱۲۳۶۶] میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اسلام ظاہری [اعلانیہ] چیز ہے جبکہ ایمان کا متعلق دل ہے''۔ ❶

☼ اس کی سند ضعیف ہے۔اس میں علی بن مسعدہ ہے جس کے بارے میں عقیلی نے ضعفاء میں بیان کیا کہ بخاری نے کہا اس میں نظر ہے۔عبدالحق ازدی نے الاحکام الکبریٰ (ق ۲/۳) میں کہا حدیث غیر محفوظ ہے۔[ذكره الهيثمي في مجمع الزوائد ۱/ ۵۲؛ و نسبه لأحمد و أبي يعلى ؛ و البزار و إسناده ثقات]

اس حدیث میں اسلام اور ایمان میں مغائرت [علیحدگی] کی دلیل ہے۔اس کی تائید حدیث جبرئیل علیہ السلام سے بھی ہو رہی ہے۔جس میں ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں؛ تمھارے پاس آئے تھا کہ تمھیں تمہارے دین کی تعلیم دے''۔ ❶

☼ مسلم ۸ عن ابن عمر، بخاری ٤٥٦ عن ابی ہریرۃ.

اس حدیث میں دین اسلام، ایمان احسان کو قرار دیا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ ہمارے دین میں تین چیزیں جمع ہوتی ہیں۔دراصل یہ تین مراتب/ درجات ہیں: مسلم، پھر مومن، پھر محسن۔جو چیز ایمان سے مراد تھی؛ وہ اسلام کے ساتھ بالکل ذکر نہیں کی گئی۔جیسا کہ جو چیز احسان سے مراد تھی وہ ایمان اور اسلام کے ساتھ ذکر نہیں کی گئی۔اس لیے نہیں کہ ایمان کے بغیر احسان مکمل ہو جاتا ہے۔یہ تو محال ہے۔یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (الفاطر : ۳۲)

''پھر ہم نے انہیں کتاب کا وارث ٹھہرایا جن کو اپنے بندوں میں سے چن لیا؛ تو ان میں سے کچھ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نیکیوں میں آگے نکل جانے والے ہیں۔''

پس [مقتصد] میانہ رو؛ اور سابق [بالخیرات] دونوں بغیر عقوبت جنت میں داخل ہوں گے۔بخلاف اپنے آپ پر ظلم کرنے والے کے؛ اسے وعید کا سامنا کرنا پڑے گا۔اسی طرح جس کسی نے تصدیق بالقلب کے ساتھ ظاہری اسلام اختیار کیا؛ لیکن باطنی ایمان کے واجب امور کو قائم نہیں کیا؛ اسے بھی وعید کا سامنا کرنا پڑے گا۔احسان اپنی ذات کے لحاظ سے عام ہے؛ اور اہل احسان [محسنین] کے لحاظ سے خاص ہے۔اسی طرح ایمان اپنے اعتبار سے عام اور مومنین کے لحاظ سے اسلام سے خاص ہے۔پس احسان میں ایمان داخل ہے۔اور اسلام ایمان میں داخل ہے۔محسنین [کا مرتبہ] مومنین سے [زیادہ] خاص ہے۔اور مومنین مسلمین سے خاص ہیں۔ان کی

مثال ایسی ہی جیسے رسالت اور نبوت۔ پس نبوت رسالت میں داخل ہے؛ اور رسالت اپنی ذات کے لحاظ سے عام ہے؛ اور مرسلین کے لحاظ سے خاص ہے پس ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن اس کا عکس نہیں ہوتا۔

[اسلام کیا ہے؟]

پس مسمیٰ اسلام کے متعلق لوگ تین گروہوں میں بٹ گئے:

۱۔ ایک گروہ نے کہا اسلام کلمہ کو کہتے ہیں۔

۲۔ دوسرے گروہ نے اسلام کا وہی جواب دیا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اسلام اور ایمان کے متعلق جواب دیا تھا۔ اس طرح کہ آپ ﷺ نے اسلام کی تفسیر ظاہری اعمال سے فرمائی؛ اور ایمان کو اصول خمسہ پر ایمان [پختہ یقین] کو قرار دیا[1]۔

۳۔ تیسرے گروہ نے اسلام کو ایمان کے مترادف قرار دیا ہے۔ اور ارشاد نبوی ہے:

''اسلام اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں؛ اور نماز قائم کرنا''[2] ......'' الحدیث۔

اس حدیث کو شعائر اسلام سے تعبیر کیا ہے؛ لیکن اصل عدم تقدیر ہے۔ حالانکہ ان کا عقیدہ ہے کہ ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے۔ پھر کہا ہے کہ: اسلام اور ایمان ایک ہی چیز کا نام ہے۔ پس اس صورت میں اسلام بھی تصدیق ہی ہوگا۔ حالانکہ یہ بات اہل لغت میں سے کسی ایک نے بھی نہیں کہی۔ بلکہ اسلام تو انقیاد [جھک جانے] اور اطاعت گزاری کو کہتے ہیں۔ یقیناً نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ((اَللّٰهُمَّ لَكَ أَسْلَمْتُ وَبِكَ آمَنْتُ .))

''اے اللہ! میں تیرے لیے فرمانبردار ہو گیا اور تجھ پر ایمان لایا۔''[3]

❀ پس آپ ﷺ اسلام کی تفسیر ظاہری اعمال سے کی ہے۔ اور ایمان سے مراد اصول خمسۃ پر ایمان لانا لیا ہے۔ پس جب ہم ایک جملہ میں اسلام اور ایمان کو جمع کریں تو ہم صرف وہی جواب دے سکتے ہیں جو جواب نبی کریم ﷺ نے دیا ہے۔ اور جب لفظ ایمان منفرد ذکر کیا جائے تو وہ اسلام کو بھی شامل ہوتا ہے۔ اور جب لفظ اسلام منفرد ذکر کیا جائے تو کبھی اسلام کے ساتھ ساتھ بغیر کسی اختلاف کے مؤمن بھی مراد ہوتا ہے؛ اور یہی عقیدہ رکھنا واجب بھی ہے۔ اور کیا ایسا مسلمان ہو سکتا ہے جس کو مؤمن نہ کہا جا سکتا ہو؟۔ اس اختلاف پر کلام گزر چکا ہے۔

اور ایسے ہی کیا: اسلام ایمان کو مستلزم ہے؟۔ اس میں اختلاف مذکور ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ اور دوزخ سے نجات کا وعدہ ایمان کے نام پر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1] مسلم، حدیثِ جبریل علیہ السلام، حدیث صحیح ہے۔

[2] بخاری، مسلم.

[3] متفق علیه: البخاری ۱۱۲؛ مسلم ۷۶۹۔ حدیث ابن عباس۔ نماز نبوی البانی اردو ترجمہ کا مطالعہ کریں۔ (دعا النبی ﷺ فی استفتاح صلوۃ اللیل).

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ٥ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ٥﴾ (یونس: ۶۲-۶۳)

''آگاہ رہو اولیاء اللہ کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے؛ وہ جو ایمان لائے اور وہ ہمیشہ سے تقوی اپناتے رہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ (الحدید: ۲۱)

''اپنے رب کی بخشش اور جنت کی طرف سبقت لے جاؤ؛ وہ جنت جس کا عرض آسمان اور زمین کے عرض کی طرح ہے اور جو ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے ہیں۔''

لیکن قرآن پاک میں صرف اسلام پر جنت کے دخول کو موقوف قرار نہیں دیا؛ لیکن اسلام کو فرض کیا ہے؛ اور یہ خبر دی ہے کہ دین اسلام ہی وہ دین ہے جس کے علاوہ کسی سے بھی دوسرا کوئی دین قبول نہیں ہوگا؛ تمام انبیاء کو دین اسلام دے کر مبعوث کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران: ۸۵)

''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا پس وہ قبول نہ کیا جائے گا۔''

خلاصہ! اسلام ایمان کے ساتھ مل کر استعمال ہو تو اس کا وہ معنی نہیں ہوتا؛ جو ان دونوں الگ الگ استعمال ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ تو اسلام کی مثال ایمان کے ساتھ وہی ہے جو شہادتین کے ایک جزء کی مثال دوسرے جزء کے ساتھ۔ پس رسالت کی گواہی توحید کی گواہی سے علیحدہ چیز ہے۔ اعیان میں یہ دو چیزیں ہیں۔ لیکن یہ معنی اور حکم میں دونوں کے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں؛ گویا کہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ یہی حال اسلام اور ایمان کا ہے۔ جس شخص میں اسلام نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں؛ اور جس میں ایمان نہیں اس کا کوئی اسلام نہیں۔ کیونکہ مومن اس اسلام سے خالی نہیں ہوسکتا جس سے اس کے ایمان کی حقانیت ثابت ہو۔ اور مسلمان اس ایمان سے خالی نہیں ہوسکتا جس کے ساتھ اس کا اسلام درست ہوتا ہو۔ اس کی مثالیں کلام الٰہی، کلام رسول ﷺ اور کلامِ عوام الناس میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ یعنی یہ دونوں الگ الگ اور اکٹھے استعمال ہونے کی مثالیں۔ ان میں سے ایک مثال: کفر اور نفاق [کے کلمات] کی ہے۔ جب آخرت کی وعید میں صرف اکیلے لفظ کفر کا ذکر کیا جائے؛ تو اس میں منافق بھی داخل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (المائدہ: ۵)

''اور جو ایمان کا منکر ہوا اس کے عمل یقیناً ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہوگا۔''

اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

جب ان دونوں [کفر اور نفاق] کو ملایا کر بولا جائے؛ تو کافر وہ ہوگا: جو اپنے کفر کا اظہار کرے؛ اور منافق وہ ہوگا: جو زبان سے ایمان لائے، لیکن دل سے مومن نہ ہو۔ بالکل اسی طرح لفظ بر و تقویٰ؛ اور لفظ اثم وعدوان؛ اور لفظ توبہ و استغفار اور لفظ فقیر و مسکین وغیرہ بھی مستعمل ہیں۔ اسلام اور ایمان میں فرق کی دلیل؛ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا﴾ (الحجرات: ۱۴)......الخ

''دیہاتی کہتے ہیں: ہم ایمان لائے، فرمادیں: تم ایمان نہیں لائے (بلکہ یوں) کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں۔''

اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ: ﴿قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ کا معنی ہے ہم نے اپنے ظاہر کو مطیع بنا دیا؛ جب کہ حقیقت میں وہ منافق تھے۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا ایک قول ہے۔ اس کا ایک دوسرا جواب دیا گیا ہے؛ اور اس کو ترجیح بھی دی گئی ہے کہ ''وہ دراصل کامل ایمان والے مومن نہیں'' یہ مطلب نہیں کہ وہ منافق ہیں۔ جس طرح قاتل، زانی، چور اور خائن سے ایمان کی نفی کی گئی ہے۔ اس کی تائید اس آیت کے سیاق سے بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سورت کے آغاز سے لے کر اس مقام تک معاصی سے منع کرنے اور بعض نافرمانیوں کے احکام کا ذکر ہے، یہاں تک کہیں بھی منافقین کا ذکر نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِنْ تُطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا﴾ (الحجرات: ١٤)

''اور اگر تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال میں سے کچھ کم نہ کرے گا۔''

اگر اس سے مراد منافقین ہوتے؛ تو انھیں اطاعت گزاری کچھ فائدہ نہ دیتی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ (الحجرات: ١٥)

''مومن تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے، پھر شک میں نہ پڑے۔''

- واللہ اعلم - مقصود کامل الایمان مؤمن ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں؛ تم نہیں ہو۔ بلکہ تم سے تو کامل ایمان کی نفی کی گئی ہے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ انھیں حکم ملا تھا؛ یا اجازت ملی تھی کہ یوں کہیں: ''ہم اسلام لائے'' منافق کو یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ اگر وہ منافق ہوتے تو ان سے اسلام کی نفی کی جاتی۔ جیسا کہ ان سے ایمان کی نفی کی ہے۔ اور انھیں اپنے اسلام کا احسان جتانے سے منع کیا ہے۔ پس ان کے لیے اسلام کو ثابت رکھا ہے۔ لیکن اپنے رسول ﷺ پر اس کا احسان جتانے سے منع کر دیا ہے۔ اگر ان کا اسلام درست نہ ہوتا تو کہہ دیا جاتا: تم مسلمان نہیں ہو۔ بلکہ تم جھوٹے ہو۔ جیسا کہ منافقین کو ان کے اس قول میں جھوٹا کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ....﴾ (المنافقون: ١)

''ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔'' واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اس وضاحت اور تفصیل کے بعد ترادف کے دعویٰ کی نفی ہو جاتی ہے؛ اور ان لوگوں کی تشنیع کی بھی نفی ہوتی ہے جو اس بات کو لازم قرار دیتے ہیں کہ اگر اسلام اور ظاہری امور کا نام ہوتا؛ تو اس کا تقابل ایمان سے نہ ہوتا۔ اور نہ ہی مخلص کا ایمان مقبول ہوتا۔ جب کہ اس بات کا فاسد ہونا صاف ظاہر ہے۔ بے شک اس سے پہلے شہادتین کے اقرار اور دیگر امور میں ایمان اسلام دونوں کا ہم مثل ہونا ذکر ہو چکا ہے۔ نیز یہ کہ مل کر استعمال ہونے کی حالت وہ نہیں جو الگ الگ استعمال ہونے کی حالت ہے۔ کلمۂ شہادت ملاحظہ فرمائیں۔ بے شک رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑائی کروں یہاں تک کہ وہ ''لا إله إلا الله'' کا اقرار کریں''[1]۔

[1] بخاری، مسلم حدیث متواتر ہے۔ (احادیث صحیحہ ۴۰۷)۔ یہ صحابہ کرام کی ایک جماعت سے بھی مروی ہے جیسا کہ علامہ سیوطی نے کہا ہے۔

پس اگر لوگ ''لا الہ الا اللہ'' کا اقرار کر لیں، لیکن رسالت کا انکار کریں تو وہ معصوم الدم نہیں ہیں، بلکہ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ''لا الـه الا الـلـه'' کا اقرار اس کے حق پر قائم رہتے ہوئے کریں۔ اسی طرح جو کوئی کلمہ: ''محمد رسول اللہ ﷺ'' کی گواہی دیتا

ہو؛ وہ اس شہادت پر حق کے ساتھ قائم رہنے والا نہیں ہوسکتا مگر اسی صورت میں جب وہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تمام باتوں کی تصدیق کرے۔ پس جب لا الٰه الا الله' کی گواہی کو محمد رسول الله ' کی گواہی کے ساتھ ملایا جائے تو وہ توحید بھی منتظم ہوتی ہے۔ کلمہ لا الٰـه الا الـلـه' کی گواہی سے مراد توحید کا اثبات؛ اور محمد رسول اللہ کی گواہی سے مراد رسالت کا اثبات ہوتا ہے۔ ایسے ہی اسلام اور ایمان کا معاملہ بھی ہے جب ان میں سے کو باہم ملا کر ذکر کیا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (الاحزاب: ۳۵)

''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں۔''

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے: ((اَللّٰهُمَّ لَكَ أَسْلَمْتُ وَبِكَ آمَنْتُ .))

''اے اللہ! میں تیرے لیے اسلام لایا اور تجھ پر ایمان لایا''۔ ❶

تو ان دونوں میں جو مراد ایک سے ہے وہ دوسرے سے مراد نہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

''اسلام اعلانیہ ہے، اور ایمان تصدیق قلب کا نام ہے''۔ ❷

لیکن جب ان دونوں میں سے کسی ایک کو منفرد ذکر کیا جائے تو وہ دوسرے کے معنی اور حکم کو شامل ہوتا ہے۔ جیسا کہ لفظ فقیر، مسکین اور ان کے ہم مثل الفاظ میں کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فقیر اور مسکین دونوں لفظ جب یکجا ذکر کیے جائیں تو ان کے معانی الگ الگ ہوتے ہیں۔ پس کیا قرآن پاک کی اس آیات میں:

❶ بخاری ۱۱۲۶، مسلم ۷۶۹۔ حدیث ابن عباس.

❷ حدیث ضعیف ہے پہلے بھی گزر چکی ہے۔ اس میں علی بن مسعدۃ ضعیف ہے اور عبدالحق ازدی نے الاحکام الکبریٰ (ق ۲/۳) میں کہا کہ حدیث غیر محفوظ ہے۔ مسند احمد ۱۲۳۶۶۔

﴿فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ﴾ (المائدۃ: ۸۹)

''پس اس کا کفارہ دس مساکین کو کھانا کھلانا ہے۔''

اس سے مراد یہ نہیں کہ جس کے پاس مال کم ہے؛ اسے دیا جائے؛ اور جس کے پاس مال بالکل نہیں؛ اسے نہ دیا جائے۔ یا اس کے برعکس کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ (البقرۃ: ۲۷۱)

''اور اگر اسے پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے۔''

اس سے ان لوگوں کی طعن و تشنیع کا بھی رد ہوتا ہے جو کہتے ہیں: دنیا اور آخرت میں اس انسان کیا حکم ہے جو ایمان تو لے آئے؛ مگر اسلام قبول نہ کرے۔ یا اسلام قبول کرے مگر ایمان نہ لائے؟۔ پس جو کوئی حکم ان میں سے ایک کے لیے ثابت کرتا ہے؛ وہ دوسرے کے لیے ثابت نہیں کرتا؛ اس کے قول کا باطل ہونا صاف ظاہر ہے۔ ان کے اس طعن کے مقابلہ میں کہا جائے گا؛ آپ لوگ کہتے ہیں: مسلمان ہی مؤمن ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ (الاحزاب: ۳۵)

''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں۔''

اس میں ان دونوں کو الگ الگ بتایا گیا ہے۔''

نیز [حدیث میں ہے] ایک صحابی نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی:

''آپ فلاں سے کیوں اعراض فرما رہے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی قسم! میں اس کو مؤمن سمجھتا ہوں''۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا: یا پھر مسلمان''؟ ❶ آپ نے تین بار دہرا کر فرمایا۔

❶ بخاری 27، مسلم 150، من حدیث سعد بن ابی وقاص.

پس آپ ﷺ نے اس کے لیے اسلام کو تو ثابت مانا؛ مگر اس پر اسمِ ایمان کے اطلاق میں توقف فرمایا۔ [اب بھی] جو کوئی کہتا ہے: ''اسلام اور ایمان دونوں برابر ہیں؛ وہ ان نصوص کا مخالف ہے''۔ واجب تو یہ ہے کہ اختلافی امور کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹایا جائے۔ بعض نصوص میں بظاہر اختلاف اور ٹکراؤ نظر آتا ہے؛ مگر الحمد للہ ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ لیکن یہ ساری بات ان کو سمجھنے کی توفیق کی ہے؛ اور توفیق اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے دلیل پیش کرنا کہ:

﴿فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ○ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ○﴾ (الذاریات)

''تو وہاں جتنے مومن تھے ان کو ہم نے نکال لیا اور اس بستی میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔''

یہ آیت ایمان اور اسلام کے مترادف ہونے پر دلالت کرتی ہے؛ تو اس آیت میں [ان کے حق میں] کوئی حجت نہیں۔ اس لیے کہ جس خاندان کو نکالا گیا تھا وہ اسلام، ایمان دونوں اوصاف کے ساتھ متصف تھے۔ ان دونوں اوصاف سے موصوف ہونے کی بنا پر ان کا مترادف ہونا لازم نہیں آتا۔ ظاہر یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ معارضات ثابت نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کلام امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے کسی کا ہے۔ ان میں سے اکثر ایسی گری ہوئی چیزیں ہیں جنہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پسندیدہ نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی امام حماد بن زید رحمہ اللہ [۹۸-۱۷۹ھ] کے ساتھ ایک حکایت نقل کی ہے کہ: جب حماد بن زید نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سامنے یہ حدیث پیش کی: ''کون سا اسلام افضل ہے'' ❶ ۔.....الخ۔

اور ان سے پوچھا: آپ دیکھ نہیں رہے کہ وہ پوچھ رہے ہیں: کون سا اسلام افضل ہے؟؛ اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایمان''۔ اور پھر ہجرت اور جہاد کو ایمان میں سے شمار کیا''۔ تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خاموش ہو گئے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے کچھ اصحاب نے کہا: اے ابوحنیفہ! آپ جواب کیوں نہیں دیتے؟۔ آپ نے فرمایا: ''میں کیا جواب دوں؟ وہ میرے سامنے اس پر رسول اللہ ﷺ کی حدیث پیش کر رہے ہیں''۔

❶ متفق علیہ۔ حدیث ابی موسیٰ اشعری۔ مختصر البخاری (۸، ۹).

[ایمان میں استثناء کا مسئلہ]:

اس مسئلہ میں اختلاف کے ثمرات میں سے ایک: ایمان میں استثناء کا مسئلہ بھی ہے ❶ ۔ یعنی کسی شخص کا یوں کہنا: "أنا مؤمن إن شاء الله" ''اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو میں مؤمن ہوں''۔ اس میں تین اقوال ہیں؛ دو گروہ دو انتہاؤں پر ہیں؛ اور ایک گروہ کا قول متوسط ہے: [اس کی تفصیل یہ ہے:]

❶ ۔شیخ عفیفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں ۴۲۹-۴۶۰؛ اور مجموع الفتاوی ج ۷۔

اول: (ان میں سے کچھ حضرات) یہ جملہ کہنے کو واجب قرار دیتے ہیں۔

دوم: (ان میں سے کچھ حضرات) یہ جملہ کہنے کو حرام قرار دیتے ہیں۔

سوم: (کچھ حضرات) ایک اعتبار سے جائز کہتے ہیں؛ اور ایک اعتبار سے اس سے منع کرتے ہیں۔ یہی صحیح ترین قول ہے۔

جو حضرات اس کے وجوب کے قائل ہیں؛ ان کے ہاں اس کے دو ماخذ ہیں:

پہلا ماخذ: وہ ایمان معتبر ہوگا جس پر انسان کی موت آئے۔ بے شک انسان اللہ تعالیٰ کے ہاں مؤمن یا کافر اس کی وفات کے وقت کے اعتبار سے ہوتا ہے؛ اور اس کا علم پہلے سے اللہ تعالیٰ کو ہے کہ وہ کس حال پر ہوگا۔ اور اس سے پہلے جو گزر گیا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ حضرات کہتے ہیں: جس ایمان کے بعد کفر آ جائے؛ اور وہ انسان حالت کفر میں مر جائے؛ تو یہ ایمان نہیں۔ جیسے وہ نماز جسے پورا کرنے سے قبل ہی نمازی توڑ ڈالے۔ اور اس روزہ کا کچھ اعتبار نہیں جو غروب شمس سے پہلے توڑ دیا۔ بہت سارے کلابیہ اور دیگر فرقوں کا یہی ماخذ ہے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے اس شخص کو محبوب رکھتا ہے جو کافر ہو؛ اور اسے علم ہو کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا۔ پس حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قبل از اسلام بھی ہمیشہ سے محبوب ہی تھے۔ اور ابلیس اور مرتدین ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کو مبغوض [ناپسندیدہ] ہی رہے؛ اگرچہ ابھی تک ان سے کفر سرزد نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ سلف کا قول نہیں۔ اور نہ ان لوگوں کا قول ہے جو ایمان میں استثناء کے جواز کے قائل ہیں۔ بلکہ یہ قول تو فاسد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (آل عمران: ۳۱)

''کہہ دو اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے تو میری تابعداری کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔''

اس آیت میں خبر دی ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ ان سے محبت کریں گے اگر وہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کریں گے۔ پس رسول اللہ ﷺ کی اتباع محبت کی شرط ہے۔ مشروط شرط سے متاخر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دلائل ہیں۔

پھر ایک گروہ نے اس عقیدہ میں غلو اختیار کیا۔ حتی کہ ان میں سے کوئی ایک نیک اعمال میں بھی استثناء کرتا؛ اور یوں کہتا: ان شاء اللہ میں نے نماز ادا کی ہے۔ اور اس طرح دیگر اعمال میں بھی کہا جاتا۔ اور مراد قبولیت لیتے۔

پھر ان میں سے بہت سارے لوگ ہر کام میں استثناء کرتے [ان شاء اللہ تعالیٰ کہتے]۔ پس ان میں سے کوئی ایک کہتا: ان شاء اللہ یہ کپڑا ہے۔ ان شاء اللہ یہ رسی ہے۔ جب ہم نے ان سے کہا: ان چیزوں میں تو کچھ شک نہیں؟ تو وہ جواب دیتے: '' آپ کی بات صحیح ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ اسے بدلنا چاہے تو وہ اسے تبدیل کر سکتا ہے۔

دوسرا ماخذ: بے شک ایمان مطلق ان تمام افعال کے بجالانے کو شامل ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو حکم دیا ہے۔ اور ان تمام چیزوں کو چھوڑنے کو شامل ہے جن سے منع کیا ہے۔ جب کوئی انسان کہتا ہے: ''میں مؤمن ہوں'' تو وہ اس لحاظ سے اپنے حق میں گواہی دیتا ہے کہ نیکوکار پرہیزگاروں میں سے ہوں۔ جو وہ تمام امور بجالاتے ہیں جن کا حکم دیا گیا ہے؛ اور وہ تمام کام ترک کرتے ہیں جن سے منع کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ اولیاء اللہ مقربین میں سے ہے۔ اس میں اپنے نفس کا تزکیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اگر یہ گواہی درست ہے تو ضروری ہے کہ اپنے لیے جنت کی گواہی بھی دے؛ اگر وہ اسی حال پر فوت ہو جائے۔ یہ ان حضرات کے

اسلاف کی دلیل ہے جواستثناء[ان شاء اللہ] کے جواز کے قائل ہیں۔اگر چہ ایک دوسرے اعتبار سے ان شاء اللہ نہ کہنے کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔جیسا کہ ہم آئندہ اوراق میں اس کا ذکر کریں گے۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جن چیزوں میں کچھ شک وشبہ نہیں ان میں بھی استثناء کو جائز کہتے ہیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ﴾ (الفتح : ۲۷)

''تم ضرور مسجد الحرام میں داخل ہوں گے؛ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا؛ امن کی حالت میں۔''

اور رسول اللہ ﷺ جب قبرستان میں کھڑے تھے؛ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلاحِقُوْنَ))

''اور بے شک اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم تمھارے ساتھ ملنے والے ہیں۔'' ❶

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

''مجھے امید ہے کہ میں تم سب سے زیادہ خوف رکھنے والا ہوں۔'' ❷ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

❶ مسلم ۲٤۹؛ ۹۷٤ ، احکام الجنائز (ص ۱۸۹)۔ حدیث عائشة .

❷ مسلم ۱۱۱۰،۱۱۰۸؛ بخاری ۵۰۶۳۔

رہ گئے وہ حضرات جو استثناء کو حرام کہتے ہیں؛ وہ تمام حضرات جو ایمان کو ایک ہی چیز گردانتے ہیں؛ وہ کہتے ہیں: میں جانتا ہوں کہ مؤمن ہوں؛ جس طرح میں جانتا ہوں کہ میں نے کلمہ شہادت کا اقرار کیا ہے۔میرا یہ کہنا کہ: میں مؤمن ہوں؛ ایسے ہی ہے جیسے میں کہتا ہوں: میں مسلم ہوں۔پس جو کوئی اپنے ایمان میں استثناء کرتا ہے؛ وہ اس بارے میں شک کا شکار ہے۔اور جو لوگ ایمان میں استثناء کو جائز سمجھتے ہیں؛ انہیں یہ شکاکہ (شک کرنے والے) کا نام دیتے ہیں۔اور وہ اس آیت کریمہ کا جواب دیتے ہیں:

﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ﴾ (الفتح : ۲۷)

''تم ضرور مسجد الحرام میں اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا امن والے ہو کر داخل ہو گے۔''

کہتے ہیں: اس استثناء کا تعلق امن اور خوف سے ہے۔جب کہ حرم میں داخل ہونے کے متعلق کچھ شک نہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ''ضرور داخل ہوں گے آپ سب؛ یا آپ میں سے کچھ''۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان میں سے بعض لوگ مر جائیں گے۔لیکن یہ دونوں جواب محل نظر ہیں۔یہ حضرات جس چیز سے بھاگے تھے؛ اسی میں گرفتار ہو گئے۔جہاں تک امن اور خوف کی بات ہے؛ تو اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ وہ پر امن داخل ہوں گے؛ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم تھا۔وہاں داخل ہونے میں؛ اور پر امن ہونے میں کچھ شک نہیں۔اور نہ ہی ان تمام؛ یا ان میں سے بعض کے داخل ہونے میں کوئی شک ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ کو یقیناً علم تھا کہ کون داخل ہوگا؛ اس میں بھی کوئی شک نہیں۔پس یہاں پر ان شاء اللہ کا استعمال ان کو داخلہ کا یقین دلانے کے لیے ہے۔جیسے جب کوئی شخص کسی کام کا پختہ عزم کر لیتا ہے؛ کہ وہ اس کو ضرور سرانجام دے گا؛ تو وہ کہتا ہے: اللہ کی قسم! میں ان شاء اللہ فلاں کام ضرور کروں گا۔وہ ان شاء اللہ اس لیے نہیں کہتا کہ اس کو اپنے ارادہ اور عزم میں کچھ شک ہے؛ البتہ اس طرح کی قسم اٹھانے والا اگر اپنی مراد تک نہ پہنچ سکے تو اس کی قسم نہیں ٹوٹتی۔کیونکہ اس نے حصول مراد کا پختہ عزم نہیں کیا۔اس کا ایک اور بھی جواب دیا گیا ہے؛ جس میں کوئی حرج نہیں؛ یہ کہ:''

اللہ تعالیٰ اس انداز میں اس لیے فرمایا ہے کہ ہمارے لیے تعلیم ہو جائے کہ جب ہم مستقبل کے بارے میں کوئی خبر دیں تو اس میں استثناء کیسے کریں [یعنی ان شاء اللہ کیسے کہیں ❶]۔ لیکن نص قرآن سے یہ معنی مراد لینا محل نظر ہے۔ اس لیے کہ جس وجہ سے یہ سیاق کلام لایا گیا ہے؛ اشارۃ النص سے وہی مراد ثابت ہو رہی ہے۔ علامہ زمخشری نے اس کے دیگر دو باطل جواب دیئے ہیں:

اُول: یہ کہ وہ فرشتے نے یہ کہہ دیا ہو؛ اور اسے قرآن میں درج کر دیا گیا ہو۔

دوم: یا رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہو۔ تو اس مسکین کے نزدیک قرآن میں ایسی چیزیں بھی ہوسکتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کا کلام نہ ہوں۔ پس یہ بھی ان لوگوں کے ساتھ وعید میں ہوگا جنھوں نے کلام پاک کے بارے میں کہا:

﴿ إِنْ هٰذَآ إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴾

''بے شک یہ تو صرف انسان کا کلام ہے''۔ نسأل اللہ تعالیٰ العافیة .

❶ تفصیل کے لیے مجموع الفتاوٰی (ص ۴۲۹ ، ۴۶۰) کتاب الایمان (ص ۳۳۶-۳۹۳) کا مطالعہ کریں۔

جو استثناء اور اس کے ترک کو جائز سمجھتے ہیں؛ وہ دلائل کے اعتبار سے زیادہ خوش بخت ہیں۔ بہترین راہ راہِ اعتدال ہے۔ اگر استثناء [ان شاء اللہ] کہنے والے کی استثناء سے مراد اصل ایمان [ایمان کی بنیاد] میں شک کرنا ہے؛ تو اس کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور اگر اس کی مراد ان ایمانداروں کے زمرہ میں شامل کرتا ہے جن کے اوصاف کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ إِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ إِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ० الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ० اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ०﴾ (الانفال: ۲-۴)

''مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اور وہ جو نماز پڑھتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں یہی سچے مومن ہیں اور ان کے لیے رب کے ہاں بڑے درجے اور بخشش اور عزت کی روزی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أُوْلٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ०﴾ (الحجرات: ۱۵)

''مومن تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے، پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے لڑے یہی لوگ (ایمان کے) سچے ہیں۔''

تو اس صورت میں ان شاء اللہ کہنا جائز اور درست ہے۔ اسی طرح جو شخص ان شاء اللہ کہے؛ اور اس کا مقصود انجام سے لاعلمی کا اظہار ہو؛ یا جو کوئی اس معاملہ کو اللہ تعالیٰ کی چاہت کے ساتھ معلق کر رہا ہو؛ اسے اپنے ایمان میں کوئی شک و شبہ نہ ہو؛ تو اس کے لیے ان شاء اللہ کہنا جائز ہے۔ یہ قول دلائل کے اعتبار سے قوی ہے۔

صحیح حدیث پر عمل ایمان وعمل کا وجوب

٦٣۔((وَجَمِیْعُ مَا صَحَّ عَنْ رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ مِنَ الشَّرْعِ وَالْبِیَانِ کُلُّهُ حَقٌّ① .))

''وہ تمام امور شریعت اور وضاحت جو رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہیں وہ سب حق ہیں''۔

①۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : میں کہتا ہوں : اس میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی یہ خبر احاد ہے یا متواتر؛ جبکہ وہ صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو۔ یہی وہ حق ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ان دونوں میں تفریق کرنا بدعت اور اسلام میں داخل شدہ فلسفہ کا نتیجہ ہے۔اور سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین کے طریقہ کے مخالف ہے۔جیسا کہ میں نے اپنے رسالہ ''وجوب الأخذ بحدیث الآحاد فی العقیدة و الرد علی شبه المخالفین ''میں تحقیق پیش کی ہے۔یہ رسالہ چھپ کر شہرت پا چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: یہ ان کے سابقہ بیان کردہ عقیدہ کے مطابق ہے کہ ایمان صرف اقرار اور تصدیق کا نام ہے۔اور حق بات یہ ہے کہ ایمان میں اپنی اصل بنیاد کے لحاظ سے ہی فرق ہے؛ نیک انسان کا ایمان فاسق وفاجر کے ایمان کی طرح نہیں ہوسکتا۔اس کا مراجعہ کر لیں۔

اُقول: مصنف رحمہ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ تمام روایات واحادیث جو محدثین کرام رحمہم اللہ کے اصولوں کے مطابق عادل راوی روایت کریں ان پر عمل کرنا اور ان کے مطابق عقیدہ وایمان رکھنا واجب ہو جاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ سے مروی احادیث مبارکہ کی دو اقسام ہیں: متواتر اور احاد۔

متواتر: وہ حدیث ہے جسے راویوں کی اتنی بڑی تعداد روایت کرے جن کا جھوٹ پر جمع ہونا عادت کے مطابق محال ہو۔وہ اتنی ہی بڑی تعداد سے اپنے اگلوں سے روایت کریں؛حتی کہ یہ سلسلہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچ جائے۔

احاد: وہ احادیث ہیں جنہیں گنتی کے چند لوگ روایت کریں۔علماء کرام نے ان کی تین اقسام بیان کی ہیں: مشہور؛ عزیز اور غریب۔

عمومی طور پر انہیں متواتر اور احاد ہی کہا جاتا ہے۔متواتر کے ثبوت پر تمام فرقوں کا اتفاق ہے۔جبکہ احادیث کی قبول یا رد کے حساب سے بھی تین اقسام ہیں:
صحیح حسن اور ضعیف۔

حدیث ضعیف مردود ہے؛ اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔لیکن ان احادیث کی قبولیت کا جو حسن یا صحیح روایات پر مشتمل ہوں۔اہل سنت والجماعت تمام امور دین میں اور امور اعتقاد میں ان روایات کو قبول کرتے ہیں جن قبولیت روایت کی شرائط پائی جائیں؛ بھلے ان کو ایک ہی راوی روایت کرے۔جیسے رب سبحانہ و تعالیٰ کی صفات؛ اس کے افعال؛ اور جو امور آخرت سے تعلق رکھتے رہیں؛ اور ان امور میں بھی جو اعمال سے تعلق رکھتے ہیں؛ جیسے طہارت؛ نماز اور زکواۃ اور معاملات کے احکام۔یہ اصل میں ایک عقیدہ کا اصولی مسئلہ ہے کہ کیا خبر واحد حجت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ حق یہی ہے کہ: خبر واحد دین کے تمام اعتقادی اور عملی امور میں حجت ہے۔اور سنت مطہرہ میں اس پر بہت سارے دلائل ہیں۔ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ: رسول اللہ ﷺ فرد واحد کو اپنا سفیر اور اسلام کا پیامبر بنا کر دین وعقیدہ اور معاملات کی دعوت اور تعلیم کے لیے بھیجا کرتے تھے۔اور لوگ ان کی دعوت کے مطابق عقیدہ وعمل اپناتے تھے۔جب کہ اہل بدعت متکلمین کے نزدیک عقائد کے باب میں خبر واحد سے حجت نہیں لی جاسکتی۔پس اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں وارد ہونے والی بہت ساری نصوص کو رد کر دیتے ہیں۔اثبات کے لحاظ سے عقیدہ اور عمل کے مسائل میں تفریق کرنا بذات خود ایک بدعت ہے۔تمام مسائل دین یکساں ہیں؛ پس جن روایات سے شرعی احکام حلال وحرام ثابت ہوتے ہیں؛ انہی روایات سے اعتقاد کے مسائل بھی ثابت ہوتے ہیں۔درحقیقت اہل بدعت کا مقصد صرف ثبوت میں احتیاط نہیں؛ بلکہ ان کا مقصد ان روایات اور نصوص کو رد کرنا ہے جو ان کے اصولوں کے خلاف وارد ہوئی ہیں۔جب وہ ان نصوص کو رد نہ کر سکے تو پھر یہ اصول گھڑ لیا کہ یہ اخبار اُحاد ہیں؛ ان سے اعتقاد کے مسائل ثابت نہیں ہوتے۔مگر جب اس کے برعکس متواتر نصوص آ جائیں تو پھر بھی ان کا کیا رد عمل ہوتا ہے؟۔کہتے ہیں: ہاں یہ قطعی الثبوت ہیں؛ لیکن نفس نصوص ظنی الدلالت ہیں۔اور کہتے ہیں: مسائل اعتقاد صرف لفظی دلائل سے ثابت نہیں ہوتے۔پھر وہ

ادلہ سمعیہ یعنی کتاب وسنت کے دلائل کو عقل کے مقابلہ میں لفظی دلائل کے باب میں رکھتے ہیں۔اوران کے نزدیک عقیدہ کے مسائل صرف عقلی دلائل سے ہی ثابت ہوتے ہیں۔نعوذ باللہ من الضلال۔

تَشرِیح: دراصل علامہ الشیخ طحاوی رحمہ اللہ اس وضاحت سے جہمیہ،معطلہ،معتزلہ،رافضہ کا رد کرنا چاہتے ہیں؛ جو کہتے ہیں: احادیث کو دو اقسام ہیں: ❶ متواتر اور آحاد۔

پس متواتر اگرچہ سند کے لحاظ سے قطعی ہے؛ لیکن دلالت کے لحاظ سے قطعی نہیں۔اس لیے کہ لفظی دلائل یقین کا فائدہ نہیں دیتے۔اس لیے وہ قرآن پاک میں بیان کردہ صفات الٰہیہ پر تنقید کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ: آحاد احادیث یقین کا فائدہ نہیں دیتیں؛ نہ ہی ان سے ان کی سند کے اعتبار سے استدلال کیا جاسکتا ہے نہ ہی متن کے اعتبار سے۔پس انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات اور افعال کی معرفت کے دروازے دلوں پر بند کردیے۔اور انھوں نے لوگوں کو وہمی مسائل اور خیالی مقدمات کے پیچھے لگادیا۔اور انہیں قطعی عقلی دلائل اور یقینی براہین کا نام دیا۔جبکہ حقیقت میں یہ دلائل بالکل ایسے ہی ہیں: [جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے]:

☼ کتاب الایمان (ص ٤٤٦) کا مطالعہ کریں۔

﴿كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّى إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ٥ أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُورٍ ٥﴾ (النور: ۳۹-۴۰)

''جیسے صحراء میں سراب؛ پیاسا اسے پانی سمجھے حتی کہ جب وہاں پہنچے تو کچھ بھی نہ پائے؛ اور اللہ تعالیٰ ہی کو اپنے پاس دیکھتے تو وہ اسے اس کا حساب پورا پورا چکا دے اور اللہ تعالیٰ جلد حساب کرنے والا ہے۔یا جیسے گہرے سمندر میں اندھیرے جس پر لہر چڑھی چلی آتی ہو؛ اس کے اوپر اور لہر ہو؛ اس کے اوپر بادل ہو؛ غرض اندھیرے ہی اندھیرے ہوں ایک پر ایک؛ جب اپنا ہاتھ نکالے تو کچھ نہ دیکھ سکے اور جس کو اللہ تعالیٰ روشنی نہ دے اس کو روشنی نہیں (مل سکتی)۔''

تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ لوگ ان توہمات کو نصوص وحی سے مقدم رکھتے ہیں؛ بلکہ ان کی وجہ سے نصوص کو ترک کردیتے ہیں۔ان کے دل نصوص سے ہدایت پانے سے خالی ہوچکے ہیں۔اور انہیں اس صحیح عقل تک رسائی میں بھی کامیابی نہ ہوسکی جس کی تائید فطرت سلیمہ اور نصوص نبویہ سے ہوتی ہے۔اگر یہ لوگ نصوص وحی کی حاکمیت تسلیم کرلیتے؛ تو اس صحیح معقول تک رسائی میں بھی کامیاب ہوجاتے جو کہ فطرت سلیمہ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

بلکہ ارباب اہل بدعت میں سے ہر گروہ نصوص کو اپنی بدعات پر؛ اور اپنے تئیں معقول پر پیش کرتا ہے۔پس جو کچھ موافق ہو؛ تو کہتے ہیں: یہ محکم ہے؛ اسے قبول کرلیتے ہیں؛ اس سے حجت پیش کرتے ہیں۔اور جو کچھ مخالف ہو؛ تو کہتے ہیں: بے شک یہ متشابہ ہے۔پھر اس کو رد کردیتے ہیں، اس رد کو تفویض کا نام دیتے ہیں۔یا اس میں تحریف کرتے ہیں اور اس تحریف کو تاویل کا نام دیتے ہیں۔اسی لیے اہل سنت والجماعت ہمیشہ سے ان پر بہت سخت انکار کرتے چلے آئے ہیں۔

اہل سنت والجماعت کا طریقہ:

اہل سنت والجماعت نص صحیح سے ہرگز ہرگز اعراض نہیں کرتے۔ اور نہ ہی معقولات اور لوگوں کے اقوال کے ساتھ اس کا ٹکراؤ/ مقابلہ کیا جائے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے سنا: شیخ حمیدی کہہ رہے تھے: ہم امام شافعی رحمہ اللہ کی مجلس میں تھے؛ ان کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، اور اس نے ان سے ایک سوال پوچھا۔ تو امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کا اس کے بارے میں یہ فتویٰ دیا/ فیصلہ کیا ہے''۔

اس شخص نے امام شافعی رحمہ اللہ سے کہا: آپ کی اس میں کیا رائے ہے؟

امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: سبحان اللہ! کیا تو مجھے کسی گرجا گھر میں یا مندر میں دیکھ رہا ہے؟ کیا میں نے اپنے بدن پر زنار لٹکا رکھا ہے؟۔ میں تجھے کہتا ہوں: ''رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ ہے۔ اور تو کہتا ہے: آپ کا قول کیا ہے؟''۔

سلف صالحین رحمہم اللہ سے اس قسم کے اقوال کثرت کے ساتھ منقول ہیں''۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ (الاحزاب: ٣٦)

''اور کسی مومن مرد اور عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں۔''

اور خبر واحد کو جب امت قبول کرتی ہے؛ اس پر عمل کے اعتبار سے بھی؛ اور تصدیق کے اعتبار سے بھی؛ تو وہ جمہور امت کے نزدیک علم یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ اور یہ بھی متواتر کی ایک قسم ہے۔ اس مسئلہ میں امت کے سلف صالحین رحمہم اللہ کے مابین کچھ بھی اختلاف نہیں تھا۔ جیسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ والی روایت:

((إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ .))

''بے شک اعمال کا مدار نیت پر ہے۔''❶

نیز حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ والی روایت:

''ولاء کے بیچنے اور اس کے ہبہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔''❷

❶ بخاری ١؛ أول حديث فی صحيح البخاری مسلم ١٩٠٧ ـ من حديث عمر .

❷ بخاری ٢٥٣٥ ، مسلم ١٥٠٦ .

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''کسی عورت سے اس کی پھوپھی اور اس کی خالہ پر نکاح نہ کیا جائے۔''❶

نیز انہی کی روایت: ''رضاعت سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں۔''❷

اس طرح کی اور حدیثیں بھی موجود ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اس صحابی رضی اللہ عنہ کی حدیث جو مسجد قبا میں پہنچا، وہاں جا کر اس نے بتایا کہ قبلہ کا رخ کعبہ کی طرف تبدیل ہو گیا ہے تو تمام نمازی کعبہ کی جانب پھر گئے۔❸

❶ بخاری ١٥٠٩ ، مسلم ١٤٠٨ ـ الارواء الغليل (١٨٨٢) .

❷ بخاری ٢٦٤٥ ، مسلم ٤٤٧ ـ حديث عائشة ، الارواء الغليل (١٨٧٦) .

❸ متفق عليه؛ البخاری ٤٩؛ ٧٢٥١ ـ مسلم ٥٢٦ حديث براء بن عازب۔ اس کے الفاظ اور تخریج صفة الصلاة میں دیکھیں۔

رسول اللہ ﷺ اپنے قاصدوں کو اکیلے ہی بھیجتے؛ اور ان اکیلے سفراء کے ہاتھوں خطوط بھی ارسال فرماتے۔ لیکن جن کی طرف ان کو بھیجا گیا ہوتا؛ وہ یہ نہیں کہتے تھے؛ ہم اس کی بات نہیں مانتے؛ اس لیے کہ یہ خبر واحد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ: ۳۳)

''وہی جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے۔''

پس یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر اپنے دلائل اور حجتوں کی حفاظت فرمائے۔ تا کہ اس کی حجتیں اور دلائل ضائع نہ ہوں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو رسوا کیا ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یا آپ کے بعد آپ پر جھوٹ بولا۔ اور اس کے احوال کو لوگوں پر آشکار کیا۔ حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ [۱۰۷-۱۹۸ھ] کا فرمان ہے:

''جس نے بھی حدیث میں جھوٹ بولا، اللہ تعالیٰ نے اس کا پردہ نہیں رکھا''۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا قول ہے: ''اگر کوئی شخص وقت سحر میں حدیث رسول ﷺ میں جھوٹ کی آمیزش کا سوچے گا بھی؛ تو صبح کو لوگ کہنا شروع کر دیں گے: ''فلاں انسان جھوٹا/کذاب ہے''۔

یاد رہے کہ خبر واحد اگر چہ سچ اور جھوٹ کا احتمال رکھتی ہے؛ لیکن صحیح اور ضعیف حدیثوں میں امتیاز کے مقام پر وہی فائز ہوسکتا ہے جس کے اکثر اوقات حدیث کے متعلق؛ اور اس کے راویوں کے حالات کی تفتیش میں بسر ہوں؛ تا کہ اس کو راویوں کے حالات اور ان کے اقوال سے آگاہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ لغزش یا غلطی کے سرزد ہونے سے کس قدر محتاط رہتے تھے۔ [اور یہ عالم تھا کہ] اگر انہیں قتل بھی کر دیا جاتا؛ وہ پھر بھی کسی کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر کوئی کلام [اپنی طرف سے] گھڑ لائے۔ اور نہ ہی انہوں نے خود ایسے کیا۔ اور اس دین کو بالکل اسی طرح ہم تک پہنچایا جس طرح ان تک پہنچایا گیا تھا۔ وہ اسلام کے محافظ تھے؛ سچے مؤمنین کی جماعت تھے۔ احادیث کے نقاد اور ان کی جانچ پرکھ میں مہارت رکھتے تھے۔ جب انسان ان علوم میں ان کی اس شان سے آگاہ ہوتا ہے، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے احوال کیا تھے؟؛ اور وہ کس قدر راست بازی، پرہیز گاری، امانت کے اعلیٰ اوصاف سے موصوف تھے؟۔ ان کی روایات احادیث اور منقولات سے ان کی علمی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ جس شخص میں بھی عقل اور معرفت موجود ہو وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ محدثین کرام رحمہم اللہ کو رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور احادیث پر جس قدر عبور حاصل ہے؛ اس کا کسی دوسرے کو شعور تک نہیں؛ کجا کہ انہیں اتنا علم حاصل ہو؛ یا ان کے متعلق ایسا سوچا جا سکتا ہو۔ جس طرح نحویوں کو جس قدر سیبویہ [۸۴-۱۸۰ھ] اور خلیل [۱۰۰-۱۷۰ھ] کے علوم اور ان کے اقوال پر آگاہی حاصل ہے؛ جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ اور اطبا کو جس قدر بقراط اور جالینوس کے علوم کی معرفت ہے؛ کسی دوسرے کو اس کا اتنا علم نہیں۔ اسی طرح ہر فن کا ماہر اپنے فن کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہے۔ اگر آپ سبزی فروش سے خوشبو کے بارے میں سوال کریں یا عطار سے کپڑے کے بارے میں دریافت کریں تو اسے آپ کی بہت بڑی جہالت شمار کیا جائے گا۔

لیکن اہل بدعت فرقوں نے صفات کے بارے میں احادیث صحیحہ کو رد کرنے میں اپنی اصل اس آیت کو بنایا ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ۱۱) ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔''

پس جب بھی کوئی حدیث ان کے قواعد ونظریات اور توہمات کے خلاف ہو تو وہ اس آیت: ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ﴾ کا سہارا لے کر اسے رد کر دیتے ہیں۔ یہ ان کی تلبیس اور تدلیس ان ہی میں سے اس آدمی پر ہے جس کا دل ان سے بھی بڑھ کر اندھا ہو اور وہ آیات کے اصل معانی میں تحریف کا ارتکاب کرنے والا ہو۔ چنانچہ احادیث صفات سے وہ ایسا مفہوم نکالتے ہیں جو نہ اللہ تعالیٰ کی مراد ہوتا ہے نہ ہی اس کے رسول ﷺ کی۔ اور نہ ہی ائمہ اسلام میں سے کسی ایک نے ایسا سمجھا ہوتا ہے۔ [اور کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے لیے] صفات کا اثبات مخلوق کی صفات کی ساتھ تمثیل [مماثلت] کا تقاضا کرتا ہے۔ اور پھر اس پر اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ﴾۔ دونوں نصوص میں تحریف کرتے ہوئے۔ اور پھر اس کی تائید میں کتابیں تحریر کرتے ہیں؛ اور کہتے ہیں: ''یہ اس دین اسلام کے اصول ہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے؛ اور وہ دین اس کی طرف سے آیا ہے۔ قرآن بہت زیادہ پڑھتے ہیں؛ مگر اس کا معنی اللہ تعالیٰ کی طرف تفویض کر دیتے ہیں۔ اس کے ان معانی پر تدبر نہیں کرتے جن کو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے اور وضاحت کی ہے کہ یہ معنی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے۔ ان تین اوصاف خبیثہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سابقہ اہل کتاب کی مذمت کی ہے؛ اور ہمیں ان کے واقعات سے آگاہ کیا ہے تاکہ ہم عبرت حاصل کریں؛ اور ان کی راہ پر چلنے سے باز رہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا لَـكُمۡ وَقَدۡ كَانَ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ۝﴾ ......الی ...... ﴿وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ۝﴾ ......الی ...... ﴿فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ‌ؕ فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا يَكۡسِبُوۡنَ۝﴾ (البقرة: ۷۵ – ۷۹)

''کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمھارے دین پر لے آئیں؛ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کلام اللہ تعالیٰ (یعنی تورات) کو سنتے؛ پھر اس کو سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر اسے بدل دیتے ہیں۔'' ......[آگے تک]......''اور ان میں ان پڑھ ہیں جو خیالات باطلہ کے سوا کتاب سے واقف نہیں؛ اور وہ صرف بدگمانی کرتے ہیں۔'' ......[آگے تک]......''تو ان لوگوں پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیں۔ ان پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور پھر ان پر افسوس ہے جو کچھ وہ کماتے ہیں۔''

لفظ اَمَانِىَّ سے مراد مطلق پڑھنا ہے۔ ان کی مذمت اس بنا پر کی ہے کہ جو کچھ انہوں نے خود لکھا؛ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس کے عوض مال کماتے ہیں۔ یہ دونوں اوصاف مذموم ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف وہ چیز کی نسبت کی جائے جو اس کی طرف سے نہیں؛ اور یہ کہ اس کے عوض میں دنیا کا مال و دولت یا اقتدار حاصل کیا جائے۔

نسأل الله تعالیٰ ان یعصمنا من الزلل فی القول والعمل بمنه وکرمه.

[سنت کی دو اقسام:]

شیخ طحاوی رحمہ اللہ اپنے اس فرمان: ''من الشرع والبیان'' سے اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جو چیز رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہو جائے؛ اس کی دو اقسام ہیں:

[اول]: ابتدائی اور بنیادی شریعت۔

[دوم]: بیان: جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں شریعت بیان کی ہے؛ اس کی وضاحت۔ یہ دونوں حق اور واجب الاتباع ہیں۔

ایمان میں کمی وبیشی

((وَ الإِيْمَانُ وَاحِدٌ وَأَهْلُهُ فِي أَصْلِهِ سَوَاءٌ ❾، وَالتَّفَاضُلُ بَيْنَهُمْ بِالْخَشْيَةِ وَالتُّقٰى وَمُخَالِفَةِ الْهَوَى وَمُلازَمَةِ الأُوْلٰى .))

''اور ایمان ایک ہی چیز ہے؛ اہل ایمان اس کی اصل میں برابر ہیں؛ ان میں تفاوت بلحاظ خشیت پرہیز گاری اور خواہش نفس کی مخالفت؛ اور اولیٰ کے التزام کے اعتبار سے ہے''۔

❾۔ مصنف رحمہ اللہ کا فرمان: (وَالإِيْمَانُ وَاحِدٌ وَأَهْلُهُ فِي أَصْلِهِ سَوَاءٌ) یہ بات محل نظر ہے۔ بلکہ ایسے کہنا ہی غلط ہے۔ ایمان میں تمام اہل ایمان برابر نہیں ہوسکتے۔ بلکہ ان میں بہت بڑا فرق ہے۔ انبیاء ومرسلین علیہم السلام کا ایمان کسی دوسرے کی طرح نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ خلفاء راشدین کا ایمان دوسرے ان جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ایمان کی مانند نہیں۔ ایمان میں یہ فرق دل میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات؛ اور بندوں کے لیے اس کی شریعت کے متعلق علم کے حساب سے ہوتا ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے؛ بخلاف مُرْجِئَہ اور ان کے ہمنواؤں کے۔ واللہ المستعان۔
یہ اختلاف اہل سنت والجماعت اور مرجۂ فقہاء کے مابین ہے۔ مرجۂ فقہاء کے نزدیک ایمان میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی۔ جبکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایمان گھٹتا اور بڑھتا ہے؛ نیک اعمال کرنے سے ایمان بڑھتا ہے اور گناہ کے کام کرنے سے اس میں کمی آتی ہے۔ بھلے ایمان کو ان کے اصول پر صرف تصدیق ہی کہا جائے؛ تب بھی تصدیق میں بھی قوت اور کمزوری کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔ ایسے ہی علم کے لحاظ سے بھی کمی وبیشی ہوتی ہے۔ اس مؤقف پر کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شمار دلائل موجود ہیں؛ جن میں سے بعض کا ذکر شارح رحمہ اللہ نے بھی کیا ہے۔ اور اس کی تفصیل جاننے کے لیے ابوعبید قاسم بن سلام کی کتاب ''الایمان'' اور استاذ محترم جناب ڈاکٹر عبداللہ الجربوع کی کتاب ''زیادۃ الایمان ونقصانہ'' کا مطالعہ بہت ہی مفید رہے گا۔ [دراوی]

[ایمان کی اصل:]

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان ہے: ''اہل ایمان اصل ایمان میں برابر ہیں''۔ ان کے مابین تفاضل اس کی حقیقت اور خواہشات نفس کی مخالفت؛ اور زیادہ افضل واولیٰ کے التزام کی بنیاد پر ہوتا ہے''۔ اور بعض نسخوں میں ''اس کی حقیقت'' کے بجائے: تقویٰ اور خشیت کی بنیاد پر ہے۔ پس پہلی عبارت میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ: بے شک تمام لوگ اصل/ بنیادی تصدیق میں شریک ہیں؛ لیکن یہ تصدیق بعض میں دوسروں کی نسبت زیادہ اور ثابت قوی ہوتی ہے۔ جس طرح پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس کی مثال قوت بصر اور ضعف بصر میں فرق کی دی جاسکتی ہے۔

اور دوسری عبارت میں اس طرف اشارہ کررہے ہیں: مؤمنین کے مابین فرق/ اور اختلاف دل کے اعمال کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اصل تصدیق میں فرق نہیں ہوتا۔ پہلا معنی زیادہ واضح اور قوی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

[اہل ایمان اور ولایت]

٦٥ ۔((وَالْمُؤْمِنُونَ كُلُّهُمْ أَوْلِيَاءُ الرَّحْمٰنِ ①. وَأَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَطْوَعُهُمْ وَأَتْبَعُهُمْ لِلْقُرْآنِ ②.))

''تمام مومن اولیاء اللہ تعالیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ سب سے زیادہ عزت والا ہے جو سب سے زیادہ اطاعت گزار ہے اور قرآن پاک کی زیادہ اتباع کرنے والا ہے''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہی وہی لوگ ہیں جن کے متعلق ارشاد ربانی ہے:﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○﴾(یونس : ٦٢، ٦٣) ''خبردار اولیاء اللہ کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے۔''
کرامت کرامات کے دعوے کرنے اور خارق عادت پیش کرنے سے نہیں ہوتی جیسا کہ بہت سارے لوگ اس وہم میں پڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں یہ ایسے اہانت آمیز کام ہیں جن سے اسلام کا خوبصورت چہرہ مسخ ہوتا ہے۔

② ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس میں ایک لطیف اشارہ میں ان لوگوں پر رد کیا گیا ہے جو مذہبی تعصب میں اپنے مذہب کی اتباع کو کتاب وسنت کی اتباع پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اتباع کتاب وسنت اور اتباع مذہب آپس میں لازم وملزوم نہیں۔ کیونکہ مذاہب میں تو اختلاف ہے مگر کتاب اللہ میں کوئی اختلاف نہیں؛ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:﴿وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾[النساء ٨٢]
''اور اگر وہ غیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے''۔
پس مسلمان جتنا زیادہ قرآن کے تابع ہوگا؛ اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنی زیادہ عزت والا ہوگا۔ اور جتنا زیادہ تقلید میں گھستا جائے گا؛ وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا جائے گا۔ جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے اس طرح اشارہ کیا ہے؛ فرمایا: " لا يقلد إلا عصبی و غبی "۔انظر صفة الصلاة ١٢٣۔
''تقلید صرف وہی کرے گا جو یا تو متعصب ہو یا غبی ہو''۔

تشریح:......اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○﴾(یونس: ٦٢، ٦٣)

''خبردار بے شک اولیاء اللہ تعالیٰ کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے جو ایمان لائے اور تقوی پر کار بند رہے۔''

لفظ (وَلی) وِلایۃ ؛ سے مشتق ہے۔ وَلایۃ واؤ پر زبر کے ساتھ؛ عداوت کی ضد ہے؛ اور اس کے نیچے زیر کے ساتھ؛ دونوں طرح سے ہے۔ یہ دو لغتیں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اس کو وَلایۃ واؤ پر زبر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا معنی نصرت/ مدد کرنا ہوتا ہے۔ حمزہ نے اس آیت کو اس طرح پڑھا ہے:﴿ما لكم من وِلايتهم من شئی....﴾[الانفال ٧٢] اور وِلایۃ واؤ کے نیچے زیر کے ساتھ؛ جبکہ باقی اس کو واؤ پر زبر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ وِلایۃ واؤ کے نیچے زیر کے ساتھ امارت/حکومت کا معنی دیتا ہے۔
امام زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس کو کسرہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے؛ اس لیے کہ لوگوں کے ایک دوسرے کی جگہ کام کرنے میں /صناعت میں موالات/[نیابت] ہے۔ اور معروف قاعدہ کے مطابق صنعت والے صیغے کسرہ کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں جیسے (خیاطہ) کپڑے سینے کا پیشہ ہے؛ اور دیگر پیشے۔ پس مؤمنین اللہ تعالیٰ کے اولیاء ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ولی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ﴾ (البقرة: ۲۵۷)

''جولوگ ایمان لائے ہیں ان کا دوست اللہ تعالیٰ ہے؛ انہیں اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے اور جولوگ کافر ہیں ان کے دوست طاغوت ہیں کہ انھیں نور سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ٥﴾ (محمد: ۱۱)

''یہ اس لیے کہ جو مومن ہیں ان کا اللہ تعالیٰ کارساز ہے اور کافروں کا کوئی کارساز نہیں۔''

نیز مؤمن آپس میں ایک دوسرے کے اولیاء اور دوست ہیں؛ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ (التوبه: ۷۱)

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ (الانفال: ۷۲)......الخ

''جولوگ ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے لڑے وہ اور جنھوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ٥ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ٥﴾ (المائدہ: ۵۵،۵۶)

''بے شک تمھارے دوست تو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر اور مؤمن ہیں جو نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر اور مومنوں سے دوستی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔''

پس ان تمام نصوص میں اہل ایمان کی باہمی ولایت/ دوستی ثابت ہوتی ہے۔ اور بے شک اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا دوست اور کارساز ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں؛ اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر راضی ہوتے ہیں؛ وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے کسی دوست سے دشمنی کرتا ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعلان جنگ کرتا ہے۔ پس یہ ولایت/ دوستی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا احسان ہے۔ یہ لوگوں کی دوستی کی طرح نہیں کہ اسے اس دوستی کی کوئی ضرورت ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ

كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا﴾ (الاسراء: ۱۱۱)

''اور کہو کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے نہ کوئی بیٹا بنایا اور نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے اور نہ اس وجہ سے کہ وہ عاجز و ناتواں ہے نہ کوئی اس مددگار ہے اور اس کو بڑا جان کر اس کی بڑائی کرتے رہو۔''

پس اللہ تعالیٰ اس لیے دوست نہیں بناتا کہ اس میں کچھ کمزوری ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہی تمام غلبہ اور عزت ہے۔ بادشاہوں اور دیگر لوگوں کے برعکس؛ جو اپنی کمزوری؛ پستی اور مددگار کی ضرورت کی وجہ سے دوستی کرتے ہیں۔ یہاں پر وَلایت بھی ایمان کی مانند ہے۔ شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ اصل ولایت میں تمام برابر ہیں، یہ ولایت کامل بھی ہوسکتی ہے اور ناقص بھی۔ پس کامل ولایت کے حقدار پرہیز گار ایماندار لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ o الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ o لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ (یونس: ٦٢-٦٤)

''آگاہ رہو اولیاء اللہ کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے وہ جو ایمان لائے اور پرہیز گار رہے ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔''

پس ''الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ'' کا جملہ اس بنا پر منصوب ہے کہ یہ اولیاء اللہ کی صفت ہے؛ یا اس سے بدل ہے؛ یا اَمدحُ ضمیر پوشیدہ ماننے کی بنا پر منصوب ہے۔ یا پھر ''ھم'' ضمیر کی وجہ سے مرفوع ہے۔ یا ان کی دوسری خبر ہے۔ نیز عَلَيْهِمْ کی ضمیر سے بدل بنا کر مجرور پڑھنا بھی جائز ہے۔ ان تمام صورتوں میں وِلایت کے حقدار وہ مؤمن اور پرہیز گار ہیں جن سے وعدہ کا ذکر ان تینوں آیات میں ہے۔ ولایت کا مطلب یہ ہے کہ وہ محبت کے کاموں اور ناراضگی کے کاموں میں اللہ تعالیٰ کی موافقت کا خیال رکھتے ہیں۔ محض زیادہ روزے رکھنا اور کثرت کے ساتھ نوافل ادا کرنا چاپلوسی اختیار کرنا اور ریاضت کرنے کا نام ولایت نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' مبتداء ہے؛ اور ''لَهُمُ الْبُشْرٰى'' خبر ہے۔ لیکن یہ احتمال بعید ہے کیونکہ جملہ ماقبل سے منقطع ہو رہا ہے؛ نیز اس طرح آیت کا نظم/ ربط بھی ختم ہو جاتا ہے۔

پس مؤمن میں ایک اعتبار سے ولایت اور ایک اعتبار سے عداوت دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ کبھی ایسا ہوسکتا ہے کہ اس میں کفر بھی ہو اور ایمان بھی؛ شرک بھی ہو اور توحید بھی؛ [ایسے ہی] تقویٰ اور فسق؛ نفاق اور ایمان [کا جمع ہونا ممکن ہے]۔

اگرچہ اہل سنت کے درمیان اس اصل میں نزاع/ اختلاف لفظی ہے؛ اور ان کا معنوی اختلاف اہل بدعت کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ ایمان کی بحث میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ خیال رہے لفظ اور معنی دونوں میں شارع کی موافقت اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ صرف معنوی موافقت ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ o﴾ (یوسف: ١٠٦)

''اور ان کی اکثریت اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ (الحجرات : ١٤)

''کہہ دو تم ایمان نہیں لائے ہو لیکن تم کہو ہم مسلمان ہوئے ہیں۔''

اس آیت پر بحث گزر چکی ہے۔ صحیح قول کے مطابق یہ لوگ منافق نہیں تھے۔ نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''جس شخص میں چار خصلتیں ہیں وہ خالص منافق ہے؛ اور جس میں ان سے ایک خصلت ہے تو اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود ہے۔ جب تک کہ وہ اس کو چھوڑ نہ دے:

(۱) جب بات کرے جھوٹ بولے۔

(۲) جب معاہدہ کرے تو غدر [بے وفائی] کرے۔

(۳) اور جب وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے۔

(۴) اور جب جھگڑا کرے تو گالیاں دے''۔

ایک روایت میں ہے: ''جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے''۔ یہ خصلت اس خصلت کی جگہ ذکر ہوئی ہے: ''جب وہ وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے'' [1]۔ [أخرجاه فی الصحيحين]

☼ متفق عليه . / اصله من صحيح مسلم ١ / ٧٨۔

اس سے پہلے حدیث ''شعب الایمان'' کا ذکر ہو چکا ہے۔ نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''اس شخص کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا جس کے دل میں ذرہ ءمثقال بھر ایمان ہوگا''۔ [1]

[1] ۔سنن الترمذی ٢٥٩٨ : البخاری ٧٥١٠ ؛ مسلم ١٩٣۔

پس معلوم ہوا جس کے دل میں نہایت کم سے کم تر ایمان بھی ہوگا وہ دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہے گا؛ اگر چہ اس کے ساتھ بہت سارا نفاق بھی کیوں نہ ہو۔ اس کو نفاق کے برابر دوزخ میں عذاب ہوگا۔ پھر اسے آگ سے نکال لیا جائے گا۔ پس اطاعت گزاری کے کام ایمان کی شاخیں ہیں۔ اور معاصی کے کام کفر کی شاخیں ہیں۔ اگر چہ تمام کفر کی اصل جڑ انکار کرنا ہے۔ اور ایمان کی تمام شاخوں کی سرخیل شاخ تصدیق ہے۔ ہاں جو نبی کریم ﷺ تک ایک مرفوع حدیث نقل کی جاتی ہے کہ بے شک آپ ﷺ نے فرمایا:

''کوئی بھی جماعت جمع نہیں ہوتی؛ مگر اس میں ایک ولی اللہ ہوتا ہے۔ نہ لوگ اس کو جانتے ہیں نہ وہ خود اپنے آپ کو جانتا ہے''۔

اس کی کوئی اصل نہیں؛ یہ سراسر باطل کلام ہے۔ کبھی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جماعت والے لوگ کافر ہوں یا فاسق ہوں۔ اور فسق پر ہی ان کی موت آنی ہو''۔ ہاں ولایت میں درجۂ کمال پر فائز ہونے والوں کے حق میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ (یونس : ٦٢۔٦٤)

''آگاہ رہو! جو اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔''

تقویٰ کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ....إلى.... اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ (البقرة: ۱۷۷)

''بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور فرشتوں پر اور (اللہ تعالیٰ کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں ......آگے تک...... یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔''

پرہیزگار دو قسم کے ہیں: پہلی قسم میں مقتصد، دوسرے میں مقرب ہیں۔

اول: مقتصد [میانہ رو] وہ ہیں جو اعمال قلوب و جوارح میں سے فرائض ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا قرب تلاش کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((مَنْ عَادَ لِي وَلِيّاً فَقَدْ بَارَزَنِي بِالْمُحَارِبَةِ ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَّي عَبْدِي بِمِثْلِ أَدَاءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ ، وَلَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَّي بِالنَّوَافِلِ ، حَتّٰى أُحِبَّهُ ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يَبْصِرُ بِهِ ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا ، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا ، وَلَئِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ قَبْضِ نَفْسِ عَبْدِي المؤمِنِ ، يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَكْرَهُ مَسَاْتَهُ .))

''جس شخص نے میرے ولی کے ساتھ دشمنی کی اس نے مجھ سے اعلان جنگ کیا؛ اور میرا بندہ کسی طرح بھی میرا وہ قرب حاصل نہیں کر سکتا جیسے وہ میرے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی سے حاصل کرتا ہے۔ میرا بندہ ہمیشہ نوافل ادا کر کے میرا مقرب بنتا ہے؛ حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں؛ پس جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں، جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں ضرور اس کا سوال پورا کرتا ہوں، اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں ضرور اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہوں اور میں کسی کام کے کرنے سے کبھی اتنا متردد نہیں ہوا جس قدر کہ اپنے مومن بندے کی روح قبض کرنے سے متردد ہوتا ہوں وہ موت کو برا جانتا ہے اور میں اس کو تکلیف دینا اچھا نہیں سمجھتا''۔ ❶

❶ حدیث صحیح ہے۔ بخاری، الاحادیث الصحیحة: ۱٦٤٠۔ اس کی سند قوی ہے؛ اور اس کی کئی اسناد اور شواہد ہیں۔ لیکن ''المبارزة'' کے الفاظ بخاری میں نہیں ؛ بلکہ یہ الفاظ حضرت ابوامامہ رحمہ اللہ کی روایت سے دوسرے محدثین کے ہاں پائے جاتے ہیں۔ اس سند میں دو راوی ضعیف ہیں۔ جیسا کہ میں نے دوسری جگہ پر بیان کر دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی شرح میں کافی لمبا کلام کیا ہے۔ اور یہ صراحت کی ہے کہ یہ روایت مسند احمد میں نہیں ہے۔ اور وہ الفاظ بیان کئے ہیں جو مسند احمد میں ہیں۔ اور بخاری کے الفاظ میں بہت تھوڑے سے مقامات پر بہت تھوڑا سا ایسا اختلاف ہے جس سے معنی نہیں بدلتا۔ پر میں نے ان الفاظ کو نہیں بدلا۔ شاید کہ شارح رحمہ اللہ نے یہ صحیح روایت کسی اور مصدر سے نقل کی ہو؛ جو کہ ہمارے سامنے [اس وقت] موجود نہیں ہے۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: صحیح الجامع الصغیر ۱۷٦۲]۔

پس لفظ ''وَلِیْ'' کا معنی عدو کا متضاد ہے؛ یہ لفظ وِلَاء'' سے مشتق ہے جس کا معنی قرب کا ہے۔ پس اللہ کا ولی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اور اس کے احکام کی موافقت کے کام کرتا ہے؛ اور اس کی رضامندی سے اس کی قربت چاہتا ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق : ۲،۳)

''اور جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نجات کی راہیں پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے وہم وگمان بھی نہ ہو۔''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے ابوذر! اگر لوگ اس آیت پر عمل کریں تو ان کے لیے کافی ہو جائے''۔ ❶

پس پرہیز گاروں کے لیے اللہ تعالیٰ ان امور کشادگی کی راہ نکالتا ہے جن میں لوگ تنگی کا شکار ہوتے ہیں۔ اور انھیں وہاں سے رزق عطا کرتا ہے؛ جہاں سے ان کا وہم وگماں بھی نہیں ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے تکالیف دور فرماتا ہے اور ان کے لیے فوائد کھینچ لاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو ایسے مکاشفات اور اثرات عطا کرتا ہے جن کی شرح طوالت اختیار کر جائے گی۔

❶ احمد ۵/ ۱۷۸، حاکم ۲/ ۴۹۲؛ سند میں انقطاع ہے اور یہ روایت ضعیف ہے۔ سنن ابن ماجہ ۴۲۲۰۔

[اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت کا معیار:]

(وَأَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَطْوَعُهُمْ وَأَتْبَعُهُمْ لِلْقُرْآنِ).

''اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ زیادہ عزت والا ہے جو زیادہ اطاعت گزار ہے اور قرآن پاک کی زیادہ اتباع کرنے والا ہے''۔

تَشْرِیح:...... اس سے مراد یہ ہے کہ: سب سے زیادہ عزت والا مؤمن وہ ہے جو ان سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا اطاعت گزار؛ اور قرآن کی اتباع کرنے والا ہو؛ وہی بڑا متقی ہوتا ہے۔ اور بڑا متقی ہی سب سے زیادہ عزت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (الحجرات : ۱۳)

''تم میں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو۔''

نیز سنن میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''کوئی فضیلت نہیں ہے؛ نہ ہی کسی عربی کو عجمی پر؛ نہ کسی عجمی کو عربی پر؛ نہ کسی سفید کو سیاہ پر؛ اور نہ ہی کسی سیاہ کو سفید پر؛ مگر تقوی کے ساتھ۔ تمام لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنے ہیں''۔ ❶

اس دلیل کی روشنی میں فقیر صابر اور غنی شاکر کے مسئلہ میں علماء کے اختلاف؛ اور ان میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ اور بے شک حقیقت یہ ہے کہ: اس فضیلت کا مرجع / مدار ذاتی طور پر فقر وغنا پر نہیں، بلکہ اس کا مرجع اعمال و احوال اور حقائق ہیں۔ یہ مسئلہ بذات خود فاسد ہے۔ [درست نہیں]۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاں فضیلت تقویٰ اور ایمانی حقائق پر مبنی ہوتی ہے؛ فقیری یا مالداری پر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے- واللہ تعالیٰ اعلم- کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: ''مالداری اور فقیری دو سواریاں ہیں مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ میں جس پر بھی سوار ہو جاؤں''۔

حقیقت میں فقر اور تونگری؛ دونوں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندہ کے لیے آزمائش ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

❶ حدیث صحیح ہے۔ لیکن سنن میں نہیں ہے۔ سنن کی طرف منسوب کرنا ایک وہم ہے۔ اصحاب سنن میں سے کسی ایک نے بھی اسے روایت نہیں کیا۔ بلکہ یہ

روایت مسند احمد ۵/۴۱۱؛ برقم ۲۳۴۷۹ میں ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: صحیح الجامع الصغیر وزیادته (۱۷۸۰). الصحیحة ۷۰؛ ۔شاید شارح رحمہ اللہ پر سنن ابی داؤد کی حدیث نمبر ۵۱۱۶ کے ساتھ مخالطہ ہو گیا۔

﴿فَأَمَّا الْإِنسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ﴾ (الفجر: ۱۵)

''مگر انسان کو جب اس کا رب آزماتا ہے اسے عزت اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت بخشی۔''

پس اگر صبر کرنے والا فقیر اور شکر گزار مالدار تقویٰ میں دونوں برابر ہوں؛ تو دونوں ایک درجہ میں ہیں۔ اور اگر تقویٰ میں کسی ایک کو فضیلت ہے تو وہی عند اللہ تعالیٰ افضل ہے۔ بے شک فقیری اور مالداری کا وزن نہیں ہوگا۔ بلکہ صبر و شکر کا وزن ہوگا۔

بعض حضرات نے یہ مسئلہ ایک دوسرے انداز سے پیش کیا ہے کہ صبر نصف ایمان ہے اور شکر بھی نصف ایمان ہے۔ پس ان دونوں میں سے ہر ایک میں صبر اور شکر کا ہونا ضروری ہے۔ جبکہ لوگوں نے ایک فرع صبر کی اور ایک فرع شکر کی لی ہے۔ اور ان میں ترجیح پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ پس بطور مثال ایسے مالدار کو پیش کیا ہے جو خرچ کرتا اور صدقہ کرتا ہے؛ اور اپنے مال کو اللہ تعالیٰ کی قربت میں لگاتا ہے؛ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ نیز ایسے فقیر کو الگ کر دیا جو اطاعت باری تعالیٰ میں مشغول ہے، اس کی عبادت بجالاتا ہے؛ اور اپنے فقر پر صابر ہے۔ اس صورت میں کہا جائے گا: ان دونوں میں سے اکمل وہ ہے جو زیادہ اطاعت گزار اور زیادہ متبع سنت ہے۔ اگر دونوں برابر ہیں تو دونوں کے درجات بھی برابر ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم''۔[مدارج السالکین ۲/ ٤٤٦]

اور اگر ان کو مجرد کرنا درست ہے؛ تو پھر یہ کہنا بھی درست ہے کون افضل ہے؟۔ تندرست شکر گزار یا بیمار صابر؟۔ سردار شکر گزار یا ذلیل صابر؟۔ یا پر امن شکر گزار یا خوف زدہ صابر۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں۔

[ایمان کی تفصیل]

٦٦ـ((وَالإِيْمَانُ هُوَ الإِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَومِ الآخِرِ وَالْقَدْرِ خَيرِهِ وَشَرِّهِ وَحُلْوِهِ وَمُرِّهِ مِنَ اللّٰهِ تَعَالىٰ① .

''ایمان سے مراد اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، پیغمبروں پر، آخرت کے دن پر اور اچھی بری؛ خوشگوار اور ناخوشگوار تقدیر کے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہونے کا یقین رکھنا ہے''۔

① ـ علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جان لیجیے کہ یہ رسول اللہ ﷺ سے منقول دعائے استفتاح کے منافی ہے؛ جس میں ہے: ((والخير كله بيديك والشر ليس إليك))۔ [رواہ مسلم] ''اور ہر قسم کی خیر تیرے ہاتھ میں ہے؛ اور برائی تیری طرف سے نہیں ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ تعالیٰ! آپ صرف محض شر تخلیق نہیں کرتے؛ بلکہ آپ کی ہر تخلیق میں حکمت ہوتی ہے؛ اور وہ اس حکمت کے اعتبار سے خیر اور بہتر ہے۔ لیکن اس میں کبھی کبھار کچھ لوگوں کے لیے شر ہوتا ہے؛ یہ شر جزوی اور نسبتی ہوتا ہے۔ جہاں تک کلی شر یا مطلق شر کی بات ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہیں۔ اس پر اس کی شرح میں بہترین گفتگو کی گئی ہے۔ اگر تفصیل جاننا چاہتے ہیں تو ابن قیم کی کتاب ''شفاء العلیل'' کا مراجعہ کرلیں۔ یہاں سے آپ کو ان لوگوں کے جھوٹ کا پتہ چل جائے گا جو کہتے ہیں: شر کا پیدا کرنے والا اللہ کے علاوہ کوئی اور ہے۔

تشریح: ...... یہ بحث گزر چکی ہے کہ یہ تمام خصلتیں دین کے اصول ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ نے حدیث جبرئیل علیہ السلام؛ جس کی صحت متفق علیہ ہے؛ میں یہی جواب دیا تھا۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کی خدمت میں ایک اعرابی کی شکل میں آئے؛ اور آپ سے اسلام کے بارے میں سوال کیا؟ تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں؛ اور تو نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور رمضان کے روزے رکھے اگر وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو تو بیت اللہ تعالیٰ کا حج کرے''۔ ❶

❀ پھر اس نے ایمان کے بارے میں دریافت کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر؛ اور آخرت کے دن پر۔ نیز اچھی بری تقدیر پر ایمان / یقین رکھو''۔ پھر اس نے آپ ﷺ سے احسان کے بارے میں دریافت کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے تو پھر یہ تصور ہو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے''۔ [مسلم ۲۶۷]

اور صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کبھی صبح کی دونوں رکعتوں میں یہ دونوں سورت اخلاص کی تلاوت فرماتے؛ یعنی ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۝﴾۔ اور کبھی ایمان اسلام کی دو آیات تلاوت فرماتے جو سورۂ بقرہ میں ہیں:

❶ بخاری ٥٠ ؛ مسلم ٨ - ٤٦٢ .

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ .... الخ (البقرة: ١٣٦)

''کہہ دو ہم اللہ تعالیٰ پر اور اس پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کی گئی۔''

اور دوسری آیت جو آل عمران میں ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ﴾ ❶ .... الخ (آل عمران: ٦٤)

۞ حدیث صحیح ہے۔ مسلم ۷۲۷، صفة الصلاة (ص ٩٢).

''کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمھارے دونوں کے درمیان یکساں ہے، اس کی طرف آؤ۔''

آپ نے مشہور حدیث وفد عبدالقیس (جو کہ بالاتفاق صحیح ہے) میں ایمان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

((آمركم بالإِيمانِ بِاللهِ وحده، أتدرون ما الإِيمان بِاللهِ وحده؟ شهادة أن لا إِله إِلا الله تعالىٰ وحده لا شرِيك له، وإِقام الصلاةِ، وإِيتاءِ الزكاة، وأن تؤدوا خمس ما غنِمتم.))

''میں تم کو ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہوں۔ کیا تمھیں علم ہے کہ ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا کیا ہے؟۔ اس بات کی گواہی دینا کہ: ''اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے؛ اور نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، اور تم جو مال غنیمت حاصل کرو؛ اس سے پانچواں حصہ نکالنا''۔ ❶

۞ متفق عليه. البخاری ٥٣؛ مسلم ١٧۔

نیز یہ بات مسلم ہے کہ دل سے ایمان و یقین کے بغیر یہ اعمال اللہ تعالیٰ پر ایمان سے آپ کی مراد نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ کئی مواقع پر یہ خبر دی ہے کہ دل سے ایمان و یقین کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ پس معلوم ہوا اگر ان پر دل سے یقین ہے تو یہ اعمال ایمان ہیں [ورنہ نہیں]۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے''۔ [كتاب الايمان ١٠]

کتاب وسنت ان نصوص سے بھرپور ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کسی انسان کے لیے عمل اور تصدیق کے بغیر ایمان کا حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ نصوص نماز اور زکوٰۃ کے دلائل سے بھی زیادہ ہیں۔ بے شک نماز، زکوٰۃ کی تفاصیل کو صرف سنت نے بیان کیا ہے؛ جبکہ ایمان کی تفاصیل کتاب وسنت دونوں نے بیان کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (الانفال: ٢)

''بے شک مومن تو وہ ہیں جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ (الحجرات: ١٥)

''مومن تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں، پھر شک میں نہ پڑیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (النساء: ٦٥)

''آپ کے رب کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ آپ کر دیں اس سے اپنے دل

میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔''

پس ایمان کی نفی؛ حتی کہ یہ غایت پائی جائے؛ یہ دلیل ہے کہ یہ غایت لوگوں پر فرض ہے۔ پس جس نے اس غایت کو ترک کر دیا اس کا شمار اہل وعید میں ہوگا۔ اور اس نے اس واجب ایمان کو ادا نہیں کیا؛ جس ایمان والوں سے بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے''۔ [کتاب الایمان ٣٤]

حدیث جبرئیل اور حدیث وفد عبدالقیس ؟

اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ نبی کریم ﷺ کی حدیث جبریل میں ایمان کی تفسیر میں اور حدیث وفد عبدالقیس میں ایمان کی تفسیر میں تعارض/ٹکراؤ ہے۔ اس لیے کہ حدیث جبرئیل علیہ السلام میں ایمان کی تفسیر اسلام کی تفسیر کے بعد کی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ایمان سے مراد اللہ تعالیٰ پر ایمان؛ اس کے فرشتوں پر؛ اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانا؛ ان اعمال کے ساتھ ساتھ شامل ہے جن کی تفسیر اسلام میں کی گئی ہے۔ جیسا کہ احسان ایمان کی اس تفسیر کو شامل ہے؛ جو اس سے قبل ذکر کی گئی ہے۔ بخلاف حدیث وفد عبدالقیس کے؛ اس میں ایمان کی تفسیر سے ہی ابتداء کی ہے۔ اس میں اس سے پہلے اسلام کی تفسیر نہیں کی گئی۔ لیکن یہ جواب شیخ طحاوی رحمہ اللہ کی بیان کردہ ایمان کی تفسیر کے ساتھ میل نہیں رکھتا۔ پس حدیث وفد عبدالقیس کا اشکال بدستور موجود ہے۔

ایک سوال: یہاں پر سوال کیا جاتا ہے کہ: جن اعمال ظاہرہ کو اللہ تعالیٰ نے واجب قرار دیا ہے؛ وہ ان پانچ ارکان سے زیادہ ہیں جن کا جواب رسول اللہ ﷺ سے حدیث جبرئیل علیہ السلام میں مذکور ہے۔ تو پھر یہ کیوں کہا ہے: اسلام ان پانچ ارکان کا نام ہے؟۔

جواب: بعض حضرات نے اس کا یہ جواب دیا ہے: یہ تو اسلام کے واضح اور عظیم ترین شعائر ہیں۔ اور انسان کے ان ارکان کو قائم کرنے سے ہی اس کا اسلام مکمل ہوتا ہے۔ اور ان کے ترک سے انقیاد/ اطاعت گزاری کی گرہ ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔

- حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس دین کا ذکر فرمایا ہے، جس سے مقصود بندے کا اپنے رب کے لیے مطلق طور پر مطیع ہونا ہے۔ جو تمام بندوں پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طور پر واجب ہے۔ پس ہر ایک قدرت رکھنے والے پر ان پانچ ارکان کو بجالانا واجب ہوتا ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے؛ اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ ان کے علاوہ جتنے بھی واجبات/ فرائض ہیں؛ ان کا وجوب اسباب اور مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور ان کا وجوب تمام لوگوں کے لیے عام نہیں۔ بلکہ بسا اوقات کچھ چیزیں فرض کفایہ ہوتی ہیں: جیسے جہاد؛ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر؛ اور وہ اعمال جو ان کے تابع ہیں مثلاً: امارت، فیصلہ/ قانون سازی، افتاء؛ اور حدیث بیان کرنا؛ اور ان کے علاوہ دیگر اعمال۔
- اور وہ اعمال جو لوگوں کے حقوق کی وجہ سے واجب ہوتے ہیں؛ تو یہ ان کے ساتھ خاص ہیں جن پر اور جن کے لیے واجب ہوں گے؛ اور ان اسباب کے ساقط ہونے پر وہ حقوق بھی ساقط ہوں گے۔ جیسے قرضوں کی ادائیگی، امانتوں اور غصب شدہ چیز کا واپس کرنا۔ مظالم میں انصاف، جن کا تعلق خون اور مال، اور عزت وغیرہ سے ہے۔ اور بیوی اور اولاد کے حقوق، صلہ رحمی؛ اور اس طرح کے دیگر تمام حقوق۔ پس ان میں جو کچھ زید پر واجب ہے وہ عمرو پر واجب نہیں۔ بخلاف رمضان کا روزہ، بیت اللہ تعالیٰ کا حج، پانچوں نمازوں، اور زکوٰۃ کے۔ اگرچہ زکوٰۃ کا شمار مالی حقوق میں سے ہے تاہم وہ اللہ تعالیٰ کے لیے واجب ہے۔ زکوٰۃ کے

مصارف وہ آٹھ اقسام ہیں (جن کا ذکر قرآن میں ہے)۔

اسی لیے اس میں نیت واجب ہے۔ اور جس پر زکوٰۃ فرض ہے؛ کوئی دوسرا اس کی اجازت کے بغیر نہیں دے سکتا۔ اور زکوٰۃ کا مطالبہ کفار سے نہیں کیا گیا۔ لیکن حقوق العباد میں نیت ضروری نہیں۔ اگر کوئی دوسرا اس کی اجازت کے بغیر یہ حق ادا کرے گا تو وہ بریٔ الذمہ ہوگا۔ اس کا مطالبہ کفار سے بھی ہوگا۔ اور وہ چیزیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے واجب ہیں، جیسے کفارے/کفارات؛ وغیرہ؛ ان کا سبب بندہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور ان میں ایک معنوی سزا ہے۔ اسی لیے زکوٰۃ میں مکلّف ہونا شرط ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور اس کے متبعین کے نزدیک بچے اور دیوانے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ پر مشہور و معروف ہے''۔

[کتاب الایمان ٢٥٤]

[اچھی اور بری تقدیر پر ایمان:]

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: ''تقدیر اچھی، بری، خوش گوار، نا گوار سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ گزر چکا ہے کہ: ''تیرا ایمان اچھی، اور بری تقدیر پر ہو''۔ [1]

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1] متفق علیه . البخاری ٥٠ ؛ مسلم ٨۔

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا﴾ (التوبة : ٥١)

''کہہ دو ہمیں ہرگز مصیبت نہ آئے گی مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ٥ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ (النساء: ٧٨-٧٩)

''اور انہیں اگر کوئی فائدہ پہنچے تو کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور اگر کوئی گزند پہنچتا ہے تو کہتے ہیں: یہ آپ کی وجہ سے ہے۔ فرما دیں: سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے انہیں کیا ہوا وہ تو بات نہیں سمجھتے۔ اور آپ کو جو فائدہ پہنچے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی وجہ سے ہے۔''

اعتراض: اس آیت میں ایک مقام پر ﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ کے الفاظ ہیں، دوسری جگہ پر ﴿فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ کے الفاظ ہیں، ان میں مطابقت کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟۔

جواب: ﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ سے مراد خوشحالی، بدحالی، کامیابی، اور شکست ہیں؛ یہ سب امور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ اور ''من نفسك'' سے مراد یہ ہے کہ: جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو تکلیف/ برائی پہنچتی ہے؛ وہ تمہارے اپنے گناہ کی وجہ سے بطور سزا کے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ﴾ (الشوریٰ: ۳۰)

''اور جو مصیبت تمھیں پہنچتی ہے وہ تمھارے کسب سے ہے۔''

اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ (النساء: ۷۹)

''اور جو مصیبت تجھے پہنچتی ہے وہ تیری ذات کی طرف سے ہے۔''

[اور اس سے آگے یوں پڑھا:] (وأنا كتبتها عليك) (یعنی میں نے اس کو تجھ پر لکھ دیا ہے)۔

یہاں پر حسنة/ بھلائی سے مراد نعمت ہے اور سیئة سے مراد آزمائش ہے۔ یہ صحیح ترین قول ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے: حسنة سے مراد فرمانبرداری ہے؛ اور سیئة سے مراد نافرمانی ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے: حسنه سے مراد جنگ بدر کی کامیابی اور سیئة سے مراد جنگ احد کی شکست ہے۔

پہلا قول تیسرے قول کے معنی پر مشتمل ہے؛ اور دوسرا معنی بھی پہلے معنی کے بغیر قطعاً مراد نہیں ہوسکتا۔ ہاں اس میں کچھ منافات نہیں کہ عمل کی برائی اور اس کی جزاء کی برائی؛ بذات خود مراد ہو۔ حالانکہ یہ سب چیزیں مقدر ہیں۔ بے شک دوسری نافرمانی پہلی نافرمانی کی سزا ہوتی ہے۔ پس برا بدلہ اسی لیے ملتا ہے کہ یہ اعمال برے اعمال میں سے ہیں [1]۔ اس طرح دوسری نعمت کبھی پہلی نعمت کا ثواب/ بدلہ ہوتی ہے؛ جیسا کہ اس پر کتاب وسنت دلالت کرتے ہیں''۔ [الفتاوی العراقية ۲/ ۹۸۳]

اس میں قدریہ کے حق میں کوئی ایسی چیز نہیں جو وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کریں: ﴿فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾۔

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں کتاب الایمان (۳۱۴).

بے شک ان کا عقیدہ ہے کہ بندے کا فعل اچھا ہو یا برا ہو؛ وہ بندے کی طرف سے ہی ہوتا ہے؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا۔ قرآن پاک نے دونوں میں فرق کیا ہے، لیکن یہ لوگ فرق نہیں کرتے۔ اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ''سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے''۔ جس طرح نیکیوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بتایا ہے؛ اسی طرح برائیاں بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ قدریہ اعمال؛ بلکہ جزاء تک کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھتے۔

اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ﴾ ''اور آپ کو جو فائدہ پہنچے''۔ پھر فرمایا: ﴿[وَاَصَابَكَ] مِنْ سَيِّئَةٍ﴾ ''[اور آپ کو پہنچے] ''جو بھی نقصان'' یہ بھی اسی طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ﴾ ''اور انہیں اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے''۔ اور ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ﴾۔ ''اور اگر کوئی گزند پہنچتا ہے''۔ پس اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ نے حسنات کے درمیان جو کہ نعمتیں ہیں اور سیئات کے درمیان جو کہ مصائب ہیں؛ فرق کیا ہے۔ پس نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرار دیا ہے۔ اور مصائب کو انسان کی ذات کی جانب قرار دیا ہے''۔ [الفتاوی العراقية ۲/ ۹۸۸]

اس لیے کہ نیکی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے۔ اس لیے کہ نیکی کی توفیق ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا احسان ہوتا ہے۔ اس میں کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا مگر اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ نیکی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے۔ جب کہ برائی کی تخلیق بھی کسی حکمت کی بنا پر ہوتی ہے۔ اور اس حکمت کے لحاظ سے وہ اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ہے۔ البتہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا

کوئی بھی فعل کبھی بھی برا نہیں ہوتا۔اس کے تو تمام افعال اچھے اور بہترین ہوتے ہیں۔

[اللہ تعالیٰ خالص برائی کو پیدا نہیں کرتے:]

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ دعاء استفتاح میں فرمایا کرتے تھے:

((والخير كله بِيديك ، والشر ليس إليك .))

''اور ہر قسم کی بھلائی آپ کے ہاتھ میں ہے؛ برائی تیری جانب سے نہیں ہوسکتی''۔

یعنی [اے اللہ!] بے شک آپ محض شر/ برائی کو پیدا نہیں کرتے ؛ بلکہ وہ جس چیز کو بھی پیدا کرتے ہیں؛ اس میں حکمت ہے۔ وہ فعل اس حکمت کے اعتبار سے خیر ہے۔ لیکن کبھی اس میں بعض لوگوں کے لیے برائی/ شر ہوتا ہے۔ پس یہ شر جزئی اضافی /نسبتی ہوتا ہے۔ شر کلی، یا شر مطلق سے اللہ تعالیٰ منزہ ہیں۔ اور یہ ایسا شر ہے جو اس کی جانب سے نہیں۔ پس اس کو انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف ہرگز منسوب بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس قسم کا شر کبھی عموماً مخلوقات میں داخل ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الرعد: ١٦)

''اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (النساء: ٧٨)

''سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔''

یا پھر اسے سبب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جیسے قول باری تعالیٰ ہے:

﴿مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ٥﴾ (الفلق: ٢)

''ہر اس چیز کی برائی سے جو اس نے پیدا کی۔''

یا پھر اس کے فاعل کو [بیان کرنے میں] حذف کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ جنات کا قول ہے:

﴿وَإِنَّا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا٥﴾ (الجن: ١٠)

''اور یہ کہ ہمیں معلوم نہیں کہ اہل زمین کے حق میں برائی مقصود ہے یا ان کے رب نے ان کی بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے۔''

[الفتاوى العراقية ٢/ ٩٩٩]

اور یہ ضروری نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ایسی چیز کو پیدا فرمائے جس سے بعض حیوانوں کو اذیت ہو؛ تو اس میں حکمت نہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وحکمت اتنی اور ایسی ہے کہ اس کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ جب مخلوقات میں کوئی جزوی نسبتی شر موجود ہو تو وہ بالعموم کلی شر ہو۔ بلکہ امور عامہ کلیہ عام طور پر بندوں کے لیے خیر اور مصلحت ہوتے ہیں۔ جیسے بارش کا عمومی نزول؛ رسولوں کی بعثت؛ یہ عام ہے۔

اس کا تقاضا یہ ہے کہ: ایسے کذاب انسان [جھوٹے مدعی نبوت] کی تائید ان معجزات کے ذریعہ جائز نہ ہو جن سے اللہ تعالیٰ نے

سچے انبیاءِ کرام علیہم السلام کی تائید فرمائی ہے۔ بے شک ایسا شر تو تمام لوگوں کے لیے عام ہو جائے گا؛ وہ لوگوں کو گمراہ کرے گا؛ ان کے دین و دنیا اور آخرت کو بھی خراب کرے گا۔

یہ شخص اس ظالم بادشاہ اور دشمن کی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ظالم بادشاہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اتنی برائی/ اور شر کو ختم فرماتے ہیں جو اس کے ظلم سے بہت زیادہ ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ: ''ظالم امام/ بادشاہ کا ساٹھ سال ظلم کرنا اس ایک رات سے بہتر ہے جس میں کوئیں امام/ حاکم نہ ہو۔ جب اس کے ظلم کا اندازہ لگایا جائے تو بسا اوقات ایسا ظلم دین میں بھلائی کا سبب ہوتا ہے جیسے مصائب گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں اس پر صبر کرنے سے ثواب دیا جاتا ہے؛ اور لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور اس سے اپنے گناہوں پر معافی کے طلب گار ہوتے ہیں؛ اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ کرتے ہیں۔ ایسے ہی جب دشمن مسلط کر دیا جائے [تو لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے]۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بیشتر اوقات ظالم بادشاہوں کو لمبا عرصہ تک مسلط کر دیتے ہیں۔ لیکن جھوٹے مدعیان نبوت کو زیادہ دیر استحکام نہیں ملتا۔ ان کو جلد ہی اللہ تعالیٰ تباہ و برباد کر دیتے ہیں اس لیے کہ ان کا فساد دین، دنیا، آخرت کے لیے عام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝﴾ (الحاقة: ۴۴-۴۶)

''اگر وہ ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنا لیتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ان کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔''

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''شر تیرے نفس میں ہے''۔ اس میں کئی فوائد ہیں:

بے شک بندہ اپنے نفس کے لحاظ سے اطمینان و سکون نہیں پاتا کہ شر نفس میں مخفی ہے۔ اور شر کی آمد اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور جب لوگ اس سے ناروا سلوک کرتے ہیں؛ تو وہ ان کو ملامت کرنے اور ان کی مذمت کرنے میں نہیں لگ جاتا۔ بے شک یہ بھی تو وہی برائی/تکلیف ہے جو اسے پہنچتی ہے۔ یہ برائی اسے پہنچنے کا سبب اس کے اپنے گناہ ہیں۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنے گناہوں کی جانب دھیان کرے اور اپنے نفس کی برائی اور اپنے برے اعمال سے اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ نیک اعمال میں اس کی مدد کی جائے؛ اس طرح کرنے سے اس کو ہر قسم کی خیر حاصل ہو گی اور ہر قسم کی برائی/ شر اس سے دور ہو جائے گی۔

[سورت فاتحہ: سب سے نفع بخش دعاء]

اس لیے تمام دعاؤں سے زیادہ نفع دینے والی؛ عظیم شان والی اور محکم دعا سورۂ فاتحہ کی دعا ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝﴾
(الفاتحة: ۵، ۶، ۷)

''ہم کو سیدھے رستے چلا ان لوگوں کے رستے جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا اور نہ گمراہ ہوں گے۔''

پس بے شک جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو صراط مستقیم کی ہدایت کر دیں؛ تو پھر اطاعات کی بجا آوری اور نافرمانی کے ترک کرنے پر اس کی اعانت فرمائیں گے۔ پھر اسے کسی برائی سے واسطہ نہیں پڑے گا؛ نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ لیکن چونکہ گناہ انسان کے لوازمات سے ہیں؛ اور انسان ہر لمحہ ہدایت کا محتاج رہتا ہے۔ ہدایت کے لیے اس کی حاجت کھانے پینے کی حاجت سے بڑھ کر ہوتی

ہے۔ ایسے نہیں جیسا کہ کچھ مفسرین کہتے ہیں:

''جب اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت عطا کر دی ہے تو پھر وہ ہدایت کا سوال کیوں کرے؟۔ اس لیے کہ اس سے مراد ثابت قدمی ہے یا زیادہ ہدایت کا سوال ہے۔ بلکہ ہر انسان اس بات کا زیادہ ضرورت مند ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ان احوال کی تفاصیل سے آگاہ کرے جو کچھ اس نے روزانہ کرنا ہے؛ اور جن کو چھوڑنا ہے۔ اس کو ان اعمال پر عمل کرنا الہام کر دے۔ کیونکہ جو کچھ علم حاصل کیا ہے؛ اگر اس سے مقصود عمل نہیں تو صرف علم کافی نہیں ہوسکتا اور یہ علم اس کے خلاف حجت ہوگا۔ وہ انسان ہدایت یافتہ نہیں ہوسکے گا۔ انسان محتاج ہے کہ اس کے نیک ارادہ کے مطابق اللہ تعالیٰ اسے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بے شک جو حق ہم سے مجہول ہے؛ وہ معلوم سے کئی گناہ زیادہ ہے۔ اسی طرح جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں ان سے کم وبیش یا ان کے مساوی امور وہ ہیں جن کا ہم کاہلی اور سستی کی وجہ سے ارادہ بھی نہیں کرتے۔ جن امور کا ارادہ کرنے کے باوجود ہم ان پر قادر نہیں؛ ان کا بھی یہی حال ہے۔ اور جن کاموں کو ہم اجمالی طور پر تو جانتے ہیں، لیکن ان کی تفاصیل کا علم نہیں؛ ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہم مکمل ہدایت کے محتاج ہیں۔ پس جس شخص کے پاس یہ تمام امور کامل واکمل ہوں اس کا سوال کرنا استقامت [ثابت قدمی] کا سوال ہوگا؛ اور یہ آخری مرتبہ ہے۔ ان تمام کے بعد ایک اور ہدایت بھی ہے؛ اور وہ ہے کہ آخرت میں جنت کی راہ کی طرف ہدایت۔ پس اسی لیے لوگوں کو ہر نماز میں اس دعا کا حکم دیا گیا ہے۔ چونکہ وہ اس کے بہت زیادہ محتاج ہیں۔ بلکہ اس دعا سے زیادہ کسی چیز کے محتاج نہیں۔ لہٰذا یہ جاننا بھی واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں فضل سے اس دعا کو ان تمام اسباب سے عظیم سبب قرار دیا ہے جو خیر کا تقاضا کرتے ہیں اور شر سے روکنے والے ہیں''۔ [الفتاوی العراقیة ۲/ ۱۰۳۱]

قرآن پاک نے واضح کر دیا ہے کہ برائیوں کا منبع نفس ہے۔ اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ اور تمام نیکیاں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ جب معاملہ ایسے ہی ہے؛ تو پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا شکر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور یہ کہ بندہ اپنے گناہوں پر اس سے بخشش کا طلبگار رہو۔ صرف اس اللہ وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی پر توکل نہ کرے؛ اس لیے کہ وہی نیک اعمال کی توفیق دیتا ہے۔ اس سے اس کی توحید بجالانا واجب ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا صرف اسی اکیلے کا شکر یہ ادا کیا جائے اور اسی سے مغفرت طلب کی جائے۔ رسول اکرم ﷺ نماز میں ان تمام کلمات کو جمع فرماتے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ جب آپ ﷺ رکوع سے سر اٹھاتے تو ذیل کے دعائیہ کلمات کہتے:

((رَبَّـنَا لَكَ الْحَمْد حَمْدًا كَثِيراً طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ ❶ مِلأَ السَّمٰوٰتِ وَمِلْأَ الْاَرْضِ وَمِلْأَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ اَهْلَ الثَّنَآءِ وَالْمَجْدِ اَحَقَّ مَا قَالَهُ الْعَبْدُ وَكُلُّنَا لَكَ عَبْد . ❷))

❶ بخاری ۲۴۷۶؛ ۷۷۱؛ لیکن آپ کا فعل نہیں بلکہ آپ نے ایک انسان سے یہ کلمات سنے تو آپ نے فرمایا: میں نے تیس سے زائد فرشتوں کو دیکھا، وہ ایک دوسرے سے مسابقت کر رہے تھے کہ کون ان کلمات کو پہلے لکھے دیکھیں صفة الصلوٰة للعلامه البانی ص ۱۱۹ .

❷ صحيح البخاری ٤٧٨٤ ، مسلم ٧٦١- یہ دوسری حدیث ہے؛ مؤلف نے پہلی حدیث میں اس کو داخل کر دیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی حدیث ہے۔

''اے ہمارے رب! تیرے لیے حمد ہے؛ کثرت کے ساتھ پاکیزہ برکت والی حمد؛ آسمان بھر کر، اور زمین بھر کر اور ان کے بعد

جو تو چاہے بھر کر، اے تعریف والے بزرگی والے! جو بات بندے نے کہی ہے وہ حق ہے اور ہم سب تیرے ہی بندے ہیں۔''

پس یہ اللہ تعالیٰ کی حمد ہے اور اس کا شکر یہ ادا کیا گیا ہے۔ نیز یہ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد انسان کے کلام میں سب سے سچی بات ہے۔ پھر اس کے بعد یہ دعا فرمایا کرتے:

((اَللّٰھُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلاَ مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلاَ یَنْفَعُ ذَاالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ))

''اے اللہ تعالیٰ جو کچھ تو عطا کر دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو تو روک دے اس کا کوئی دینے والا نہیں؛ کسی دولت والے کو اسکی دولت تیرے ہاں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی''۔

[مسلم (477) ابو داؤد (847) نسائی 2/198`199]

[توحید الوہیت اور توحید ربوبیت کی حقیقت:]

ان کلمات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت؛ توحید ربوبیت کی حقیقت ہے؛ تخلیق و تقدیر اور آغاز، انجام کے لحاظ سے۔ بے شک وہی عطا کرنے والا ہے وہی روکنے والا ہے۔ جس کو وہ عطیہ دے اس سے روکنے والا کوئی نہیں اور جس سے روک لے اس کو کوئی دینے والا نہیں۔ نیز توحید الوہیت کی شرعاً، امراً، نہیاً وضاحت/حقیقت ثابت ہو رہی ہے۔ بے شک اگر چہ لوگ کثرت سے مال دیے جاتے ہیں؛ بادشاہت حکومت اور عظمت سے بظاہر نوازے جاتے ہیں؛ یا باطن میں بھی۔ جیسے اصحاب المکاشفات اور خرق عادت التصرفات۔ تو کسی کو اس کی ظاہری و باطنی بزرگی تجھ سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ یعنی نہ تیرے عذاب سے اس کو بچا سکتی ہے اور نہ ہی نجات دلا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں الفاظ منك کے ہیں عندك کے الفاظ نہیں ہیں۔ اس لیے کہ لفظ عندك کی صورت میں یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ مال و دولت سے تیرا قرب حاصل نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ مال و دولت کا ہونا کبھی ضرر رساں نہیں بھی ہوتا۔ پس یہ کلام توحید کی حقیقت کو شامل ہے اور اس آیت کی حقیقت کا بیان ہے [1]:

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: مجموع الفتاوٰی لا بن تیمیه (٤/ ٣١٩).

﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ۝﴾ (الفاتحه: ٤)

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔'' [الفتاوی العراقية ٢/ ١٠٦٣]

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسباب میں سے کوئی چیز علیحدہ سے [بذات خود] مطلوب ہے؛ تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور آسانی پیدا کرنے کے ساتھ ہی ہوگی؛ تو پھر بھی واجب ہوتا ہے کہ ایک اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے ساتھ امیدیں وابستہ نہ رکھی جائیں؛ اور اس کے علاوہ کسی پر توکل نہ کیا جائے؛ اور اس کے علاوہ سے سوال نہ کیا جائے؛ اس کے علاوہ کسی سے مشکل کشائی نہ چاہی جائے اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی سے مدد طلب کی جائے۔ نہ ہی کوئی تصرف ہے اور نہ ہی کوئی قوت مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے۔ تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب اسباب میں سے کوئی بھی چیز بذات خود مطلوب ہی نہیں؟۔ بلکہ اس کے ساتھ دوسرے اسباب کو ملانا انتہائی ضروری ہے۔ نیز اس سے موانع [رکاوٹ] اور معارضات [ٹکراؤ] کو ختم کرنا بھی ضروری ہے تاکہ مقصود حاصل ہو جائے۔ پس ہر سبب کا ایک شریک سبب ہوتا ہے اور ایک مخالف۔ اگر شریک سبب اس کی معاونت نہ کرے اور مخالف اس سے دور نہ ہو؛ تو مسبب یعنی مقصود حاصل نہیں ہوگا۔ صرف بارش سے ہی سبزہ نہیں اگتا؛ جب تک اس کے ساتھ مٹی اور ہوا اور دیگر چیزیں نہ مل جائیں۔ پھر زراعت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی

جب تک اس سے تباہ کن آفات کو نہ روکا جائے۔ اسی طرح کھانا پینا بھی غذا نہیں ہوتا، جب تک بدن میں اس کو تحلیل کرنے والے اعضاء اور قویٰ موجود نہ ہوں۔ پھر ان سب کا مجموعہ بھی کارگر نہیں ہوسکتا، جب تک ان سے خرابی پیدا کرنے والی چیزوں کو دور نہ کیا جائے۔

اسی طرح وہ لوگ جو آپ کو کچھ دیتے ہیں؛ یا آپ کی مدد کرتے ہیں؛ پس وہ- حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں قوت اور فعل اور ارادہ پیدا کیا ہوا ہے- اپنے کام کو اس وقت تک پورا نہیں کرسکتے جب تک بہت سارے ایسے اسباب نہ بجالائیں جو اس کی قدرت سے باہر ہوں؛ مگر مطلوب کے حصول میں معاون ہوں۔ اگرچہ یہ شخص ایسا بادشاہ بھی کیوں نہ ہو؛ جس کی بات مانی جاتی ہو۔ پس یہ ضروری ہے کہ معاون اسباب بجالانے کے ساتھ ساتھ موانع اور معارض سے بھی دفاع ہو۔ پس مطلوب اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب مقتضی موجود ہو اور کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

اور ہر معاون سبب مقتضی کا جزء ہے۔ پس وجود میں کوئی ایک بھی ایسی اکیلی چیز نہیں ہے جو مقتضی تام ہو۔ اگرچہ اسے مقتضی کا نام دیا گیا ہو۔ اور اس کے تمام مددگار عناصر کو شروط کا نام دیا گیا ہو۔ یہ اختلاف لفظی ہے۔ اور یہ کہ مخلوقات میں ایسی علت تامہ ہو جو اس کے معلول کو مستلزم ہو؛ تو یہ باطل ہے۔

جو کوئی ان امور کی ایسی معرفت حاصل کرلے؛ جیسے معرفت کا حق ہے؛ تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی توحید کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور وہ جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی سوال کیے جانے کا مستحق نہیں؛ کجا کہ اس کے ماسویٰ کی عبادت کی جائے۔ نہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی پر توکل کرے؛ نہ کسی غیر سے اپنی امیدیں وابستہ کرے''۔[مجموع الفتاوی ۸/ ۱٦٦]

[مرسلین علیہم السلام پر بلاتفریق ایمان]

٦٧ـ((وَنَحْنُ مُؤْمِنُونَ بِذَلِكَ كُلِّهِ ﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ ﴾ وَنُصَدِّقُهُمْ كُلَّهُمْ عَلَى مَا جَاؤُا بِهِ۔))

''ہم ان تمام پر ایمان رکھتے ہیں ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔ ہم ان تمام کی تصدیق کرتے ہیں اور جو کچھ انھوں نے پیش کیا ہے''۔

تَشْرِیح:......سابقہ بیان کردہ حقائق کی طرف اشارہ ہے کہ جن پر تفصیلی ایمان رکھنا واجب ہے۔

مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان: ''ہم رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے......الخ۔ یعنی ہم ایسے تفریق نہیں کرتے کہ بعض پر رسولوں پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کردیں۔ بلکہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں؛ اوران سب کی تصدیق کرتے ہیں۔ بے شک جو شخص بعض رسولوں پر ایمان لاتا ہے اور بعض کا انکار کرتا ہے وہ درحقیقت تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا منکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ (النساء: ۱۵۰، ۱۵۱)

''اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں؛ اور وہ چاہتے ہیں اس کے درمیان کی راہ نکال لیں۔ وہی لوگ پکے کافر ہیں۔''

بلا شک وشبہ جس معنی کی وجہ سے وہ ان رسولوں پر ایمان لایا ہے؛ جن پر ایمان کا وہ اقرار کررہا ہے؛ وہی معنی ان رسولوں میں بھی پایا جاتا ہے جن کا وہ انکار کررہا ہے۔ اور یہ رسول جس پر وہ ایمان لایا ہے؛ وہ خود دوسرے تمام مرسلین علیہم السلام کی تصدیق کا پیغام لے کر آیا ہے۔ پس جب وہ بعض رسولوں پر ایمان نہیں رکھتا تو وہ ان رسولوں کا بھی منکر ہے جن کے متعلق اس کا خیال ہے کہ وہ ان پر ایمان لایا ہے۔ اس لیے کہ وہ رسول خود تمام انبیاء ومرسلین کی تصدیق لیکر آیا ہے۔ پس اس کا منکر پکا کافر ہے۔ بھلے وہ اپنے آپ کو مومن سمجھتا ہو۔ لیکن درحقیقت وہ اس کا شمار ان میں ہوتا ہے [جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے]:

﴿ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا (۱۰۳) اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (۱۰۴)﴾ [الکھف]

''جو اعمال کے لحاظ سے خسارے میں ہیں، جن کی دنیوی زندگی کی کوششیں اکارت ہوگئیں؛ وہ اس خیال میں مبتلا رہا کہ وہ اچھے کام کررہا ہے''۔

[امت محمد ﷺ کے اہل کبائر کا حکم]

٦٨۔((وَأَهْلُ الْكَبَائِرِ [مِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ] [1] فِي النَّارِ لاَ يُخَلَّدُونَ إِذَا مَاتُوا وَهُمْ مُوَحِّدُونَ وَإِنْ لَمْ يَكُونُوا تَائِبِينَ بَعْدَ أَنْ لَقُوا اللّٰهَ عَارِفِينَ [مُؤْمِنِينَ] وَهُمْ فِي مَشِيئَتِهِ وَحُكْمِهِ إِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُمْ وَعَفَا عَنْهُمْ بِفَضْلِهِ كَماَ ذَكَرَ عَزَّ وَجَلَّ فِي كِتَابِهِ: ﴿وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [2] (النساء: ٤٨) وَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهُمْ فِي النَّارِ بِعَدْلِهِ ثُمَّ يُخْرِجُهُمْ مِنْهَا بِرَحْمَتِهِ؛ وَشَفَاعَةِ الشَّافِعِينَ مِنْ أَهْلِ طَاعَتِهِ ؛ ثُمَّ يَبْعَثُهُمْ إِلَى جَنَّتِهِ وَذَلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ تَوَلَّى [3] أَهْلَ مَعْرِفَتِهِ وَلَمْ يَجْعَلْهُمْ فِي الدَّارَينِ كَأَهْلِ نُكْرَتِهِ الَّذِينَ خَابُوا مِنْ هِدَايَتِهِ وَلَمْ يَنَالُوا مِنْ وِلاَيَتِهِ . اللّٰهُمَ يَا وَلِيَّ الإِسْلاَمِ وَأَهْلِهِ ثَبِّتْنَا عَلَى الإِسْلاَمِ حَتّٰى نَلْقَاكَ بِهِ [4] .))

''امت محمد یہ ﷺ کے اُہل کبائر دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے؛ جب وہ اس حال میں مرے ہوں کہ توحید پرست ہوں؛ اگر چہ انہوں نے توبہ بھی نہ کی ہو۔اور جب ان کی ملاقات اللہ تعالیٰ سے ہو تو وہ اس کی معرفت اور اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور حکم کے تحت ہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے فضل وکرم سے ان کو بخش دے اور معاف کر دے جیسا کہ کتاب اللہ تعالیٰ میں ہے:

﴿وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء: ٤٨)

---

[1] ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: [] بین القوسین عبارت تین مخطوطات میں نہیں مل سکی۔اس کو حذف کر دینا ہی زیادہ صحیح ہے۔اس لیے کہ اس سے مفہوم یہ نکلتا ہے کہ امت محمد ﷺ کے علاوہ دوسری امتوں کے گنہگار؛ ان شریعتوں کے منسوخ ہونے سے قبل؛ ان کا حکم امت محمد یہ کے لوگوں سے الگ ہے۔ یہ بات محل نظر ہے۔اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:''جس کے دل میں ایک ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا اسے جہنم سے نکالا جائے گا''۔اس میں امت محمد ﷺ کی کوئی تخصیص وارد نہیں ہوئی۔ بلکہ مطلق طور پر ایمان کا ذکر ہے۔اس پر غور کریں۔

اور یہ بھی جان لیں کہ کبیرہ گناہ کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ان میں سب سے عمدہ قول یہ ہے کہ: ہر وہ گناہ جس پر حد مرتب ہوتی ہو؛ یا اس کے کرنے والے کو جہنم کی وعید ملی ہو؛ یا اس پر لعنت کی گئی ہو؛ یا اس پر غضب کا اظہار ہو؛ وہ کبیرہ گناہ ہے''۔[دیکھیں: شرح/مجموع الفتاوی ۱۱/ ۶۵۰]

[2] ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شرک کفر ہی ہے؛ شریعت میں ان کے مابین کوئی فرق نہیں۔ ہر کفر شرک ہے؛ اور ہر شرک کفر ہے۔جیسا کہ سورہ کہف میں ایک مؤمن کا دو باغوں والے سے مکالمہ اس پر دلالت کرتا ہے۔اس پر توجہ دیں؛ اس سے آپ کے بہت سارے اشکالات ختم ہو جائیں گے۔اور تمام تر تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں جس کے نعمت سے نیک اعمال پورے ہوتے ہیں۔

[3] ۔ یہاں پر تَوَلّی: کے الفاظ شیخ البانی رحمہ اللہ کی تعلقیات والے نسخہ اصلی عقیدہ طحاوی سے لیے ہیں۔اور یہی الفاظ سیاق وسباق کے ساتھ مناسب لگتے ہیں؛ جب کہ شیخ البانی رحمہ اللہ والے شرح ہذا کے نسخہ میں''مولَی'' کے الفاظ ہیں۔قارئین آگاہ رہیں۔دراوی۔

[4] ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ دعا مرفوع حدیث میں وارد ہوئی ہے۔جس کی الصحیحة (۱۸۲۳) میں تخریج کر دی گئی ہے۔جیسا کہ میں اس کا ذکر شرح کی تخریج میں بھی کیا ہے۔وہاں پر غلطی سے نمبر (۱۸۳۳) لکھا گیا ہے۔اس کی تصحیح کرنا واجب ہو گیا تھا۔

''اس کے سوا جس کو چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔''

اور اگر چاہے تو اپنے عدل کے ساتھ ان کو عذاب میں گرفتار کرے؛ پھر اپنی رحمت سے اور اطاعت گزار شافعین کی شفاعت سے انھیں عذاب سے نجات عطا فرمائے؛ پھر انھیں جنت میں بھیج دے۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دوست ہے جو اس کی معرفت رکھتے ہیں؛ اور وہ دونوں جہانوں میں ان کا حال ان لوگوں کی طرح نہیں کریگا؛ جو اس کی معرفت نہیں رکھتے؛ جو اس کی ہدایت سے محروم ہیں؛ اور اس کی دوستی نہیں پا سکے۔ اے اللہ! اے اسلام اور اہل اسلام کے متولی! ہمیں اسلام پر استقامت عطا فرما حتی کہ ہم تجھ سے اسلام کی حالت میں ہی ملاقات کریں''۔

تشریح:......شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: ''امت محمدیہ ﷺ کے اہل کبائر دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے جب وہ توحید پر فوت ہوئے ہوں''۔ اس وضاحت سے خوارج اور معتزلہ کا رد مقصود ہے، جو کہتے ہیں کہ کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں ہی رہیں گے۔ البتہ خوارج ان کو کافر کہتے ہیں۔ اور معتزلہ ان کو ایمان سے خارج سمجھتے ہیں؛ لیکن ان کو کافر نہیں کہتے۔ بلکہ ان کا ایک تیسرا درجہ ہے جو ان دو درجوں کے درمیان میں ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے اس بحث میں گزر چکی ہے کہ: ہم اہل قبلہ میں سے کسی گنہگار کو کافر نہیں کہتے جب تک وہ اسے حلال نہ سمجھے''۔

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: ''امت محمدیہ ﷺ کے اہل کبائر'' اس میں امت محمدیہ ﷺ کی تخصیص ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری امتوں کے اہل کبائر جو ان شریعتوں پر ان کے منسوخ ہونے سے قبل عمل کرتے رہے؛ ان کا حکم امت محمدیہ جیسا نہیں۔ یہ بات محل نظر ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں بتایا ہے:

''دوزخ سے ان لوگوں کو نکال لیا جائے گا جن کے دلوں میں ذرہ برابر ایمان ہوگا''۔ [1]

اس حدیث میں امت کی تخصیص نہیں؛ بلکہ یہاں پر مطلق ایمان کا ذکر ہے۔ اس پر غور کریں۔ بعض نسخوں میں لفظ امت کا ذکر نہیں۔ اور ترکیب کے لحاظ سے ''فِي النَّارِ'' کا لفظ ''لَا يَخْلِدُوْنَ'' کا معمول ہے۔ صرف عبارت میں سجع کی رعایت کے باعث اس کو مقدم کر دیا ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے کہ لفظ ''فِي النَّارِ؛ اَهْلُ الْكَبَائِرْ'' کی خبر ہے جیسا کہ بعض شارحین کا خیال ہے۔

[1] بخاوی و مسلم، الظلال الجنة (۸۴۹۔ ۸۵۲).

[کبائر میں علماء کا اختلاف]:

کبیرہ گناہوں کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ اس میں کئی اقوال ہیں:

۱۔ بعض نے سات کہا ہے۔

۲۔ بعض نے سترہ کہا ہے۔

۳۔ بعض نے کہا ہے: جس کی حرمت پر تمام شرائع متفق ہیں۔

۴۔ بعض نے کہا ہے: جن کے ارتکاب سے معرفت الٰہی کا دروازہ بند ہو جائے۔

۵۔ بعض نے کہا ہے: جن کے ارتکاب سے مال اور جسم کا تحفظ ختم ہو جائے۔

۶۔ بعض نے کہا ہے: ان کا نام کبائر اپنے سے چھوٹے گناہ کی طرف نسبت اور اضافت کے اعتبار سے ہے۔

۷۔ بعض نے کہا ہے: ان کی اصلیت نہیں معلوم ہوسکتی۔ اور انہیں لیلۃ القدر کی طرح مخفی رکھا گیا ہے۔

۸۔ بعض نے ان کی تعداد ستر گنوائی ہے۔

۹۔ بعض کا خیال ہے: ہر وہ گناہ جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہو؛ وہ کبیرہ ہے۔

۱۰۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ''جس کے ارتکاب پر حد کا نفاذ ہوتا ہے؛ یا جس کے ارتکاب پر دوزخ کی وعید آئی ہے۔ یا اس کو لعنت اور غضب الٰہی کا سبب قرار دیا ہے، یہ قول سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح صغیرہ گناہوں کی تعریف میں بھی سلف صالحین کی عبارات مختلف ہیں۔:

۱۔ بعض نے کہا صغیرہ وہ گناہ ہے جس پر دونوں حدوں میں سے کوئی ایک حد بھی نہ ہو؛ نہ دنیا کی حد نہ آخرت کی حد۔

۲۔ بعض نے کہا ہے: ہر وہ گناہ جس کے آخر میں لعنت یا غضب یا جہنم کا ذکر نہ ہو۔

۳۔ بعض نے کہا ہے: ہر وہ گناہ جس پر دنیا میں کچھ حد نہیں اور آخرت میں کچھ وعید نہ ہو۔ وعید سے مراد دوزخ کی وعید، لعنت اور غضب باری تعالیٰ کی وعید ہے۔ اس لیے کہ آخرت کی خاص وعید ویسے ہی ہے جیسے دنیا میں خاص عقوبت۔ میری مراد طے شدہ عقوبت ہے۔ پس دنیاوی تعریز اس وعید کی مثل ہے جس میں دوزخ؛ یا لعنت یا غضب باری تعالیٰ کا ذکر نہ ہو۔ یہ ایسا قاعدہ ہے جو ان تمام اعتراضات سے بالکل محفوظ ہے جو دوسرے قواعد پر وارد ہو رہے ہیں۔ اس قاعدہ میں ہر وہ گناہ داخل ہے جس کا کبیرہ ہونا نص کے ساتھ ثابت ہے جیسے شرک، قتل، زنا، جادو، پاک دامن غافل مومن عورتوں پر تہمت؛ اس طرح اور گناہ بھی ہیں جیسے میدان جنگ سے بھاگنا، یتیم کا مال کھانا، سود کھانا، والدین کی نافرمانی کرنا، جھوٹی قسم اٹھانا، جھوٹی گواہی دینا وغیرہ۔

اس قول کے راجح ہونے کے کچھ اسباب ہیں۔ ان میں سے:

پہلا سبب: یہ قول حضرات سلف صالحین رحمہم اللہ علیہم، جیسے حضرت ابن عباس، ابن عیینہ، ابن حنبل وغیرہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔

دوسرا سبب: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ (النساء: ۳۱)

''تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے اجتناب رکھو گے تو ہم تمھارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے اور تمھیں عزت کے مکانوں میں داخل کریں گے۔''

اس کریمانہ وعدہ کا حق دار وہ انسان نہیں ہوسکتا جس کو اللہ تعالیٰ کے غضب، لعنت اور دوزخ کی وعید سنائی گئی ہو۔ اور نہ ہی وہ شخص اس قابل ہے جس پر حد شرعی قائم کیے جانے کا حق دار ہو۔ صرف کبائر سے احتراز کرنا اس کی برائیوں کا کفارہ نہ ہوگا۔

تیسرا سبب: اس قاعدے کا تعلق ان گناہوں کے ساتھ ہے جن کا ذکر کتاب اللہ تعالیٰ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے ان گناہوں پر حد کا نفاذ شارع کے خطاب سے معلوم ہو رہا ہے۔

چوتھا سبب: بے شک اس بیان کردہ قاعدہ سے کبائر اور صغائر میں فرق ممکن ہے؛ بخلاف دیگر اقوال کے؛ جن میں سات یا سترہ یا ستر کا کہا گیا ہے۔ یہ قول صرف دعویٰ ہونے کے زیادہ قریب ہے۔ اور جن حضرات نے کہا ہے: ''کبیرہ وہ ہیں جن کی حرمت پر تمام

شریعتوں کا اتفاق ہے؛ اختلاف نہیں''۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ شراب نوشی؛ میدان جہاد سے بھاگنا؛ بعض محرکات سے نکاح کرنا؛ اور رضاعت کی وجہ سے یا سسرالی تعلق کی وجہ سے محرم سے نکاح کرنا؛ اور اس طرح کے دیگر گناہ؛ ان سب کو کبائر کی فہرست سے خارج کر دیا جائے۔

[شیخ عفیفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب: مدارج السالکین ص ۳۱٦؛ اور صفحہ ٤٩٤ تا ٤٩٧۔ مجموع الفتاوی ١١/ ٦٥٠۔]

❀ اور یتیم کے مال سے ایک دانہ چوری کرنا، ہلکا سا جھوٹ بولنا وغیرہ کبائر کی فہرست میں داخل ہو جائیں؛ حالانکہ یہ قول فاسد ہے۔ اور جس کسی نے کبیرہ گناہ کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ''جس سے معرفت باللہ کا دروازہ بند ہو جائے؛ یا مال اور جان ضائع ہو جائے؛ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ شراب نوشی، خنزیر، مردار اور خون کھانا اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا کبیرہ گناہ شمار نہ ہوں۔ یہ قول بھی فاسد ہے۔ اور جس نے کہا ہے: ان کو اپنے سے چھوٹے گناہ کی نسبت کے لحاظ سے کبیرہ کہا جاتا ہے؛ یا ہر وہ چیز جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے وہ کبیرہ ہے۔ تو اس کا تقاضا ہے کہ گناہوں کی صغیرہ اور کبیرہ میں تقسیم نہ کی جائے۔ یہ قول بھی فاسد ہے۔ کیونکہ یہ بات ان نصوص کے خلاف ہے جو گناہوں کو صغائر، کبائر دو قسموں میں تقسیم کرتی ہیں۔ اور جس نے یہ کہا ہے: کہ کبائر کا علم ہی نہیں ہے؛ یا کبائر مبہم ہیں؛ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ انسان اپنی ذات کے متعلق خبر دے رہا ہے کہ اسے ان کا کوئی پتہ نہیں؛ تو اس کی لاعلمی اس راہ میں رکاوٹ نہیں ہو سکتی کہ دوسرے لوگ ان کو جانتے ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم [1]

☼ تفصیل کے لیے دیکھیں: مجموع الفتاوی (٣/ ٢٨٠)، مدارج السالكين لابن القيم (ص ٤٩٤ الیٰ ٤٩٧).

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: ''اگرچہ وہ تائب نہ ہوں''۔ اس لیے کہ توبہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے اس میں کچھ اختلاف نہیں۔ اس میں اختلاف توبہ نہ کرنے والے کے بارے میں ہے''۔

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''جب اللہ تعالیٰ سے ان کی ملاقات ہو تو ان میں اللہ تعالیٰ کی معرفت ہو''۔

اگر عارفین [معرفت] کے بجائے مؤمنین [ایمان] کہا جاتا تو بہتر تھا۔ اس لیے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت تو ہو مگر ایمان نہ لائے؛ تو وہ کافر ہے۔ جہم بن صفوان نے کہا ہے صرف معرفت ہی کافی ہے۔ لیکن اس کا قول باطل ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابلیس لعین کو بھی اللہ تعالیٰ کی معرفت تھی۔ اس نے کہا تھا:

﴿قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ۝﴾ (الحجر : ٣٦)

''کہا میرے رب! مجھے اس دن تک مہلت دے جب وہ زندہ کیے جائیں گے''۔

نیز اس نے یہ بھی کہا تھا:

﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ۝﴾ (ص : ٨٢، ٨٣)

''کہا: تیری عزت کی قسم! میں ضرور ان سب کو گمراہ کروں گا؛ سوائے تیرے مخلص بندوں کے''۔

اسی طرح فرعون اور اکثر کفار کو یہ معرفت حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (لقمان : ٢٥)

''اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ بول اٹھیں گے اللہ تعالیٰ نے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ٥ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ﴾(المومنون: ۸۴، ۸۵)

''کہو کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ زمین اور جو کچھ اس میں ہے کس کا مال ہے، جھٹ کہیں گے: اللہ تعالیٰ کا۔''

ان کے علاوہ بھی بہت ساری آیات ہیں جو اس معنی پر دلالت کرتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے شیخ طحاوی رحمہ اللہ معرفت سے معرفت کاملہ مراد لیتے ہیں جو ان کے ہدایت یافتہ ہونے کو مستلزم ہے جس کی طرف اہل طریقت بھی اشارہ کرتے ہیں۔ حاشا وکلا کہ یہ ایسے لوگ کبائر کا ارتکاب کرنے والوں میں سے ہوں بلکہ وہ تو لوگوں کے سردار اور خواص لوگ ہیں۔

[کبیرہ کا مرتکب اور اللہ تعالیٰ کی مرضی:]

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''وہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور اس کے حکم کے تحت ہیں، اگر چہ اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے فضل کے ساتھ انھیں معاف فرما دے؛ اور ان سے درگزر کر دے............الخ''۔

اللہ تعالیٰ نے شرک اور دوسرے گناہوں میں فرق کیا ہے، اس لیے کہ شرک اکبر الکبائر ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے؛ اور اللہ تعالیٰ نے آگاہ کیا کہ شرک نا قابل مغفرت گناہ ہے۔ اور اس سے کم درجہ کے دیگر گناہوں کی معافی کو اپنی مشیئت کے ساتھ معلق فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے ساتھ معلق کرنا جائز ہے ممتنع نہیں۔ کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی مغفرت توبہ کے بعد قطعی یقینی ہے؛ وہ مشیئت کے ساتھ معلق نہیں ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ٥﴾ (الزمر: ۵۳)

''فرما دیجیے: اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید نہ ہونا اللہ تعالیٰ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

تو واجب یہ ٹھہرا کہ جن گناہوں کا معاف کرنا اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے ساتھ معلق ہے وہ شرک سے کم تر گناہ ہیں اور جو توبہ سے پہلے کے ہوں۔

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اہل معرفت کے دوست ہیں''۔ اس میں ایک لطیف مؤاخذہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''اے اللہ! اے اسلام اور اہل اسلام کے محافظ! ہمیں اسلام میں استقامت عطا فرما''۔ بعض نسخوں میں ہے:

''ہمیں اسلام پر ثابت قدم رکھ! حتی کہ ہماری تیرے ساتھ ملاقات ہو''۔

شیخ الاسلام ابو اسماعیل انصاری نے اپنی کتاب ''الفاروق'' میں اپنی سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی تھی:

((یا ولی الإسلام وأهلِهِ، مسّكْنِی بِالإِسلامِ حتی ألقاك علیهِ.)) ❶

''اے اسلام اور اہل اسلام کے محافظ مجھے اسلام پر کاربند رکھ حتی کہ میری تیرے ساتھ ملاقات بھی اسی پر ہو''۔

❶ الضیاء المقدسی فی المختارۃ: ق (۱۵۰/ ۱) طبرانی نے اپنی سند سے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے؛ اس کی سند جید ہے۔ جیسا کہ میں نے احادیث صحیحہ (۱۸۲۳) میں اس کی تحقیق کی ہے۔ دیکھیں مقدمہ طبع سوم ص (۲)۔

متقدم کلام کو اس دعا پر ختم کرنے کی مناسبت ظاہر ہے۔ اسی قسم کی دعا حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی کی تھی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی:

﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ (یوسف: ۱۰۱)

''میرے رب! تو نے مجھے حکومت دی اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا، آسمانوں اور زمین کے خالق! تو دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے، تو مجھے اپنی اطاعت پر فوت کرنا اور اپنے نیک بندوں میں داخل کرنا۔''

اور یہی دعا ان جادوگروں نے کی جو پہلے پہل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، انھوں نے کہا:

﴿رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ﴾ (الاعراف: ۱۲۶)

''اے ہمارے رب ہم پر صبر بہادے؛ اور ہمیں مسلمان ہی مارنا۔''

اور جس کسی نے ان دونوں آیات سے موت کی آرزو کے جواز پر استدلال کیا ہے؛ اس کے حق میں ان آیات میں کوئی دلیل نہیں۔ بے شک یہاں پر دعا صرف اسلام پر موت آنے کی دعا ہے؛ نہ کہ مطلق موت کی دعا۔ اور نہ ہی ابھی اس وقت میں موت آنے کی دعا ہے۔ دونوں میں فرق صاف واضح ہے۔

[اہل قبلہ کے پیچھے نماز]

٦٩۔((وَنَرَى الصَّلَاةَ خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ وَعَلَى مَنْ مَاتَ مِنْهُمْ ① .))

''ہم ہر نیک و بد اہل قبلہ کے پیچھے نماز کو درست سمجھتے ہیں اور ان میں جو مر جائے اس پر نماز جنازہ ادا کرنا بھی درست مانتے ہیں''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی دلیل اس پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا عمل ہے؛ اس کی وضاحت آپ کو اس کتاب کی شرح میں مل جائے گی۔ پس ان کا عمل بطور حجت پیش کرنا ہی کافی ہے۔ اور ائمہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی ہے: ''وہ تمہیں نمازیں پڑھائیں گے؛ اگر درست پڑھیں گے تو ان کی نماز بھی درست اور تمہاری بھی۔ اور اگر وہ غلطی کریں گے تو تمہاری نمازیں درست ہوں گی؛ اور ان کی غلطی کا بوجھ ان پر ہی ہوگا''۔[أخرجه البخاري؛ وأحمد وأبويعلى؛]۔ اور ان پر نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں بھی کافی دلائل ہیں۔ انہیں ''احکام الجنائز (ص ۷۹) میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور رہ گئی یہ حدیث: (صلوا خلف كل بر وفاجر وصلوا على كل بر وفاجر ۔) ''ہر بد اور نیک کے پیچھے نماز پڑھ لو؛ اور ہر نیک اور بد کی نماز جنازہ پڑھ لو''۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ شرح عقیدہ طحاویہ میں میں نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اور ضعیف ابی داؤد (۹۷) میں بھی اس کی وضاحت کی ہے۔(الإرواء ۵۲۰)۔ بدکار کے پیچھے نماز کے صحیح نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور یہ حدیث ''اپنے ائمہ بہترین لوگوں کو بناؤ'' اس کی سند انتہائی سخت ضعیف ہے۔ جیسا کہ (الضعيفة ۱۸۲۲) میں اس کی تحقیق میں موجود ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح بھی ثابت ہو جائے تو پھر بھی اس میں بہترین لوگوں کو امام بنانے کے واجب ہونے پر کوئی دلیل نہیں ملتی۔ یہ تو ایک علیحدہ چیز ہے؛ اور فاسق کے پیچھے نماز کا باطل ہونا ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔ خصوصاً جب اسے حکام کی طرف سے امام مقرر کیا گیا ہو۔ اور اگر یہ حدیث صحیح ثابت ہو جائے: کہ کوئی فاجر کسی مؤمن کی امامت نہ کرے'' تو اس میں ظاہری طور پر اس کی امامت کے باطل ہونے پر دلیل بنتی تھی۔ لیکن یہ حدیث بھی سند کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔ دیکھو:(الإرواء ۵۹۱)۔

تَشْرِیح:...... جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''ہر نیک اور بدکردار کی اقتداء میں نماز ادا کرو''۔ ❶

یہ حدیث مکحول نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اور اسے دارقطنی نے ذکر کیا ہے؛ اور کہا ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مکحول کی ملاقات نہیں ہوئی۔ نیز اس کی سند میں معاویہ بن صالح متکلم فیہ ہے۔ امام مسلم نے صحیح مسلم میں اس کو قابل حجت سمجھا ہے؛ اور اس سے حدیث روایت کی ہے۔ نیز دارقطنی اور ابوداؤد نے مکحول کی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر مسلمان خواہ نیک ہو یا بد؛ اس کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرنا تم پر واجب ہے۔ اگرچہ وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہی ہو۔ نیز ہر امیر کے ساتھ مل کر جہاد کرنا تم پر واجب ہے؛ بھلے وہ امیر نیک ہو یا بد؛ بھلے وہ کبائر کا مرتکب ہو''۔ ❷

❶ حدیث ضعیف ہے سند میں مکحول اور ابوہریرہ کے درمیان انقطاع ہے۔ ضعيف سند ابی داؤد (۹۷).

❷ حدیث ضعیف ہے اس میں علت انقطاع ہے۔ الارواء الغليل (۵۲۷)

بخاری میں ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حجاج بن یوسف ثقفی کی اقتداء میں نمازیں ادا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بھی کیا کرتے تھے۔ حالانکہ حجاج بن یوسف فاسق اور ظالم انسان تھا۔ نیز صحیح بخاری میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''أئمہ تمھاری نمازوں کی امامت کرائیں گے۔ اگر وہ درست نمازیں پڑھیں گے تو تمھاری اور ان کی نمازیں درست ہوں گی۔ اور اگر وہ غلط کریں گے؛ تو تمھاری نمازیں صحیح ہوں گی؛ ان کا بوجھ ان پر ہوگا''۔ ❶

نیز حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر اس شخص کی اقتداء میں نماز ادا کرو جو ''لا الٰہ الا اللہ'' کہتا ہے۔ نیز اس شخص کا جنازہ پڑھو ''لا الٰہ الا اللہ'' کہنے والوں میں سے ہو''۔ (دار قطنی نے اس کو کئی اسناد سے روایت کیا ہے؛ اور کمزور کہا ہے۔) ❷

❶ صحیح ہے مسند احمد میں بھی ہے۔ مختصر البخاری (رقم ۳۸۳)

❷ حدیث ضعیف ہے۔

-اللہ تعالیٰ ہم پر اور آپ پر رحم فرمائے- انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ ایسے شخص کی اقتداء میں نماز ادا کرے جس سے کسی بدعت یا فسق کا علم نہ ہو، اس پر تمام أئمہ کا اتفاق ہے۔ اقتداء کی شرائط سے یہ نہیں ہے کہ مقتدی کو اپنے امام کے عقیدہ کا علم ہو۔ اور نہ یہ کہ اس کے عقیدہ کا امتحان لے: آپ کا عقیدہ کیا ہے؟۔ بلکہ مستور الحال کے پیچھے نماز ادا کرلے۔ اگر ایسے بدعتی کے پیچھے نماز ادا کرلی؛ جو اپنی بدعت کی طرف دعوت بھی دیتا ہے؛ یا کھلم کھلا فاسق ہو؛ اور وہی مقرر امام ہے؛ اس کے پیچھے نماز کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو؛ جیسے جمعہ عیدین کا امام؛ اور [حج میں] نماز عرفہ کا امام؛ اور اس طرح کا دیگر کوئی۔ تو مقتدی اس کی اقتداء میں ہی نماز ادا کرلے؛ سلف، خلف أئمہ کا یہی مسلک ہے۔ اور جو کوئی جمعہ، جماعت فاجر امام کے پیچھے نہیں پڑھتا، اکثر علماء کے نزدیک وہ بدعتی ہے۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ وہ اس کی اقتداء میں نماز ادا کرے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فاسق فاجر أئمہ کی اقتداء میں جمعہ اور باجماعت نماز ادا کرتے اور پھر اس کا اعادہ نہ فرماتے؛ جس طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز ادا کرلیتے تھے۔ یہی حال حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا تھا؛ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ولید بن عقبہ بن ابی معیط کی اقتداء میں نماز ادا کرلیتے۔ حالانکہ وہ شراب پیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے صبح کی نماز چار رکعت پڑھا دی۔ اور پوچھنے لگا: اور پڑھاؤں؟۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آج ہم تو پہلے ہی تمہارے ساتھ زیادہ پڑھ چکے ہیں''۔ صحیح بخاری میں ہے جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ ہوا تو ایک شخص نے امامت کرائی۔ ایک شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: آپ عوام کے امام ہیں؛ اور یہ شخص فتنہ باز لوگوں کا امام ہے؟۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میرے بھتیجے! نماز بہت اچھا عمل ہے جب لوگ اچھے کام کریں تو آپ بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر اچھے کام کرو اور جب لوگ برے عمل کریں تو آپ ان سے کنارہ کش رہیں''۔ ❶

❶ حدیث صحیح ہے۔ بخاری، کتاب الاذان، مختصر البخاری (رقم: ۳۸٤)

فاسق اور بدعتی کی نماز بذات خود درست ہے؛ جب مقتدی اس کے پیچھے نماز ادا کرے تو اس کی نماز باطل نہ ہوگی، لیکن جس نے اس کے پیچھے نماز ادا کرنے کو مکروہ جانا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے۔

ہاں جو شخص بدعات اور فسق و فجور کو شہرت دیتا ہے اس کو مسلمانوں کا امام نہ بنایا جائے وہ تعزیز کے قابل ہے، حتی کہ توبہ کرلے۔ اگر اس سے بائیکاٹ کرنا ممکن ہے حتی کہ وہ توبہ کرے تو یہ مستحسن ہے۔ اور جب کچھ لوگ اس جیسے شخص کے پیچھے نماز ترک کردیں گے اور کسی

دوسرے کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے؛ تو اس کا اثر انکارِ منکر پر ضرور ہوگا۔حتی کہ وہ یا تو تائب ہوگا؛ یا اس کو معزول کر دیا جائے گا؛ یا لوگ اس قسم کے گناہوں سے بچ جائیں گے۔ جب اس طرح کے انسان کے پیچھے نماز ترک کی جائے تو اس میں شرعی مصلحت ہوتی ہے۔اور مقتدی سے جمعہ اور باجماعت نماز نہیں چھوٹتی۔ ہاں اگر اس کے پیچھے نماز چھوڑنے سے جمعہ اور باجماعت نماز فوت ہو رہی ہو؛ تو اس صورت میں اس کے پیچھے نماز صرف بدعتی ہی چھوڑے گا جو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم [کے طریقے] کا مخالف ہوگا۔اسی طرح جب حاکم وقت نے کسی کو امام متعین کیا ہو؛ اور اس کی اقتداء میں نماز ترک کرنے میں کوئی شرعی مصلحت نہ ہو۔تو اس کے پیچھے نماز ترک نہیں کی جائے گی۔ بلکہ اس کی اقتداء میں نماز ادا کرنا افضل ہے۔ ❶ جہاں تک کسی انسان کے لیے ممکن ہو کہ وہ امامت کے لیے کسی کھلم کھلا بد کردار کو آگے نہ کرے؛ تو اس پر ایسا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔لیکن اگر اس کو کسی دوسرے نے متعین کیا ہو؛ اور اسے امامت سے ہٹانا ممکن نہ ہو؛ یا پھر اس کو امامت سے ہٹانا اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کی برائی کے ضرر سے بڑا ضرر واقع ہو؛ تو اس صورت میں چھوٹے فساد کو بڑے فساد سے ختم کرنا جائز نہیں اور نہ ہی بڑے ضرر سے چھوٹے ضرر کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

❶ مجموع الفتاوی (۲۳/۳۴۲-۳۶۰) کا مطالعہ کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شریعت مصلحت کا حصول اور اس کی تکمیل؛ خرابیوں کے خاتمے اور ان کو کم کرنے کے مقاصد لے کر آئی ہے۔ پس جمعہ، جماعت کو فوت کرنے میں؛ فاجر امام کے پیچھے یہ نمازیں پڑھ لینے سے بڑا نقصان ہے۔خصوصاً جب اس اقتداء نہ کرنے سے اس کا فسق و فجور ختم نہ ہوتا ہو۔تو شرعی مصلحت ایسے ہی معطل/بے کار رہے گی؛ اور اس سے کسی خرابی کا ازالہ نہ ہوگا۔البتہ اگر جمعہ یا باجماعت نماز کسی نیک انسان کے پیچھے ادا کرنا ممکن ہو؛ تو فاجر امام کے پیچھے نمازیں ادا کرنے سے یہ بہتر ہے۔اس صورت میں اگر وہ بلا عذر کسی فاسق، فاجر کے پیچھے نماز ادا کرے؛ تو یہ علماء کے مابین مقام اجتہاد/اختلاف ہے۔بعض علماء نے کہا ہے:''وہ نماز کا اعادہ کرے''۔بعض علماء نے کہا ہے:''نماز کا اعادہ نہ کرے''۔تفصیل کے لیے فروعی مسائل کی کتابوں میں موجود ہے۔

ہاں اگر امام جب بھول جائے یا اس سے خطا ہو جائے؛ مقتدی کو اس کے حال کا علم نہ ہو؛ تو مقتدی پر نماز کا اعادہ نہیں ہے۔جیسا کہ ایک حدیث میں گزر چکی ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے لوگوں نے نماز پڑھی [آپ نے امامت کروائی]؛ آپ جنابت کی حالت میں تھے؛ مگر آپ جنابت کو بھول گئے تھے۔پھر آپ نے تو نماز کا اعادہ کر لیا؛ مگر مقتدیوں کا اعادہ کا حکم نہ دیا ❷۔

❷ حدیث صحیح ہے۔ مصنف عبدالرزاق (۲/ ۳۴۷۔ ۳۴۹)۔ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/ ۳۹۳).

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر مقتدی کو نماز ادا کرنے کے بعد علم ہوا کہ امام بے وضو تھا تو وہ نماز کا اعادہ کرے، امام شافعی، امام احمد اپنے مشہور قول میں، اور امام مالک رحمہم اللہ ان کے مخالف ہیں۔اسی طرح اگر امام ایسا عمل کرے جو مقتدی کے نزدیک درست نہ ہو؛ تو تفصیلات کے لیے کتبِ فروع کا مطالعہ کریں۔اگر مقتدی کو علم ہو جائے کہ امام بے وضو نماز پڑھاتا ہے، تو مقتدی اس کے پیچھے نماز ادا نہ کرے؛ اس لیے کہ وہ نمازی کے ساتھ کھلواڑ کرتا ہے نماز نہیں پڑھتا۔

کتاب وسنت کے نصوص اور اسلاف کا اجماع اس بات پر دال ہے کہ حاکم وقت، نمازوں کا امام ماتحت حاکم، فوج کا کمانڈر زکوٰۃ فراہم کرنے والا اجتہادی مسائل میں ان کی اطاعت کی جائے یہ لوگ اپنے ماتحت لوگوں کی اطاعت نہ کریں بلکہ ماتحت لوگ اپنی رائے چھوڑ کر ان کی اطاعت کریں اتفاق واتحاد کا یہی تقاضا ہے کہ اختلاف سے بچا جائے، بلاشبہ مسائل جزئیہ میں اختلاف کرنے سے بدرجہا

جہا اتفاق واتحاد کی فضا کو برقرار رکھنا عظیم کام ہے، اسی بنیاد پر حکام کے لیے بھی اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ کسی دوسرے حاکم کے فیصلہ کے خلاف اپنی رائے کا اظہار راہ صواب یہی ہے کہ تمام ایک دوسرے کی اقتداء میں نماز ادا کریں۔

کتاب وسنت کے نصوص اور سلف امت کا اجماع اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حاکم وقت، نمازوں کا امام؛ ماتحت حاکم، فوج کا کمانڈر؛ زکوٰۃ وصول کرنے والا عامل؛ اجتہادی مسائل میں ان کی اطاعت کی جائے گی۔ان پر اجتہادی مسائل میں اپنے ماتحت کی اطاعت لازم نہیں آتی۔ بلکہ ماتحت لوگوں پر ان کی اطاعت لازم ہے۔پس اس کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے ترک کرنا؛ اس لیے کہ اس میں جماعت اور اتفاق واتحاد کی مصلحت اور تفرقہ اور اختلاف کی خرابی سے اجتناب ہے؛ بلاشبہ یہ جزوی مسائل میں اختلاف کرنے سے بدر جہا بہتر ہے۔ پس اسی بنیاد پر حکام کو بھی کسی دوسرے حاکم کے فیصلہ کے خلاف اپنا فیصلہ جاری کرنے کی اجازت نہیں۔

اور یہی بات قطعی درست ہے کہ ان تمام ایک دوسرے کی اقتداء میں نماز ادا کرنا درست ہے۔حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ ہارون رشید کے ساتھ حج کرنے گئے۔ ہارون رشید نے پچھنے لگوائے؛ امام مالک رحمہ اللہ نے فتویٰ دیا کہ وضو کی ضرورت نہیں۔اور اس نے لوگوں کو [سابقہ وضوء کے ساتھ] نماز پڑھا دی۔تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ''کیا آپ نے اس کے پیچھے نماز پڑھی ہے؟''۔تو انہوں نے فرمایا: ''سبحان اللہ! وہ امیر المؤمنین ہیں''۔آپ کی مراد یہ تھی کہ حکمران کے پیچھے نماز ترک کرنا اہل بدعت کا طریقہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''وہ تمھیں نماز پڑھائیں گے؛ اگر صحیح نماز پڑھائیں تو سب کی نماز صحیح ہے۔اگر وہ غلطی کریں؛ تو ان کی خطا کا بوجھ ان پر؛ تمہاری نماز درست ہوگی''۔ [1]

یہ صریح نص ہے کہ اگر امام غلطی کر جائے تو وہ غلطی اسی کے ذمہ ہوتی ہے؛ مقتدی پر اس کا بوجھ نہیں ہوتا۔

مجتہد کی غلطی کی انتہاء یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسے واجب کو ترک کر کے غلطی کر جاتا ہے جو اس کے خیال کے مطابق واجب نہیں۔ یا کسی ناجائز فعل کا ارتکاب کرتا ہے؛ اور وہ اس کو ناجائز نہیں سمجھتا۔[تو اس پر کچھ حرج نہیں]۔اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو؛ اور اس تک یہ صحیح اور صریح حدیث پہنچ چکی ہو؛ اس کے لیے اس کی مخالفت کرنا جائز نہیں۔ یہ حدیث حنفیہ؛ شافعیہ اور حنابلہ میں سے ان لوگوں کے خلاف حجت ہے جن کا نظریہ ہے کہ امام جب ایسا عمل چھوڑ دے جس کو مقتدی واجب سمجھتا تھا تو اس کی اقتداء درست نہیں۔اس لیے کہ اتحاد واتفاق کا خیال رکھنا؛ نیز جس اختلاف سے فساد کا اندیشہ ہو اس کا ترک کرنا بھی ضروری ہے۔

[1] مختصر البخاري (٣٨٣).

[اہل قبلہ کی نماز جنازہ:]

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''جو شخص ان میں سے فوت ہو جائے ہم ان کا نماز جنازہ ادا کریں گے''۔

یعنی ان سے جو لوگ فوت ہوں گے خواہ وہ نیکوکار ہوں یا فاسق وفاجر ہوں ہم ان کا نماز جنازہ ادا کریں گے؛ اس عموم سے باغیوں، ڈاکوؤں اور خودکشی کرنے والوں کو مستثنیٰ قرار دیا جائے گا۔امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک یہ استثناء درست نہیں۔ اور نہ ہی شہید کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی، البتہ امام شافعی، امام مالک کا اس میں اختلاف مشہور ہے۔

لیکن شیخ طحاوی رحمہ اللہ کے اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ: ''ہم اہل بدعت اور فاسق وفاجر لوگوں کی نماز جنازہ اس کلیہ کے عموم کی وجہ سے ترک نہیں کریں گے''۔ لیکن جو لوگ اسلام کا اظہار کرتے ہیں دو قسم کے ہیں: مومن یا منافق۔

پس جس کسی کے نفاق کا یقینی علم ہو گیا؛ تو نہ اس کا نماز جنازہ پڑھنا اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرنا جائز نہیں۔ اور جس کے نفاق کا علم نہ ہو اس کا جنازہ پڑھا جائے۔ اگر کسی شخص کو کسی دوسرے کے نفاق کا علم ہو؛ تو وہ اس کا جنازہ نہ پڑھے؛ دوسرے لوگ پڑھ لیں جن کو اس کے نفاق کا علم نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس شخص کا جنازہ نہیں پڑھا کرتے تھے جس کا جنازہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نہ پڑھتے۔ اس لیے کہ انھیں جنگ تبوک میں منافقین کا علم ہو گیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کا جنازہ ادا کرنے سے روک دیا تھا۔ اور آپ کو آگاہ کر دیا تھا کہ آپ کی دعائے مغفرت سے اللہ تعالیٰ ان کو معاف نہیں فرمائے گا۔ اس کی علت: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا کفر بتایا۔ پس جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو؛ اس کی نماز جنازہ سے منع نہیں کیا گیا۔ اگر چہ اس میں اعتقادی بدعات یا عملی گناہ؛ یا فسق و فجور کے کام کیوں نہ ہوں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ایمانداروں کے لیے مغفرت طلب کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ (محمد: ۱۹)

''پس جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور مومن مرد اور عورتوں کے لیے بھی۔''

اللہ تعالیٰ نے توحید بجالانے اور اپنے ذات کے لیے اور ایمان دار مردوں اور عورتوں کے لیے استغفار کا حکم دیا ہے۔

پس توحید دین کی اصل [بنیاد] ہے۔ اور آپ کے اپنے لیے اور اہل ایمان کے لیے استغفار اس کا کمال ہے۔ پس ان کے لیے مغفرت اور رحمت؛ اور ہر قسم کی بھلائی کی دعا کرنا یا تو واجب ہے یا مستحب۔ پھر اس کی بھی دو اقسام ہیں:

عام اور خاص۔ عام تو صاف ظاہر ہے جیسے اس آیت میں ہے۔ اور خاص دعا سے مراد: ''میت کی نماز جنازہ ہے''۔ جو بھی مومن فوت ہوتا ہے؛ اہل ایمان کو اس کی نماز جنازہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ: اس کی نماز جنازہ پڑھتے ہوئے اس کے لیے خاص دعا کریں۔ جیسا کہ ابوداؤد، ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

''جب تم میت کا جنازہ ادا کرو تو اس کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا کرو''۔ [1]

[1] حدیث صحیح ہے۔ احکام الجنائز (۱۲۳)، ارواء الغلیل (۷۳۲)

[جنتی اور جہنمی ہونے کا حتمی تعین]

۷۰۔((وَلاَ نُنَزِّلُ أَحداً مِنْهُمْ جَنَّةً ①وَّلاَ نَـاراً وَلاَ نَشْهَدُ عَلَيْهِمْ بِكُفْرٍ وَلَا بِشِرْكٍ وَلاَ بِنِفَاقٍ مَا لَمْ يَظْهَرْ مِنْهُمْ شَيْءٌ مِنْ ذٰلِكَ وَنَذَرُ سَرَائِرَهُمْ إِلَى اللهِ تَعَالٰى۔))

''ہم ان میں سے کسی کے جنتی اور دوزخی ہونے کا فیصلہ نہیں کرتے۔ اور نہ ہم ان پر کفر، شرک، نفاق کی گواہی دیتے ہیں جب تک ان سے ان باتوں کا ظہور نہ ہو اور ہم ان کے باطنی حالات اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سوائے عشرہ مبشرہ؛ حضرت عبداللہ تعالیٰ بن سلام اور ان جیسے دیگر صحابہ کے؛ ان کے بارے میں ہم جنتی ہونے کی گواہی رسول اللہ ﷺ کی گواہی کی وجہ سے دیتے ہیں۔ جیسا کہ شارح رحمہ اللہ نے فقرہ نمبر (۹۵) میں واضح کیا ہے۔ آج کل بعض اہل قلم کی گمراہی اور جہالت یہ ہے کہ وہ حضرت عبداللہ تعالیٰ بن سلام رضی اللہ عنہ کو اسلام سے پہلے یہودی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے ان کے جنتی ہونے کی گواہی دی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ ہائے افسوس! ان کو سمجھ آتی کہ اگر کوئی یہودی مسلمان ہو یا کوئی بت پرست مسلمان ہو؛ تو اس میں فرق کیا ہے۔ بس یہ تو محض جاہلانہ تعصب ہے۔ صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین قسم کے لوگ ہیں جنہیں دوہرا اجر ملے گا...... ان میں سے ایک ...... وہ آدمی جو اہل کتاب میں سے تھا؛ وہ اپنے نبی پر بھی ایمان لایا؛ اور نبی کریم ﷺ کو پا کر آپ پر بھی ایمان لایا؛ آپ کی اتباع اور تصدیق کی''۔ اس کے لیے دوہرا اجر ہے؛ مگر بت پرست کے لیے یہ دوہرا اجر نہیں۔ وہ اگر اسلام لائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔

تشریح:...... مراد یہ ہے: ہم اہل قبلہ میں سے کسی متعین انسان کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ فلاں جنتی ہے، فلاں دوزخی ہے۔ سوائے ان کے جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے اطلاع دی ہو کہ وہ اہل جنت میں سے ہیں۔ جیسے عشرہ مبشرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ۔ اگرچہ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ کبائر کے مرتکبین سے جس شخص کو اللہ تعالیٰ چاہے گا دوزخ میں گرائے گا اس کے بعد شفاعت کرنے والوں کی سفارش کے ساتھ دوزخ سے نکالے گا۔ لیکن کسی معین انسان کے بارے میں ہم توقف اختیار کرتے ہیں بغیر علم اس کو جنتی یا دوزخی نہیں کہیں گے۔ اس لیے کہ حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے؛ ہمیں اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ اس کی موت کس چیز پر ہوئی ہے۔ بس ہم تو نیکوکاروں کے لیے اچھی امید رکھتے ہیں؛ اور بدکاروں کے لیے پر خوف محسوس کرتے ہیں۔

کسی شخص کے لیے جنت کی گواہی دینے کے بارے سلف کے تین اقوال ہیں:

[اول:] صرف انبیاء کے لیے جنت کی شہادت دی جائے یہ قول محمد بن حنیفہ اور اوزاعی رحمہما اللہ کا ہے۔

[دوم:] جس مومن کے لیے بھی نص موجود ہے اس کے حق میں بھی جنت کی شہادت دی جائے گی یہ قول اکثر علماء اور محدثین کا ہے۔

[سوم:] ان لوگوں کے حق میں بھی جنت کی شہادت دیں گے جن کے بارے میں ایماندار جنتی ہونے کی شہادت دیں۔

جیسا کہ صحیحین میں ہے:

''[آپ کے سامنے سے] ایک جنازہ گزرا، لوگوں نے اس کی تعریف کی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''واجب ہو گئی''۔

پھر ایک اور جنازہ گزرا، لوگوں نے اس کے حق میں برے کلمات کہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''واجب ہو گیا''۔ ایک روایت میں ہے: آپ نے یہ الفاظ تین بار دھرائے: ''واجب ہو گیا''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: یارسول اللہ! کیا واجب ہو گیا؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جس کے حق میں تم نے اچھے کلمات کہے اس کے لیے جنت واجب ہو گی؛ اور یہ جس دوسرے کے حق میں برے کلمات کہے تو اس کے لیے دوزخ واجب ہو گئی۔ تم زمین میں اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو''۔ ❶

نیز ارشاد گرامی ہے: ''قریب ہے کہ تم جنتیوں کی جہنمیوں سے تمیز کر سکو گے''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ کیسے ممکن ہے؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کسی کی اچھی تعریف کرنے سے اور کسی کی برے الفاظ میں مذمت کرنے سے''۔ ❷

پس آپ ﷺ نے ان امور کا بتا دیا جن کی وجہ سے جنت والوں اور دوزخ والوں کو معلوم کیا جا سکے گا۔

❶ حدیث صحیح ہے۔ احکام الجنائز للعلامه البانی ص (٤٤).

❷ سند حسن درجہ ہونے کا احتمال رکھتی ہے، ابن ابی زہیر باپ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں (ابن ماجہ) (۴۲۲۱) (احمد ۳/۴۱۶، ۶/۴۶۶) زوائد میں اس کی سند کو صحیح کہا اور رواۃ ثقہ ہیں۔ میں کہتا ہوں اس ابوبکر سے صرف دو راویوں نے بیان کیا ہے ابن حبان کے علاوہ کسی نے اس کو ثقہ قرار نہیں دیا (۱/ ۲٦٧) تقریب میں مقبول کہا ہے یعنی متابعت کی صورت میں وگرنہ کمزور حدیث والا ہے۔

[کفر اور شرک کا فتوی:]

''ہم ان پر کفر، شرک، نفاق کی گواہی نہیں دیتے ہیں جب کہ ان سے ان باتوں کا ظہور نہ ہو اور ہم ان کے باطنی حالات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں''۔

تشریح:...... ہمیں ظاہر دیکھ کر حکم لگانے کا حکم دیا گیا، ہمیں ظن اور بلا علم کسی بات کے کہنے سے روکا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ﴾ (الحجرات : ١١)

''مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (الحجرات : ١٢)

''اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا﴾ (الاسراء: ٣٦)

''اور جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑ کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باز پرس ہو گی۔''

[امت محمد ﷺ میں سے کس کو قتل کیا جا سکتا ہے؟]

۷۱۔((وَلاَ نَرَی السَّیْفَ عَلَی أَحَدٍ مِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَی اللّٰهُ عَلَیهِ وَسَلَّمَ إِلَّا مَنْ وَجَبَ عَلَیْهِ السَّیْفُ .))

: ہم امت محمد یہ میں سے کسی پر بھی تلوار چلانے کو جائز نہیں سمجھتے، ہاں جس پر تلوار واجب ہو گئی ہو‘‘۔

تَشْرِیح:......صحیح حدیث میں ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

’’کسی ایسے مسلمان کا خون گرانا حلال نہیں جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ﷺ ہوں۔ ہاں تین باتوں میں سے کسی ایک کے پائے جانے سے خون گرانا درست ہے۔شادی شدہ انسان زنا کرے،نفس کو نفس کے بدلے قتل کیا جائے ،اور جو دین اسلام چھوڑ کر مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے‘‘۔ [1]

[1] متفق علیه: حدیث ابن مسعود۔ الارواء الغلیل (۲۱۹۶)۔ الظلال الجنة (۶۰ ، ۸۹۳، ۸۹٤) .

أقول: ایسے ان لوگوں سے قتال بھی جائز ہے جو بغاوت کے مرتکب ہو رہے ہوں؛ جن سے قتال کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے؛ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ﴾[الحجرات ۹] ’’اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر دونوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے‘‘۔

ایسے ہی اگر کوئی گروہ یا جماعت اسلامی شعائر میں سے کسی ایک شعیرہ کو با قاعدگی کے ساتھ ترک کر دیں تو ان سے بھی جنگ کی جائے گی۔مثال کے طور پر ایک شہر کے لوگ اذان دینا ترک کر دیں تو ان سے جنگ وقتال جائز ہو جاتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کسی بستی پر حملہ نہیں کرتے تھے جب تک صبح نہ ہو جائے۔آپ کوشش فرماتے تھے کہ اذان کی آواز سن لیں؛ اگر اذان سن لی تو رک جاتے تھے؛ ورنہ اس بستی پر حملہ کر دیتے تھے۔

یہی حال ان لوگوں کا بھی ہوا جنہوں نے زکواۃ کی ادائیگی روک لی تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ ان لوگوں سے جنگ کریں گے جب کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:’’ مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتی کہ وہ لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دیں۔ جب وہ اس کا اقرار کر لیں تو وہ اپنے خون اور مال کو مجھ سے محفوظ کر لیں گے؛ مگر اس کے حق کے ساتھ؛ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہو گا‘‘۔تو آپ نے فرمایا:’’اللہ کی قسم! میں ضرور ان لوگوں سے جنگ لڑوں گا جو نماز اور زکاۃ میں فرق کرتے ہیں۔ اگر وہ مجھ سے ایک رسی بھی روکیں گے جسے وہ رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے؛ تو میں اس کے روکنے پر ان سے جنگ کروں گا‘‘۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اللہ کی قسم میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا شرح صدر کر دیا ہے؛ اور میں نے جان لیا کہ یہی بات حق ہے‘‘۔[البخاری ۶۹۲۴؛ مسلم ۲۰۔]

ایسے ہی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے بالا جماع ان خوارج سے بھی قتال کیا تھا جن سے جنگ کا حکم نبی کریم ﷺ نے دیا تھا؛ اور اس کی ترغیب دی تھی۔ یہ اس وقت ہوا جب یہ لوگ جمع ہو کر اپنی بدعات کا اظہار کرنے لگے تھے۔

[حکمران کی اطاعت کا وجوب

اور ان کے خلاف بغاوت کی ممانعت]

۷۲۔((وَلاَ نَرَى الْخُرُوجَ عَلَى أَئِمَّتِنَا وَوُلاَةِ أُمُورِنَا وَإِنْ جَارُوا①. وَلاَ نَدْعُوا عَلَيهِمْ وَلاَ نَنْزِعُ يَداً مِنْ طَاعَتِهِمْ وَنَرَى طَاعَتَهُمْ مِنْ طَاعَةِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَرِيْضَةً ②مَا لَمْ يَأْمُرُوا بِمَعْصِيَةٍ وَنَدْعُو لَهُمْ بِالصَّلاَحِ وَالْمَعَافَاةِ .))

''ہم اپنے حکام؛ اور اولیاء امور کے خلاف بغاوت جائز نہیں سمجھتے، اگر چہ وہ ظلم ہی کیوں نہ کریں۔ نہ ہی ہم ان پر بددعا کرتے ہیں۔ نہ ہم ان کی اطاعت سے دستکش ہوتے ہیں؛ اور ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری میں فرض سمجھتے ہیں جب تک کہ وہ گناہ کا حکم نہ دیں اور ہم ان کے حق میں اصلاح اور عافیت کی دعا کرتے ہیں''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شارح رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں اپنی کتاب میں بہت سی احادیث ذکر کی ہیں؛ اور پھر فرمایا ہے:''ان کے ظلم کی صورت میں بھی ان کی اطاعت اس لیے ضروری ہے کہ ان کی عدم اطاعت پر جو مفاسد مرتب ہوتے ہیں وہ ان کے ظلم سے کہیں زیادہ دور رس برے اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ جبکہ ان کے ظلم پر صبر کرنا گناہوں کا کفرہ بنتا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمارے برے اعمال کے بدلے میں ہم پر مسلط کیا ہے۔ پس جس طرح کا عمل ہوتا ہے اسی طرح کا بدلہ ملتا ہے۔ تو ہمارے لیے استغفار اور توبہ کے ساتھ ساتھ اپنے عمل کی اصلاح لازم ہوتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ﴾ (الشوریٰ: ۳۰) ''اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمھارے اپنے فعلوں سے اور وہ بہت سے گناہ تو معاف کر دیتا ہے۔''

نیز فرمایا:﴿وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (الانعام: ۱۲۹) ''اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔'' پس اگر رعایا ظالم امیر کے ظلم سے رستگاری چاہتی ہے تو وہ ظلم ترک کر دیں''۔

میں کہتا ہوں: یہ ان ظالم حکمرانوں سے نجات کا طریقہ ہے جو ہم میں سے ہی ہیں اور ہماری زبان میں بات کرتے ہیں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ کرے؛ اور اپنے عقیدہ کو درست کرے؛ اور اپنے نفس اور اپنے اہل خانہ کی تربیت صحیح اسلام کے مطابق کرے۔ تا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہو سکے:﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ [الرعد ۱۱] ''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، یہاں تک کہ وہ اسے بدلیں جو ان کے دلوں میں ہے''۔

ایک معاصر داعی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے؛ وہ کہتا ہے:''پہلے اسلامی مملکت اپنے دلوں میں قائم کرو؛ تو وہ تمہاری سرزمین پر خود بخود ہی قائم ہو جائے گی''۔ اور جیسے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ:''اسلحہ لیکر حکمرانوں کے خلاف مسلح بغاوت کرنے سے انقلاب آ جائے گا'' ظلم سے نجات کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ فوجی اور عسکری انقلاب لایا جائے۔ یہ طریقہ کار جہاں عصر حاضر کی ایک بدعت ہے؛ وہیں پر یہ ان نصوص شریعت کے خلاف بھی ہے جن میں اپنے آپ کو بدلنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بنیاد سے اصلاح کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تا کہ اس پر ایک اچھی عمارت قائم ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾(الحج ۴۰) ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ یقیناً بہت قوت والا، سب پر غالب ہے''۔

② ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ تو واضح ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾[النساء ۵۹] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ تعالیٰ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں''۔ جہاں تک استعماری کفار کا مسئلہ ہے؛ تو ان کی اطاعت واجب نہیں ہوتی؛ بلکہ مادی و معنوی ہر لحاظ سے ان کے مقابلہ کرنا اور اس کی تیاری کرنا واجب ہو جاتا ہے تا کہ انہیں بلاد اسلامیہ سے نکال باہر کیا جائے۔ اور ان کی پلیدی کے زمین کو پاک کیا جائے۔ اور فرمان الٰہی:﴿مِنْكُمْ﴾ ''یعنی تم میں'' مراد لینا یہ قادیانی تاویل اور بدعت

ہے؛ جوکہ خود انگریز کے پروردہ اور وظیفہ خوار ہیں؛ اس تاویل سے مقصود عام سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کر کے انہیں کفار کی اطاعت کی ترغیب دینا ہے جو مسلمان ممالک پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے نجات دے؛ آمین۔

تشریح:...... اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ٥٩)

''اے مومنو! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور ان کی بھی جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں۔''

صحیح حدیث میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ اور جو شخص امیر کی اطاعت کرے گا اس نے میری اطاعت کی اور جو شخص امیر کی نافرمانی کرے گا اس نے میری نافرمانی کی''۔ [1]

[1] بخاری، مسلم، ابو ہریرہ راوی ہیں۔ الارواء الغليل (٣٩٤).

نیز حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

''میرے دوست نے مجھے وصیت کی کہ میں (امیر کی) سمع و اطاعت کروں اگر چہ وہ حبشی غلام ہو جس کے اعضاء کٹے ہوئے ہوں''۔ [1]

بخاری میں ہے: ''اگر چہ اس کا سر منقہ [کے دانے] جیسا ہو''۔ [2]

نیز بخاری، مسلم میں ہے: ''مسلمان پر سمع و اطاعت ہے، اس چیز میں جس کو وہ اچھا جانتا ہے اور برا جانتا ہے، ہاں اگر اس کو نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر سمع و اطاعت نہیں ہے''۔ [3]

[1] مسلم.

[2] بخاری، انس راوی ہیں۔ (۴/۳۸۵)۔

[3] بخاری، مسلم ابن عمر راوی ہے۔

نیز حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بن یمان بیان کرتے ہیں:

''دوسرے صحابہ تو رسول اللہ ﷺ سے خیر کے بارے میں سوال کرتے؛ اور میں آپ سے شر/ برائی کے بارے میں سوال کرتا تھا، مجھے خطرہ رہتا کہ کہیں مجھ میں شر نہ آجائے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ''ہم جاہلیت کے برے دور میں تھے اللہ تعالیٰ ہمارے پاس اس خیر کو لے آیا، کیا اس خیر کے بعد شر بھی ہے؟ آپ ﷺ نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''ہاں؛ اس میں کچھ دھندلاھٹ ہوگی''۔

میں نے عرض کیا: ''کیا دھندلاھٹ ہوگی؟'' ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو میرا طریقہ نہیں اختیار کریں گے؛ اور نہ میری راہ پر چلیں گے۔ ان میں کچھ اچھی باتیں ہوں گی اور کچھ بری باتیں۔ میں نے عرض کیا: ''اس خیر کے بعد شر ہو گا؟ ۔ آپ ﷺ نے اثبات میں جواب دیا اور فرمایا: ''دوزخ کے دروازوں پر کچھ بلانے والے ہوں گے، جو ان کی دعوت پر لبیک کہے گا وہ اس کو دوزخ میں گرادیں گے۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ان کی وضاحت فرمائیں؟ ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہم میں سے کچھ مضبوط لوگ ہوں گے وہ ہماری طرح گفتگو کریں گے''۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ!

آپ کی کیا رائے ہے، جب میں اس دور کو دیکھوں [تو کیا کروں]؟'' ۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کے ساتھ رہ'' ۔ میں نے عرض کیا: ''اگر امام اور جماعت نہ ہوں تو؟ ۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر ان تمام جماعتوں سے کنارہ کش ہو جاؤ، اگرچہ تجھے جنگل کی زندگی گزارنی پڑے اور درختوں کی چھال کھانی پڑے، یہاں تک کہ اسی حالت پر تجھ کو موت آجائے'' ۔ ❶

❶ بخاري، مسلم.

نیز ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اپنے امیر کے کسی مکروہ عمل کو دیکھے تو وہ صبر کرے، اس لیے کہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت دور ہوا اور فوت ہو گیا تو وہ جاہلیت پر فوت ہوا'' ۔ ❶

ایک روایت میں ہے کہ: ''اس نے اسلام کا پٹہ اپنی گردن سے اتار دیا'' ۔ ❷

❶ مسلم، بخاري حديث ابن عباس، الارواء الغليل (٢٤٥٣).

❷ صحیح ہے مسند احمد (۴/۱۳۰) لیکن ابن عباس سے نہیں شارح کو وہم ہے۔ وهو بتمامه في صحيح الترغيب (٥٥٣). صحيح الجامع الصغير (١٧٢٠). وفيه الرد على من حاول اعلال بما لا يقدح من الدكاترة المعاصرين؛ فليراجعه من شاء فإن فيه شفاء"۔

نیز حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب دو خلفاء کی بیعت کی جائے تو ان میں سے جو بعد والا ہے اس کو قتل کر دو'' ۔ ❶

نیز حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تمھارے بہترین امام وہ ہوں گے کہ تم ان سے محبت کرو گے اور وہ تم سے محبت کریں گے اور تم ان کے حق میں دعا کرو گے وہ تمھارے حق میں دعا کریں گے۔ اور تمھارے بدترین امام وہ ہوں گے جن کو تم برا جانو گے اور وہ تمھیں برا جانیں گے اور تم ان پر لعنت کرو گے اور وہ تم پر لعنت کریں گے۔ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا اس وقت ہم انھیں تلوار کے ساتھ ختم نہ کر دیں؟ ۔آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں؛ جب تک کہ وہ تم میں نماز کی اقامت کا خیال رکھیں'' ۔خبردار جس پر کوئی شخص حاکم بنایا گیا اس نے دیکھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کام کرتا ہے اس کو برا سمجھے لیکن اس کی اطاعت سے دستکش نہ ہو'' ۔ ❷

❶ مسلم، احمد.

❷ مسلم، الصحيحة (٩٠٧).

بلاشبہ کتاب وسنت کی نصوص اولوالامر کی اطاعت کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہیں؛ جب تک کہ وہ نافرمانی کا حکم نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول پر غور کیجیے:

﴿ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ﴾ (النساء: ٥٩)

''اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور پیغمبر کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں۔''

غور فرمائیے کہ رسول ﷺ کے ساتھ تو لفظ اطیعوا کا ذکر ہے لیکن اولوالامر کے ساتھ لفظ اطیعوا کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ

اولوالامر کی اطاعت مستقل نہیں ہے بلکہ ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے ماتحت ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اطاعت [لفظ اطیعوا] کے اعادہ کا مطلب ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے؛ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے علاوہ کسی چیز کا حکم نہیں دیتے۔ آپ ﷺ معصوم ہیں۔ ہاں اولوالامر کبھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے ہٹ کر بھی حکم دیتے ہیں۔ پس ان کی اطاعت صرف ان کاموں میں کی جائے گی جن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہو۔ ہاں ان کے ظلم کی صورت میں بھی ان کی اطاعت اس لیے ضروری ہے کہ ان کی عدم اطاعت کے مفاسد ان کے ظلم سے کہیں زیادہ برے اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے ظلم پر صبر کرنا گناہوں کا کفارہ اور اور ثواب میں کئی گناہ اضافہ کا موجب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے برے اعمال کے بدلے میں ان کو ہم پر مسلط کیا ہے۔ ہر عمل کا بدلہ اس کی جنس سے ہوتا ہے۔ تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اصلاح عمل کے ساتھ ساتھ کثرت کے ساتھ توبہ واستغفار کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيْرٍ٥﴾ (الشوریٰ: ۳۰)

''اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمھارے اپنے فعلوں سے اور وہ بہت سے گناہ تو معاف کر دیتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ﴾ (آل عمران: ۱۶۵)

''کیا جب تم پر مصیبت واقع ہوئی حالانکہ اس سے دو چند مصیبت تمھارے ہاتھ سے ان پر پڑ چکی ہے؛ تو تم چلا اٹھے کہ (ہائے) آفت (ہم پر) کہاں سے آپڑی، کہہ دو کہ یہ تمھاری شامتِ اعمال ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ﴾ (النساء: ۷۹)

''آپ کو جو فائدہ پہنچے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامل اعمال) کی وجہ سے ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ٥﴾ (الانعام: ۱۲۹)

''اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔''

پس اگر رعایا یا ظالم حاکم کے ظلم سے نجات چاہتی ہو؛ تو وہ ظلم ترک کر دیں۔ حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ کی بعض کتابوں میں ہے:

''میں اللہ تعالیٰ مالک الملک ہوں، بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں، پس جو کوئی میری اطاعت کرے اس پر میں بادشاہوں کو رحیم بنا دیتا ہوں؛ اور جو میری نافرمانی کرے؛ اس پر میں ان کو عذاب کی صورت میں مسلط کر دیتا ہوں'' پس تم بادشاہوں کو گالی گلوچ نہ کرو، توبہ کرو؛ میں ان کو تم پر نرم کر دوں گا''۔ [1]

[1] اسرائیلی روایت ہے بعض ضعیف راویوں نے اس کو مرفوع بنا دیا ہے طبرانی فی الاوسط میں یہ حدیث ابی الدرداء سے ہے، امام ہیثمی نے (۵/ ۲۴۹) پر بیان کیا ہے کہ اس کی سند میں ابراہیم بن راشد متروک راوی ہے۔

[سنت اور جماعت کی پیروی]

۷۳۔ ((وَنَتَّبِعُ السُّنَّةَ وَالْجَمَاعَةَ① . وَنَجْتَنِبُ الشُّذُوْذَ وَالْخِلَافَ وَالْفُرْقَةَ ② .))

''ہم سنت اور جماعت کی اتباع کرتے ہیں اور شذوذ [علیحدگی] اور اختلاف سے اجتناب کرتے ہیں''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سنت رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے؛ اور جماعت سے مراد مسلمانوں کی جماعت ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ اور قیامت تک ان کی راہ پر چلنے والے ہیں؛ ان کی مخالفت کرنا گمراہی ہے۔

② ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے مراد سنت سے دور ہونا [شذوذ اختیار کرنا] اور اس جماعت کی مخالفت کرنا ہے جس پر سلف صالحین رحمہم اللہ گامزن رہے ہیں؛ جیسا کہ یہ بات سب کو معلوم ہے۔ شذوذ یہ نہیں ہے کہ انسان مخالف کا کوئی قول کسی دلیل کی بنا پر اختیار کرے۔ بھلے جمہور اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ان لوگوں کے برعکس ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ کتاب وسنت میں کوئی دلیل ایسی نہیں جس پر جمہور قائم ہوں؛ اور اس سے صحیح تر دلیل ان کے مخالف کے پاس ہو۔ ہاں اگر دلیل موجود نہ ہو تو پھر جس چیز پر مسلمان بغیر کسی اختلاف کے متفق ہو جائیں؛ تو اس کی اتباع واجب ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے: ﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء: ۱۱۵)۔ ''اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر ﷺ کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کے سوا اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے تو ہم اس کو ادھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔''

اگر ان کے مابین اختلاف ہو تو پھر کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا واجب ٹھہرتا ہے۔ پس جس کے لیے حق واضح ہو جائے؛ وہ اپنی خواہشات پر چلنے والا نہ ہو؛ تو پھر بھلے جمہور کی مخالفت ہو یا موافقت؛ اس پر حق کی اتباع واجب ہو جاتی ہے۔ اور میرا خیال نہیں ہے کہ کوئی انسان ہر اس مسئلہ میں جمہور کی رائے پر چلتا ہو جس میں اس پر حق واضح نہ ہوا ہو۔ بلکہ وہ کبھی ایک طرف جاتا ہے اور کبھی دوسری طرف؛ حتی کہ اس کے دل کو اطمینان حاصل ہو جائے۔ اور اسے شرح صدر حاصل ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا تھا: ''اپنے دل سے پوچھو؛ بھلے تمہیں مفتی کوئی فتوی دیتے ہوں''۔

تشریح:......سنت سے مراد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے؛ اور جماعت سے مسلمانوں کی جماعت ہے؛ اس جماعت سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور قیامت تک ان کی اتباع کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کی اتباع سراپا ہدایت ہے اور ان کی مخالفت سراپا گمراہی ہے، اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آل عمران: ۳۱)

''آپ فرما دیں: اگر تم اللہ تعالیٰ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ بھی تمھیں دوست رکھے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ تعالیٰ تو بخشنے والا مہربان ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء: ۱۱۵)

''اور جو کوئی ہدایت واضح ہونے کے بعد پیغمبر ﷺ کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کے سوا اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے تو ہم اس کو ادھر ہی چلنے دیں گے اور جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ﴾ (النور: ٥٤)

''فرما دیں: اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اگر منہ موڑو گے تو رسول پر ان کی ذمہ داری ہے اور تم پر تمھاری ذمہ داری؛ اور اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو تم ہدایت پا لو گے اور رسول کے ذمہ تو صاف صاف پہنچا دینا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الانعام: ١٥٣)

''اور یہ کہ میرا سیدھا رستہ یہی ہے تو تم اسی پر چلنا اور راستوں پر نہ چلنا، اللہ تعالیٰ کے رستے سے الگ ہو جاؤ گے ان باتوں کا اللہ تعالیٰ تمھیں حکم دیتا ہے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (آل عمران: ١٠٥)

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو متفرق ہو گئے اور احکام بینہ آنے کے بعد ایک دوسرے سے (خلاف) واختلاف کرنے لگے یہ وہ لوگ ہیں جن کو (قیامت کے دن) بڑا عذاب ہو گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ (الانعام: ١٥٩)

''جن لوگوں نے اپنے دین میں (بہت سے) رستے نکالے ہیں اور کئی کئی فرقے ہو گئے ان سے تم کو کچھ کام نہیں، ان کا کام اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے پھر جو جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں وہ ان کو (سب) بتائے گا۔''

سنن کی کتابوں میں یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے؛ جسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پر اثر وعظ فرمایا، جس سے ہماری آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور دل کانپنے لگے۔ ایک صحابی نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! یہ تو الوداعی وعظ معلوم ہو رہا ہے؛ آپ ہمیں کس بات کے خیال رکھنے کا حکم دیتے ہیں؟۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمھیں سمع و اطاعت کی وصیت کرتا ہوں بیشک جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہا وہ بہت اختلاف دیکھے گا۔ پس

تمھارے لیے ضروری ہے کہ تم میری اور میرے خلفاء راشدین ہدایت یافتہ کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے رکھو۔ اور اس کو کچلی کے دانتوں سے نہایت مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو۔ نیز اپنے آپ کو بدعات سے بچاؤ بے شک ہر بدعت گمراہی ہے"۔ ❶

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

"بے شک اہل کتاب کے بہتر (۷۲) فرقے بن گئے میری امت کے تہتر (۷۳) فرقے بن جائیں گے، تمام اپنی خواہشات کے (پجاری) دوزخ جائیں گے صرف ایک فرقہ (جنتی ہے) اور وہ جماعت ہے"۔ ❷

ایک روایت میں ہے: صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ فرقہ کون لوگ ہیں؟۔

آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ اس راہ پر ہوں گے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں"۔ ❸

پس نبی کریم ﷺ نے واضح فرما دیا کہ اکثر اختلاف کرنے والے تباہ و برباد ہونے والے ہیں۔ سوائے اہل سنت والجماعت کے؛ وہ ان سے مستثنیٰ ہیں۔

❶ حدیث صحیح ہے جیسا کہ امام ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (الارواء: ٢٤٥٥) السنة لابن ابی عاصم رقم (٢٧/ ٣٤).

❷ حدیث صحیح ہے۔ الاحادیث الصحیحة (٢٠٣/ ٢٠٤) السنة کی تخریج (رقم ٦٣-٦٩) بھی دیکھیں۔

❸ اس روایت میں ضعف ہے ترمذی نے الایمان میں حسن کہا ہے۔ امام البانی نے اس کا شاہد ذکر کیا ہے۔ دیکھیں الصحیحة (٢٠٤).

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول کس قدر عمدہ ہے؛ آپ فرماتے ہیں کہ:

"جو شخص تم میں سے کسی راہ پر چلنے والا ہے وہ فوت شدہ لوگوں کا راہ اختیار کرے اس لیے کہ زندہ انسان کے بارے میں فتنہ سے امن میں نہیں رہا جا سکتا۔ دیکھیں یہ محمد ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو امت محمدیہ میں سب سے افضل ترین لوگ ہیں دلوں میں نیکی موجزن ہے، علم میں گہرائی ہے، تکلفات سے دور ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کی صحبت اور دین کی اقامت کے لیے پسند فرما لیا ہے۔ پس ان کے فضائل کا اعتراف کرو اور ان کے نقش قدم پر چلو اور استطاعت کے مطابق ان کے طریقہ اور اخلاق کا اتباع کرو، یقیناً وہ لوگ سیدھے راہ پر تھے"۔ اس کی مزید وضاحت آئندہ اوراق میں آ جائے گی۔

[محبت اور نفرت کا معیار]

٧٤۔((وَنُحِبُّ أَهْلَ الْعَدْلِ وَالأَمَانَةِ وَنَبْغِضُ أَهْلَ الْجَوْرِ وَالْخِيَانَةِ .))

": ......ہم اہل عدل اور اہل امانت سے محبت کرتے ہیں اور اہل ظلم وخیانت کو ناپسند کرتے ہیں"۔

تشریح: ...... یہ کمال درجہ کا ایمان اور کمال درجہ کی عبودیت میں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ عبادت محبت کے انتہائی کامل ہونے اور انتہائی ذلت کا تقاضا کرتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے رسولوں، اور انبیائے کرام علیہم السلام اور اس کے ایمان دار بندوں کے ساتھ محبت کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنا ہے۔ اگر چہ وہ محبت جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اس کا مستحق اللہ تعالیٰ کا غیر نہیں ہوسکتا۔ مگر غیر سے یہ محبت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے؛ اللہ تعالیٰ کی محبت کے ساتھ [شراکت] نہیں۔ سچا محبّ اس چیز کو محبوب جانتا ہے جس سے محبوب کو محبت ہو؛ اور اس چیز سے بغض رکھتا ہے جس سے محبوب دشمنی رکھتا ہو۔ جس سے اس کی دوستی ہو اس سے دوستی رکھتا ہے اور جس سے اس کی دشمنی ہو اس سے دشمنی رکھتا ہے۔ وہ اس کی رضا پر راضی رہتا ہے اور اس کی ناراضگی سے ناراض ہوتا ہے۔ وہ اسی چیز کا حکم دیتا ہے جس کا وہ حکم دیتا ہے اور جس چیز سے وہ روکتا ہے اس سے وہ بھی روکتا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنے محبوب کی موافقت کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ بھی احسان کرنے والوں پرہیز گاروں، توبہ کرنے والوں، پاک صاف رہنے والوں سے محبت کرتے ہیں؛ اور ہم بھی ان سے محبت کرتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں فسادیوں اور تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے؛ اور ہم بھی انہیں پسند نہیں کرتے۔ نیز ہم اللہ تعالیٰ کی موافقت کرتے ہوئے ان سے بغض رکھتے ہیں۔

بخاری، مسلم میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے آپ نے فرمایا:

"جس شخص میں تین چیزیں ہیں وہ ایمان کی حلاوت پائے گا، جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ان کے ماسویٰ ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو۔ وہ شخص جو کسی انسان سے صرف اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرتا ہے۔ اور وہ شخص جو کفر کی طرف پلٹنا ایسے ناپسند کرتا ہے؛ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے نجات عطا کی ہے؛ جیسے اس کو یہ بات ناپسند ہے کہ وہ دوزخ میں گرایا جائے"۔ [1]

پس مکمل محبت اس بات کو مستلزم ہے کہ محبوب کی پسند اور ناپسند؛ دوستی اور دشمنی میں اس کی موافقت کی جائے۔ یہ بات بالکل صاف ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے واجب محبت رکھتا ہے؛ اس کے لیے اس کے دشمنوں سے بغض رکھنا ضروری ہے [2]۔ نیز ان چیزوں کو بھی محبوب سمجھنا بھی ضروری ہے جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں۔ مثلاً: اس کے دشمنوں سے جہاد کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1] متفق علیہ: انس راوی ہیں۔

[2] ۔ اس واجب میں لوگوں کی تین اقسام ہیں: ۱۔ اللہ تعالیٰ کے اولیاء۔ ان سے مطلق محبت رکھنا واجب ہے۔ ۲۔ اللہ تعالیٰ کے دشمن: ان سے مطلق دشمنی رکھنا واجب ہے۔ ۳۔ مخلط (ملے جلے لوگ)۔ جیسے فاسق مسلمان؛ تو اس میں جتنا ایمان اور اطاعت گزاری پائے جاتے ہیں؛ اسی لحاظ سے دوستی رکھنا واجب ہے۔ اور جس قدر برائی؛ فسق و فجور پائے جاتے ہیں؛ اسی قدر ان سے بغض رکھا جائے۔

پس ظالم و جابر بادشاہ یا حاکم سے اس کے ظلم و جور اور خیانت کی وجہ سے نفرت کی جائے گی۔ اور جس قدر اس میں ایمان واطاعت گزاری پائے جاتے ہیں؛ اس قدر اس سے محبت کی جائے گی۔ ظالم اور فاسق و فاجر مسلمان کو اس بغض و نفرت میں کافر کے برابر نہیں کیا جا سکتا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾ (الصف : ٤)

''بے شک اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں جو اس کی راہ میں یوں جم کر لڑتے ہیں کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔''

پس محبت اور دشمنی کا معیار انسان کے اندر موجود اخلاق حمیدہ اور اخلاق فاسدہ ہیں۔ بے شک کسی انسان میں محبت اور دشمنی کے؛ اور محبت اور بغض کے اسباب جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ایک وجہ سے محبوب اور ایک وجہ سے مبغوض ٹھہرتا ہے۔ حکم غالب عنصر کے مطابق لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں بندے کا معاملہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک چیز کو ایک لحاظ سے محبوب رکھتے ہیں اور دوسرے لحاظ سے اسے ناپسند کرتے ہیں۔

جیسا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: آپ اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''میں کسی چیز میں تردد نہیں کرتا جب میں نے اسے کرنا ہے، جیسے مجھے اپنے مؤمن بندے کی روح قبض کرنے میں تردد ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بندہ موت کو ناپسند ہے اور میں اسے تکلیف دینے کو ناپسند جانتا ہوں۔ حالانکہ اسے موت سے بچاؤ نہیں ہے''۔ [1]

اس میں وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ تردد فرماتے ہیں۔ تردد دو ارادوں کے تعارض کا نام ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اس چیز کو دوست جانتے ہیں جس کو اس کا مومن بندہ دوست سمجھتا ہے اور جس چیز کو وہ مکروہ جانتا ہے اس کو وہ بھی مکروہ جانتا ہے، چونکہ مومن بندہ موت کو مکروہ جانتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ بھی اس کو مکروہ جانتا ہے۔ جیسا کہ خود فرمان ربانی ہے: ''اور میں اسے تکلیف دینے کو ناپسند جانتا ہوں''۔

مگر جب اللہ تعالیٰ نے موت کا فیصلہ فرما دیا ہے تو وہ اس کا نفاذ ہو کر رہے گا۔ اسی کو تردد کا نام دیا گیا ہے۔ پھر واضح کر دیا کہ: موت کا ہر حال میں واقع ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ موت سے مومن بندے کو اس سے بڑا محبوب حاصل ہوگا۔

[1] ۔ اس حدیث کی تخریج گزر چکی ہے۔

[متشابہات کا علم اور اہل سنت کا موقف]

۷۵۔((وَنَقُولُ اللّٰهُ أَعْلَمُ فِيْمَا اشْتَبَهَ عَلَيْنَا عِلْمُهٗ))

" جس کا علم ہم پر مشتبہ ہے اس کے بارے میں ہم کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے''۔

تَشْرِيح:......شیخ کے کلام میں پہلے گزر چکا ہے کہ دین اسلام میں وہی انسان سلامتی والا ہے، جس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے سپرد کر دیا اور مشتبہ چیزوں کے علم کو ان کے جاننے والے کی طرف سپرد کر دیا اور جو شخص بلا علم گفتگو کرتا ہے وہ اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ﴾(القصص: ۵۰)

''اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍo كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِo﴾ (الحج: ۳،۴)

''اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی شان میں علم کے بغیر جھگڑتے ہیں اور ہر شیطان سرکش کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ طے ہو چکا ہے جو اسے دوست رکھے گا تو وہ اس کو گمراہ کر دے گا اور دوزخ کے عذاب کا رستہ دکھائے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ اَتَاهُمْ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍo﴾ (غافر: ۳۵)

''جو لوگ بغیر ان کے پاس آنے والی کسی دلیل کے اللہ تعالیٰ کی آیات میں جھگڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک جھگڑا سخت ناپسند ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَo﴾(الاعراف: ۳۳)

''فرما دیں: میرے رب نے فحاشی کو حرام کیا ہے؛ خواہ وہ ظاہری ہو یا پوشیدہ؛ اور گناہ کو ناحق زیادتی کو بھی۔اور یہ کہ تم کسی کو اللہ کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بابت ایسی باتیں کہو جن کا تمھیں کچھ علم نہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کا حکم دیا کہ جن باتوں کو آپ نہیں جانتے ہیں ان کے علم کو اللہ تعالیٰ کی جانب رد فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (الکهف : ٢٦)

''فرما دیں: جتنی مدت رہے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اسی کو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں (معلوم) ہیں۔''

نیز نبی کریم ﷺ سے جب مشرکین کے بچوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ انھوں نے کون سے اعمال کرنے تھے [1]۔

[1] بخاری و مسلم . ابی ہریرۃ اور ابن عباس سے مروی ہے۔

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: دین میں اپنی رائے کو تہمت زدہ سمجھو۔ اگر آپ ابو جندل رضی اللہ عنہ کے واقعہ کے دن مجھے دیکھ پاتے جب میں اپنی رائے سے رسول اللہ ﷺ کے حکم کو رد کر رہا تھا؛ یہ میرا بھرپور اجتہاد تھا؛ اور میں اس میں کوئی پرواہ محسوس نہ کرتا تھا۔ اور اس وقت تحریر لکھی جا رہی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: "بسم اللہ تعالیٰ الرحمن الرحیم" تحریر کرو، اس نے کہا: "باسمك اللهم" تحریر کرو۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے رضامندی کا اظہار فرمایا؛ اور اسے تحریر کر دیا؛ میں نے انکار کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عمر! تو مجھے دیکھتا ہے کہ رضامند ہوں تو پھر انکار کر رہا ہے''۔ [1]

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: سنت وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمایا، پس تم کسی کی غلط رائے کو امت کے لیے سنت قرار نہ دو۔

نیز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے کون سی زمین اٹھائے گی اور مجھ پر کون سا آسمان سایہ کرے گا، اگر میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنی رائے کا اضافہ کروں؛ یا ایسی بات کہوں جو میں نہیں جانتا''۔

[1] طبرانی فی الکبیر (۱/۵/۱) ابن حزم فی الاحکام (۶/۴۶) فضالہ بن مبارک کے علاوہ رواۃ ثقہ ہیں وہ مدلس ہے کما فی التقریب پھر اس نے عن کے صیغہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ہیثمی نے مجمع الزوائد (۱/۱۷۹) میں کہا اس کو ابو یعلی نے روایت کیا اس کے رواۃ موثق ہیں، اگرچہ ان میں مبارک بن فضالہ ہے دوسرے مقام (۶/۱۴۵/-۱۴۶) میں کہا اس نے طویل روایت کی لیکن اس نے مکمل بیان نہیں کیا بزار نے بھی روایت کیا رواۃ صحیح ہیں اس کا پہلا ٹکڑا صحیحین میں سہل بن حنیف کا قول ہے۔

حسن بن حلوائی نے بیان کیا؛ وہ عارم سے، اس نے حماد بن زید سے، اس نے سعید بن ابی صدقہ سے، اس نے ابن سیرین سے، روایت کیا ہے؛ وہ فرماتے ہیں: ''علم کے بغیر بات کرنے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی شخص خائف نہ رہتا تھا۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد علم کے بغیر بات کرنے میں کوئی شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ خائف نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک واقعہ آیا۔ کتاب اللہ تعالیٰ سے اس کی دلیل نہ مل سکی نہ ہی سنت رسول ﷺ سے اس کا اثر مل سکا۔ تو پھر آپ نے اجتہاد کیا اور کہا یہ میری رائے ہے، اگر درست ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور اگر غلط ہوگی تو میری طرف سے ہے اس پر میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں''۔

موزوں پر مسح

۷۶۔((وَنَرَى الْمَسْحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ ①فِي السَّفَرِ وَالْحَضَرِ كَمَا جَاءَ فِي الأَثَرِ .))

''اور ہم موزوں پر مسح کو سفر وحضر میں جائز سمجھتے ہیں جیسا کہ احادیث میں وارد ہوا ہے''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: عقیدہ پر لکھنے والے دوسرے مؤلفین کی اتباع میں مصنف رحمہ اللہ نے بھی جراب اور نعلین کو چھوڑ کر موزے پر مسح کرنے کو یہاں دو اسباب کی بنا پر ذکر کیا ہے۔ پہلا سبب: اس موزوں پر مسح کی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں۔ دوسرا سبب: اس مسئلہ میں رافضی اہل سنت والجماعت کے مخالف ہیں؛ اور متواتر احادیث کے ساتھ ان کے رد میں یہ ایک قوی حجت ہے۔ انہوں نے موزوں پر مسح کی نفی نہیں کی کیونکہ اس کا ثبوت موجود ہے۔ ایسے ہی جراب اور جوتے [نعلین] پر مسح کرنے کا ثبوت بھی موجود ہے اس کی تفصیل آپ کو شیخ قاسمی کی کتاب ''المسح علی الجوربین'' میں مل جائے گی۔ میں نے اس پر حاشیہ لکھا ہے؛ اور تخریج کی ہے؛ اس میں مسح کے بہت سارے مسائل ذکر کئے گئے ہیں۔ (مطبوع فی المکتب الاسلامی)۔

تَشْرِیح:...... موزوں پر مسح اور دونوں پاؤں کے دھونے کا عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ روافض اس متواتر سنت کی مخالفت کرتے ہیں''۔[منهاج السنة النبوية ٤/ ١٧٤]

❀ ہم ان سے پوچھتے ہیں: جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو کے مسائل کو قولاً وعملاً ذکر کیا ہے؛ اور جنھوں نے آپ سے وضو کرنا سیکھا؛ آپ کی موجودگی میں وضو کیا، آپ نے انھیں اس پر برقرار رکھا۔ پھر انھوں نے اس کو تابعین رحمہم اللہ کی طرف نقل کیا؛ ان کی تعداد ان صحابہ سے زیادہ ہے جنھوں نے وضو کی آیت کے الفاظ کو نقل فرمایا۔ ظاہر ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وضو فرماتے، اور وضو کا طریقہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی سیکھا تھا۔ اس لیے کہ ان کے ہاں دور جاہلیت میں وضو کا طریقہ رائج نہ تھا۔ پھر انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی ہی بار وضو کرتے ہوئے دیکھا؛ اس تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کے دھونے کا ذکر اتنی زیادہ تعداد میں نقل کیا ہے؛ اور اس کی کئی اسناد ہیں۔ ان میں سے کچھ روایات صحاح میں ہیں [اور دیگر کتب احادیث میں بھی اس کا ذکر ہے] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایڑھیوں اور پاؤں کے نچلے حصوں کے لیے ویل دوزخ ہے''۔①

①۔ متفق عليه ؛ لیکن بخاری اور مسلم کی روایت میں ''وبطون الاقدام " (اور پاؤں کے نچلے حصے) کے الفاظ نہیں پائے جاتے۔ یہ الفاظ مسند أحمد ٤/ ١٩١ پر صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ تعالیٰ بن حارث بن جزء الزبیدی سے روایت کیے گئے ہیں۔ دیکھیں: بخاری ٦٠ ؛ مسلم ٢٤١ ۔ ابن عمرو کی روایت : بخاری ١٦٥ ؛ مسلم ٢٤٣ ؛ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت : مسلم ٢٤٠ ؛ حضرت ابوهریره کی روایت : مسلم ٢٤٢ ۔

❀ لیکن اگر پاؤں کے اوپر کے حصے کا مسح فرض ہوتا تو پھر سارے پاؤں کا دھونا ایک ایسی تکلف ہوتا جس کی طرف طبعی میلان نہ ہوتا۔ جیسا کہ اقتدار اور مال کی جانب طبعی میلان ہوتا ہے۔ پس اگر وضو کے طریقہ کی متواتر روایات میں میں طعن جائز ہوتا تو آیت وضو کے الفاظ نقل کرنے میں بالاولیٰ طعن جائز ہوتا۔ اور جب یہ کہتے ہیں کہ: آیت کے الفاظ تواتر کے ساتھ ثابت ہیں جس میں

جھوٹ اور خطا کا امکان نہیں ہے''۔تو یاد رہے کہ وضو کے نقل میں بھی تواتر بالاولی اور اکمل طور پر ثابت ہے۔اور آیت کے الفاظ متواتر سنت کے مخالف نہیں ہیں۔اس لیے کہ لفظ مسح جب مطلق طور پر بولا جاتا ہے تو اس سے مراد [پانی] پہنچانا ہوتا ہے؛ایسے ہی اس لفظ کے اطلاق سے پانی بہانا بھی مراد لیا جاتا ہے۔جیسا کہ اہل عرب کہتے ہیں''تمحست للصلوٰۃ''میں نے نماز کے لیے پانی بہایا''۔

نیز آیت میں دلالت موجود ہے کہ پاؤں کے مسح سے مراد مسح نہیں جو غسل دھونے کے بالمقابل ہے، بلکہ وہ مسح ہے جو غسل [دھونے] کی ایک قسم ہے؛اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ''إِلَى الْكَعْبَيْن'' (ٹخنوں تک) کے الفاظ ذکر کیے ہیں۔''کِعَاب'' جمع کا صیغہ ذکر نہیں فرمایا،جیسا کہ ''إلی المرافق''جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے۔پس معلوم ہوا کہ پاؤں میں ایک ٹخنہ نہیں، جیسے ایک ہاتھ میں ایک کہنی ہوتی ہے۔بلکہ ہر ایک پاؤں میں دو ٹخنے ہیں۔پس اللہ تعالیٰ نے دو اونچی ہڈیوں تک مسح کرنے کا حکم دیا ہے۔تو اس لحاظ سے اس مسح سے مراد غسل [دھونا] ہے۔ظاہر ہے کہ جو شخص پاؤں کے اوپر کے حصہ کا وہ خاص مسح کرے گا؛تو یہ مسح پاؤں کی پشت پر ہی ہوگا''۔[منهاج السنة ٤/ ١٧٧]

❀ لیکن آیت کریمہ میں اس مسح کی غایت کعبین متعین ہے؛جو ان کے قول کا رد کر رہی ہے۔پس ان کا یہ دعویٰ کہ پاؤں کا فرض مسح کعبین تک ہے؛اس سے مراد پنڈلی اور قدم کے جمع ہونے کی جگہ مراد ہے۔جہاں تسمہ باندھا جاتا ہے ان کی یہ بات کتاب وسنت کی روشنی میں مردود ہے۔

نیز اس آیت کی دو مشہور قراءتیں ارجلَ پر زبر اور اس کے نیچے زیر کے ساتھ ہیں۔ان دونوں کے اعراب کی توجیہ اپنے مقام پر وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ہاں زبر والی قراءت تو دھونے کے وجوب پر نص ہے اس لیے کہ محل عطف اس وقت ہوتا ہے جب معنیٰ ایک ہو جیسے؛شاعر کہتا ہے''فلسنا بالجبال و لا الحديدا''ہم نہ پہاڑ ہیں نہ لوہا۔

نیز''مسحت براسی ورجلی''کا معنی مسحت راسی ورجلی والا نہیں ہے۔بلکہ لفظ المسح سے زیادہ معنی کا فائدہ مل رہا ہے۔یعنی کچھ پانی کو سر کے ساتھ ملانا،لہٰذا ارجل کا عطف ایدی پر متعین ہو جاتا ہے''۔[منہاج ۱/ ۱۷۷]

اور سنت متواترہ اس معنیٰ کو ثابت کرتی ہے جس کو بعض لوگ ظاہر قرآن سے بھی سمجھتے ہیں؛بیشک رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے قرآن کریم کے الفاظ اور معانی دونوں بیان فرمائے ہیں۔جیسے حضرت ابو عبدالرحمٰن سلمی رحمہ اللہ کا فرمان ہے:

''ہمیں ان لوگوں نے بتایا جو ہمیں قرآن پاک پڑھاتے تھے؛حضرت عثمان بن عفان،اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما؛اور ان کے علاوہ دیگر حضرات؛جب وہ نبی کریم ﷺ سے دس آیات پڑھ لیتے تو اس سے آگے نہ بڑھتے جب تک کہ اس کا معنی نہ معلوم کر لیتے''۔[منهاج السنة ٤/ ١٧٦]

اور پاؤں پر مسح کے ذکر میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ پاؤں پر تھوڑا پانی گرایا جائے؛دیکھا گیا ہے کہ پاؤں کے دھونے میں پانی زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔بہرحال مسئلہ واضح ہے کتب فروع میں بحث موجود ہے وہاں دیکھیں۔

حج اور جہاد اور حکام کی اطاعت:

۷۷۔((وَالْحَجُّ وَالْجِهَادُ مَاضِيَانِ مَعَ وَلِيِّ الأَمْرِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ بَرِّهِمْ وَفَاجِرِهِم إِلَى قِيَامِ السَّاعَةِ① . لاَ يُبْطِلُهُمَا شَيْءٌ وَلاَ يَنْقُضُهُمَا .))

''حج اور جہاد قیامت تک کے لیے مسلمانوں کے ولی امر [حاکم] کی رفاقت میں جاری رہیں گے؛ خواہ ان میں سے نیک ہو یا بد؛ ان دونوں کو نہ کوئی چیز باطل کر سکتی ہے اور نہ ہی ختم کر سکتی ہے''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جان لیجیے کہ جہاد کی دو اقسام ہیں: فرض عین: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان ملک پر حملہ کی صورت میں دشمن سے مقابلہ کی ضرورت ہو؛ جیسے آج کل یہود نے فلسطین پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ تمام مسلمان اس وقت تک گنہگار تصور ہوں گے حتی کہ وہ یہود کو فلسطین سے نکال باہر کریں۔ دوسری قسم: فرض کفایہ: جب کچھ لوگ یہ فریضہ ادا کر رہے ہوں تو دوسروں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ تعالیٰ دعوت اسلام کو دوسرے تمام ممالک تک پھیلانا ہے؛ حتی کہ وہاں اسلام کی حاکمیت قائم ہو جائے۔ اور ان ممالک کے رہنے جو لوگ مسلمان ہو جائیں تو فبہا؛ اور جو کوئی اس کی راہ میں رکاوٹ بنے؛ اس سے قتال کیا جائے حتی کہ اللہ تعالیٰ کا دین سربلند ہو جائے۔ پس یہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ نہ کہ پہلی قسم کا جہاد۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کل بعض اہل قلم اس کا انکار کرتے ہیں۔ بس اتنا ہی نہیں؛ بلکہ وہ جہاد کو اسلام کی خصوصیت بتاتے ہیں۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی کمزوری اور جہاد فرض عین کو ادا کرنے سے ان کی عاجزی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا: ''جب تم کاروبار میں لگ جاؤ گے اور گائے بیل کی دم پکڑ لو گے؛ اور کھیتی باڑی پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد فی سبیل اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دیں گے؛ اور یہ ذلت اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک تم اپنے دین کی طرف رجوع نہ کر لو''۔[الصحيحة ۱۱]

تشریح: ......اس سے شیخ رحمہ اللہ کا مقصد روافض کا رد ہے؛ وہ کہتے ہیں: ''جہاد فی سبیل اللہ تعالیٰ اب نہیں ہے ہاں جب آل محمد سے امام رضا [مہدی] کا ظہور ہوگا اور آسمان سے منادی اعلان کرے گا کہ تم اس کا اتباع کرو تو پھر جہاد ہوگا''۔

❀ ان کے اس عقیدہ کا باطل ہونا اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے امام کے بارے میں شرط لگائی ہے کہ وہ معصوم ہو۔ یہ شرط بغیر کسی دلیل نہیں کے ہے۔ اس کے برخلاف صحیح مسلم میں حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرماتے تھے:

''تمھارے بہترین امام/حکمران وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہیں؛ اور تم ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہو اور وہ تمھارے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ اور تمھارے بدترین امام/حکمران وہ ہیں جن کو تم برا جانتے ہو اور وہ تمھیں برا جانتے ہیں؛ اور تم ان پر لعنت کرتے ہو وہ تم پر لعنت کرتے ہیں''۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اس وقت ہم ان سے معاہدہ ختم نہ کر دیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں؛ جب تک وہ تم میں اقامت صلوٰۃ کا خیال رکھتے ہیں''۔ آگاہ رہو! جس شخص پر حکمران مقرر کر دیا جائے؛ اور وہ دیکھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمان کا ارتکاب کرتا ہے؛ تو وہ اس کی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو برا سمجھے؛ لیکن اس کی اطاعت سے دستکش نہ ہو''۔ 1

۞ حدیث صحیح ھے۔ مسلم، الصحیحۃ (۹۰۷)

اس مضمون کی احادیث پہلے بھی امامت کی بحث میں گزر چکی ہیں۔ خیال رہے حدیث میں یہ نہیں کہا گیا کہ: امام کا معصوم ہونا واجب ہے''۔ روافض اس مسئلہ میں تمام فرقوں سے زیادہ گمراہ/ گھاٹے کا شکار ہیں۔ اس لیے کہ وہ امام معصوم کو امام معدوم سمجھتے ہیں؛ جو انہیں دینی فائدہ دے سکتا ہے اور نہ ہی دنیاوی۔ اور یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ امام منتظر محمد بن حسن عسکری ہے؛ جو ان کے خیال میں سن دوصد ساٹھ ہجری میں یا اس کے قریب قریب سامراء کے غار میں داخل ہو گیا تھا۔ اب یہ لوگ وہاں پر سواری لیکر کھڑے ہوتے ہیں؛ وہ سواری خچر یا گھوڑا ہوتی ہے؛ تا کہ جب اس کا ظہور ہو تو وہ اس پر سوار ہو سکے۔ نیز بعض متعین اوقات میں وہاں پر منادی کرنے والوں کا بھی تقرر کرتے ہیں جو آواز لگاتے ہیں: ''اے ہمارے مولا! آپ ظہور فرمائیں۔ اے ہمارے مولا! آپ ظہور فرمائیں۔ اور وہاں اسلحہ کی نمائش بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ وہاں ان سے کوئی بھی لڑائی لڑنے والا نہیں ہوتا''۔ [منهاج السنة ۱/ ٤٤]

اس کے علاوہ مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں جن پر اہل عقل کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔

شیخ رحمہ اللہ کا قول: ''اولوالامر'' یعنی حکمران خواہ وہ نیک ہوں یا فاسق فاجر؛ اس کا سبب یہ ہے کہ حج اور جہاد دونوں ایسے فرائض ہیں جو سفر کے ساتھ متعلق ہیں۔ اس لحاظ سے ایسے حاکم کی ضرورت ہے جو لوگوں کی راہنمائی کرے، دشمنوں کا مقابلہ کرے یہ کام جس طرح نیک حاکم کے ساتھ پورا ہو سکتا ہے فاسق فاجر حاکم کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

کرام کاتبین پر ایمان

۷۸۔((وَنُؤْمِنُ بِالْكِرَامِ الْكَاتِبِينَ فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ جَعَلَهُمْ عَلَيْنَا حَافِظِيْنَ .))

"......کراماً کاتبین پر ہم ایمان رکھتے ہیں؛ بیشک اللہ تعالیٰ نے ان کو ہم پر نگہبان بنایا ہے"۔

تَشْرِیح:......ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِينَo كِرَامًا كَاتِبِينَo يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَo﴾ (الانفطار: ۱۰،۱۲)

"حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں؛ عالی قدر لکھنے والے؛ جو تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌo مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌo﴾ (ق: ۱۷،۱۸)

"جب دو لکھنے والے جو دائیں بائیں بیٹھتے ہیں لکھ لیتے ہیں کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک سخت نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَهُ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ﴾ (الرعد: ۱۱)

"اس کے آگے اور پیچھے اللہ تعالیٰ کے چوکیدار ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ﴾ (الزخرف: ۸۰)

"کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں اور سرگوشیوں کو سنتے نہیں، ہاں ہاں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی) سب باتیں لکھ لیتے ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَo﴾ (الجاثیہ: ۲۹)

"یہ ہماری کتاب تمھارے بارے میں سچ سچ بیان کرتی ہے جو کچھ تم کیا کرتے تھے ہم لکھواتے جاتے تھے۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَo﴾ (یونس: ۲۱)

''بے شک ہمارے فرشتے اس کو لکھ لیتے ہیں جو تم تدبیریں کرتے ہو۔''

صحیح حدیث میں مروی ہے؛ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''تم میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے باری باری آتے ہیں اور صبح، عصر کی نمازوں میں جمع ہوتے ہیں۔ جو فرشتے تم میں موجود تھے؛ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اوپر چلے جاتے ہیں؛ اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرماتے ہیں؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتے ہیں: ''تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟

وہ جواب دیتے ہیں کہ جب ہم ان کے پاس آئے تو وہ نماز میں مشغول تھے اور جب ہم ان سے جدا ہوئے تب بھی وہ نماز میں مشغول تھے''۔ 1

ایک دوسری حدیث میں ہے: ''بیشک تمھارے ساتھ وہ لوگ ہیں جو تم سے صرف قضاء حاجت اور جماع کے وقت جدا ہوتے ہیں وگرنہ ساتھ رہتے ہیں پس تم ان سے شرم کرو اور ان کی عزت کرو''۔ 2

کتب تفسیر میں ہے: ''ہر انسان کے دائیں اور بائیں جانب دو فرشتے ہوتے ہیں: جو اعمال لکھتے ہیں، دائیں طرف والا نیکیاں لکھتا ہے اور بائیں طرف والا برائیاں لکھتا ہے؛ ان کے علاوہ دو فرشتے اور ہوتے ہیں جو حفاظت کرتے ہیں؛ اور پہرہ داری پر مامور ہوتے ہیں، ایک پیچھے اور ایک آگے ہوتا ہے۔ انسان دن بھر چار فرشتوں کے درمیان ہوتا ہے۔ رات کو ان کے بدل چار فرشتے اور آجاتے ہیں؛ دو حفاظت کرتے ہیں اور دو اعمال لکھتے ہیں''۔ ارشاد ربانی ہے:

1 بخاری(۵۵۵)، مسلم(۶۳۲)۔ حدیث ابی هریرة۔ الظلال الجنة (۴۹۱).

2 حدیث ضعیف ھے۔ الترمذی (۲۹۶۴)الاحادیث الضعیفه (رقم: ۲۲۴۱).

﴿يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ (الرعد: ۱۱)

''وہ اس کی اللہ تعالیٰ کے حکم سے حفاظت کرتے ہیں۔''

کی تفسیر میں عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ:

''فرشتے آگے اور پیچھے سے حفاظت کرتے ہیں جب تقدیر الٰہی آجاتی ہے تو وہ دور ہو جاتے ہیں''۔

صحیح مسلم (۲۸۱۴) اور مسند احمد بن حنبل (۳۶۴۷) میں ایک حدیث عبداللہ سے ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہیں؛ مگر کے ساتھ اس کا ایک ساتھی جنون سے اور ایک ساتھی فرشتوں سے مقرر ہے''۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ کے ساتھ بھی ہے؟ فرمایا: ''ہاں میرے ساتھ بھی ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف میری مدد فرمائی ہے کہ: '' فَأَسْلَمَ ''''وہ ایماندار ہو گیا''؛ پس وہ مجھے نیکی کا ہی حکم کرتا ہے''۔ 1

اس روایت '' فَأَسْلَمَ ''؛ کی میم پر زبر ہے۔ دوسری روایت میں یوں ہے: '' فَأَسْلَمُ '' یعنی میم پر پیش کے ساتھ۔ اس کے الفاظ میں تحریف ہوگئی ہے۔ اس لیے کہ: '' فَأَسْلَمَ '' کا معنی ہے: شیطان ایماندار ہو گیا؛ اور وہ میرے احکام کی اطاعت کرنے لگ گیا۔ یہ دو میں سے ایک صحیح قول کے مطابق ہے۔ اسی لیے فرمایا: ''پس وہ مجھے صرف نیکی کا ہی حکم کرتا ہے''۔ اور جس کسی نے یہ کہا ہے کہ شیطان ایمان دار ہو گیا؛ اس نے اس کے معنی میں تحریف کر دی ہے۔ [منہاج ۲۷۱/۸]

بیشک شیطان ایماندار نہیں ہوتا۔ ❷

❶ عبد اللہ تعالیٰ بن مسعود راوی ھیں اس کو دارمی نے کتاب الرقاق میں ذکر کیا ھے۔

❷ شیخ احمد شاکر فرماتے ہیں کہ اسلم کی میم پر کیا اعراب ہے اس پر بہت پرانا اختلاف ہے۔ راجح مذہب یہ ہے کہ فتح ہے جیسا کہ شارح نے ذکر کیا لیکن شارح نے جس معنی کو ترجیح دی ہے اس کو ترجیح نہیں ہے۔ چنانچہ قاضی عیاض نے رحمہ اللہ مشارق الانوار (۲/ ۲۱۸) میں ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ زبر اور پیش دونوں طرح منقول ہے پیش کی صورت میں یہ معنی ہوگا کہ میں اس سے محفوظ رہتا ہوں اور زبر کی صورت میں یہ معنی ہوگا کہ وہ قرین اسلام لے آیا، امہات کے علاوہ کتابوں میں فاستسلم کے لفظ مروی ہیں امہات سے مراد موطا اور صحیحین ہیں ان دونوں میں یہ حدیث نہیں ہے۔ امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ یہ دونوں مشہور روایات ہیں البتہ اس میں اختلاف ہے کہ راجح کون ہے؟۔ خطابی نے پیش کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے لیکن قاضی عیاض نے زبر کو راجح کہا ہے۔ حافظ ابن حبان نے اس روایت کو صحیح (۲/ ۲۸۳) مخطوط عکسی میں میم کی زبر کو یقین کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ نیز اس نے بیان کیا کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا شیطان مسلمان ہوگیا اب وہ آپ کو صرف بھلائی کا ہی مشورہ دیتا ہے لیکن یہ معنی درست نہیں کہ آپ اس سے محفوظ ہیں اگرچہ وہ کافر ہے دلائل اس معنی کو ترجیح دے رہے ہیں شارح مدعی ہے کہ یہ تحریف معنوی ہے یہ اس لیے کہ حدیث میں لفظ قرین کے ہیں شیطان کے نہیں ہیں۔ نیز جنوں میں مومن کافر سبھی ہیں لیکن شیاطین تو تمام کافر ہیں ان میں ایماندار کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔

اور "يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ" یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس معنی کی شہادت دوسری قراءت سے ہو رہی ہے جس میں من 'مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ' کی بجائے 'بِاَمْرِ اللّٰهِ' پڑھتے ہیں۔

پس نصوص مذکورہ سے ثابت ہوا کہ فرشتے قول، فعل تحریر کر لیتے ہیں، ایسے ہی نیت بھی؛ کیونکہ اس کا شمار دل کے اعمال میں ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (12)﴾ "وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو"۔

اس کی تائید رسول اکرم ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل فرماتے ہیں:

"جب میرا بندہ برائی کا ارادہ کرے تو تم اسے تحریر نہ کرو، اگر برائی کر لیتا ہے تو پھر تحریر کرو اور جب میرا بندہ نیکی کا ارادہ کرے لیکن کر نہ پائے تو اس کے نامۂ اعمال میں نیکی ثبت کرو، اگر نیکی کرے تو ایک کی جگہ دس نیکیاں تحریر کرو"۔ 1

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے: "فرشتے عرض کرتے ہیں: "یہ بندہ برائی کا ارادہ رکھتا ہے؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اس کا انتظار کرو اگر برائی کرے تو ایک برائی تحریر کر دو؛ اور اگر ارادہ چھوڑ دے؛ تو ایک نیکی لکھ دو؛ اس لیے کہ برائی میرے خوف کی وجہ سے چھوڑی ہے"۔ 2

❶ بخاری (٦٤٩١)، مسلم (٢٠٨)، حدیث ابی هریرة.

❷ بخاری (٧٥٠١)، مسلم (١٢٩)، حدیث ابی هریرة. خرّجاه فی الصحیحین و اللفظ لمسلم۔

ملک الموت پر ایمان

۷۹۔((ونُؤْمِنُ بِمَلِكِ الْمَوْتِ① الْمُوَكِّلِ بِقَبْضِ أَرْوَاحِ الْعَالَمِيْنَ .))

''ہمارا ملک الموت پر ایمان ہے جو جہان والوں کے ارواح کے قبض پر مقرر ہے''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس فرشتے کا یہ نام قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔لیکن اس کا نام عزرائیل جیسا کہ لوگوں میں مشہور ہو گیا ہے؛ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ یہ اسرائیلیات میں سے ہے۔

تشریح:......ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ۝﴾ (السجدة: ۱۱)

''فرما دیں: موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمھاری روحیں قبض کرتا ہے پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹ جاؤ گے۔''

مذکورہ ارشاد ربانی کے مخالف یہ ارشاد ربانی نہیں ہے:

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ۝﴾ (الانعام: ٦١)

''یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرشتے اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔''

نیز ارشاد ربانی ہیں:

﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (الزمر: ٤٢)

''اللہ تعالیٰ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کرتا ہے اور جو اپنی نیند میں نہیں مرے؛ پھر جن کی موت کا فیصلہ ہو چکا؛ ان کو روک لیتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقت مقرر تک کے لیے واپس بھیج دیتا ہے۔''

اس لیے کہ ملک الموت ارواح کے قبض اور ان کے نکالنے کا ذمہ دار ہے۔ پھر اس سے ان روحوں کو رحمت کے فرشتے یا عذاب کے فرشتے لے لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد وہ اپنی ذمہ داری نبھاتے ہیں۔ یہ تمام کام اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اور اس کی قضاء قدر؛ اس کے حکم اور فیصلہ سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا فوت کرنے کی نسبت تمام کی طرف اس لحاظ سے ہے۔

نفس وروح کی حقیقت:

نفس کی حقیقت میں اختلاف ہے؛ کہ یہ کیا چیز ہے؟۔ کیا وہ بدن کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے؟ یا اس کی اعراض میں سے ایک عرض ہے؟ یا اس کا ایسا جسم ہے جس میں اس کو رکھا گیا ہے؟ یا مجرد جوہر ہے؟ اور کیا نفس روح کا نام ہے؟ یا اس کا غیر ہے؟۔ اور کیا نفس

امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ ایک نفس ہیں یا تین نفس ہیں؟ اور کیا روح پر موت طاری ہوتی ہے یا موت صرف بدن پر طاری ہوتی ہے؟۔ اس کی تفصیل کے لیے ضخیم کتاب درکار ہے لیکن میں اختصار کے ساتھ اشارات پر اکتفا کروں گا۔ ان شاء اللہ

بعض کہتے ہیں: روح قدیم ہے جب کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا اجماع ہے کہ روح محدث اور مخلوق؛ مربوب؛ مصنوع اور تدبیر کی گئی ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے بدیہی طور پر یہی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ عالم محدث [مخلوق] ہے۔ حتی کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم اسی عقیدہ پر گزر رگئے۔ ان کے بعد کچھ ایسے لوگ نمودار ہوئے جن کا کتاب وسنت کا فہم بہت کمزور تھا۔ وہ خیال کرنے لگے کہ: روح کو قدیم ہے۔ اور اس پر دلیل یہ پیش کی کہ روح کو امر اللہ تعالیٰ کہا گیا ہے؛ اور اللہ تعالیٰ کا امر مخلوق نہیں ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے روح کی اضافت اپنی جانب کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ﴾ (الاسراء: ۸۵)

''کہہ دو کہ روح میرے رب کے امر سے ہے۔''

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ﴾ (الحجر: ۲۹)

''اور میں نے اس میں اپنی روح پھونکی۔''

اسی طرح جیسے: علم، قدرت، سمع، بصر، ہاتھ کی نسبت بھی اپنی طرف کی ہے وہ بھی قدیم ہیں۔ بعض نے اس میں توقف اختیار کیا''۔ [کتاب " الروح " ۱٤٤/ لابن قیم]

لیکن اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ روح مخلوق ہے۔ اس اجماع کے ناقل محمد بن نصر مروزی، ابن قتیبہ رحمہم اللہ وغیرہ ہیں، اس پر دلیل ذیل کی آیت ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیۡءٍ﴾ (الزمر: ٦٢)

''اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔''

اس آیت میں عمومیت ہے؛ تخصیص نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات اس میں داخل نہیں ہیں وہ تو اس کے مسمیٰ میں داخل ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ وہ الٰہ ہے جو صفات کمال کے ساتھ موصوف ہے اس کا علم اس کی قدرت اس کی زندگی اس کی سمع اس کی بصر اور اس کے تمام صفات اسی کے اسم مسمیٰ میں داخل ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور اپنے صفات کے ساتھ خالق ہے اور اس کے ماسویٰ سب مخلوق ہیں اور یہ بات تو قطعیت کے ساتھ معلوم ہے کہ روح نہ اللہ تعالیٰ ہے نہ اس کی صفت ہے۔ وہ تو اس کی مصنوعات سے ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا قول دال ہے:

﴿هَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّهۡرِ لَمۡ یَكُنۡ شَیۡـًٔا مَّذۡكُوۡرًا﴾ (الدھر: ۱)

''انسان پر ضرور ایک ایسا زمانہ بھی آیا ہے کہ اس کا کہیں کچھ بھی ذکر نہ تھا۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام سے خطاب فرمایا:

﴿وَّ قَدۡ خَلَقۡتُكَ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَمۡ تَكُ شَيۡـًٔا﴾ (مریم: ۹)

''اور میں پہلے تم کو پیدا کر چکا ہوں اور تم کچھ چیز نہ تھے۔''

ظاہر ہے کہ انسان جسم اور روح دونوں کا نام ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام سے خطاب ان کی روح اور بدن دونوں کے لیے تھا۔ نیز روح کو وفات، قبض، بند کرنے چھوڑنے کے ساتھ موصوف کیا جاتا ہے۔ یہ تمام صفتیں مخلوق محدث کی ہوتی ہیں۔ ہاں ان کا استدلال کہ روح امر ربی ہے؛ تو یہاں پر امر سے مراد طلب نہیں؛ بلکہ مامور بہ ہے۔ عام استعمال میں مصدر کا ذکر کیا جاتا ہے؛ اور اس سے مراد اسم مفعول لیا جاتا ہے۔ یہ بات مشہور اور معلوم شدہ ہے۔

نیز ان کا استدلال کہ ﴿من روحی﴾ میں روح کی اضافت اللہ تعالیٰ کی جانب ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت کی دو اقسام ہوتی ہیں: ایک وہ صفات جو اپنے بذات خود قائم نہ رہ سکتی ہوں۔ جیسے علم، قدرت، کلام سمع، بصر؛ یہ صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا علم کلام، قدرت، حیات اس کے اوصاف ہیں اسی طرح اس کا چہرہ؛ اور اس کا ہاتھ بھی اس کے اوصاف ہیں۔ دوسری اضافت ان اعیان کی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے جدا ہیں، جیسے بیت، ناقہ، عبد، رسول، روح۔ یہ مخلوق کی اپنے خالق کی طرف نسبت یا اضافت ہے۔ لیکن یہ اضافت تخصیص اور تشریف کا تقاضا کرتی ہے؛ جس کی وجہ سے مضاف دوسرں سے امتیازی حیثیت پاتا ہے۔

روح کے متعلق اختلاف:

روح میں اختلاف ہے کیا اس کو جسم سے پہلے پیدا کیا گیا یا بعد میں؟۔ میثاق کے ذکر میں اس کا اشارہ گزر چکا ہے۔

روح کے متعلق یہ اختلاف بھی ہے کا اس کی حقیقت کیا ہے؟ ایک قول کے مطابق وہ جسم ہے۔ بعض نے کہا: عرض ہے۔ بعض نے کہا نہیں جانتے روح کیا ہے؟ جوہر ہے یا عرض؟۔ بعض نے کہا روح صرف طبائع اربعہ میں زیادتی کا نام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ''یہ ایسے خالص خون کا نام ہے جو نہ مکدر ہو نہ اس میں عفونت ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرارت غریزیہ کو روح کہتے ہیں۔ اور روح کو زندگی قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا وہ ایسا جوہر ہے جو بسیط ہے عالم کی تمام ذی روح چیزوں میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ اس کی وجہ سے عمل کرتے ہیں اور تدبیر کرتے ہیں۔ پس روح کا جس طرح بیان ہوا ہے اس لحاظ سے وہ تمام عالم میں پھیلی ہوئی اس کی ذات اور وجود کا انقسام نہیں ہوسکتا۔ اس کا وجود کائنات کی تمام ذی روح چیزوں میں یکساں ہے۔ بعض نے کہا: اس سے مراد وہ نسیم ہے جو سانس لیتے وقت داخل ہوتا ہے اور سانس کے ساتھ خارج ہوتا ہے۔ اور روح عرض ہے جو کہ فقط زندگی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ پس انسان کا مسمّٰی کیا صرف روح ہے یا صرف بدن ہے یا ان دونوں کا مجموعہ ہے؟ یا ان میں سے ہر ایک ہے؟ اور یہ چاروں اقوال ہیں۔ ان کے کلام کے متعلق بھی یہ چار اقوال ہیں: کیا وہ صرف لفظ ہے؟ یا صرف معنی ہے؟ یا دونوں کا مجموعہ ہے؟ یا ان میں سے ہر ایک ہے؟۔ [1]

پس اختلاف ان کے درمیان ناطق اور اس کے نطق میں ہے۔ حق بات یہ ہے کہ انسان دونوں کا نام ہے البتہ قرینہ کی موجودگی میں ایک پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح کی بحث کلام کے معانی میں بھی ہے۔

[1] روح کے بارے میں تفصیلی بحث کے لیے مجموع الفتاویٰ (٤/ ٢١٦) کا مطالعہ کریں۔

کتاب وسنت اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں:

کتاب وسنت اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نیز عقلی دلائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نفس ایسا جسم ہے جو ماہیت کے لحاظ سے جسم محسوس کے برعکس ہے۔ پس نفس ایک نورانی علوی جسم ہے۔ جو کہ خفیف؛ زندہ اور متحرک ہے۔ اعضاء کے جوہر میں اس کا نفوذ ہے۔ وہ ان میں بالکل اس طرح سمویا ہوا ہے جیسے پانی گلاب کے پھول میں سمویا ہوتا ہے؛ یا تیل زیتون میں۔ یا آگ کوئلے میں۔ پس جب تک یہ اعضاء ان آثار کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جن کا ان پر جسم لطیف سے فیضان ہوتا ہے اس وقت تک جسم لطیف اعضاء میں جاری ساری رہتا ہے۔ اوران اثرات سے ان میں حس، حرکت ارادیہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اور جب بوجہ اخلاط غلیظہ کے غلبہ سے ان میں فساد رونما ہوتا ہے تو اثرات کے قبول سے وہ انکار کر دیتے ہیں؛ تو اس وقت روح بدن سے جدا ہوتا ہے وہاں سے منتقل ہو کر عالم ارواح کی طرف چلا جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾ (الزمر: ۴۲)

''اللہ تعالیٰ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔''

اس آیت میں انفس کی وفات کے سلسلہ میں ان کے روکنے اور واپس بھیجنے کا ذکر بھی ہے؛ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ﴾ (الانعام: ۹۳)

''اور کاش تم ان ظالموں کو موت کی سختیوں میں (مبتلا) دیکھو؛ اور فرشتے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں؛ کہ نکالو اپنی جانیں۔''

اس میں فرشتوں کے ارواح کو پکڑنے کے لیے اپنے ہاتھ پھیلانے کا ذکر ہے۔ نیز ارواح کے نکالنے اور ان کے نکلنے؛ اور بروز قیامت ان کو عذاب میں مبتلا کرنے؛ نیز ان کا ان کے رب کی طرف جانے کا ذکر ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ﴾ (الانعام: ۶۰)

''اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمھاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کی بھی خبر رکھتا ہے پھر تمھیں دن کو اٹھا دیتا ہے۔''

اس میں خبر دی گئی ہے کہ نفس رات کو فوت ہو جاتے ہیں اور دن میں ان کو اجسام میں داخل کر دیا جاتا ہے اور موت کے وقت ان کو فرشتے فوت کر لیتے ہیں۔ نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ٥ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ٥﴾ (الفجر: ۲۷۔۳۰)

''اے اطمینان پانے والی روح اپنے رب کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی ہو وہ تجھ سے راضی ہے تو میرے (ممتاز) بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔''

اس میں ان کے اللہ تعالیٰ کی طرف جانے، اس کے بندوں کے زمرہ میں داخل ہونے نیز اللہ تعالیٰ کے ان پر راضی ہونے کا ذکر ہے۔ نیز ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''بے شک روح جب قبض ہوتی ہے تو نظر اس کا پیچھا کرتی ہے''۔ ❶

اس میں روح کی صفت قبض ذکر کی گئی ہے۔ نیز یہ کہ نظر اس کو دیکھ سکتی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''اللہ تعالیٰ نے تمھاری روحوں کو قبض کیا، پھر انھیں تم میں واپس بھیج دیا''۔ ❷

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کی روح پرندہ بن جاتی ہے جو جنت کے درختوں میں معلق رہتی ہے''۔ ❸

آئندہ اوراق میں عذاب قبر پر کثرت کے ساتھ دلائل ذکر کیے جائیں گے کہ کسی طرح روح سے ملک الموت خطاب کرتا ہے؟ نیز روح جسم سے یوں خارج ہوتی ہے جیسے پانی کا قطرہ مشکیزہ کے منہ سے خارج ہوتا ہے۔ نیز روح آسمان کی جانب چڑھتی ہے مومن کی روح سے بہترین خوشبو آتی ہے اور کافر کی روح سخت بدبودار ہوتی ہے۔ مزید اوصاف بھی ذکر ہوں گے۔ اس پر سلف کا اجماع ہے عقل بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔ مخالفین کے پاس سوائے باطل اوہام اور فاسد شبہات کے اور کچھ بھی نہیں۔ وہ نصوص اور عقلی دلائل کا معارضہ نہیں کر سکتے۔

❶ مسلم عن ام سلمه احكام الجنائز (۲۵).

❷ بخاری من حديث ابی قتاده بلال اس كا راوی نهيں هے۔ جيسا كه مؤلف نے كها سهو هو گيا هے احمد وغيره نے اس كو بيان كيا، صحيح ابوداؤد (٤٦٥).

❸ الصحيحة (٩٩٥).

نفس اور روح کے مسمیٰ میں اختلاف:

نفس اور روح کے مسمیٰ میں لوگوں کا اختلاف ہے کیا دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہیں یا ان کا مسمیٰ ایک ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ نفس کا اطلاق چند چیزوں پر ہوتا ہے اسی طرح روح کا اطلاق بھی ہے۔ کبھی تو ان کا مدلول ایک ہوتا ہے اور کبھی مختلف۔ نفس کا اطلاق روح پر ہوتا ہے۔ لیکن غالب استعمال میں نفس تب کہتے ہیں جب وہ بدن کے ساتھ متصل ہو۔ اور جب بدن سے جدا ہو تو اسے اکثر طور پر روح کہا جاتا ہے۔ نیز خون پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے؛ حدیث میں ہے:

((ما لا نفسَ له سائلة لا ينجس الماء إذا مات فيها .))

''جس کا خون بہنے والا نہ ہو، جب وہ پانی میں مرجائے تو اس سے پانی پلید نہیں ہوتا''۔ ❶

نیز نفس کا معنی نظر لگنا بھی ہے۔ اور نفس سے مراد ذات بھی ہوتی ہے؛ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

❶ حديث ميں اس كا كچھ اصل نهيں البته فقهاء كے كلام نے اس كو ذكر كيا هے۔

﴿فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ﴾ (النور: ٦١)

''پس تم اپنے آپ پر سلام کہو۔''

نیز دیکھیں:

﴿لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ (النساء: ٢٩)

''تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔''

ہاں روح کا اطلاق بدن پر نہیں ہوتا؛ نہ انفراداً نہ نفس کے ساتھ۔ البتہ روح کا اطلاق قرآن اور جبرئیل علیہ السلام پر ہوتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا﴾ (الشوریٰ: ۵۲)

''اوراسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ کی طرف روح کی وحی کی۔''

نیز [جبریل امین کے متعلق] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ۝﴾ (الشعراء: ۱۹۳)

''اس کو روح الامین [امانت دار فرشتہ] لے کر اترا ہے۔''

نیز روح کا اطلاق اس ہوا پر بھی ہوتا ہے جو انسان کے بدن میں متردد رہتی ہے۔ اور جس روح کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی تائید فرماتے ہیں؛ وہ یہ روح ایک اور چیز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِيۡمَانَ وَاَيَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ﴾ (المجادله: ۲۲)

''یہ وہ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان تحریر کر دیا ہے اور اپنی طرف کی روح سے ان کی مدد کی ہے۔''

اسی طرح وہ قوتیں جو بدن میں کام کرتی ہیں ان کو بھی ارواح کہا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: دیکھنے والی روح، سننے والی روح، سونگھنے والی روح۔ نیز روح کا اطلاق ایک چیز پر بھی ہوتا ہے جو ان تمام سے زیادہ خاص ہے؛ اور وہ ہے معرفت الٰہی کی قوت، انابت الی اللہ، اللہ تعالیٰ کی محبت؛ نیز اپنی ہمت کو اللہ تعالیٰ کی طلب میں اسے اپنا مقصود و مراد بنانے کے لیے مہمیز دینا [اس کو بھی روح کہا جاتا ہے]۔ پس اس روح کی نسبت اصل روح کی جانب بالکل اس طرح ہے جس طرح روح کی نسبت بدن کی طرف ہوتی ہے۔ پس علم کی روح ہوتی ہے، احسان کی روح ہوتی ہے؛ محبت کی روح ہوتی ہے، توکل کی روح ہوتی ہے صدق کی روح ہوتی ہے۔ [1]

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: العقل والنقل لابن تیمیه (۲/ ۱۷۷).

اس روح کے لحاظ سے لوگوں میں فرق ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں پر یہ تمام ارواح غالب آجاتی ہیں؛ تو وہ روحانی ہو جاتا ہے۔ کچھ وہ ہیں جن میں ان تمام یا اکثر کا فقدان ہوتا ہے وہ سفلی بھیمیت [جانور صفت] والے ہوتے ہیں۔ اکثر لوگوں کے کلام سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ ابن آدم کے تین اقسام کے نفس ہیں: (۱) مطمئنہ (۲) لوامہ (۳) امارہ۔

اور کہتے ہیں: بعض پر ایک قسم غالب ہے، اور بعض پر دوسری، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ۝﴾ (الفجر: ۲۷)

''اے مطمئن روح۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ۝﴾ (القیامه: ۲)

''نفس لوامہ کی قسم۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوۡٓءِ﴾ (یوسف: ۵۳)

''بیشک نفس برائی کا حکم دینے والا ہے۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ نفس تو ایک ہی ہے؛ اور اس کے صفات مختلف ہیں۔ پس نفس برائی کا حکم دیتا ہے۔ مگر جب ایمان اس کا معارضہ کرتا ہے تو وہ لوامہ کہلاتا ہے۔ اس سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو نفس اس کو ملامت کرتا ہے۔ وہ کبھی گناہ پر آمادہ ہوتا ہے تو کبھی رکتا ہے۔ جب ایمان مضبوط ہو جائے تو نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص کو اس کا اچھا کام پسند ہو اور برا کام ناپسند ہو تو وہ مومن ہے''۔ ❶

آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی:

''جب زنا کرنے والا زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا''۔ ❷

❶ الاحادیث الصحیحة (٥٥٠) صحیح الجامع (٦٢٩٤) سنن الترمذی ٢٢٦٨۔ .

❷ متفق علیه . یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے۔

روح کی موت میں اختلاف:

اس میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ روح مرے گی یا نہیں؟ تو ایک فرقہ کہتا ہے: ''روح مرے گی'' اس لیے کہ روح نفس ہے۔ اور ہر نفس مرنے والا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ○﴾ (الرحمن: ٢٦، ٢٧)

''جو کچھ اس پر ہے سب کو فنا ہونا ہے اور تمھارے رب صاحب جلال وعظمت والے کا چہرہ باقی رہے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (القصص: ٨٨)

''اس کے چہرہ کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔''

اور ان کا کہنا ہے کہ جب فرشتوں پر بھی موت طاری ہوگی؛ تو بشری نفوس پر بالاولیٰ موت طاری ہوگی۔

دوسرا فریق کہتا ہے: ''ارواح نہیں مریں گی''۔ انہیں باقی رہنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ البتہ اجسام پر موت طاری ہوتی ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں: ''اس پر وہ احادیث دلالت کرتی ہیں جو ارواح کے جسم سے جدا ہونے کے بعد ان کی نعمتیں ملنے یا عذاب میں مبتلا ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ حتی کہ پھر اللہ تعالیٰ ان کو اجسام میں لوٹا دے گا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ارواح کی موت سے مراد ان کا اجسام سے جدا ہونا اور نکلنا ہے۔ اگر موت سے اتنا ہی مراد لیا جائے؛ تو یہی ﴿ذائقة الموت﴾ موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اور اگر موت سے مراد ارواح کا بالکلیہ فنا اور معدوم ہونا ہے؛ تو اس اعتبار سے روح کو موت نہیں۔ بلکہ ارواح کو انعامات یا عذاب میں رہنے کے ساتھ بقا حاصل ہوگی۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گی۔

[للہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جنت والے کس حال میں ہوں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ﴾ (الدخان: ٥٦)

''پہلی دفعہ کے مرنے کے سوا (کہ مر چکے تھے) موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔''

اس موت سے مراد روح کا جسم سے جدا ہونا ہے۔ لیکن جہاں تک دوزخیوں کے اس قول کا تعلق ہے کہ:

﴿رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ﴾ (المومن: ۱۱)

''اے ہمارے رب! تو نے ہم کو دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ جان بخشی۔''

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾(البقرة: ۲۸)

''تم کیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے ہو؛ جبکہ تم بے جان تھے، پھر اس نے تم کو زندگی عطا کی پھر تمھیں بے جان کرے گا پھر تمھیں زندگی عطا کرے گا۔''

تو مراد یہ ہے کہ وہ اپنے آباء کی پشتوں میں اور اپنی ماؤں کے ارحام میں مردہ [نطفہ] تھے۔ پھر ان کو بعد میں زندہ کیا۔ پھر ان کو مارا؛ پھر قیامت کے روز ان کو زندہ فرمائے گا۔ اس میں قیامت سے قبل ارواح کے مرنے کا ذکر نہیں ہے۔ وگرنہ تین موتیں ہوں گی۔ نفخ صور کے ساتھ ارواح کا بے ہوش ہونا ان کی موت کو لازم نہیں کرتا۔ بے شک لوگ اس وقت بھی بے ہوش ہوں گے جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کرنے کے تشریف لائیں گے؛ اور زمین اس کی روشنی سے چمک اٹھے گی۔ لیکن یہ بے ہوشی موت نہیں ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا؛ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بے ہوش ہونا بھی موت نہیں ہے۔ ہاں یہ [حدیث] اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بے ہوش کرنے والا نفخ صور مخلوق میں سے ہر اس چیز کے لیے موت ہوگا جس نے اس سے پہلے موت کا ذائقہ نہیں چکھا۔ اور جنہوں نے موت کا ذائقہ چکھا ہے؛ یا جن چیزوں پر موت لکھی ہی نہیں گئی جیسے حوریں اور ولدان [جنت کے خدمتگار]؛ ان پر موت نہیں آئے گی۔ یہ آیت اس پر دال نہیں ہے کہ ان پر دوسری بار موت طاری ہوگی۔ [1] واللہ تعالیٰ اعلم۔

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: کتاب الروح (ص ۲٦٤).

عذاب قبر اور منکر و نکیر پر ایمان:

۸۰۔((وَبِعَذَابِ الْقَبْرِ لِمَنْ كَانَ لَهُ أَهْلاً ① وَسُؤَالِ مُنْكَرٍ وَنَكِيْرٍ فِي قَبْرِهِ عَنْ رَبِّهِ وَ دِيْنِهِ وَ نَبِيِّهِ عَلَى مَا جَاءَتْ بِهِ الأَخْبَارُ عَنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ ②، وَعَنِ الصَّحَابَةِ رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَيهِمْ۔))

''ہم عذاب قبر پر ایمان رکھتے ہیں؛ جو اس کے حق دار ہیں؛ اور قبر میں منکر نکیر کے سوالات پر ایمان رکھتے ہیں۔[وہ ہر شخص سے] اس کے رب، اس کے دین، اور اس کے نبی[کے بارے میں پوچھیں گے]۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے احادیث مروی ہیں۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: اس سے مراد کفار اور فاسق مسلمان ہیں۔ کفار کے متعلق تو یہ عذاب قرآن کریم کی قطعی نصوص کی روشنی میں حتمی ہے۔ اور فاسق مسلمانوں کے متعلق بہت ساری ایسی احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے جو کہ حد تواتر تک پہنچتی ہیں۔ جیسا کہ شارح اور دیگر حضرات نے بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق اعتقاد رکھنا ضروری ہے؛ مگر اس کی کیفیت میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کیونکہ عقل اس کیفیت کا ادراک نہیں کر سکتی۔ شریعت ایسی چیز تو بیان نہیں کرتی جو عقلی طور پر محال ہو۔ مگر ایسی چیز ضرور بیان کرتی ہیں جس میں عقل حیران و سرگردان رہ جاتی ہے۔ پس مسلمان پر واجب ہوتا ہے کہ وہ اس کو تسلیم کر لے۔ ان میں سے بعض احادیث جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؛ وہ شرح میں بھی موجود ہیں؛ اور ابن ابی عاصم نے السنہ میں (۸۶۳ تا ۸۷۷) نقل کی ہیں۔ اور میری تحقیق کے ساتھ طبع ہو چکی ہیں۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: یہ احادیث متواتر ہیں؛ جیسا کہ ابھی دو ملائکہ منکر اور نکیر کے اسماء کے بارے میں بیان کیا۔ اس سلسلہ میں صحیح سند کے ساتھ حدیث مروی ہے۔ (الصحیحہ ۱۳۹۱)۔

اُقول: اگر مصنف رحمہ اللہ یوں فرماتے: ''اور ہم عذاب قبر پر ایمان رکھتے ہیں؛ اور قبر کی آزمائش پر بھی'' تو یہ زیادہ بہتر ہوتا۔ اس لیے کہ عذاب قبر سے پہلے آزمائش یعنی امتحان کا مرحلہ ہوگا۔ جس میں میت سے اس کی قبر میں کچھ سوال پوچھے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بیشک رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان انسان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''جب اسے قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کی روح کو اس کے بدن میں لوٹا دیا جاتا ہے؛ اور فرمایا: ''اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اسے بٹھاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔......''۔......اور اسی روایت میں ہے: ''کافر انسان کو جب دفن کیا جاتا ہے اور اس کی روح اس کے بدن میں لوٹائی جاتی ہے۔ پھر اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اسے بٹھاتے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے: تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ہائے افسوس مجھے کوئی پتہ نہیں۔......''۔ رواہ احمد وأبوداؤد وصححہ الألبانی[دیکھیں شرح ہذا]۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب بندہ اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اسکے ساتھی اس سے رخصت ہوتے ہیں اور وہ انکے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔ اور اسکے پاس دو فرشتے آتے ہیں اسے بٹھاتے ہیں......''۔صحیح بخاری: ح 1299۔[یہ طویل حدیث کا ایک حصہ ہے؛ اس حدیث میں کافر کے احوال بھی بتائے گئے ہیں۔ اوپر شرح ملاحظہ فرمائیں] مقصود یہ بتانا ہے کہ عذاب قبر کا مسئلہ اسلافِ امت کے مابین متفق علیہ رہا ہے؛ اور چند بدعتی گروہوں کے علاوہ کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ اس کے دلائل حد تواتر کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اس کی تفصیل شرح شرح السنہ میں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ نیز دیکھیں؛ شرح طحاویہ از براک۔

[قبر کی حقیقت]

۸۱۔ وَالْقَبَرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِأَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النِّيْرَانِ① .

''اور قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے''۔

①۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ فقرہ اصل میں ایک حدیث کا ٹکڑا ہے جسے امام ترمذی (۲/ ۷۵) نے ذکر کیا ہے۔ ضعيف سنن الترمذي (برقم ٤٣٧)؛ عن أبي سعيد مرفوعاً بسند ضعيف ؛ والطرف الأول أخرجه أبو يعلى ؛ وفيه دراج كما في " المجمع ٣/ ٥٥" و هو ذو مناكير۔

تَشْرِیح:......ارشاد ربانی ہے:

﴿وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِo النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِo﴾ (غافر: ٤٥، ٤٦)

''اور فرعون والوں کو برے عذاب نے آگھیرا، جہنم کی آگ پر صبح وشام پیش کیے جاتے ہیں اور جس روز قیامت برپا ہوگی (حکم ہوگا) کہ فرعون والوں کو سخت عذاب میں داخل کرو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَذَرْهُمْ حَتَّى يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَo يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَo وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَٰلِكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَo﴾(الطور: ٤٥۔٤٧)

''پس ان کو چھوڑ دو حتی کہ اپنے اس دن سے جاملیں جس میں وہ بے ہوش کر دیے جائیں گے؛ جس دن ان کا کوئی داؤ کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی اور ظالموں کے لیے اس کے سوا اور عذاب بھی ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔''

اس میں احتمال ہے کہ اس عذاب سے مراد ان کا دنیا میں قتل ہونا وغیرہ ہو؛ یا پھر اس سے مراد برزخ کا عذاب ہو۔ یہی زیادہ واضح ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے بہت سارے لوگ مر جاتے ہیں مگر انہیں دنیا میں عذاب نہیں ہوتا۔ یا اس سے مراد اس سے بھی زیادہ عام ہوسکتی ہے۔ چنانچہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''ہم بقیع غرقد قبرستان میں ایک جنازہ میں تھے کہ ہمارے ہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوئے تو ہم بھی آپ کے گرد بیٹھ گئے، گویا کہ ہمارے سروں پر پرندے تھے (یعنی مکمل خاموشی تھی)۔ میت کے لیے لحد تیار کی جارہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک مومن انسان جب آخرت کی طرف جانے والا ہوتا ہے؛ اور دنیا سے منقطع ہونے والا ہوتا ہے؛ تو اس پر فرشتے نازل ہوتے ہیں گویا کہ ان کے چہرے سورج کی مانند چمک دمک رہے ہیں۔ ان کے پاس جنت کے کفنوں میں کفن اور جنت کی

خوشبوؤں میں سے خوشبو ہوتی ہے۔ وہ [فرشتے] میت سے تاحد نگاہ دور بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت سر کی طرف سے آتا ہے؛ حتی کہ وہ بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: اے پاکیزہ روح! اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رضا کی طرف نکل آ''۔

(راوی بیان کرتا ہے کہ:) ''وہ روح جسم سے یوں نکلتی ہے جیسا کہ پانی کا قطرہ مشکیزرے کے منہ سے باہر آتا ہے''۔ چنانچہ ملک الموت روح کو اٹھاتا ہے، ابھی اس نے اٹھایا ہی ہوتا ہے کہ آنکھ جھپکنے کی مدت کے برابر بھی روح ملک الموت کے پاس نہیں رہتی کہ فرشتے اس روح کو لے لیتے ہیں؛ اور اس روح کو اس کفن میں لپیٹ لیتے ہیں اور خوشبو لگاتے ہیں۔ اس سے ایسی اعلیٰ درجہ کی کستوری کی خوشبو آتی ہے جو روئے زمین پر پائی جاتی ہو''۔ (راوی بیان کرتا ہے): ''فرشتے اس روح کو لے کر آسمانوں کی طرف جاتے ہیں۔ تو جب بھی اسے لیکر فرشتوں کے کسی مجمع کے پاس سے گزرتے ہیں؛ تو وہ کہتے ہیں: یہ کیا ہی پاکیزہ ہے؟ تو فرشتے کہتے ہیں: یہ فلاں بن فلاں ہے۔ اس کو دنیا میں جس بہترین نام سے پکارا جاتا تھا اس نام سے پکارتے ہیں۔ حتی کہ وہ آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ اس کے لیے دروازہ کھلواتے ہیں؛ تو اسے کھول دیا جاتا ہے۔ پس ہر آسمان کے مقرب فرشتے اس کو الوداع کہتے ہیں؛ یہاں تک وہ اس سے اگلے آسمان تک پہنچ جائے۔ حتی کہ وہ اس آسمان تک پہنچ جاتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے کا نام علیین میں تحریر کردو۔ اور اس کو زمین میں واپس لے جاؤ۔ اس لیے کہ میں نے اس کو زمین سے پیدا کیا، اسی میں لوٹاتا ہوں، اسی سے انہیں دوبارہ نکالوں گا''۔

(راوی بیان کرتا ہے): ''اس کی روح اس کے جسم میں واپس کردی جاتی ہے۔ پھر اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں وہ اس کو بٹھا لیتے ہیں؛ اور اس سے دریافت کرتے ہیں، تیرا رب کون ہے؟

وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ تعالیٰ ہے۔

پھر اس سے دریافت کرتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟

وہ کہتا ہے: میرا دین اسلام ہے۔

وہ اس سے دریافت کرتے ہیں یہ آدمی کون ہے؟ جو تم میں بھیجا گیا تھا؟

وہ جواب دیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ہیں۔

پھر وہ دریافت کرتے ہیں تجھے اس کا علم کیسے ہوا ہے؟

وہ جواب دیتا ہے: ''میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھا، میں اس پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی''۔

اس کے بعد ایک منادی آسمان میں ندا لگاتا ہے: ''بے شک میرے بندہ نے سچ کہا ہے۔ اس کے لیے جنت کا فرش بچھا دو؛ اور جنت کی طرف سے اس کے لیے کھڑکی کھول دو''۔

فرمایا: ''اس کے پاس جنت کی عمدہ ہوا اور خوشبو آئے گی اور قبر تاحد نظر وسیع کردی جائے گی۔ اور اس کے پاس ایک خوبصورت انسان آئے گا جس کا لباس بھی عمدہ ہوگا اس سے بہترین خوشبو مہک رہی ہوگی۔ وہ کہے گا: ''تمہیں ایسی چیز کی خوش خبری ہو جو تجھے خوش کردے۔ یہ تیرا وہ دن ہے جس کا تجھے وعدہ دیا گیا تھا''۔

وہ اس سے دریافت کرے گا تو کون ہے؟ تیرا چہرہ تو خیر و بھلائی لانے والے کا چہرہ ہے؟۔
وہ جواب میں کہے گا: ''میں تیرا نیک عمل ہوں''۔
وہ کہے گا: ''اے اللہ! قیامت قائم فرما دے تا کہ میں اپنے اہل اور مال کی طرف واپس جاؤں''۔
اور فرمایا: ''کافر بندہ جب دنیا سے خاتمہ اور آخرت کی طرف سدھار کے قریب ہوتا ہے تو اس کی طرف آسمان سے سیاہ چہرے والے فرشتے اترتے ہیں؛ ان کے ساتھ ٹاٹ ہوتی ہے؛ وہ اسے لے کر تا حد نگاہ دور بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آ کر اس کے سرہانے بیٹھتا ہے اور کہتا ہے: ''اے خبیث روح! اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے غضب کی طرف باہر نکل''۔ پس اس کی روح اس کے تمام جسم میں پھیل جاتی ہے تو اس کو جسم سے یوں نکالا جاتا ہے جیسا کہ لوہے کی سلاخ کو بھیگی اون سے نکالا جاتا ہے۔ پس ملک الموت روح کو جیسے ہی قبض کر لیتا ہے تو فرشتے آنکھ جھپکنے کی بقدر بھی اس کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے؛ اسے لیکر اس ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں جس سے روئے زمین سب سے گندی بدبو آتی ہے۔ فرشتے اس کو لے کر اوپر جاتے ہیں۔ فرشتوں کی جس جماعت پر بھی ان کا گزر رہتا ہے وہ دریافت کرتے ہیں: کیسی خبیث روح ہے؟ وہ جواب دیتے ہیں: یہ فلاں بن فلاں ہے۔ اس کو دنیا میں اس کے سب سے برے نام سے پکارا جاتا ہے۔ حتی کہ پہلے آسمان کے قریب پہنچتے ہیں اس کے لیے دروازہ کھولنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے لیکن دروازہ نہیں کھلتا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ذیل کی آیت تلاوت کی:

﴿لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (الاعراف: ۴۰)

''ان کے لیے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ وہ بہشت میں داخل ہوں گے؛ حتی کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔''

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس کا نام سجین [جہنم] میں تحریر کرو، جو نچلی زمین میں ہے۔ اس کی روح کو وہاں پھینک دیا جاتا ہے، پھر آپ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

﴿وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ۝﴾

(الحج: ۳۱)

''اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک مقرر کرے تو وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑا پھر اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے۔''

تو اس کی روح کو اس کے جسم میں واپس کر دیا جاتا ہے۔ اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں وہ اس کو بٹھا دیتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں: ''تمہارا رب کون ہے''۔؟
وہ کہتا ہے: ہائے ہائے! مجھے کچھ پتہ نہیں۔
وہ فرشتے اس سے کہتے ہیں: ''یہ کون آدمی تھا جو تم میں بھیجا گیا تھا؟''۔
وہ جواب دیتا ہے: ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔

تو پھر آسمان سے منادی آواز دیتا ہے: اس نے جھوٹ بولا۔ اس کے لیے دوزخ سے فرش بچھا دو اور اس کے لیے دوزخ کی جانب دروازہ کھول دو تو اس کے پاس دوزخ کی گرمی اور سخت بو آتی ہے۔ اور قبر اس پر تنگ ہو جاتی ہے؛ حتی کہ اس کی پسلیاں آپس میں گھس/مل جاتی ہیں۔ اور اس کے پاس ایک آدمی بدصورت چہرہ والا آتا ہے جس کے کپڑے بھی گندے اور بدبودار ہوتے ہیں؛ وہ کہتا ہے: ''تجھ ایسی بشارت ہو جو کہ تجھے بری لگے۔ یہ تیرا وہ دن ہے جس کا وعدہ کیا جاتا تھا۔ وہ اس سے پوچھتا ہے تو کون ہے تیرا چہرہ بری خبر لانے والے کا چہرہ ہے''۔ تو وہ کہے گا: میں تیرا بدترین عمل ہوں''۔ وہ کہے گا؛ یا اللہ! قیامت قائم نہ کرنا''۔ ❶

اسے امام احمد (۱۸٤۹۱)، ابوداؤد (٤۷۵۳)، نسائی (۱۸۹۱) نے روایت کیا ہے، ابن ماجہ (۱۵٤۹): اور امام حاکم نے بھی اس کا پہلا حصہ بیان کیا ہے، حاکم (۱/ ۳۷)، ابوعوانہ، ابن حبان (۱۳٤٤۷) نے اپنی صحیح میں بیان کیا۔

تمام اہل سنت اور اہل حدیث کا اعتقاد اس حدیث کے مطابق ہے۔ پھر اس حدیث کے شواہد صحیح بخاری میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ، حضرت سعید رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے؛ وہ قتادہ سے اور وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بندے کو جب اس کی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر واپس جاتے ہیں؛ تو بے شک وہ ان کے جوتوں کی آہٹ کو سنتا ہے۔ اس کے پاس دو فرشتے آ کر اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں: ''تو اس شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہا کرتا تھا؟۔

مومن جواب دیتا ہے: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں''۔

پھر وہ [فرشتہ] اس سے کہتا ہے: ''اپنی دوزخ کی جگہ دیکھ لو؛ جس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے تجھے جنت کی جگہ دی ہے''۔

وہ ان دونوں کو ایک نظر سے دیکھتا ہے''۔ ❷

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ''ہمیں خبر دی گئی ہے کہ اس کی قبر فراخ کر دی جاتی ہے (راوی نے تمام حدیث کو ذکر کیا)''۔

نیز صحیحین میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یہ دونوں عذاب میں مبتلا ہیں؛ اور انہیں کسی بڑی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا؛ ان میں سے ایک تو پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغل خوری کرتا پھرتا تھا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سبز ٹہنی منگوائی اس کے دو حصے کیے اور فرمایا: شاید ان کا عذاب ہلکا ہو جائے، جب تک وہ خشک نہ ہوں''۔ ❸

نیز صحیح ابو حاتم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی شخص - یا کوئی انسان - قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو اس کے پاس دو سیاہ رنگ والے نیلی آنکھوں والے فرشتے آتے ہیں جن میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے''۔ ❹

❶ حدیث صحیح ھے۔ احکام الجنائز ص (۱۵٦۔۱۵۹).

❷ الاحادیث الصحیحه (۱۳٤٤).

۞ بخاری، مسلم، صحیح ابو داؤد (۱۵).
○ حسن ھے ترمذی (۱/ ۱۱۹) اس نے کہا حدیث حسن غریب ہے میں کہتا ہوں حدیث حسن ہے اس حدیث سے ان ہم عصر علما کا رد ہو رہا ہے جو دونوں فرشتوں کا نام منکر نکیر نہیں رکھتے الاحادیث الصحیحة (۱۳۹۱).

قبر کے عذاب اور اور قبر کے آرام کی احادیث رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں؛ یہ کچھ انہی کے لیے ہوگا جو اس کے اہل ہوں گے۔ اور ایسے ہی فرشتوں کے سوال کرنے کے ثبوت [متواتر احادیث سے ثابت ہے]۔ پس ان کے ثابت ہونے کا اعتقاد رکھنا اور ان پر ایمان لانا واجب ہے۔ بس ہم ان کی کیفیت میں کلام نہیں کرتے۔ اس لیے کہ عقل ان کی کیفیت تک رسائی سے قاصر ہے۔ اس جہان میں اس کا علم ممکن نہیں۔ اور شریعت ایسی چیز نہیں لاتی جو عقلاً محال ہوں۔ البتہ ایسی باتوں کا ذکر کرتی ہے جس میں عقلیں حیران ہو جاتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ روح کا جسم میں واپس آنا اس طرح نہیں ہوتا جس طرح دنیا میں معروف ہے بلکہ روح کا اعادہ اس اعادہ کے خلاف ہے جو دنیا میں معلوم ہے۔ پس روح کا بدن کے ساتھ پانچ قسم کا تعلق ہے جن میں احکام مختلف ہیں:

اولاً: روح کا تعلق جسم کے ساتھ ہے جب کہ ماں کے پیٹ میں جنین تھا۔

ثانیاً: بچہ کے اس روئے زمین پر آمد کے بعد۔

ثالثاً: روح کا وہ تعلق جو بحالت نیند میں ہے اس میں ایک وجہ سے تعلق ہوتا ہے اور اور ایک وجہ سے مفارقت ہوتی ہے۔

رابعاً: برزخ میں روح کا جسم کے ساتھ۔ اگرچہ اس عالم میں روح جسم سے جدا ہوتا ہے اور خالی چھوڑ جاتا ہے؛ مگر یہ جدائی مکمل جدائی نہیں ہوتی کہ اس کی طرف بالکل التفات بھی نہ کرے۔ بے شک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جب کوئی سلام کرتا ہے تو روح جسم میں لوٹ آتی ہے۔ نیز حدیث میں ہے کہ: ''مردہ انسان لوگوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے جب لوگ واپس پلٹتے ہیں۔ لیکن روح کا لوٹانا اس طرح کا نہیں ہوتا کہ قیامت سے پہلے جسم کو دوبارہ زندگی مل جائے۔

خامساً: روح کا وہ تعلق جو اجسام کے ساتھ حشر کے روز ہوگا۔ روح کے جسم کے ساتھ تعلق کی یہ کامل ترین قسم ہے۔ دیگر اقسام میں روح کے تعلق کی نسبت کا اس کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں۔ اس لیے کہ وہ تعلق ایسا ہے جس کیبعد جسم کو موت، نیند، یا کسی خرابی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ پس نیند بھی موت کے مثل [اس کی بہن] ہے۔ اس پر غور و فکر کریں؛ اس تشریح سے بہت سے اشکالات حل ہو جائیں گے۔

یاد رہے کہ قبر میں صرف روح سے سوال نہ ہوگا جیسا کہ ابن حزم رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے۔ [۵۶/۴]

اس سے بھی غلط قول یہ ہے کہ: سوال صرف جسم سے ہوگا روح سے نہیں ہوگا۔

جب کہ احادیث صحیحہ دونوں اقوال کو رد کر رہی ہیں۔ اسی طرح عذاب قبر بھی روح اور جسم دونوں کو ہوگا۔ اس پر اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ کبھی اکیلے روح کو آرام یا عذاب ہوگا اور کبھی دونوں کو مل کر ہوگا۔

شیخ عفیفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس تیسرے مسئلہ سے لے کر ساتویں مسئلہ تک کے لیے ابن قیم کی کتاب ''الروح'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

عذاب قبر کا ذکر:

جان لیجیے کہ: عذاب قبرہی عذاب برزخ ہے۔ ہر وہ شخص جو فوت ہوااور وہ عذاب کا مستحق ہے؛ وہ اس عذاب میں سے اپنا حصہ پا کر رہے گا۔ خواہ اسے قبر میں دفن کیا گیا ہو یہ قبر میں دفن نہ ہوا ہو۔ یا اسے درندے پرندے کھا جائیں یا اسے جلا کر راکھ کر دیا جائے؛ اور اس کو ہوا میں اڑا دیا جائے؛ یا اس کو صلیب پر لٹکایا جائے یا وہ سمندر میں غرق ہو جائے۔

بہر حال اس کی روح اور اس کے بدن کو اسی طرح عذاب ہوگا جس طرح قبر میں دفن انسان کو عذاب ہوتا ہے۔ ہاں رسول اکرم ﷺ سے جو مروی ہے کہ: ''میت کو قبر میں بٹھایا جاتا ہے؛ یا یہ کہ اس کی پسلیاں دباؤ کے ساتھ آپس میں مل جاتی ہیں۔ ضروری ہے کہ ان باتوں کو بغیر کسی غلو اور کوتاہی کے سمجھا جائے؛ تاکہ کلام کا ایسا معنی نہ کیا جائے جس کا وہ متحمل نہیں۔ اس کو اس کی مراد؛ اور مقصودِ ہدایت اور بیان سے دور نہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں لاپرواہی یا اصل معنی سے روگردانی اتنی بڑی گمراہی اور راہ حق صواب سے انحراف کا سبب بنتی ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی باتوں کو غلط سمجھنا ہی اسلام میں پیدا ہونے والی ہر بدعت اور گمراہی کی اصل وجہ ہے۔ اسلام کے اصول و فروع میں ہر قسم کی غلطیوں اور گمراہیوں کا یہی اصل ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کے ساتھ برا ارادہ بھی شامل ہو جائے۔ و اللہ المستعان۔

[دار کی اقسام]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ گھر تین قسم کے ہیں: دار دنیا، دار برزخ، اور دار قرار [آخرت]۔

اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک دار کے احکام الگ الگ بتائے ہیں جو اسی دار کے ساتھ خاص ہیں۔ اور اس انسان کو جسم اور روح سے مرکب بنایا ہے۔ پس دار دنیا کے احکام ابدان کے ساتھ خاص ہیں؛ اور ارواح ابدان کے تابع ہیں۔ اور دار برزخ کے احکام ارواح کے ساتھ خاص ہیں اور اجسام ان کے تابع ہیں۔ لیکن جب ابدان کے محشر اور لوگوں کے قبروں سے اٹھنے کا دن آئے گا؛ تو [اس وقت] نعمتوں کا اور عذاب کا تعلق ارواح، اجسام دونوں پر اکٹھا ہوگا۔ جب آپ اس حقیقت ایسے غور و فکر کریں جیسے غور و فکر کرنے کا حق ہے؛ تو آپ پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ: ''قبر جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے؛ یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا'' یہ بات عقل کے بھی عین مطابق ہے۔ اور یہ ایسا حق ہے جس کے صحیح ہونے میں کچھ شک نہیں''۔

اس حقیقت کے پیش نظر غیب پر ایمان رکھنے والے دوسروں سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قبر کی آگ یا نعمتیں؛ دنیا کی آگ یا نعمتوں کی جنس میں سے نہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ مردے پر قبر کی مٹی یا اوپر اور نیچے کے پتھروں کو اس قدر تپا دے گا کہ ان کی گرمی دنیا کے انگاروں کی گرمی سے بھی زیادہ ہوگی۔ لیکن دنیا والے اگر کو قبر کو چھولیں تو انہیں اس گرمی کا احساس تک نہ ہو۔ بلکہ اس سے بھی تعجب خیز بات یہ ہے کہ دو انسان جن کو ایک دوسرے کے پہلو میں دفن کیا جاتا ہے؛ ایک دوزخ کے گڑھے میں ہوتا ہے اور دوسرا جنت کے باغ میں۔ نہ اس کو اس آگ کی گرمی پہنچے گی اور نہ اُس کو اپنے پڑوسی کی کوئی نعمت پہنچے گی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس سے بھی زیادہ وسیع اور عجیب ہے۔ لیکن عام طور پر لوگوں کی عادت ہے کہ وہ ایسی باتوں کو جھٹلا دیتے ہیں جن کا انھیں کچھ علم نہ ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں اپنی قدرت کے ایسے عجائبات کا مشاہدہ کرایا ہے جو اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہیں۔ اور جب بھی اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو ان پر اپنے بعض بندوں کو مطلع کرتا ہے اور بعض سے پوشیدہ رکھتا ہے۔ لیکن اگر تمام بندوں کو اس پر مطلع کرے تو

پھر مکلّف ہونے اور ایمان بالغیب کی حکمت ختم ہو کر رہ جائے۔ بلکہ لوگ دفن کرنا چھوڑ دیں۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

''اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تم دفن نہ کرو گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ وہ تمھیں اسی طرح عذاب قبر سنائے جس طرح کہ میں سنتا ہوں''۔ ❶ لیکن جب یہ چوپایوں کے بارے میں منتفی ہے تو چوپائے عذاب قبر کا ادراک بھی کرتے ہیں اور سنتے بھی ہیں''۔

❶۔أخرجه مسلم عن أبي سعيد وعن أنس ؛ ولكن دون قوله :" ما أسمع " لیکن (ما اسمع) کے الفاظ نہیں ھیں یعنی (جو میں سنتا ہوں)۔ (مسلم ٢٨٦٧)۔ و أبو سعيد عن زيد مسلم (٢٨٦٨)۔

منکر نکیر کے سوال کے بارے میں؛ کہ کیا ان کا سوال کرنا اس امت کے ساتھ خاص ہے یا نہیں؟

اس میں تین اقوال ہیں:

ایک قول: یہ ہے [یہ اس امت کے ساتھ خاص ہے]۔

دوسرا قول: یہ ہے [کہ یہ سب امتوں کے لیے عام ہے]۔

تیسرا قول: توقف کا ہے۔ یہی قول علماء کی ایک جماعت کا ہے ان میں امام ابوعمر؛ ابن عبدالبر رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔ [التمهيد ٢٢/ ٢٥٣] چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

''حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

''بے شک یہ امت اپنی قبروں میں امتحان/آزمائش کا سامنا کرتی ہے''۔ [مسلم ٢٨٦٧]

ایک دوسری روایت میں ہے: ''قبروں میں سوال ہوتا ہے''۔ [مسلم، احمد، الاحاديث الصحيحه (١٥٩)]

ان الفاظ کی بنا پر یہ احتمال ہوتا ہے کہ یہ احکام اس امت کے ساتھ خاص ہیں۔ لیکن قطعی طور پر ایسا نہیں کہا جا سکتا۔

بلکہ ظاہر میں امت کے ساتھ خاص نہ ہونا لگتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسی طرح بچوں سے [ان] سوالات کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ [الروح ص ٨٧]

نیز کیا عذاب قبر ہمیشہ رہے گا یا ختم ہو جائے گا؟۔

جواب: عذاب قبر کی دو اقسام ہیں؛ بعض دائمی عذاب میں گرفتار ہوں گے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿النَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِo﴾ (غافر: ٤٦)

''(یعنی) آتش (جہنم) کے صبح و شام اس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور جس روز قیامت برپا ہوگی (حکم ہوگا) کہ فرعون والوں کو سخت عذاب میں داخل کر دو۔''

اسی طرح حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ والی حدیث میں کافر کے قصہ میں ہے کہ:

''اس کے لیے دوزخ کی جانب دروازہ کھول دیا جائے گا وہ اپنے ٹھکانے کو دیکھتا رہے گا حتی کہ قیامت قائم ہو جائے''۔ ❶

اور بعض کچھ مدت عذاب میں رہیں گے اس کے بعد عذاب ختم ہو جائے گا۔ اس عذاب میں وہ نافرمان گرفتار ہوں گے جن کے جرائم معمولی تھے۔ تو انھیں ان کے جرموں کے مطابق عذاب ہوگا پھر عذاب ختم ہو جائے گا جیسا کہ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

☼ حديث صحيح هے۔ احكام الجنائز (ص ١٥٦-١٥٩)۔ [رواه الإمام أحمد ١٨٥٧٠؛ فی بعض طريقه].

ارواح کا دار استقرار؟

موت کے بعد سے قیام قیامت تک ارواح کا استقرار کہاں ہوگا؟ اس میں [کئی اقوال میں] اختلاف ہے۔

پہلا قول: مؤمنوں کی ارواح جنت میں ہوں گی؛ اور کافروں کی ارواح دوزخ میں ہوں گی۔

دوسرا قول: مؤمنوں کی ارواح جنت کے آخری حصہ میں اس کے دروازے پر کھلے میدان میں ہوں گی؛ جہاں جنت کی خوشبو، نعمتیں اور رزق انھیں ملتا رہے گا۔

تیسرا قول: روحیں اپنی قبروں کے اردگرد ہوں گی۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ ارواح آزاد ہوں گی وہ جہاں چاہیں گی گھومتی پھرتی رہیں گی۔

چوتھا قول: ایک گروہ کا خیال ہے مؤمنوں کی ارواح اللہ تعالیٰ کے ہاں ہوں گی۔

پانچوں قول: مؤمنوں کی ارواح دمشق میں جابیہ کے مقام پر ہونگی؛ اور کافروں کی روحیں حضرموت کے کنوئیں برھوت میں ہوں گی۔

چھٹا قول: حضرت کعب [الاحبار] کا قول ہے: ایمانداروں کی روحیں ساتویں آسمان میں علیین میں ہوں گی؛ اور کافروں کی روحیں ساتویں زمین میں سجین میں ابلیس کے رخسار کے نیچے ہوں گی۔

ساتواں قول: مؤمنوں کی ارواح زم زم کے کنوئیں میں ہونگی؛ اور کافروں کی روحیں برھوت کنوئیں میں ہوں گی۔

آٹھواں قول: مؤمنوں کی ارواح حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں اور کافروں کی روحیں آدم علیہ السلام کی بائیں طرف ہوں گی۔

یہ ابن حزم رحمہ اللہ اور دیگر حضرات کا قول ہے۔ [الفصل ٥/ ٥٨]

نوواں قول: روحوں کا استقرار وہاں ہوگا جہاں وہ اجسام کے پیدا ہونے سے پہلے تھیں۔ یہ ابو عمر ابن عبدالبر رحمہ اللہ کا قول ہے۔ [التمهيد ١١/ ٦٥؛ ٢٠/ ٢٤٠]

دسواں قول: شہیدوں کی روحیں جنت میں اور عام ایمانداروں کی روحیں ان کی قبروں میں ہوں گی۔ ابن شہاب رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ: ''شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گی جو عرش کے ساتھ معلق ہوں گے؛ وہ صبح و شام جنت کے باغوں میں چلیں پھریں گے؛ روزانہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دیں گے اور سلام کہیں گے۔

گیارھواں قول: ایک فرقہ کہتا ہے اس کا استقرار عدم محض ہے۔ یہ قول ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ نفس بدن کے اعراض سے ایک عرض ہے؛ جیسا کہ بدن کی زندگی اور اس کا ادراک ہے ان کا قول کتاب وسنت کے مخالف ہے۔

بارھواں قول: ایک جماعت کا قول ہے روحوں کا استقرار موت کے بعد دیگر اجسام ہیں جو ان کے ان اخلاق اور صفات کے مناسب ہوں گے جو انہوں نے زندگی میں کیے تھے۔ تو ہر روح ایسے حیوان کے بدن کی طرف جائے گی؛ جو اس روح کے ہم شکل ہوگا۔ یہ قول ان لوگوں کا ہے جو تناسخ کے قائل ہیں؛ اور آخرت کے منکر ہیں۔ یہ قول تمام اہل اسلام کے عقیدہ کے مخالف ہے۔ [1]

☼ کتاب الروح لابن القیم کا مطالعہ کریں۔

یہ مختصر مقام ان تمام اقوال اوران کے دلائل پیش کرنے/ اور کلام کرنے سے تنگ دامنی کا اظہار کر رہا ہے۔

ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ عالم برزخ میں ارواح میں عظیم تفاوت ہوگا۔بعض ارواح اعلیٰ علیین میں ملاء اعلیٰ میں ہوں گی؛ یہ انبیائے کرام علیہم السلام کی ارواح ہوں گی۔ان کی منازل میں بھی فرق ہوگا۔

بعض ارواح سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گی وہ جنت میں جہاں چاہیں گے چلیں پھریں گے۔یہ بعض شہداء کی روحیں ہوں گی۔اور بعض شہیدوں کی روحوں کو جنت میں داخل ہونے سے بوجہ قرض کے روک دیا جائے گا۔جیسا کہ مسند احمد (۱۹۰۲۹ ؛نسائی ۲۹۵۷) میں حضرت محمد بن عبداللہ تعالیٰ بن جحش رضی اللہ عنہ ❶ سے روایت ہے کہ:

''ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا؛ اورعرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوگیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''جنت ملے گی''۔جب وہ پلٹ کر جانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''البتہ قرض معاف نہیں ہوگا''۔ابھی مجھے آہستگی کے ساتھ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس کی خبر دی ہے''۔ ❷

❶ اصل میں محمد بن عبد الله تعالیٰ بن محسن هے۔

❷ صحیح مسند احمد (٤/ ١٣٩ ، ٣٥٠)

بعض ارواح کو جنت کے دروازہ پر بند کیا جائے جیسا کہ ایک حدیث میں ہے،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں نے تمھارے صاحب کو دیکھا اسے جنت کے دروازے پر روکا گیا تھا'' ❶۔

1۔سنن ابن ماجه (٢٤٣٣)؛ صحیح هے؛ احکام الجنائز (١٥)۔

بعض روحیں قبر میں بند ہوں گی اور بعض زمین میں ہوں گی اور بعض آگ کے تنور میں ہوں گی۔جیسا کہ زانی مردوں اور عورتوں کا ذکر آتا ہے۔اور کچھ روحیں خون کی نہر میں تیرتی ہوں گی انھیں پتھر لگ رہے ہوں گے۔ان سب کا ذکر احادیث میں ہے۔واللہ اعلم۔

جہاں تک اس زندگی کی بات ہے؛ جو شہید کے ساتھ خاص ہے؛ اور وہ اس کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے جداگانہ مقام رکھتے ہیں؛ اس کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (آل عمران: ١٦٩)

''جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھنا؛ بلکہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں''۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ (البقرة ۱۵۴)

''اور جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کیے جائیں،ان کو مردے مت کہو، بلکہ زندہ ہیں اور لیکن تم نہیں سمجھتے''۔

اللہ تعالیٰ نے شہیدوں کی روحوں کو سبز پرندوں کے پیٹوں میں کر دیا ہے۔جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تمھارے بھائی [احد کے دن] شہید ہوئے؛ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں کے پیٹوں میں کر دیا؛ وہ جنت کی نہروں پر وارد ہوتے ہیں؛ اور اس کے پھلوں میں سے کھاتے ہیں؛ اور سونے کی قندیلوں کی صرف جگہ پکڑتے ہیں جو عرش کے

سایہ میں معلق ہیں''۔ ❶

❶ صحیح حاکم صحیح علیٰ شرط مسلم ذہبی نے موافقت کی؛ مشکوٰۃ للالبانی (۳۸۵۳) . صحیح الجامع (۵۲۰۵)۔

اسی مضمون کی حدیث حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ جو کہ امام مسلم نے روایت کی ہے۔(۱۸۸۷۔)

بے شک جب انھوں نے اپنے اجسام کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دیا؛ حتیٰ کہ دشمنوں نے ان کو ختم کر دیا؛ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے عوض ان کو برزخ میں پہلے سے زیادہ بہتر جسم عطا فرما دیے۔ قیامت تک ان جسموں میں رہیں گے؛ ان انہیں ان اجسام کے ذریعہ نعمتیں ملیں گی۔ یہ اس سے زیادہ بہتر ہوگا کہ خالی ارواح کو نعمتیں ملیں۔ اسی لیے مومن کی روح پرندے کی شکل میں ہوتی ہے؛ یا پھر پرندے کی طرح ہوتی ہے۔ نیز شہید کی روح پرندے کے پیٹ میں ہوتی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کے الفاظ پر غور کیجیے۔ مؤطا (۴۲۷۱) میں ہے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں؛ آپ ﷺ نے فرمایا:

''مومن کی روح پرندہ بن جاتی ہے، جو جنت کے درختوں کے ساتھ معلق رہتا ہے؛ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو بروز قیامت اس کے جسم میں واپس لوٹا دے گا''۔ ❶

اس حدیث کے الفاظ (نسمة المؤمن ؛یعنی) مؤمن کی روح؛ عام ہیں۔ جو شہید غیر شہید دونوں کو شامل ہیں۔

پھر شہید کو خاص کیا گیا ہے کہ:''اس کی روح سبز پرندے کے پیٹ میں ہوتی ہے''۔ اور یہ بات واضح ہے کہ جب وہ پرندے کے پیٹ میں ہے تو اس کو پرندہ کہنا صحیح ہے۔ اس اعتبار سے دوسری حدیث کے عموم میں داخل ہے۔ پس برزخ کی نعمتوں میں ان کا حصہ دیگر ان ایمان دار لوگوں کے حصہ سے زیادہ ہے جو بستر پر فوت ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کا مقام ان میں سے اکثر سے بہت بلند ہوتا ہے۔ پس ان کے لیے کچھ نعمتیں خاص ہیں؛ کہ ان کے ساتھ ان میں وہ لوگ شریک نہیں جو ان سے کم درجہ کے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

❶ حدیث صحیح هے۔ الصحیحة (۹۹۵) .

نیز اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام کو کھائے۔ یہ حدیث سنن میں ہے۔
[سنن أبی داؤد ۱۰۴۷؛ صحیح۔]

بعض شہیدوں کے بارے میں مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ان کے دفن کے کافی عرصہ بعد بھی ان کے اجسام میں تغیر رونما نہیں ہوا۔ ان کے بارے میں ممکن ہے کہ قیامت تک ان کا جسم اسی طرح اس مٹی میں باقی رہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ طویل مدت کے بعد بوسیدہ ہو جائے، معلوم یوں ہوتا ہے کہ جس قدر شہادت اکمل ہو اور شہید افضل ہو اسی نسبت سے اس کا جسم زیادہ عرصہ باقی رہتا ہے۔ واللہ اعلم۔

بعث اور حساب پر ایمان

۸۲۔((وَنُؤْمِنُ بِالْبَعْثِ وَجَزَاءِ الأَعْمَالِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالْعَرْضِ وَالْحِسَابِ وَقِرَأَةِ الْكِتَابِ وَالثَّوَابِ وَالْعِقَابِ وَالصِّرَاطِ وَالْمِيزَانِ .))

''ہم دوبارہ اٹھنے پر اور قیامت کے روز اعمال کے بدلے پر اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی اور حساب نیز اعمال نامے پڑھنے، ثواب، عقاب، پل صراط اور میزان پر ایمان رکھتے ہیں''۔

تشریح:...... آخرت پر ایمان کتاب وسنت کے دلائل موجود ہیں؛ اور عقل اور فطرت سلیمہ سے بھی ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں آخرت کی خبر دی ہے۔ اور اس پر دلائل بیان فرمائے ہیں؛ اور قرآن کی اکثر سورتوں میں اس کے منکرین کا رد کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ: ''تمام انبیاء علیہم السلام ایمان باللہ پر متفق ہیں۔ رب تعالیٰ کا اقرار تمام بنی آدم میں عام ہے؛ اور یہ فطری چیز ہے۔ تمام لوگ رب کا اقرار کرتے ہیں؛ سوائے بہت بڑے سرکش کے؛ جیسے فرعون۔ بخلاف آخرت پر ایمان کے؛ اس کے منکرین کی تعداد زیادہ ہے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب خاتم الانبیاء ہیں اور آپ کی بعثت اور قیامت [ایسے ساتھ ساتھ ہیں] جیسے یہ دو انگلیاں۔ اور آپ ہی حاشر [جمع کرنے والے] اور مقفی (سب سے پیچھے آنے والے) ہیں [1]؛ تو آپ نے آخرت کا ذکر ایسی تفصیل کے ساتھ پیش کیا کہ پہلے انبیاء کی کتابوں میں ایسی تفصیل موجود نہیں۔

[1] ۔ یہ دونوں اسماء گرامی کے حوالہ کے لیے دیکھیں؛ اسم حاشر: بخاری (۴۸۹۶؛ مسلم ۲۳۵۴)؛ اسم مقفی (مختصر الشمائل ۳۱۶؛ یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔

❀ اسی لیے فلاسفہ کا ایک گروہ اور کچھ دیگر لوگ اس گمان میں پڑ گئے ہیں کہ: اجسام کے اٹھائے جانے کا تفصیلی ذکر صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی کیا ہے۔ اور اس کو اپنی دلیل بناتے ہوئے انھوں نے اس مسئلہ کو تخیل [خیال] سے اور جمہوری خطاب سے تعبیر کیا ہے۔ اور قرآن نے موت کے بعد روح کے واپس آنے اور قیامت کبریٰ کے وقت بدن کے اٹھائے جانے کا ذکر متعدد مقامات میں کیا ہے۔ فلاسفہ چونکہ قیامت کبریٰ اور اجسام کے اٹھائے جانے کے منکر ہیں۔ اور ان میں سے کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ: ان باتوں کی خبر صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے؛ اور وہ بھی خیالی انداز میں''۔ یہ بہت بڑا جھوٹ ہے۔ پس بے شک قیامت کبریٰ تو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے ہاں معروف ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت نوح علیہ السلام تک؛ اور حضرت ابراہیم، اور حضرت موسیٰ، اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام تک [سب نے اس کی خبر دی ہے]۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے اتارا گیا؛ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے [قیامت کی خبر دی تھی؛ اور] فرمایا تھا:

﴿اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍo قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَo﴾ (الاعراف: ۲۳۔ ۲۴)

''اتر جاؤ؛ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو؛ اور تمھارے لیے ایک وقت تک زمین پر ٹھکانہ اور سامانِ زندگی ہے۔ فرمایا: اس میں تمھارا جینا ہوگا اور اسی میں مرنا ہوگا اور اسی میں سے (قیامت کو) نکالے جاؤ گے۔''

اور جب ابلیس لعین نے مطالبہ کیا:

﴿رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ○ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ○ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ○﴾ (ص)

''اے میرے رب! مجھے قیامت تک مہلت دیجیے۔ فرمایا: ''تجھ کو مہلت دی جاتی ہے اس روز تک جس کا وقت مقرر ہے۔''

نیز حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا○ ثُمَّ یُعِیْدُكُمْ فِیْهَا وَیُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا○﴾ (نوح: ۱۷،۱۸)

''اور اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے پھر اسی میں تمھیں لوٹا دے گا اور اسی سے تم کو نکال لائے گا۔''

نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ○﴾ (الشعراء: ۸۲)

''اور وہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخش دے۔''

نیز [قرآن کریم میں اہل ایمان کی دعا میں ہے]:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ○﴾ (ابراهیم: ٤١)

''اے ہمارے رب! مجھے اور میرے والدین مؤمنوں کو معاف کرنا جس دن حساب قائم ہوگا۔''

نیز [حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مطالبہ کیا تھا] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی﴾ (البقرة: ٢٦٠)

''اے اللہ تعالیٰ مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔''

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب اس نے سرگوشی کی:

﴿اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَكَادُ اُخْفِیْهَا لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی○ فَلَا یَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰی○﴾ (طٰهٰ: ١٥، ١٦)

''بے شک قیامت آنے والی ہے؛ قریب ہے کہ میں اسے ظاہر کردوں؛ تاکہ ہر نفس اس کی کوشش کا بدلہ دیا جائے؛ تو جو شخص اس پر ایمان نہیں رکھتا ہے اور وہ اپنی خواہش کے تابع ہے؛ تم کو اس [پر ایمان] سے روک نہ دے تو (اس صورت میں) تم ہلاک ہوجاؤ گے۔''

بلکہ آل فرعون کا مومن قیامت کا علم رکھتا تھا اس کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان تھا اور اللہ تعالیٰ اس کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں [اس نے کہا تھا]:

﴿وَیٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ یَوْمَ التَّنَادِ○ یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ وَّمَنْ

يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ (غافر: ۳۲، ۳۳)

''اے قوم مجھے تمھاری نسبت پکار کے دن کا خوف ہے؛ جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے اس دن تم کو کوئی اللہ تعالیٰ سے بچانے والا نہ ہوگا اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔''

نیز یہ بھی کہا تھا:

﴿يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ﴾ (غافر: ۳۹)

''بھائیو! یہ دنیا کی زندگی (چندروز) فائدہ اٹھانے کی چیز ہے اور جو آخرت ہے وہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے۔''

اور پھر آگے چل کر ارشاد فرمایا:

﴿اَدْخِلُوْا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ (غافر: ٤٦)

''فرعون والوں کو سخت عذاب میں داخل کرو۔''

نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی:

﴿وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾ (الاعراف: ١٥٦)

''اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی لکھ لے اور آخرت میں بھی ہم تیری طرف رجوع ہو چکے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے گائے کے واقعہ میں خبر دی ہے:

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (البقرة: ۷۳)

''تو ہم نے کہا: اس کا کوئی ٹکڑا مقتول کو مارو یونہی اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔''

بے شک اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ذکر فرمایا ہے کہ: اس نے پیغمبروں کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو خوشخبری دیں اور ڈرائیں۔ نیز دوزخیوں کے بارے میں خبر دار دی ہے کہ جب ان سے دوزخ کے دربان کہیں گے:

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ (الزمر: ٧١)

''کیا تمھارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمہیں تمھارے رب کی آیات پڑھ کر سناتے اور اس دن کی پیشی سے ڈراتے تھے کہیں گے کیوں نہیں لیکن کافروں کے حق میں عذاب کا حکم ثابت ہو چکا تھا۔''

اس آیت میں مختلف اقسام کے دوزخیوں کے اعتراف کا ذکر ہے کہ رسولوں نے ان کو قیامت کے دن سے ڈرایا تھا۔ پس تمام رسولوں نے اس چیز سے ڈرایا تھا جس سے خاتم الرسل ﷺ نے ڈرایا ہے کہ گنہگاروں کو دنیا و آخرت میں فلاں فلاں سزاؤں سے واسطہ پڑے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک کی اکثر سورتیں جن میں وعد اور وعید کا ذکر ہے ان میں دنیا اور آخرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ﷺ آخرت کے دن کی یقین دہانی کے لیے قسم اٹھائیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ﴾ (سبا: ۳)

''اور کافروں نے کہا: ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔ فرمادیں: ''کیوں نہیں؟ میرے رب کی قسم وہ تم پر ضرور آ کر رہے گی؛ وہ غیب کا جاننے والا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ يَسْتَنْبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ قُلْ اِيْ وَ رَبِّيْۤ اِنَّهٗ لَحَقٌّ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ۠﴾ (یونس : ۵۳)

''اور وہ آپ سے پوچھتے ہیں: کیا یہ سچ ہے؟ فرمادیں: ہاں اللہ تعالیٰ کی قسم! بے شک وہ سچ ہے اور تم عاجز نہیں کر سکتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۠﴾ (التغابن : ۷)

''کافر خیال کرتے ہیں کہ وہ ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے؛ فرمادیں: ہاں میرے رب کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر جو جو کام تم کرتے رہے ہو وہ تمھیں بتائے جائیں گے اور یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔''

نیز قرب قیامت کے بارے میں فرمایا:

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۠﴾ (القمر : ۱)

''قیامت قریب آ گئی ہے اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ۠﴾ (الانبیاء : ۱)

''لوگوں کے لیے ان کا حساب قریب آ گیا ہے اور وہ غفلت میں روگردانی کرنے والے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ۠ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ۠ .... إلى .... اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا۠ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا۠﴾ (المعارج : ۱۔۷)

''ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا جو نازل ہو کر رہے گا؛ کافروں سے کوئی اس کو ٹال نہ سکے گا...... آگے ان آیات تک...... وہ ان لوگوں کی نگاہ میں دور ہے اور ہماری نظر میں قریب ہے۔''

نیز قیامت کی تکذیب کرنے والوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۠﴾ (یونس : ۴۵)

''خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو جھٹلایا؛ ہدایت یافتہ نہ تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا﴾ (الانعام : ۳۱)

''حتی کہ جب ان پر قیامت ناگہاں آجائے گی تو کہیں گے! ہمیں اس تقصیر پر افسوس ہے جو ہم نے قیامت کے متعلق کی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ۝﴾ (الشوریٰ: ۱۸)

''دیکھو جو لوگ قیامت میں جھگڑتے ہیں وہ پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ۝﴾ (النمل: ٦٦)

''بلکہ آخرت میں ان کا علم ختم ہو چکا ہے بلکہ وہ اس میں شک میں ہیں بلکہ اس سے بھی اندھے ہو رہے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ .... وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ۝﴾ (النحل: ۳۸، ۳۹)

''اور یہ اللہ تعالیٰ کی سخت سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے نہیں اٹھائے گا؛ ہرگز نہیں یہ (اللہ تعالیٰ کا) وعدہ سچا ہے؛ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔............تاکہ کافر جان لیں کہ بے شک وہ جھوٹے تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝﴾ (غافر: ۵۹)

''بے شک قیامت آنے والی ہے اس میں کچھ شک نہیں ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا۝ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا۝اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا۝﴾ (الاسراء: ۹۷-۹۹)

''اور ہم ان کو قیامت کے دن اوندھے منہ اندھے گونگے اور بہرے بنا کر اٹھائیں گے اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے جب (اس کی آگ) بجھنے کو ہوگی تو ہم اس کو اور بھڑکا دیں گے۔ یہ ان کی سزا ہے اس لیے کہ وہ ہماری آیتوں سے کفر کرتے رہے اور کہتے رہے کہ جب ہم (مر کر بوسیدہ) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا کیے جائیں گے۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اس بات پر قادر ہے کہ ان جیسے (لوگ) پیدا کر دے اور اس نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے جس میں کچھ بھی شک نہیں تو ظالموں نے انکار کرنے کے سوا (اسے) قبول نہ کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ قَالُوْٓا ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًاo قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًاo اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًاo يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَ تَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًاo﴾ (الاسراء: ۴۹۔۵۲)

''اور کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور چور چور ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہو کر اٹھیں گے کہہ دو کہ (خواہ تم) پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور چیز جو تمھارے نزدیک بڑی (سخت) ہو؛ جھٹ کہیں گے: ہمیں دوبارہ کون لوٹائے گا؟ فرمادیں: وہی ہے جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔ تو تمھارے آگے سر ہلائیں گے اور پوچھیں گے کہ ایسا کب ہوگا؟ فرمادیں: امید ہے کہ جلد ہوگا جس دن وہ تمھیں پکارے گا تو تم اس کی تعریف کے ساتھ جواب دو گے اور خیال کرو گے کہ تم (دنیا میں) بہت کم (مدت) رہے۔''

خیال کیجیے کہ انھیں ہر سوال کا جواب کتنی تفصیل سے دیا گیا ہے۔ پہلے جب انھوں نے کہا:

﴿ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًاo﴾ (الاسراء: ۴۹)

''کیا جب ہم (مر کر بوسیدہ) ہڈیاں اور چور چور ہو جائیں گے تو کیا از سر نو پیدا ہو کر اٹھیں گے۔''

تو انھیں جواباً کہا گیا: اگر تم خیال کرتے ہو کہ تمھارا کوئی خالق اور کوئی رب نہیں؛ تو تم کیوں نہ ایسی مخلوق بن گئے جس کو موت فنا نہ کر سکتی؛ مثلاً: پتھر، یا لوہا یا تمھارے خیال میں جو [اس سے بھی] بڑی مخلوق تھی۔ [وہ کیوں نہ بن گئے]۔ اور اگر تم یہ کہو کہ: ہم تو ایسی مخلوق تھے جو بقاء کو قبول نہیں کرتی۔ تو پھر کون سی وہ چیز ہے جو تمھارے خالق اور موجد کے اور اس کے تمھیں دوبارہ پیدا کرنے کے درمیان حائل ہو سکے؟۔ یہی دلیل ان دوسرے الفاظ سے بیان کی جاسکتی ہے: ''اگر تم پتھر، لوہا یا اس سے بھی بڑی مخلوق ہوتے؛ تو اللہ تعالیٰ قادر تھا کہ تمھیں فنا کر دیتا؛ اور تمھاری ذات کو تبدیل کرتا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل کر دیتا۔ پس جو ذات ان اجسام میں ان کے اتنے سخت اور شدید ہونے کے باوجود تصرف کر سکتی ہے؛ تو جو چیزیں ان سے کئی درجہ کم ہیں؛ ان کو فنا کرنے اور تبدیل کرنے سے کون سی چیز عاجز کر سکتی ہے؟۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ سوال کرتے ہیں کہ: ﴿مَنْ يُّعِيْدُنَا﴾ ''ہمیں کون لوٹائے گا'' یعنی جب ہمارے اجسام تبدیل ہو جائیں گے یا فنا ہو جائیں گے؛ [تو پھر]۔ تو اس کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (الاسراء: ۵۱)

''کہہ دو کہ وہی ہے جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا ہے۔''

جب دلیل ثابت ہو گئی؛ تو اب اس کا حکم ان پر لازم آئے گا۔ اب وہ تو بہانہ تراشتے ہوئے دوسرے سوال پر چلے گئے: کرتے ہوئے کہا کہ اچھا بتاؤ ﴿مَتٰى هُوَ﴾ ''قیامت کب قائم ہوگی''۔ تو انھیں جواب دیا گیا: ﴿عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا﴾ ''ہو سکتا ہے کہ وہ تو بہت قریب ہو''۔ اسی قبیل سے ارشاد ربانی ہے:

﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌo﴾ (یس: ۷۸)

''اور ہمارے لیے مثالیں بیان کیں؛ اور اپنی پیدائش کو بھول گیا کہنے لگا کہ جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو ان کو کون زندہ کرے گا؟''

پس اگر فصیح بلیغ علم وفضل میں نادرۂ روزگار اور بیان پر قدرت رکھنے والا کوشش کرے کہ وہ اس سے بہتر دلیل یا اس جیسی دلیل؛ اس جیسے مختصر الفاظ میں؛ واضح دلالت اور صحت برہان کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کرے گا؛ تو وہ ایسا نہ کر سکے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اس دلیل کا آغاز ایک ملحد انسان کے وارد کردہ سوال سے کیا ہے؛ جو جواب کا تقاضا کرتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا: ﴿وَنَسِيَ خَلْقَهُ﴾ (یس: ۷۸) ''وہ اپنی پیدائش کو فراموش کر بیٹھا۔''

اس میں ہر لحاظ سے شافی ووافی جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حجت قائم کر دی؛ اور شبہ ختم کر دیا؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دلیل کی تائید کے سلسلہ کو بڑھاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (یس: ۷۹)

''کہہ دو: ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔''

تو پہلی بار کی تخلیق سے دوبارہ بھی پیدا کر سکنے پر دلیل پیش کی؛ اور پہلی بار وجود میں لانے کو دوبارہ وجود میں لانے پر قادر ہونے کے لیے بطور حجت کے پیش کیا۔ کیونکہ ہر عقل مند انسان لازمی طور پر جانتا ہے کہ جو ذات پہلی بار پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ اور اگر دوسری بار پیدا کرنے سے عاجز ہے تو پہلی بار پیدا کرنے سے بہت ہی زیادہ عاجز ہوتا۔ جب پیدا کرنا خالق کے خلق پر قادر ہونے کو مستلزم ہے؛ اور اسے اپنی تخلیق کی تفصیلات کا علم ہے؛ تو اس کے بعد فرمایا: ﴿وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ﴾ (یس: ۷۹) ''وہ سب قسم کا پیدا کرنا جانتا ہے۔''

پس اللہ تعالیٰ کو پہلی بار پیدا کرنے کی تفاصیل، جزئیات، مادوں اور صورتوں کا خوب علم ہے؛ اسی طرح وہ دوسری بار پیدا کرنے کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ کا علم مکمل ہے؛ اور وہ کامل قدرت والا ہے؛ تو اس کے لیے کیسے مشکل ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ نہ کر سکے؟۔ پھر اس کو پختہ دلیل کے ساتھ تاکیدی رنگ میں ظاہری برہان کے ساتھ پیش فرمایا؛ جو ایک دوسرے ملحد کے سوال کے جواب کو متضمن ہے۔ ملحد کہتا ہے جب ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی طبعی طور پر ان سے حرارت ختم ہو جائے گی اور خشکی آ جائے گی؛ جب کہ زندہ چیز مادی اور طبعی طور پر حرارت اور رطوبت والی ہوتی ہے جس سے اس کا اٹھایا جانا واضح ہے۔ پس آیت میں دلیل اور جواب دونوں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ﴾ (یس: ۸۰)

''وہی جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کی پھر تم اس سے آگ نکالتے ہو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ درخت جو سرسبز ہے رطوبت اور برودت سے بھرا ہوا ہے اس سے اللہ تعالیٰ نے آگ کو نکالا، جس میں انتہا درجہ کی حرارت اور خشکی موجود ہے۔ پس وہ ذات جو کسی چیز سے اس کی ضد کو پیدا فرما سکتی ہے؛ نیز تمام مخلوقات کے مواد اور عناصر جس کے تابع اور مطیع ہیں؛ وہ ذات ان افعال کے کرنے پر بھی قادر ہے جن کا ملحدین انکار کر رہے ہیں کہ کیسے بوسیدہ

ہڈیوں کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس کی تاکید میں اس سے بڑی اور عظیم تر چیز سے چھوٹی اور آسان چیز پر دلائل پیش کئے ہیں؛ ہر عاقل جانتا ہے کہ جو کوئی ایک بہت بڑے اور جلیل کام پر قدرت رکھتا ہے؛ وہ اس سے کئی درجہ کم چیز کئی گنا زیادہ/ بہت زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ شخص ایک ڈھیر اٹھانے پر قادر ہو وہ چالیس تولے اٹھانے پر زیادہ قادر ہے۔ تو ارشاد فرمایا:

﴿اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ﴾ (یس : ۸۱)

''بھلا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کہ وہ اس بات پر قادر نہیں ان جیسے ہی پیدا کر دے۔''

پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو باوجود ان کی جلالت اور عظمت شان کے؛ اور ان کے بڑے جسم کے اجسام کے؛ اور ان کی وسعت کے؛ اور ان کی عجیب خلقت کے؛ انہیں بغیر کسی نمونہ کے پیدا فرمایا تو وہ اس پر بہت زیادہ قادر ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کر کے پہلی حالت میں لے آئے۔ ❶ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

❶ تفصیل کے لیے دیکھیں: مختصر الموصلی للصواعق المرسلة (۱/ ۱۰۶۔۱۰۷).

﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾(غافر ۵۷)

''آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ۝﴾ (یس:۸۱)

''بھلا جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ اس بات پر قادر نہیں کہ ان کو پھر ویسے ہی پیدا کر دے کیوں نہیں اور وہ تو بڑا پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تاکید فرمائی؛ اور اسے ایک دوسرے انداز میں بیان فرمایا؛ کہ اللہ تعالیٰ کا فعل کسی دوسرے اس شخص کے فعل کی طرح نہیں ہے جو آلات اور تکلیف کے ساتھ تھکاوٹ اور مشقت اٹھاتے ہوئے فعل کو سرانجام دیتا ہے۔ وہ اکیلا آزادی کے ساتھ اس فعل کو نہیں کر سکتا ہے بلکہ اس کے لیے آلات اور معاونین کا ہونا بہت ضروری ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے کسی چیز کے پیدا فرمانے ؛ اور اس کو وجود میں لانے کے لیے؛ صرف اس کا ارادہ اور ہونے والی چیز کے لیے کلمہء کن کہنا کافی ہے۔ جب وہ ''کن'' کہتا ہے تو وہ چیز اس کی مشیئت اور ارادہ کے مطابق ہو جاتی ہے۔ پھر اس دلیل کو ختم کرتے ہوئے بتایا کہ تمام چیزوں کی بادشاہت اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ان میں اپنے قول اور فعل کے ساتھ جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے اور اسی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے۔ [الصواعق ۴۷۳-۴۷۷]

اسی مضمون کا یہ فرمان باری تعالیٰ بھی ہے:

﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى۝﴾(القیامۃ ۳۶۔۴۰)

''کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ یوں چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ ٹپکتی ہوئی منی کا ایک قطرہ نہ تھا، پھر لوتھڑا ہوا تو اللہ نے اس کو بنایا پھر درست کیا۔ پھر اس سے مرد اور عورت دو قسمیں بنائیں، کیا وہ اس بات پر قدرت نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے۔''

اس میں اللہ تعالیٰ نے دلیل دیتے ہوئے فرمایا: وہ انسان کو امر ونہی اور ثواب عقاب سے رائیگاں نہیں چھوڑے گا اس کی حکمت اور اس کی قدرت اس کا شدت کے ساتھ انکار کرتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾(المؤمنون: ۱۱۵)

''کیا تم سوچتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ جس ذات جس نے انسان کو نطفہ سے منجمد خون میں تبدیل کیا، پھر اسے گوشت کا ٹکڑا بنایا، پھر اس کے کان اور آنکھ کو پیدا کیے۔ اور اس میں حواس اور قوتوں کو ودیعت فرمایا۔ اور ہڈیوں اور منافع سے؛ اور اعصاب اور جوڑوں کو مضبوط سے ترکیب بنایا۔ اور اس کی تخلیق کو انتہائی درجہ کا محکم/ پختہ بنایا۔ اور پھر اس بہترین شکل میں پیدا فرمایا؛ جو کہ کامل اور بہترین شکل ہے؛ تو وہ اس کو دوبارہ پیدا کرنے سے کس طرح عاجز ہوسکتا ہے؟۔ بلکہ اس کی حکمت وعنایت کا یہ تقاضا کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ انسان کو بے کار چھوڑ دے؟۔ یہ تو اس کی حکمت کے لائق نہیں اور نہ ہی اس کی قدرت اس سے عاجز ہے۔ ذرا غور کریں یہ کتنا عجیب اور مختصر استدلال ہے شاید کہ اس سے زیادہ اختصار ممکن ہی نہیں۔ اور کتنا واضح اور پرمغز بیان ہے کہ اس سے زیادہ وضاحت ممکن نہیں؛ اور کتنا جاذب اور پرکشش ہے کہ اس سے زیادہ پرکشش بیان کا ہونا ممکن ہی نہیں''۔[الصواعق ٤٨٠]

قرآن پاک میں اس قسم کے دلائل کثرت کے ساتھ مذکور ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾........﴿وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِo﴾(الحج: ۵،۶،۷)

''لوگو! اگر تم کو (مرنے کے بعد) جی اٹھنے میں کچھ شک ہو تو ہم نے تم کو (پہلی بار بھی تو) پیدا کیا تھا (یعنی ابتدا میں) مٹی سے پھر اس سے نطفہ بنا کر پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر پھر اس سے بوٹی بنا کر، جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی، ......اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾....﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَo﴾(المومنون: ۱۲۔۱۶)

''اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا ہے......پھر قیامت کے روز اٹھا کر کھڑے کیے جاؤ گے۔''

اور پھر اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کا قصہ بیان کیا؛ کیسے اللہ تعالیٰ نے ان کو تین سو سال شمسی؛ تین سو نو سال قمری؛ باقی رکھا۔ ان کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا﴾(الكهف ۲۱)

''اور اسی طرح ہم نے ان سے خبردار کردیا تا کہ وہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت میں کچھ شک نہیں۔''

کیا اجسام جواہر مفردہ سے مرکب ہیں؟

جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ اجسام جواہر مفردہ سے مرکب ہیں؛ وہ ان کے معاد کے بارے میں مخبوط الحواسی اور اضطراب کا شکار

ہیں، اس کے بارے میں ان کے دوقول ہیں:

اول: جواہر معدوم ہو جائیں گے، پھر انھیں لوٹایا جائے گا۔

دوم: اجزاء متفرق ہو جائیں گے پھر اکٹھا کر لیا جائے گا۔

اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ جس انسان کو حیوان اپنا لقمہ بنالیتا ہے، پھر اس حیوان کو انسان کھالیتا ہے۔ اس کے وہی اجزا دوبارہ لوٹائے جائیں گے تو لوٹائے نہیں جاسکتے۔

اوران پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ انسان ہمیشہ تحلیل ہوتا رہتا ہے پس کس کو لوٹایا جائے گا؟ کیا وہ ڈھانچہ جو موت کے وقت تھا اس کو لوٹایا جائے گا؟۔ اگر اسی کا کہا جائے: تو لازم آتا ہے کہ اس کا اعادہ بہت کمزور صورت میں ہو۔ اور ایسا ہونا نصوص شریعت کے خلاف ہے۔ اگر اس کا اعادہ نہیں تو بعض اجسام دیگر بعض اجسام سے افضل اور اولیٰ نہ ہوئے۔

بعض حضرات نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان میں ایسے اجزاء اصلیہ ہیں جو تحلیل نہیں ہوتے۔ اور اس میں اس حیوان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جس کو دوسرے نے لقمہ بنالیا۔ تمام عقلاء جانتے ہیں کہ انسان کا تمام بدن تحلیل ہوجاتا ہے اس کا کوئی جزء باقی نہیں رہتا۔ پس معاد کے بارے میں انھوں نے جو کچھ ذکر کیا ہے؛ اس نے فلاسفہ کے شبہ کو اجسام کے معاد کے انکار میں قوی بنا دیا ہے۔

سلف صالحین، اور جمہور علماء رحمہم اللہ کا قول ہے کہ اجسام ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ پس وہ مٹی تحلیل کر جائیں گے؛ پھر اللہ تعالیٰ ان کو ازسرنو پیدا فرمائے گا؛ جیسا کہ وہ پہلی بار ایک خلقت میں تحلیل ہوا؛ پہلے وہ نطفہ تھا؛ پھر منجمد خون بنا؛ پھر گوشت کا ٹکڑا بنا؛ پھر اس نے ہڈیوں اور گوشت کی شکل اختیار کی پھر اس کو سیدھے قد والا انسان بنایا۔ اسی طرح اعادہ بھی ہے۔ تمام جسم کے بوسیدہ ہونے کے بعد سوائے ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرہ کے اللہ تعالیٰ اس کا اعادہ فرمائے گا۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ابن آدم کا تمام ڈھانچہ (سوائے ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرہ کے) بوسیدہ ہو جائے گا اسی سے اس کو پیدا کیا گیا ہے؛ اور اسی سے اس کو [دوبارہ] جوڑا جائے گا''۔ ❶

ایک دوسری حدیث میں ہے:

''آسمان سے بارش برسے گی؛ جیسے مردوں کی منی؛ وہ قبروں سے یوں اگ پڑیں گے جیسے زمین سے انگوری نکلتی ہے''❷۔

❶ البخاری، مسلم، احمد؛ الفاظ احمد کے ھیں (۲/ ٤٢٨) اضافہ ہے اس کو مٹی کھا جاتی ہے اس کی سند مضبوط ہے۔

❷ حدیث ضعیف ھے طبرانی فی المعجم الکبیر (۱/ ٤٦/ ۱، ۲) طویل حدیث عن ابی الزعراء ھے حدیث موقوف ھے لیکن اس کو مرفوع کا حکم ھے حدیث میں انقطاع ھے۔ ستدرك حاكم (٤/ ٦٠٠).

دونوں بار کی تخلیق؛ دو اقسام ہیں؛ جو ایک ہی جنس کے تحت ہیں۔ ان میں ایک وجہ سے متماثلت اور موافقت ہے اور ایک وجہ سے افتراق اور اختلاف ہے۔ معاد میں بالکل ویسے ہی پہلی بار کی طرح جسم کو لوٹایا جائے گا۔ اگرچہ اعادہ اور آغاز خلق کے لوازم میں فرق ہوگا۔ پس ریڑھ کی ہڈی کا آخری مہرہ ہی باقی رہے گا؛ اور باقی جسم تحلیل ہو جائے گا۔ اور پھر اسی مادہ سے دوبارہ تیار کیا جائے گا جس مادہ میں وہ تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ کتنی واضح بات ہے کہ جس شخص نے کسی کو بچپن میں دیکھا؛ پھر اسی کو بڑھاپے میں دیکھا؛ تو وہ فوراً ہی جان لے گا

کہ یہ وہی ہے۔حالانکہ وہ ہمیشہ سے احوال بدلتا رہا ہے۔یہی حال تمام حیوانات اور نباتات کا ہے۔جس شخص نے چھوٹا سا پودا دیکھا تھا؛ پھر جب دیکھا تو وہ تناور درخت بن گیا تھا:اس نے کہا: یہ وہی درخت ہے۔حالانکہ اس کی دوسری حالت [نشأة] کی صفات پہلی حالت کی صفات کے مماثل نہیں ہوتی؛ کہ یہ کہا جا سکے کہ تبدیلی تو مواصفات میں ہوئی ہے۔خاص طور پر جنتی جب جنت میں داخل ہوں گے؛تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کی شکل میں داخل ہوں گے۔یعنی ساٹھ ہاتھ لمبے قد والے ہوں گے؛ جیسا کہ صحیحین اور دیگر کتب میں ثابت ہے۔ [صحیح البخاری ۳۳۲۶؛ و صحیح مسلم ۲۸٤۱.]

اور یہ روایت بھی ہے کہ:''اس کی چوڑائی سات ہاتھ ہوگی''۔[مسند أحمد بن حنبل ۲/ ۲۹۵.]

وہ نشأة ثانیہ باقی رہے گی؛اس کو آفات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔جبکہ پہلی نشأة فنا ہو جائے گی جو آفات کا پیش خیمہ رہی ہے۔

[جزاء اعمال پر ایمان:]

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول:''اعمال کی جزاء پر ہمارا ایمان ہے''۔

تشریح:ارشاد ربانی ہے:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۝﴾ (الفاتحة: ۳)

''جزا سزا کے دن کا مالک ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ۝﴾ (النور: ۲۵)

''اس دن اللہ تعالیٰ کو پورا پورا اور ٹھیک بدلہ دے گا اور ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ حق مبین ہے۔''

دین کا معنی بدلہ ہے۔کہا جاتا ہے (كما تدين تدان)'جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔''

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝﴾ (السجدة: ۱۷)

''بدلہ ہوگا اس کا جو کچھ وہ کرتے تھے''۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿جَزَآءً وِّفَاقًا۝﴾ (النباء: ۲۶)

''پورا پورا بدلہ ہوگا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۝﴾ (الانعام: ۱٦۰)

''جو کوئی نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو کوئی برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا

جائے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ۝ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝﴾ (النمل: ۸۹، ۹۰)

''جو کوئی نیکی لے کر آیا تو اس کے لیے اس سے بہتر ہے؛ اور وہ گھبراہٹ سے بے خوف ہوں گے اور جو برائی لایا؛ تو وہ دوزخ میں اوندھے منہ ڈالے جائیں گے تم کو ان ہی اعمال کا بدلہ ملے گا جو تم نے کئے تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝﴾ (القصص: ۸٤)

''جو کوئی نیکی لایا؛ اس کے لیے اس سے بہتر بدلہ ہے اور جو کوئی برائی لایا؛ تو جنہوں نے برے کام کیے ان کو وہی بدلہ ملے گا جو کچھ وہ کرتے تھے۔'' اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب سے روایت کرتے ہیں: فرمایا:

''اے میرے بندو! یہ تمھارے اعمال ہیں جن کو میں تمھارے لیے شمار کرتا ہوں پھر تم کو ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا۔ پس جو شخص نیک عمل پائے اس پر اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے۔ اور جو شخص برے عمل پائے وہ اپنے آپ کو ہی ملامت کرے''۔ [1]

مزید وضاحت آئندہ اوراق میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

[1] مسلم (۲۵۷۷)، احمد، حدیث ابی ذر رضی اللہ عنہ.

[اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی اور نامہ اعمال کی تقسیم]

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی، حساب، اعمال نامے پڑھنے ثواب وعقاب پر ایمان رکھتے ہیں''۔

تشریح: ارشاد ربانی ہے:

﴿فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ۝ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ۝ وَّالْمَلَكُ عَلٰى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ۝ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ۝﴾ (الحاقة: ۱۵۔۱۸)

''تو اس روز ہونے والی (قیامت) ہو پڑے گی اور آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس دن کمزور ہوگا اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے؛ اور آپ کے رب کے عرش کو اس روز آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے اس روز تم (سب لوگوں کے سامنے) پیش کیے جاؤ گے اور تمھاری کوئی پوشیدہ بات چھپی نہ رہے گی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ۝ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ

حِسَابًا يَسِيرًا ٥ وَيَنقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ٥ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ٥ فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا ٥ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ٥ إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ٥ إِنَّهُ ظَنَّ أَن لَّن يَحُورَ ٥ بَلَىٰ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ٥﴾ (الانشقاق: ٦-١٥)

''اے انسان تو اپنے رب کی طرف (پہنچنے میں) خوب کوشش کرتا ہے سو اس سے جا ملے گا تو جس کا نامۂ (اعمال) اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے حساب آسان لیا جائے گا اور اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے گا اور جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا وہ موت کو پکارے گا اور دوزخ میں داخل ہوگا یہ اپنے اہل وعیال میں خوش رہتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ (اللہ تعالیٰ کی طرف) پھر کر نہ جائے گا ہاں (ہاں) اس کا رب اس کو دیکھ رہا تھا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ عُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (الکهف: ٤٨)

''اور وہ قطاروں میں آپ کے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ یقیناً تم ہمارے پاس ویسے ہی آئے ہو جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ وُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَ يَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّ لَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَ وَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ٥﴾ (الکهف: ٤٩)

''اور کتاب رکھی جائے گی؛ تو آپ مجرموں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہوگا اس سے ڈرتے ہوں گے اور کہیں گے: ہماری شامت! اس کتاب کو کیا ہوگیا نہ چھوٹی بات کو چھوڑی اور نہ بڑی مگر اسے لکھ رکھا ہے۔ جو عمل کیے ہیں؛ وہ حاضر پائیں گے اور تمھارا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَ السَّمَاوَاتُ وَ بَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ٥﴾ [ابراهيم ٥٠]

''جب زمین کو دوسری زمین سے بدل دیا جائے گا؛ اور آسمان کو بھی؛ سب اللہ تعالیٰ واحد قہار کے سامنے پیش ہوں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ٥ .... إلى .... إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ٥﴾ (غافر: ۱۵-۱۷)

''وہ مالک درجات عالی اور صاحب عرش ہے، اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے وحی بھیجتا ہے تا کہ ملاقات کے دن سے ڈرائے...... بے شک اللہ تعالیٰ تو جلد حساب لینے والا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ ٥﴾ (البقرة: ٢٨١)

''اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ تعالیٰ کے حضور لوٹ کر جاؤ گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کو کچھ نقصان نہ ہوگا۔''

نیز صحیح بخاری [۱۰۳؛ مسلم ۲۸۷۶] میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''قیامت کے دن جس کا محاسبہ ہوا وہ برباد ہوا''۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا فرمان ربانی نہیں ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتَابَهٗ بِیَمِیْنِهٖ o فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا o﴾ (الانشقاق : ۷،۸)

''لیکن وہ شخص نامۂ (اعمال) اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو اس کا حساب آسان ہوگا۔''

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

''یہ تو صرف پیشی ہے، ہاں قیامت کے دن جس کا حساب کرید کر لیا گیا، وہ عذاب میں گرفتار ہوا''۔ ❶

مقصود یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے حساب کرید کر لیں؛ تو ان کو عذاب میں مبتلا کر دیں؛ اور وہ ان پر ظلم کرنے والے نہیں ہونگے۔ لیکن اللہ تعالیٰ معاف فرماتے اور درگزر کرتے ہیں۔ مزید وضاحت آگے آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

نیز صحیح حدیث میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہوں گے سب سے پہلے ہوش میں میں آؤں گا تو [دیکھوں گا کہ] حضرت موسیٰ علیہ السلام عرش کے پائے کو تھامے ہوئے ہوں گے میں نہیں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے گویا کہ طور کے دن کی بے ہوشی ان کو اس کی جگہ کفایت کر گئی''۔ ❷

یہ بے ہوشی میدان محشر میں ہوگی، جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کرنے آئیں گے؛ اور زمین اس کی روشنی سے چمک اٹھے گی اس وقت تمام مخلوق بے ہوش ہو جائے گی۔ [الروح ۳۵]

❶ بخاری، حدیث صحیح ہے۔

❷ بخاری، کتاب الخصومات (۲/ ۸۹)۔ مسلم، کتاب الفضائل (۷/ ۱۰۱)۔ مسند احمد (۲/ ۲۶٤).

اعتراض: اگر کوئی شخص اعتراض کرے کہ رسول اکرم ﷺ کی اس حدیث کا کیا ❶ جواب ہے کہ لوگ قیامت کے روز بے ہوش ہو جائیں گے؛ پہلا شخص جس سے زمین پھٹے گی وہ میں ہوں گا، میں دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کے پائے کو پکڑے ہوئے ہوں گے''۔

❶ یہ حدیث صحیح ہے، امام بخاری کتاب الخصومات کے آغاز میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً لائے ہیں، جب کہ ایک صحابی نے یہودی پر طعن لگایا تو اس نے فرمایا: انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے درمیان ایک دوسرے پر فضیلت عطا نہ کرو۔ لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہوں گے سب سے پہلے مجھ سے زمین پھٹے گی، میں موسیٰ علیہ السلام کو دیکھوں گا کہ انھوں نے عرش کے پائے کو تھاما ہوا ہوگا۔ میں نہیں جانتا کیا وہ بے ہوش ہوئے ہیں یا ان کی پہلی بے ہوشی کا حساب کر لیا گیا ہے۔ امام مسلم نے (۲۳۷۴) میں ذکر کیا مکمل الفاظ یہ نہیں ہیں مسند احمد (۳/ ۳۳) میں کچھ الفاظ کی تبدیلی ہے اس حدیث کی شاہد مسلم میں ابوہریرہ کی حدیث ہے (۲۳۷۳) کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء میں ایک دوسرے پر فضیلت عطا نہ کرو، جب صور میں پھونکا جائے گا تو آسمان زمین کی تمام چیزیں (سوائے ان کے جن کو اللہ تعالیٰ چاہے) بے ہوش ہو جائیں گی۔ پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو سب سے پہلے میں اٹھوں گا تو موسیٰ علیہ السلام نے عرش کو تھاما ہوگا میں نہیں جانتا طور کی بے ہوشی کا حساب کر کے کمی کر دی گئی ہے یا مجھ سے پہلے اٹھایا گیا ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ نفخہ ثانیہ اٹھانے کے لیے جس کا آیت میں ذکر ہے وہ نفخہ نہیں ہے جو فیصلوں کے لیے ہے جیسا کہ شارح نے امام ابن قیم کے پیچھے چلتے ہوئے یہ بات کہی ہے اس طرح حدیث میں وارد اشکال ختم ہو

جاتا ہے۔

جـــواب :اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ وارد ہے جس سے اشکال پیدا ہوتا ہے،لیکن سند میں کسی راوی پر ایک حدیث کے الفاظ دوسری حدیث میں خلط ملط ہو گئے ہیں حالانکہ دونوں حدیثیں ان الفاظ کے ساتھ ہیں؛ایک حدیث کے الفاظ یوں ہیں:''لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہو جائیں گے سب سے پہلے مجھے ہوش آئے گی''۔دوسری حدیث کے الفاظ یوں ہیں:''قیامت کے دن سب سے پہلے جس سے زمین پھٹے گی وہ میں ہوں گا''۔❶[الروح ۳۷]

❶ مسلم رقم (۲۲۷۸) باب تفصیل نبینا ﷺ میں الفاظ یہ ہیں، میں پہلا ہوں جس سے زمین پھٹ جائے گی، نیز ابوداؤد، ترمذی، احمد نے روایت کیا۔

تو راوی پر ایک حدیث کے الفاظ کا دوسری حدیث کے ساتھ اختلاط ہو گیا۔اس کی وضاحت ابوالحجاج مزی ان کے بعد شیخ شمس الدین ابن قیم،شیخ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کی ہے۔اسی طرح بعض راویوں پر اشتباہ ہوا کہ آپ نے فرمایا:

''میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آئے؛یا اللہ تعالیٰ نے ان بے ہوشی سے مستثنیٰ رکھا''۔❶

❶ حدیث صحیح ہے۔ابی ہریرۃ سے مروی ہے۔بخاری۔''اللہ تعالیٰ نے ان کو بے ہوشی سے مستثنیٰ رکھا'' مطلب یہ ہے کہ نفخ صور کا اثر ان پر نہیں ہوا۔جیسا کہ ابن ابی الدنیا نے کتاب''البعث''میں اس کی صراحت کی ہے۔اور حضرت حسن سے مرسل روایت بھی ہے۔ کمافی الفتح ۔

پس محفوظ حدیث جس کی موافقت دیگر صحیح احادیث کر رہی ہیں وہ پہلی حدیث ہے۔اور اسی پر صحیح مطلب و معنی بنتا ہے؛کہ بے شک قیامت کے دن بے ہوشی اللہ تعالیٰ کی تجلی کے وقت ہوگی؛جب اللہ تعالیٰ فیصلوں کے لیے آئیں گے۔تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر ان کیساتھ بے ہوش نہ ہوئے تو مطلب صاف ظاہر ہے کہ اس دن کی بے ہوشی کی وجہ سے جب:

﴿ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا ﴾[الاعراف ۱۴۳]

''تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی اور اس کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا''۔

پس اس دن کی بے ہوشی بدلہ ہو جائے گی اس دن کی بے ہوشی کا جب اللہ تعالیٰ بروز قیامت تجلی فرمائیں گے۔

اس عظیم معنی و مفہوم پر غور کیجیے اور اسے بے فائدہ نہ سمجھئے''۔[الروح ۳۷]

چنانچہ امام احمد[۱۹۶۶۰]،ترمذی[۲۴۲۷]،ابوبکر بن ابی الدنیا،نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے؛فرماتے ہیں:میں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے سنا،وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لوگوں کو بروز قیامت تین پیشیاں ہوں گی،پہلی دو پیشیوں میں جھگڑے اور عذر وغیرہ ہوں گے۔اور تیسری پیشی میں اعمال نامے ہاتھوں میں آجائیں گے۔[فرمان الٰہی ہے:]﴿ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴾''جس کو اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں پکڑایا گیا'' اور اس کا حساب آسان ہوا،وہ جنت میں داخل ہوا؛اور﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ﴾[الحاقۃ ۲۴]''اور جس کا اعمالنامہ بائیں ہاتھ میں دیا گیا''وہ دوزخ میں داخل ہوا۔''❶ ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے ابن مبارک رحمہ اللہ سے یہ اشعار ذکر کیے ہیں:

❶ حدیث ضعیف ہے۔حسن بصری مدلس ہے اس نے عَنْ کے ساتھ حدیث بیان کی ہے،یہ علت ایسی ہے کہ اگرچہ حسن بصری کا سماع ابوہریرہ اور ابوموسیٰ سے ثابت بھی ہو جائے تب بھی مدلس کی روایت میں یہ کافی نہیں جب تک کہ صریحاً حدثنا کے الفاظ نہ ہوں جیسا کہ اصول حدیث میں اس کا ذکر ہے ہاں اگر کسی روایت میں حسن بصری کا ابوموسیٰ سے صریحاً سماع ثابت ہو تب تسلیم کیا جائے گا۔

وطارت الصحف فی الایدی منشرة فیھا السرائر والاخبار تطلع
فکیف سھوك والانباء واقعة عما قلیل ولا تدری بما تقع
افی الجنان وفوز لا انقطاع لہ ام الجحیم فلا تبقی ولا تدع
تھوی بساکنھا طوراً وترفعھم اذا رجوا مخرجا من غمھا قمعوا
طال البقاء فلم یرحم تضرعھم فیھا ولا رقیة تغنی ولا جزع
لینفع العلم قبل الموت عالمہ قد سأل قوم بھا الرجعیٰ فما رجعوا

''اعمال نامے ہاتھوں میں پھیلے ہوئے ہوں گے، ان میں رازدارانہ باتیں اور واقعات نمایاں ہوں گے تو کیسے فراموش (ہو کر بیٹھا ہے) حالانکہ قیامت بہت جلدی واقع ہونے والی ہے، لیکن تو نہیں جانتا کب واقع ہو گی، کیا تیرا ٹھکانہ جنتیوں میں ہے اور نہ ختم ہونے والی کامیابی ہے یا جہنم ہے، جو کسی چیز کو باقی نہ چھوڑے گی، دوزخ اپنے رہنے والوں کو کبھی نیچے اور کبھی اوپر کنارے لےائے گی، جب کنارے سے نکلنے کی امید کریں گے تو انھیں رد کر دیا جائے گا دوزخ میں رونا لمبا ہو گا لیکن وہ آہ و بکا سے کچھ رحم نہ ہو گا نہ دم وغیرہ کچھ فائدہ دے گا اور نہ گھبرانے سے کچھ فائدہ حاصل ہو گا، علم والے موت سے قبل فائدہ حاصل کر لیں، وہاں دوزخی واپس لوٹنے کا سوال کریں گے لیکن نہیں لوٹ سکیں گے۔'' [نھایة ۲/ ۳۹]

پل صراط پر ایمان:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: پل صراط پر بھی ہمارا ایمان ہے۔ پل صراط جہنم پر ایک پل کا نام ہے جب لوگ محشر کے میدان سے الوداع ہوں گے تو پل صراط کے قریب ایک تاریک مقام پر پہنچیں گے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام سے دریافت کیا گیا جس دن زمین تبدیل ہو گی اور آسمان لپیٹے جائیں گے تو لوگ کہاں ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ پل صراط کے قریب تاریکی میں ہوں گے''۔ ❶

☼ مسلم (۱/ ۱۷۳).

یہ وہ مقام ہے جہاں سے منافق لوگ ایمانداروں سے الگ ہوں گے اور پیچھے رہ جائیں گے، ایماندار لوگ آگے ہوں گے ان کے درمیان ایک دیوار حائل ہو گی جو ان کو ان کی طرف جانے سے روکے گی۔ بیہقی میں مسروق سے روایت ہے؛ وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں؛ فرمایا:

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع فرمائے گا...... اعمال کے مطابق انھیں روشنی عطا ہو گی،...... بعض کی روشنی پہاڑ کی مانند ہو گی۔ بعض کی اس سے بھی زیادہ روشنی ہو گی۔ اور بعض کے دائیں ہاتھ میں کھجور کی مثل روشنی ہو گی۔ بعض کی اس سے بھی کم ہو گی۔ آخر انسان کی روشنی پاؤں کے انگوٹھے کے برابر ہو گی۔ وہ کبھی روشنی ہو گی کبھی بجھ جائے گی۔ جب روشنی ہو گی تو وہ اپنا پاؤں آگے رکھے گا جب بجھ جائے گی تو وہ رک جائے گا۔ چنانچہ وہ بھی اور دوسرے لوگ بھی پل صراط سے گزریں گے۔ خیال رہے پل صراط تلوار کی دھار کی مانند ہو گی، جس سے پاؤں پھسلے گا ان سے کہا جائے گا اپنی روشنی کے حساب سے چلو، بعض

ستارے کے ٹوٹنے کے وقت کے برابر گزریں گے، بعض آندھی کی طرح، بعض آنکھ جھپکنے کے برابر، بعض آدمی کے تیز دوڑنے کی مانند گزریں گے ❶۔ بہر حال اپنے اعمال کے مطابق گزریں گے، یہاں تک کہ اس شخص کا گزرنا ہوگا جس کی روشنی پاؤں کے انگوٹھے میں ہوگی، کبھی اس کا ایک ہاتھ پھسلے گا، دوسرا درست رہے گا اور کبھی اس کا ایک پاؤں پھسلے گا اور دوسرا درست رہے گا۔ لیکن اس کے جسم کے اطراف کو دوزخ کی آگ نے گھیر رکھا ہوگا اس طرح ان کا پل صراط سے گزرنا ہوگا جب گزر جائیں گے تو کہیں گے تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے ہمیں تجھے دکھایا اور تجھ سے نجات عطا فرمائی بے شک اللہ تعالیٰ نے ہمیں وہ انعام دیئے ہیں جو کسی کو نہیں دیئے گئے ہیں''۔ ❶

❶۔ مستدرک حاکم اور معجم طبرانی میں ایسے ہی ہے۔ اور وہ روایت جس پر یہاں شیخ احمد شاکر نے ان الفاظ کے ساتھ تعلیق لگائی ہے؛ (کشد الرجل ؛ ثم کمشیئتهم) ؛ یہ دراصل امام حاکم (۲/ ۳۷۵) کے ہاں ایک دوسری روایت ہے۔ جو کہ دالانی کی سند سے نہیں۔ شیخ رحمہ اللہ کی نظر اس سند کی طرف نہیں گئی۔ حالانکہ یہ روایت بھی ساتھ والے صفحہ پر تھی۔

✪ حدیث صحیح هے حاکم نے (۲/ ۳۷٦) میں روایت کیا، میرا خیال ہے بیہقی نے اس کے طریق سے روایت کیا حاکم نے اس روایت کو صحیح علیٰ شرط الشیخین کہا، ذہبی نے بھی اس کو موافقت کی ہے میں کہتا ہوں اس میں یزید بن عبدالرحمٰن راوی سے بخاری، مسلم میں کوئی روایت نہیں اگر چہ وہ سچا ہے لیکن اکثر طور پر خطا کر جاتا ہے نیز مدلس بھی کما فی التقریب لیکن اس حدیث میں صراحتاً صیغۂ تحدیث کے ساتھ ذکر کیا ہے جس سے تدلیس کا وہم جاتا رہا اس سے خطا کا بھی خطرہ تھا، لیکن متابعت نے خطا کے خطرہ کو بھی ختم کر دیا، حاکم نے (٤/ ٥٩٠-٥٩٢) میں مکمل طویل حدیث ذکر کی ہے۔ طبرانی معجم الکبیر (۳/ ٤٦/ ۲/ ٤٧/ ۲) میں ابو خالد عن ابن مسعود سے مرفوعاً ذکر کیا طبرانی میں اس کی متابعت مرفوعاً زید بن ابی انیسہ سے موجود ہے اور زید ثقہ ہے۔ لہٰذا حدیث صحیح ہے والحمد للہ حاکم کی مرفوع اور موقوف روایت میں دون کے ساتھ اور طبرانی میں لفظ اصغر کے ساتھ ہے یہ روایت زیادہ مناسب ہے اس لیے کہ اس پر سیاق دلالت کر رہا ہے۔ حاکم، طبرانی کی مرفوع، موقوف روایت میں فیمدون کے لفظ ہیں اسی طرح مستدرک اور معجم میں بھی ہیں البتہ وہ حدیث جس کو علامہ احمد شاکر نے کشد الرحال او کمشیھم کے الفاظ سے ذکر کیا ہے وہ حاکم کی دوسری روایت (۲/ ۳۸۵) میں دالاتی کے غیر طریق سے ہے اس طریق پر شیخ کی نظر نہیں گئی حالانکہ وہ اس صفحہ پر تھی جو دوسری روایت کے صفحہ کے بعد ہے (توفیق دینے والا اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ ہے)

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ''لفظ ورود'' سے کیا مراد ہے؟ ﴿وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ (مریم : ۷۱) ''اور تم سب اس پر وارد ہونے والے ہو۔'' اس کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ زیادہ ظاہر اور قوی بات یہی لگتی ہے کہ اس سے مراد پل صراط سے گزرنا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا﴾ (مریم : ۷۲)

''پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا ہوا چھوڑ دیں گے۔''

نیز صحیح حدیث [مسلم ٢٤٩٦] میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جس نے درخت کے نیچے بیعت کی ہے وہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا''۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا: یارسول اللہ ﷺ! کیا فرمان باری تعالیٰ نہیں ہے:

﴿وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ (مریم : ۷۱)

''اور تم سب اس میں داخل ہونے والے ہو۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا:

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا﴾ (مريم: ۷۲) [1]

"پھر ہم پرہیز گاروں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا ہوا چھوڑ دیں گے۔"

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دوزخ پر وارد ہونا دوزخ میں داخل ہونے کو مستلزم نہیں۔ نیز شر سے نجات پانا اس کے حصول کو مستلزم نہیں۔ البتہ سب کے انعقاد کو مستلزم ہے۔ جیسے جس شخص کو دشمن ہلاک کرنے کے لیے تلاش کرتے ہیں لیکن ہلاک کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلاں کو اللہ تعالیٰ نے اس کے دشمنوں سے نجات عطا کی ہے۔ اسی لیے ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا﴾ (هود: ۵۸)

"اور جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے ہود کو نجات دی۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا﴾ (هود: ٦٦)

"پس جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے صالح کو نجات دی۔"

﴿وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا﴾ (هود: ٩٤)

"اور جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے شعیب کو نجات دی۔"

حالانکہ ان پر عذاب نہیں آیا تھا۔ عذاب دوسرے لوگوں پر آیا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ انھیں خصوصی اسباب نجات سے ہمکنار نہ کیا ہوتا؛ تو ان پر بھی وہی عذاب آتا جو ان دوسرے لوگوں پر آیا تھا۔ یہی حال آگ پر وارد ہونے والوں کا ہوگا؛ جو وہ اس کے اوپر سے پل صراط پر سے گزریں گے۔ تو للہ تعالیٰ پرہیز گاروں کو نجات دے گا اور ظالموں کو گھٹنوں کے بل جہنم میں گرا دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں بیان کر دیا ہے کہ اس ورود سے مراد پل صراط پر وارد ہونا ہے۔

نیز حافظ ابو نصر وائلی [1] نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"لوگوں کو میری سنت کی تعلیم دو اگر چہ وہ اس کو ناپسند کریں۔ اگر تو پسند کرتا ہے کہ تجھے پل صراط پر آنکھ جھپکنے کے برابر بھی نہ رکنا پڑے؛ اور تو جنت میں داخل ہو جائے تو: "پھر ہر گز اللہ تعالیٰ کے دین میں اپنی رائے سے نئی چیزوں کو داخل نہیں کرنا"۔ [2]

قرطبی (تذکرہ ۲/ ۱۷۶) نے ذکر کیا ہے؛ نیز ابوبکر بن احمد بن سلیمان نجار نے یعلیٰ بن منیہ سے روایت کیا ہے: انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا، آپ ﷺ نے فرمایا:

"بروز قیامت دوزخ مومن سے کہے گی اے مومن! گزر جا؛ تیری روشنی نے میرے شعلوں کو بجھا دیا ہے" [3]۔

---

[1] صحیح هے؛ مسلم ـ احمد [٦/ ٢٨٥] نے ایسی هی روایت ام مبشر سے بیان کی هے۔

[1] ابو نصر سجزی المتوفی سنة ٤٤٤ هـ۔ (تذكرة الحفاظ ٣/ ٣٨٩ ـ ٢٩٨)

[2] حدیث موضوع ہے دراصل ایک حدیث کا ٹکڑا ہے جس کو ابو نعیم اور خطیب نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ذکر کیا ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں ذکر کیا، میں نے اس حدیث پر احادیث ضعیفہ (۲۶۳) میں کلام کیا ہے۔

[3] حدیث ضعیف هے ـ طبرانی ۲۲/ ٦٦٨ ـ ابن عدی اور ابو نعیم نے اس ضعیف اور منقطع سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ نهاية ۲/ ۹۲ ـ

[میزان پر ایمان]

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''ہم میزان پر بھی ایمان رکھتے ہیں''۔

تشریح: ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ نَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْـًٔا وَ اِنْ کَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا وَ کَفٰی بِنَا حٰسِبِیْنَo﴾ (الانبیاء: ٤٧)

''اور ہم بروز قیامت انصاف کی ترازو قائم کریں گے تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی اور اگر رائی کے دانہ کے برابر (بھی کسی کا عمل) ہوگا تو ہم اس کو لا موجود کریں گے اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَo وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِیْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَo﴾ (المومنون: ١٠٢، ١٠٣)

''تو جن کے (عملوں کے) بوجھ بھاری ہوں گے وہ فلاح پانے والے ہیں اور جن کے بوجھ ہلکے ہوں گے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے تئیں خسارے میں ڈالا، ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔''

علامہ قرطبی رحمہ اللہ علیہ (التذکرة ٢/ ١٣٤) فرماتے ہیں: ''علماء کا قول ہے: جب حساب ختم ہو جائے گا تو اس کے بعد اعمال کا وزن ہوگا۔ اس لیے کہ وزن کی جزاء دینے کے لیے ہے؛ تو اسے محاسبہ کے بعد ہی ہونا چاہیے۔ محاسبہ اعمال کے ثابت کرنے کے لیے ہوگا اور وزن کے مقدار کے اظہار کے لیے؛ تاکہ پورا پورا بدلہ مل سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ نَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ﴾ (الانبیاء: ٤٧)

''اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ساتھ ترازو رکھیں گے۔''

اس بات کا بھی احتمال ہے کہ متعدد ترازو ہوں جن میں اعمال کا وزن کیا جائے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد تولے جانے والے اعمال ہوں۔ پس جمع کا صیغہ ''موازین'' اعمال کے اعتبار سے ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سنت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ: اعمال والے ترازو کے دو پلڑے ہیں؛ جو حسی ہیں ان کا مشاہدہ کیا جائے گا۔ امام احمد رحمہ اللہ علیہ (مسند ٦٩٩٢؛ میں) ابو عبد الرحمٰن الحبلی کی سند سے؛ وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے سنا؛ آپ فرما رہے تھے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک شخص کو تمام مخلوق کی موجودگی میں نجات دیں گے۔ اس کے اعمال نامے کے ننانویں دفاتر پھیلائے جائیں گے ہر دفتر تا حد نگاہ پھیلا ہوا ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے: کیا تو ان گناہوں میں کسی گناہ کا انکار کرتا ہے؟۔ کیا تجھ پر میرے مقرر کردہ نگران لکھنے والوں نے ظلم تو نہیں کیا؟ وہ جواب دے گا: اے اللہ! نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیا تیرا کوئی عذر ہے؟ یا تیری کوئی نیکی ہے؟، وہ شخص حیران ہوگا اور کہے گا: نہیں اے میرے رب۔ اللہ

تعالیٰ فرمائیں گے: ہاں ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے؛ آج تجھ پر ظلم نہیں ہوگا؛ اس کے لیے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا جائے گا جس میں ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ' تحریر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اس کو حاضر کرو۔ وہ کہے گا: اے میرے رب! ان دفتروں کے مقابلے میں اس پرزے کی کیا حیثیت ہے؟۔ اسے کہا جائے گا: ''تجھ پر آج کوئی ظلم نہیں ہوگا''۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ: ''ان تمام دفاتر کو ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا؛ اور کاغذ کے اس پرزے کو دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا۔ تمام دفاتر وزن میں ہلکے ہوجائیں گے اور کاغذ کا پرزہ بھاری ہوجائے گا۔ کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ رحمان رحیم کے نام کے مقابلہ میں بھاری نہیں ہوسکتی''۔ [1]

[1] حدیث صحیح ہے، حاکم ۱/۶؛ نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے، ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے۔ ترمذی نے اسے ان دونوں روایتوں میں حسن کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہے''۔ کتاب میں جو روایت ہے وہ مسند احمد کی ہے (۲/۲۱۳)؛ یہ روایت شاذ ہے میں نے سلسلہ الاحادیث الصحیحہ (۱۳۵) میں حدیث کی سند پر بحث کی ہے۔

اسی طرح ترمذی (۲۷۸۹)، ابن ماجہ (۴۳۰۰)، ابن ابی الدنیا نے لیث کی حدیث روایت کی، ترمذی میں اضافہ ہے: ''اللہ تعالیٰ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھی بھاری نہیں ہوسکتی''۔

ایک دوسرے سیاق میں ہے:

''ترازو قیامت کے دن رکھے جائیں گے، ایک شخص کو لایا جائے گا اس کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا'' [1]

اس حدیث سے ایک جلیل فائدہ حاصل ہورہا ہے کہ: اعمال کے ساتھ عامل کا بھی وزن کیا جائے گا۔ (النهاية ۲/ ۲۳)

اس کی شاہد بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''قیامت کے دن ایک ایسے شخص کو لایا جائے گا جو بڑا تھا اور موٹا تازہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا''۔ آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ آیت تلاوت کرو:

[1] حدیث پہلی ہی ہے الفاظ اور ہیں سند کے لحاظ سے حدیث صحیح نہیں اس لیے کہ اس میں ابن لہیعہ ہے جس کا حافظہ کمزور تھا وہ روایت جس میں وہ منفرد ہے، قابل حجت نہیں ہے۔ مسند احمد (۲/ ۲۲۱ (۷۰۳۷۰)).

﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ (الكهف: ۱۰۵) [1]

[1] حديث صحيح هے۔ مسلم (۸/ ۱۲۵). (النهاية ۲/ ۸۲)

''ہم ان کے (اعمال کا) قیامت کے دن وزن نہیں کریں گے''۔

نیز مسند احمد (۳۹۹۲) میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ پیلو کے درخت سے مسواک اتار رہے تھے۔ ان کی پنڈلیاں بہت باریک تھیں؛ تو ہوا کے جھونکے ان کو گرا رہے تھے اس پر لوگ ہنسنے لگے، رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا:

تم کیوں ہنستے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: یا نبی اللہ تعالیٰ! اس کی پنڈلیوں کی باریکی پر ہنس رہے ہیں''۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس کی پنڈلیاں ترازو میں احد پہاڑ سے بوجھل ہوں گی''۔ [1]

نیز اعمال کے وزن کے بارے میں بھی احادیث موجود ہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابومالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''وضوء آدھا ایمان ہے، الحمدللہ کا جملہ ترازو کے پلڑے کو بھر دے گا''۔ ❷

بخاری شریف کے آخر میں حدیث ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

''دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ہیں۔ وزن میں بوجھل ہیں: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمْ''۔ ❸

۞ حدیث حسن ھے مسند احمد (۱/ ٤٥٠) سند حسن ھے۔

۞ حدیث صحیح ھے۔ تخریج مشکاۃ الفقرۃ (رقم ٥٩).

۞ بخاری(٦٤٠٦). ، مسلم(٢٦٩٤)۔

نیز حافظ ابوبکر بیہقی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں؛ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''ابن آدم کو قیامت کے دن لایا جائے گا؛ اور اسے ترازو کے دونوں پلڑوں کے درمیان کھڑا کیا جائے گا۔ اور اس پر ایک فرشتہ مقرر ہوگا۔ اگر اس کا پلڑا بھاری ہوگیا تو فرشتہ ایسی بلند آواز کے ساتھ منادی کرے گا اس کی آواز تمام مخلوق کو سنائی دے گی کہ: '' فلاں آدمی سعادت مند ہے اس کے بعد وہ کبھی بدبخت نہ ہوگا''۔

اور اگر اس کا پلڑا ہلکا ہوا تو فرشتہ بلند آواز کے ساتھ منادی کرے گا جس کی آواز تمام مخلوق کو سنائی دے گی:

''فلاں انسان بدبخت ہے اس کے بعد وہ کبھی خوش بخت نہ ہوگا''۔ ❶

۞ حدیث موضوع ہے۔ ابونعیم نے اس حدیث کو حلیہ (٦/ ١٧٤) میں ذکر کیا ہے اور ذکر کیا ہے اور ذکر کیا کہ اس حدیث میں داؤد بن محبر منفرد ہے۔ میں کہتا ہوں وہ متروک ہے۔ نیز اس پر احادیث گھڑنے کی تہمت ہے۔

پس کسی سرکش ملحد کی بات پر دھیان بھی نہ کیا جائے گا جو کہتا ہے: ''اعمال اعراض ہیں ان کا وزن ممکن نہیں؛ اس لیے کہ وزن تو اجسام کا ہوتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اعراض کو اجسام سے بدل دیں گے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

نیز مسند احمد (٩٤٤٧) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''موت کو مٹیالے رنگ کے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا جنت اور دوزخ کے درمیان اسے کھڑا کیا جائے گا جنت والوں کو پکارا جائے گا: اے جنت والو! وہ سر اٹھائیں گے اور دیکھیں گے۔ اور دوزخ والوں کو پکارا جائے گا: اے دوزخیو! وہ بھی سر اٹھائیں گے اور دیکھیں گے؛ وہ سوچیں گے کہ نجات کا وقت آ گیا ہے۔ اس دوران مینڈھے کو ذبح کر دیا جائے گا؛ اور اعلان کیا جائے گا: ''اب ہمیشگی ہے موت نہیں ہے۔'' ❶

بخاری(٤٧٣٠ و مسلم ٢٨٤٩) نے اس حدیث کو بالمعنیٰ ذکر کیا ہے۔

پس ان احادیث سے اعمال کا، اور عمل کرنے والوں کا؛ اور نامہ اعمال کا وزن ہونا ثابت ہوگیا۔ نیز یہ بھی ثابت ہوگیا کہ ترازو کے دو پلڑے ہوں گے۔ باقی کیفیات کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

۞ حدیث صحیح ھے۔ مسند احمد (٢/ ٤٢٣) سند صحیح ھے۔

پس ہم پر غیب پر ایمان لانا واجب ہے؛ جیسے ہم کو نبی کریم ﷺ نے خبر دی ہے۔ بغیر کسی کمی یا بیشی کے۔ اور کس قدر بدنصیب

ہیں وہ لوگ: ﴿الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ ''جو قیامت کے دن انصاف کے ترازو کے رکھے جانے'' کی نفی کرتے ہیں۔ جیسا کہ شارع ﷺ نے اس کی خبر دی ہے۔ اس لیے کہ ان پر اس کی حکمت مخفی رہ گئی ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہوئے ان روایات پر جرح کرتا ہے کہ: ''ترازو کی ضرورت تو صرف سبزی فروش، غلہ فروشوں کو ہوتی ہے''۔

اس فکر کے لوگ یقیناً اس لائق ہیں کہ قیامت کے دن ان کے لیے ترازو نہ قائم کیا جائے۔ اور اگر اعمال کا وزن کرنے میں صرف یہی حکمت ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کے عدل کا اس کے تمام بندوں کے لیے ظہور ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے زیادہ کسی کے نزدیک عذر اتنا پسندیدہ اور محبوب نہیں۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو خوشخبری دیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرائیں۔ تو پھر اس وقت کیا عالم ہوگا جب اس کے پیچھے اور بھی اتنی حکمتیں ہو سکتی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں۔ غور کیجیے، جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا: ﴿اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً﴾: ''میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں''۔ تو فرشتوں نے کہا:

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرة: ۳۰)

''بولے: تو ایسے کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور خون بہائے؛ اور ہم تیری حمد و تسبیح کے ساتھ پاکیزگی بیان کرتے ہیں؟۔ فرمایا: ''میں وہ باتیں بھی جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (الاسراء: ۸۵)

''اور نہیں دیے گئے تم علم میں سے کچھ؛ مگر بہت تھوڑا۔''

حوض کی تفصیل میں علامہ قرطبی رحمہ اللہ کی وضاحت گزر چکی ہے کہ حوض میزان سے پہلے ہوگا؛ اور پل صراط میزان کے بعد۔ چنانچہ بخاری (۶۵۳۵)، مسلم میں ہے:

''بے شک مؤمنین جب پل صراط سے گزریں گے؛ تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک ٹیلے پر کھڑے کیے جائیں گے۔ وہاں وہ ایک دوسرے سے بدلہ لیں گے۔ جب چھان بین اور صفائی ہو جائے گی تو انھیں جنت میں داخلہ کی اجازت مل جائے گی''۔ [1]

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے تذکرہ (۲/ ۱۷۹) میں اس ٹیلے کو خاص طور پر ایمان داروں کے لیے دوسرا پل صراط قرار دیا ہے۔ اس پل صراط سے کوئی شخص دوزخ میں نہیں گرے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

[1] بخاری فی المظالم، احمد (۳/ ۱۳/ ۶۳/ ۷۴) عن ابی سعید الخدری میں نے اس حدیث کو مسلم میں نہیں دیکھا۔

[جنت اور جہنم کی تخلیق]

۸۳۔((وَالْجَنَّةُ وَالنَّارُ مَخْلُوقَتَانِ لَا تَفْنِيَانِ أَبَدًا وَلَا تَبِيْدَانِ① وَأَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَلَقَ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ قَبْلَ الْخَلْقِ وَخَلَقَ لَهُمَا أَهْلاً فَمَنْ شَاءَ مِنْهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ فَضْلاً مِنْهُ وَمَنْ شَاءَ مِنْهُمْ إِلَى النَّارِ عَدْلاً مِنْهُ وَكُلٌّ يَعْمَلُ لِمَا قَدْ فَرَغَ لَهُ ②وَصَائِرٌ إِلَى مَا خُلِقَ لَهُ .))

" جنت، دوزخ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ دونوں کبھی فنا نہ ہوں گی نہ ہی ختم ہوں گی" اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق سے پہلے جنت، دوزخ کو پیدا فرمایا اور ان دونوں کے لیے مخلوق کو پیدا فرمایا، ان میں سے جس شخص کو چاہے گا جنت میں داخل کرے گا۔ یہ اس کا فضل ہے اور کس شخص کو چاہے گا دوزخ میں داخل کرے گا یہ اس کا عدل ہے۔ ہر انسان وہی عمل کرتا ہے جس سے فارغ ہوا گیا ہے اور اسی چیز کی طرف جانے والا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے"۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جان لیجیے کہ آخرت میں جہنم کی دو اقسام ہیں۔ ایک قسم کی جہنم ختم ہو جائے گی۔ اور دوسری جہنم ہمیشہ باقی رہے گی؛ وہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔ پہلی قسم مسلمان گنہگاروں کی جہنم ہے۔ اور دوسری قسم کافروں اور مشرکین کی جہنم ہے۔ یہ ابن قیم رحمہ اللہ کی الوابل الصيب میں تحریر کا خلاصہ ہے۔ اور یہی بات حق ہے؛ اس میں کچھ شک نہیں۔ اور اسی طرح سے دلائل میں جمع و تطبیق ممکن ہے۔ اس موقع پر شارح کے کلام سے انسان غلط نہ سمجھ لے؛ ابن قیم نے شفاء العليل اور حادی الارواح میں جو کچھ ذکر کیا ہے؛ وہ اس خلاصہ کی منافی ہے جو میں نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس کو واضح بنیاد نہیں بنایا۔ اور اس سلسلہ میں کوئی صحیح اور صریح دلیل نہیں ہے جس سے پتہ چلتا ہو کہ کافروں والی جہنم بھی ختم ہو جائے گی۔ جبکہ اللہ تعالیٰ اہل جنت کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿لا يمسهم فيها نصب وما هم منها بمخرجين﴾ [الحجر: 48]۔ "انہیں نہ وہاں پر کوئی تنگی ہوگی اور نہ ہی وہ اس سے نکالے جائیں گے"۔ اور ایسے ہی اہل جہنم کے متعلق فرمایا: ﴿وما هم بخارجين من النار﴾ [البقرة: 167] "اور وہ جہنم سے نہیں نکالے جائیں گے"۔ اور اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو روایت کیا گیا ہے؛ اس کی سند صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے شرح عقیدہ طحاویہ پر اپنی تعلیق میں واضح کیا ہے؛ نیز دیکھیں: (الاحاديث الضعيفة ۲/ ۶۰۶؛ ۶۰۷)۔

اس سلسلہ میں شیخ البانی رحمہ اللہ نے علامہ امیر صنعانی رحمہ اللہ کے رسالہ "رفع الأستار لإبطال أدلة القائلين بفناء النار" پر بھی تعلیق لگائی ہے۔

أقول: کتاب و سنت میں جنت اور جہنم کے اس وقت میں مخلوق اور موجود ہونے کے دلائل بہت سارے ہیں۔ ان میں سے وہ دلائل بھی ہیں جو عذاب قبر یا نعیم قبر پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ جنت اور جہنم کے موجود ہونے کے دلائل ہیں۔ اس لیے کہ عذاب قبر جہنم کا ایک حصہ ہے۔ اور قبر کی نعمتیں دراصل جنت کی نعمتوں کا ایک حصہ ہیں۔ نیز جنت اور جہنم ان دونوں کو پیدا کر دیا گیا ہے۔ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں کہ آخرت میں ملنے والی جنت یا جہنم ابھی پیدا ہی نہیں کی گئیں۔ یہ سب غلط گمان کرتے ہیں؛ جن کی کوئی اصل نہیں ہے۔ جب کہ قرآنی صراحت کے مطابق جنت اور جہنم تیار کیے جا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ☆..... سَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾۔ [آل عمران 131.133]۔ "اور اس آگ سے بچو جو کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔......اور اپنے رب کی بخشش اور جنت کی طرف لپکو جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کے برابر ہے اور جو متقیوں کیلئے تیار کی گئی ہے"۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم کو پیدا کیا، تو حضرت جبریل علیہ السلام کو جنت کی طرف بھیجا، اور فرمایا: جنت کو دیکھو، اور جو کچھ میں نے اس میں جنت والوں کے لیے تیار کیا ہے، اسے دیکھو......"۔ [أحمد ۲/۳۵۴، والترمذی (۲۵۶۳)۔ وعبدالرزاق في المصنف (۹۱۳)۔]

اور فرمایا: "جنت کو ناپسندیدہ چیزوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے؛ اور جہنم کو شہوات سے ڈھانپ دیا گیا ہے"۔ مسلم (۲۸۲۲)، وعبدالرزاق في المصنف (۹۱۵)۔

② ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے: "اللہ تعالیٰ ہر انسان کے متعلق پانچ چیزوں سے فارغ ہو چکے ہیں: ۱۔ اس کی اجل۔ ۲۔ اس کا رزق۔ ۳۔ اس کی زندگی۔ ۴۔ اس کا ٹھکانہ۔ ۵۔ اس کا نیک یا بد بخت ہونا"۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ دیکھیں: تخريج المشكاة (۱۱۳) السنة (۳۰۳۔۔۳۰۹)۔ اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ اور معروف ہیں۔

تشریح: امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ''جنت، دوزخ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں''۔ اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ جنت اور دوزخ پیدا کر دی گئی ہیں؛ اور وہ دونوں اس وقت موجود ہیں۔ اہل سنت اسی عقیدہ پر قائم رہے، حتیٰ کہ معتزلہ قدریہ کا ظہور ہوا، انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اور کہا کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو قیامت کے دن بنائے گا۔ ان کو اس پر ابھارنے والا ان کا ایک من گھڑت اور فاسد اصول تھا؛ جس کو انھوں نے شریعت قرار دیدیا تھا، کہ اللہ تعالیٰ کے لائق ہے فلاں کام کرے؛ اور فلاں کام کرنا اس کے لائق نہیں ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے افعال میں ان پر قیاس کرنے لگے۔ پس یہ لوگ افعال میں مشبہہ ہیں۔ نیز ان میں جہمیت کا دخل بھی ہے۔ اس لحاظ سے یہ لوگ معطلہ بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جزاء سے پہلے جنت کا پیدا کرنا بے فائدہ ہے۔ اس لیے کہ جنت اتنا لمبا طویل عرصہ بے آباد رہے گی۔ انھوں نے ان نصوص کا رد کیا جو ان کی طرف سے رب کے لیے گھڑی گئی شریعت کے خلاف تھیں۔ اور نصوص میں تحریف کی۔ اور جو بھی ان کی شریعت کی مخالفت کرتا اسے گمراہ اور بدعتی کہنے لگ گئے''۔ (حادی ۱۱)

شیخ عفیفی فرماتے ہیں: اس بحث کے لیے حادی الآرواح کا مطالعہ کیا جائے۔ بہت ہی نفیس بحث ہے۔

کتاب اللہ تعالیٰ میں جنت کے بارے میں نصوص؛ ارشاد ربانی ہے:

﴿اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ۝﴾ (آل عمران: ۱۳۳)

''پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اُعِدَّتۡ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ﴾ (الحدید: ۲۱)

''ان کے لیے تیار کی گئی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔''

نیز دوزخ کے بارے میں فرمایا:

﴿اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ۝﴾ (آل عمران: ۱۳۱)

''وہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ جَہَنَّمَ کَانَتۡ مِرۡصَادًا۝ لِّلطّٰغِیۡنَ مَاٰبًا۝﴾ (النبا: ۲۱، ۲۲)

''بے شک دوزخ گھات میں ہے (یعنی) سرکشوں کا وہی ٹھکانہ ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی ۝ عِنۡدَ سِدۡرَۃِ الۡمُنۡتَہٰی ۝ عِنۡدَہَا جَنَّۃُ الۡمَاۡوٰی ۝﴾ (النجم ۱۳، ۱۵)

''اور انہوں نے اس کو ایک اور بار بھی دیکھا ہے پرلی حد کی بیری کے پاس رہنے کی بہشت ہے۔''

نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سدرۃ المنتہیٰ کو بھی دیکھا، وہاں جنت الماویٰ کو بھی دیکھا، جیسا کہ بخاری (۳۲۰۷)، مسلم (۱۶۴) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسراء کے واقعہ کے آخر میں ہے:

''پھر مجھے جبرئیل علیہ السلام لے کر چلا یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ کو مختلف قسم کے رنگوں نے ڈھانپ رکھا تھا، میں نہیں جانتا وہ کیا تھے۔ پھر میں جنت میں داخل ہوا تو وہاں موتی کے محلات تھے اور ان کی مٹی کستوری کی تھی۔ ❶

نیز بخاری (۱۳۷۹) مسلم (۲۸٦٦) میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو اس پر اس کا مقام صبح، شام پیش کیا جاتا ہے، اگر وہ جنت والوں سے ہے تو جنت میں سے، اگر وہ دوزخ والوں سے ہے تو دوزخ میں سے وہ ٹھکانہ پیش کیا جاتا ہے۔ اسے کہا جاتا ہے: ''یہ تیرا اصل مقام ہے۔ جب اللہ تعالیٰ تجھے قیامت کے دن اٹھائے گا''۔ ❷

نیز حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث پہلے گزر چکی ہے؛ جس میں ہے:

''آسمان میں منادی کرنے والا منادی کرے گا، میرے بندہ نے سچ کہا؛ اس کے لیے جنت میں فرش بچھا دو اس کے لیے جنت کی طرف دروازہ کھول دو''۔

(راوی بیان کرتا ہے): ''پس اس تک جنت کی خوشبوئیں اور لطیف جھونکے آنے شروع ہو جائیں گے''۔ ❸

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت حضرت براء رضی اللہ عنہ والی روایت کے ہم معنی ہے۔ (بخاری ۱۳۳۸؛ مسلم ۲۸۷۰)

صحیح مسلم (۹۰۱؛ بخاری ۱۲۱۲) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سورج کسوف ہوا۔ اس حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں نے یہاں اپنی اس جگہ سے ہر اس چیز کا مشاہدہ کیا جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے، حتی کہ میں نے دیکھا کہ میں نے جنت میں ایک [انگور کا] خوشہ پکڑا، جب تم نے دیکھا کہ میں آگے بڑھا تھا۔ نیز میں نے دوزخ کو دیکھا کہ اس کا کچھ حصہ دوسرے حصہ کی توڑ پھوڑ کر رہا ہے، جب تم نے دیکھا میں پیچھے ہوا''۔ ❹

نیز بخاری (۲۰۵۲) اور مسلم (۹۰۷) میں ہے؛ یہ الفاظ بخاری کے ہیں، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں سورج گرہن ہو گیا...... (اس حدیث کا ذکر کیا)۔ اس میں ہے:......

''انہوں نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے اپنی جگہ پر آگے ہو کر کسی چیز کو پکڑا۔ پھر ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ذرا پیچھے ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک میں نے جنت کو دیکھا، اس کا ایک خوشہ پکڑا، اگر میں نے اسے توڑ لیتا: تو تم اس میں سے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے۔ اور میں نے دوزخ کو دیکھا۔ میں نے آج کے دن کی مانند کوئی خوفناک منظر نہیں دیکھا۔ میں نے اس میں زیادہ تعداد میں عورتیں دیکھیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کس لیے؟۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کے کفر [ناشکری] کرنے کی وجہ سے''۔ عرض کی: کیا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ خاوندی کی ناشکری کرتی ہیں اور احسانات کا شکریہ ادا نہیں کرتیں''۔ اگر آپ ساری زندگی ان کے ساتھ احسان کرتے رہیں، پھر وہ آپ میں کوئی ناخوشگوار چیز دیکھ لے؛ تو بول اٹھے گی: ''میں نے کبھی بھی خیر و بھلائی نہیں دیکھی''۔ ❺

نیز صحیح مسلم (٤٢٦) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم ان چیزوں کا مشاہدہ کرو جن کا مشاہدہ میں کر رہا ہوں تو تم بہت کم ہنسو؛ اور زیادہ روؤ''۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے کیا دیکھا؟۔ آپ نے فرمایا: ''میں نے جنت اور جہنم کو دیکھا''۔ (حدیث صحیح ہے؛ مخرج فی الصحیحة)

نیز مؤطا (١/ ٢٤٠) میں؛ اور سنن کی کتابوں (نسائی ١٩٦٠؛ ابن ماجة ٤٢٧١) میں حضرت کعب بن ابی مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مومن کی روح پرندہ [کی شکل میں ہوتی] ہے؛ جو جنت کے درختوں کے ساتھ لٹکی ہوتی ہے، حتی کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے روز اس کے جسم کی طرف واپس کر دے گا''۔ ❻

مذکورہ حدیث واضح طور پر [صراحت کے ساتھ] دلالت کر رہی ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے روح جنت میں داخل ہوگی۔

نیز صحیح مسلم، سنن (أبو داؤد ٤٧٤٤ الترمذی ٢٦٩٨)، مسند (أحمد ٨٣٧٢) میں ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ نے جنت، دوزخ کو پیدا فرمایا؛ تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو جنت کی طرف بھیجا اس کہا جاؤ جنت کا مشاہدہ کرو، نیز ان چیزوں کو دیکھو جو میں نے جنت والوں کے لیے تیار کی ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لے گئے؛ آپ نے جنت کو دیکھا؛ اور اس میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے لیے تیار کر رکھا ہے؛ اس کو دیکھا؛ اور پھر واپس آئے اور کہا: آپ کی عزت کی قسم! جو بھی جنت کے بارے میں سنے گا وہ اس میں ضرور داخل ہوگا۔ پھر جنت کے بارے میں حکم دیا اس کو مصائب سے ڈھانپ دیا گیا۔ پھر فرمایا: اب جاؤ جنت کا اور ان چیزوں کا مشاہدہ کرو جن میں نے اہل جنت کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔

پس حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس کو دیکھا؛ پھر واپس آئے؛ اور کہا: آپ کی عزت کی قسم! مجھے ڈر ہے کہ اس میں تو کوئی بھی داخل نہ ہوگا''۔ (راوی بیان کرتا ہے): ''پھر اس کو دوزخ کی جانب بھیجا؛ اور فرمایا: جاؤ دوزخ کو دیکھو؛ اور جو کچھ میں نے اہل دوزخ کے لیے تیار کیا ہے اس کا مشاہدہ کرو۔ جبریل علیہ السلام نے اس کا مشاہدہ کیا؛ تو اس کے حصے آپس میں گتھم میں گتھا ہو رہے تھے۔ پھر وہ واپس آئے؛ اور کہا: ''آپ کی عزت کی قسم! جو کوئی اس کے بارے میں سنے گا وہ ہرگز اس میں داخل نہیں ہوگا''۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کے بارے میں حکم دیا، اس کو شہوات کے ساتھ ڈھانپ دیا گیا۔ پھر فرمایا: اب جاؤ اور دیکھو میں نے دوزخ والوں کے لیے کیا تیار کر رکھا ہے۔ وہ گئے؛ اور دیکھ کر آئے؛ اور کہنے لگے: ''آپ کی عزت کی قسم! مجھے ڈر ہے کہ اس سے کوئی نجات نہ پا سکے گا۔ سب اس میں داخل ہوں گے''۔ ❼

اس مضمون کی احادیث کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

❺ حدیث صحیح هے۔

❻ حدیث صحیح مسن احمد (٢/ ٦، ٥١، ١١٣، ١٢٣).

❼ حدیث صحیح هے۔ احکام الجنائز (ص ١٥٦، ١٥٩).

○ حدیث صحیح ہے نماز کسوف میں طویل حدیث کا ٹکڑا ہے میں نے اس کی تخریج جزء صلوٰۃ الکسوف میں کی ہے۔
* حدیث صحیح ھے پھلے گزر چکی ھے۔
ۂ حدیث صحیح ھے۔ الصحيحة (۹۹۵).
❀ حدیث صحیح ھے۔ الحاکم (۱/ ۳٦)، صحيح الجامع (۵۰۸٦)، مشكوٰة البانی (۵٦۹٦).

جو حضرات یہ کہتے ہیں: وعدہ کی گئی جنت سے مراد وہی ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام تھے۔ پھر انہیں وہاں سے نکالا گیا۔ یہ قول بھی اس بات پر دال ہے کہ اس وقت جنت موجود ہے۔ اس میں اختلاف مشہور ہے"۔(حادی ص ۱۸)

اور جو لوگ کہتے ہیں: جنت ابھی تک پیدا نہیں کی گئی؛ وہ اس شبہ کا شکار ہیں کہ اگر جنت اس وقت موجود ہے؛ تو لازمی طور پر اسے قیامت کے دن اس کا فنا ہو جانا واجب ہوتا ہے، اور جو بھی چیز اس میں ہے وہ ہلاک ہو اور مر جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (القصص: ۸۸)

"اس کی ذات کے علاوہ وہ سب فنا ہونے والے ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (آلِ عمران: ۱۸۵)

"ہر ذی روح موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔"

نیز امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع (۳۴۵۸) میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس رات مجھے آسمانوں کی سیر کرائی گئی، میری ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی، انہوں نے کہا:

"اے محمد! میری جانب سے اپنی امت کو سلام کہنا اور انہیں خبر دینا کہ جنت کی مٹی نہایت عمدہ ہے؛ اس کا پانی شیریں ہے اور جنت چٹیل میدان ہیں اور اس میں شجر کاری کے لیے "سبحان الله، الحمد لله، لا اله الا الله و الله أكبر" کلمات ہوتے ہیں"۔(اور فرمایا: یہ حدیث حسن غریب ہے)[1]

نیز ترمذی (۳۴٦۴) میں ہی حضرت ابوزبیر کی روایت ہے؛ جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے سبحان اللہ تعالیٰ وبحمدہ کے کلمات کہے اس کے لیے جنت میں کھجور کا درخت تیار لگا دیا جاتا ہے"۔[2]

(اور فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے)۔

۞ الاحاديث الصحيحه (۱۰۵).
✵ حدیث حسن صحیح ھے۔ الصحيحة (٦٤).

اس حدیث کی روشنی میں معترضین کہتے ہیں: اگر جنت پیدا کی جا چکی ہوتی، اس کام سے فارغ ہو چکے ہوتے تو اس میں چٹیل میدان نہ ہوتے؛ اور اس میں یہ شجر کاری بے معنی ہوتی۔ مزید برآں وہ کہتے ہیں: نیز اللہ تعالیٰ کا قول جو فرعون کی بیوی کی طرف سے نقل کیا گیا ہے؛ اس نے کہا تھا:

﴿رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ (التحريم: ۱۱)

"اے میرے رب! اپنے ہاں میرا گھر جنت میں تعمیر کر۔"

اس کا جواب یہ ہے: اگر تم کہتے ہو کہ اب وہ بالکل معدوم ہے، جیسا کہ نفخۂ صور؛ اور لوگوں کا قبروں سے اٹھنا؛ تو تمہارا یہ قول باطل ہے۔ گزشتہ دلائل میں؛ اور دیگر بھی کئی دلائل میں' جو کہ ذکر نہیں کیے گئے؛ اس کا رد ہو چکا ہے۔

اگر تم کہتے ہو کہ جنت کی ان تمام چیزوں کی تخلیق ابھی تک مکمل نہیں ہوئی؛ جو اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنے اہل محبت بندوں کے لیے تیار کی ہیں؛ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے تدریجی طور پر اس میں کچھ نہ کچھ پیدا فرماتے رہتے ہیں۔ اور جب ایمان دار جنت میں داخل ہوں گے تو ان کے داخل ہونے کے وقت اللہ تعالیٰ اس میں مزید نعمتوں کو پیدا فرمائیں گے؛ تو یہ حق ہے اس کا رد کرنا ممکن نہیں۔ تمہارے بیان کردہ دلائل سے صرف اسی قدر ثابت ہو رہا ہے۔ ہاں تمہارا اس آیت سے استدلال کرنا:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (القصص: ۸۸)

''اس کی ذات کے علاوہ وہ سب فنا ہونے والے ہیں۔''

''اس آیت کا یہ معنی تم نے اپنی سمجھ سے غلط نکال لیا ہے۔ تمہارا اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ جنت اور دوزخ کا اس وقت میں وجود نہیں ہے؛ یہ بالکل ویسے ہی ہے جس طرح کا استدلال تمہارے بھائی جنت اور دوزخ کے فنا ہونے اور جنتیوں اور دوزخیوں کے مرنے پر پیش کرتے ہیں۔ پس نہ تمہیں اور نہ تمہارے ان بھائیوں کو اس آیت کا معنی سمجھنے کی توفیق ہوئی۔ حقیقت میں یہ توفیق صرف أئمہ اسلام کا حاصل ہوئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''(كُلُّ شَيْءٍ) ہر چیز'' سے مراد وہ چیزیں ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے فنا اور ہلاک ہونا لکھ دیا ہے۔ جنت اور دوزخ تو بقاء کے لیے پیدا کی گئیں ہیں، فنا کے لیے نہیں۔ یہی حال عرش کا ہے۔ بے شک عرش جنت کی چھت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی بادشاہت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: جو بھی اس کے چہرہ کی مراد ہو گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ (الرحمٰن: ۲٦)

''جو بھی اس پر ہے وہ فنا ہونے والا ہے۔''

تو فرشتوں نے کہا: ''زمین پر رہنے والے ہلاک ہو جائیں گے، وہ بقا کی طمع رکھتے تھے''۔ تو اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا کہ آسمان والے اور زمین والے تمام مر جائیں گے۔ تو ارشاد فرمایا:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ (القصص: ۸۸)

''اس کی چہرہ [ذات] کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔''

تو اس وقت فرشتوں کو اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ یہ باتیں وضاحت کے ساتھ اس لیے ذکر کی ہیں تاکہ متشابہات اور محکمات نصوص میں تطبیق/موافقت ہو سکے۔ جو کہ جنت کے باقی رہنے پر دلالت کرتی ہیں اور جو دوزخ کے باقی رہنے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کا ذکر عنقریب کیا جائے گا۔ (ان شاء اللہ)

جنت اور دوزخ کو کبھی فنا نہیں:

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لَا تَفْنِيَانِ أَبَدًا وَلَا تَبِيْدَانِ. '' دونوں کبھی فنا نہ ہوں گی نہ ہی ختم ہوں گی''

جمہور ائمہ سلف و خلف کا یہی عقیدہ ہے۔ لیکن سلف کی ایک جماعت جنت کی بقاء اور دوزخ کے فنا ہونے کی قائل ہے ❶۔

❶۔ علامہ ناصر الدین الالبانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''میں کہتا ہوں: جہنم کے فنا ہونے کا عقیدہ سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہیں ہے۔ یہ ایسے کمزور اور بودے آثار ہیں جن سے حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ اور اس سلسلہ کی بعض احادیث موضوع ہیں۔ اگر یہ صحیح بھی ثابت ہو جائیں تب بھی اس تصور کردہ فنا ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔ بلکہ ان کی دلالت جہنم کے باقی رہنے پر اور موحدین کے وہاں سے نکل جانے پر ہے۔ میں نے ان میں سے بعض احادیث کی تخریج سلسلہ احادیث ضعیفہ میں کر دی ہے (نمبر ۶۰۶؛ اور ۶۰۷)۔ پھر اس مسئلہ میں مکتب اسلامی کی لائبریری میں امیر صنعانی کا ایک کتابچہ ہاتھ لگا؛ جو کہ بڑا ہی خطرناک ہے؛ اور اس میں انہوں نے ابن قیم پر رد کیا ہے۔ میں نے اس پر تعلیق لگائی ہے؛ اور اس کی احادیث کی تخریج کی ہے؛ اور اس میں ایک اضافی مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اور یہ رسالہ مکتب اسلامی سے طبع ہو چکا ہے۔

یہ دونوں قول کافی ساری کتب تفسیر اور دیگر بہت ساری کتابوں میں مذکور ہیں۔ جہم بن صفوان (۱۲۸ھ) معطلہ فرقے کا امام؛ جنت، دوزخ دونوں کے فنا ہونے کا قائل ہے۔ اس عقیدہ میں اس کا کوئی پیش رو نہیں ہے ❶۔ نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے اور نہ ہی تابعین عظام رحمہم اللہ اور ائمہ اسلام میں سے؛ اور نہ ہی اہل سنت میں سے کسی نے ان کی موافقت کی ہے۔

❶۔ یعنی اس عقیدہ میں کہ جنت فناء ہو جائے گی؛ اس کا کوئی سلف [یا صحابہ کرام اور ائمہ تابعین رحمہم اللہ میں سے کوئی بھی] اس کا موافق نہیں ہے۔ ہم مؤلف رحمہ اللہ کی بات پر ایک اور بات کا اضافہ کرتے ہیں؛ اور کہتے ہیں: جہنم کے فناء ہونے کے عقیدہ میں بھی اس کا کوئی پیش رو نہیں۔ جیسا کہ ابھی اس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عام اہل سنت نے اس کے مذہب کا انکار کیا ہے، اور اس بنا پر اسے کافر کہا ہے۔ نیز اس کے اور اس کے پیروکاروں کے خلاف روئے زمین میں ہر طرف آواز اٹھائی ہے۔ اس کا یہ عقیدہ ایک فاسد اصول کی بنیاد پر ہے؛ جس کا وہ اعتقاد رکھتا ہے؛ وہ یہ ہے کہ: ''ایسی چیز کا وجود ممتنع ہے جس کے حوادثات متناہی نہیں ہیں''۔

یہی اصول قابل مذمت متکلمین کا بھی ہے۔ جو اس اصول کی بنا پر حدوث اجسام پر؛ اور ایسی چیز کے پیدا ہونے پر استدلال کرتے ہیں جو کبھی حادثات [تخلیقی اعمال] سے خالی نہ رہی ہو۔ پس حدوث عالم کے اثبات میں اسی کو انہوں نے بنیادی اصول بنایا ہے۔ چنانچہ جہم کا خیال ہے: ''جو چیز حوادث میں مانع ہے؛ جس کی ماضی میں بھی کوئی ابتداء نہیں؛ وہ مستقبل میں بھی ممنوع ہے''۔

اس کے نزدیک مستقبل میں اللہ تعالیٰ پر فعل کا دوام ممتنع ہے جیسا کہ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر ماضی میں بھی ممتنع تھا۔ اور شیخ المعتزلہ ابو الہذیل علاف (۱۳۵ھ-۲۳۵ھ) نے اس اصول پر اس کی موافقت کی ہے۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ اس کا تقاضا حرکات کا فنا ہونا ہے۔ پس اس بنیاد پر کہتا ہے: جنتیوں اور دوزخیوں کی حرکات فنا ہو جائیں گی، حتی کہ دائمی سکون میں ہو جائیں گے۔ اور ان میں سے کوئی بھی حرکت پر قادر نہیں رہے گا۔ اشارۃً پہلے یہ بحث گزر چکی ہے کہ لوگ کے مابین ماضی اور مستقبل کے حوادث کے تسلسل میں اختلاف ہے۔ دراصل یہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کی دائمی فاعلیت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ قادر رب اور اپنے ارادہ کے مطابق فعل کرنے والا رہا ہے۔ بیشک وہ ہمیشہ سے زندہ؛ علم اور قدرت والا ہے۔ اور محال ہے کوئی فعل اللہ تعالیٰ پر بالذات ممتنع ہو۔ پھر وہ الٹ جائے اور ممکن لذاتہ ہو جائے؛ بغیر کسی چیز کے تجدد کے ایسا ہو جائے۔ اس کی ابتداء کے لیے کوئی متعین حد نہیں کہ فعل اس حد کے وقت اس کے لیے ممکن ہو اور اس سے پہلے اس پر ممتنع ہو۔ اس قول کا تصور ہی اس کے فاسد ہونے پر قطعی اور کافی دلیل ہے''۔

جہاں تک جنت کی ابدیت کی بات ہے؛ اور بے شک جنت کبھی ختم یا فنا نہیں ہوگی۔ پس یہ چیز ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے؛ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍo﴾ (ھود: ۱۰۸)

''جو نیک بخت ہوں گے وہ بہشت میں داخل کیے جائیں گے اور جب تک آسمان اور زمین ہیں ہمیشہ اسی میں رہیں گے مگر جتنا تمہارا رب چاہے یہ اللہ تعالیٰ کی بخشش ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگی۔''

یعنی کبھی اس میں رکاوٹ نہیں آئے گی۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے منافی نہیں:

﴿اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ﴾ (ھود: ۱۰۷)

''مگر جتنا تمہارا رب چاہے۔''

سلف صالحین رحمہم اللہ کا اس استثناء میں اختلاف ہے۔ یہ کہا گیا ہے: اس سے مراد وہ عرصہ ہے جو دوزخ میں ٹھہریں گے۔ یہ صرف ان لوگوں کے حق میں ہے جو ان میں سے دوزخ میں داخل ہوئے ہوں؛ پھر انہیں نکالا جائے؛ سب مراد نہیں ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اس مدت کے علاوہ جتنا عرصہ وہ میدان محشر میں رکے ہوں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: جتنی مدت وہ قبروں میں اور میدان محشر میں ٹھہرے ہوں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: یہ رب تعالیٰ کا استثناء ہے جس کو وہ نہیں کرے گا۔ جیسے آپ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کی قسم! میں تجھے ضرور ماروں گا؛ مگر یہ کہ کچھ اور پیش نظر آجائے۔ حالانکہ کچھ اور پیش نظر نہیں ہوتا؛ بلکہ آپ اس کے یقیناً مارنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: اِلَّا واؤ کے معنی میں ہے۔ یہ قول بعض نحویوں کا ہے اور کمزور قول ہے۔ سیبویہ ''اِلاَّ ؛ لٰکِنْ'' کے معنیٰ میں لیتا ہے۔ پس اس صورت میں استثناء منقطع ہوگا۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔ نیز کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے ہاں وعدہ خلافی نہیں ہوتی۔ اور استثناء اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ مل کر آیا ہے:

﴿عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ (ھود: ۱۰۸)

''بخشیش جو کبھی منقطع نہ ہوگی۔''

اس کی مثال: جیسے آپ کہیں: (أسکنتك داری حولاً إلا ما شئت)'' میں نے آپ کو اپنا گھر سال بھر رہنے کے لیے دیا؛ مگر جو چاہوں؛ یعنی میری چاہت کے علاوہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس پر جتنا زیادہ میری چاہت ہو۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ: استثناء کا مقصد انہیں معلوم کرانا ہے کہ ان کی یہاں پر ہمیشگی کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی چاہت کے تابع ہیں؛ اس لیے کہ وہ اس کی چاہت سے باہر نہیں ہو سکتے۔ یہ معنی اس کی عزیمت اور ان کے ہمیشہ [جنت میں] رہنے کے جزم/قطعی فیصلہ کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَکِیْلًاo﴾ (الاسراء: ۸۶)

''اور اگر ہم چاہیں تو جو آپ پر وحی کی ہے؛ اس کو لے جائیں؛ پھر آپ اس میں ہمارے مقابلہ میں کسی کو مددگار نہ پاؤ۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِكَ﴾ (الشوریٰ: ۲۴)

''پس اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو آپ کے دل پر مہر لگا دے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ﴾ (یونس: ۱٦)

''فرما دیں: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو میں یہ تم کو پڑھ کر نہ سناتا اور نہ ہی تمہیں اس سے آگاہ کرتا۔''

اس قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ [جن میں] اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خبر دیتے ہیں کہ تمام امور اس کی مشیئت میں ہیں جو چاہتا ہے ہوتا ہے جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ ''ما؛ من'' کے معنی میں ہے۔ یعنی جن نیک لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں داخل کرنا چاہے۔ اس کے علاوہ دیگر اقوال بھی ہیں۔ بہرصورت یہ استثناء متشابہات میں سے ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی:

﴿عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ (ھود: ۱۰۸)

''بخشش جو کبھی منقطع نہ ہوگی۔'' محکم ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ۝﴾ (ص: ٥٤)

''بے شک ہمارا یہ عطیہ اس کے لیے ختم ہونا نہیں ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّ ظِلُّهَا﴾ (الرعد: ۳٥)

''اس کے پھل ہمیشگی والے ہیں اور اس کے سائے بھی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ﴾ (الحجر: ٤٨)

''وہ اس سے ہرگز نکالے نہیں جائیں گے۔''

اللہ تعالیٰ نے جنت والوں کا ہمیشہ جنت میں رہنے کا ذکر، تاکیدی کلمات کے ساتھ قرآن پاک میں متعدد مقامات پر کیا ہے؛ اور آگاہ کیا ہے کہ:

﴿لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى﴾ (الدخان: ٥٦)

''وہ اس میں پہلی موت کے سوا دوسری موت سے ہمکنار نہ ہوں گے۔''

یہ استثناء منقطع ہے۔ اور جب اس کو آپ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں استثناء کے ساتھ ملائیں گے:

﴿اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ﴾ (ھود: ۱۰۸)

''مگر جو آپ کا رب چاہے۔''

تو آپ پر دونوں آیتوں سے مراد واضح ہو جائے گی۔ یہ خلود کی مدت میں سے اس وقت کا استثناء ہے جب جنت میں نہ تھے۔ جیسا کہ پہلی موت کا جملہ موت سے استثناء ہے۔ یہ موت ان کی ابدی زندگی سے پہلے کی ہے۔ ایسے جنت سے یہ جدائی جنت میں ہمیشہ رہنے کی مدت شروع ہونے سے پہلے کی ہے۔

جنت کی ابدیت اور اس کے دوام پر سنت سے کثرت کے ساتھ دلائل موجود ہیں، ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''جو شخص جنت میں داخل ہو جائے گا وہ نعمتوں میں رہے گا، اسے کچھ غم نہ ہوگا ہمیشہ رہے گا فوت نہیں ہوگا''۔ [1]

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''منادی کرنے والا منادی کرے گا: اے جنت والو! تم تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے، اور یہ کہ جوان رہو، کبھی بڑھاپا نہ آئے گا، زندہ رہو، کبھی موت نہ آئے گی۔ [2]

نیز جنت اور دوزخ کے درمیان موت کو ذبح کرنے کا ذکر پہلے گزر چکا ہے؛ کہا جائے گا:

''اے جنت والو! ہیشگی ہے موت نہیں، اے دوزخ والو! ہیشگی ہے، موت نہیں''۔ [3]

---

[1] الصحيحة (١٠٨٦). مسلم ٢٨٣٦۔

[2] مسلم (برقم ٢٨٣٧؛ ٨/ ١٤٧)۔ عن أبي سعيد وأبي هريره. اس میں آخری جملہ کو مقدم کیا گیا ہے؛ اور اس پر یہ جملہ زیادہ کیا ہے: ''بے شک تمہارے لیے یہ ہے کہ تم نعمتیں ہی پاؤ گے کبھی بھی تم پر تنگی نہ آئے گی''۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے: ﴿وَ نُوۡدُوۡۤا اَنۡ تِلۡکُمُ الۡجَنَّۃُ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ﴾ [الاعراف ۴۳] ''اور انھیں آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے جس کے وارث تم اس کی وجہ سے بنائے گئے ہو جو تم کیا کرتے تھے''۔

[3] بخاري، مسلم. قد سبق هذا الحديث۔

دوزخ کی ابدیت اور دوام:

اس مسئلہ میں علماء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے آٹھ اقوال ہیں:

پہلا قول: جو شخص دوزخ میں داخل ہو گیا، وہ اس سے کبھی نہیں نکلے گا۔ یہ قول خوارج اور معتزلہ کا ہے۔

دوسرا قول: دوزخیوں کو دوزخ میں عذاب کیا جائے گا پھر ان کی طبیعت میں انقلاب آ جائے گا۔ ان کی طبیعت ناری ہو جائے گی یعنی ان کی طبیعت دوزخ کے موافق ہو جانے کی بنا پر وہ دوزخ میں لذت حاصل کریں گے۔ یہ قول ابن عربی الطائی (۵۶۰-۶۳۸ھ) کا ہے۔ جو وحدۃ الوجود یہ فرقے کا امام ہے۔ [فصوص الحكم ٩٤؛ ١٦٩؛ ١٧٩]

تیسرا قول: دوزخیوں کو دوزخ میں ایک محدود وقت تک عذاب ہوگا، پھر ان کو اس سے نکال لیا جائے گا، ان کے بدلے دوزخ میں اور لوگوں کو گرایا جائے گا۔ اس قول کو یہود نے نبی ﷺ کے سامنے پیش کیا، تو آپ نے انہیں جھٹلایا، نیز اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو جھٹلایا ہے؛ اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿وَ قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً ؕ قُلۡ اَتَّخَذۡتُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ عَہۡدًا فَلَنۡ یُّخۡلِفَ اللّٰہُ عَہۡدَہٗۤ اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓــَٔتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ﴾ (البقرہ: ۸۰، ۸۱)

''اور بولے: آگ ہمیں چند روز کے سوا چھو ہی نہیں سکے گی۔ آپ پوچھیں: کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے عہد لے رکھا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا۔ بلکہ تم اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں، ہاں جو کوئی برے کام کرے اور اس کے گناہ اس کو گھیر لیں تو ایسے لوگ دوزخ والے ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔'' [حادی الارواح ۲۹۸]

چوتھا قول: دوزخیوں کو نکال لیا جائے گا؛ اور دوزخ اپنے حال پر باقی رہے گی، اس میں کوئی دوزخی نہ ہوگا۔

پانچواں قول: دوزخ بالکل فنا ہو جائے گی؛ کیونکہ دوزخ حادث ہے؛ اور جس چیز کا حادث ہونا ثابت ہو اس کی کا بقاء محال ہے۔ یہ قول جہم اور اس کے رفقاء کا ہے ان کے ہاں اس میں جنت، دوزخ برابر ہیں، دونوں فنا ہو جائیں گی۔ پہلے بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

چھٹا قول: دوزخیوں کی حرکات ختم ہو جائیں گی وہ جمادات ہو جائیں گے اور وہ کسی تکلیف کو محسوس نہ کریں گے، یہ قول ابوالہذیل علاف کا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

ساتواں قول: اللہ تعالیٰ دوزخ میں سے جس کو چاہیں گے نکال لیں گے؛ جیسا کہ حدیث میں ہے، پھر دوزخ کو کچھ عرصہ باقی رکھیں گے اس کے بعد فنا کر دیں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی ایک مدت مقرر کی ہے اس کے بعد وہ ختم ہو جائے گی۔

آٹھواں قول: بے شک اللہ تعالیٰ دوزخ سے جس کو چاہیں گے نکال لیں گے؛ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ اور اس میں کافر باقی رہیں گے جو اس سے نہ نکلیں گے، جیسا کہ شیخ رحمہ اللہ نے کہا ہے۔ ان میں سے آخری دو اقوال کے علاوہ بقیہ تمام اقوال باطل ہیں۔ یہ دونوں قول اہل سنت کے ہیں ان کے دلائل پر غور کیا جائے۔

پہلے قول کے دلائل:

ارشاد ربانی ہے:

﴿قَالَ النَّارُ مَثْوٰیكُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ﴾ (الانعام: ۱۲۸)

''فرمایا: تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہے، ہمیشہ اس میں رہو گے مگر جتنا اللہ تعالیٰ چاہے بے شک رب تیرا حکیم و علیم ہے۔''

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝﴾ (هود: ۱۰۶، ۱۰۷)

''تو جو بخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے؛ اس میں ان کا چلانا اور دھاڑنا ہوگا؛ جب تک آسمان اور زمین ہیں اسی میں رہیں گے، مگر جتنا آپ کا رب چاہے بے شک آپ کا رب جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔''

ان دونوں استثناء کے بعد وہ الفاظ ذکر نہیں ہوئے جو اہل جنت کے ذکر میں استثناء کے بعد آئے ہیں قول ربانی ہے:

﴿عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ﴾ (هود: ۱۰۸)

''ایسی بخشش جو کبھی منقطع نہ ہوگی۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

﴿لَّابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا ۝﴾ (النبا: ۲۳)

''اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔''

یہ قول کہ دوزخ فنا ہو جائے گی لیکن جنت فنا نہیں ہوگی، حضرت عمر، ابن مسعود، ابو ہریرہ، ابو سعید رضی اللہ عنہم سے منقول ہے، عبد بن حمید نے اپنی مشہور تفسیر میں سند کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ:

''اگر دوزخی دوزخ میں عالج وادی کی ریت کے ذرات کے برابر بھی رہیں، پھر بھی ان پر ایک ایسا وقت آئے گا جب وہ دوزخ سے باہر نکل آئیں گے''۔ ❶

❁ حدیث ضعیف ہے اس لیے کہ یہ روایت حسن [بصری رحمہ اللہ] سے ہے؛ وہ کہتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حالانکہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور نہیں پایا۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ حادی الارواح (۳/ ۷۱؛ طبع کردی) میں اس حدیث کے بعد فرماتے ہیں: ''حضرت حسن رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا۔ اس کے ساتھ انہوں نے خطاب کے انداز میں کلام کو تقویت دینے کی کوشش کی ہے؛ جس سے بے نیازی نہیں ہوسکتی''۔ اور فرمایا ہے: ''اس سند کی جلالت کے لیے اتنا ہی کافی ہے؛ اگر چہ حضرت حسن رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نہیں بھی سنا؛ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اسے بعض تابعین سے روایت کیا ہے۔ اور اگر ان کے نزدیک یہ سند صحیح ثابت نہ ہوتی؛ تو پھر قطعیت کے ساتھ یہ نہ کہتے: ''اسے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں: ابن قیم رحمہ اللہ جیسے لوگوں سے ایسی باتیں بڑی عجیب لگتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ایسے تابعی سے روایت کی جاسکتی ہے جو مجهول العین ہو۔ اس لیے کہ اگر حضرت حسن رحمہ اللہ نے اسے بعض تابعین سے روایت کیا ہے؛ تو وہ تابعین کون ہیں؟۔ اور حدیث کے حفظ اور ضبط میں اس کا کیا حال ہے؟۔ تو کیا ابن قیم رحمہ اللہ کی یہ منطق حدیث کے اصولی قواعد کو الٹ دینے کی طرف نہیں جاتی؟۔ وہ قواعد جو مجہول راوی کی حدیث کو ضعیف بتاتے ہیں۔ اور ایسے ہی حدیث مرسل منقطع بھی ضعیف ہی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں کا مرجع ایسا راوی ہوتا ہے جس کا نہ ہی ذکر کیا جاتا ہے؛ اور نہ ہی اس کا نام لیا جاتا ہے۔ اور اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ حسن بصری رحمہ اللہ کی عن عن والی احادیث کو قبول کیا جائے۔ کجا کہ وہ سند کے اعتبار سے مرسل ہو یا منقطع۔ جیسا کہ وہ حضرت سمرہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں؛ کہ: جب حضرت حواء کو حمل ٹھہرا؛ تو ابلیس نے اس کے گرد چکر لگایا۔ ان کا کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا تھا۔ ابلیس نے کہا: اس کا نام عبد الحارث رکھنا۔ پس انہوں نے اس کا نام عبد الحارث رکھا۔ تو وہ زندہ رہا۔ یہ مشورہ شیطانی وحی کی ایک قسم اور اسکا حکم تھا۔ یہ حدیث ضعیف ہی نہیں؛ بلکہ سرے سے باطل ہے۔ اور اس میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے عن عنہ کے علاوہ کوئی دوسری علت نہیں ہے۔ اور انہوں نے بھی اس آیت کی تفسیر کی ہے؛ جس کی تفسیر بعض مفسرین اس حدیث سے کرتے ہیں۔ یہ تفسیر حضرت حسن رحمہ اللہ نے اپنی طرف سے کی ہے؛ اس پر کوئی حدیث دلالت نہیں کرتی۔ اور پھر بعض محققین اس میں آپ کے پیچھے چل پڑے۔ ان میں سے ہی ایک خود ابن قیم رحمہ اللہ بھی ہیں۔ جیسا کہ میں نے سلسلة الاحاديث الضعيفه والموضوعة (۳۴۲) میں اس پر بحث کی ہے۔ اور اس کی دوسری مثال: قہقہ لگا کر ہنسنے پر وضوء باطل ہونے والی حدیث ہے۔ اس حدیث کے ضعیف ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ ابن قیم رحمہ اللہ کو معاف کرے؛ اور ان کے گناہ بخش دے۔ اس لیے کہ ان کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس جیسے آثار کو صحیح کہنے سے بعض گمراہ فرقوں کے لیے بہت بڑا دروازہ کھل جاتا ہے۔ جس سے وہ اپنی گمراہیوں کی تائید کے لیے پناہ گاہ تلاش کرتے ہیں۔ جیسے قادیانی؛ بے شک ان کی من جملہ گمراہیوں میں سے ایک یہ عقیدہ بھی ہے کہ: ''جنت اور جہنم ختم ہو جائیں گے؛ اور کافروں سے عذاب ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ میں نے سلسلہ احادیث صحیحہ میں اس موضوع کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ میں نے وہاں بھی کلام میں اس اثر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پس جب مجھے اس کی اسناد سے آگاہی ہوئی تو میں نے پھر پوری تفصیل کے ساتھ کلام کیا۔ اور اسے مذکورہ مشار الیہ حدیث کے ساتھ ملایا ہے۔ اس کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ! یہ اثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ اور نہ ہی کسی دوسرے سے یہ اثر مرفوعاً صحیح ثابت ہے۔ توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جو کوئی اس کی مزید تفصیل جاننا چاہتا ہو وہ علامہ امیر صنعانی رحمہ اللہ کی کتاب ''رفع الاستار لإبطال أدلة القائلين بفناء النار'' پر میری تحقیق میں اس بحث کا مطالعہ کرلے۔ اس جیسی ایک روایت حضرت عبد اللہ تعالیٰ بن عمرو سے بھی موقوفاً مروی ہے؛ اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ اور ابو امامہ سے مرفوعاً روایت ہے؛ مگر اس کی سند بالکل تباہ حال ہے۔ میں نے سلسلۂ احادیث ضعیفہ اور موضوعہ میں اس پر کلام کیا ہے (نمبر ۶۰۷)۔

اس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے قول کی تفسیر کے ضمن میں ہے:

﴿لَّٰبِثِينَ فِيهَآ أَحْقَابًا ۝﴾ (النبا: ۲۳)

''اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔''

'' کہتے ہیں: ''دوزخ اس کے غضب کا تقاضا ہے اور جنت اس کی رحمت کا تقاضا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو ایک کتاب کو تحریر کیا؛ وہ تحریر اس کے ہاں عرش پر ہے [اس میں ہے]:

''بے شک میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے''۔ ❶

اور ایک روایت میں ہے: ''بے شک میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے''۔

❶ بخاری (۳۱۹۴)، مسلم (۲۷۵۱)، الظلال الجنة (۶۰۸، ۶۰۹). من حديث أبی هريرة رضی اللہ عنہ۔قد سبق الحديث۔

اسے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح الجامع میں روایت کیا ہے؛ نیز وہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے عذاب کے بارے میں بتایا ہے:

﴿عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ (الانعام: ۱۵)

''بڑے دن کا عذاب۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ﴾ (هود: ۲٦)

''دردناک دن کا عذاب۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ﴾ (الحج: ۵۵)

''نامبارک دن کا عذاب۔''

لیکن نعمتوں کے بارے میں کسی ایک مقام پر بھی یہ نہیں کہا کہ وہ ایک دن کی نعمت ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿عَذَابِيٓ أُصِيبُ بِهِۦ مَنْ أَشَآءُ ۖ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الاعراف: ۱۵٦)

''میرا عذاب اسے تو جس پر میں چاہتا ہوں نازل کرتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔''

(شیخ عفیفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس مسئلہ کی تفصیل کے لیے دیکھو: حادی الأرواح ص ۲۵۴-۲۷۹)

نیز اللہ تعالیٰ ملائکہ سے حکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا﴾ (غافر: ۷)

''اے ہمارے رب! تو ہر چیز پر رحمت اور علم کے ساتھ شامل ہے۔''

پس ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان عذاب میں گرفتار لوگوں کے حق میں بھی وسیع ہو۔ اگر وہ غیر محدود مدت تک عذاب میں مبتلا رہیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے حق میں وسیع نہ ہوئی۔ صحیح حدیث (مسلم ۹۸۷) میں ثابت ہے کہ:

''قیامت کے دن کی مدت پچاس ہزار سال ہے''۔ ❶

❶ حدیث صحیح ہے۔ مسلم، حدیث ابی ھریرۃ؛ باب عقوبۃ مانع الزکاۃ۔ مستدرک حاکم (۵۷۲/۴) وصححہ ووافقہ الذہبی۔ مسند أحمد ۱۱۲/۲؛ عن ابن عمر۔

اس دن میں عذاب میں مبتلا لوگ اپنے جرائم کے حساب سے مدت عذاب میں مختلف ہونگے؛ اوراللہ احکم الحاکمین کی حکمت ارحم الراحمین کی رحمت کا تقاضا ہرگز یہ نہیں کہ وہ اپنی مخلوق کو پیدا کرے؛ اور پھر ہمیشہ ہمیشہ غیر متناہی/ سرمدی عذاب میں مبتلاء رکھے؛ جس کی کوئی انتہاء ہی نہ ہو۔ البتہ اپنی پیدا کردہ مخلوق پر ہمیشہ انعامات فرمائے اور ہمیشہ احسانات کرے، تو اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔ اوراحسان تو بذات خود مقصود و مطلوب ہے جبکہ انتقام بالعرض[سبب کی بنا پر] مراد ہے''۔(حادی الأرواح ۳۵۸)

نیز وہ کہتے ہیں: عذاب کے دائمی اور ابدی ہونے؛ اور عذاب سے نہ نکلنے اور عذاب کے مقیم ہونے کا جو ذکر ہے؛ نیز یہ کہ عذاب لازم ہوگا۔ یہ سب کچھ درست ؛حق اور مسلّم ہے؛ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ تمام الفاظ ہمیشہ دارلعذاب میں رہنے کا تقاضا کرتے ہیں، جب تک کہ دارلعذاب باقی ہے۔ دارالعذاب کی بقاء کے باوجود اس سے اہل توحید کو نکالا جائے گا۔ پس اس شخص کے درمیان جس کو جیل سے اس حال میں نکالا جائے اور جیل اپنے حال پر باقی رہے؛ اور اس شخص کے درمیان جس کو جیل کے تباہ ہونے اور ختم ہونے کے بعد رہائی حاصل ہو؛ بہت بڑا فرق ہے۔

اور جو لوگ دوزخ کی بقاء اور عدم فنا کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّقِيۡمٌ ﴾ (المائدہ: ۳۷)

''اوران کے لیے ہمیشہ قائم رہنے والا عذاب ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يُفَتَّرُ عَنۡهُمۡ وَهُمۡ فِيۡهِ مُبۡلِسُوۡنَ۝﴾ (الزخرف: ۷۵)

''کبھی ان کے عذاب میں کمی نہ ہوگی اور وہ اس میں مایوس ہو کر پڑے رہیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَنۡ نَّزِيۡدَكُمۡ اِلَّا عَذَابًا﴾ (النبا: ۳۰)

''پس ہم تم کو ہرگز زیادہ نہیں کریں گے مگر عذاب۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا﴾ (البینہ: ۸)

''وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَّ مَا هُمۡ مِّنۡهَا بِمُخۡرَجِيۡنَ﴾ (الحجر: ۴۸) [1]

[1] یہ آیت جنت والوں کے حق میں ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ شاید کہ اس سے مؤلف رحمہ اللہ کی مراد سورت مائدہ کی آیت نمبر ۳۷ ہو؛ جس میں ہے: ﴿وَّ مَا هُمۡ بِخٰرِجِيۡنَ مِنۡهَا﴾ ''اور وہ اس سے نکالے جانے والے نہیں ہیں''۔ ابن قیم اور دوسرے حضرات کو یہ وہم ہوا ہے۔ دیکھیں: '' رفع الاستار لإبطال أدلة القائلین بفناء النار'' پر میری تحقیق او رتعلیق۔

''اور وہ اس سے ہرگز نہ نکالے جائیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ (البقرہ: ۱٦٧)

''اور وہ دوزخ سے نہ نکل سکیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (الاعراف: ٤٠)

''اور نہ وہ بہشت میں داخل ہوں گے حتی کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا﴾ (فاطر: ٣٦)

''نہ انہیں موت آئے گی کہ وہ مر جائیں اور نہ اس کا عذاب ان سے ہلکا کیا جائے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا﴾ (الفرقان: ٦٥)

''بے شک اس کا عذاب چپک کر رہنے والا ہے۔''

غراماً سے مراد لازم رہنے والا عذاب ہے۔ مشہور احادیث مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دوزخ سے ان لوگوں کو باہر نکال لیا جائے گا۔ جنہوں نے ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه'' کہا ہوگا۔ نیز احادیث شفاعت اس باب میں صریح ہیں کہ نافرمان موحدین کو دوزخ سے نکالا جائے گا۔ یہ حکم ان کے ساتھ خاص ہے۔ لیکن اگر کافر بھی دوزخ سے باہر نکل آئیں تو وہ بھی ایماندار نافرمان موحدین کے مرتبہ میں ہوئے، اس طرح دوزخ سے نکالنا صرف اہل ایمان کے ساتھ خاص نہ ہوگا۔ خیال رہے کہ جنت، دوزخ کی بقا ذاتی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ان کو باقی رکھنے کے ساتھ ہے''۔

ظلال الجنة تخریج السنة لا بن ابی عاصم (٢٥١). اس حدیث کا آخری حصہ موصلی نے الصواعق المرسلہ میں نقل کیا ہے۔

اہل جنت اور اہل جہنم کی تخلیق:

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے لیے مخلوق پیدا کی ہے''۔

تشریح: ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ﴾ (الاعراف: ١٧٩)

''اور یقیناً ہم نے دوزخ کے لیے کثیر (تعداد میں) جنات اور انسان پیدا کیے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک انصاری بچے کے جنازے کے لیے بلایا گیا۔ میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس کے لیے مبارک ہو یہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے؛ اس نے نہ برا عمل کیا نہ ابھی اس عمر کو ہی پہنچا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کیا کوئی اور بات بھی کہنی ہے؟ [معاملہ اس کے برعکس ہے]۔ اے عائشہ! بے شک اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے اس کی اہل

مخلوق کو پیدا فرمایا۔ ان کو اس وقت پیدا فرمایا جب وہ اپنے باپ کی پشت میں تھے۔ اور اس نے دوزخ کے لیے مخلوق کو پیدا فرمایا؛ اور ان کو دوزخ کے لیے اس وقت پیدا فرمایا جب کہ وہ اپنے باپ کی پشت میں تھے''۔ ❶

❶ حدیث صحیح هے۔ مسلم(۲٦٦۲)، ابو دائود(٤٧١٣)، نسائی (۱۸۳۹)۔ ظلال الجنة فی تخریج السنة لا بن ابی عاصم (۲۵۱).

نیز ارشادِ ربانی ہے:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝﴾ (الدھر: ۲، ۳)

''ہم نے انسان کو نطفہ مخلوط سے پیدا کیا ہے تا کہ اسے آزمائیں تو ہم نے اس کو سنتا دیکھتا بنایا (اور) اسے رستہ بھی دکھایا (اب وہ) خواہ شکر گزار ہو خواہ ناشکرا ہو۔''

اس سے مراد عام ہدایت ہے لیکن اس سے بھی عام وہ ہدایت ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ﴾ (طٰہٰ: ۵۰)

''جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی پھر راہ دکھائی۔''

پس موجودات دو اقسام پر ہیں:

[اول]: وہ جو بالطبع مسخر ہیں۔

[دوم]: وہ جو متحرک بالارادہ ہیں۔

پہلی قسم کی ہدایت بالطبع مسخر ہونے کے لحاظ سے ہے۔ اور دوسری قسم کی ہدایت ارادی ہے جو بلحاظ نفع، نقصان کے شعور اور علم کے تابع ہے۔ پھر اس دوسری کو قسم کی مزید تین اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے:

[اول]: قسم وہ جو صرف خیر کا ارادہ کرتی ہے، اس کے سوا کسی چیز کا ارادہ نہیں کرتی، جیسے فرشتے ہیں۔

[دوم]: وہ جو صرف شر کا ارادہ رکھتی ہے، اس کا سوائے اس کے کسی قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہو سکتا، جیسے شیاطین۔

[سوم]: جو خیر اور شر دونوں کا ارادہ رکھتی ہے جیسے انسان۔ پھر اس قسم کی مزید تین اقسام کی گئی ہیں:

[اول]: وہ صنف جس کا ایمان اور معرفت اور عقل اس کی خواہشات اور شہوات پر غالب ہے، یہ قسم فرشتوں کے ساتھ مل جاتی ہے۔

[دوم]: یہ صنف پہلی صنف کے برعکس ہے، اور یہ شیاطین کے ساتھ مل جاتی ہے۔

[سوم]: یہ صنف وہ جس کی حیوانی شہوات اس کی عقل پر غالب ہوتی ہیں۔ وہ قسم چارپایوں کے ساتھ مل جاتی ہے۔

مقصود یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دو وجود عطا کیے ہیں، ایک وجود عینی ہے، دوسرا علمی۔ جس طرح کوئی چیز اس کے ایجاد کرنے کے بغیر موجود نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اس کی تعلیم کے بغیر کوئی ہدایت نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام دلائل اس کی کمال قدرت کے دلائل ہیں جو کہ اس کی وحدانیت، اور تحقیقِ ربوبیت پر دلالت کرتے ہیں۔

[اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کا عدل:]

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس شخص کو چاہے گا جنت بھیجے گا یہ اس کا فضل ہے اور جس شخص کو چاہے گا دوزخ بھیجے گا یہ اس کا عدل ہے......'' ۔الخ

یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ثواب کو نہیں روکتے جب تک کہ اس کے سبب کو نہ روک لیا جائے۔ اور یہ سبب عمل صالح ہے۔ بے شک ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًاo﴾ (طٰهٰ: ۱۱۲)

''اور جو شخص نیک کام کرے گا اور مومن بھی ہوگا تو اس کو نہ ظلم کا خوف ہوگا اور نہ ہی نقصان کا۔''

اسی طرح کسی شخص اس وقت تک سزا میں مبتلا نہیں کیا جائے گا جب تک کہ سزا کا سبب موجود نہ ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ o﴾ (الشوریٰ: ۳۰)

''اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے فعلوں سے اور وہ بہت سے گناہ تو معاف کر دیتا ہے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی عطا کرنے والے ہیں، جس کو وہ عطا کر دیں؛ اس سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اور جس سے وہ روک لے؛ کوئی اس کو دے نہیں سکتا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی انسان پر احسان فرما کر اسے ایمان اور نیک عمل کی توفیق سے نوازتے ہیں؛ تو اس سے اس کے سبب کو کوئی نہیں روک سکتا، بلکہ اس کو وہ ثواب اور قربت عطا ہوتی ہے:

''جس کو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی کے دل پر اس کا خیال گزرا''۔

[البخاری ۳۲٤٤؛ مسلم ۲۸۲٤؛ ۲۸۲۵]

اور جب کسی سے ثواب اور قربت کو اللہ تعالیٰ روک لیں؛ تو ان کا روکنا بھی اسباب نہ ہونے کی بنا پر ہوتا ہے۔ اور وہ سبب ہے نیک عمل۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، جس کو چاہتے ہیں گمراہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اس کی حکمت اور عدل کی بنا پر ہے۔ پس اس کا اسباب یعنی نیک اعمال سے روکنا بھی حکمت اور عدل کی بنا پر ہے۔ جہاں تک مسببات کی بات ہے؛ تو ان کے اسباب [نیک اعمال] پائے جانے کے بعد کسی حال میں ان کو نہیں روکتا۔ جب تک کہ اسباب میں کوئی نامناسب/ ناکارہ بات نہ ہو۔ اور یہ وجہ اعمال میں فساد/ خرابی بھی ہو سکتی ہے؛ پھر ایسی وجہ ہو سکتی ہے جو ان اسباب کے موجب اور مقتضی سے ٹکراؤ رکھتی ہو۔ تو ایسی حالت میں وہ مقتضی موجود ہی نہیں ہوتا۔ یا پھر کوئی رکاوٹ موجود ہوتی ہے۔ اور جب اس کا روکنا اور سزا دینا ایمان اور عمل صالح کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی وجہ ہی ابتداء ہی میں یہ عطیہ نہیں بخشا؛ بلکہ یہ اس کی حکمت اور عدل کی بنا پر ہے۔ پس دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد وتعریف ہے۔ ہر حال میں اللہ تعالیٰ تعریف کے لائق ہے، ہر عطیہ اس کا فضل ہے، ہر سزا اس کا عدل ہے، بے شک اللہ تعالیٰ حکیم ہیں؛ وہ چیزوں کو ان کے ایسے مقامات پر رکھتے ہیں جن کی وہ صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (الانعام: ۱۲٤)

''اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ ہمیں بھی وہی رسالت مل جائے جو

پیغمبروں کو ملی؛ اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ اپنی پیغمبری کسے عنایت فرمائے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۝﴾ (الانعام: ۵۳)

''اور اسی طرح ہم نے ان کو ایک دوسرے سے آزمایا؛ تاکہ وہ کہیں: کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے فضل کیا ہے؟ کیا بھلا اللہ تعالیٰ کا شکر گزاروں سے واقف نہیں۔''

مزید وضاحت آگے آئے گی ان شاء اللہ۔

[خیر و شر کا مقدر ہونا]

۸۴۔ ((وَالْخَيْرُ وَالشَّرُّ مُقَدَّرَانِ عَلَى الْعِبَادِ۔))

''نیز خیر شر دونوں بندوں کے لیے تقدیر میں لکھی گئی ہیں''۔

اس کا مضون بھی وہی تقدیر کا مضمون ہے۔اچھی اور بری ہر قسم کی تقدیر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے پر ایمان رکھنا۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴾[النساء۸۷] ''اور اگر انھیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر انھیں کوئی بُرائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔کہہ دے سب اللہ کی طرف سے ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہے کہ قریب نہیں ہیں کہ کوئی بات سمجھیں''۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ: بندوں کے ساتھ جو بھی دینی یا دنیاوی بھلائی پیش آتی ہے؛ یا اس پر کوئی پریشانی یا برائی آتی ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر شدہ تقدیر کے مطابق ہی جاری ہوتی ہے۔کوئی بھی چیز اس تقدیر سے راہ فرار حاصل نہیں کرسکتی۔دینے اور روکنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔فرمان الٰہی ہے: ﴿ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَ مَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾[فاطر۲] ''جو کچھ اللہ لوگوں کے لیے رحمت میں سے کھول دے تو اسے کوئی بند کرنے والا نہیں اور جو بند کردے تو اس کے بعد اسے کوئی کھولنے والا نہیں اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے''۔

[استطاعت کی اقسام]

۸۵۔((وَالِاسْتِطَاعَةُ الَّتِي يَجِبُ بِهَا الْفِعْلُ مِنْ نَحْوِ التَّوفِيْقِ الَّذِی لاَ يَجُوزُ أَنْ يُوصَفُ الْمَخْلُوقَ بِهِ فَهِيَ مَعَ الْفِعْلِ . وَأَمَّا الِاسْتِطَاعَةِ مِنْ جِهَةِ الصِّحَةِ وَالْوُسْعِ وَالتَّمَكِيْنِ وَسَلَامَةِ الآلَاتِ فَهِيَ قَبْلَ الْفِعْلِ وَبِهَا يَتَعَلَّقُ الْخِطَابِ وَهُوَ كَمَا قَالَ تَعَالىٰ: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾[1] (البقره: ٢٨٦) .))

''وہ استطاعت جس کے ساتھ فعل واجب ہوتا ہے اس کی توفیق سے ہے، جائز نہیں کہ اس کے ساتھ مخلوق کو موصوف کیا جائے، یہ استطاعت فعل کے ساتھ مقارن ہوتی ہے۔ البتہ وہ استطاعت جو صحت، وسعت، قدرت اور اعضاء کی سلامتی کے ساتھ ہے وہ فعل سے قبل ہے، اس استطاعت کے ساتھ خطاب متعلق ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (البقره: ٢٨٦)

''اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا''۔

[1]۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: پہلا قول اشاعرہ کا ہے؛ اور دوسرا قول معتزلہ کا ہے۔ اور حق وصواب اس میں ہے کہ ان دونوں اقوال کو اس تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے جو مصنف رحمہ اللہ نے بیان کی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ کافی وشافی انداز میں بیان کیا ہے۔ اہمیت کے پیش نظر ان کا پورا کلام نقل کرنے میں کوئی حرج والی بات نہیں۔ آپ (مجموع الفتاوی ۸/ ۳۷۱ تا ۳۷۶ پر) فرماتے ہیں: ''ہمارے اصحاب اور دیگر حضرات نے بندے کی استطاعت کے متعلق بحث کی ہے؛ کیا استطاعت انسان کے فعل بجالانے کے وقت ہوتی ہے یا اس سے پہلے ہوتی ہے؟۔ پس انہوں نے ان دونوں باتوں کو متناقض قرار دیا ہے۔ کچھ لوگ استطاعت کو صرف فعل کی ادائیگی کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ غالب طور پر قائلین تقدیر متکلمین؛ اشعری کے اصحاب اور ان کے موافقین ہمارے اصحاب کا ہے۔ دوسرے لوگ کہتے ہیں: استطاعت فعل سے پہلے ہوتی ہے۔ یہ غالب طور پر منکرین تقدیر معتزلہ اور شیعہ کا عقیدہ ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کے نزدیک قدرت واستطاعت ایک وقت میں ایک ہی فعل کے لیے کارگر ہوسکتی ہے۔ کیونکہ استطاعت فعل کے ساتھ لازم ہوتی ہے؛ اس سے جدا نہیں ہوتی۔ جب کہ دوسری قسم کے لوگ کہتے ہیں: استطاعت دونوں اضداد کے لیے کارگر ہوسکتی ہے۔ اور یہ کبھی بھی فعل کے ساتھ مقارن/ ملی ہوئی نہیں ہوتی۔ بھلے یہ قدرت ہو یا امر اور ارادہ۔ اور حق بات وہی ہے جس پر کتاب وسنت دلالت کرتے ہیں کہ استطاعت فعل سے پہلے پائی جاتی ہے؛ اور اس کے ساتھ مقارن بھی ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک اور استطاعت بھی مقارن ہوتی ہے جو کسی دوسری چیز کے لیے کارگر نہیں ہوسکتی۔

پس استطاعت کی دو اقسام ہیں: ایک وہ استطاعت جو فعل سے پہلے پائی جاتی ہے؛ جو دونوں اضداد [یعنی فعل کے بجالانے اور اس کے ترک کرنے] کے لیے کارگر ہوتی ہے۔ اور دوسری استطاعت جو فعل کے ساتھ مقارن ہوتی ہے؛ جو فعل کے بغیر نہیں پائی جاتی۔ پس یہی استطاعت فعل کو صحیح کرنے اور اسے جائز قرار دلوانے والی ہوتی ہے۔ اور یہ فعل کا موجب اور اس کے لیے محقق ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے: ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾ (آلِ عمران: ۹۷) ''اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے لیے بیت اللہ تعالیٰ کا حج ہے جو اس کی طرف رستے کی استطاعت رکھتا ہے۔''

[تو اس شخص پر حج فرض کیا ہے جو استطاعت رکھتا ہو]۔ اگر اس میں استطاعت صرف فعل کے ساتھ پائی جاتی؛ تو پھر حج صرف اس پر ہی فرض ہو جو حج کرتا۔ اور حج کو ترک کر کے کوئی نافرمان نہ ہوتا۔ اس لیے کہ اس پر احرام باندھنے سے پہلے؛ اور اسے اچھی طرح مکمل کرنے سے پہلے حج واجب ہی نہ ہوا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن: ۱۶) ''تم اللہ تعالیٰ سے استطاعت کے مطابق ڈرو۔''

اس میں استطاعت کی مقدار کے لحاظ سے تقویٰ کو واجب قرار دیا ہے۔ اگر اس سے مراد مقارن استطاعت ہوتی تو پھر کسی بھی شخص پر تقویٰ واجب نہ ہوتا؛ مگر صرف اس پر جو کوئی تقویٰ اپناتا۔ کیونکہ تقویٰ تو استطاعت سے ملا ہوا ہے۔ فرمان الٰہی ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ: ۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا''۔ ﴿وُسْعَهَا﴾: میں وسعت سے مراد وہی استطاعت اور طاقت ہے؛ اگر اس سے مراد مقارن استطاعت ہوتی تو کوئی بھی کسی فعل کا مکلّف نہ ٹھہرتا سوائے اس فعل کے جو اس نے انجام دیدیا ہے۔ نہ کہ وہ واجبات جو اس نے ترک کر دیے ہیں۔ اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ بیشک ہر وہ کام جو کتاب و سنت میں واجب ٹھہرایا گیا ہے وہ استطاعت کی وجہ سے ہے۔ اور استطاعت نہ ہونے پر وہ بھی کالعدم ہو جاتا ہے۔ اس سے مقارنت مراد نہیں ہوتی۔ وگرنہ ایسا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ فعل کو صرف اس پر واجب قرار دیتے جس نے وہ فعل سرانجام دیدیا ہو۔ اور جس نے کچھ نہ کیا ہو اس سے وہ واجب ساقط ہو جاتا۔ اور کوئی بھی مذکورہ واجب کو ترک کرنے کی وجہ سے گنہگار نہ ہوتا۔ اور وہ استطاعت جو فعل کے ساتھ مقارن اور اس کو واجب کرنے والی ہوتی ہے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ملتی ہے:

﴿مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ﴾(ھود: ۲۰)

''وہ سننے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی وہ سن سکتے تھے۔''

یہ مقارن استطاعت فعل کو واجب کرنے والی ہوتی ہے۔ جب کہ دوسری استطاعت کا ہونا مکلّف ٹھہرائے جانے کے لیے ضروری ہے۔

پہلی استطاعت: شرعی استطاعت ہے؛ جس پر امر و نہی اور ثواب و عقاب کے مرتب ہونے کا دارو مدار ہوتا ہے۔ اور فقہاء کرام اسی کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ لوگوں کے عرف میں اکثر طور پر یہ معروف ہے۔

دوسری استطاعت: کونی استطاعت ہے جس کے ساتھ قضاء وقدر کے معاملات ہوتے ہیں۔ اور اسی کے نتیجہ میں فعل کا وجود متحقق ہوتا ہے۔ پس پہلی استطاعت شرعی اوامر کے لیے ہے۔ اور دوسری قسم: خلقیات اور کونیات کے لیے ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ﴾[التحریم ۱۲] ''اور اس نے اپنے رب کی باتوں کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی''۔

بندے کی قدرت کے بارے میں لوگوں نے معلوم شدہ حق اور مراد کے برعکس اختلاف کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بیان شدہ متقدم قدرت شرعی کے اعتبار سے فعل پر قادر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس معلوم شدہ حقیقت اور مراد کے خلاف پر بھی قادر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتو قادر صرف اسے ہی شمار کیا جائے جو فعل کو سرانجام دیدے۔ کیونکہ بندہ اس پر قدرت مقارنہ للفعل کے ساتھ قادر نہیں ہے۔ اور بیشک کچھ بھی نہیں ہوسکتا سوائے اس کے جس کے ہونے کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے؛ اور وہ اس کا ارادہ کرے۔ پس جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے؛ اور جو نہیں چاہتے وہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی حواریوں کا یہ قول بھی ہے: ﴿هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾[المائدة ۱۱۲] ''جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تیرا رب کرسکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک دسترخوان اتارے؟''۔ انہوں نے اس کی قدرت کے بارے میں استفہام کیا تھا۔ ایسے ہی حضرت یونس علیہ السلام کے گمان کا مسئلہ بھی ہے۔ ﴿فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ [الانبیاء۸۷] ''پس اس نے سمجھا کہ ہم اس پر گرفت تنگ نہ کریں گے''۔ اس کی تفسیر قدرت کے ساتھ کی گئی ہے۔ جیسا کہ کسی آدمی سے کہا جاتا ہے: هل تقدر أن تفعل كذا؟ ۔ کیا آپ طاقت رکھتے ہیں کہ یہ کام کر دیں''۔ لوگوں کے کلام میں یہ چیز مشہور و معروف ہے۔ جب کہ عقیدہ پہلی قسم کی استطاعت کا تھا؛ یعنی فعل سے پہلے استطاعت کا پایا جانا فعل کے حصول کے لیے کافی ہوتا ہے؛ اور بندے کی چاہت فعل کی ادائیگی کے وقت آڑے آتی ہے؛ اور وہ اسے اس فعل کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ سے بے پرواہ کر دیتی ہے۔ اور جیسا کہ جبریہ کا عقیدہ دوسری قسم کی استطاعت کا تھا؛ جو فعل کو واجب کرنے والی ہے؛ اور یہ دوسرے کی طرف سے ہوتی ہے؛ تو انہوں نے انسان کو اس فعل پر مجبور سمجھا۔ یہ دونوں باتیں انتہائی قبیح اور غلط ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بندے کی بھی چاہت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی چاہت کے تابع ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر ذکر کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بندے کو مختار؛ ارادہ اور چاہت والا بنایا ہے تو اب یہ بات ممتنع ہے کہ وہ مقہور و مجبور ہو۔ کیونکہ وہ خود جو ارادہ کرنے والا ہے۔ اور یہ بھی ممتنع ہے کہ اس نے اپنی ذات کے لیے مشئیت کو پیدا کر لیا ہو۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس فعل کو اختیار کرنے پر مجبور ہے؛ اور وہ اسے چاہنے کے لیے بھی مجبور ہے؛ تو اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اور نہ ہی جبر بالاضطرار کا یہ مفہوم ہوسکتا ہے۔ اور نہ ہی اس پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی قادر ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدریہ اور جبریہ دو مخالف انتہاؤں میں تقسیم ہو گئے۔ اور ان میں سے ہر ایک جس چیز کو ثابت مانتا ہے؛ اس میں وہ حق پر ہے؛ نہ کہ نفی میں۔ ابن الخطیب اور اس جیسے دوسرے جبریہ یہ گمان کرتے ہیں کہ افتقار کا علم بندے کا فعل بجالانے کو اس کے ترک کرنے پر اس مرجح کی وجہ سے ترجیح دینا ہے؛ جو بندے کے علاوہ ہے؛ اس کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ مساوی الطرفین ممکن کی کسی ایک طرف کو دوسری پر ترجیح دینا مرجح کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ اس سے دوسری طرف کی نفی کرنا لازم آتا ہے؛ یہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ بندہ اپنے افعال کا ایجاد کنندہ اور ان کا کاسب ہے۔ ان ایجادات کو اپنے موجد کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس بندہ فاعل؛ صانع اور ایجاد کنندہ ہے۔ اس کا فاعل: صانع اور موجد ہونا؛ حالانکہ پہلے وہ ایسا نہیں تھا؛ تو اس کے لیے بھی ایک فاعل کا ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے: ﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ۝﴾ ''اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھا چلے''۔ جب وہ استقامت چاہتا ہے تو سیدھا چل پڑتا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾(تکویر 29)

''اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے''۔

پس یہ بات اضطراری طور پر معلوم ہوتی ہے؛ اور نقلی و عقلی دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ تمام حق ہے۔ اس لیے کہ بندے کی نہ ہی کوئی طاقت ہے اور نہ ہی کوئی توفیق مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ اور بندہ ذاتی طور پر اپنی ذات وصفات اور افعال میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فقیر اور محتاج ہے۔ حالانکہ اس کی ذات بھی ہے؛ افعال بھی ہیں؛ اور صفات بھی۔ پس اس کے افعال کی نفی کرنا ایسے ہی ہے جیسے اس کی ذات یا صفات کی نفی کرنا۔ اور یہ حق سے انکار ہے اور غلو میں غالی صوفیاء سے مشابہت ہے؛ جو اسے ہی حق قرار دیتے ہیں۔ اور اسے اللہ تعالیٰ سے کسی حد تک مستغنی قرار دیتے ہیں۔ اور اس حق کا انکار کئے بغیر بھی ان میں فرعون کے غلو کی مشابہت پائی جاتی ہے؛ جس نے کہا تھا: ﴿أنا ربکم الأعلی﴾ ''میں تمہارا رب اعلی ہوں''۔ اور یہ بھی کہتے تھے: اس نے اپنے آپ کو خود ہی پیدا کر لیا ہے۔ حق عقیدہ وہی ہے جس پر اہل سنت والجماعت قائم ہیں۔

أقول: یہاں پر لوگوں کی باتوں کا اعتبار نہیں ہوگا؛ جو عذر پیش کرتے ہیں کہ ہم ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ مثلاً اگر آپ کسی سے کہیں: شراب نوشی چھوڑ دیں؛ تو وہ کہتا ہے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اور اگر کسی سے کہیں نماز فجر کا اہتمام کریں تو وہ کہتا ہے: ''میں ایسا نہیں کر سکتا''۔ درحقیقت یہ لوگ شہوات نفس سے مغلوب ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے۔ اور ان شہوات میں مشغولیت کی وجہ سے ہی ان سے توفیق سلب کر لی گئی ہے۔ اب بھی اگر یہ دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے نیکی کے کام کرنا چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔

تشریح: ...... استطاعت، طاقت، قدرت، وسعت متقارب/ مترادف المعنی الفاظ ہیں۔ نیز استطاعت کی دو قسمیں ہیں؛ جیسے شیخ طحاوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔ اکثر اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔ یہی قول درست اور عادلانہ ہے۔ لیکن قدریہ اور معتزلہ کہتے ہیں: قدرت نہیں ہو سکتی؛ مگر فعل سے پہلے۔ ان کے مقابلہ میں اہل سنت کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ: قدرت فعل کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔

اکثر اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ بندے کی ایک قدرت وہ ہوتی ہے؛ جو امر، نہی کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ یہ قدرت یقیناً فعل سے پہلے ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ فعل کے ساتھ ہی ہو۔ لیکن وہ قدرت جس کے ساتھ فعل [کا ادا کرنا] ہوتا ہے؛ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ فعل کے ساتھ ہو۔ یہ جائز نہیں ہے کہ فعل کا وجود معدوم قدرت کے ساتھ ہو۔ البتہ وہ قدرت جو صحت اور وسعت، طاقت؛ امکان اور اعضاء کی سلامتی کے ساتھ متعلق ہے وہ افعال سے قبل ہوتی ہے اس قدرت کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (آل عمران: ۹۷)

''اور لوگوں پر اللہ تعالیٰ کے لیے بیت اللہ تعالیٰ کا حج فرض ہے جو اس کے رستے کی استطاعت رکھتا ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ نے استطاعت رکھنے والے پر حج فرض کیا ہے۔ اگر یہ استطاعت صرف اس میں سمجھی جائے جس نے حج کر لیا ہے؛ تو پھر حج صرف اس پر ہی فرض ہو جو حج کر چکا ہے۔ اور جو حج کے ترک پر کوئی ایک بھی قابل مؤاخذہ نہ ہو۔ یہ بات دین اسلام میں ضرورت کے تحت معلوم شدہ امور کے خلاف ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ١٦)

''تم اللہ تعالیٰ سے استطاعت کے مطابق ڈرو۔''

اس میں استطاعت کے لحاظ سے تقویٰ کو واجب قرار دیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ جو کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار نہیں کرتا؛ تو وہ تقویٰ کی استطاعت نہیں رکھتا۔ [تو پھر اس صورت میں] اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اسی پر واجب قرار دیا ہے جو متقی ہے اور جو متقی نہیں؛ وہ سزا کا مستحق نہ ہوتا''۔ [منهاج السنة لابن تیمیه ۳/ ۴۱۔]

اس اصول کا فاسد ہونا ظاہر ہے۔اسی طرح ارشاد ربانی ہے:

﴿فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا﴾ (المجادلہ: ٤)

''پس جو شخص اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس پر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔''

اس سے مراد اسباب اور آلات کی استطاعت ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے منافقین کا قول نقل کیا ہے [کہنے لگے]:

﴿لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ﴾ (التوبہ: ٤٢)

''اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم تمہارے ساتھ نکل پڑتے۔''

اللہ تعالیٰ ان کو اس قول میں جھوٹا قرار دیا ہے۔اگر وہ اس استطاعت کا ارادہ کرتے؛ جو کہ فعل کی قدرت منحصر ہے؛ تو وہ اس کی نفی کی وجہ سے جھوٹے نہ قرار پاتے۔اور جب ان کو جھوٹا کہا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ان کی مراد بیماری یا مال کا نہ ہونا ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى وَ لَا ..... إلى....... اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَ هُمْ اَغْنِيَآءُ﴾ (التوبہ: ۹۱،۹۳)

''نہ تو ضعیفوں پر کچھ گناہ ہے اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر............آگے تک............الزام تو ان لوگوں پر ہے جو دولت مند ہیں اور پھر تم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ﴾ (النساء: ۲۵)

''اور جو کوئی تم میں سے آزاد مومن خواتین سے نکاح کی مقدور نہ رکھے تو مومن لونڈیوں سے جو تمہارے قبضہ میں آ گئی ہوں۔''

اس سے مراد آلات اور اسباب کی استطاعت ہے۔اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

''کھڑے ہو کر نماز ادا کرو؛ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو بیٹھ کر، اگر بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر''۔ ❶

بے شک یہاں پر نفی اس استطاعت کی ہے جس کے ساتھ فعل کا ادا کرنا ممکن ہو''۔[منهاج السنة ۳/ ٤۳]

❶ بخاری صفة الصلواة ص (۵۸).

البتہ اس استطاعت کا ثبوت جو کہ حقیقتاً قدرت ہے؛ تو اس پر بطور دلیل یہ آیت پیش کی جاتی ہے:

﴿مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ﴾ (هود: ۲۰)

''وہ نہ تھے طاقت رکھتے سننے کی اور نہ تھے وہ دیکھتے۔''

اس نفی سے مراد حقیقی قدرت کی نفی ہے؛ آلات اور اسباب کی نفی نہیں؛ وہ تو موجود ہیں۔اس کی مزید وضاحت متن کے اس پیرائے میں آئے گی: ''وہ اتنی ہی طاقت رکھتے ہیں جتنے کہ وہ مکلّف ہیں''۔ان شاء اللہ۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾ (الکهف: ۷۵)

''بے شک تو میرے ساتھ صبر کی استطاعت نہیں رکھ سکتا۔''

نیز موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے فرمایا تھا:

﴿اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكَ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِیۡعَ مَعِیَ صَبۡرًا﴾(الکھف: ۷۵)

''میں نے تجھ سے کہا نہیں تھا کہ تو میرے ساتھ صبر کی طاقت نہیں پا سکتا۔''

مراد صبر کی حقیقی قدرت ہے۔ اسباب اور آلات کی نفی مراد نہیں؛ یہ تو موجود تھے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں انہوں نے اس پر عتاب [اظہار خفگی] کیا تھا؟۔ اور کام کے اسباب اور آلات نہ ہونے کی بنا پر؛ کام نہ کر سکنے پر ملامت نہیں کی جائے گی؛ بے شک ملامت تو تب ہوگی جب کوئی شخص غیر مامور بہ کاموں میں مشغول ہو کر اس کام کی قدرت ضائع کرنے کی وجہ سے کام نہ کرے؛ یا اس قدرت کو مامور بہ پر صرف نہ کرے [اسے چھوڑ کر کسی اور مامور بہ میں مشغول ہو جائے]۔

جو لوگ کہتے ہیں: قدرت صرف فعل کے وقت ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قدرت ضدین [دو متضاد] کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ جو قدرت فعل کے ساتھ ملی ہوتی ہے وہ صرف اسی فعل کی صلاحیت رکھتی ہے؛ وہ اس کے ساتھ مستلزم ہے اس کے علاوہ اس کا جود نہیں ہوتا۔

قدریہ کا جو عقیدہ ان کے اس فاسد اصول کی بنیاد پر ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے مومن، کافر، نیکوکار، بدکار سب کو برابر طاقت دی ہے۔ پس وہ یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے مومن فرمانبردار کو ایسی اعانت کے ساتھ خاص کیا ہے جس سے وہ ایمان لایا۔ بلکہ اس نے بذات خود اطاعت کو ترجیح دی ہے؛ اور دوسرے نے بذات خود معصیت/گناہ کو ترجیح دی ہے۔ جس طرح کہ ایک باپ نے اپنے ہر بیٹے کو تلوار دی، ایک نے تلوار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا۔ دوسرے نے ڈاکہ ڈالا۔ تقدیر کے قائلین اہل سنت والجماعت کا اس عقیدہ کے فاسد ہونے پر اتفاق ہے۔ اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنے فرمانبردار، بندے پر ایسا دینی نعمت [احسان] ہے؛ جو اس کے ساتھ خاص ہے؛ کافر پر نہیں؛ اور اطاعت گزاری پر اس کی ایسی اعانت فرمائی ہے کہ کافر کی ایسی اعانت نہیں فرمائی۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَـٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيۡكُمُ الۡاِيۡمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ وَكَرَّهَ اِلَيۡكُمُ الۡكُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوۡنَ﴾(الحجرات: ۷)

''لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایمان کو عزیز بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کر دیا اور کفر و گناہ اور نافرمانی کو تمہارے لیے ناپسند کیا؛ یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں۔''

قدریہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا ان چیزوں کو محبوب بنانا؛ اور مزین کرنا تمام مخلوق میں عام ہے؛ یہ بیان اور دلائل حق کے اظہار کے معنی میں ہے۔ جبکہ آیت کا تقاضا ہے کہ یہ ایمانداروں کے ساتھ خاص ہے اسی لیے تو فرمایا ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوۡنَ﴾ (الحجرات: ۷)

''یہ یہی لوگ راہِ ہدایت پر ہیں۔''

ظاہر ہے کہ کفار تو راہِ ہدایت پر نہیں ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾(الانعام ١٢٥)

''تو جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے؛ اس طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر عذاب بھیجتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔''

اس قسم کی آیات قرآن پاک میں کثرت کے ساتھ ہیں جن میں وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو ہدایت دی، اور فلاں کو گمراہ کیا۔ارشاد ربانی ہے:

﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا﴾ (الكهف : ١٧)

''جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے؛ وہی ہدایت پر ہے؛ اور جس کو گمراہ کرے تو تم اس کا کوئی دوست راہنما نہ پاؤ گے۔''

اس مسئلہ کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔ان شاء اللہ تعالیٰ[منهاج السنة لابن تيميه ٣/ ٤٣۔]

ترجیح بلا مرجح کا عقیدہ:

کہنے والے کا یہ قول: ''ترجیح بلا مرجح ہے'' اگر چہ اس کے اس قول ''یرجح'' کا معنی فعل پر زائد ہے۔پس یہی اس کو ترجیح دینے کا سبب ہے۔اگر اس کا یہ زائد معنی نہ ہوتا تو فاعل کا حال فعل سے قبل بھی ویسے ہی ہوتا جیسے فعل کے وجود کے وقت ہوتا ہے۔پھر فعل دو میں سے کسی ایک حالت میں بغیر کسی مرجح کے حاصل ہو۔یہ دراصل عقل کے خلاف مکابرہ/تکبر ہے۔درحقیقت جب عقیدہ ءقدریہ کی اصل یہ ہے کہ: ''اطاعت گزار؛ اور اس کا تارک دونوں ہی اعانت اور قدرت میں برابر ہیں''۔تو ان کے اس اصول کی روشنی میں یہ بات ممتنع /ممنوع ٹھہرتی ہے کہ فعل کے وقت کوئی ایسی قدرت پائی جائے جو اس کے ساتھ خاص ہو۔اس لیے کہ فعل کے لیے جو خاص قدرت ہوتی ہے؛ جو تارک کو حاصل نہیں ہوتی؛ بلکہ جو قدرت فاعل کو حاصل ہوتی ہے؛ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔

انہوں نے جب دیکھا کہ بلاشبہ قدرت کا فعل سے پہلے ہونا ضروری ہے؛ تو کہنے لگے: ''قدرت فعل کے ساتھ نہیں ہوتی۔اس لیے کہ قدرت کی بنیاد پر ہی تو فعل کی بجا آوری یا اس کو ترک کرنا ممکن ہوتا ہے۔اور فعل کے وجود کی حالت میں اس کا ترک کرنا ممتنع ٹھہرا۔پس اسی لیے وہ کہتے ہیں: قدرت صرف فعل سے پہلے ہی ہوسکتی ہے۔یہ قول مطلق طور پر باطل ہے۔اس لیے کسی فعل کا وجود ؛جب اس کے وجود کی شرائط مفقود ہوں؛ ممتنع ہوتا ہے۔بلکہ یہ ضروری ہے کہ جن امور وجود یہ پر فعل کا توقف ہے وہ فعل کے وقت موجود ہوں۔پس ان کے قول کے خلاف قول صحیح اور برحق ہے۔یعنی بے شک فعل کے لیے لازمی ہے کہ اس کے ساتھ قدرت بھی پائی جائے۔

لیکن قدرت کے قائلین/ ثابت ماننے والے اس موقع پر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے:

ایک گروہ کا کہنا ہے: قدرت نہیں ہوسکتی مگر فعل کے ساتھ۔ان کا خیال ہے کہ قدرت ایک ہی نوع ہے اس میں ضدین/ دو الٹ چیزوں کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ان میں سے بعض حضرات کا خیال ہے کہ: قدرت عرض ہے؛ اس کا دو زمانوں میں باقی رہنا ممکن نہیں۔لہٰذا اس کا فعل کے وجود سے قبل موجود ہونا ممتنع ہے۔

درست بات یہ ہے کہ قدرت کی دو اقسام ہیں؛ جیسے پہلے بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔قدرت کی ایک قسم فعل کو صحیح کرنے والی ہے:

اس کے ساتھ فعل اور ترک فعل دونوں ہی ممکن ہیں۔ امر و نہی کے احکام کا تعلق اسی قسم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ قسم اطاعت گزار اور نافرمان دونوں کو حاصل ہوتی ہے؛ اور اس کا وجود فعل سے پہلے ہوتا ہے؛ اور فعل کے سرانجام دینے تک باقی رہتا ہے۔ یا تو وہ بذات خود قائم رہتی ہے؛ ایسا ان کے ہاں ہے جو اعراض کی بقا کے قائل ہیں۔ یا پھر اس کی مثل قدرت کا تجدد ہوتا رہتا ہے؛ یہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے جو اعراض کا بقاء دو زمانوں میں تسلیم نہیں کرتے۔ قدرت کی یہ قسم ضدین [دو متضاد] کی صلاحیت رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم اس قدرت کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ جس میں یہ طاقت نہ ہو اس کو اللہ تعالیٰ اسے مکلّف نہیں ٹھہراتے۔ اس کی ضد عاجزی ہے"۔ [منهاج السنة لابن تيميه ۳/ ٤٣۔] جیسے کہ یہ بیان پہلے گزر چکا ہے"۔

نیز شرعی استطاعت اس استطاعت سے خاص ہے جس کے معدوم ہونے کی صورت میں فعل ممتنع ہوتا ہے۔ بے شک شرعی استطاعت کبھی اس کے نہ ہونے کی صورت میں فعل کا تصور نہیں ہوتا؛ اگر چہ وہ اس فعل سے عاجز نہ بھی ہو۔ لہٰذا شارع اپنے بندوں پر آسانی کرتا ہے؛ ان کے ساتھ آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا [فرمان الٰہی ہے]:

﴿ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ [الحج ۷۸]

" اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کچھ تنگی نہیں رکھی"۔

بیمار کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہے، اگر چہ ایسا کرنے سے مرض میں اضافہ ہوگا اور صحت بحالی میں تاخیر ہوگی۔ یہ شخص بوجہ ضرر حاصل ہونے کے شرعاً استطاعت نہیں رکھتا۔ بھلے اس کو مستطیع نام دیا جائے۔ تو شارع شرعی استطاعت میں صرف فعل کے امکان کو نہیں دیکھتا؛ بلکہ اس کی نظر میں اس فعل کے لوازم بھی ہوتے ہیں۔ اگر خرابی کے غالب امکان کے ساتھ فعل ممکن ہو تو یہ شرعی استطاعت شمار نہ ہوگی۔ جیسے وہ انسان جو حج پر اس صورت میں قدرت رکھتا ہے کہ اس کے مال یا بدن کو ضرر لاحق ہونے کا خطرہ ہو؛ یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی صورت میں مرض بڑھنے کا اندیشہ ہو؛ یا دو ماہ کے روزے رکھے تو خطرہ ہے کہ اس کی گزر اوقات کے اسباب ختم ہو جائیں گے۔ اس طرح کی دیگر مثالیں بھی ہیں۔

تو جب شارع نے فعل کے پورا کرنے میں راجح خرابی/ مفسدہ راجحہ کے نہ ہونے کی شرط لگائی ہے تو پھر کسی عاجز کو کیسے مکلّف ٹھہرایا جا سکتا ہے؟۔

"لیکن یہ استطاعت فعل کے وقت تک باقی رہنے کے باوجود فعل کے وجود کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ اگر کافی ہوتی تو عمل کا تارک عمل کرنے کی طرح ہی ہوتا۔ بلکہ ایک دوسری اعانت کی ایجاد ضروری ہے جو فعل سے مقارن ہو۔ مثلاً فاعل کو اس کا ارادہ کرنے والا بنایا جائے [یعنی فاعل میں اس فعل کا ارادہ پیدا ہو]۔ کیونکہ فعل قدرت اور ارادہ کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوتا۔ اس مقارن استطاعت [ایسی استطاعت جو فعل کے ساتھ ملی ہوئی ہو] میں پختہ ارادہ داخل ہوتا ہے؛ بخلاف اس ارادہ جو کہ تکلیف میں مشروط ہے۔ لیکن قدرت میں ارادہ کی شرط نہیں ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ اس کو بھی فعل کا حکم دیتا ہے جو اس کا ارادہ نہیں کرتا۔ لیکن اس کو حکم نہیں دیتا کہ اگر وہ اس کا ارادہ کرے تو اس سے عاجز رہے۔ اسی طرح لوگوں کا آپس میں حکم دینے کا معاملہ بھی ہے۔ پس کوئی انسان اپنے غلام کو ایسا حکم دیتا ہے جس کا غلام کا ارادہ نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا حکم نہیں دیتا جس سے غلام عاجز

آ جائے۔اور جب ارادۂ جازمہ اور قوت تامہ دونوں مل جائیں تو فعل کا وجود لازم ہو جاتا ہے‘‘۔اسی پر تکلیف مالا یطاق کی بنیاد ہے۔[منهاج السنة لابن تيميه ٣/ ٤٣۔]

پس جو شخص کہتا ہے کہ قدرت صرف فعل کے ساتھ ہوتی ہے؛ تو وہ یوں کہتا ہے کہ ہر کافر اور فاسق ایسے امور کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے جس کی طاقت اس میں نہیں۔ مالا یطاق کی تفسیر دو چیزوں سے کی جاتی ہے:

۱۔ مالا یطاق کی وجہ عاجزی ہو۔اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے کسی کو مکلّف نہیں ٹھہرایا۔

۲۔ مالا یطاق کی تفسیر: اس کی ضد میں مشغولیت کے ساتھ کی جاتی ہے۔پس اس استطاعت کی وجہ سے مکلّف ٹھہرایا جاتا ہے۔جیسا کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو حکم دیتے ہیں؛ تو اس میں مختلف لوگوں کے درمیان فرق روا رکھتے ہیں۔مثلاً: آقا اپنے اندھے غلام کو قرآن پاک میں نقطے لگانے کا حکم نہیں دیتا۔اور اگر وہ بیٹھا ہو تو اس کو کھڑے ہونے کا حکم دیتا ہے ان میں ضرورت کے تحت فرق معلوم شدہ حقیقت ہے۔

[بندوں کے افعال کی تخلیق اور کسب:]

۸۶۔((وَأَفْعَالُ الْعِبَادِ خَلْقُ اللّٰهِ وَكَسْبٌ مِنَ الْعِبَادِ .))

''بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور بندوں کا کسب ہیں''۔

تشریح :...... بندوں کے افعال اختیاریہ میں لوگوں کے مابین اختلاف ہے۔ جبریہ اور ان کے سرغنہ جہم بن صفوان الترمذی [۱۲۸ھ] کا خیال ہے: ''مخلوق کے تمام افعال میں تدبیر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔اور تمام افعال اضطراری ہیں۔ جیسے رعشہ مرض والے کی حرکات ؛ اور رگوں میں نبض ؛ اور درختوں کی حرکات ؛ ان حرکات کی مخلوق کی طرف نسبت مجازی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی چیز کی نسبت اس کے محل کی طرف ہوتی ہے اس کے حصول کنندہ کی طرف نہیں ہوتی۔ ان کے بالمقابل معتزلہ ہیں؛ ان عقیدہ ہے کہ تمام حیوانات کے تمام افعال اختیاریہ خود ان کی تخلیق کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے ساتھ ان کا کچھ تعلق نہیں۔ پھر خود معتزلہ میں اختلاف رائے ہے۔ کہ کیا اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال پر قادر ہے یا نہیں؟۔

اہل حق کا عقیدہ ہے کہ: ''لوگ اپنے افعال کی بنا پر اطاعت گزار یا نافرمان ہوتے ہیں۔ افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کو پیدا کرنے میں منفرد ہیں؛ اس کے سوا ان کا کوئی خالق نہیں۔ جبریہ نے تقدیر کے اثبات میں غلو سے کام لیا۔ انہوں نے بندے کے عمل کی بالکل ہی نفی کر دی؛ جیسا کہ مشبہہ نے اثبات صفات میں غلو کیا، اور وہ تشبیہ دینے لگ گئے۔ منکرین تقدیر قدریہ بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ خالق قرار دینے لگے۔ اسی لیے انہیں اس امت کے مجوسی کہا گیا ہے۔ بلکہ یہ لوگ مجوسیوں سے بھی بدتر ٹھہرے۔ اس لیے کہ مجوسی تو صرف دو خالق مانتے ہیں۔ انہوں نے تو کئی خالق ثابت کر دیئے [مان لیے]۔

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے ایماندار اہل سنت کو دین حق کے اختلافی مسائل میں ہدایت دی؛ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں سیدھے راہ کی ہدایت دیتے ہیں۔ پس جبریہ فرقہ کی پیش کردہ ہر صحیح دلیل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے خالق ہیں اور بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہیں۔ اور بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی جملہ مخلوقات میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں ہوتا ہے جو نہیں چاہتے نہیں ہوتا۔ اور اس پر کوئی دلالت نہیں کہ بندہ حقیقت میں نہ فاعل ہے اور نہ ہی ارادہ کرنے والا؛ اور نہ ہی وہ مختار ہے۔ اور یہ کہ اس کی اختیاری حرکات رعشہ والے کی حرکت کی طرح ہیں؛ یا ہواؤں کے چلنے اور درختوں کی حرکت کے مثل ہیں۔ پس قدریہ فرقہ کی پیش کردہ ہر صحیح دلیل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بندہ اپنے فعل کا حقیقی فاعل ہے؛ اور حقیقت میں ارادہ کرنے والا مختار ہے۔ اور بے شک اس کام کی اس کی طرف نسبت اور اضافت درست اور برحق ہے۔ وہ اس پر دلالت نہیں کرتی کہ وہ فعل اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ما تحت نہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی چاہت اور قدرت کے بغیر ہی واقع ہو جاتا ہے۔ جب آپ ان میں سے ہر گروہ کے صحیح دلائل دوسرے گروہ کے صحیح دلائل سے ملائیں؛ تو ان کی دلالت ان ہی چیزوں پر ہوگی جن پر قرآن اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ دیگر ساری کتابیں

دلالت کرتی ہیں؛ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت عام ہے؛ اوراس کی چاہت کائنات کی تمام چیزوں اعیان اورافعال کوشامل ہے۔ بندے اپنے افعال کے حقیقی فاعل ہیں؛ اور بے شک ان افعال کی بنا پر ہی وہ تعریف یا مذمت کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔ نفس الامر میں یہی حقیقی واقع حال ہے۔ بلا شک دلائل حق اس سے ٹکراؤ نہیں رکھتے۔ حق کے اجزاء باہم ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ مختصر سا مقام فریقین کے دلائل پیش کرنے تنگ دامنی کا اظہار کر رہا ہے۔ دراصل یہ تقابلی دلائل ہیں اور تقابل میں آ کر ساقط ہو جاتے ہیں، ہر فریق کی دلیل سے دوسرے فریق کی دلیل کے باطل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ مختصراً میں فریقین کے کچھ دلائل ذکر کر کے واضح کروں گا کہ یہ دلیل اس باطل پر دلالت نہیں کرتی جس پر استدلال کیا جا رہا ہے۔

[مسئلہ کلام میں جبریہ اور معتزلہ پر رد]:

جبریہ نے جن دلائل سے استدلال کیا ہے؛ ان میں سے یہ ارشاد ربانی بھی ہے:

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ (الانفال: ۱۷)

''آپ نے نہیں پھینکا؛ جب آپ نے پھینکا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکا۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے رمی کی نفی کی ہے؛ اوراپنی ذات اقدس کے لیے ثابت کیا ہے۔ پس یہ دلیل ہے کہ انسان کا کچھ عمل نہیں۔ نیز ان کا عقیدہ ہے کہ: ''جزاء عمال پر مرتب نہیں ہوتی''۔ اس کی دلیل رسول اکرم ﷺ کا یہ فرمان گرامی ہے:

''کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوگا''۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: یارسول اللہ ﷺ! ''کیا آپ بھی نہیں؟''۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں بھی نہیں الا یہ کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اوراس کا فضل سایہ فگن ہو''۔ [1]

[1] مسلم بألفاظ متقاربة؛ ۲۸۱۸؛ ۲۸۱٦؛ البخاری ٦٤٦٤؛ ٥٦٧٣: مسند أحمد ۲/ ۲٥٦؛ من حديث ابی هريرة، جابر، عائشه رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اور قدریہ نے اس آیت مبارکہ سے استدلال کیا ہے: ارشاد ربانی ہے:

﴿فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ (المومنون: ١٤)

''پس بابرکت ہیں اللہ تعالیٰ جو سب سے بہترین خالق ہیں۔''

اور کہتے ہیں: جزاء اعمال پر اس طرح مرتب ہوتی ہے جس طرح معاوضہ مرتب ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝﴾ (الواقعه: ۲٤)

''بدلہ ہے ان اعمال کا جو کچھ وہ کرتے تھے''۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے::

﴿تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (الاعراف: ٤٣)

''تم اس جنت کے وارث بنائے جاتے ہو جو تم عمل کرتے تھے۔'' اس طرح کے دیگر دلائل بھی ہیں۔

جبکہ جبریہ جو کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کرتے ہیں:

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ (الانفال: ۱۷)

''آپ نے نہیں پھینکا؛ جب آپ نے پھینکا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکا۔''

یہ آیت تو ان کے خلاف دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے لیے رمی کو ثابت کیا ہے؛ فرمایا: ''اِذْ رَمَیْتَ'' ''جب آپ نے پھینکا''۔ معلوم ہوا کہ مثبت کچھ اور ہے؛ اور منفی کچھ اور۔ تفصیل یہ ہے کہ رمی کی ایک ابتداء ہے؛ اور ایک انتہا ہے۔ رمی کی ابتدا اس کا پھینکنا ہے؛ اس کی انتہاء اس کا ہدف تک پہنچانا ہے۔ ان میں سے ہر ایک رمی ہے۔ تو اس صورت میں معنی یوں ہوگا - واللہ اعلم - :''جب آپ نے پھینکا؛ تو آپ نے اسے ہدف تک نہیں پہنچایا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے [اسے ہدف تک] پہنچایا۔ وگرنہ یہ جملہ بھی لوگوں کے ان اقوال کے مطابق ہوگا: کہ تو نے نماز ادا نہیں کی جب تو نے نماز ادا کی لیکن اللہ تعالیٰ نے نماز ادا کی۔ تو نے روزہ نہیں رکھا جب تو نے روزہ رکھا۔ تو نے زنا نہیں کیا جب تو نے زنا کیا۔ تو نے چوری نہیں کی جب تو نے چوری کی۔ ان جملوں کا فاسد ہونا ظاہر ہے۔

جہاں تک اعمال پر جزاء کے مرتب ہونے کی بات ہے؛ تو یقیناً اس مسئلہ میں جبریہ، قدریہ دونوں فرقے گمراہی کا شکار ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل سنت والجماعت کو ہدایت دی ہے۔ وله الحمد و المنة۔

خیال رہے منفی جملہ میں ''بَا'' کا وہ معنی نہیں ہوتا جو مثبت جملہ میں ہوتا ہے۔ نفی اس ارشاد نبوی ﷺ میں ہے:

''لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اَحَدٌ بِعَمَلِهِ''

''کوئی شخص اپنے عمل کے عوض جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''

یہاں پر ''بَا'' عوض کے لیے ہے۔ یعنی انسان کے جنت میں داخل ہونے کے لیے عمل قیمت کی طرح ہو۔ جیسا کہ معتزلہ کا خیال ہے؛ کہ عمل کرنے والا اپنے عمل کی وجہ سے اپنے رب کے ہاں جنت میں جانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ بلکہ یہ [جنت میں جانا] تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل سے ہی ممکن ہے۔ اور وہ بَا جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (السجده: ۱۷)

''یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے۔''

یہاں پر اور اس جیسی دیگر آیات میں ''بَا'' سبب کا ہے۔ یعنی تمہارے عمل کے سبب سے؛ اور اللہ تعالیٰ ہی اسباب اور مسببات کے خالق ہیں۔ بس تمام کا مرجع محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے۔

[''کل'' کے عموم میں صرف مخلوقات ہی شامل ہیں:]

[معتزلہ کے دلائل اور ان کا رد]: معتزلہ نے اس ارشاد ربانی سے استدلال کیا ہے:

﴿فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ﴾ (المومنون: ۱۴)

''پس بابرکت ہیں اللہ تعالیٰ جو سب سے بہترین خالق ہیں۔''

اس آیت کا معنی ہے: بہترین مصور اور قدرت بنانے والا ہے۔ خلق [پیدا کرنے] کا لفظ ذکر کر کے اس سے مراد تقدیر لیا جاتا

ہے۔ یہاں پر یہی معنی مراد ہے۔اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی ہے:

﴿اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الزمر: ٦٢)

''اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے خالق ہیں۔''

یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہر مخلوق چیز کے خالق ہیں۔ پس بندوں کے افعال اس لفظ ''کل'' کے عموم میں داخل ہیں۔اوران کا عقیدہ کس قدر فاسد ہے کہ وہ کلام اللہ تعالیٰ کو اس کل کے عموم میں داخل کرتے ہیں؛ حالانکہ کلام اللہ تعالیٰ تو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔اس کا مخلوق ہونا محال ہے۔مگر اپنے افعال کو اس ''کل'' کے عموم سے خارج کر دیا جو کہ مخلوق ہیں۔تو کیا اس ''کل'' کے عموم میں مخلوق کے علاوہ بھی کچھ داخل ہوسکتا ہے؟۔ اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس اور اس کے اوصاف اس عموم میں داخل نہیں۔ جب کہ تمام مخلوقات اس عموم میں داخل ہیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (الصافات: ٩٦)

''اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا ہے؛اور جو کچھ تم کرتے ہو [اس کو بھی]۔''

ہم نہیں کہتے کہ: [یہاں پر] ما مصدر یہ ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو اور تمہارے عمل کو پیدا کیا۔ کیونکہ آیت کا سیاق وسباق اس کا انکار کررہا ہے۔اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان پران گھڑی ہوئی چیزوں کی عبادت کا انکار کیا تھا؛ان کے گھڑے کا انکار نہیں کیا تھا۔آیت دلالت کرتی ہے کہ گھڑی گئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔اور اس چیز کا گھڑا جانا ان کے ہاتھوں سے روبہ عمل ہوا ہے۔پس ان کے افعال کے آثار اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہی ہوں گے۔اگر گھڑنا [فعل] اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہ ہوتا تو گھڑی گئی چیز [مفعول] بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہ ہوتی۔ بلکہ وہ تو صرف لکڑی یا پتھر ہی ہوتے۔متاخرین معتزلہ کے امام ابوالحسین بصری رحمہ اللہ [۴۳۶ھ] نے ذکر کیا ہے کہ: ''یہ جان لینا ضروری ہے کہ انسان اپنے فعل کا محدث ہے''۔

امام رازی رحمہ اللہ [۵۴۴ھ-۶۰۶ھ] نے ذکر کیا ہے کہ: ''ممکن فعل محدث کا ایسے مرجح کی جانب احتیاج؛ جس کی موجودگی میں اس کا وجود ہو اور جس کے عدم موجودگی میں اس کا وجود ممتنع ہو؛ واجب اور ضروری ہے''۔

یہ دونوں اپنی بات میں اس حد تک صحیح [اور سچے] ہیں جو کچھ انہوں نے علم ضروری کی بابت ذکر کیا ہے۔لیکن پھر ان دونوں میں سے ہر ایک کا یہ دعوی کرنا کہ: ''یہ علم ضروری؛ ضرورت کے تحت دوسرے کے علم کو باطل قرار دیتا ہے'' یہ بات نا قابل تسلیم ہے۔ بلکہ دونوں نے جو علم ضروری کا دعوی کیا ہے؛ اس میں دونوں سچے ہیں؛ لیکن غلطی یہاں پر واقع ہوئی جب ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے پاس موجود حق کا انکار کردیا۔ بے شک بندے کو اپنے فعل کا محدث قرار دینے میں؛ اور اس فعل کے احداث کے اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے تحت وجود کے واجب ہونے میں کوئی منافات/ٹکراؤ نہیں ہے۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝﴾ (الشمس: ٧، ٨)

''اور نفس کی قسم اور جس نے اسے درست کیا! پھر اس کو بدکاری اور پرہیز گاری کا الہام کیا۔''

پس اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝﴾ (الشمس: ٨)

''پھر اس کو بدکاری اور پرہیزگاری کا الہام کیا۔''

﴿فَاَلْهَمَهَا﴾ کے اس جملہ میں تقدیر کا اثبات ہے؛ نیز بندے کے فعل کا اثبات ہے؛ جس میں برائی اور تقویٰ کی نسبت اس کے نفس کی طرف کی گئی ہے؛ تاکہ یہ معلوم ہو کہ نفس فجور والا اور تقویٰ والا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ○ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ○﴾ (الشمس: ۹، ۱۰)

''جس نے نفس کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اسے گنہگار کیا وہ خسارے میں رہا۔''

اس میں بھی بندے کے فعل کا اثبات ہے۔ اس مضمون کی آیات کثرت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں۔

[ایک شبہ اور اس کا جواب]:

[شبہ]: یہ ان کے ان شبہات میں سے ایک دوسرا شبہ ہے جن شبہات نے ان کو تفرقہ میں مبتلا کیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ کہ: وہ کہتے ہیں: ''تمہارے اس عقیدہ پر یہ حکم کیسے درست ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مکلفین کو ان کے گناہوں کے مطابق عذاب دیں گے؛ جبکہ ان میں گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے؟۔ ان کو عذاب دینے میں کہاں کا عدل ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی ان میں [ان افعال کا] خالق اور فاعل ہے۔ پوری دنیا میں یہی سوال ہمیشہ عوام وخواص کی زبانوں پر رہا ہے۔ اور ہر شخص نے اپنے علم ومعرفت کے مطابق اس کا جواب دیا ہے۔ اسی کی بنا پر ان کی راہیں بٹ گئیں۔ ایک گروہ نے انسانوں کے افعال کو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے نکال دیا۔ ایک گروہ نے حکمت اور علت کا انکار کرتے ہوئے سوال کا دروازہ ہی بند کر دیا۔ ایک گروہ نے ایسے کسب کو ثابت مانا ہے جو کہ عقل میں نہیں آ سکتا۔ اور اسی پر ثواب وعقاب کو منحصر کر دیا۔ ایک گروہ نے فعل کے وقوع کو دو قدرت والوں کا مقدور اور دو فاعلوں کا مفعول قرار دیا ہے۔ ایک گروہ نے جبر کو لازم قرار دیا۔ اور یہ کہ بے شک اللہ تعالیٰ انہیں ان افعال کی وجہ سے بھی عذاب دیگا جن پر وہ قادر بھی نہیں۔ یہ وہ سوال ہے جس نے ان میں افتراق اور اختلاف کو واجب کر دیا۔

[اس کا ازالہ]: اس کا صحیح جواب یہ ہے: جن وجودی گناہوں میں بندہ مبتلا ہوتا ہے اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں؛ لیکن وہ بندے کے لیے اس سے پہلے گناہوں پر سزا ہوتے ہیں۔ پس ایک گناہ دوسرا گناہ کما لاتا ہے۔ برے کام کی سزا اس کے بعد دوسرا برا کام ہوتا ہے۔ گناہوں کی مثال ان بیماریوں کی طرح ہے جو یکے بعد دیگرے آتی ہیں۔ اب پہلے گناہ کے بارے میں سوال باقی رہتا ہے جو دیگر گناہوں کو لانے والا ہے؟۔ اس کا جواب یہ ہے: وہ بھی اس کام کو نہ کرنے کی سزا ہے جس کے لیے بندے کو پیدا کیا گیا تھا؛ اور اس فطرت پر رکھا گیا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے بندے کو بغیر کسی شرک کے صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ نیز اس کی فطرت میں اپنی محبت رکھ دی ہے۔ تاکہ وہ صرف اسے معبود سمجھے اور انابت الی اللہ تعالیٰ کے ساتھ موصوف رہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (الروم: ۳۰)

''دین کے لیے یکسو ہو کر اپنے چہرہ کو سیدھا کر دو؛ یہ اللہ تعالیٰ کی فطرت کو جس پر لوگوں کو پیدا کیا ہے۔''

جب انسان نے وہ کام نہ کیا جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا تھا؛ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی عبودیت اور انابت کی جس فطرت پر

اسے بنایا گیا تھا؛ تو اس پر اس کو سزا یہ دی گئی کہ شیطان نے اس کے لیے شرک اور نافرمانیوں کو مزین کر دیا''۔[الفتاوی العراقیۃ ۲/ ۱۰۳۸]

شیطان کا واسطہ خالی دل سے پڑا؛ جس میں خیر اور شر دونوں کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی۔ اگر اس میں اتنی خیر ہوتی جو اپنی ضد[برائی] کو روک سکتی؛ تو شر اس میں اپنا ٹھکانہ نہ بناتا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (یوسف: ۲٤)

''یونہی ہم ان سے برائی اور بے حیائی کو روک دیتے ہیں کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں۔''

نیز ابلیس نے کہا:

﴿فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ٥ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ٥﴾ (ص: ۸۲، ۸۳)

''پس تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کروں گا؛ سوائے ان میں سے تیرے مخلص بندوں کے۔''

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ٥ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ (الحجر: ٤١، ٤٢)

''مجھ تک کا یہی سیدھا رستہ ہے۔ جو میرے بندے ہیں ان پر تجھے کچھ قدرت نہیں۔''

اخلاص یہ ہے کہ انسان کا دل جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی بھی بندگی، ارادہ اور محبت سے خالی ہو جائے؛ تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو جاتا ہے۔ پس شیطان کو اس پر قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن جب شیطان انسان کے دل کو اخلاص سے خالی پاتا ہے؛ تو اس پر بقدر دل میں خالی جگہ کے اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔ تو اس حالت میں اس کو گنہگار یا بدکردار بنانا اس اخلاص کے معدوم ہونے کی سزا ہوتی ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا محض عدل ہے۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ: اس میں اس عدم اخلاص کا خالق کون ہے؟۔

جواب: یہ تو بے کار سوال ہے۔ ظاہر ہے کہ لفظ عدم نام کی طرح ہے۔ وہ اس کے ساتھ تکوین اور تخلیق کے متعلق ہونے کا محتاج نہیں۔ اس لیے کہ فعل کا معدوم ہونا وجودی امر نہیں ہوتا؛ جس کی فاعل کی طرف نسبت کی جا سکے۔ بلکہ عدم اخلاص تو محض شر ہے۔ اور شر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاتی۔ جیسا کہ نماز کے شروع کرتے وقت نبی کریم ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے:

((لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ بَيْنَ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ .))

''میں حاضر ہوں تیری طرف سے سعادت! تمام خیر تیرے ہاتھ میں ہیں اور شر کی نسبت تیری طرف نہیں''۔ ❶

اور اسی طرح قیامت کے دن شفاعت والی حدیث میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ سے فرمائیں گے:

یا محمد! تو آپ ﷺ فرمائیں گے:

((لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ .))

''میں حاضر ہوں تیری طرف سے سعادت! خیر تیرے ہاتھ میں ہیں اور شر کی نسبت تیری طرف نہیں''۔ ❷

نیز اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ: [شیطان کن لوگوں پر مسلط ہوتا ہے؟ فرمایا:]

﴿ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ﴾[النحل ۱۰۰]

''ان لوگوں پر؛ جو اس سے دوستی کرتے ہیں؛ اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں''۔

پس جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بجائے اس کو دوست بنایا؛ اور شیطان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا؛ تو ان کو سزا یہ دی گئی کہ شیطان کے ان پر مسلط کر دیا۔ اور شیطان کے ساتھ یہ دوستی اور شرک دراصل دل کے اخلاص سے خالی ہونے کی سزا ہے۔ بس نیکی اور پرہیز گاری کا الہام اخلاص کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ اور فسق و فجور کا الہام دل کے اخلاص سے خالی ہونے کی ایک سزا ہے۔

۞ حدیث صحیح ہے طویل حدیث کا ایک حصہ ہے۔ صفة الصلوٰة ص ۸۳ ملا حظه فرمائیں۔ [ابو دائود (760) مسلم (771)]

۞ یہ حدیث صحیح ہے۔ اس کو بزار نے حذیفہ سے موقوف بیان کیا۔ المجمع (۱۰/ ۳۷۷)، حاکم (٤/ ٥٧٤). المعجم الأوسط للطبرانی ۱۰۵۸ ؛ اس کی سند میں لیث بن أبی سلیم مدلس ہے۔ باقی راوی ثقہ ہیں۔

اگر آپ کہیں: ''اگر ترک اخلاص امر وجودی ہے؛ تو پہلا اعتراض بحال رہا۔ اور اگر عدمی ہے تو عدم محض پر کیسے سزا دی جا سکتی ہے؟''۔

جواب: یہاں لفظ ''ترک'' سے مراد نفس کو ایسی چیز سے روکنا اور منع کرنا نہیں جس کا نفس ارادہ کرتا اور اسے چاہتا ہے۔ پس اس کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ امر وجودی ہے۔ لیکن یہاں پر [ترک سے مراد] اس کا معدوم ہونا؛ اور خیر کے اسباب سے خالی ہونا ہے۔ یہ معدومی اس کا اس چیز سے بالکل خالی ہونا ہے جو چیز نفس کے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔ امر عدمی پر عقوبت دراصل برائی کرنے کی وجہ سے ہے۔ اس کا تعلق ان سزاؤں سے نہیں جو رسولوں کے ذریعہ حجت قائم کرنے کے بعد دی جاتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزائیں دو اقسام کی ہیں:

۱۔ اس کے گناہ گار خطا کار ہونے کی۔ یہ سزا عدم اخلاص عدم انابت کی سزا ہے؛ اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہونے کی سزا ہے۔ اس سزا کی تکلیف؛ دکھ اور الم اور نقصان عموماً محسوس نہیں ہوتا؛ کیونکہ یہ سزا اس کی شہوت اور ارادہ کے موافق ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ بہت بڑی سزا ہے۔

۲۔ دوسری سزا: انسان کے گناہ کے ارتکاب کے بعد دکھ اور الم و سزا۔ [جس کی تکلیف محسوس کی جاتی ہے]۔ ان دونوں سزاؤں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں یکجا کر کے ذکر کیا ہے:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ (الانعام: ٤٤)

''پھر جب وہ نصیحت کو فراموش کر دیا؛ جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔''

یہ پہلی سزا ہے۔ پھر فرمایا:

﴿حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً﴾ (الانعام: ٤٤)

''حتی کہ جب ان چیزوں پر خوش ہو گئے جو ان کو دی گئی تھیں؛ تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا۔'' یہ دوسری سزا ہے۔

[اعتراض]: اگر کہا جائے: کیا ان کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ اخلاص انابت، محبت صرف ایک اللہ تعالیٰ کے لیے کرتے، اس کے بغیر ہی کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ان کو پیدا فرماتا؟ اور ان کو مخلص، منیب [رجوع کرنے والے] محبّ بناتا؟ یا پھر یہ محض ان کے دلوں میں اس کا خیال پیدا کرنا؛ اور اس کا القا کرنا تھا؟۔

جواب: ایسا نہیں؛ بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے۔ یہ وہ سب سے بڑی خیر ہے جو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اور ہر قسم کی خیر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور کوئی بھی شخص خیر کے حاصل کرنے پر قادر نہیں؛ سوائے اس خیر کے جو اللہ تعالیٰ اس کو عنایت فرمادے۔ اور کوئی بھی انسان شر سے نہیں بچ سکتا؛ سوائے اس کے جس کو اللہ تعالیٰ بچالے۔

[اعتراض]: اگر کہا جائے: ''جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اخلاص پیدا ہی نہیں فرمایا نہ وہ اس کی توفیق دیئے گئے؛ تو از خود وہ اسے کیسے حاصل کر سکتے تھے؟ تو پھر یہ سوال اپنی جگہ پر باقی ہی رہا؟۔ کہ ان سے اخلاص روکنا ظلم ہے؛ نیز تمہیں لازمی تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل یہ ہے کہ مالک اپنی ملکیت میں جس طرح چاہے تصرف کرے؛ جو وہ کرے اس سے کوئی پوچھنے والا نہ ہو، باقی سب سے پوچھا جائے؟۔

جواب: اللہ تعالیٰ ان سے اس چیز کو روکنے میں ظالم نہیں ہو سکتے۔ کسی چیز کو روکنے والا ظالم تب بنتا ہے جب وہ کسی دوسرے کے اپنے اوپر واجب حق کو روک لے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس پر حرام قرار دے دیا ہے۔ اور اس کے برعکس کو اپنے اوپر لازم کیا ہے۔ لیکن جب وہ کسی سے ایسی چیز کو روکتا ہے جو اس کا حق نہیں؛ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل اور احسان ہے؛ تو اس کے روکنے سے اللہ تعالیٰ ظالم نہیں بنے گا۔ کسی کا حق روکنا ظلم ہوتا ہے۔ اور فضل واحسان کو روکنا عدل ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس سے [اس خیر و بھلائی کے] روکنے میں عادل ہیں۔ جیسا کہ وہ اپنی نوازشات کے لحاظ سے محسن اور منان [کرم نواز] ہیں۔

اعتراض: جب عطیہ [بخشش] اور توفیق اللہ تعالیٰ کا احسان اور رحمت ہے؛ تو اسے کیوں غالب نہیں کیا گیا، جیسے اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے؟۔ [مجموع الفتاوى ١٤/ ٣٢٧]

جواب: یہاں پر مقصود وہ سزا بیان کرنا ہے جو اس روکنے پر مرتب ہوتی ہے۔ اور وہ روکنا جو عقوبت کو مستلزم ہے؛ وہ ظلم نہیں بلکہ عین عدل ہے۔

اور یہ سوال اس حکمت کے بارے میں ہے جس نے بعض مقامات میں عدل کو فضل ورحمت پر مقدم کر دیا ہے؟ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت میں تمام بندوں کو مساوی کیوں نہیں بنایا؟۔ اس سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ فلاں فلاں کو کیوں فضیلت عطا کی ہے؛ اور کسی دوسرے پر اپنا فضل کیوں نہیں کیا؟۔ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے؛ فرمایا:

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ (الحديد: ٢١)

''یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔''

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○﴾ (الحديد: ٢٩)

''اس لیے کہ اہل کتاب جان لیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے فضل پر کچھ بھی قدرت نہیں؛ اور یہ کہ فضل اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے نوازتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل کے مالک ہیں۔''

جب یہودیوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ امت محمدیہ کو کس لیے دوگنا اجر اور ہمیں کیوں ایک ایک ہی اجر وثواب دیا جائے

گا؟۔تو آپ ﷺ نے [اللہ تعالیٰ کا قول پیش] فرمایا:

''[اللہ تعالیٰ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ] کیا میں نے تم سے تمہارا حق چھینا ہے؟۔

انہوں نے نفی میں جواب دیا؛ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''یہ میرا فضل ہے، جس کو چاہتا ہوں عطا کرتا ہوں''۔ ❶

❶ بخاری ۵۵۷، حدیث ابن عمر.

نیز یہ حکمت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کسی کو عطیہ دینے، اور کسی کو نہ دینے میں جو حکمت پوشیدہ ہے اس سے تمام لوگوں کو مطلع کرے۔ بلکہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی بصیرت کو منکشف کر دیتا ہے؛ تا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں؛ اور اس کے حکم میں اور اس کے ثواب اور عقاب میں؛ اور اس کے خاص کرنے میں اور محروم رکھنے میں؛ اس کی حکمت کو دیکھ سکے۔ اور ان کے احوال و مقامات پر اچھی طرح سے غور و فکر کرے؛ تو وہ جو کچھ جانتا ہے اس سے ان چیزوں پر استدلال کرتا ہے جن کو وہ نہیں جانتا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے دشمن مشرکین نے اس تخصیص کو مشکل گردانا تو انہوں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا: ﴿اَهٰٓـؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا﴾ ''کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ہم میں سے اپنا احسان کیا ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جواب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ﴾ (الانعام: ۵۳)

''کیا اللہ تعالیٰ شکر گزار لوگوں کو نہیں جانتا ہے۔''

آپ اس جواب پر غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ خوب علم رکھتے ہیں کہ کونسا مقام نعمت کے درخت لگانے کے قابل ہے کہ وہ شکر سے بار آور ہوگا؛ اور کون سا مقام ایسا ہے جو درخت لگانے کے لیے موزوں نہیں؛ اور اگر وہاں پر درخت لگا دیا جائے تو پھل نہ دے؛ وہاں پر شجر کاری کرنا بے فائدہ ہو اور اس کی حکمت بالکل بھی مناسب نہ ہو۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾۔[الانعام ۱۲۴]

''اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ اس نے اپنی رسالت کو کہاں رکھنا ہے''۔

[بندہ اپنے فعل کا حقیقی فاعل/فعل اللہ تعالیٰ کی مخلوق:]

اگر یہ کہا جائے کہ: جب تم بندے کی طرف سے اس کے ایجاد ہونے پر محال ہونے کا حکم لگاتے ہو؛ تو پھر بندے کا قطعاً کوئی فعل ہے ہی نہیں؟۔

جواب: بندہ اپنے فعل کا حقیقی فاعل ہے؛ اسے فعل پر حقیقی قدرت حاصل ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ﴾ (البقرہ: ۱۹۷)

''اور جو بھی نیک (کام) تم کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (ہود: ۳۶)

''تو جو یہ کام کر رہے ہیں ان کی وجہ سے غم نہ کھاؤ۔'' اس طرح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔

جب بندے کا فاعل ہونا ثابت ہوگیا؛ تو یاد رہے کہ افعال کی دو اقسام ہیں:

- ایک قسم وہ ہے جس میں قدرت اس کا ارادہ فعل کے ساتھ مقارن نہیں ہوتا۔ یہ قسم اس کی صفت ہوتی ہے۔ یہ فعل نہیں ہوتی۔ جیسا کہ مریض رعشہ کی حرکات ہیں۔
- دوسری قسم وہ ہے جس میں قدرت اور ارادہ فعل کے ایجاد میں مقارن [ملے ہوئے] ہوتے ہیں۔ اس قسم کو بندے کی صفت اور فعل اور کسب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جیسے اختیاری حرکات۔

اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جس نے بندے کو فاعل اور مختار بنایا ہے؛ اور اللہ وحدہٗ لا شریک ہی ایسا کرنے پر قادر ہیں۔ اسی لیے سلف صالحین رحمہم اللہ نے جبر کا انکار کیا ہے۔ اس لیے کہ جبر تو صرف عاجز سے ہی ہو سکتا ہے؛ اور یہ صرف اکراہ [مجبوری] کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: باپ چھوٹی کنواری بچی کو نکاح پر مجبور کر سکتا ہے؛ لیکن ثیبہ [یعنی مطلقہ یا بیوہ] بالغہ کو مجبور نہیں کر سکتا۔ یعنی اس کی نا پسندیدگی کی صورت میں باپ اس کی شادی نہیں کرا سکتا۔

[اللہ تعالیٰ کا وصف مجبور کرنا نہیں:]

اللہ تعالیٰ اس اعتبار سے اجبار [جبر] کے ساتھ موصوف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ارادہ اور مراد دونوں کے خالق ہیں؛ اور وہ اس بات پر قادر ہیں کہ دوسروں کے برعکس اس کو مختار بنا دے''۔ [موافقة صحيح المعقول ١/ ٣٦؛ منهاج ١/ ٩٠]

اسی لیے شارع کے الفاظ میں جبل (یعنی فطرت) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جبر کے الفاظ نہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اشج عبد القیس سے فرمایا:

''بے شک تجھ میں دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں: بردباری اور دور اندیشی''۔

اس نے دریافت کیا: ''یہ دونوں عادتیں میرا کسب ہیں؛ ان سے موصوف ہوا ہوں؛ یا جبلی [فطرتی] ہیں؛ ان پر ہی مجھے پیدا کیا گیا ہے؟۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''جبلی [فطرتی] خصلتیں ہیں؛ ان پر تجھے پیدا کیا گیا ہے''۔ تو اس نے کہا: ''تمام تعریف اللہ تعالیٰ کی ہے جس نے مجھے ان دونوں عادتوں پر پیدا فرمایا، جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں''۔ [1]

اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو فعل اختیاری پر سزا دیتے ہیں۔ اور فعل اختیاری، غیر اختیاری کے درمیان سزا میں جو فرق ہے وہ فطرتی اور عقلی ہے۔

[1] مسلم ١٧؛ ٢٥، أبو داؤد ٥٢٢٥؛ حديث ابن عباس، الروض النضير (٤٠٦). وفى لفظ مسلم: خصلتين ......

اگر کہا جائے کہ: ''عقوبت کے ساتھ فعل کی تخلیق تو اس پر ظلم ہے؟''۔

تو یہ اسی طرح ہے کہ کہا جائے: ''زہر کھانے کی تخلیق؛ اور پھر اس کی وجہ سے موت کا آنا ظلم ہے''۔ [منهاج السنة ٣/ ٢٨]

پس جس طرح زہر کھانا موت کا سبب ہے؛ اسی طرح عمل سزا کا سبب بنتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں کوئی ظلم نہیں ہوتا۔

حاصل کلام! بے شک بندے کے فعل کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی ہی مخلوق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا مفعول ہوتا ہے۔وہ بذات خود اللہ تعالیٰ کا فعل نہیں ہوتا۔پس فعل اور مفعول میں؛ اور خلق اور مخلوق میں فرق صاف ظاہر ہے۔

اسی بات کی طرف شیخ رحمہ اللہ نے یہ کہتے ہوئے اشارہ کیا ہے: ''انسانوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور انسانوں کا کسب ہیں''۔

اس میں بندوں کے لیے فعل اور کسب کو ثابت کیا ہے۔اور تخلیق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے۔اور کسب بندے کا وہ فعل ہے جس کے فاعل پر اس کا نفع یا نقصان لوٹ کر جاتا ہے۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ (البقرہ: ۲۸۶)

''اسی کے لیے فائدہ ہے جو کچھ اس نے اچھا کیا؛ اور اسی پر بوجھ ہے جو اس نے برائی کی۔''

[مکلفین کی وسعت]:

۸۷۔((وَلَمْ یُکَلِّفْهُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ إِلَّا مَا یُطِیْقُوْنَ وَلَا یُطِیْقُوْنَ إِلَّا مَا کَلَّفَهُمْ⑩ . وَهُوَ تفسِیر: " لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ۔ نَقُوْلُ لَا حِیْلَةَ لِأَحَدٍ وَلَا حَرْکَةَ لِأَحَدٍ وَلَا تَحَوُّلَ لِأَحَدٍ عَنْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ إِلَّا بِمَعُوْنَةِ اللّٰهِ وَلَا قُوَّةَ لِأَحَدٍ عَلَی إِقَامَةِ طَاعَةِ اللّٰهِ وَالثُّبَاتِ عَلَیْهَا إِلَّا بِتَوْفِیقِ اللّٰهِ .))

''اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اسی قدر مکلّف بنایا ہے جس قدر ان میں استطاعت تھی اور ان میں استطاعت نہ تھی مگر اسی قدر جس قدر ان کو مکلّف بنایا گیا۔ چنانچہ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه" کی یہی تفسیر ہے، ہم کہتے ہیں: نہ کسی کا کوئی حیلہ ہے؛ نہ کسی کی کوئی حرکت اور نہ ہی کسی میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کی طاقت ہے؛ مگر اللہ تعالیٰ کی مدد سے۔ اور کسی کی کوئی طاقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری قائم کرنے اور اس پر ثابت رہنے کی نہیں مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی''۔

⑩۔ یہ بات درست نہیں؛ بلکہ مکلفین اس چیز سے زیادہ کی طاقت رکھتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے انہیں مکلّف بنایا ہے۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر مہربانی اور لطف و کرم ہے کہ اس نے ان کے لیے آسانی کی ہے۔ اور ان کو دین کے معاملہ میں حرج میں نہیں ڈالا۔ یہ اس کا فضل و احسان ہے۔ اور نیکی کی توفیق بخشنے والی وہی ہستی ہے۔
مثال کے طور پر اگر اللہ تعالیٰ سال میں دو بار ایک ایک ماہ کے روزے فرض کر دیتے تو لوگ ایسا کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بندوں کے ساتھ رحمت والا معاملہ کرتے ہوئے انہیں اتنا زیادہ مکلّف نہیں بنایا۔
"لَاحَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه" کی تفسیر یہی ہے کہ ایک حال سے دوسرے حال میں تبدیلی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور قوت سے ہی ہوتی ہے۔ اور زبان سے اس کلمے کا اقرار کرنا جہاں پر اللہ تعالیٰ پر توکل؛ اس سے مدد کی طلب اور اس کے ساتھ حسن ظن کو شامل ہے؛ وہیں اس کلمہ کے زبانی اظہار پر بہت بڑا اجر و ثواب بھی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتاؤں؟ ۔ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں؛ یارسول اللہ ﷺ ضرور بتائے۔ آپ نے فرمایا: "لَاحَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه" کہا کرو''۔ البخاری ۶۴۰۹ مسلم ۲۷۰۴۔
اس لیے کہ یہ کلمہ توحید الوہیت کے اقرار کے ساتھ ساتھ بندے کی اللہ کی بارگاہ میں محتاجی کو بھی شامل ہے۔ پس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اس کی مشئیت سے ہو رہا ہے۔
مصنف رحمہ اللہ کی عبارت میں: "لَاحَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰه" سے آگے کے جملے: ''لَا حِیْلَةَ لِأَحَدٍ وَلَا حَرْکَةَ لِأَحَدٍ...... '' اسی جملہ کی شرح اور توضیح اور اس کی تاکید ہیں۔

مشئیت الٰہی کا نفاذ

۸۸۔ ((وَكُلُّ شَيْءٍ يَجْرِي بِمَشِيئَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَعِلْمِهِ وَقَضَائِهِ وَقَدْرِهِ غَلَبَتْ مَشِيئَتُهُ الْمَشِيئَاتِ كُلَّهَا. [وعكست إرادته الإرادات كلها⑩] وَغَلَبَ قَضَاؤُهُ الْحِيَلَ كُلَّهَا يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ أَبَدًا. [تَقَدَّسَ عَنْ كُلِّ سُوْءٍ وَحِيْنٍ. وَتَنَزَّهَ عَنْ كُلِّ عَيْبٍ وَشِيْنٍ]: ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبياء: ۲۳)))

''نیز ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیت، علم، قضاوقدر کے ساتھ جاری ہے اس کی مشیت تمام مشیئتوں پر غالب ہے اور اس کا ارادہ تمام ارادوں پر غالب ہے اس کے فیصلے تمام حیلوں پر غالب ہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے وہ قطعاً کسی پر کچھ ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْـَٔلُوْنَ۝﴾ (الانبياء: ۲۳)

''جو وہ کرتا ہے اس سے سوال نہیں ہوگا اور ان سے سوال ہوگا۔''

⑩۔ اس متن میں دونوں جگہ پر [] بین القوسین عبارت شیخ الالبانی رحمہ اللہ کی تعلیقات والے نسخہ متن عقیدہ طحاویہ میں نہیں؛ بلکہ شرح پر آپ کی تخریج والے نسخہ میں ہے؛ جس کی تحقیق علماء کی ایک جماعت نے کی ہے۔ دراوی۔

تَشْرِیح:...... اللہ تعالیٰ نے بندوں کو استطاعت کے بقدر مکلّف بنایا ہے ارشاد ربانی ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ: ۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (الانعام: ۱۵۲)

''ہم کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔''

ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ [۲۶۰-۳۲۴ھ] کہتے ہیں: عقلاً تکلیف مالا یطاق جائز ہے۔ اس پر ان کے تلامذہ متردد ہیں کیا شریعت میں اس کا ثبوت ہے بھی یا نہیں؟۔ جو اس کے قائل ہیں وہ ابولہب کو ایمان لانے کا حکم دینے سے دلیل پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے خبر دی تھی کہ وہ ایمان نہیں لائے گا؛ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ: ''اور بے شک؛ وہ﴿سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ﴾۔

''عنقریب شعلہ مارتی دوزخ میں داخل ہوگا''۔ پس اس کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا تھا۔ حالانکہ اس کا طے تھا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ یہ تکلیف حقیقت میں جمع بین ضدین [دو مخالف چیزوں کا جمع کرنا] ہے۔ ایسا ہونا محال ہوتا ہے۔

جواب: اصل میں ایسا ہونا ممنوع ہے۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اسے ایمان لانے کا بھی حکم تھا اور ایمان نہ لانے کا بھی حکم تھا۔ اور وہ استطاعت جس کے ساتھ انسان ایمان لانے پر قادر ہوتا ہے؛ وہ اسے حاصل تھی؛ وہ ایمان کے حصول سے عاجز نہ تھا، پس اس کو صرف اسی چیز کا مکلّف ٹھہرایا گیا تھا؛ جس کی اس میں طاقت تھی۔ جیسے اس سے پہلے استطاعت کی بحث میں اس کی وضاحت گزر چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فرشتوں سے یہ کہنے سے کہ:

﴿اَنۡۢبِـُٔوۡنِیۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ﴾ (البقرہ: ۳۱)

''اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔''

تکلیف مالا یطاق کا دیا جانا لازم نہیں آتا؛ جب کہ فرشتوں کو اس کا علم ہی نہ تھا۔ اسی طرح قیامت کے دن تصویر کشی کرنے والوں سے یہ کہنے سے: ''جن کو تم نے بنایا ہے ان میں روح ڈالو''۔ [البخاری ۵۹۵۱؛ مسلم ۲۱۰۸؛ ۲۱۰۷؛ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا]

[اس سے] انہیں تکلیف مالا یطاق لازم نہیں آتی۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی ہیں۔ کیونکہ ان سے کسی ایسے فعل کے مطالبہ نہیں جس پر فاعل کو ثواب حاصل ہو یا تارک کو سزا ملے۔ بلکہ یہاں تو خطاب ان کی عاجزی کے اظہار کے لیے ہے۔ اسی طرح اہل ایمان کی یہ دعا:

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ (البقرہ: ۲۸۶)

''اے ہمارے رب اور ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جس کی ہم میں طاقت نہیں۔''

اس سے بھی یہ لازم نہیں آتا۔ اس لیے طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنا شرعی طور پر مکلّف ٹھہرانا نہیں ہے۔ ممکن ہے کسی پر پہاڑ کا بوجھ ڈال دیا جائے؛ جس کی اس میں طاقت نہ ہو؛ اور وہ مرجائے۔ [یہ تکلیف مالا یطاق شمار نہیں ہوگا]۔

ابن الانباری رحمہ اللہ (۲۷۱۔۳۲۸ھج) کا فرمان ہے: ''اس کا معنی یہ ہے کہ ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا جس کا اٹھانا ہم پر گراں ہو۔ اگرچہ ہم تکلیف اور مجبوری کے ساتھ اس کی طاقت رکھتے ہیں''۔ پس اللہ تعالیٰ نے عرب کو ایک معقول انداز میں مخاطب کیا ہے۔ پس کوئی عرب جب کسی سے بغض رکھتا ہے تو کہتا ہے: ''میں تجھے دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا''۔ حالانکہ اس میں طاقت ہوتی ہے۔ البتہ اس کو دیکھنا اس پر گراں گزرتا ہے۔ نیز حکمت کے لحاظ سے یہ جائز نہیں ہے کسی کو پہاڑ اٹھانے کا مکلّف ٹھہرایا جائے؛ اس طرح سے کہ اگر وہ اٹھائے گا تو اس کو ثواب حاصل ہوگا ورنہ اس کو سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنی ذات کی بابت خبر دی ہے؛ فرمایا:

﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾ (البقرہ: ۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔''

ان میں سے بعض حضرات کہتے ہیں: عادت کے اعتبار سے ممتنع کی تکلیف تو جائز ہے؛ مگر ذات کے اعتبار سے ممتنع کی تکلیف جائز نہیں۔ اس لیے کہ اس کے وجود کا تصور ہی ممکن نہیں؛ اور نہ ہی اس کا حکم معقول ہوسکتا ہے؛ بخلاف پہلی قسم کے۔

کچھ حضرات کہتے ہیں: ''جس فعل کے کرنے کی طاقت عجز کی وجہ سے نہ ہو؛ اس کا مکلّف ٹھہرانا دینا جائز نہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی اس وجہ سے طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اس کے برعکس کام میں مشغول ہے؛ تو اس کو ایسی چیز کا مکلّف ٹھہرانا جائز ہے۔ یہ لوگ درحقیقت اس معنی میں ائمہ سلف کے ساتھ متفق ہیں۔ لیکن جس فعل کو بندہ اس لیے چھوڑ دے کہ وہ اس کے برعکس دوسرے فعل میں مشغول ہے؛ اور

اس کو ان حضرات کا تکلیف مالا یطاق قرار دینا شریعت اور لغت کے لحاظ سے بدعت ہے۔اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ انسان جو کام نہیں کرتا؛ وہ اس کی طاقت ہی نہیں رکھتا۔ یہ حضرات اسی کا التزام کرتے ہیں؛ ان کا کہنا ہے کہ: ''طاقت: جو کہ قدرت اور استطاعت ہے؛ وہ صرف فعل کے ساتھ ہوتی ہے۔ان کا یہ بھی کہنا ہے: ''ہر وہ انسان جو کوئی کام نہیں کرتا؛ وہ اس کی طاقت بھی نہیں رکھتا''۔ یہ بات کتاب وسنت کی نصوص اور اجماع سلف کے خلاف ہے۔اور اس چیز کے بھی خلاف ہے جس پر اکثر عقلاء کاربند ہیں۔اشارۃً اس کا ذکر استطاعت کی بحث میں ہو چکا ہے۔

اور وہ استطاعت جو صرف اور صرف فعل کے ساتھ مقارن ہوتی ہے؛ وہ مکلّف ٹھہرانے کے لیے شرط نہیں۔ حالانکہ حقیقت میں وہاں پر مراد فعل کا بجالانا ہی ہوتا ہے۔وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے دلیل پیش کرتے ہیں:

﴿مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ﴾ (ھود: ۲۰)

''وہ سننے کی استطاعت نہیں رکھتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾ (الکھف: ۷۲)

''بے شک تو میرے ساتھ تو صبر کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔''

''اس میں وہ ارادہ نہیں ہے جس کا نام وہ استطاعت رکھتے ہیں۔ وہ تو صرف فعل کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت اس بات پر کی ہے کہ وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اگر اس سے مراد [فعل کے ساتھ] مقارن [استطاعت] ہوتو تمام مخلوق سننے سے پہلے سماعت کی استطاعت نہیں رکھتی۔تو پھر ان کو بطور خاص ذکر کرنے کا کچھ معنی نہ ہوا۔لیکن یہ لوگ چونکہ حق کے ساتھ بغض رکھتے ہیں اور حق ان پر گراں ہوتا ہے؛ ایسا یا تو اہل حق سے حسد کی وجہ سے کرتے ہیں؛ یا پھر خواہشات کی اتباع کی وجہ سے؛ [اس لیے وہ] سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ظاہر شریعت کی مخالفت دیکھ کر صبر نہیں کر سکے۔ کیونکہ آپ کو ان امور کا علم بھی نہیں تھا۔عربی اور تمام امتوں کی زبانوں میں اس طرح استعمال ہوتا ہے کہ جو کسی دوسرے سے بغض رکھتا ہے؛ اس کے متعلق کہا جاتا ہے: وہ اس کے ساتھ احسان کر ہی نہیں سکتا [یعنی اس کی استطاعت نہیں رکھتا]۔اور جو کوئی کسی سے محبت کرتا ہو؛ اس کے متعلق کہا جاتا ہے: ''اس کو سزا دینے کی استطاعت نہیں رکھتا''۔ کیونکہ ایسا اس سے شدید محبت کی وجہ سے ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ اس کو سزا دینے سے عاجز آ گیا ہو۔ایسا مبالغہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں: میں ضرور اس کی پٹائی کروں گا حتی کہ وہ مر جائے'' مراد سخت پیٹنا ہے۔اور یہ عذر نہیں۔ پس اگر اللہ تعالیٰ بندوں کو صرف ان چیزوں کا حکم دے جو لوگوں کی چاہت ہیں؛ تو آسمان، زمین میں فساد پیدا ہو جاتا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ﴾ (المومنون: ۷۱)

''اور اگر حق ان کی خواہشوں پر چلے تو آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب درہم برہم ہو جائیں۔''

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ان میں استطاعت تکلیف کے بقدر ہے............الخ۔

یعنی وہ صرف اسی چیز کی طاقت رکھتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو قدرت دی ہے۔ یہ استطاعت توفیق ہی ہے۔اس سے

صحت، فراخی، قدرت، اور اعضاء و آلات کی سلامتی مراد نہیں۔

اور "لا حول ولا قوۃ إلا باللہ" تقدیر کے اثبات کی دلیل ہے۔ شیخ رحمہ اللہ نے بھی اس کے بعد اس کی تفسیر کی ہے۔ لیکن شیخ رحمہ اللہ کے کلام میں اشکال ہے۔ بے شک لفظ "تکلیف" قادر کرنے کے معنی میں مستعمل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ امر و نہی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اور شیخ رحمہ اللہ نے خود کہا ہے: "اللہ تعالیٰ انہیں طاقت کے مطابق تکلیف دیتا ہے اور وہ اسی چیز کی طاقت رکھتے ہیں؛ جس کا انہیں مکلّف بنایا گیا ہے"۔ بظاہر ان دونوں جملوں کا ایک ہی معنی ہے۔ لیکن یہ معنی درست نہیں۔ اس لیے کہ جس قدر اللہ تعالیٰ نے ان کو مکلّف ٹھہرایا ہے؛ ان سے زیادہ کی طاقت ان میں موجود ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر آسانی اور تخفیف چاہتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرہ: ۱۸۵)

"اللہ تعالیٰ تو تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتے ہیں اور تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں کرتے۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ﴾ (النساء: ۲۸)

"اللہ تعالیٰ تم پر تخفیف کرنا چاہتے ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج: ۷۸)

"اللہ تعالیٰ نے تم پر دین میں کچھ تنگی نہیں کی۔"

تو جس قدر ہمیں مکلّف بنایا گیا ہے؛ اگر اس کو زیادہ بھی کیا جاتا؛ تو ہم اس کی بھی طاقت رکھتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان اور رحمت فرمائی؛ اور ہم پر تخفیف کر دی۔ اور ہم پر دینی امور میں کوئی حرج نہیں رکھا۔

اس اشکال کا جواب وہی پہلے والا ہے کہ: بے شک یہاں پر طاقت سے مراد توفیق کا ہونا ہے، نہ کہ قدرت اور آلات و اعضاء کی سلامتی مراد ہے۔ خیال رہے عبارت میں کچھ اضطراب ہے اس لیے اس میں بہت غور و فکر کی ضرورت ہے۔

[قضاء کونی اور قضاء شرعی میں فرق:]

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (وَكُلُّ شَيْءٍ يَجْرِي بِمَشِيئَةِ اللّٰهِ تَعَالىٰ وَعِلْمِهِ وَقَضَائِهِ وقدره)

"ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیئت اور قدرت اور علم اور قضا کے ساتھ ہے"۔

قضاء سے مراد تکوینی قضاء ہے، شرعی نہیں۔ اس لیے کہ قضاء تکوینی بھی ہوتی ہے اور شرعی بھی۔ اسی طرح ارادہ، امر، اذن، کتاب، تحریم، اور کلمات بھی ہیں [تکوینی اور شرعی دونوں طرح کے ہوتے ہیں]۔ قضاء تکوینی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ (حم السجدہ: ۱۲)

"پھر اس نے دو دن میں سات آسمان بنائے۔"

اور دینی وشرعی قضاء اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾ (الاسراء: ۲۳)

''اور آپ کے رب نے فرمادیا: اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔''

اور ارادہ، تکوینی دینی کا ذکر پہلے شیخ رحمہ اللہ کی اس عبارت میں گزر چکا ہے: (اور صرف وہی ہوگا جو وہ چاہتا ہے)۔

اور امر تکوینی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ o﴾ (یٰسٓ: ۸۲)

''بے شک اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے: ہوجا، تو وہ ہوجاتی ہے۔''

نیز ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا o﴾ (الاسراء: ۱۶)

''اور جب ہم کسی بستی کے ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو مامور کردیتے ہیں؛ وہ وہاں پر نافرمانیاں کرتے ہیں ؛ پھر اس پر حکم ثابت ہوگیا اور ہم نے اسے بالکل ہلاک کرڈالا۔''

یہ ایک قول ہے؛ اور یہی قول سب سے قوی ہے۔ اور امر شرعی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ﴾ (النحل: ۹۰)

''بے شک اللہ تعالیٰ انصاف اور احسان کا حکم دیتے ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ (النساء: ۵۸)

''بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم امانت کو اس کے حقداروں کی طرف ادا کرو۔''

اذن تکوینی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (البقرہ: ۱۰۲)

''وہ اس جادو کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔''

اور اذن شرعی اس فرمان میں ہے:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (الحشر: ۵)

''کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا؛ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا۔''

کتاب تکوینی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ (فاطر: ۱۱)

''اور نہ کسی بڑی عمر والے کو عمر زیادہ دی جاتی ہے اور نہ اس کی عمر کم کی جاتی ہے مگر (سب کچھ) کتاب میں (لکھا ہوا) ہے بے شک یہ اللہ تعالیٰ کے لیے بہت آسان ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۵)

''اور ہم نے نصیحت [تورات] کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ میرے نیکوکار بندے ہی ملک کے وارث ہوں گے۔''

کتاب شرعی دینی؛ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ (المائدہ: ۴۵)

''اور ہم نے ان پر تورات میں بھی لکھ دیا تھا کہ بے شک جان کے بدلے جان۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ (البقرہ: ۱۸۳)

''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں۔''

حکم تکوینی: اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے کی طرف سے حکایت فرماتے ہیں:

﴿فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ﴾ (یوسف: ۸۰)

''میں ہرگز یہ جگہ نہ چھوڑوں گا حتی کہ میرے ابا مجھے اجازت دیں؛ یا اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ کر دے اور وہ بہترین فیصلہ ساز ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۱۱۲)

''فرمایا: میرے رب! برحق فیصلہ کر دے اور ہمارا رب بڑا مہربان ہے مدد طلب کیا ہوا ان باتوں میں جو تم بیان کرتے ہو۔''

حکم شرعی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾ (المائدہ: ۱)

''حلال کر دیئے ہیں تمہارے لیے چار پائے جانور، بجز ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، مگر حالت احرام میں شکار کو حلال نہ جاننا؛ اللہ تعالیٰ جیسا چاہے حکم دیتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ﴾ (الممتحنہ: ۱۰)

''یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے وہ تمہارے درمیان فیصلہ فرماتے ہیں۔''

تحریم کونی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ﴾ (المائدہ: ۲۶)

''فرمایا: وہ ملک ان پر چالیس برس تک حرام کر دیا گیا زمین میں سرگردان پھرتے رہیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ حَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ﴾ (الانبياء: ۹۵)

''اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ان پر حرام ہے؛ بے شک وہ رجوع نہیں کریں گے۔''

تحریم شرعی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِیْرِ﴾ (المائده: ۳)

''حرام کر دیا گیا ہے تم پر مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿حُرِّمَتْ عَلَیْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ﴾ (النساء: ۲۳)

''اور تم پر تمہاری مائیں حرام کر دی گئیں۔''

تکوینی کلمات اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہیں:

﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (الاعراف: ۱۳۷)

''اور بنی اسرائیل کے بارے میں ان کے صبر کی وجہ سے تمہارے رب کا نیک وعدہ پورا ہوا۔''

نیز رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی میں ہے:

((اَعُوْذُبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ الَّتِیْ لَا یُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ .)) [1]

''میں اللہ تعالیٰ کے مکمل کلمات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں، جن سے کوئی نیک اور بد تجاوز نہیں کر سکتا''۔

[1] حديث صحيح هے۔ مسند احمد (۳/ ۴۱۹؛ ۱۵۴۴۳) ابن اسنی (۶۳۱).

اور کلمات شرعیہ دینیہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہیں:

﴿وَ اِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ (البقره: ۱۲۴)

''اور جب رب نے چند باتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش کی تو وہ اس میں پورے اترے۔''

[اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت لکھ دی ہے:]

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ أَبَدًا)۔

''اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں؛ اور وہ بالکل ظالم نہیں ہے''۔

قرآن پاک دلالت کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کو لوگوں پر ظلم سے منزہ قرار دیا ہے، یہ مسلک اعتدال کا تقاضا ہے جو قدریہ، جبریہ کے اقوال کے بین بین ہے''۔[مختصر الصواعق المرسلة للموصلی ۱/ ۳۱۵؛ مجموع الفتاوی ۶/ ۱۲۵]

ایسا نہیں کہ جس انسان کے جس فعل کو ظلم اور قبیح قرار دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے اس کو بھی ظلم اور قبیح سمجھا جائے۔ جیسا کہ قدریہ اور معتزلہ وغیرہ کہتے ہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے مماثل ہونا لازم آتا ہے اور اس کو مخلوق پر قیاس کرنا پڑتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ رب ہیں؛ قدرت والے اور غنی والے؛ اور تمام لوگ اس کے محتاج اور مغلوب ہیں۔ نیز ظلم ایسی ممتنع چیز کا نام نہیں جو قدرت کے تحت داخل

نہیں۔جیسا کہ یہ بات متکلمین وغیرہ کہتے ہیں کہ یہ بات ممتنع ہے کہ ممکن مقدور میں ظلم ہو، بلکہ جو چیز ممکن ہے وہ اس سے ہے اگر وہ اس کو کرتا ہے تو عدل ہے اس لیے کہ ظلم تو محض اس صورت میں ہے کہ اس کے غیر سے اس کا حکم دیا گیا ہے یا اس کے غیر سے اس کو روکا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ تو اس طرح نہیں ہے۔بے شک اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا۝﴾ (طٰهٰ: ۱۱۲)

''اور جو نیکی کرے اور مومن بھی ہو تو اس کو نہ ظلم کا خوف ہوگا اور نہ نقصان کا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ۝﴾ (ق: ۲۹)

''میرے ہاں بات بدلا نہیں کرتی اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ۝﴾ (الزخرف: ۷۶)

''اور ہم نے تو ان پر ظلم نہیں کیا البتہ وہ خود ہی ظالم تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَ لَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ (الکهف: ۴۹)

''اور جو عمل کیے ہیں سب حاضر پائیں گے اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ (غافر: ۱۷)

''آج ظلم نہیں ہوگا؛ بے شک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والے ہیں۔''

اس قول کے خلاف پر دلالت کرتا ہے۔اسی قبیل سے رسول اللہ ﷺ کی روایت کردہ حدیث قدسی میں فرمان الٰہی ہے:

''اے میرے بندو! میں نے اپنے نفس پر ظلم حرام قرار دیا ہے اور تم پر بھی حرام کرتا ہوں، پس تم باہم ظلم نہ کیا کرنا۔'' [1]

یہ حدیث دو چیزوں پر دلالت کرتی ہے:

اول: اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس پر ظلم حرام کر دیا ہے، ظاہر ہے کہ ممتنع کو یوں ذکر نہیں کیا جاتا۔

دوم: اللہ تعالیٰ نے ظلم کو اپنے نفس پر حرام کرنے کی خبر اسی طرح دی ہے جس طرح یہ خبر دی ہے کہ: ﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام: ۱۳): ''اس نے اپنے نفس پر رحمت کو لکھ لیا ہے'' اس سے ان کا استدلال باطل ہو جاتا ہے کہ ظلم اس مامور سے ہوتا ہے جس کو روکا گیا ہو؛ اور اللہ تعالیٰ کا معاملہ ایسا نہیں ہے؟ ان سے کہا جائے گا: اللہ سبحانہ وتعالیٰ: ﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ ''اس نے اپنے نفس پر رحمت کو لکھ لیا ہے'' اور اپنے نفس پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے؛ اور ظاہر ہے کہ اس نے اس چیز کو اپنے نفس پر لکھا ہے یا حرام کیا ہے جس پر اس کو قدرت حاصل ہے، وہ چیز مراد نہیں جو اس پر ممتنع ہے۔

[1] مسلم ۲۵۷۷، مختصر صحیح مسلم (۱۸۸۲) (۸/ ۱۷)۔ مسند احمد (۵/ ۱۶۰).

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

﴿فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۲)

''تو اس کو نہ ظلم کا خوف ہوگا اور نہ نقصان کا۔''

سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم نے ظلم کی تفسیر یہ کی ہے: ''کسی پر دوسرے کی غلطیوں کا بوجھ ڈال دیا جائے۔ اور ہضم یہ ہے کہ اس کی نیکیوں میں کمی کی جائے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (فاطر: ۱۸)

''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بار نہ اٹھائے گا۔''

مزید برآں بے شک انسان اس ممتنع سے خائف نہیں ہوتا جو قدرت کے تحت داخل نہیں؛ کہ وہ اس سے امن کا طالب ہو۔ بلاشبہ اس سے امن چاہتا ہے جو [ظلم ہونا] ممکن ہو۔ پس جب اس کو ظلم سے یہ کہہ کر مامون کر دیا کہ: ﴿فَلَا يَخٰفُ﴾ ''اسے ڈر نہ ہوگا''۔ تو معلوم ہوا کہ وہ ممکن ہے اور اس کی قدرت کے تحت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَیَّ﴾.... إلی.... ﴿وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ٥﴾ (ق: ۲۸، ۲۹)

''ہمارے حضور میں جھگڑا نہ کرو'' ...... ''اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

اس سے مراد ایسی چیز کی نفی نہیں جس پر قدرت ہی حاصل نہ ہو؛ اور نہ ہی اس سے ممکن ہو۔ بے شک یہ اس چیز کی نفی کی ہے جو اس کی قدرت کے تحت داخل؛ اور ممکن ہے۔ ظلم یہ ہے کہ: انہیں اعمال کے خلاف بدلا جائے۔ پس ان کے عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ افعال میں سے کسی فعل منزہ نہیں؛ اور نہ ہی وہ ان کو بجالانے سے پاک ہے۔ بلکہ کسی بھی ممکن کے کرنے سے وہ منزہ نہیں؛ بلکہ اس کا ہر کام اچھا ہے اور برے فعل کی کوئی حقیقت نہیں؛ بلکہ ایسا ہونا ممتنع ہے۔ اور ممتنع کی کوئی حقیقت نہیں۔ جبکہ قرآن کریم کئی مواقع پر اس عقیدہ کے خلاف پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کی ایسے فعل سے تنزیہ بیان کی ہے جو اس کے ساتھ مناسب نہیں اور اس کے لائق نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ برے فعل سے؛ عیب دار اور مذموم فعل سے منزہ [پاک] ہے۔ جیسا کہ وہ برے اور مذموم اور عیب والے اوصاف سے پاک اور منزہ ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ٥﴾ (المومنون: ۱۱۵)

''کیا تم سوچتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔''

اللہ تعالیٰ نے بے فائدہ چیز کے پیدا کرنے سے اپنے نفس کی نزاہت اور پاکیزگی بیان کی ہے۔ اور جو شخص اس طرح کا خیال بھی کرتا ہے؛ اس کا بھی [اللہ تعالیٰ نے] انکار کیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ٥﴾ (القلم: ۳۵)

''کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی مانند کر دیں گے۔''

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ٥﴾

(ص: ۲۸)

''کیا جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کیا ہم ان کو ویسا کر دیں جو ملک میں فساد کرتے ہیں یا متقیوں کو بدکاروں جیسا کر دیں۔''

اس میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے عقیدہ کا انکار فرما رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے ان دونوں کو مساوی کرنے کو جائز کہتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہے:

﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝﴾ (الجاثیہ: ۲۱)

''کیا جو لوگ برے کام کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو ان جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے؛ اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی یہ بہت برا دعوی کرتے ہیں۔''

اس میں ان لوگوں پر رد ہے جن کے خیال میں وہ اس طرح کرتا ہے۔ اور یہ خبر دی ہے کہ یہ سوچ بری اور قبیح ہے؛ جس سے اللہ تعالیٰ منزہ ہیں۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے، اور امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں حضرت ابن عباس اور حضرت عبادہ بن صامت، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے؛ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

''اگر اللہ تعالیٰ تمام آسمان والوں، زمین والوں کو عذاب میں گرفتار کرے؛ تو وہ ان کو عذاب دے سکتا؛ اس میں وہ ظالم نہ ہوگا؛ اور اگر وہ ان پر رحم کر دے تو اس کی رحمت ان کے لیے ان کے اعمال سے بہتر ہے''۔ [1]

یہ ان احادیث میں سے ہے جن سے جبریہ استدلال کرتے ہیں۔ لیکن [یہ روایات] قدریہ کے فاسد اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی لیے وہ اس کے مقابلہ میں یا تو اس کی تکذیب کرتے ہیں یا تاویل۔ البتہ اہل سنت والجماعت ان احادیث کی بابت سب لوگوں سے بڑے خوش بخت ہیں، جو ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال اور مخلوق پر اس کی نعمتوں کی قدر کو جانتے ہیں۔ اور وہ اعتراف کرتے ہیں کہ مخلوق اس کی نعمتوں کے حقوق ادا نہیں کر سکتی؛ خواہ اس کی وجہ ان کی عاجزی ہو یا جہالت؛ یا افراط تفریط اور ضیاع؛ یا مقدور بھر شکر بجالانے میں کوتاہی؛ اگرچہ یہ بعض وجوہ کے اعتبار سے ہی ہو۔ بے شک اہل زمین وآسمان پر اللہ تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ کی جائے۔ اسے یاد رکھا جائے، بھلایا نہ جائے۔ شکر ادا کیا جائے، ناشکری نہ کی جائے۔ نیز یہ کہ محبت وانابت، توکل، خشیت، مراقبہ؛ خوف، اور امید تمام اخلاقی قدریں [اور قوتیں] اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں۔ اور اسی کے ساتھ متعلق ہوں۔ اس طرح کہ دل ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے سرشار رہے اور اس کی الوہیت میں مگن رہے؛ بلکہ ان امور میں اس کی توحید بجالائے۔ زبان اس کے ذکر سے تر رہے اور اعضاء اس کی اطاعت کے لیے وقف ہوں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ امور فی الجملہ انسان کی قدرت میں ہیں۔ لیکن نفوس اس میں بخل کرتے ہیں۔ بخل میں ان کے اتنے مختلف مراتب ہیں جن کا شمار اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ اکثر اطاعت گزار لوگوں کے نفوس ایک لحاظ سے تو بخیل ہیں اور ایک لحاظ سے بخیل نہیں ہیں۔ کہاں ہے وہ انسان جس سے ایسا ارادہ وقوع پذیر ہونا ممتنع ہوتا ہو جو اللہ تعالیٰ کی مراد اور اس کی محبوب چیز سے ٹکراؤ نہ رکھتا ہو؟۔ ایسا کون ہے جس سے کبھی مقصد تخلیق کی خلاف ورزی صادر نہیں ہوئی؟؛ بھلے وہ کسی ایک ہی وقت میں سہی؟۔ پس اگر اللہ سبحانہ تعالیٰ اپنا عدل تمام آسمان والوں اور زمین پر رکھ دے؛ تو وہ انہیں اپنے عدل سے عذاب دے گا۔ وہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں ہوگا۔

اوراس میں جو انتہاء درجے کا تصور کیا جا سکتا ہے؛ وہ بندے کا اپنے گناہ سے تائب ہونا اوراس کا اعتراف کرنا ہے۔توبہ کی قبولیت محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے۔ بصورت دیگر اگر وہ اپنے بندے کو اس کے گناہوں پر عذاب دینا چاہے؛ تو وہ ان پر ظالم نہیں ہوگا؛ بھلے اس نے توبہ بھی کر لی ہو۔لیکن اللہ تعالیٰ نے - اپنے فضل ورحمت کے مقتضی کے مطابق - اپنے نفس پر واجب کرلیا ہے کہ وہ توبہ کرنے والے عذاب میں گرفتار نہ کرے۔ یقیناً اس نے اپنے نفس پر رحمت کو واجب کرلیا ہے؛ اب تمام مخلوق کے لیے اس کی رحمت اور معافی ہی ہے۔کسی شخص کا عمل اس لائق نہیں کہ اس کی وجہ سے دوزخ سے نجات حاصل کرے یا اسے جنت میں داخلہ مل جائے۔

☼ حديث صحيح هے۔ تخريج السنة (٢٤٥).

جیسا کہ اپنے رب کی سب سے بڑی اطاعت گزار ہستی؛ عمل کے لحاظ سے سب سے افضل؛ اور اپنے رب کی تعظیم اور بزرگی میں سب سے ممتاز ہستی [جناب رسول اللہ ﷺ] نے فرمایا:

''تم میں سے کسی کو بھی اس کا عمل نجات نہیں دے سکتا''۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ﷺ کو بھی نہیں؟ ۔تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں بھی نہیں؛ ہاں یہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا فضل اپنے گھیرے میں لے لے''۔ ❶

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے گزارش کی کہ آپ مجھے ایسی دعا سکھائیں جس جو نماز میں مانگا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دعا کیجیے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِی ظُلْمًا کَثِیرًا وَّلاَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلاَّ اَنْتَ فَاغْفِرْلِی مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِی اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ)) ❷

''اے اللہ تعالیٰ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا بہت زیادہ ظلم؛ اور تیرے سوا گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں۔تو مجھے بخش دے بخشش تیرے پاس سے ہے اور مجھ پر رحم فرمایا بے شک تو ہی بخشنے والا مہربان ہے۔''

☼ متفق عليه حديث ابی هريرة.

✵ البخاری (834) مسلم (2705) من حديث ابی بكر ، مسند ابوبكر الصديق طبع المكتب الا سلامی (١٢٢).

پس جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ حال ہے- جو انبیاء ومرسلین علیہم السلام کے بعد سب سے افضل ہستی ہیں- تو کسی دوسرے کے بارے میں کیا خیال ہے؟۔ بلکہ آپ صدیق اسی لیے قرار پائے کہ آپ نے اس مقام صدیقیت کا وہ حق ادا کر دیا جو کہ معرفت الٰہی، اس کے حق اور عظمت اور جو کچھ اس کے شایان شان ہے؛ اور اللہ تعالیٰ کے بندوں پر جو حقوق ہیں؛ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرنا ہے۔لیکن اس انسان کے لیے بربادی اور رحمت الٰہی سے دوری ہے جو سمجھتا ہے کہ مخلوق اپنے رب کی مغفرت سے بے نیاز ہے؛ اور اسے اس چیز کی کوئی ضرورت نہیں۔اللہ تعالیٰ اور اس کے حقوق سے اس جہالت کا کوئی مقصد ہی نہیں؛ [اور نہ ہی اس سے بڑھ کر جہالت کی کوئی منتہاء ہے]۔اگر آپ کا ذہن اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے اتنا وسیع نہیں ہے؛ تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں جائزہ لیں؛ اور دیکھیں ان کی وجہ سے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں۔اور پھر ان نعمتوں پر شکر گزاری اور ناشکری میں موازنہ کریں؛ تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ:'' اگر اللہ تعالیٰ تمام آسمان وزمین والوں کو عذاب دیں تو ان کو عذاب دینے میں ان پر ظالم نہیں ہوں گے''۔

مردوں کے لیے ایصال ثواب:

۸۹۔((وَفِي دُعَاءِ الأَحْيَاءِ وَصَدَقَاتِهِمْ مَنْفَعَةٌ لِلْأَمْوَاتِ[1] .))

''زندوں کے دعا اور صدقہ کرنے میں مردوں کے لیے منفعت ہے''۔

[1] ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: ''شارح رحمہ اللہ نے اس پر اہل سنت والجماعت کا اتفاق نقل کیا ہے؛ اور پھر اس پر کتاب وسنت کے دلائل پیش کئے ہیں۔لیکن صدقہ سے متعلق کوئی دلیل پیش نہیں کی سوائے اس کے کہ والد کو اولاد کے صدقہ سے فائدہ پہنچتا ہے۔یہ ایک خاص دعوی ہے جو کہ مخفی نہیں ہے۔میں نے اس کی شرح اپنی کتاب ''احکام الجنائز؛ص ۱۷۳'' پر کردی ہے۔اور اس مذکورہ اجماع پر گفتگو کی ہے۔وہاں مراجع کرلیں۔

تَشْرِیح......:اہل سنت والجماعت کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ دو صورتوں میں مردے کو زندہ انسانوں کی کوششوں سے فائدہ پہنچتا ہے:

[اول]: یہ کہ مرنے والے انسان نے اپنی زندگی میں اس کا کوئی سبب قائم کیا تھا۔

[دوم]: یہ کہ مسلمانوں کا اس کے لیے دعا کرنا،استغفار کرنا؛ صدقہ کرنا؛ حج کرنا۔

حج کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس کا ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟۔محمد بن حسن رحمہ اللہ [۱۳۱-۱۸۹ھ] سے ایک روایت ہے، حج میں خرچ کا ثواب میت کو اور حج کا ثواب حج کرنے والے کو ملتا ہے۔لیکن اکثر علماء کے ہاں حج کا ثواب اس شخص کو ملے گا جس کی طرف سے حج کیا گیا ہو۔صحیح مسلک بھی یہی ہے۔ہاں عبادات بدنیہ [محضہ] روزہ،نماز،تلاوت قرآن، ذکر میں اختلاف ہے۔امام ابوحنیفہ، احمد، جمہور سلف رحمہم اللہ کا مذہب ثواب پہنچنے کا ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ کا مشہور مذہب اور امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ [ان اعمال کا ثواب] نہیں پہنچتا۔بعض اہل کلام میں سے اہل بدعت کا عقیدہ ہے کہ بالکل کسی قسم کا کوئی ثواب نہیں پہنچتا؛ نہ ہی دعا کا؛ نہ ہی کسی دوسری چیز کا۔ان کا یہ عقیدہ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں مردود ہے۔لیکن یہ لوگ متشابہ آیات سے استدلال کرتے ہیں،مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ٥﴾ (النجم : ٣٩)

''اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (یٰس:٥٤)

''اور تمہیں صرف وہی بدلہ ملے گا جو تم اعمال کرتے تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ﴾ (البقرہ: ٢٨٦)

''اسے ان اعمال کا فائدہ پہنچے گا جو اس نے کیے اور ان اعمال کا نقصان ہوگا جو اس نے کیے۔''

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے آپ نے فرمایا:

''جب ابن آدم فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے: صدقہ جاریہ؛ نیک اولاد کا دعا کرنا؛ اس کے بعد نفع دینے والا علم''۔ [1]

[1] مسلم وغیرہ من حدیث ابی ہریرہ احکام الجنائز ص (١٧٤).

اس حدیث میں آپ ﷺ نے خبر دی ہے کہ وہی عمل فائدے دے گا جس کا سبب وہ اپنی زندگی میں خود بنا تھا اور جس کا سبب وہ خود اپنی زندگی میں نہیں بن سکا؛ وہ منقطع ہو جائے گا۔ اور وہ حضرات جو صرف ان عبادات کا ثواب پہنچنے کے قائل ہیں؛ جن میں نیابت ہو سکتی ہے؛ وہ اس چیز سے استدلال کرتے ہیں: جس قسم کے اعمال میں کسی بھی طرح نیابت درست نہیں؛ جیسے: اسلام، نماز، روزہ، تلاوت قرآن ان کا ثواب کسی صورت میں بھی نہیں پہنچے گا۔ ان افعال کا ثواب صرف اسے ملے گا جو ان کو سرانجام دیتا ہے؛ اس سے دوسرے کی طرف تجاوز نہیں کرتا۔ جیسا کہ زندگی میں بھی ان افعال کو کوئی کسی دوسرے کی طرف سے سرانجام نہیں دے سکتا۔ اور نہ ہی ان میں فاعل کا نائب کوئی دوسرا بن سکتا ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں؛ آپ نے فرمایا:

''کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے نہ نماز ادا کرے نہ ہی کوئی ایک کسی ایک کی جگہ روزہ رکھے لیکن ایک روزے کے بدل اس کی طرف سے گندم کا ایک مد صدقہ کرے''۔ [1]

[1] مرفوع کی اصل کا تو علم نہیں ہے نہ نسائی میں ہے، نہ کسی دوسری کتاب میں ہے۔ البتہ نسائی نے الکبریٰ میں (٤/ ٤٢/ ١) اور مشکل الآثار طحاوی (٢/ ١٤١) میں ابن عباس سے موقوف روایت کیا ہے۔ موقوف حدیث کی سند صحیح ہے۔

میت کے سبب بننے کے بغیر اسے فائدہ پہنچنے کی دلیل کتاب اللہ؛ وسنت رسول اللہ ﷺ؛ اجماع اور قیاس صحیح سے موجود ہے۔

کتاب اللہ میں: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ﴾ (الحشر: ١٠)

''اور جو ان کے بعد آئے اور دعا کرتے ہیں ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں۔''

پس اللہ تعالیٰ نے اپنے سے پہلے والے اہل ایمان کے لیے استغفار کرنے پر ان کی تعریف کی ہے۔ اس دلیل کی روشنی میں زندوں کا استغفار کرنا مُردوں کو فائدہ دیتا ہے۔ اور مردوں کو زندہ کی دعا سے فائدہ پہنچنے پر تو امت کا اجماع دلالت کرتا ہے۔ نماز جنازہ میں میت کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ نماز جنازہ میں جو دعائیں میت کے لیے کی جاتی ہیں وہ مشہور احادیث مبارکہ میں ثابت ہیں۔ اسی طرح میت کے دفن کے بعد اس کے حق میں دعا کرنا بھی ثابت ہے۔ سنن ابو داؤد میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ جب میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو قبر پر کھڑے ہو کر فرماتے:

''اپنے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کرو اور ثابت قدمی کا سوال کرو۔ بے شک اب اس سے سوال ہو رہا ہے''۔ [1]

۞ حديث صحيح هے۔ (احكام الجنائز: ١٥٥) .

اسی طرح قبروں کی زیارت کے وقت بھی ان کے لیے دعا کرنا ثابت ہے۔ صحیح مسلم میں ہے، حضرت بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں تعلیم دیتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو یوں کہیں:

((اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَهْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ نَسْاَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَةَ)) ❶

۞ صحيح هے۔ (احكام الجنائز: ١٨٩، ١٩٠) . صحيح مسلم ٩۔

''تم پر سلام ہو اے ایمان والو مسلمانوں، آخرت کے گھر میں رہنے والو، بے شک ہم بھی اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لیے عافیت کا سوال کرتے ہیں۔''

نیز صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: ''میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا کہ جب آپ قبروں والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں تو کیا کلمات کہتے ہیں؟، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کلمات کہو:

((اَلسَّلَامُ عَلٰی اَهْلِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَیَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنَّا وَمِنْکُمْ وَالْمُسْتَاخِرِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِکُمْ لَاحِقُوْنَ)) ❶

۞ صحيح هے۔ (احكام الجنائز ١٨١، ١٨٣) . مختصر الصواعق المرسلة ١/ ٣٥٤ .

''سلامتی ہو اس دیار کے ایمانداروں اور اسلام والوں پر! اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمہارے پہلوں اور پچھلوں پر رحم فرمائے، اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو بے شک ہم تمہارے ساتھ ملنے والے ہیں۔''

صدقات کا ایصال ثواب:

صدقے کا ثواب [میت کو] پہنچتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے عرض کیا:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری والدہ اچانک فوت ہوگئی ہے؛ اس نے کچھ وصیت نہیں کی، میرا خیال ہے اگر وہ کلام کرنے کا موقعہ پاتی تو صدقہ کرنے کا کہتی۔ کیا اگر میں اس کی جانب سے صدقہ کروں تو اس کو ثواب ملے گا؟۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں؛ بالکل''۔ ❶

نیز صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ فوت ہوگئیں، وہ خود اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میری والدہ فوت ہوئیں تو میں وہاں موجود نہ تھا، اگر میں اس کی جانب سے صدقہ کروں تو اس سے اس کو فائدہ ہوگا؟۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جی بالکل''۔ انہوں نے کہا: ''میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے مقام مخراف کا باغ اس کی طرف

سے صدقہ کر دیا''۔ ❷ اس مضمون کی احادیث سنت میں کثرت کے ساتھ ہیں۔

۞ حدیث صحیح ھے۔ احکام الجنائز ص (۱۷۲) . البخاری ۱۳۸۵؛ مسلم ۱۰۰٤؛ ۱٦۳۰ .

۞ صحیح ھے؛ مخرج فی الإرواء ۹۹۳۔ اس پر تفصیل کے لیے دیکھیں: احکام الجنائز ص (۱۷۲) . البخاری ۲۷٦٥ ؛ ۲۷٦۱؛ مسلم ۱٦۳۸ .

روزے کا ایصال ثواب:

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص فوت ہو؛ اس کے ذمہ روزے ہوں؛ تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے''۔ ❶

اس مضمون کی احادیث صحیح کتب حدیث میں موجود ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ میت کی طرف سے روزے نہ رکھے جائیں؛ البتہ کھانا کھلایا جائے۔ اس کی دلیل حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اخذ کرتے ہیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس مسئلہ پر کتب فروع میں تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔

۞ حدیث صحیح ھے۔ احکام الجنائز ص (۱۲۹) . البخاری ۱۹٥۲ ؛ مسلم ۱۱٤۷ .

حج کا ایصال ثواب:

جہاں تک حج کا ثواب پہنچنے کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جہینہ قبیلہ کی ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی؛ اور عرض گزار ہوئی:

''میری ماں نے حج کی نذر مان رکھی تھی؛ لیکن وہ حج نہ کر سکی؛ اور فوت ہوگئی؛ کیا میں اس کی طرف سے حج کروں؟۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی طرف سے حج کرو؛ تمہارا کیا خیال ہے اگر تمہاری والدہ پر قرضہ ہوتا تو اسے ادا نہ کرتی؟۔ اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرو؛ اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ اس کا حق ادا کیا جائے''۔ ❶

اس مضمون کی احادیث کثرت کے ساتھ ہیں۔

۞ حدیث صحیح ھے۔ (الارواء ۹۹۳۳ ، اس کلام سے ابن قیم رحمہ اللہ نے کیا مراد لی ہے؟ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: احکام الجنائز ؛ فصل: ما ینتفع به المیت ۱۷۰ ، ۱۷۱) .

میت کی طرف سے قرض کی ادائیگی:

نیز مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ میت کی جانب سے قرض کی ادائیگی؛ اگرچہ اجنبی کی طرف سے ہو؛ میت کے ترکہ سے نہ بھی ہو؛ ہو جائے گی۔ اس پر حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ جب حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے ایک میت کے دو دینار قرض کی ذمہ داری اٹھائی۔ اس کی ادائیگی کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اب اس کا جسم ٹھنڈا ہوا ہے''۔ ❶

۞ حدیث حسن ھے (حاکم ۲/ ۵۸) (احکام الجنائز ص ۱٦) . مسند أحمد برقم ۱٤٥۲۰۔

یہ تمام احکام قواعد شرع کے عین مطابق جاری ہوتے ہیں۔ نیز خالص قیاس کا بھی یہی تقاضا ہے۔ بے شک کسی بھی نیک عمل کا ثواب عمل والے کا حق ہے۔ جب وہ اپنا حق اپنے کسی مسلمان بھائی کے لیے ہبہ کر دیتا ہے تو اس سے روکا نہیں جا سکتا، جیسا کہ اگر کوئی اپنی زندگی میں اپنا مال ہبہ کر دے؛ تو اسے نہیں روکا جا سکتا۔ وفات کے بعد اپنے مال سے بری ہونے سے روکا نہیں جا سکتا۔ یقیناً شارع علیہ السلام نے روزے کا ثواب پہنچنے سے قرأت وغیرہ عبادات بدینہ کا ثواب پہنچنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ روزہ [عبادت کی] نیت کے ساتھ نفس کو ان چیزوں سے روکنے کا نام ہے جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے ایصال ثواب پر شارع علیہ السلام کی جانب سے نص موجود ہے۔ تو قرأت قرآن کا ایصال ثواب کیوں نہیں ہوگا؟، جو کہ نیت بھی ہے اور عمل بھی [1]۔

[1]۔ [علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں]: یہ کلام محل نظر ہے؛ جو کہ غور و فکر کرنے والوں پر مخفی نہیں۔ میں نے اس مسئلہ پر ایسی تحقیق پیش کی ہے جس سے شرح صدر ہوتا اور دل ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: احکام الجنائز ؛ فصل: ما ینتفع به المیت ۱٦۸ ، ۱۷۸) اس کا مراجعہ کریں؛ یہ بہت اہم ہے۔

ایصال ثواب کے منکرین کے جوابات:

منکرین کے استدلال کا جواب: وہ [اپنی دلیل کے طور پر یہ] ارشاد ربانی پیش کرتے ہیں:

﴿وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝﴾ (النجم: ۳۹)

''اور یہ کہ انسان کو ان اعمال کا فائدہ ہوگا جو وہ کرتا ہے۔''

علماء کرام رحمہم اللہ نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں؛ ان میں سے زیادہ صحیح دو جواب ہیں:

[اول]: بے شک انسان اپنی مساعی، حسن معاشرت کے ساتھ دوستوں کا حلقہ پیدا کر لیتا ہے، اور وہ بچے پیدا کرتا ہے؛ اس کے ساتھ ساتھ وہ بیویوں سے نکاح کرتا ہے؛ لوگوں کے ساتھ بھلائی کا اور محبت بھرا سلوک کرتا ہے؛ تو یہ لوگ اس کے حق میں رحمت مانگتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں اور اس کو نیک اعمال کا ثواب ہدیہ کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہ اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بلکہ ایک مسلمان کا عقیدہ اسلام میں جملہ مسلمانوں کے ساتھ داخل ہونا؛ تمام مسلمانوں کی طرف سے اسے زندگی میں اور مرنے کے بعد فائدہ ملنے کے بڑے اور عظیم ترین اسباب میں سے ایک ہے۔ اس کے پیچھے مسلمانوں کی دعائیں اسے گھیر لیتی ہیں'' [1]۔

[1]۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: ابن ماجة ۳۰۵٦ ؛ الصحیحة ٤۰٤ .

❀ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو صاحب ایمان کے لیے اس کے مؤمن بھائیوں کی دعاؤں اور کوششوں کے نفع کے حصول کا سبب بنایا ہے۔ پس جب اس نے یہ کام کر دیا تو وہ اس نیک عمل کا سبب بن گیا جس کا ثواب اب اس کو پہنچے گا۔

[دوم:] یہ جواب پہلے جواب سے قوی ہے؛ یہ کہ قرآن پاک نے اس بات کی نفی نہیں کی کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی کوشش سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، البتہ اس بات کی نفی ہے کہ دوسرے کی کوشش کا وہ مالک نہیں بن سکتا۔ ان دونوں باتوں میں فرق کوئی مخفی چیز نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ہر شخص صرف اپنی مساعی کا مالک ہے؛ اور دوسرے کی کوشش اس کوشش کرنے والے کی ملکیت ہے؛ اگر وہ چاہے تو اپنی کوششیں کسی دوسرے کے نام کر دے۔ اور چاہے تو اپنی مساعی کو اپنی ذات کے لیے مختص رکھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ۝ وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝﴾ (النجم: ۳۸)

''کوئی نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور یہ کہ انسان کو ان ہی اعمال کا فائدہ ہوگا جو وہ کرتا ہے۔''

یہ دونوں آیات محکم ہیں؛ جن کا تقاضا رب سبحانہ وتعالیٰ کا عدل ہے۔ پہلی آیت کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو کسی دوسرے کے جرم کی وجہ سے سزا میں مبتلا نہیں کرتا۔ اور نہ غیر کے قصور پر اس سے مواخذہ کرتا ہے۔ جس طرح کہ دنیا کے بادشاہ کرتے ہیں۔ اور دوسری آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کی کامیابی اس کے اعمال پر ہے، وہ ہرگز امید نہ رکھے کہ اپنے آباؤ اجداد اور اپنے اسلاف اور مشائخ کے اعمال سے نجات حاصل کرے گا۔ جس طرح کہ اس قسم کی ناکام اور جھوٹی امیدیں بعض لوگ اپنے دل میں سمائے رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ اپنی کوشش کے علاوہ کسی کی کوشش کام نہیں آسکتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی بھی ہے:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ [وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ] ﴾ (البقرہ: ۲۸۶)

''اس کے لیے وہی فائدہ ہے جو اس نے کیا؛ اور ان اعمال کا نقصان پہنچے گا جو اس نے کیے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (یٰسٓ: ۵٤)

''اور تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق ہی بدلہ ملے گا۔''

اس آیت کا سیاق کسی انسان کو دوسرے کے عمل کی وجہ سے سزا ملنے کی نفی پر دلالت کر رہا ہے۔ مکمل آیت ملاحظہ کریں:

﴿ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (یٰسٓ: ۵٤)

''پس آج کسی جان پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور نہ تمہیں اس کے سوا کوئی بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے''۔

اور رہ گیا نبی کریم ﷺ کے اس فرمان گرامی سے استدلال کرنا کہ:

''جب ابن آدم فوت ہو جاتا ہے تو سوائے تین چیزوں کے باقی سے اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے''۔ [1]

[1] مسلم ۱٦۳۱ وغیرہ؛ حدیث صحیح ھے۔ من حدیث ابی ھریرہ احکام الجنائز ص (۱۷٤).

یہ استدلال ساقط الاعتبار ہے۔ بے شک آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ نفع اٹھانا بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس میں انسان کے اپنے عمل کے منقطع ہو جانے کی خبر دی گئی ہے۔ جبکہ کسی دوسرے کا عمل تو عامل کے لیے ہے۔ اگر وہ اپنا عمل اس کو ہبہ کر دے؛ تو عمل کرنے والے کا ثواب اس کو پہنچتا ہے۔ وہ اس کے ذاتی عمل کا ثواب تو نہیں۔ اس کی مثال اس قرض کی طرح ہے جسے کوئی انسان کسی کی طرف سے ادا کرے؛ تو وہ اس سے بریٔ الذمہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ مال اس کا ذاتی نہیں ہوتا جس سے وہ خود قرض ادا کرے۔

عبادات بدنیہ و مالیہ میں فرق؟:

جہاں تک تفریق کی بات ہے؛ تو جو لوگ مالی اور بدنی عبادات میں فرق کرتے ہیں؛ تو یقیناً نبی کریم ﷺ نے میت کی طرف سے روزہ رکھنے کو مشروع قرار دیا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ حالانکہ روزے میں نیابت جائز نہیں۔ ایسے ہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے؛ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ نے ساتھ عید الاضحیٰ کی نماز ادا کی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ کے پاس ایک

مینڈھالایا گیا؛ آپ نے اس کو ذبح کیا؛ اور فرمایا:

((بِسْمِ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ أَكْبَرُ ، اَللّٰهُمَّ هَذَا عَنِّي وَعَمَّنْ لَمْ يُضَحِّ مِنْ أُمَّتِي .))

''بسم اللہ واللہ اکبر۔ یا اللہ! یہ قربانی میری طرف سے اور میری امت کے ان لوگوں کی طرف سے ہے جنہوں نے قربانی نہیں کی''۔ ❶ رواہ احمد ۱۴۸۲۱، ابوداؤد ۲۸۱۰، ترمذی ۱۵۷۴۔

نیز دو مینڈھوں والی حدیث؛ [جس میں ہے] آپ ﷺ نے ایک مینڈھے کو ذبح کرتے ہوئے فرمایا:

''اے اللہ! میری طرف سے اور میری تمام امت کی طرف سے ہے''۔

دوسرے پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! یہ محمد اور آلِ محمد کی طرف سے ہے'' ❷۔ رواہ احمد ۲۷۱۸۳۔

❶ شواهد کے پیش نظر صحیح ہے۔ المجمع (٤/ ٢٢۔ ٢٣) الارواء الغلیل (١١٣٨) .اس کی شاہد اس کے بعد والی حدیث ہے؛ میں نے الإرواء میں اس کی تحقیق کی؛ یہ صحیح لذاتہ ہے۔ مزید تفصیل کے لیے وہاں پر صفحہ ۱۱۳۸ کا مراجعہ کر لیں۔
❷ حسن ہے۔ المسند (٦/ ٣٩۔ ٣٩٢) .

قربانی میں قربت کا کام خون بہانا ہوتا ہے۔ اس کو دوسرے کے لیے ہدیہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح حج بھی بدنی عبادت ہے۔ مال اس کا رکن نہیں ہے؛ مال تو وسیلہ ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ مکہ میں رہنے والا جب پیدل چل کر عرفات جانے کی قدرت رکھتا ہو تو اس پر حج فرض ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے مال کی شرط نہیں۔

یہی قول زیادہ ظاہر ہے کہ حج کی عبادت مال اور بدن سے مرکب نہیں؛ بلکہ محض بدنی عبادت ہے۔ جیسا کہ اس کی وضاحت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے متاخرین اُصحاب سے منصوص ثابت ہے۔ نیز فرض کفایہ امور پر نگاہ ڈالیں کہ چند انسانوں کے اس فرض کو ادا کرنے سے دوسروں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی تو اہداء ثواب ہے، یہ نیابت کے باب سے نہیں؛ جیسا کہ اجیر خاص کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی کو اپنا نائب بنائے البتہ اجرت جس کو چاہے دے سکتا ہے۔

اجرت پر قرآن خوانی کروانا اور ثواب میت کو ہدیہ کرنا:

کچھ لوگوں کو اجرت پر قرآن پاک پڑھانا اور میت کے لیے اس کا ایصال ثواب کرنا؛ ایسا فعل ہے کہ سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے کسی ایک سے بھی یہ ثابت نہیں۔ اور نہ ہی ائمہ دین میں سے کسی ایک نے اس کا حکم دیا ہے؛ اور نہ ہی اس کی رخصت دی ہے۔ نیز محض اجرت لینے کے لیے تلاوت بلا اختلاف ناجائز ہے۔ البتہ اختلاف قرآن کی تعلیم پر اجرت لینے میں ہے؛ جس میں دوسرے انسان کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ کسی عمل کا ثواب میت کو تب ہی ملے گا جب وہ عمل محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو۔ یہ عبادت تو اس کی رضا کے لیے خالص ہوئی ہی نہیں۔ اور نہ ہی اس کا کوئی ثواب ہوگا جسے میت کو ہدیہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص اس بات کا قائل نہیں کہ نماز، روزہ کے لیے کسی کو کرایہ پر رکھا جائے اور میت کو اس کا ایصال ثواب کیا جائے۔ لیکن جب کوئی کسی ایسے کو کچھ دیتا ہے؛ جو قرآن پڑھتا ہے؛ اس کی تعلیم حاصل کرتا ہے؛ اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے؛ تاکہ قرآن پڑھنے والوں کی مدد ہو جائے۔ تو یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے میت کی طرف سے صدقہ کرنا؛ تو یہ جائز ہے۔

''الاختیار''میں ہے:''اگر کوئی شخص وصیت کر جاتا ہے کہ اس کے مال سے کچھ حصہ اس شخص کو دیا جائے جو اس کی قبر پر قرآن کی تلاوت کرے؛ تو یہ وصیت باطل ہے۔ کیونکہ یہ صورت اجرت کی ہے''۔(انتھی)

نیز زاہدی رحمہ اللہ نے (القنیة ص ۱۸۷) میں ذکر کیا ہے:''اگر کوئی شخص اپنا مال ایسے لوگوں کے لیے وقف کرے جو اس کی قبر پر قرآن کی تلاوت کریں؛ تو [قبر پر تلاوت کا] تعین کرنا باطل ہے''۔

بلا اجرت تلاوت قرآن کا ایصال ثواب:

البتہ بغیر اجرت کے رضا کارانہ طور پر قرآن پاک کی تلاوت کرنا اور اس کا ثواب کا میت کو ہدیہ کرنا؛ تو یہ ثواب اس کو ایسے ہی پہنچتا ہے جیسے روزہ اور حج کا ثواب پہنچتا ہے۔

[اعتراض]: اگر کہا جائے:''یہ طریقہ سلف رحمہم اللہ میں معروف نہ تھا؛ اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی راہنمائی کی؟ تو۔

[جواب]: اگر معترض حج، روزہ، دعا کے ثواب کے ایصال کا قائل ہے؛ تو اس سے پوچھا جائے گا:''ان کے ایصال ثواب اور قرآن کی تلاوت کے ایصال ثواب میں کیا فرق ہے؟۔ سلف کا ایسا نہ کرنا عدم وصول ثواب پر حجت نہیں ہوسکتا۔ پھر ہمارے لیے نفی میں عمومیت کہاں سے آ گئی؟۔

[اعتراض]: اگر یہ کہا جائے کہ:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو روزے، حج صدقہ کے ایصال ثواب کی راہنمائی تو فرمائی ہے؛ تلاوت قرآن کے ایصال ثواب کی راہنمائی نہیں فرمائی؟۔

[جواب]: تو اسے بتایا جائے گا کہ: ان امور کے بارے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود کچھ نہیں فرمایا۔ بلکہ جب آپ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے اس کا جواب دیا ہے۔ ایک آدمی نے اپنے میت کی طرف سے حج کا پوچھا؟۔ تو آپ نے اس کی اجازت دی۔ ایک انسان نے آپ سے روزے کے بارے میں دریافت کیا؟ تو آپ نے اس کی بھی اجازت دیدی۔ دیگر چیزوں سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا۔ اور روزے کے ایصال ثواب میں؛ جو کہ صرف نیت اور نفس کو روکنے کا نام ہے؛ اور تلاوت قرآن اور ذکر کے ایصال ثواب میں کون سا فرق ہے؟۔

[اعتراض]: اگر دریافت کیا جائے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہداء ثواب کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

[جواب]: بعض متاخرین نے اس کو مستحب کہا ہے۔ اور ان میں سے کچھ حضرات اس کو بدعت خیال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسا نہیں کرتے تھے۔ اور اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہر اس شخص کے ثواب کے برابر ثواب ثابت ہے جو آپ کی امت میں سے نیک عمل کرتا ہے۔ اور عمل کرنے والے کے ثواب میں کچھ کمی نہیں آتی۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی امت کو تمام نیکی کے کام بتائے ہیں اور اس طرف راہنمائی کی ہے۔

لیکن جو کوئی کہتا ہے:''میت کے پاس قرآن پڑھا جائے تو میت کو فائدہ پہنچتا ہے؛ اس اعتبار سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتا ہے؛ تو یہ قول کسی مشہور امام سے صحت کے ساتھ مروی نہیں۔ اس کے سننے میں تو کچھ شک نہیں؛ لیکن اس کے سننے سے فائدہ حاصل ہوگا؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن پاک کے سننے کا ثواب زندگی کے ساتھ مشروط ہے۔ بے شک یہ ایک اختیاری عمل تھا؛ جو اس کی موت کے

ساتھ ہی منقطع ہو گیا۔ بلکہ بعض اوقات تو اسے نقصان پہنچتا ہے اور تکلیف ہوتی ہے؛ اس لیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی اطاعت نہ کی تھی؛ یا اس لیے کہ اس نے نیکی کا زادِ راہ نہیں اپنایا تھا۔

قبر پر قرآن پڑھنے میں علماء کا اختلاف:

قبروں کے پاس قرآن پڑھنے کے مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے؛ اس میں تین مشہور اقوال ہیں:

۱۔ ایسا کرنا مکروہ ہے۔ ۲۔ ایسا کرنے میں کچھ حرج نہیں۔

۳۔ دفن کے بعد ایسا کرنا مکروہ ہے۔ دفن کے وقت اس میں کچھ حرج نہیں۔

جو حضرات اس کو مکروہ کہتے ہیں؛ جیسے امام ابو حنیفہ، اور امام مالک رحمہما اللہ؛ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ایک روایت میں؛ یہ حضرات فرماتے ہیں: ''ایسا کرنا اس لیے بدعت ہے کہ سنت میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ نیز قرآن پڑھنا نماز کے مشابہ ہے۔ اور قبرستان میں نماز ادا کرنے سے روکا گیا ہے۔ اسی طرح تلاوت قرآن سے بھی روکا جائے گا۔

اور جو حضرات کہتے ہیں: ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ جیسے امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ؛ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ دوسری روایت میں۔ ان کا استدلال حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی وصیت ہے۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر دفن کے بعد سورۃ بقرہ کے شروع اور آخر کی آیات پڑھی جائیں۔ نیز بعض مہاجرین رضی اللہ عنہم اجمعین سے سورہ بقرہ کی تلاوت بھی منقول ہے'' [1]۔

☼ حدیث ضعیف ہے۔ احکام الجنائز (۱۹۳)۔ اس کی سند میں مجہول راوی ہیں؛ یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ اس میں مجھے ''المہاجرین'' کا لفظ نہیں ملا؛ بلکہ ''الانصار'' کا لفظ ہے۔ یہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے؛ اور اس کا ثابت ہونا محل نظر ہے۔

اور جو حضرات کہتے ہیں: صرف دفن کے وقت اس میں کوئی حرج نہیں؛ یہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت ہے؛ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض مہاجرین رضی اللہ عنہم اجمعین سے منقول اثر سے یہ مسئلہ لیا ہے۔ ہاں اس کے بعد؛ جس طرح کہ قبر پر لوگ تلاوت قرآن کے لیے آتے جاتے رہتے ہیں، تو ایسا کرنا مکروہ ہے؛ سنت میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ ہی اصل میں سلف صالحین رحمہم اللہ علیہم سے کوئی ایسی بات منقول ہے۔ یہ قول دلیل کے لحاظ سے قوی ہے۔ اس لیے کہ اس میں دونوں روایتوں میں جمع و تطبیق ہو جاتی ہے۔''

[دعاؤں کی قبولیت اور حاجات کی برآوری]

۹۰۔((وَاللّٰهُ تَعَالیٰ يَسْتَجِيْبُ الدَّعْوَاتِ وَيَقْضِی الْحَاجَاتِ .))

''اور اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں اور ضرورتیں پوری فرماتے ہیں''۔

تَشْرِیح......: ارشاد ربانی ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (غافر: ٦٠)

''اور تمہارے رب نے اعلان کیا کہ تم مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرہ: ١٨٦)

''اور جب میرے بندے آپ سے میری بابت پوچھیں بے شک میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار کو جب وہ پکارتا ہے، قبول کرتا ہوں۔''

مسلمانوں کی اکثریت نیز دیگر تمام مذاہب اور ملتوں کا عقیدہ ہے کہ فوائد کے حصول اور نقصان دہ چیزوں سے بچاؤ کا مضبوط ذریعہ/سبب دعا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے متعلق خبر دی ہے کہ سمندر میں سفر کرتے ہوئے جب انہیں خطرہ لاحق ہوتا تو وہ اخلاص کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے تھے۔ نیز یہ کہ بے شک انسان پر جب کوئی بھی مصیبت آتی ہے تو وہ پہلو کے بل؛ بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کی دعاؤں کو قبول فرمانا؛ خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر؛ اور اللہ تعالیٰ ان کے سوال کو پورا فرمانا؛ اور اللہ تعالیٰ کے ان کو روزی دینے؛ اور ان کی معاونت کرنے کی جنس سے ہے۔ بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مطلق ربوبیت کا تقاضا بھی یہی ہے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ دعا اس کے حق میں فتنہ اور نقصان دہ ہوتی ہے؛ جب اس کا کفر و فسق اس کا تقاضا کرتا ہے۔ سنن ابن ماجہ (۳۸۲۷) میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو جاتا ہے''۔ [1]

[1] حدیث صحیح ہے۔ مشکوٰۃ (۲۲۳۸)۔ مستدرك حاكم (١/ ٤٩١). البته (ابو صالح خوزی) کے بارے میں صاحب تقریب نے کہا ہے: ضعیف حدیث والا ہے۔ البتہ حاکم نے (٤٩١) میں اس حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا، ذہبی نے خاموشی اختیار کی، ترمذی نے کہا ہم اس حدیث کو صرف اسی طریق سے جانتے ہیں۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

الرب يغضب إن تركت سؤاله   وبنی آدم حين يسال يغضب

''اگر اللہ تعالیٰ سے آپ سوال نہ کریں تو ہو ناراض ہو جاتا ہے، جب کہ انسان سے اگر سوال کیا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔''

ابن عقیل رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ دعا کریں؛ اس سے اللہ تعالیٰ کی چند صفات کا اثبات مقصود ہے:

اول: اللہ تعالیٰ کے وجود کا اثبات؛ اس لیے کہ جس کا وجود نہ ہو؛ اسے نہیں پکارا جاتا۔

دوم: اللہ تعالیٰ کا غنی اور بے نیاز ہونا۔ اس لیے کہ فقیر سے تو کچھ نہیں مانگا جاتا۔

سوم: اللہ تعالیٰ کا سمیع ہونا [صفت سمع کا اثبات]۔ بے شک بہرے کو نہیں پکارا جاتا۔

چہارم: اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی: بے شک بخیل سے نہیں مانگا جاتا۔

پنجم: اللہ تعالیٰ کی رحمت: سخت دل سے نہیں طلب کیا جاتا۔

ششم: اللہ تعالیٰ کی قدرت۔ عاجز [اور بے اختیار] سے دعا نہیں کی جاتی۔

اور جو لوگ اشیاء میں طبیعات [نیچر] کا عقیدہ رکھتے ہیں؛ وہ جانتے ہیں کہ: آگ کو نہیں کہا جا سکتا تم رک جاؤ۔ اور نہ ہی ستارے سے کہا جا سکتا ہے کہ میرے مزاج کی اصلاح کرو۔ اس لیے کہ چیزیں ان کے ہاں اپنی طبیعت کے لحاظ مؤثر ہیں؛ انہیں کچھ اختیار حاصل نہیں۔ [پس اللہ تعالیٰ نے] اسی لیے دعا اور نماز استسقاء مشروع ٹھہرائی ہے؛ تاکہ نیچر پرست لوگوں کے جھوٹ کو واضح کیا جائے۔

دعاء کے متعلق کچھ لوگوں کی بدگمانی اور اس پر رد:

بعض خود ساختہ فلاسفہ اور غالی قسم کے خود ساختہ صوفیاء کا خیال ہے کہ دعا میں کچھ فائدہ نہیں۔ ان کا کہنا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ کی چاہت مطلوب کے وجود کا تقاضا کرتی ہے تو دعا کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر مشئیت یہ تقاضا ہی نہیں کرتی؛ تو دعا کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان میں سے بعض نے دعا نہ کرنے کو مخصوص عارفین کا خاصہ قرار دیا ہے؛ اور دعا کو مقام خواص تک رسائی کی علت کہا ہے۔ یہ ان کے بعض شیوخ/علماء کی غلطی ہے۔ جس طرح اس عقیدہ کی خرابی دین اسلام میں ضرورت کے تحت معلوم شدہ ہے؛ اسی طرح ضرورت عقلی کی روشنی میں بھی اس کی خرابی واضح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دعاء کی منفعت پر تمام امتوں کا تجربات کی روشنی میں اتفاق ہے۔ حتی کہ فلاسفہ کہتے ہیں: ''عبادت گاہوں میں اٹھتی ہوئی مختلف زبانوں میں آوازیں ان گرہوں کو کھول کر رکھ دیتی [یعنی مشکلات ختم کر دیتی] ہیں جنہیں افلاک اور مؤثرات نے بند کر رکھا ہوتا ہے''۔ وہ بھی یہ بات کہتے ہیں؛ حالانکہ وہ مشرک ہیں۔

ان کے شبہ کا جواب ان کے ان دونوں ان مقدمات کے غلط ہونے پر ہے؛ کہ اللہ تعالیٰ کی مشئیت (چاہت) اس کا تقاضا کرتی ہے یا نہیں کرتی؟۔ اور پھر یہاں ایک تیسرا مقدمہ ہے؛ کہ مشئیت الٰہیہ مطلوب کے وجود کا تقاضا ایک شرط کے ساتھ کرتی ہو؛ اور اس شرط کے عدم کی صورت میں اس مطلوب کو واجب نہ کرتی ہو۔ اور کبھی دعا کرنا بھی اس کی شرط میں سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ [یہ شرط] نیک عمل کے ساتھ ثواب کو واجب کرتی ہے۔ اگر عمل صالح نہ ہو تو ثواب بھی واجب نہیں کیا جاتا۔ اور جس طرح کہ کھانا، پینا سیرابی کو واجب کرتا ہے؛ ان کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اولاد کا حصول؛ وطی کے ساتھ؛ اور زراعت کا حصول کاشتکاری کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس

جب یہ مان لیا جائے کہ تقدیر الٰہی میں ہے دعا کرنے سے مطلوب کام ہو جائے گا؛ تو پھر یہ کہنا درست نہیں کہ دعا کا کوئی فائدہ نہیں۔ جیسے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کھانے پینے؛ کاشتکاری کرنے اور دیگر اسباب کا کچھ فائدہ نہیں۔ پس ان لوگوں کا قول جس طرح شریعت کے خلاف ہے؛ اسی طرح عقل اور فطرت کے بھی خلاف ہے۔

جان لینا چاہیے کہ: علماء کی ایک جماعت نے یہ جو اسباب کی طرف التفات کرنا توحید میں شرک کہا ہے؛ اور اسباب کو اس لیے ختم کرنا کہ وہ اسباب ہیں؛ یہ عقل میں کمی کا نتیجہ ہے۔ اور اسباب سے بالکل ہی اعراض کرنا [منہ موڑ لینا] درحقیقت شریعت پر قدح / طعنہ زنی ہے۔ توکل اور امید کا معنی یہ ہے کہ: یہ امور وجوب توحید اور عقل اور شریعت کے باہم میل سے ہی تشکیل پاتے ہیں [1]۔

[1] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: الإحياء للغزالی ٤/ ٢٤٢ ؛ ابن جوزی و غیرهما ۔ کما قاله ابن تیمیة رحمه الله منهاج السنة ٥/ ٣٦٦۔

اس کی تفصیل یہ ہے: کسی سبب کی طرف التفات کرنا؛ دل اس پر اعتماد کرنے؛ اس سے امید وابستہ کرنے اور اس پر مکمل سہارا کرنے کا نام ہے۔ مخلوقات میں کوئی بھی چیز اس کا استحقاق نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ وہ مستقل / آزاد نہیں۔ بلکہ اس کے لیے اضداد اور شرکاء کا ہونا ضروری ہے۔ اور تمام امور کے ساتھ وہ سبب اس وقت تک مسخر نہیں ہو سکتا جب تک مسبب الاسباب اس کو مسخر نہ کر دے [اسے آسان اور تابع نہ کر دے]۔ [-مجموع الفتاوی ٨/ ١٦٩]

ان کا یہ کہنا کہ: ''اگر مشیئت الٰہیہ مطلوب کا تقاضا کرتی ہے تو دعا کی ضرورت نہیں؟۔

ہم کہتے ہیں: '' [یہ کلیہ غلط ہے] بلکہ یقیناً اس کی بارگاہ میں دعا کی ضرورت ہوتی ہے؛ تاکہ کوئی دوسرا مفاد / مصلحت جلد یا بدیر حاصل ہو؛ یا کسی دوسری نقصان دہ چیز کو جلد یا بدیر ختم کیا جا سکے۔

اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ: ''اگر مشیئت الٰہیہ مطلوب کا تقاضا نہیں کرتی تو دعا کا کچھ فائدہ نہیں۔

ہم کہتے: دعا کے تو بہت بڑے فوائد ہیں۔ جیسے منافع کا حصول؛ نقصان سے بچاؤ [وغیرہ]۔ نبی کریم ﷺ نے ہمیں اس سے آگاہ فرمایا ہے۔ بلکہ دعا سے جلد حاصل ہونے والا فائدہ: بندے کو رب کی معرفت حاصل ہونا؛ اور اس کا اقرار کرنا ہے۔ اور یہ کہ بے شک اللہ تعالیٰ سمیع و قریب ہیں؛ قدیر اور علیم اور رحیم ہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے فقر و نیازمندی اور بے چارگی کا اقرار کرنا ہے۔ اور اس کے بالتبع اعلیٰ قسم کے علوم اور پاکیزہ کیفیات کا حصول ہوتا ہے جو کہ سب سے بڑی مطلوب و مقصود چیزوں میں سے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ: ''اللہ تعالیٰ کا کسی کو عطیہ کرنا اس کے فعل کے ساتھ معلل [علت پر منحصر] ہے۔ جیسے سوال کیا گیا شخص جب سائل کو کچھ دیتا ہے تو کہا جاتا ہے: سائل اس پر اثر انداز ہوا؛ حتی کہ اس نے اسے نواز دیا۔ [اس کا سوال پورا کر دیا۔]

ہم کہتے ہیں: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہی انسان میں دعا کی طرف حرکت پیدا کی۔ لہٰذا اس خیر کی ابتداء بھی اسی کی طرف سے ہے اور اسی پر اس کو پورا کرنا بھی ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

'' مجھے دعا کی قبولیت کی فکر نہیں ہوتی۔ مجھے تو بس دعا کا خیال ہی دامن گیر رہتا ہے۔ اور جب مجھے دعا کا الہام ہو جاتا ہے تو دعا کی قبولیت بھی اس کے ساتھ ہی ہوتی ہے''۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے:

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾

(السجده : ۵)

''وہ آسمان سے زمین کی طرف معاملات کی تدبیر کرتا ہے، پھر وہ (معاملہ) اس کی طرف ایسے دن میں اوپر چڑھ جاتا ہے جس کی مقدار ہزار سال ہے، اس (حساب) سے جو تم شمار کرتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ تدبیر کا آغاز وہی کرتا ہے؛ پھر تدبیر شدہ امور اسی کی جانب چڑھ جاتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جو بندے کے دل میں دعا کی تحریک پیدا کرتی ہے اور اِس کو اُس خیر کا سبب بناتی ہے جو وہ اپنے بندے کو عطا کرتا ہے۔ جیسا کہ اعمال صالحہ اوران کے ثواب کا مسئلہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہی بندے کو توبہ کی توفیق دی؛ اور پھر اس توبہ کو قبول بھی کیا۔ اور وہی ہستی بندے کو عمل کی توفیق دیتی ہے؛ اور پھر اس پر ثواب سے نوازتی ہے۔ اور اسی نے بندے کو دعا کی توفیق دی؛ اور پھر اس کو قبول بھی فرمایا۔ پس مخلوقات میں سے کوئی بھی چیز خود کچھ بھی اثر نہیں رکھتی؛ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے سبب کو سبب بنایا ہے۔ مطرف بن عبداللہ بن شخیر رحمہ اللہ [۸۷ھ] ائمہ تابعین میں سے ایک ہیں؛ آپ فرماتے ہیں: ''میں نے اس معاملہ میں اچھی طرح غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا آغاز اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے؛ اور اس کو پورا کرنا بھی اللہ تعالیٰ پر ہی ہے۔ پس میں نے دیکھا کہ سب سے جامع چیز دعا ہی ہے''۔

[مانگنے والے کو مطلوبہ چیز نہ ملنے یا کچھ اور ملنے کی حکمت کا بیان]:

یہاں پر ایک مشہور سوال پیدا ہوتا ہے؛ کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں انہیں کچھ نہیں دیا جاتا؛ یا وہ مانگتے کچھ ہیں؛ اور انہیں کچھ اور ملتا ہے؟۔ تو اس اشکال کے کئی جواب دیے گئے ہیں؛ جن میں سے تین بڑے محققانہ جوابات ہیں:

پہلا جواب: مذکورہ آیت قرآنی مطلق عطیہء سوال کو متضمن نہیں؛ بے شک یہ آیت داعی کے جواب کو متضمن ہے۔ داعی [دعا کرنے والا] سائل [سوال کرنے والا] سے زیادہ عام ہے۔ ایسے ہی داعی کو جواب دینا [دعاء کی قبولیت]؛ سائل کو نوازنے سے زیادہ عام ہے۔ اسی لیے ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''ہمارا رب سبحانہ وتعالیٰ ہر رات دنیاوی آسمان کی طرف اترتا ہے اور اعلان فرماتا ہے: ''ہے کوئی جو مجھ سے دعا کرے میں اس کی دعا قبول کروں؟ ہے کوئی جو مجھ سے سوال کرے میں اس کو عطیہ دوں؟۔ اور جو کوئی مجھ سے مغفرت طلب کرے، میں اس کو معاف کردوں''۔ ❶

☼ صحيح متواتره وقد ذكرت بعض طرقه في إرواء الغليل (٤٥٠)۔

تو معلوم ہوا کہ دعا کرنے اور سوال کرنے والے میں فرق ہے۔ نیز دعا قبول کرنے اور عطیہ دینے میں فرق ہے۔ اور یہ فرق عموم اور خصوص کا ہے۔ حدیث مذکورہ میں [سائل] کے بعد استغفار کرنے والے کا ذکر کیا ہے وہ بھی ایک قسم کا سائل ہے۔ لیکن [استغفار سوال سے زیادہ خاص ہے]۔ اس میں پہلے عام کا ذکر ہے پھر خاص کا اور پھر خاص الخاص کا۔

پس جب بندوں کو یہ علم ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں؛ وہ دعا کرنے والے کی دعا قبول فرماتے ہیں؛ تو وہ جان لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے قریب ہے اور وہ اس سے سوال کرسکتے ہیں۔ نیز اس کے علم اس کی رحمت اور قدرت کو بھی معلوم کرلیتے ہیں۔ تو کبھی وہ اللہ تعالیٰ سے عبادت کے انداز میں اور کبھی سوال کے انداز میں دعا کرتے ہیں؛ اور کبھی ان دونوں کو جمع کرتے ہیں۔ اس لیے کہ لفظ دعا

عبادت اور استعانت [یعنی سوال] دونوں کو شامل ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (غافر: ۶۰)

''اور تمہارے رب نے اعلان کیا کہ تم مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا۔''

کی تفسیر دعا سے کی گئی ہے؛ جو کہ درحقیقت عبادت ہے؛ اور وہ دعا جو طلب ہے؛ اس کے بعد [ہے] ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي﴾ (غافر: ۶۰)

''بے شک وہ لوگ جو مجھ کو پکارنے سے روگردانی کرتے ہیں۔'' یہ فرمان گرامی پہلے معنی کی تائید کرتا ہے۔

دوسرا جواب: اجابت دعائے سوال اس نسبت سے عام ہے کہ انسان جو کچھ مانگتا ہے؛ اس کو وہی مل کر رہے۔ اس کی تفسیر نبی کریم ﷺ نے بیان فرمائی ہے؛ جیسا کہ مسلم کی حدیث میں ہے؛ فرمایا:

''جو شخص بھی اللہ تعالیٰ سے ایسی دعا کرتا ہے جس میں گناہ کا کام نہ ہو؛ اور نہ ہی قطع رحمی ہو؛ تو اس کو اس کے بدلہ میں تین عطایا میں سے ایک عطیہ دیا جاتا ہے: ۱۔ یا تو بہت جلد اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ ۲۔ یا اس کے لیے اس کے مثل خیر کا ذخیرہ کر دیا جاتا ہے۔ ۳۔ یا اس سے اس کے مثل شر اور برائی کو دفعہ کر دیا جاتا ہے''۔

صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! تو پھر ہم زیادہ سے زیادہ دعا کریں گے''۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے پاس اس بھی زیادہ ہے''۔ [1]

پس اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ الصادق المصدوق نے خبر دی ہے کہ جو دعا زیادتی سے پاک ہے یا تو اس کا سوال بہت جلد پورا ہو جاتا ہے؛ یا اس جیسی ہی چیز بعد میں ملتی ہے؛ یا اس کی مثل اس سے کسی برائی کو روک لیا جاتا ہے۔

☼ حدیث صحیح ہے لیکن مسلم میں نہیں ہے۔ البتہ مسند احمد ۳/ ۱۸ میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نیز امام حاکم ۱/ ۴۵۳۔ اور ذہبی رحمہ اللہ نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔ [بعد کی تحقیق میں آپ فرماتے ہیں:] امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اختصار کے ساتھ روایت کی ہے (۲۷۳۵)؛ اور امام الترمذی (۳۸۵۹) نے پوری تفصیل کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس میں تیسری خصلت یہ بیان ہوئی ہے کہ: ''یا اس کی دعا کی مقدار میں اس کے گناہ مٹا دیے جاتے ہیں''۔ الضعیفه (٤٤٨٣).

تیسرا جواب: دعا تو ایک سبب ہے جو مطلوب کے حصول کا تقاضا کرتا ہے۔ اور سبب کے کچھ شروط اور موانع ہوتے ہیں۔ جب شروط پوری ہوں اور موانع نہ ہوں؛ تو مطلوب حاصل ہو جاتا ہے۔ وگرنہ مطلوب حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے بجائے کوئی دوسری چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تمام پاکیزہ کلمات اور ان مسنون اذکار کا حال ہے جن پر فوائد کا حصول یا نقصان دہ چیزوں کا دفع کرنا معلق ہے۔ بے شک ان کلمات کی حیثیت کسی کاریگر کے ہاتھ میں آلہ کی طرح ہے؛ اور یہ آلہ قوت اس کے معاون امور کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوتا ہے۔ کبھی اسباب کا ٹکراؤ موانع میں سے کسی مانع / رکاوٹ سے ہو جاتا ہے۔ وعد و وعید کی نصوص میں بظاہر تعارض اسی باب سے تعلق رکھتا ہے۔ پس آپ اکثر و بیشتر زیادہ دیکھ سکتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے دعائیں کیں ان کی دعائیں قبول ہو گئیں۔ دراصل دعا میں صاحب دعا کی ضرورت اور اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ باہمی ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ دعا سے پہلے کی جانے والی نیکی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ دعا کی قبولیت کو اس کی نیکی کی قدر دانی کے طور پر لیتے ہیں۔ اور کبھی دعا کرتے ہوئے قبولیت کی گھڑی آ جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی اسباب ہوتے ہیں جن کی بنا پر اس کی دعا منظور

کر لی جاتی ہے۔اس سے دعا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ دعا میں اصل راز یہی ہے۔اور وہ دیگر ان اسباب کو چھوڑ دیتا ہے جو اس وقت دعا کرنے والے کو پیش تھے۔

اس کی مثال اس طرح ہے جیسے ایک شخص فائدہ بخش دواء مناسب وقت میں استعمال کرتا ہے،اور اس کو فائدہ ہو جاتا ہے۔اس سے دوسرا شخص یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ فلاں دوا کا صرف استعمال کرنا ہی مطلوب کے حصول میں کافی ہے؛اور وہ غلطی کا شکار ہو جاتا ہے۔اسی طرح کوئی شخص بیچارگی کے عالم میں کسی قبر کے قریب دعا کرتا ہے؛اور وہ دعا قبول ہو جاتی ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ اصل راز اس قبر میں ہے۔اور وہ یہ نہیں جانتا کہ اصل راز اس کی بے چارگی اور صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف میلان میں ہے۔بس جب یہ کیفیت اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی بھی گھر میں پیدا ہو جائے؛تو یہ اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب اور افضل ہے۔

پس دعائیں اور تعوذات والے کلمات نیز[شرعی]دم؛دراصل ان کی حیثیت ہتھیار کی ہے۔ہتھیار کا اثر اس کے مارنے والے پر منحصر ہے۔صرف ہتھیار کی دھار کے ساتھ نہیں۔پس جب بھی ہتھیار مضبوط اور کامل ہو؛اس کے چلانے والے کا بازو بھی مضبوط ہو؛اور اس کے استعمال کی جگہ اس ضرب کے قابل ہو؛اور کوئی رکاوٹ بھی نہ ہو؛تو اس سے دشمن کا سر کچلا جائے گا۔اور جب بھی ان تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز مفقود ہوگی؛تو ہتھیار کی وہ تاثیر نہ رہے گی۔پس جب دعا بذات خود درست نہ ہو؛یا بوقت دعا داعی کی زبان اور دل میں ہم آہنگی نہ ہو؛یا کوئی مانع/رکاوٹ موجود ہو تو دعا کا کچھ اثر نہ ہوگا''۔[الجواب الكافی ٢٤]

[اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مخلوق کی حاجت مندی]

۹۱۔((وَيَـمْلِكُ كُلَّ شَيْءٍ وَلَا يَمْلِكُهُ شَيْءٌ وَلَا غِنَى عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰى طَرْفَةِ عَيْنٍ وَمَنِ اسْتَغْنَى عَنِ اللّٰهِ طَرْفَةِ عَيْنٍ فَقَدْ كَفَرَ وَصَارَ مِنْ أَهْلِ الْحِيْنِ .))

''اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے اس کی مالک کوئی چیز نہیں،اللہ تعالیٰ سے پلک جھپکنے کے برابر بھی بے نیازی نہیں ہو سکتی،جو شخص آنکھ جھپکنے کے برابر(وقت)اللہ تعالیٰ سے مستغنی ہوا وہ کافر ٹھہرا؛اور ہلاکت پانے والوں میں سے ہو گیا''۔

تشریح......:نہایت واضح اور سچا کلام ہے اس میں کچھ چیز مخفی/پوشیدہ نہیں ہے۔

[اللہ تعالیٰ کی صفات رضا اور غضب]

۹۲۔((وَاللّٰهُ تَعَالیٰ يَغْضِبُ وَيَرْضَ لاَ كَأَحَدٍ مِنَ الْوَرٰى① .))

''اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور خوش ہوتا ہے لیکن کسی مخلوق کی طرح نہیں''۔

①۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: اس میں ان متأولین اشاعرہ میں سے معطلہ اور دیگر پر رد ہے جو کہتے ہیں: بغض اور رضا سے مراد احسان کا ارادہ کرنا ہے۔ ہائے افسوس! کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ صفت ارادہ کی طرح اس صفت کو بھی تسلیم کر لیتے۔ تأویل کرتے ہوئے ان دو صفات کا انکار کرنا؛ کہ بندے میں یہ دو صفات پائی جاتی ہیں؛ تو انہوں نے ان کے بارے میں بھی ارادہ والی توجیہ کیوں نہ پیش کی۔ ان کا جب عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس ارادہ کے برعکس ہے جو بندے میں پایا جاتا ہے۔ اگر چہ ان دونوں میں ایسی حقیقت پائی جاتی ہے جو ان سے موصوف کے مناسب ہے۔ شارح رحمہ اللہ نے اس کی تفصیل بیان کی ہے؛ وہاں پر اس کا مراجع کر لیا جائے۔

تَشرِیح......:ارشاد ربانی ہے:

﴿رَّضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ﴾ (التوبہ: ١٠٠)

''اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدۡ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ يُبَايِعُوۡنَكَ تَحۡتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح: ١٨)

''یقیناً اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيۡهِ﴾ (المائدہ: ٦٠)

''جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور اس پر غضب کیا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ لَعَنَهٗ﴾ (النساء: ٩٣)

''اور اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا اور اس پر لعنت کی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (البقرہ: ٦١)

''وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ لوٹے۔'' اس قسم کی آیات کثرت کے ساتھ ہیں۔

تمام سلف صالحین اور ائمہ کرام رحمہم اللہ کا مسلک اللہ تعالیٰ کے لیے اوصاف ناراض ہونا، راضی ہونا، دشمنی، دوستی، محبت، بغض اور

ان جیسی دوسری وہ صفات جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں؛ ان تمام کو ثابت ماننا ہے۔ان اوصاف کی ایسی تاویل کرنا منع ہے جو ان صفات کو ان حقائق سے پھیر دیں جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات کے لائق ہیں۔ جو عقیدہ اللہ تعالیٰ کی صفت سمع اور بصر اور کلام کے بارے میں ہے؛ یہی عقیدہ باقی تمام اوصاف میں بھی ہے۔جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے بھی اس مسئلہ کی طرف سابقہ اوراق میں اشارہ کیا ہے جہاں یہ ذکر ہے:''...... جب رؤیت باری تعالیٰ میں تأویل کرنا؛ اور ہر اس وصف میں تأویل کرنا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے؛ تو اس کی تاویل کو ترک کرنا [بلا کیفیت] اس کی تسلیم کو لازم پکڑنا مسلمانوں کا عقیدہ ہے......''۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے اس جواب پر غور کیجیے؛ جب ان سے پوچھا گیا: صفت استواء کیسے ہے؟۔

تو آپ نے فرمایا:''اللہ تعالیٰ کا مستوی ہونا معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے''۔

نیز حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اسی مضمون کی موقوف روایت بھی ہے؛ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع روایت بھی موجود ہے [1]۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے بھی سابقہ اوراق میں ذکر کیا ہے کہ:''جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں نفی اور تشبیہ سے پرہیز نہ کیا وہ گمراہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کو نہ پا سکا''۔

نیز امام طحاوی رحمہ اللہ کے قول کا ذکر آگے آئے گا کہ:''اسلام غلو اور تقصیر؛ تشبیہ اور تعطیل کے درمیان راہ اعتدال کا نام ہے''۔

[1] مرفوع ثابت نہیں۔

اسی طرح شیخ رحمہ اللہ کا یہ قول:''وہ کسی مخلوق کی مثل نہیں''؛ بھی تشبیہ کی نفی میں ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ:''رضامندی سے مراد احسان کا ارادہ کرنا؛ اور غضب سے مراد انتقام کا ارادہ کرنا ہے۔ یہ صفت کی نفی ہے۔ جبکہ اہل سنت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس چیز کا حکم دیتے ہیں جسے وہ پسند کرتے ہیں؛ اور اس پر راضی ہوتے ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ اس کا ارادہ نہیں کرتے؛ اور نہ ہی اسے چاہتے ہیں۔ اور اس چیز سے روکتے ہیں جس سے وہ ناراض ہوتا ہے اور اسے ناپسند کرتا ہے؛ اور اس سے بغض رکھتا ہے؛ اور اس کے کرنے والے پر ناراض ہوتے ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو چاہا ہو اور اس کا ارادہ کیا ہو۔ پس ان کے ہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ ایسی چیزوں کو محبوب جانتے ہیں اور ان سے راضی ہوتے ہیں جس کو وہ نہیں چاہتے؛ اور ایسی چیزوں کو برا جانتے ہیں اور ان پر ناراض ہوتے ہیں؛ جن کا اس نے ارادہ کیا ہو۔

جو لوگ غضب اور رضا کی تاویل [ارادۂ ناراضگی اور] ارادۂ احسان سے کرتے ہیں؛ ان سے پوچھا جائے گا: آپ یہ تاویل کیوں کرتے ہیں؟۔ تو وہ لازمی طور پر جواب میں کہیں گے کہ:''غضب دل کے خون کے جوش مارنے کا نام ہے؛ اور رضا میلان اور شہوت کا نام ہے۔ اور یہ امور اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں ہیں۔

تو ان سے کہا جائے گا:''انسان میں دل کے خون کا جوش مارنا ایسی چیز ہے جو غضب کی صفت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ [یہ جوش مارنا] خود غضب نہیں۔ مزید برآں ان سے یہ بھی کہا جائے گا:''اسی طرح ہم میں ارادہ اور مشیئت کا معاملہ بھی ہے۔ یعنی کسی زندہ کا کسی چیز کی طرف مائل ہونا؛ یا ایسی چیز کی طرف رجحان ہونا جو اس کے ساتھ مناسب ہو؛ اور اس سے جوڑ [موافقت] رکھتی ہو۔ بے شک ہم میں زندہ لوگ صرف وہی چیز چاہتے ہیں جس سے اسے فائدہ حاصل ہو یا اسے نقصان سے بچائے۔ ہو تو انسان جس چیز کا ارادہ کرتا ہے؛ وہ اس کا محتاج اور ضرورت مند ہے۔ اس کے وجود کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا ہے اور معدوم ہونے پر کمی ہوتی ہے۔ وہ معنی

جس کی جانب آپ نے لفظ کا رخ موڑا ہے؛ وہ بھی اس معنی کی طرح ہے جس سے آپ نے اس لفظ و معنی کو بدلا ہے، دونوں برابر ہیں۔ یعنی اگر یہ جائز ہے تو وہ بھی جائز ہے۔ اور اگر یہ ناجائز ہے تو وہ بھی ناجائز ہے۔

اگر وہ کہیں: ''جس ارادہ کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ موصوف ہیں؛ وہ اس ارادہ کے برعکس ہے جس کے ساتھ بندہ موصوف ہوتا ہے۔ اگر چہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی حقیقت ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ: ''بے شک وہ ناراضگی اور رضا مندی جو کہ اللہ تعالیٰ کا وصف بیان کیا جاتا ہے؛ وہ بندے کے اوصاف کے برعکس ہے۔ اگر چہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی حقیقت ہے۔ پس جو کچھ وہ ارادہ کے بارے میں کہتے ہیں؛ وہی بات صفات کے بارے میں کہنا بھی ممکن ہے۔ تو پھر تأویل کی ضرورت نہیں پڑے گی؛ بلکہ اس کو ترک کرنا واجب ہو جائے گا۔ بے شک ایسا کرنے سے ہی آپ تناقض سے بچ سکتے ہیں؛ اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اسماء اور صفات میں بلا موجب تعطیل سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ بے شک قرآنی الفاظ کو بغیر کسی [مقتضی/موجب] سبب کے اس کے ظاہر سے موڑنا حرام ہے۔ اور صرف عقل اس معنی کو چھوڑنے/ بدلنے کا موجب نہیں ہو سکتی؛ اس لیے کہ عقول کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ ہر انسان کی عقل دوسرے انسان کی عقل کے خلاف راہ دیکھاتی ہے۔

یہ رد ہر ایسے انسان پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی بھی صفت کی نفی اس لیے کرتا ہے کہ اس صفت کا مسمیٰ مخلوق میں ممتنع ہے۔ [اور جس کا کہنا ہے] بے شک یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایسی چیز ثابت کی جائے جو ان کے ہاں عام معلوم/تصور شدہ وصف کے خلاف ہو۔ حتی کہ وجود کے وصف میں بھی۔ بے شک انسان کا وجود ویسے ہے جیسے اس کے لائق ہے؛ اور اللہ تعالیٰ کا وجود جیسے اس کی ذات کے لائق ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے وجود پر عدم محال ہے۔ لیکن مخلوق کے وجود پر عدم محال نہیں۔ اور وہ اسماء جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے رکھے ہیں؛ بعض مخلوقات کو بھی وہی نام دیے ہیں۔ مثلاً: حی، علیم، قدیر۔ اور اپنے کچھ ایسے اوصاف بیان فرمائے ہیں: جیسے غضب، رضا؛ اور اپنے بعض بندوں کے بھی یہی اوصاف بیان کئے ہیں۔ تو ہم دل کی بصیرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حق میں ان اسماء کو سمجھتے ہیں۔ بے شک یہ حق؛ ثابت اور موجود ہیں۔ اسی طرح ہم مخلوق کے حق میں بھی ان اسماء کے معانی سمجھتے ہیں۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان دونوں معانی میں ایک قدر مشترک ہے؛ لیکن خارج میں یہ معنی مشترک نہیں۔ اس لیے کہ مشترک معنی کلی کا وجود صرف ذہن میں ہی ہوتا ہے، خارج میں مختص معین ہی ہوتا ہے۔ تو ان میں سے ہر ایک [کے لیے اس کی صفت] کو ایسے ہی ثابت مانا جائے گا جیسے اس کی شان کے لائق ہے۔ بلکہ اگر کہا جائے: ''دوزخ کے داروغہ مالک کا غضب؛ اور کسی دوسرے فرشتے کا غضب؛ اس کے لیے ضروری نہیں کہ ان کی غضب [ناراضگی] کی کیفیت انسانوں کے غضب کی کیفیت جیسی ہی ہو۔ اس لیے کہ فرشتے اخلاط اربعہ [چار تکوینی عناصر] سے خالی ہیں؛ کہ ان کے دلوں کا خون بھی جوش مارے۔ جیسے غصہ میں انسانی دل کا خون جوش مارتا ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی زیادہ اولی ہے [کہ اس کی کوئی مماثلت و مشابہت نہ ہو]۔

جہم بن صفوان اور اس کے ہمنواؤں نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ان تمام اوصاف کی نفی کی ہے جو اس نے اپنی ذات کے لیے بیان کئے ہیں؛ جیسے: اللہ تعالیٰ کا کلام، رضا، غضب محبت، بغض؛ افسوس کرنا اور دیگر صفات۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ سب اوصاف مخلوق ہیں؛ اور اللہ تعالیٰ سے الگ ہیں۔ وہ بذات خود ان میں سے کسی ایک چیز سے بھی موصوف نہیں۔ ان کے مقابلہ میں قائلین صفات ابن کلاب

[۲۴۵ھ] اور اس کے ہمنواء ہیں؛ وہ کہتے ہیں: اصل میں اللہ تعالیٰ کو کسی ایسی چیز سے موصوف نہیں کیا جا سکتا جس کا تعلق اس کی مشیئت اور قدرت کے ساتھ ہو۔ بلکہ یہ تمام امور صفات اس کی ذات کے ساتھ لازم قدیم اور ازلی ہیں۔ پس ایسا نہیں کہ وہ کسی وقت راضی ہوتا ہو؛ اور کسی وقت میں راضی نہیں ہوتا؛ اور نہ ہی کبھی غصہ ہوتا ہے اور کبھی غصہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حدیث شفاعت میں ہے:

''بیشک میرا رب آج اتنا ناراض ہوا ہے کہ اس سے پہلے اتنا کبھی ناراض نہیں ہوا تھا اور نہ اس کے بعد کبھی اتنا ناراض ہوگا''۔ ❶

❶ متفق علیه۔ حدیث ابی هریرة۔ مسند احمد (۲/ ۴۳۵)۔ ظلال الجنة فی تخریج السنة (۸۱۱). البخاری ۴۷۱۲ ؛ مسلم ۱۹۴۔

نیز بخاری، مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائیں گے: اے جنت والو! وہ جواب دیں گے:

"لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَ سَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكِ"

''اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں اور خیر تیرے دونوں ہاتھ میں ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: کیا تم خوش ہو؟

وہ جواب دیں گے: ''اے رب! ہم خوش کیوں نہ ہوں، جب کہ تو نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو اپنی کسی مخلوق کو نہیں دیا''۔

پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیا میں تمہیں اس سے افضل چیز نہ عطا کروں؟

وہ کہیں گے: اے رب! اس سے زیادہ بہتر کون سی چیز ہے؟۔

تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''میں تم پر اپنی رضا کو اتارتا ہوں اس کے بعد میں کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا''۔ ❶

❶ حدیث صحیح هے۔ مقفق علیه۔ صحیح الجامع الصغیر (۱۹۰۸). البخاری ۶۵۴۹ ؛ مسلم ۲۸۲۹۔

اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ اپنی رضا مندی کو وقتاً فوقتاً اتارتے ہیں۔ اور بے شک کبھی اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ہوتی ہے؛ اور پھر وہ ناراض ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ کبھی اپنی ناراضگی اتارتا ہے پھر راضی بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن ان [اہل جنت] پر ایسی رضا مندی کو نازل کی ہے جس کے بعد کوئی ناراضگی نہ ہوگی۔

اور کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ اپنی مشیئت سے کلام نہیں کر سکتے، نہ ہی جب چاہیں ہنستے ہیں؛ اور نہ ہی جب وہ چاہیں تو ناراض ہو سکتے ہیں؛ اور نہ راضی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یہ حضرات یا تو رضا، غضب، محبت اور بغض کو یا تو ارادہ کہتے ہیں؛ یا ان کو دیگر صفات قرار دیتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان میں سے کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کی مشیئت (چاہت) اور قدرت کے ساتھ تعلق نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ یہ چیز اگر اس کے ساتھ تعلق رکھتی ہو؛ تو وہ محل حوادث [تخلیق کی جگہ] ٹھہرے گا۔ پس اس اصول کی بنیاد پر وہ لوگ صفات فعلیہ ذاتیہ [فعلی ذاتی صفات] کی نفی کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان لوگوں نے صفات کی مطلق نفی یہ کہہ کر کر دی تھی کہ: ''اللہ تعالیٰ اعراض کا محل نہیں''۔ یہ کہا جا سکتا ہے: بلکہ یہ تو افعال ہیں؛ انہیں حوادث نہیں کہا جا سکتا۔ جیسا کہ ان کو صفات کہتے ہیں اعراض نہیں کہتے۔ ان معانی کی طرف اشارہ پہلے گزر چکا ہے۔ لیکن شیخ طحاوی رحمہ اللہ نے اپنے مختصر رسالہ میں صفات کی بحث کو ایک جگہ پر جمع نہیں کیا۔ یہی حال مسئلہ تقدیر اور کچھ دوسرے مسائل کا ہے ان میں آپ نے ترتیب کا اہتمام نہیں کیا۔ ہاں اصول دین کی کتاب کو جس نہایت عمدہ ترتیب میں مرتب کیا جا سکتا

ہے، وہ نبی کریم ﷺ کے ان جوابات پر مشتمل ہے جو آپ نے جبرئیل علیہ السلام کو دیئے ہیں۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے ایمان کے متعلق سوال کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تیرا اللہ تعالیٰ پر اس کے فرشتوں اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں، آخرت کے دن پر اور تقدیر پر ایمان ہو، ......''۔ ❶

❁ بخاری، مسلم۔

تو وہاں پر پہلے توحید اور صفات اور ان سے متعلق امور کی بحث ہے؛ پھر اس کے بعد بالترتیب فرشتوں وغیرہ کی بحث ہے...... ......الخ۔

[اصحاب رسول اللہ ﷺ کی ثنا خوانی:]

[ثناء صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین میں وارد نصوص]

۹۳۔((وَنُحِبُّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ وَلاَ نُفْرِطُ فِي حُبِّ أَحَدٍ مِنْهُمْ ① وَلاَ نَتَبَرَّأُ مِنْ أَحَدٍ مِنْهُم ② وَنَبْغِضُ مَنْ يَبْغِضُهُمْ وَبِغَيرِ الْخَيرِ يَذْكُرُهُمْ وَلاَ نَذْكُرُهُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ وَحُبُّهُمْ دِيْنٌ وَإِيْمَانٌ وَإِحْسَانٌ وَبُغْضُهُمْ كُفْرٌ وَنِفَاقٌ وَطُغْيَانٌ .))

''رسول اللہ ﷺ کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ❸ سے محبت رکھتے ہیں۔ کسی کی محبت میں غلو نہیں کرتے نہ کسی سے تبری کرتے ہیں۔ نیز ہم ان سے دشمنی رکھتے، ہیں جو ان سے دشمنی رکھتے ہیں اور انہیں اچھے الفاظ سے یاد نہیں کرتے نیز ہم ان کا ذکر خیر ہی کرتے ہیں۔ ان سے محبت کرنا دین ❹، ایمان احسان ہے اور ان سے دشمنی رکھنا کفر، نفاق، سرکشی ہے''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یعنی ان میں سے کسی ایک کی محبت میں حد سے تجاوز نہیں کرتے؛ اور نہ ہی ان کے معصوم ہونے کا دعوی کرتے ہیں جیسا کہ شیعہ کرتے ہیں؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ حضرات کو معصوم کہتے ہیں۔

② ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جیسا کہ روافض کرتے ہیں؛ ان کے نزدیک برأء کے بغیر ولاء کا تصور بھی نہیں؛ یعنی کوئی اس وقت تک حضرات اہل بیت رضی اللہ عنہم اجمعین سے دوستی کا اظہار نہیں کرسکتا جب تک وہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما پر تبرأ نہ کرلے۔ جبکہ اہل سنت والجماعت ان سب سے محبت اور دوستی رکھتے ہیں؛ اور ان میں سے ہر ایک کو عدل و انصاف کے ساتھ اس کے اس مقام پر رکھتے ہیں جس کے وہ مستحق ہیں؛ نہ کہ ھوس اور خواہشات نفس اور تعصب کے ساتھ۔

❸ ۔شرعی اصطلاح میں: ''صحابی وہ ہے جس نے نبی کریم ﷺ سے ایمان کی حالت میں ملاقات کی ہو؛ اور اسی پر اس کی موت واقع ہوئی ہو''۔ الإصابة في تمييز الصحابة ۱/ ۱٦۔

یہ معنی و تعریف جمہور علمائے سلف و خلف کی اختیار کردہ ہے۔ صحبت [صحابیت] کے وصف کے ثبوت میں اس سے زیادہ کوئی شرط بیان نہیں کی گئی۔ نہیں لمبے عرصہ کی صحبت؛ نہ ہی آپ کے ساتھ کسی غزوۃ میں شراکت؛ اور نہ ہی آپ سے حدیث کا روایت کرنا۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صحابی وہ ہے جس نے نبی کریم ﷺ کو اسلام کی حالت میں دیکھا ہو؛ اگرچہ اسے صحبت کیلئے لمبا زمانہ میسر نہ بھی آیا ہو اور بھلے اس نے کوئی بھی حدیث روایت نہ کی ہو؛ جمہور علمائے سلف و خلف نے اسی معنی و تعریف کو اختیار کیا ہے''۔ [اختصار علوم الحديث مع الباعث الحثيث ۱/ ٤۹۱۔]

حضرت امام أحمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ہر وہ انسان جس نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک مہینہ صحبت میں گزارا ہو یا ایک سال' یا ایک دن؛ یا ایک گھنٹہ؛ یہ صرف آپ کو [ایمان کی حالت میں] دیکھا ہو؛ تو اس کے لیے بھی اس وقت کے حساب سے شرف صحبت حاصل ہے''۔[الکفایة في علم الروایة ۵۱۔]

امام بخاری رحمہ اللہ صحیح البخاری میں فرماتے ہیں: ''جس نے بھی رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں کچھ وقت گزارا ہو؛ یا صرف آپ ﷺ کو دیکھا ہو؛ وہ آپ کے صحابہ کرام میں سے ہے''۔[امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب باندھا ہے:"الباب الأول من كتاب فضائل الصحابة ۳/ ۵۔ اس كے الفاظ يه هيں:باب فضائل اصحاب النبي ﷺ ومن صحب النبي ﷺ أو راه من المسلمين فهو من أصحابه۔]

لغت کے اعتبار سے صحبت کا یہ معنی متفق علیہ ہے۔اس لیے کہ اس میں کسی ایک چیز کا دوسری چیز سے مقارنہ کرنے اور اس کے قریب لانے کا معنی لیا جاتا ہے۔

❹ ۔دراوی کہتا ہے: سلف صالحین رحمہم اللہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے محبت کو سب سے بڑی فضیلت اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔اور وہ کسی دوسرے عمل کو اس کے برابر نہیں سمجھتے تھے۔امام ابونعیم نے اپنی کتاب ''الحلیة'' میں حضرت بشر بن حارث رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے' آپ فرمایا کرتے تھے: ''اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں میرا سب سے زیادہ پختہ [اور پر امید] عمل أصحاب رسول اللہ ﷺ کی محبت ہے۔''[شرح اصول اعتقاد اہل السنة والجماعة ۸/ ۳۳۸۔]

نیز آپ نے حضرت شعیب بن حرب رحمہ اللہ سے یہ بھی روایت کیا ہے؛ فرمایا: ''عاصم بن محمد رحمہ اللہ کی مجلس میں حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کا ذکر کیا گیا؛ اور ان کے مناقب شمار کیے جانے لگے۔ یہاں تک کہ تقریباً پندرہ مناقب شمار کیے گئے تو عاصم بن محمد رحمہ اللہ نے پوچھا: کیا تم لوگ اپنی گفتگو سے فارغ ہو گئے؟[کہا جی ہاں۔تو فرمایا:] مجھے ایک ایسی منقبت کا بھی علم ہے جو ان تمام سے افضل ہے؛ وہ یہ کہ: آپ کا سینہ أصحاب محمد ﷺ کے لیے بالکل صاف تھا۔''[شرح اصول اعتقاد......۸/ ۱۲۴۰۔]

قبیصہ بن عقبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کے تمام صحابہ سے محبت کرنا سنت [ایمان] ہے۔''[شرح اصول أعتقاد أہل سنة ۷/ ۱۲۴۰۔]

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی فرمایا ہے کہ: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے محبت فرض ہے''۔[الجمهرة ، ص: 3]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل سے وہ شخص واقف ہو سکتا ہے جو عہد نبوی ﷺ میں ان کے تعامل اور اس کے بعد کی زندگی پر گہری نظر ڈالے۔صحابہ کرام وہ عظیم شخصیات تھے جو ایمان، کفار سے جہاد و قتال، اشاعت دین، قیام دین، اعلائے کلمۃ اللہ؛ احکامات الٰہی و نبوی کی تعمیل، فرائض اور سنن نبوی کی تعلیم و تعلم میں ایک دوسرے سے سبقت لینے کی کوشش کرتے تھے۔اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نہ ہوتے تو ہرگز دین کی کوئی اصل یا فرع ہم تک نہیں پہنچ سکتے۔اور نبی کریم ﷺ کی کسی حدیث یا سنت سے ہم ہرگز واقف نہیں ہو سکتے تھے۔اس لیے جو شخص صحابہ کے حوالے سے طعنہ زنی و گستاخی سے کام لے وہ پوری طرح دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے چونکہ جو شخص صحابہ کو گالیاں دے کر طعنہ زنی کرتا ہے وہ اپنے اس عقیدے کا اظہار کرتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین غلط راستے پر تھے اور قرآن پاک اور احادیث میں ان کے جتنے اوصاف مذکور ہیں یہ لوگ ان تعریفوں کی تردید کرتے ہیں۔ یہ قرآن وحدیث کا انکار ہے۔ جو شخص صحابہ پر طعن کرتا ہے دراصل وہ آپ ﷺ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتا ہے۔نصوص شریعت کے ناقلین کی توہین و گستاخی درحقیقت نصوص (قرآن وسنت) کی توہین ہے۔ یہ بات ہر اس شخص کے لیے قابل فہم ہے جو تدبر کا اہل اور نفاق و کفر اور الحاد سے دور ہو۔حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے محبت ذخیرہ ءآخرت ہے۔اللہ کی رحمت ہو اس شخص پر جو أصحاب رسول ﷺ پر سلام و درود بھیجے''۔

اس کی اصل دلیل یہ حدیث مبارکہ ہے: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((من أحب الأنصار فبحبي أحبهم ، ومن أبغض الأنـصـار فبـبُغْضِـي أَبْغَضَـهُـمْ .)) ''جو انصار سے محبت کرتا ہے، وہ میرے ساتھ محبت کے باعث ان سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے، وہ میرے ساتھ بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے''۔[یہ روایت طبرانی میں ثقہ راویوں سے مروی ہے۔][(المجمع: ۱۰/ ۳۹، عبدالرزاق: ۱۱/ ۵۹)]

علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حکم تمام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں بھی ہے کہ ان سے محبت ایمان کی نشانی ہی؛ اور ان سے بغض نفاق کی علامت ہے۔[(عمد القاری: ۱/ ۱۵۲۔)]

تشریح:......شیخ رحمہ اللہ روافض اور نواصب کا اشارہ کر رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی تعریف کی ہے، ان سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے اور ان سے جنت کا وعدہ کیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ (التوبہ: ۱۰۰)

''مہاجرین و انصار میں سے سابقین اولین؛ اور احسان کے ساتھ کی پیروی کرنے والے، اللہ ان سے خوش ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ

سے خوش ہوئے اور ان کے لیے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں ہیں اور ہمیشہ ان میں رہیں گے یہ بڑی کامیابی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا﴾ (الفتح: ۲۹)

''محمد رسول اللہ؛ اور آپ کے ساتھی کافروں پر بہت سخت اور آپس میں رحمدل ہیں آپ ان کو دیکھیں گے: رکوع اور سجدہ میں [1]۔''

[1] ۔ یہ سیّدنا علی رضی اللہ عنہ ہیں، وہ اپنے دینی بھائیوں کے حالات سے باخبر ہیں، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو قریب سے دیکھا ہے۔ میری نگاہ میں ان سا کوئی نہیں ہے۔ وہ صبح کو پراگندہ حال اٹھتے تھے۔ ان کی راتیں بارگاہ الٰہی میں قیام وقعود اور رکوع و سجود کرتے گزرتی تھیں۔ وہ تمام رات بارگاہ ایزدی میں پیشانیوں کو رگڑ رگڑ کر اپنی عاجزی کا اللہ کے سامنے اظہار کیا کرتے تھے۔ مناجات سے ان کی راتیں آباد ہوا کرتی تھیں۔ ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان کثرت سجود کی وجہ سے نشان بن گئے تھے۔ اللہ کے عذاب کے خوف اور اس کے ثواب کی امید میں قیام کی وجہ سے ان کی کمریں ایسے خمیدہ ہوگئی تھیں جیسے شدید ہوا کے وقت پیڑ جھک جاتا ہے۔'' (نهج البلاغة، خطبه نمبر ۹۷) [نهج البلاغة: ۱۴۳۔ ومن كلام فی وصف بنی امية وحال الناس فی دولتهم]

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح: ۱۸)

''یقیناً اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے راضی ہوا جب وہ درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ (الانفال: ۷۲)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا؛ وہ اور جنہوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝﴾ (الحديد: ۱۰)

''جس شخص نے تم میں سے فتح سے پہلے خرچ کیا اور لڑائی کی؛ ان کا درجہ ان سے بڑھ کر ہے جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور جہاد کیا اور اللہ تعالیٰ نے سب سے نیک وعدہ کیا ہے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ ان سے واقف ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا

الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (الحشر ۸، ۱۰)

''ان فقراء مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکالے گئے، وہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور رضا مندی چاہتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، وہی لوگ سچے ہیں۔ اور جنھوں نے ان سے پہلے اس گھر میں اور ایمان میں جگہ بنا لی ہے، وہ ان سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کی طرف آئیں اور وہ اپنے سینوں میں اس چیز کی کوئی خواہش نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دی جائے اور اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں سخت حاجت ہو؛ اور جس کو نفس کی بخیلی سے بچا لیا گیا؛ یقیناً وہی لوگ کامیاب ہونے والوں میں سے ہیں۔ اور ان کے لیے جو بھی جو ان کے بعد آئے؛ وہ دعا کرتے ہیں: ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو معاف فرما جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں اور مومنوں کے لیے ہمارے دل میں کینہ وحسد نہ پیدا ہونے دے اے ہمارے رب آپ بڑے مہربان رحم کرنے والے ہیں۔''

یہ آیات مہاجرین اور انصار اور ان لوگوں کی تعریف وثناء کو شامل ہیں جو ان کے بعد آئے وہ ان کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں؛ اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کے دلوں میں ان حضرات کے لیے حسد وبغض نہ ڈالے۔ نیز یہ آیات اس حکم کے بیان کو شامل ہیں کہ: مال فئے کے بھی حق دار ہیں''۔[منهاج السنه ۲/ ۱۷]

جس شخص کے دل میں ایمان والوں کے بارے میں کینہ ہو؛ اور نہ وہ ان کے لیے استغفار کرتا ہے تو اسے قرآن پاک کی روشنی میں مال فئے میں سے کچھ حصہ نہ ملے گا۔ بخاری ومسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی بات پر جھگڑا تھا اس بنیاد پر حضرت خالد بن ولید نے انہیں کچھ برا بھلا کہا؛ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا تَسُبُّوْا أَحَداً مِنْ أَصْحَابِيْ فَإِنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَّا أَدْرَكَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَ لَا نَصِيْفَهُ.)) ❶

''میرے کسی ایک صحابی کو برا بھلا مت کہو، بے شک اگر تم میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر ڈالے تو ان کے ایک مٹھی غلہ کے برابر بھی نہیں ہو سکتا اور نہ ان کے آدھے مد کے برابر''۔[منهاج السنه ۲/ ۲۰]

❶ حديث صحيح هے۔ مسلم من حديث ابی هريره ايضاً۔ ظلال الجنة (۹۸۸۔ ۹۹۱)۔

امام مسلم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے کا ذکر کرنے میں منفرد ہیں؛ بخاری کی روایت میں یہ نہیں۔

پس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور اس جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ فرما رہے ہیں کہ: ''تم میرے صحابہ کو برا بھلا نہ کہو''۔ اس لیے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سابقین اولین میں سے ہیں؛ جو فتح مکہ سے قبل مسلمان ہوئے اور انہوں نے جہاد کیا، یہی حضرت بیعت رضوان والے ہیں۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیعت رضوان کے بعد مسلمان ہونے والوں سے زیادہ خاص اور افضل ہیں۔ یعنی صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہوئے؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل مکہ سے صلح کر لینے کے بعد۔ ان میں سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ یہ ان حضرات کی نسبت سابق ہیں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ جو لوگ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے انہیں طلقاء (آزاد) کا نام دیا گیا۔ ان میں حضرت ابوسفیان [۵۷ ق ھ-۳۱ ھ] اور ان کے دونوں بیٹے حضرت یزید اور معاویہ [۲۰ ق ھ-۶۰ ھ]

رضی اللہ عنہم اجمعین بھی شامل ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ جنہیں آخر میں صحابی ہونے کا شرف حاصل ہوا؛ انہیں ان لوگوں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا جو ان سے پہلے اسلام لائے اور صحبت کے شرف سے باریاب ہوئے تھے۔اس لیے کہ ان کو صحبت میں وہ امتیازی شرف حاصل ہے جس میں کسی دوسرے کا شریک ہونا ممکن نہیں۔حتی کہ اگر ان میں سے کوئی صحابی احد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کردے تو وہ ان [سابقین] کی [خرچ کردہ] ایک مٹھی اور نصف مٹھی کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔پس جب حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہونے والوں کا یہ حال ہے؛ تو پھر ان لوگوں کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے مقابلہ میں کیا حال ہوگا جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی فہرست میں نہیں ہیں۔رضی اللہ عنہم اجمعین۔

سابقون اولون۔مہاجرین اور انصار۔میں سے وہ حضرات ہیں جنہوں نے فتح مکہ سے قبل اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔ بیعت رضوان میں شریک تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین ان میں سے شمار ہوتے ہیں۔ان کی تعداد چودہ (۱۴) سو کچھ زائد ہے۔بعض کا قول ہے کہ سابقون اولون وہ صحابہ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی جانب نماز ادا کی ہے؛ یہ قول کمزور/ضعیف ہے [1]۔

☼ تفصیل کے لیے ۔مجموعی الفتاوی لابن تیمیه (٤/ ٣٩٨) کا مطالعه کریں۔

اس لیے کہ صرف منسوخ قبلہ کی طرف نماز ادا کرنا تو کوئی فضیلت کی بات نہیں؛ اس لیے کہ قبلہ کو منسوخ کرنا ان کا اپنا فعل نہیں۔ مزید برآں اس فضیلت پر کوئی شرعی دلیل بھی دلالت نہیں کرتی جیسے جہاد؛ انفاق فی سبیل اللہ اور درخت کے نیچے بیعت کی طرف سبقت لے جانے کی فضیلت پر دلائل موجود ہیں''۔ [1]

☼ تفصیل کے لیے ۔منهاج السنة لابن تیمیه (٢/ ٢٦) کا مطالعه کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ جو حدیث روایت کی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ستاروں کی مانند ہیں،ان میں سے تم جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔'' [1]

☼ یه حدیث بالکل لغو هے۔ احادیث موضوعه۔ الضعیفة والموضوعة برقم (٥٧)۔

یہ حدیث ضعیف ہے۔امام بزار رحمۃ اللہ علیہ [۲۹۲ھ] فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں؛ اور نہ ہی یہ کسی معتمد کتب احادیث میں موجود ہے۔اور صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: فرماتے ہیں:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا، کچھ لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بے حرمتی کرتے ہیں، حتی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی معاف نہیں کرتے''؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:'' تم اس پر تعجب کیوں کر رہے ہو؛ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وفات کے بعد ان کا عمل منقطع ہوگیا تھا؛ تو اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ثواب تو منقطع نہ ہو''۔ [1]

☼[منهاج السنة لابن تیمیه:٢/ ٢٢]۔ یہ حدیث میرے نزدیک غریب ہے۔مزید تعجب اس بات پر ہے کہ اسے صحیح مسلم کی طرف منسوب کردیا ہے میں نے اس کی تلاش میں امکانی وسائل استعمال کیے لیکن مجھے یہ حدیث مسلم میں نہیں مل سکی، دیگر حدیث کے مصادر کی مراجعت سے ابھی تک میسر نہیں آسکی۔البتہ بندہ مدینہ منورہ کے سفر ارادہ رکھتا ہے چند سال بعد جب مسلم کی تلخیص سے فارغ ہوا تو مجھے یقین حاصل ہوگیا کہ یہ حدیث مسلم میں نہیں ہے ان دنوں صحیح بخاری کے دقیق علمی ومنہجی اختصار میں مشغول ہوں۔

نیز ابن بطہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ انہوں نے فرمایا:

''تم اصحاب رسول رضی اللہ عنہم اجمعین پر دشنام طرازی نہ کیا کرو؛ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے استغفار کرنے کا حکم دیا ہے؛ اور وہ

جانتا تھا کہ وہ آپس میں لڑیں گے''۔[مسند أحمد / الفضائل ۱۸؛ ۱۷٤۱]

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے؛ فرمایا:

''تم اصحاب رسول رضی اللہ عنہم اجمعین پر دشنام طرازی نہ کیا کرو؛ ان کا ایک ساعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں گزارنا تمہارے چالیس سال کے عمل سے بہتر ہے۔'' ❶

✿ حدیث صحیح هے۔ الظلال (۱۰۰٦)۔

اور وکیع رحمہ اللہ [۱۶۲ھ] کی روایت میں ہے کہ: ''تمہاری عمر بھر کی عبادت سے بہتر ہے''۔[منہاج السنہ ۲/ ۲۱]

نیز بخاری مسلم میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي ، ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ؛ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ؛۔ قَالَ عِمْرَانُ : فَلاَ أَدْرِي : أَ ذَكَرَ بَعْدَ قَرْنِهِ قَرْنَينِ أَوْ ثَلاثَةً .))

''میرے زمانہ کے لوگ بہترین ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے، عمران کو قول ہے مجھے علم نہیں کہ آپ نے اپنے دور کے بعد دو دور یا تین دور کا ذکر فرمایا۔'' ❶

✿ حدیث صحیح هے۔ السنة لابن ابی عاصم (۱٤٦۸۔ ۱٤۷۲)۔ الاحادیث الصحیحة (٦۹۹)۔البخاری ۲٦۵۱ ؛ ۲٦۵۲ ۔ مسلم ۲۵۳۵ ؛ ۲۵۵۳۔ صحیح ابن حبان ۷۲۲۹۔

نیز صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: بے شک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لاَ يَدْخُلُ النَّارَ أَحَدٌ؛ بَايَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ .))

''جن لوگوں نے درخت کے نیچے بیعت کی، ان میں سے کوئی دوزخ میں داخل نہیں ہوگا۔''

(حدیث صحیح هے/ 2۔مسلم؛ کتاب فضائل الصحابة ، باب من فضائل أصحاب الشجرة ح [۲٤۹٦])

نیز ارشاد ربانی ہے:

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾(التوبه : ۱۱۷)

''یقیناً اللہ نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین اور انصار پر جو مشکل کی گھڑی میں پیغمبر کے ساتھ رہے۔''[منہاج السنہ ۲/ ۲۰]

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جو وصف بیان کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے وہ فرماتے ہیں:

''جب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں پر نظر ڈالی تو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو بہترین پایا۔ تو اسے اپنی ذات کے لیے منتخب کر لیا اور اپنی رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کے بعد بندوں کے قلوب پر نظر ڈالی تو صحابہ کرام کے دلوں کو تمام لوگوں کے دلوں سے بہترین پایا؛ سو انہیں اپنے برگزیدہ پیغمبر کی صحبت کے لیے منتخب کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر بنا دیا تاکہ اس کے دین کی خاطر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ پس جس کام کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہے اور جس کام کو مسلمان برا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی برا ہے''۔ ❶

✿ حسن موقوف روایت ہے۔ مسند طیالسی ۲۴۶، مسند احمد، سند حسن ہے حاکم ۳/ ۷۸؛ نے صحیح کہا، ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے۔ اور زبان پر اس امر فوع ہونا مشہور ہے؛ اس کی سند میں کذاب راوی ہے۔ صحیح اس کا موقوف ہونا ہے۔ اس کی تخریج الضعیفہ میں ہو چکی ہے۔ الضعیفه (۵۳۲ ، ۵۳۳)۔

نیز ایک روایت میں ہے کہ محمد ﷺ کے تمام صحابہ کی رائے یہ تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا جائے، نیز عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول پہلے گزر چکا ہے (جو شخص تم سے کسی کی اقتداء کرنا چاہتا ہے تو وہ فوت شدہ لوگوں کی اقتداء کرے) شیخ کے اس بیان کے ساتھ: (......ہم سنت اور جماعت کی اتباع کرتے ہیں......)۔

پس اس سے بڑا گمراہ کون ہوسکتا ہے جس کے دل میں اہل ایمان میں سے بہترین لوگوں؛ انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد اولیاء اللہ کے سرداروں کے متعلق بغض موجود ہو؟۔ بلکہ ایسے انسان پر یہود و نصاریٰ کو بھی ایک وجہ سے فضیلت حاصل ہے۔ یہودیوں سے پوچھا گیا: ''تمہاری ملت میں کون لوگ سب سے افضل ہیں؟۔

تو انہوں نے جواب دیا: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب''۔

اور عیسائیوں سے پوچھا گیا: ''تمہاری ملت میں کون لوگ سب سے افضل ہیں؟۔

تو انہوں نے جواب دیا: ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب افضل ہیں''۔

اور روافض سے دریافت کیا گیا: سے پوچھا گیا: ''تمہاری ملت میں کون لوگ سب سے برے ہیں؟۔

تو انہوں نے جواب دیا: ''محمد ﷺ کے اصحاب سب سے برے ہیں''۔[منهاج السنه ۲/ ۲۷]

ان میں سے معدود چند افراد کے علاوہ کسی کو نہیں بخشا؛ اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو وہ سب وشتم کا نشانہ بناتے ہیں، وہ ان سے ایسے صحابہ بھی ہیں جو ان دوسروں سے بدرجہا بہترین ہیں جن پر وہ سب وشتم نہیں کرتے۔

نیز امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: ((وَلَا نُفْرِطُ فِي حُبِّ أَحَدٍ مِنْهُمْ .))

''ہم ان میں سے کسی کی محبت میں حد اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے ہیں'' جیسا کہ شیعہ کرتے ہیں، کہیں ہم بھی زیادتی کرنے والوں میں داخل نہ ہو جائیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لَا تَغۡلُواْ فِي دِينِكُمۡ﴾ (النساء: ۱۷۱)

''اے اہل کتاب تم اپنے دین میں غلو نہ کرو۔''

[کسی بھی صحابی سے اظہار برأت جائز نہیں:]

شیخ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول کہ: ((وَلَا نَتَبَرَّأُ مِنْ أَحَدٍ مِنْهُمْ .))

''ہم کسی صحابی سے بیزاری کا اظہار نہیں کرتے ہیں'' جیسے رافضی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں اظہار برأت کے بغیر اظہار موالات [دوستی] نہیں ہوسکتا۔ یعنی کوئی انسان اس وقت تک اہل بیت سے دوستی نہیں رکھ سکتا حتی کہ وہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے اظہار برأت نہ کرلے۔ اور اہل سنت والجماعت تمام صحابہ سے موالات رکھتے ہیں؛ اور ان میں سے ہر ایک کو وہ مقام دیتے ہیں جس کا وہ مستحق ہے؛ عدل و انصاف کے ساتھ؛ مذہب تعصب اور خواہشات نفس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ اس لیے کہ یہ تمام امور [تعصب برتنا؛ خواہشات نفس کی پیروی] سرکشی اور حد سے تجاوز کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَمَا ٱخۡتَلَفُوٓاْ إِلَّا مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ ٱلۡعِلۡمُ بَغۡيَۢا بَيۡنَهُمۡ﴾ (الجاثیه: ۱۷)

''تو انہوں نے جو اختلاف کیا تو علم آچکنے کے بعد آپس میں ضد کی وجہ سے۔''

سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے جو حضرات کہتے ہیں کہ گواہی دینا بھی بدعت ہے؛ اور برأت کا اظہار بھی بدعت ہے؛ ان کے اس قول کا یہی معنی ہے۔ یہ قول سلف صالحین رحمہم اللہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور تابعین عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت سے مروی ہے؛ ان میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ تابعین میں سے حضرت حسن بصری، ابراہیم نخعی، ضحاک اور دوسرے حضرات رحمہم اللہ شامل ہیں۔ اور گواہی دینے سے مراد یہ ہے کہ: کسی متعین انسان کے بارے میں یہ گواہی دینا کہ وہ دوزخی ہے۔ یا یہ کہ فلاں کافر ہے۔ حالانکہ یہ علم نہیں ہوتا کہ کس کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کس حال پر فرمائیں گے۔

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان ہے: ((وَحُبُّهُمْ دِيْنٌ وَإِيْمَانٌ وَإِحْسَانٌ .))

''ان سے محبت کرنا دین، ایمان، احسان ہے''۔

اس لیے کہ ایسا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی ہے؛ جیسا کہ پہلے نصوص میں گزر چکا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ تعالیٰ بن مغفل رحمہ اللہ سے حدیث روایت کی ہے؛ وہ بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

((اللـه الله في أصحابي ، لا تتخذوهم غرضاً بعدي ، فمن أحبهم فبحبي أحبهم ، ومن بغضهم فببغضي أبغضهم ، ومن آذاهم فقد آذاني ، ومن آذاني فقد آذى الله ، ومن آذى الله يوشك أن يأخذه .))[رواه أحمد وترمذى حسنه] [1]۔

''میرے صحابہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو؛ میرے بعد ان کو (طعن و تشنیع کا) نشانہ نہ بنانا (یاد رکھو) جس نے ان سے محبت کی، پس میری محبت کی وجہ سے اس نے ان سے محبت کی۔ جس نے ان سے بغض رکھا پس میرے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا اور جس نے ان کو اذیت دی پس اس نے مجھے اذیت دی جس نے مجھے اذیت دی، اس نے اللہ تعالیٰ کو اذیت دی اور جس نے اللہ تعالیٰ کو اذیت دی، پس قریب ہے کہ وہ اس کو گرفت کر لے''۔

[1] حدیث ضعیف ھے؛ ترمذی نے غریب کہاھے۔ احادیث ضعیفه (۲۹۰۱) دیکھیں۔

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کے ہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ محبت کرنے کو ایمان سے تعبیر کرنا مشکل کام ہے؛ اس لیے کہ محبت دل کا عمل ہے اور یہ تصدیق نہیں ہے۔ اس لحاظ سے عمل ایمان کے مسمیٰ میں داخل ہو جائے گا۔ جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالجنان کا نام ہے۔ ان کے نزدیک عمل ایمان کے مسمیٰ میں داخل نہیں۔ اہل سنت کے مذہب کے مطابق یہ بات معروف ہے۔ ہاں ہوسکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ محبت کو مجازاً ایمان کہا ہو۔

شیخ طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان ہے: ((وَبُغْضُهُمْ كُفْرٌ وَنِفَاقٌ وَطُغْيَانٌ .))

''ان سے دشمنی رکھنا کفر، نفاق اور سرکشی ہے''۔

اہل بدعت کو کافر قرار دینے کی بحث گزر چکی ہے اور یہ کفر بھی اس کفر کی مانند ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (المائدہ: ٤٤)

''اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو یہ لوگ کوفر ہیں''۔

اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔

[حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت]

۹۴۔((وَنُثْبِتُ الْخِلَافَةَ بَعْدَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ أَوَّلاً لِأَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ تَفْضِيْلاً لَّهُ وَتَقْدِيمًا عَلَى جَمِيْعِ الأُمَّةِ . ثُمَّ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ثُمَّ لِعُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ثُمَّ لِعَلِيِ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَهُمُ الْخُلَفَاءَ الرَّاشِدُوْنَ وَالأَئِمَّةِ الْمَهْدِيُّونَ① .))

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولاً ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت تسلیم کرتے ہیں، انہیں تمام امت پر فضیلت دیتے ہیں اور مقدم سمجھتے ہیں۔ان کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے؛ ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے؛ ان کے بعد ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے [خلافت ثابت کرتے ہیں]۔ یہ چاروں خلفاء راشدین ہیں اور ہدایت یافتہ ائمہ کرام ہیں''۔

①۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس کسی نے ان خلفاء میں سے کسی ایک کی خلافت پر طعنہ زنی کی؛ وہ گدھے سے بدتر ہے''۔[مجموع الفتاوی ۳/ ۱۵۳]



امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: ((وَنُثْبِتُ الْخِلَافَةَ بَعْدَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ أَوَّلاً لِأَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ تَفْضِيْلاً لَّهُ وَتَقْدِيمًا عَلَى جَمِيْعِ الأُمَّةِ .))

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولاً ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت تسلیم کرتے ہیں، انہیں تمام امت پر فضیلت دیتے ہیں اور مقدم سمجھتے ہیں''۔

تشریح ......: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے متعلق اختلاف ہے کہ وہ نص کی روشنی میں تھی یا انہیں منتخب کیا گیا تھا۔حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور کچھ محدثین کی رائے یہ ہے کہ ان کے خلیفہ بنائے جانے کے سلسلہ میں نص خفی اور اشارات موجود ہیں۔ [منہاج السنہ ۲/ ۴۸۷]

- بعض محدثین رحمہم اللہ نص جلی کے مدعی بھی ہیں۔[منہاج السنہ ۲/ ۴۸۸]
- بعض دیگر محدثین کی ایک جماعت؛ معتزلہ اور اشاعرہ کی نظر میں انہیں بذریعہ انتخاب خلیفہ بنایا گیا۔[منہاج السنہ ۲/ ۴۸۷]
ان کی خلافت نص پر مبنی تھی اس پر چند احادیث ملاحظہ فرمائیں۔
- بخاری شریف میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:''ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی

آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ پھر آئے‘‘۔اس نے استفسار کیا:’’آپ کیا حکم ہے؟اگر میں آؤں اور آپ ﷺ سے ملاقات نہ ہو سکے‘‘۔اس کا مقصد تھا کہ آپ ﷺ فوت ہو جائیں؛تو؟(اس پر) آپ ﷺ نے فرمایا:

’’اگر تو مجھے نہ پائے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آجانا‘‘۔ ❶

یہ حدیث ایک دوسرے سیاق کے ساتھ بھی مروی ہے۔اور اس کے علاوہ دیگر احادیث بھی ہیں۔ یہ حدیث حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر نص کی حیثیت رکھتی ہے۔‘‘

❶ حدیث صحیح ھے۔ الظلال الجنة (۱۱۵۱)۔قال عفیفی:انظر خطبة کتاب منهاج السنة لابن تیمیة رحمه الله۔

❀ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’میرے بعد ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی اقتداء کرو‘‘۔ ❶ (اسے اہل سنن نے روایت کیا ہے)۔

❶ حدیث صحیح ھے (احادیث صحیحه ۱۲۳۳)۔سنن الترمذی ۳۹۲٤؛[منهاج السنه ۲/ ٤۸۸]

❀ بخاری،مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے والد[حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ] سے روایت کرتی ہیں،فرماتی ہیں:

’’جس روز بیماری کا آغاز ہوا،اس روز آپ ﷺ میرے ہاں تشریف لائے۔آپ ﷺ نے فرمایا:اپنے باپ اور بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے ایک تحریر لکھوادوں‘‘اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

’’اللہ تعالیٰ اور مسلمان ابو بکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ سبھی کا انکار کرتے ہیں‘‘ ❶۔

❶ حدیث صحیح ھے۔ احادیث صحیحه ٦۹۰۔ الظلال الجنة (۱۱۵٦)۔البخاری ٥٦٦٦ مسلم ۲۳۸۷۔

نیز ایک دوسری روایت میں ہے:

’’تاکہ خلافت کے بارے میں کوئی دوسرا طمع کرنے والا اس معاملہ کی طمع نہ کرے‘‘۔

نیز ایک روایت میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

’’عبدالرحمٰن بن ابو بکر رضی اللہ عنہما کو میرے پاس بلالاؤ؛ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے ایک تحریر لکھواؤں تاکہ کوئی اختلاف نہ کرے‘‘۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:’’اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ ابو بکر کے بارے میں ایمانداروں میں اختلاف رونما ہو‘‘ ❶۔

❶ ۔[دراوی] یہی وجہ ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:’’جس کسی کو یہ وہم ہو کہ یہ تحریر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے متعلق تھی تو اس کے گمراہ ہونے پر تمام شیعہ اور اہل سنت علماء کا اتفاق ہے۔اور اہل سنت والجماعت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی تفضیل و تقدیم پر یک زبان ہیں۔جب کہ شیعہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ امامت کے مستحق تھے۔وہ کہتے ہیں کہ:’’رسول اللہ ﷺ سے واضح جلی اور معروف نصوص کی روشنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت ثابت ہے۔تو پھر اس صورت میں کسی تحریر کی ضرورت ہی نہ تھی‘‘۔[منہاج السنۃ:٦/ ۲۵.]

جب یہ اصول طے پا گیا تو یہ جان لینا چاہیے کہ علماء کرام کا اس میں اختلاف ہے کہ اس کتاب (تحریر) سے رسول اللہ ﷺ کی مراد کیا تھی؟بعض علماء کی رائے ہے کہ رسول اللہ ﷺ بعض احکام کے متعلق نصوص تحریر کروانا چاہتے تھے،تاکہ ان میں اختلاف ختم ہو جائے‘‘۔یہ بات امام نووی اور ابن حجر رحمہما اللہ نے بعض اہل علم حضرات سے نقل کی ہے‘‘۔[شرح صحیح مسلم للنووی: ۱۱/ ۹۰۔ فتح الباری: ۱/ ۲۰۹ .]اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس تحریر سے رسول اللہ ﷺ کی مراد ایسا عہد نامہ تھا جس کی طرف فتنوں کے اوقات میں رجوع کیا جائے‘‘۔[المفهم: ٤/ ٥٥٨ .]

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ ملکی نظام کی تدبیر کی کیفیت تحریر کروانا چاہتے تھے،یعنی مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے اور وفود کو انعام و اکرام سے نوازا جائے جیسا کہ آپ خود کیا کرتے تھے اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو تیار کیا جائے‘‘۔امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔اور آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں آپ ﷺ نے وصیت کی تھی۔یہ حدیث ابھی گزری ہے۔[مختصر التحفة الاثنی عشریة: ۲۵۱ .] اکثر محقق علماء کا

کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا حکم لکھوانا چاہتے تھے، پھر آپ نے تقدیر الٰہی پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔
النووی: ۱۱/ ۹۰۔ المفهم: ٤/ ٥٥٨۔ منهاج السنة: ٦/ ٢٣٧۔ الصارم الحدید ......: ٢/ ٤٨۔ الشفاء: ٢/ ٨٩٠.

نیز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز کی امامت کرانے کا حکم دینے والی حدیثیں مشہور و معروف ہیں۔

❀ آپ ﷺ نے فرمایا:

''ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم دو وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں'' ❶۔

اس پر کئی بار تکرار بھی کیا گیا؛ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بیماری کا تمام عرصہ میں نماز پڑھاتے رہے۔

❶ بخاری، مسلم۔ الظلال الجنة (١١٦٤، ١١٦٧)۔(١١٥٩؛ ١١٦٠)۔البخاری ٦٦٤؛ ٦٧٨؛ مسلم ٤٢٠؛ ٦٨٢؛ عن أبی موسی رضی اللہ عنہ۔

❀ بخاری، مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے؛ فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: ایک بار میں سویا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ میں ایک پرانے کنوئیں پر ہوں جس پر ڈول رکھا ہے، میں نے جس قدر اللہ تعالیٰ نے چاہا ڈول سے پانی نکالا، اس کے بعد ڈول کو ابن ابی قحافہ نے پکڑا؛ اس نے دو ڈول یا تین ڈول پانی نکالا؛ لیکن اس کے نکالنے پر کچھ کمزوری تھی؛ اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے۔ اس کے بعد وہ ڈول بڑے ڈول کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر اس کو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پکڑا، میں نے کسی قوی مضبوط انسان کو نہیں دیکھا جو اس کی طرح ہمت اور قوت کے ساتھ ڈول نکالتا ہو، یہاں تک کہ لوگوں نے اپنے باڑوں کو پانی سے بھر لیا''۔ ❶

❶ حدیث صحیح هے۔ السنة لابن ابی عاصم (١٤٥٩)۔البخاری ٣٦٦٤؛ مسلم ٢٣٩٢۔

❀ صحیح بخاری میں ہے نبی کریم ﷺ نے منبر پر فرمایا:

''اگر میں نے زمین والوں سے کسی کو خلیل بنانا ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیل بناتا؛ مسجد کی طرف کھلنے والی تمام کھڑکیاں بند کر دی جائیں؛ سوائے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کھڑکی کے''۔ ❶

❶ البخاری ٣٩٠٤، مسلم ٢٣٨٢۔ السنة (١٢٢٦)۔ ترمذی (٢/ ٢٨٩)۔

❀ سنن ابوداؤد اور دیگر کتب میں ہے؛ حضرت اشعث نے حسن رحمہ اللہ سے اور وہ ابوبکرہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں؛ بے شک ایک دن نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا:

''تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟۔

''ایک شخص نے کہا میں نے دیکھا ہے؛ کہ ایک ترازو آسمان سے اترا ہے، اس سے آپ ﷺ کا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کا وزن میں مقابلہ کیا گیا تو آپ ﷺ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر بھاری نکلے۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھاری نکلے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا وزن کیا گیا تو عمر رضی اللہ عنہ بھاری نکلے۔ پھر ترازو اٹھا لیا گیا اس دوران میں نے دیکھا؛ تو نبی ﷺ کے مبارک چہرہ پر ناراضگی کے آثار تھے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''یہ دور نبوت کی خلافت کا ہے، پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا بادشاہت دے گا''۔ ❶

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ان کی حکومت خلافت نبوت تھی۔ پھر اس کے بعد بادشاہت ہو

گی۔لیکن اس حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں ہے۔اس لیے کہ ان کے زمانہ میں ان پر لوگوں کا اتفاق نہ ہوسکا، بدستور اختلاف رہا؛ ان کے دور میں خلافت نبوت منظم نہ ہوسکی اور نہ ہی بادشاہت قائم ہوئی۔

✪ حدیث صحیح ھے۔ ابو داؤود (٤٦٣٤ ـ ٤٦٣٥) دوطریق سے ہے۔اس کتاب کے الفاظ اشعث کے طریق میں ہیں لیکن اس میں آخری الفاظ (نبوت کی خلافت اور اس کے بعد) کے نہیں ہیں۔ یہ زائد الفاظ دوسرے طریق سے ہیں، اس طریق میں علی بن زید بن عان ضعیف ہے۔لیکن اس کی شاہد روایت حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے۔ ظلال الجنة (١١٣١ ـ ١١٣٣)۔

❀ ابوداؤد نے ہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: آپ فرمایا کرتے تھے: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''آج رات ایک نیک انسان کو خواب میں دیکھایا گیا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور حضرت عمر کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما کے ساتھ اور حضرت عثمان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ باندھا [ملایا] گیا ہے''۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے باہر نکلے تو ہم نے کہا نیک آدمی سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔اور جو لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں وہ اس دین اسلام کے محافظ اور نگران [حاکم] ہیں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے''۔ ❶

✪ حدیث ضعیف ھے۔ ظلال الجنة (١١٣٤)۔

❀ ابوداؤد میں ہی حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:''ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے دیکھا ہے گویا کہ ایک ڈول آسمان سے نازل ہوا ہے۔ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے انہوں نے اس کا کنڈا پکڑا؛ اور اس سے کچھ تھوڑا سا [کمزور سا] پانی پیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے؛ انہوں نے کنڈا پکڑا اور سیر ہو کر پانی پیا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے انہوں نے کنڈا پکڑا اور سیر ہو کر پانی پیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے انہوں نے بھی اس کا کنڈا پکڑا؛ تو وہ چھلک گیا اور اس میں سے کچھ ان کے اوپر بھی پڑ گیا''۔ ❶

✪ [ابو داؤد ٤٦٣٧]۔یہ حدیث ضعیف ہے عبدالرحمان جرمی روای مجہول ہے اسی سند سے یہ حدیث مسند احمد (٥/ ٢١) میں بھی ہے۔

❀ سعید بن جمہان سے روایت ہے کہ: حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''خلافت نبوت تیس سال تک ہوگی؛ پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اپنا ملک دیدے گا۔'' ❶

ایک روایت میں ''بادشاہت'' کے الفاظ ہیں۔

✪ حدیث حسن ھے اس سے قبل والی دو احادیث اس کی شاھد ھیں۔أبو داؤد ٤٦٤٦ .

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خلیفہ نہیں بنایا؛ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں؛ انہوں نے فرمایا:''اگر میں خلیفہ نامزد کروں تو درست ہے؛ کیونکہ مجھ سے بہتر [یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ] نے بھی خلیفہ نامزد کیا ہے۔اور اگر میں خلیفہ نامزد نہ کروں تو بھی درست ہے۔کیونکہ مجھ سے بہتر نے خلیفہ نامزد نہیں کیا''۔آپ کی مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے''۔ ❶

❶[البخاری ٧٢١٨؛ مسلم ١٨٢٣؛ یہ الفاظ صحیح مسلم کے ھیں۔

نیز وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں؛ ان سے دریافت کیا گیا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو خلیفہ بنانا ہوتا تو کس کو خلیفہ بناتے؟ ❶۔

❶[مسلم ٢٣٥٨ ؛ منهاج السنة ١/ ٤٩٧]

-واللہ اعلم- اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے تحریری عہد نامہ کی شکل میں کسی کو خلیفہ نامزد نہیں کیا؛ اور اگر کسی کے لیے عہد نامہ تحریر کرواتے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے تحریر کرواتے۔ بلکہ پہلے تو آپ ﷺ نے لکھوانے کا ارادہ کیا، پھر رک گئے اور فرمایا:

''اللہ تعالیٰ اور ایماندار لوگ سبھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ ہر کسی کا انکار کرتے ہیں''۔ ❷

❷ مسلم۔ الصحيحة (٦٩٠)۔ ظلال الجنة (٢/ ٥٣٥)۔

آپ ﷺ کا یہ فرمان خلیفہ نامزد کرنے سے بھی زیادہ موثر ہے۔ بے شک نبی کریم ﷺ نے مسلمان کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کی طرف مسلمانوں کی راہنمائی فرمادی۔ نیز متعدد اقوال افعال کے ساتھ انہیں اس طرف متوجہ کیا۔ نیز ان کی خلافت کی خبر دیتے ہوئے اس پر رضامندی کا اظہار کیا؛ اور ان کی تعریف کی ہے۔ بلکہ آپ ﷺ نے اس عزم کا اظہار فرمایا تھا کہ اس کے لیے ایک عہد تحریر کروادیں۔ پھر آپ ﷺ کو یقینی علم ہوگیا کہ مسلمان ان کی خلافت پر جمع ہو جائیں گے؛ تو آپ ﷺ نے اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے تحریر لکھوانے کا ارادہ ترک کر دیا''۔[البخاری ٧٣٦٦ مسلم ١٦٣٧]

پھر آپ ﷺ نے اپنی بیماری کی حالت میں جمعرات کے روز دوبارہ لکھوانے کا عزم کیا؛ اس سے کچھ صحابہ میں ایک شک سا پیدا ہوا؛ کہ کیا آپ بیماری کے غلبہ کی وجہ سے تو کچھ نہیں کہہ رہے؟ یا واقعی یہ آپ ﷺ کا ایسا حکم ہے جو واجب الاتباع ہے؟۔ بہر حال آپ ﷺ نے کچھ نہ لکھوایا۔ آپ نے اسی علم پر اکتفاء کر لیا کہ اللہ تعالیٰ اور ایمان والے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی خلیفہ منتخب کریں گے۔ اگر امت کو ان کے تعین میں ذرہ برابر بھی شبہ ہوتا تو آپ ﷺ اس کو ایسے واضح طور پر بیان فرماتے کہ عذر ختم ہو جاتا۔ لیکن جب متعدد قرائن اس پر دلالت کررہے تھے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس امر کے لیے متعین ہیں؛ اور وہ مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ گئے تھے؛ تو مقصود حاصل ہو چکا تھا۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس خطبہ میں جو انہوں نے مہاجرین اور انصار کے اجتماع میں ارشاد فرمایا تھا، اس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''آپ ہم سب سے بہتر؛ ہمارے سردار اور رسول اللہ ﷺ کے ہاں ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں''۔ اس پر ان میں سے کسی ایک نے بھی انکار نہیں کیا۔ اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی نے کہا کہ: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ فلاں مہاجر آپ سے زیادہ خلافت کا حق دار ہے''۔[منهاج السنه ٢/ ٥١٦]

نہ ہی بعض انصار کے علاوہ کسی نے خلافت کے مسئلہ پر اختلاف کیا۔ ان انصاری حضرات کی خواہش تھی کہ ایک امیر مہاجرین میں سے ہو؛ اور ایک امیر انصار میں سے۔ یہ ایسا خیال تھا جس کا باطل ہونا نبی کریم ﷺ سے ثابت متواتر نصوص کی روشنی میں معلوم شدہ تھا۔ پھر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ تمام انصار نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی تھی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ خود خلافت کے خواہشمند تھے۔ کسی ایک صحابی نے بھی ہرگز کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ: نبی کریم ﷺ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی کے لیے نص موجود ہے؛ نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اور نہ ہی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے حق میں؛ نہ ہی ان کے علاوہ کسی اور کے حق میں۔ جیسے اہل بدعت کہتے ہیں''۔[منهاج السنه ٢/ ٥١٨]

نیز ابن بطہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے؛ کہ بے شک حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے محمد بن زبیر حنظلی کو حضرت حسن

رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیجا؛ اور دریافت کیا کہ: ''کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا تھا؟۔

انہوں نے جواب دیا: کیا تمہارے ساتھی کو اس میں کچھ شک ہے؟۔ ہاں! اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں؛ یہ بات قطعی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خلیفہ نامزد فرمایا تھا۔ وگرنہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تو اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ خوف رکھنے والے تھے وہ کیسے خلافت پر از خود متمکن ہو سکتے تھے۔

خلاصہ کلام! وہ تمام منقولات جن میں ذکر ملتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی دوسرے کو خلیفہ بنانا طلب کیا گیا تھا؛ انہوں نے کوئی شرعی حجت/ دلیل ذکر نہیں کی۔ اور نہ ہی یہ ذکر کیا ہے کہ کوئی دوسرا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ افضل یا خلافت کا زیادہ حقدار ہے۔ یہ سب کچھ صرف قبائلی اور قومی محبت کا آئینہ دار ہیں۔[منهاج السنه ٢/ ٥٢٩]

یہ تمام حضرات جنابِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ سے محبت کو خوب جانتے تھے۔ صحیحین میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سریہ ذات السلاسل میں لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ پس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا؛ اور عرض کی: آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ رضی اللہ عنہا۔

میں نے کہا: مردوں میں سے کون ہے؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کا باپ ابوبکر رضی اللہ عنہ''۔

میں نے پوچھا: پھر اس کے بعد کون ہے؟۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ''۔

اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا''۔ [1]

✪ حديث صحيح هے۔ كتاب السنة/ من طرق عن عمرو (١٢٣٣، ١٢٣٦)۔[بخاری٣٦٦٢؛ مسلم ٢٣٨٤]۔

نیز صحیحین میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا:

''میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ اچانک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے کپڑے کے کنارے کو تھامے ہوئے تشریف لائے؛ حتی کہ آپ کے گھٹنے ظاہر ہو رہے تھے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارا ساتھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کسی کے ساتھ ناراض ہو کر آیا ہے'' ۔ انہوں نے سلام کیا؛ اور عرض گزار ہوئے: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا، میں کچھ تیز باتیں کہہ دیں۔ پھر میں اس پر نادم ہوا۔ میں نے اس سے عرض کیا: ''مجھے معاف کر دے'' تو اس نے میری بات نہیں مانی؛ تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ نے تین بار فرمایا: ''اے ابوبکر! اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے'' ۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نادم ہو کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے؛ اور دریافت کیا ابوبکر رضی اللہ عنہ یہاں ہیں؟۔

گھر والوں نے نفی میں جواب دیا۔ پس وہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا؛ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہونا شروع ہو گیا۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خوفزدہ ہو گئے؛ وہ آپ کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے؛ اور عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ کی قسم! میں نے ظلم کیا ہے'' ۔ اس جملہ کو دوبارہ دہرایا۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری جانب بھیجا، تم نے کہا: تم جھوٹ بولتے ہو۔ مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ نے سچ فرمایا'' اور اپنی جان و مال سے میری معاونت کی؛ کیا تم میری وجہ سے میرے ساتھی کو چھوڑنے والے ہو؟۔ دو بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات ارشاد

فرمائے۔اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کبھی تکلیف نہیں دی گئی''۔ [1]

[1] البخاری عن ابی الدرداء مسلم میں یہ حدیث نہیں مل سکتی ہے نیز الذخائر میں صاحب کتاب نے مسلم کی طرف منسوب نہیں کیا؛ اور نہ ہی ایسا کچھ الجامع الکبیر میں ہے۔ البخاری ٣٦٦١؛ السنة (١٢٢٣)۔

یہ مختصر سا مقام آپ کے فضائل کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ نیز بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فوت ہوئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ سنخ [1] مقام میں تھے۔-حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے -فرمایا:

[1] یہ مقام عوالی مدینہ میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے گھر اور اس کے درمیان ایک میل فاصلہ ہے۔

''انصار سقیفہ نبو ساعدہ میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہو گئے اور کہا: ''ایک امیر ہم سے لیا جائے اور ایک امیر تم سے لیا جائے''۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن خطاب اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم ان کی مجلس پہنچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کلام کا آغاز کرنا چاہا، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں خاموش کرا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی قسم! میں نے اس لیے کلام کا آغاز کرنا چاہا کہ میں نے بہترین گفتگو تیار کر رکھی تھی؛ جس کی وجہ سے میں نے جلدی کی۔ اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وہی باتیں نہ کہہ دیں۔ مگر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گفتگو فرمائی تو نہایت بلیغ انداز کا تھی۔ آپ نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا: ''امیر ہم [قریش] میں سے ہوگا؛ اور آپ وزراء ہوں گے''۔ اس پر حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! ہم یہ بات تسلیم نہیں کرتے؛ بلکہ ایک امیر ہم میں سے ہوگا؛ اور ایک امیر تم میں سے ہوگا۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہرگز نہیں؛ ہم امراء ہوں گے اور آپ لوگ وزراء ہوں گے۔ قریش تمام عرب سے زیادہ عزت والے اور خاندانی طور پر فضائل والے ہیں۔ لہٰذا تم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ یا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرو۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بلکہ ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں؛ آپ ہمارے سردار ہیں؛ ہم سب میں سے بہتر ہیں؛ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں''۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور بیعت کی؛ اس کے بعد لوگوں نے بھی بیعت کی''۔ کسی کہنے والے نے کہا: ''تم نے سعد رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا''۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اس کو قتل کیا''۔ [1] (سنخ مدینہ منورہ کی عوالی میں ایک مشہور باغ ہے)۔

[1] بخاری، (مسلم میں نہیں) السنة (١١٦٦)، الظلال (١١٥٩).

[حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ]

امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: (ثُمَّ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ)۔ .

''ان کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے''۔

تشریح......: **حضرت** ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت مانتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں

خلافت کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ آپ کے بعد امت کا بھی ان پر اتفاق ہو گیا تھا۔ ان کے فضائل کثرت کے ساتھ مشہور و موجود ہیں جن سے کسی کو انکار نہیں؛ اور ان کی تعداد بیان سے زیادہ ہے۔

چنانچہ محمد بن حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ [۲۱ھ-۸۱ھ] بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے دریافت کیا:

''اے ابا جی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کون شخص سب سے بہتر ہے؟۔

تو آپ نے فرمایا: ''اے میرے بیٹے! کیا تجھے اس کا علم نہیں ہے؟

میں نے کہا: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ''حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ''۔

میں نے دریافت کیا: پھر کون ہیں؟ ۔ آپ نے فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

میں نے ڈر گیا کہ کہیں آپ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام نہ لیں۔ میں نے کہا: اس کے بعد آپ؟۔

تو آپ نے فرمایا: ''میں تو صرف مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔'' ❶

❀ اس سے پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان گزر چکا ہے کہ:

''ان دو کی اقتداء کرو جو میرے بعد آئیں گے؛ حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما [کی اقتداء کرو]''۔ ❷

❀ اور صحیح مسلم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''جب عمر رضی اللہ عنہ کی میت کو چار پائی پر رکھا گیا تو لوگ ان کے ارد گرد چار پائی اٹھانے سے قبل ان کے حق میں دعا کر رہے تھے ان کی تعریف کر رہے تھے؛ ان کے لیے مغفرت طلب کر رہے تھے۔ میں بھی وہاں موجود تھا، اچانک ایک انسان نے میرے عقب سے میرے کندھے کو پکڑا، میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ علی رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے دعائے مغفرت کی۔ اور فرمایا: ''آپ نے اپنے پیچھے کسی ایسے انسان کو نہیں چھوڑا جس کے بارے میں مجھے یہ زیادہ عزیز ہو کہ میں اس جیسے اعمال لیکر اللہ تعالیٰ سے ملوں؛ سوائے آپ کے۔ اور اللہ کی قسم! میرا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے دونوں ساتھیوں کی رفاقت عطا فرمائے گا۔ اس لیے کہ میں کثرت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''میں اور ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما آئے؛ میں اور ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما داخل ہوئے؛ میں اور ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما نکلے''۔ مجھے امید تھی؛ یا فرمایا: مجھے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان دونوں کی رفاقت عطا فرمائے گا''۔ ❸

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ کنوئیں سے پانی نکال رہے ہیں، پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نکالا، پھر ڈول مغرب کو ہو گیا۔ تو اسے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پکڑا، میں نے کسی مضبوط انسان کو نہیں دیکھا جوان کی طرح ڈول کھینچ رہا ہو یہاں تک کہ لوگوں نے اپنے باڑے بھر لیے''۔ ❹

نیز بخاری، مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی۔ آپ کی خدمت میں قریش کی عورتیں تھیں، جن کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں (حدیث طویل ہے)۔ اس میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اے ابن خطاب! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جس راستے پر تو چل رہا ہو اس پر شیطان نہیں چلتا، وہ دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے''۔ ❺

نیز بخاری، مسلم میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''تم سے پہلی امتوں میں ملہم انسان ہو گزرے ہیں اگر میری امت میں کوئی شخص اس وصف کا ہوا تو ان میں سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں''۔ ❻

ابن وہب فرماتے ہیں: محدّث کا ملہم (الہام کیا گیا) ہے۔

۞ حدیث صحیح ھے۔ الظلال (١٢٠٤، ١٢٠٦)۔

❁ حدیث صحیح ھے۔ الصحیحة (١٢٣٣)۔[أخرجه الترمذی ، ح: ٣٦٦٢؛ ابن ماجة ح: ٩٧؛ أحمد في المسند ح: ٢٣٢٤٥؛ والحاكم وصححه ، ووافقه الذهبی ٤٤٥١۔ قال محققو المسند حسن بطرقه وشواهده ۔]

دراوی کہتا ہے: شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ,,یہ فضیلت ان دو کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے،،۔ مجموع الفتاوی ۴/ ۳۹۹۔

اور فرماتے ہیں: حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو ان کی اقتدء کرنے کیلئے خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے،،۔ مجموع الفتاوی ۴/ ۴۰۰۔

اور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے، آپ ایک سفر میں تھے تو لوگوں سے ان کے بارے میں فرمایا:

,, إن یطیعوا أبا بكر و عمر یرشدوا ، ،۔مسلم ح: ٦٨١۔

,, اگر ابوبکر وعمر کی اطاعت کریں تو ہدایت پالیں ،،۔ اور ایسے ہی امت بھی ان دونوں حضرات کی باقی صحابہ پر تقدیم وافضیلت پر متفق ہے، کیونکہ ان دونوں کے بہت سے فضائل کے ثابت ہونے پر خود نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ نے اور بعد میں آنے والے لوگوں نے گواہی دی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہل سنت والجماعت کا اس روایت کے صحیح ہونے پر اتفاق ہے جو تواتر کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے، آپ نے فرمایا: ,, خیر هذه الأمة بعد نبیها ، أبو بكر ، ثم عمر رضی اللہ عنہما ، ، ۔ مجموع الفتاوی ٣/ ١٥٣۔

,, نبی کریم ﷺ کے بعد اس امت کے بہترین انسان حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر ہیں رضی اللہ عنہما ،،۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کے فضیلت دینے کی وجہ ان کے وہ خاص فضائل ہیں جن میں ان کے ساتھ کوئی اور شریک نہیں ہے۔

۞ حدیث صحیح ھے۔ السنة (١٢١٠)۔

○ حدیث صحیح ھے۔ السنة (١٤٥٧)۔

❋ بخاری ، مسلم۔ السنة (١٢٥٤، ١٢٦٠)۔

ۼ بخاری ، مسلم۔ السنة (١٢٦١، ١٢٦٢)۔

[حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مقام ومرتبہ]

امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: (ثُمَّ لِعُثْمَانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ)

''......پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے''۔

تشریح......: **یعنی** ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کو ثابت تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کا واقعہ، شوریٰ کا معاملہ، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کا واقعہ صحیح بخاری میں لائے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اسی طرح من وعن اس کی سند کے ساتھ ایسے ہی بیان کروں، حضرت عمرو بن میمون بیان کرتے ہیں:

''میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ان کے شہید ہونے سے چند روز پہلے مدینہ میں دیکھا۔ وہ حذیفہ بن یمان اور عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہما کے پاس کھڑے تھے؛ اور ان سے کہہ رہے تھے تم نے کیا کیا؟ کیا تم نہیں ڈرتے ہو کہ کہیں تم زمین پر اتنا بوجھ نہ رکھ دو جس کو وہ اٹھا نہ سکے؟ انہوں نے جواب دیا: ''ہم نے اس پر اتنا ہی بوجھ رکھا ہے جس قدر اس میں اٹھانے کی طاقت ہے؛ اس پر کچھ زیادتی نہیں کی''۔

تو آپ نے پھر کہا: ''سوچ لیجیے تمہیں اس پر اتنا بوجھ نہیں رکھنا جس کے اٹھانے کی اس میں قوت نہیں ہے''۔

تو انہوں نے کہا: ایسا کچھ نہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے صحیح سلامت رکھا تو عراق کی بیوہ عورتوں کو میرے بعد کبھی کسی کی ضرورت نہ رہے گی''۔ اس کے بعد ابھی چار دن نہ گزرے ہوں گے کہ وہ شہید کر دیئے گئے''۔

عمرو بن میمون رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتا ہے کہ: ''جس صبح کو وہ شہید کیے جاتے ہیں میرے اور ان کے درمیان صرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جب وہ صفوں کو عبور کرتے تو فرماتے، صفیں درست کرو۔ جب انہیں یقین ہو جاتا کہ صفوں میں خلا نہیں رہا؛ تو آگے بڑھتے اور تکبیر تحریمہ کہتے۔ اکثر اوقات سورۂ یوسف، سورۂ نحل جیسی سورتوں کی پہلی رکعت میں تلاوت فرماتے؛ تاکہ لوگ شامل ہو جائیں۔ ابھی انہوں نے تکبیر تحریمہ ہی کہی ہو گی کہ: ''میرے کانوں میں آواز پہنچی وہ کہہ رہے ہیں: ''مجھے قتل کر دیا؛ یا مجھے کسی کتے نے کھا لیا''۔ جب انہیں نیزہ لگا؛ تو وہ عجمی دو دھاری برچھی کے ساتھ تیزی کے ساتھ پلٹ رہا تھا، اپنے سامنے دائیں بائیں والے کو گھائل کرتا جا رہا تھا۔ حتی کہ اس نے تیرہ انسانوں کو زخمی کر دیا۔ جن میں سے سات افراد شہید ہو گئے۔ اس المناک واقعہ کو دیکھ کر ایک شخص نے اس پر لمبا جبا/کوٹ پھینکا۔ جب اس عجمی قاتل کو یقین ہو گیا کہ وہ گرفتار کر لیا جائے گا؛ تو اس نے اپنے آپ کو بھی نیزہ مار کر قتل کر دیا۔ اس دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر ان کو آگے کیا''۔

جو لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قریب تھے؛ وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے: وہ دیکھ ہی رہے تھے۔ مگر مسجد کے اطراف واکناف میں لوگوں کو اور تو کچھ علم نہ تھا البتہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز نہیں پا رہے تھے؛ اس لیے وہ سبحان اللہ، سبحان اللہ کہہ رہے تھے۔ حضرت عبدالرحمان رضی اللہ عنہ نے نہایت تخفیف کے ساتھ انہیں نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا: معلوم کرو میرا قاتل کون ہے؟۔

وہ ذرا اِدھر اُدھر گھوم کر آئے اور کہا: ''مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا غلام ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''وہ جو کاریگر ہے؟''۔ عرض کیا: جی بالکل۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ تعالیٰ اسے غارت کرے، میں نے تو اس کے ساتھ اچھائی کا حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتا ہوں کہ میری موت کا باعث ایسا شخص نہیں بنا جو اسلام کا دعویدار ہو''۔ [حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا]: ''تو اور تیرا باپ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ اس قسم کے عجمی انسانوں کی مدینہ میں کثرت ہو۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ملکیت میں بہت سارے غلام تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اگر آپ چاہیں تو ہم انہیں قتل کر دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ''غلط بات کہتے ہو، اب تو وہ تمہاری زبان میں گفتگو کرتے ہیں، تمہارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں،

تمہارے ساتھ حج کرتے ہیں''۔

اس کے بعد انہیں گھر لے جایا گیا، ہم بھی ساتھ ساتھ تھے۔ گویا کہ اس سے پہلے لوگوں پر کوئی مصیبت آئی ہی نہیں۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے: خیر ہے؛ جانبر ہو جائیں گے۔ کوئی کہہ رہا تھا: ''مجھے تو آپ کے معاملہ میں خوف محسوس ہو رہا ہے''۔ پھر آپ کو پینے کے لیے نبیذ پیش کی گئی۔ جس کو انہوں نے پی لیا لیکن پیٹ کے زخم سے وہ خارج ہوگئی۔ پھر دودھ پیش کیا گیا اس کو بھی انہوں نے نوش فرمایا؛ تو وہ بھی پیٹ کے زخم سے باہر نکل گیا۔ اب لوگوں کو ان کی وفات کا یقین ہو گیا۔ ہم بھی گھر میں داخل ہوئے جو لوگ آرہے تھے وہ سب ان کی تعریف کر رہے تھے۔ چنانچہ ایک نوجوان آیا اس نے کہا: اے امیر المومنین! آپ کو خوش ہونا چاہیے، آپ کے لیے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسرتیں ہیں۔ آپ کو شرف صحبت حاصل ہے اور آپ کو سبقت اسلام حاصل ہے جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں۔ پھر آپ خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے عدل فرمایا۔ پھر آپ شہادت سے سرفراز ہو رہے ہیں''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''مجھے تو یہ پسند ہے کہ ان تمام اعمال کے باوجود اگر مجھے نجات مل جائے، نہ مجھ پر عذاب ہو اور نہ ہی مجھے کچھ ملے؛ اور معاملہ برابر ہو جائے۔

جب وہ شخص واپس لوٹا تو اس کا تہبند زمین سے لگ رہا تھا؛ تو آپ نے فرمایا: ''اس کو واپس بلا لاؤ''۔ اور فرمایا: اے میرے بھتیجے! اپنی تہبند کو اونچا کرو؛ اس سے تمہارا لباس صاف ستھرا رہے گا اور اپنے رب کا ڈر موجود رہے گا''۔ [1]

پھر [اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر] فرمایا: اے عبداللہ بن عمر! دیکھو مجھ پر قرض کتنا ہے؟ چنانچہ قرض شمار کیا گیا تو وہ تقریباً چھیاسی ہزار کے قریب تھا۔ تو آپ نے [اس کے بارے میں] فرمایا: ''اگر آل عمر رضی اللہ عنہ کے مال سے قرض ادا ہو سکے تو ان کے اموال سے ادا کرنا۔ وگرنہ بنو عدی بن کعب سے مطالبہ کرنا۔ اگر ان کے اموال سے بھی ادا نہ ہو سکے؛ تو پھر قریش سے مطالبہ کرنا۔ لیکن ان سے آگے نہ تجاوز کرنا۔ بس ان سے میرا قرض ادا کرانا۔ ہاں اب حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کے پاس جاؤ، انہیں کہنا: آپ کو عمر رضی اللہ عنہ سلام کہتا ہے۔ امیر المومنین نہ کہنا، اس لیے کہ آج میں امیر المومنین نہیں ہوں۔ اور ان کی خدمت میں درخواست کرنا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اجازت طلب کرتا ہے کہ اس کو اس کے دونوں رفقاء کے ساتھ دفن کیا جائے۔

تو انہوں نے جا کر سلام کہا اور اجازت مانگی، اندر گئے: تو حضرت عائشہ ام المومنین کو روتے ہوئے پایا۔ ان سے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سلام عرض کرتے ہیں؛ اور دونوں رفقاء کے ساتھ دفن ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ''ارادہ تو میرا اپنا تھا کہ میں وہاں دفن ہوتی؛ لیکن آج میں انہیں اپنے اوپر کو ترجیح دیتی ہوں''۔

جب واپس تشریف لائے تو کہا گیا: یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ آ گئے ہیں۔ تو [حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے] فرمایا: مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ۔ ایک آدمی نے انہیں سہارا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: کیا خبر لائے ہو؟ تو عرض کی: اے امیر المومنین! وہی بات جو آپ کو پسند تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اجازت مرحمت فرما دی ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''الحمدللہ''۔ نیز فرمایا: ''اس سے زیادہ اہم میرے نزدیک چیز نہیں تھی''۔

جب میں مر جاؤں تو مجھے اٹھا کر وہاں لے جانا؛ انہیں اسلام کہنا؛ اور ان سے کہنا: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اجازت چاہتا ہے۔ اگر وہ

مجھے اجازت دیں تو مجھے حجرہ میں داخل کرنا۔ اگر اجازت نہ دے تو مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔ اس دوران ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا دیگر عورتوں کی معیت میں آئیں۔ جب ہم نے انہیں آتے دیکھا تو ہم کھڑے ہو گئے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قریب گئیں وہاں کچھ وقت روتی رہیں۔ نیز کچھ لوگوں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی؛ وہ اندر چلی گئیں۔ ہم اندر سے ان کے رونے کی آواز سن رہے تھے۔ ان لوگوں نے عرض کی: اے امیر المؤمنین! وصیت فرما دیجیے۔ کسی کو خلیفہ بنا دیجیے۔

تو آپ نے فرمایا: ''میں خلافت کا حقدار اس گروہ سے زیادہ کسی کو نہیں سمجھتا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے تو آپ ان سے راضی تھے؛ پھر آپ نے حضرت علی، عثمان زبیر، طلحہ، سعد، عبدالرحمان رضی اللہ عنہم کا نام لیا؛ اور فرمایا: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی تمہاری مشاورت میں حاضر رہیں گے؛ لیکن خلافت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ دراصل اس کی تسکین ملحوظ خاطر تھی۔ اگر باہمی مشورہ سے سعد رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنا لیا جائے تو درست ہے۔ وگرنہ جس کو بھی خلیفہ بنایا جائے وہ ان سے اعانت طلب کرے میں نے ان کو عجز کی بنا پر یا کسی قسم کی خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا۔

نیز فرمایا: میں اپنے بعد خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ مہاجرین اولین کے حقوق پہچانے اور ان کی حرمات کا خیال رکھے۔ نیز انصار کے بارے میں بہتر وصیت کرتا ہوں جنہوں نے اپنے گھروں میں اپنے بھائیوں کو بسایا اور ایمان کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے کہ ان کے نیکوکاروں سے ان کی نیکیوں کو قبول کیا جائے اور غلط کاروں کو معاف کیا جائے۔ نیز تمام شہروں کے لوگوں سے بھلائی کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ وہ لوگ اسلام کے معاون ہیں مال جمع کرنے والے ہیں۔ دشمن کے لیے غیظ وغضب کا باعث ہیں ان سے ان کی رضامندی کے ساتھ ان کے زائد اموال لیے جائیں۔ نیز اہل بادیہ کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں؛ وہ تو عرب کے اصل ہیں، اسلام کی بنیاد ہیں ان سے بھی صرف زائد اموال لیے جائیں۔ اور ان میں آباد فقراء پر صرف کیے جائیں۔ نیز میں خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کا خیال رکھے: ان کے ساتھ عہد کو پورا کرے۔ اور ان کی طرف سے لڑائی کرے؛ اور انہیں ان کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف نہ ٹھہرایا جائے۔

جب ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی؛ اور ہم ان کی میت کو دفن کرنے کے لیے لے کر چلے؛ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کو سلام عرض کیا اور درخواست کی کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اجازت طلب کرتے ہیں۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: انہیں اندر لے آیئے۔ آپ کو اندر لے جایا گیا۔ اپنے ساتھیوں کیساتھ دفن کیا گیا۔ جب ان کے دفن سے فارغ ہوئے؛ تو شوریٰ کے ارکان جمع ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا اس معاملہ کو اپنے میں سے تین آدمیوں کے سپرد کر دو۔ چنانچہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: میں حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبردار ہوتا ہوں۔ حضرت عبدالرحمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تم میں سے کون اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہے کہ ہم اس کو خلافت کا اختیار سونپ دیں؟۔ ہم اس کو اللہ تعالیٰ اور اسلام کا واسطہ دیتے ہیں کہ وہ دیکھے تم میں سے کون افضل ہے؟

حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما خاموش رہے۔تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تم یہ معاملہ میرے سپرد کرتے ہو؛ تو میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں کہ: ''میں تم سے افضل کے انتخاب میں کوتاہی نہیں کروں گا''۔

ان دونوں کہا: ٹھیک ہے۔ چنانچہ عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ''آپ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت؛ اور اسلام میں سبقت ہے جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں؛ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں اگر ہم نے آپ کو خلیفہ بنایا تو آپ نے راہ اعتدال اختیار کرنا ہوگی؛ اور اگر عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا تو پھر تو نے اس کی سمع و اطاعت کرنی ہوگی۔ اس کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ سے تنہائی میں وہی بات کہی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہی تھی۔ جب اس نے دونوں سے پختہ عہد لے لیا تو آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہا: ''آپ اپنا ہاتھ اٹھائیں؛ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کی، پھر تمام گھر میں موجود لوگوں نے بیعت کی''۔

✪ یہ حدیث صحیح اور مرفوع روایت کا ایک حصہ ہے۔ شمائل ترمذی (رقم ۹۷)۔ الصحیحة (۱٤٤۱)۔ البخاری ۳۱۰۰۔

حمید بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ سے روایت ہے: بے شک حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ:

''جن لوگوں کو عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لیے منتخب کیا تھا وہ جمع ہوئے؛ تو انہوں نے مشورہ کیا؛ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا؛ میں خلافت کو پسند نہیں کرتا؛ ہاں اگر تم پسند کرتے ہو تو میں تم میں سے کسی ایک کا انتخاب کر دیتا ہوں۔ انہوں نے معاملہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا۔ چونکہ خلافت کا معاملہ ان کے سپرد ہو چکا تھا چ اس بنا پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاں لوگوں کا ہجوم رہتا تھا؛ حتی کہ جو لوگ شوریٰ کے ارا کین کے پیچھے پیچھے گھوم رہے تھے وہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہو گئے۔ رات دن مشورہ ہوتا رہا۔ حتی کہ جب وہ رات آئی جس کی صبح عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اس رات کے بارے میں مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ رات گزرنے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے میرے دروازہ پر دستک دی۔ میں بیدار رہا؛ انہوں نے کہا: میرا خیال ہے آپ سوئے ہوئے تھے؟

اللہ کی قسم! میں تو ان تین راتوں میں کچھ زیادہ نیند نہیں کر سکا۔ آپ جائیں زبیر رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ کو بلا لائیں۔ میں نے ان دونوں کو آپ کے پاس بلا لایا۔ آپ نے ان دونوں سے مشورہ کیا۔ پھر مجھے بلایا اور کہا علی رضی اللہ عنہ کو بلا لاؤ۔ میں ان کو بھی بلا لایا۔ آپ ان سے آدھی رات تک سرگوشی کرتے رہے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے لیکن وہ پر امید تھے۔ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کچھ خوف رکھتے تھے [1]۔

[1] ۔حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خوف اس بات کا تھا کہ اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی تو ایسا نہ ہو کہ آپ ان کی بیعت نہ کریں؛ اور اس طرح ایک اور انتشار پیدا ہو جائے۔

پھر انہوں نے مجھ سے کہا: اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو میرے پاس بلا لاؤ۔ چنانچہ میں نے انہیں بلا لایا۔ تو ان سے سرگوشی ہوتی رہی؛ حتی کہ مؤذن کی صبح کی اذان نے انہیں جدا کیا۔ جب لوگ صبح کی نماز سے فارغ ہوئے؛ تو شوریٰ کے ارکان منبر کے قریب جمع ہونے شروع ہوئے۔ جو وہاں مہاجرین، انصار موجود تھے سب کو بلایا گیا۔ لشکروں کے کمانڈروں کی طرف پیغامات بھجوائے گئے؛ انہوں نے اس سال عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج ادا کیا تھا۔ جب تمام اکٹھے ہو گئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے

خطبہ پڑھا؛ پھر فرمایا: اَمـاَّ بـعـد: اے علی رضی اللہ عنہ! میں نے خلافت کے بارے میں لوگوں میں غور کیا، میں نے دیکھا کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔ دیکھنا اپنے لیے کوئی نیا راستہ نہ نکال لینا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: میں تیرے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت؛ اور آپ کے بعد آپ کے دونوں خلیفوں کی سنت کے مطابق بیعت کرتا ہوں''۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بیعت کر لینے کے بعد مہاجرین وانصار اور لشکروں کے امیروں اور عام مسلمانوں نے بیعت کی''۔ ❶

❶ حدیث صحیح ھے۔ بخاری (۷۲۰۷)۔

عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل:

آپ کے خاص فضائل میں سے ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوہرے داماد ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے؛ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں لیٹے ہوئے تھے، آپ کے رانوں یا پنڈلیوں پر کپڑا نہ تھا، کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنے کی اجازت طلب کی انہیں کو اجازت دی گئی؛ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی حال میں رہے؛ ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی؛ انہیں بھی اجازت دی گئی؛ اور آپ اسی حال میں ان سے باتیں کرتے رہے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ گئے، آپ نے اپنے کپڑے درست فرمائے۔ وہ تشریف لائے؛ تو ان سے بھی گفتگو ہوئی۔ جب وہ چلے گئے تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے؛ تو آپ نے اس کی آمد پر کچھ اہتمام نہ کیا؛ اور نہ ہی اس کی کچھ پرواہ کی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ داخل ہوئے؛ آپ نے ان کا بھی کچھ اہتمام نہ کیا؛ اور نہ ہی کوئی پروا کی۔ لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے؛ تو آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اپنا لباس درست کیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں اس انسان سے کیوں نہ حیاء کروں جس سے فرشتے بھی حیاء کرتے ہیں''۔ ❶

نیز صحیح حدیث میں ہے؛ جب بیعت رضوان کا دن تھا؛ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا ہوا تھا۔ بیعت رضوان حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ جانے کے بعد پیش آئی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دائیں ہاتھ اٹھایا اور فرمایا: ''یہ عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ ہے'' اور اس کو دوسرے ہاتھ پر رکھا اور فرمایا: ''یہ عثمان کی بیعت ہے''۔ ❷

❶ صحیح ہے۔ الارواء (۲۶۹)۔ السنة (۱۲۸٤، ۱۲۸۵)۔ من طرق عائشة رضي الله عنها وفي بعضها "كاشفاً عن فخذيه" بدون شك۔ وله شاهدان خرجتهما هناك۔ أحدهما عن حفصة؛ و قد أخرجه ابن أبي عاصم في السنة من طريقين عنها۔

❷ صحيح بخاري من حديث ابن عمر۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ پہلے حضرت ابوبکر اور پھر حضرت عمر اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کو فضیلت دینا۔ [اس کے متعلق] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کے سب سے بہترین انسان جناب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ؛ اور پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ ہم ان تینوں کو ایسے ہی مقدم سمجھتے ہیں؛ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سمجھا کرتے تھے؛ اور ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اور ہم حضرت عبداللہ تعالیٰ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو اپنا مذہب بناتے ہیں، [جس میں ہے]: ,,ہم [ایسے] شمار کیا کرتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے، اور صحابہ بھی کثرت سے موجود تھے: [ہم کہتے پہلا مقام] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین اور پھر ہم خاموش ہوجاتے،،۔ شرح أصول اعتقاد اہل سنت والجماعت؛ لالکائی ۱/ ۱۵۹۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، مسند کے محققین کا کہنا ہے: امام مسلم کی شرائط کے مطابق یہ حدیث صحیح ہے۔ امام

علی المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''نبی کریم ﷺ کے بعد امت کے سب سے بہترین انسان جناب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ؛اور پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ ہم ان تینوں کو ایسے ہی مقدم سمجھتے ہیں ؛ جیسے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سمجھا کرتے تھے ؛ اور ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا،،۔

اس کی اصل بخاری میں حضرت عبداللہ تعالیٰ بن عمر رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے [جس میں ہے] :,,ہم [ایسے] شمار کیا کرتے تھے، اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو نہ سمجھتے تھے ؛ پھر عمر اور پھر عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین اور پھر ہم چھوڑ دیتے [کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دیتے]،،۔

شروع شروع میں بعض اہل سنت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن جمہور اہل سنت والجماعت نے اس کا انکار کیا اور انہیں غلط کہا ؛ لیکن انہوں نے ان کو بدعتی نہیں قرار دیا۔ امام خلال رحمہ اللہ نے اسحٰق بن ابراہیم رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں: میں نے ابوعبداللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ترجیح دیتے ہیں؟۔ تو آپ نے فرمایا: ,,یہ انتہائی برا انسان ہے، ہم اس سے شروع کرتے ہیں جو نبی کریم ﷺ کے صحابہ نے کہا ہے، اور جس کو انہوں نے فضیلت دی ہے،،۔ [السنۃ لخلال ۳۷۸۔]

بکر بن محمد سے روایت ہے، وہ ابوعبداللہ سے نقل کرتے ہیں، ان سے اس انسان کے بارے میں سوال کیا جو کہتا ہے: ,,پہلے ابوبکر پھر عمر پھر علی اور پھر عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین ؟۔ آپ نے فرمایا: یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں نے کہا: کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مبتدع ہے؟۔ تو فرمایا: میں اس بات کو مکروہ سمجھتا ہوں کہ اسے سخت بدعت کی طرف منسوب کیا جائے،،۔ [السنۃ لخلال ۳۷۸۔]

اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کا عقیدہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر مقدم سمجھنا [افضلیت دینا] ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے انہیں خلافت میں ترجیح دی ہے۔ اور حضرت عبداللہ تعالیٰ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے فرمان کی وجہ سے ؛ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو آپ نے فرمایا: ,,ہم نے پر باقی رہ جانے والوں میں سے سب سے بہترین آدمی کو امیر بنایا گیا، اور ہم اس سے ادھر ادھر نہیں ہٹے،،۔ [السنۃ لخلال ۳۸۴۔]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فضیلت میں خلفاء کی ترتیب ذکر کرنے کے بعد ؛ کہ خلفاء کی خلافت میں ترتیب ان کے فضائل میں ترتیب کے اعتبار سے ہے ؛ لکھتے ہیں: ,,اور جیسے بیعت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ترجیح دینے پر صحابہ کا اجماع ہے۔ حالانکہ بعض اہل سنت کا حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے بارے میں اختلاف ہوا تھا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ترجیح دینے پر ان کا [بھی] اتفاق تھا۔ بعض لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ترجیح دی اور خاموش ہو گئے۔ یا پھر چوتھا مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیا۔ اور بعض نے توقف اختیار کیا۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ترجیح دینے پر اہل سنت کا اتفاق ہی رہا۔ اگرچہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مابین فضیلت کا مسئلہ ان بنیادی مسائل میں سے نہیں ہے، کہ جمہور اہل سنت کے ہاں اس کی مخالفت کرنے والے کو گمراہ سمجھا جائے۔ لیکن وہ مسئلہ جس میں مخالف کو گمراہ سمجھا جائے گا، وہ مسئلہ خلافت کا ہے،،۔ [مجموع الفتاوی ۳/۱۵۳]۔

جب کہ ان تین کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو [باقی صحابہ پر] ترجیح وفضیلت اہل سنت والجماعت کے اجماع کی وجہ سے ؛ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد خلافت کے لیے ان کی بیعت کرنے کی وجہ سے دی جاتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اور یقیناً اہل سنت والجماعت کے علماء ؛ عباد ؛ حاکم، لشکر ؛ [یعنی تمام لوگ] اس بات پر متفق ہیں، سب کہتے ہیں: ,,ابوبکر پھر عمر پھر عثمان اور پھر علی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ [مجموع الفتاوی ٣/ ٤٠٦۔]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: (ثُمَّ لِعَلِيِ بْنِ أَبِی طَالِبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ)

'' پھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ [کے لیے خلافت ثابت کرتے ہیں]''۔

تشریح ......: یعنی ہم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد خلافت کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت مانتے ہیں۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ؛ تو لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ چنانچہ آپ برحق خلیفہ اور واجب الاطاعت امام قرار پائے۔

ان کی خلافت نبوت کی خلافت تھی۔ جیسا کہ اس پر حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا؛ اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نبوت کی خلافت تیس سال تک ہوگی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اپنا ملک عطا کرے گا۔'' ❶

❶ حديث حسن هے۔أبو داؤد ٤٦٤٦ .

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مدت دو سال تین ماہ ہے؛ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت ساڑھے دس سال ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت بارہ سال؛ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت چار سال نو ماہ۔ اور حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت چھ ماہ ہے۔ اور مسلمانوں کے پہلے بادشاہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ تمام مسلمان بادشاہوں میں سے بہتر تھے۔ آپ اس وقت امام برحق ٹھہرے جب حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے بار خلافت ان کے سپرد کردیا۔ بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اہل عراق نے ان کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔ پھر چھ ماہ بعد آپ نے بار خلافت حضرت امیر معاویہ کے سپرد کردیا؛ اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارت پوری ہوئی:

''بے شک میرا یہ بیٹا سردار ہے؛ عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے درمیان صلح کرائے گا۔'' ❶

(یہ واقعہ اپنی جگہ پر مشہور ہے)۔

❶ بخاري ٢٧٠٤ ، مسلم من حديث ابى بكرة۔

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت ثابت ہے؛ جو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے منعقد ہوئی۔ سوائے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام کے؛ [انہوں نے بیعت نہ کی]۔ جبکہ حق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ بے شک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ؛ اور دیگر اکابر صحابہ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ جو مدینہ منورہ میں اقامت پذیر تھے؛ کے خلاف جھوٹے اور بہتان پر مبنی افسانے تراشے گئے۔ اور جو لوگ صحیح صورت حال سے واقف نہ تھے وہ بہت بڑے شبہات میں مبتلا ہوگئے۔ ایسے ہی خود غرض اور خواہشات کے غلام لوگوں میں خواہش پرستی زور پکڑ گئی۔ خاص طور پر وہ لوگ جن کے علاقے شام سے بھی دور تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محفوظ رکھا تھا؛ انہوں نے کبھی اپنے اکابر کے خلاف لب کشائی نہ کی۔ البتہ ان تک ان لوگوں سے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ جن میں سے کچھ خبریں جھوٹی اور بے سروپا ہوتیں؛ اور کچھ میں تحریف کی گئی ہوتی۔ اور کچھ خبریں ایسی ہوتیں جن کے منہ یا سر کا کوئی پتہ نہ ہوتا۔ پھر ان کے ساتھ وہ لوگ بھی مل گئے تھے جو [اقتدار کے بھوکے تھے] زمین میں سرکشی چاہتے تھے۔ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں وہ سرکش خوارج بھی تھے؛ جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ اور کسی متعین قتل کرنے والے کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کچھ ایسے افراد بھی تھے جن کی پشت پناہی ان کے قبائل کررہے تھے۔ اور کچھ لوگ ایسے تھے جن کے کرتوتوں پر کوئی حجت/گواہی نہیں پیش ہوسکی تھی۔ اور کچھ ایسے افراد بھی تھے جن کے دلوں میں نفاق تھا؛ لیکن ان کے لیے اس مکمل نفاق کا اظہار ناممکن تھا۔ ان حالات میں حضرت طلحہ، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے مظلوم شہید عثمان کا بدلہ نہ لیا؛ اور فسادیوں کا قلع قمع نہ کیا؛ تو ان پر اللہ تعالیٰ کا غیظ و غضب اور عقاب واجب ہوجائے گا۔ چنانچہ جنگ جمل [۳۶ھ] اسی کشمکش کا نتیجہ تھی؛ اس میں حضرت علی، اور حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم بے اختیار تھے۔ اس جنگ کا فتنہ

پھیلانے والے وہی فسادی تھے؛ اس میں حضرات سابقین اولین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بے اختیار نظر آتے ہیں۔ پھر اس کے بعد جنگ صفین [۳۷ھ] کا فتنہ پیش آیا؛ جو کہ رائے کا نتیجہ تھا۔ بات یہ تھی کہ اہل شام نے ان کے حق خلافت کو قبول نہیں کیا تھا۔ ان کی تعداد بہت بڑی تھی۔ ان کے بغیر امت کا اجماع ممکن نہیں تھا۔ اور انہیں فوجی بغاوت کا بھی خوف تھا؛ جیسا کہ ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید مظلوم کے خلاف بغاوت کر کے انہیں شہید کر دیا۔ [دوسری طرف] حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد؛ برحق خلیفہ تھے؛ آپ کی اطاعت واجب تھی۔ اور یہ بھی واجب تھا کہ مسلمان ایک امیر پر مجتمع ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ آپ کی اطاعت اور مسلمانوں کی جماعت بندی یہ دونوں واجب ان کے ساتھ لڑائی کے نتیجہ میں حاصل ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان سے تو واجب پورا کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اور آپ کا خیال تھا کہ اس طرح سے آپ کے ذمہ بھی جو واجب ہے وہ ادا ہو جائے گا۔ [تو آپ نے ان لوگوں کے ساتھ لڑائی کا اعلان فرمایا]۔

آپ کا اندازہ نہیں تھا کہ ان کو ایک جگہ جمع کرنا ایسے ہی مشکل کام ہے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد دونوں خلفاء کے دور میں تالیف قلبی کا رجحان غالب رہا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حالات کا جائزہ لیکر اس بات پر پہنچے کہ ان پر اسلامی حدود کا نفاذ کرنا؛ اور فتنہ کو ختم کرنا دین ہے؛ اس میں بلا قتال کسی کی تألیف قلبی کی رعایت نہ کی جائے۔ اور اس خیال نے آپ کو جنگ پر آمادہ کیا۔ لیکن فتنہ کے اس دور میں اکثر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم الگ تھلگ رہے؛ انہوں نے وہ نصوص سن رکھی تھیں جن میں فتنوں کے دور میں گھروں میں بیٹھے رہنے کا حکم تھا۔ اس لیے کہ فتنہ میں شریک ہونے سے اس کی خرابی کا پلہ بھلائی پر غالب آ جاتا ہے۔ لیکن ہم تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں اچھی بات کہتے ہیں کہ:

﴿رَبَّنَآ اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحشر: ۱۰)

''اے ہمارے رب! اور ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے؛ اور مومنوں کی بابت ہمارے دل میں کینہ پیدا نہ کر، ہمارے رب بے شک تو رؤوف ورحیم ہے۔''

اور آپ کی خلافت کے ایام میں جو فتنے پیش آئے؛ اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمارے ہاتھوں کو محفوظ رکھا ہے؛ اب ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضل وکرم سے ہماری زبانوں کو بھی ان فتنوں سے محفوظ فرمائے۔ [آمین]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل:

بخاری، مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''تو میرے ساتھ ایسے ہی ہے جیسے حضرت ہارون علیہ السلام؛ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ، بس اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے''۔ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن فرمایا:

'' لأعطين الراية غداً رجلاً يحب الله و رسوله و يحبه الله و رسوله ۔'' [رواه البخاری ۵/ ۱۸]

''کل میں یہ جھنڈا ایسے آدمی کو دوں گا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے' اور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔''

(راوی بیان کرتے ہیں) کہ ہم سب اس کے آرزومند تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ کو میرے پاس بلالاؤ ''۔ ان کو آپ ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو ان کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے ان کی آنکھوں میں تھوکا؛ اور جھنڈا ان کے ہاتھ میں دیا، اللہ تعالیٰ نے فتح وکامرانی سے ہمکنار کیا''۔ ❷

✪ حدیث صحیح ھے۔ الارواء (۱۱۸۸)، السنة (۱۳۳۱ ، ۱۳٤٥)۔البخاری ۳۷۰٦ ؛ ۲٤۰٤۔

✪ البخاری ۳۰۰۹ ، مسلم ۲٤۰٦ ؛ من حدیث من سهل بن سعد۔ السنة (۱۳٥۱ ، ۱۳۷۷)۔

نیز جب اس آیت کا نزول ہوا:

﴿فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا وَ اَبْنَآءَ كُمْ وَ نِسَآءَ نَا وَ نِسَآءَ كُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ﴾(آل عمران: ٦١)

''فرمادیجیے: آؤ ہم اپنے بچوں کو بلائیں تم اپنے بچوں کو؛ ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تو اپنی عورتوں کو؛ اور ہم خود اپنے نفس پیش کریں تم اپنے آپ کو''۔

''تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا: یا اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔'' ❶

✪ مسلم ۲٤۰٤ (۷/ ۱۲۰/ ۱۲۱) ترمذی نے صحیح کہا۔وله شاهد عند ابن أبی عاصم ۱۳٥۱۔

خلافت راشدہ:

امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان: (وَهُمُ الْخُلَفَاءَ الرَّاشِدُوْنَ وَالأَئِمَّةِ الْمَهْدِيُّونَ . ❶)

''اور یہ حضرات [چاروں] خلفاء راشدین ہیں اور ہدایت یافتہ ائمہ کرام ہیں''۔

❶۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ ' تَمَسَّكُوا بِهَا ؛ وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ ؛ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ ' فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ ' وَ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ......))[مسند أحمد : ٤/ ١٢٦۔سنن أبی داؤد' كتاب السنة 'ح : ٤٦٠٧۔ سنن الترمذي 'ح : ٢٦٧٦]''تم پر میرا طریقہ اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء کا طریقہ اپنانا لازم ہے؛ اسے مضبوطی سے تھام لو؛ اور اپنی داڑھ کے دانتوں سے پکڑ لو۔ اور نئے نئے کام ایجاد کرنے سے بچو؛ بیشک ہر نیا کام بدعت ہے' اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔

علامہ بربہاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:''اصل اہل سنت والجماعت اصحاب محمد ﷺ اور ان کے بعد آنے والے وہ لوگ ہیں جو بھلے طریقہ سے ان کی راہ پر چلتے رہے۔ یعنی کتاب وسنت کی پیروی کرتے رہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:''بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں کی طرف دیکھا' ان دلوں میں سب سے بہتر دل محمد ﷺ کا پایا تو ان کو اپنی رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ اس کے بعد پھر اپنے بندوں کے دلوں میں دیکھا تو محمد ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں کو سب سے بہتر پایا' تو ان کو اپنے نبی کریم ﷺ کی صحبت اور اپنے دین کی نصرت و مدد کے لیے چن لیا''۔ اس اثر سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ جن دلوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بہترین ہونے کا فیصلہ کر لیا ہو اور وہ حق پانے سے رہ جائیں اور ان کے بعد کے لوگ حق پا کر کامیاب ہو جائیں؛ یہ محض احمقانہ سوچ اور بدنیتی اور حسد پر مبنی بات ہے۔

تشریح ......: سنن کی مروی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔ ترمذی (۲۸۲۸) نے اسے صحیح کہا۔ حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پر تاثیر وعظ فرمایا؛ جس سے آنکھیں اشک بار ہو گئیں؛ اور دل خوف زدہ ہو گئے۔ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ! یہ تو الوداعی وعظ معلوم ہوتا ہے؛ آپ ہمیں کس بات کی وصیت کرتے ہیں؟

تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمہیں سمع و اطاعت کی وصیت کرتا ہوں؛ بیشک تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا؛ وہ عنقریب بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا۔ پس تم پر میری سنت کو اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا واجب ہے۔ سنت کے ساتھ تمسک اختیار کرو اور اسے کنچلی کے دانتوں سے پکڑ لو؛ دیکھو: تم اپنے آپ کو نئی ایجادات سے بچاؤ؛ بے شک ہر نئی ایجاد گمراہی ہے''۔ ❶

☼ حديث صحيح هے۔ ترمذی (۲۸۲۸)۔

اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی فضیلت میں وہی ترتیب ہے جو ترتیب ان کی خلافت میں ہے۔ البتہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی سنت کی پیروی کا حکم دیا ہے لیکن افعال میں اقتدا کا حکم صرف ابوبکر، عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں دیا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''میرے بعد ان دو یعنی ابوبکر، عمر رضی اللہ عنہما کی اقتدا کرو''۔ ❶

معلوم ہوا کہ حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی سنت کے اتباع اور ان کی اقتداء میں فرق ہے۔ پس ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا مقام عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ کے مقام سے بلند ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ایک روایت آئی ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مقدم رکھتے تھے۔ لیکن ان کا ظاہری مذہب یہی تھا کہ حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہما سے مقدم ہیں۔

تمام اہل سنت کا یہی عقیدہ ہے۔ نیز حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: ''میں نے تمام لوگوں کو جائزہ لیا، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے''۔ [البخاری ۷۲۰۷]

حضرت ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''جس شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر مقدم نہ رکھا اس نے مہاجرین اور انصار رضی اللہ عنہم اجمعین سے جفا کی''۔

نیز بخاری و مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ بقید حیات تھے تو ہم کہا کرتے تھے: ''نبی اکرم ﷺ کے بعد تمام امت میں سے افضل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عمر اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہما ہیں''۔ ❷

☼ حديث صحيح هے۔ الصحيحة (۱۲۳۳). ترمذی ۳۹۲٤.

✵ صحیح ہے ابوداؤد صحیح سند کے ساتھ لائے ہیں بخاری ۳۶۹۷ میں بھی اس طرح ہے، البتہ مسلم میں نہیں ہے۔ ابن أبی عاصم فی السنة (۱۱۹۰۔۱۱۹۹)۔ ظلال الجنة (۲/ ۵٦٦، ۵۲۹)۔

مناقب عشرہ مبشرہ

۹۵۔((وَأَنَّ الْعَشَرَةَ الَّذِيْنَ سَمَّاهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ وَبَشَّرَهُمْ بِالْجَنَّةِ نَشْهَدُ لَهُمْ بِالْجَنَّةِ عَلَى مَا شَهِدَ لَهُمْ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ وَقَوْلُهُ الْحَقُّ وَهُمْ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ وَعُثْمَانُ وَعَلِيٌّ وَطَلْحَةُ وَالزُّبَيْرُ وَسَعْدٌ وَسَعِيْدٌ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ وَأَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ وَهُوَ أَمِيْنُ هٰذِهِ الأُمَّةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِيْنَ .))

''جن دس صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپ نے نام لیا اور انہیں جنت کی خوشخبری سنائی ہم بھی ان کے بارے میں جنت کی گواہی دیتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گواہی دی، آپ کا فرمان برحق ہے ان کے نام یہ ہیں: ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، سعید، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم؛ آپ تو اس امت کے امین ہیں''۔

تشریح......: چاروں خلفا کے کچھ فضائل پہلے ذکر ہو چکے ہیں دیگر چھ صحابہ کے فضائل ذکر کیے جاتے ہیں۔ مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار رہے؛ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کاش میرے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی صالح انسان آج رات مجھ پر پہرہ دے''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''اتنے میں ہم نے ہتھیاروں کی آوازیں سنیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: یہ کون ہیں؟ عرض کیا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں سعد بن ابی وقاص ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہرہ دینے کے لیے آیا ہوں''۔

دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں: ''میرے دل میں آپ کے بارے میں خوف پیدا ہوا تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہرہ دینے کے لیے حاضر ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں دعا کی اور محو خواب ہو گئے''۔ ❶

نیز بخاری، مسلم میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے دن حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے لیے اپنے ماں باپ کو جمع کرتے ہوئے فرمایا: ''اے سعد! تیر اندازی کرو، تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں''۔ ❷

❶ مسلم عن سعد بن ابی وقاص۔ السنة (۱۴۱۲).

❷ حدیث صحیح ھے۔ السنة (۱۴۰۵، ۱۴۰۸)۔البخاری ۲۹۰۵؛ مسلم ۲۴۱۱؛ عن علی وعن سعد۔

نیز صحیح مسلم میں حضرت قیس بن حازم رحمہ اللہ سے مروی ہے؛ فرماتے ہیں: ''میں نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ دیکھا وہ شل ہو چکا تھا؛ جس کے ساتھ اس نے احد کی جنگ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مدافعت کی تھی''۔ ❶

❶ حدیث صحیح ھے البتہ مسلم میں نہیں ھے بخاری (۳۷۰۴) میں ھے۔

نیز صحیح مسلم میں ابوعثمان نہدی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ بعض جنگوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف طلحہ اور سعد رضی اللہ عنہما برابر شریک رہے۔ ❶ یعنی انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ چھوڑا''۔

❶ حدیث صحیح ھے نیز بخاری ۳۷۲۲ میں بھی ھے۔مسلم ۲۴۱۴۔

نیز بخاری، مسلم میں ہے (البتہ الفاظ مسلم کے ہیں) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے دن لوگوں کو بلایا، تو زبیر آ گئے، دوبارہ بلایا تو بھی زبیر آئے۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر نبی کے مددگار ہوتے ہیں، میرے مددگار زبیر رضی اللہ عنہ ہیں''۔ ❶

❶ صحیح ھے۔ بخاری ۲۴۱۵، مسلم ۳۸۴۶۔ السنة (۱۳۸۸۔ ۱۳۹۳)۔

نیز بخاری ومسلم میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بنوقریظہ کے پاس کون جا کر مجھے ان کے بارے میں مطلع کرے گا، چنانچہ اس کام کے لیے میں گیا''۔ جب میں واپس لوٹا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ماں باپ کو جمع کرتے ہوئے فرمایا: ''تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہو''۔ ❶

نیز صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک ہر امت کا امین ہوتا ہے۔ لیکن اے امت! ہماری اس امت کا امین ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہیں''۔ ❶

نیز بخاری ومسلم میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اہل نجران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے عرض کیا:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہماری طرف کسی امین انسان کو بھیجیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں ضرور ایسے انسان کو ہی بھیجوں گا، جو ایسا امین ہوگا کہ امانت کا حق ادا کرے گا''۔

(راوی بیان کرتا ہے): ''لوگوں نے اس شرف کا حقدار بننے کی آرزو کی''۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا''۔ ❶

نیز حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''دس انسان جنتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں ہوں گے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے''۔ اور فرمایا: ''اگر میں چاہوں تو بتا سکتا ہوں کہ دسواں کون ہے؟۔ لوگوں نے پوچھا: وہ کون ہے؟۔ تو آپ جواب دیا: ''سعد بن زید رضی اللہ عنہ ہے''۔

نیز فرمایا: ان میں سے کسی ایک کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنی دیر تک ساتھ دینا جس میں اس کا چہرہ کا غبار آلود ہو؛ تم میں سے کسی ایک کے عمل سے بہتر ہے اگر چہ اسے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر عطا ہو جائے'' ❷۔

نیز ترمذی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت سعید بن زید، بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ جنت میں ہوں گے۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم جنتی ہیں''۔ ❸ رواہ احمد۔

❶ صحیح ھے۔ بخاری ۳۷۲۰، مسلم ۲۸٤٦۔ السنة (۱۳۹۰)۔

❶ حدیث صحیح ھے بخاری ۳۷٤٤ میں بھی ھے۔ مسلم ۲٤۱۹۔

❶ صحیح بخاری ۳۷٤٥، مسلم ۲٤۲۰۔

❷ حدیث صحیح ھے ابوداؤد، ابن ماجه، ترمذی۔ اس نے صحیح کہا ھے۔

❸ حدیث صحیح ھے مسند احمد بن جنبل۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت امام ابوبکر بن ابی خثیمہ رحمہ اللہ سے بھی اس کو روایت کیا ہے؛، اس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مقدم کیا گیا ہے۔ نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حراء (پہاڑ) پر تھے آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ تو چٹان میں حرکت آ گئی۔ آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''رک جا، تجھ پر یا نبی ہے یا صدیق یا شہید [ان کے علاوہ کوئی نہیں]''۔ ❶

اسے امام مسلم امام ترمذی رحمہما اللہ اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔ اور اس کی مختلف اسناد ہیں۔

❶ مسلم ۲٤۱۷، ترمذی ۳۹٦۳، مسند احمد (۲/ ٤۱۹) حدیث صحیح ہے۔ السنة (۱٤۲٥، ۱٤۳۹، ۱٤٤۳)۔

اور [اہل سنت والجماعت کا] خلفاء راشدین اور اہل شوریٰ کے بعد باقی عشرہ مبشرہ کو فضیلت دینا؛ یہ اس لیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے جنت کی گواہی دی ہے؛ اور ان کے نام لے کر انہیں متعین کیا ہے۔ جو باقی لوگوں پر ان کی فضیلت کی دلیل ہے۔ امام مزنی رحمہ اللہ خلفاء راشدین کی ترجیح اور باقی لوگوں پر ان کی فضیلت ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ,,پھر ان کے بعد عشرہ مبشرہ میں سے باقی ان لوگوں کا درجہ ہے جن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے جنت کو واجب قرار دیا ہے،،۔ شرح السنة للمزنی ۸٦۔ امام ابن بطہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ,,عشرہ مبشرہ کے لیے [جنت کی] گواہی دی جائے گی؛ اور ان پر فضیلت اور بہتری میں کسی کو ترجیح نہیں دی جائے گی،،۔ الابانة الصغری لابن بطة ۲٦۰-۲٦۱۔

جن کا تذکرہ گزر گیا، ان کے بعد اہل بدر کی فضیلت ہے، ان کی فضیلت کے عام دلائل کی وجہ سے ہے؛ جو کہ احادیث کی کتابوں میں مشہور ہیں۔ امام لالکائی رحمہ اللہ نے احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے...... آپ نے فرمایا: ,,اہل شوریٰ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے اہل بدر مہاجرین، اور پھر اہل بدر انصار، ہجرت اور نصرت کے اعتبار سے درجہ بدرجہ ہیں،،۔ [شرح أصول اعتقاد أهل السنة ۱/ ۱٥۹۔]

ان دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت شان اور تقدیم پر تمام اہل سنت متفق ہیں۔ اس لیے کہ ان کے فضائل اور مناقب بہت مشہور ہیں۔ لیکن اس شخص سے بڑا جاہل کون ہو سکتا ہے جو دس کے لفظ کو زبان پر لانا؛ یا ایسا کام کرنا جس میں دس کا عدد آتا ہو؛ مکروہ جانتا ہے۔ اس لیے کہ اس قسم کے لوگ سب سے بہترین مخلوق حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے دشمنی رکھتے ہیں؛ وہ دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کے جنتی ہونے کی گواہی دی گئی ہے''۔ [منهاج السنة النبوية ۱/ ۳۸]

اور وہ ان میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ لوگ نو کے عدد سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں؛ اور دس صحابہ رضی اللہ عنہم [عشرہ مبشرہ] میں سے نو صحابہ سے بغض رکھتے ہیں۔ نیز تمام مہاجرین، انصار سابقین اولین رضی اللہ عنہم اجمعین سے بغض رکھتے ہیں؛ جنہوں نے درخت کے نیچے آپ سے بیعت کی تھی؛ جن کی تعداد چودہ سو تھی؛ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح: ۱۸)

''یقیناً اللہ تعالیٰ مؤمنین پر راضی ہو گئے جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے۔''

صحیح مسلم میں ہے؛ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں؛ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص نے درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے وہ دوزخ میں داخل نہیں ہو گا''۔ ❶

❶ حدیث صحیح ھے۔ السنة (۸٦۰، ۸٦۱)۔ الصحیحة (۲۱٦۰)۔

صحیح مسلم میں ہے؛ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے غلام نے کہا:

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! حاطب دوزخ میں جائے گا''۔

آپ نے فرمایا: ''تو جھوٹ کہتا ہے وہ دوزخ میں نہیں جائے گا؛ بے شک وہ تو بدر اور حدیبیہ میں حاضر تھا''۔ ❶

☼ حدیث صحیح ھے۔مسلم ۲٤۹٦۔

روافض جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے براءت کا اظہار کرتے ہیں؛ بلکہ سوائے چند افراد کے جن کی تعداد تیرہ (۱۳) سے زیادہ نہیں، سب سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں اگر دنیا میں دس انسان عظیم کفر والے فرض کر لیے جائیں؛ تو تب بھی اس عدد [نام] کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝﴾ (النمل : ٤٨)

''اور شہر میں نو گروہ تھے جو ملک میں فساد کیا کرتے تھے اور اصلاح سے کام نہیں لیتے تھے۔''

تو اس وجہ سے نو کے عدد کو مطلق طور پر ترک کرنا واجب نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے دس کے عدد کے مسمیٰ کی قرآن پاک میں کئی مقام پر تعریف کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ (البقره : ١٩٦)

''یہ پورے دس ہوئے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَوٰعَدْنَا مُوسٰى ثَلٰثِينَ لَيْلَةً وَّأَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ﴾ (الاعراف : ١٤٢)

''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس رات کو وعدہ لیا اور اس کی تکمیل دس رات کے ساتھ کی۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝﴾ (الفجر : ۱،۲)

''قسم ہے صبح کی اور دس راتوں کی۔''

نیز ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دن اعتکاف بیٹھا کرتے تھے۔ ❶

☼ بخاری، مسلم من حدیث ابن عمر۔

نیز آپ نے لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا: ''اس کو رمضان کے آخری دس دنوں میں تلاش کرو''۔ ❶

☼ البخاری من حدیث ابن عباس نیز اس کو ترمذی نے صحیح کہا ھے۔

نیز آپ نے فرمایا: ''ذوالحجہ کے دس سے زیادہ اور کوئی دن نہیں ہیں کہ ان میں عمل صالح اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہو''۔ ❶

☼ حدیث صحیح ھے۔ مقفق علیه حدیث ابن عمر۔ الصحیحة (١٤٧١)۔ صحیح ابی دائود (١٢٥٠، ١٢٠٢)۔ منهاج السنة النبویة ١/ ٤٠۔

روافض عشرہ مبشرہ کی بجائے اپنے بارہ ائمہ سے موالات رکھتے ہیں؛ ان کے ہاں پہلے امام حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (۲۳ ق ھ-۴۰ ھ) ہیں۔ جن کے متعلق وہ دعوی کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں خلافت کی وصیت کی تھی۔ حقیقت میں یہ بغیر دلیل کے خالی دعویٰ ہی ہے۔ ان کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ (۳ ھ-۵۰ ھ) ان کے بعد حضرت حسین رضی اللہ عنہ (۴-۶۱ ھ) ان کے بعد حضرت زین العابدین رحمہ اللہ علیہ (۳۳ ھ-۹۴ ھ) ان کے بعد حضرت محمد بن باقر رحمہ اللہ علیہ (۵۷ ھ-۱۱۴ ھ)، ان کے بعد حضرت جعفر بن محمد الصادق رحمہ اللہ علیہ (۸۰-۱۴۸ ھ)، ان کے بعد حضرت موسیٰ بن جعفر الکاظم رحمہ اللہ علیہ (۱۲۸-۱۸۳ ھ) ان کے بعد حضرت علی بن موسیٰ رضا

رحمہ اللہ (۱۵۳ھ-۲۰۳ھ)، ان کے بعد حضرت محمد بن علی جواد (۱۹۵-۲۲۰ھ)، ان کے بعد حضرت علی بن محمد ہادی رحمہ اللہ (۲۱۴ھ-۲۵۴ھ)، ان کے بعد حضرت حسن بن علی عسکری رحمہ اللہ (۲۳۲ھ-۲۶۰ھ)، ان کے بعد حضرت محمد بن حسن ہیں۔

یہ لوگ ان کی محبت میں غلو کرتے ہوئے حد اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ حالانکہ ان بارہ ائمہ کا تذکرہ جس انداز سے کیا گیا ہے وہ انداز خود ہی ان پر رد کرتا ہے؛ اوران کی باتوں کو باطل قرار دیتا ہے۔ صحیحین میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اپنے باپ کی رفاقت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے آپ سے سنا فرما رہے تھے:

''لوگ ہمیشہ خیر سے رہیں گے جب تک ان پر بارہ خلفاء نہ آجائیں''۔ پھر آپ نے آہستگی سے بات کہی؛ جس کا مجھے پتہ نہ چل سکا؛ تو میں نے اپنے باپ سے دریافت کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟۔

انہوں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''وہ تمام قریش سے ہوں گے''۔ ❶

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ: ''بارہ خلفاء تک دین اسلام کا معاملہ غالب رہے گا''۔ ❷

ایک روایت میں ہے: ''یہ دین غالب ہی رہے گا حتی کہ بارہ خلفاء ہو گزریں''۔

❶ حدیث صحیح هے۔ الصحيحة (۳۷٦، ۹٦٤)۔ السنة (۱۱۲۲، ۱۱۲۳)۔البخاری ۷۲۲۲؛ مسلم ۱۸۲۱۔
❷ حدیث صحیح هے۔ صحیح مسلم۔

چنانچہ دین اسلام کا معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مطابق غالب ہی رہا۔ بارہ خلفاء سے مراد چاروں خلفاء راشدین، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ [۲۰ ق ھ-۶۰ھ] اس کا بیٹا یزید [۲۵ھ-۶۴ھ]، عبدالملک بن مروان [۲۶ھ-۸۶ھ] اس کے چاروں بیٹے، ان میں عمر بن عبدالعزیز [۶۱ھ-۱۰۱ھ] رحمہ اللہ بھی شمار ہوتے ہیں۔ ان کے بعد دین اسلام کا معاملہ کمزور ہونے لگا۔

لیکن شیعہ کہتے ہیں: ان خلفاء کے دور میں امت اسلامیہ کا معاملہ کمزور تر اور خرابی کا شکار رہا۔ جبکہ رافضہ کے نزدیک اس دور میں بھی امت خرابی اور پستی کا شکار رہی۔ اس دوران ظالم اور سرکش لوگ حاکم بنے؛ یہی نہیں بلکہ وہ کافر اور منافق بھی تھے؛ ان کے دور میں اہل حق یہودیوں سے بھی زیادہ ذلیل تھے ❶۔ ان کے اس دعوے کا باطل ہونا صاف ظاہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بارہ خلفاء کے دور میں اسلام کو غلبہ ہی حاصل رہا؛ اور اسلام پھیلتا ہی رہا۔

❶۔ شیخ عفیفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: خطبہ منہاج السنہ ۱/۲۴؛ ط: بولاق۔ طبع جدیدہ ۸/۲۵۳۔

دیگر آل واصحاب کے متعلق اہل سنت والجماعت کا عقیدہ:

٩٦۔((وَمَنْ أَحْسَنَ الْقَوْلَ فِي أَصْحَابِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَزْوَاجِهِ

الطَّاهِرَاتِ مِنْ كُلِّ دَنَسٍ وَذُرِّيَاتِهِ الْمُقَدَّسِيْنَ مِنْ كُلِّ رِجْسٍ فَقَدْ بَرِيءَ مِنَ النِّفَاقِ .))

''جس نے حضرات صحابہ کرام رحمہم اللہ، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نیز آپ کی پاکیزہ اولاد رضی اللہ عنہم اجمعین؛ جو کہ ہر نجاست سے بری ہیں ؛ کے بارے میں جو شخص اچھے کلمات کہے گا وہ نفاق سے بری ہوگیا''۔

تشریح ......: فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں کتاب وسنت سے کچھ بیان ہو چکا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ، مدینہ کے درمیان مقام خم میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''امابعد! لوگو! میں بھی تمہارے جیسا ہی ایک انسان ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ میرے رب کا فرشتہ میرے پاس آ جائے اور میں اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہہ دوں۔ بے شک میں تمہارے درمیان دو بھاری بھرکم چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، ان میں سے ایک کتاب اللہ تعالیٰ ہے، جس میں نور اور ہدایت ہے، لہٰذا کتاب اللہ تعالیٰ کو لے لو اور اسے مضبوطی سے پکڑلو۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ کے بارے میں مبالغہ کے ساتھ ترغیب دی۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہارے درمیان اپنے اہل بیت کو چھوڑے جارہا ہوں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم کو اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں۔''......الخ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات تین بار ارشاد فرمائے'' [1]۔

نیز امام بخاری رحمہ اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں، انہوں نے فرمایا:

''تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کا خیال کرو''۔ [2]

[1] حدیث صحیح ھے۔مسلم ۲۴۰۸؛ السنة (۱۵۶۰، ۱۵۵۷، ۱۵۵۶)۔

[2] حدیث صحیح ھے۔ بخاری (۳۷۱۳، ۳۷۵۱)۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا یہ فرمان: '' فَقَدْ بَرِيءَ مِنَ النِّفَاقِ . '''' وہ یقیناً نفاق سے بری ہوگیا''۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ رافضیت کی بنیاد رکھنے والا ایک منافق اور زندیق انسان تھا۔ اس کا مقصد دین اسلام کا استیصال/ خاتمہ کرنا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر تنقید کرنا تھا۔ جیسا کہ علمائے کرام رحمہم اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔

بے شک عبداللہ بن سبا نے جب دین اسلام کا اظہار کیا تو اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اپنے مکر وفریب اور اپنی خباشتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دین اسلام میں بگاڑ پیدا کرے؛ جیسے پولس نے دین عیسائیت کے ساتھ کیا تھا۔ پس اس نے بظاہر عبادت گزاری کا لبادہ اوڑھ لیا، امر بالمعروف نہی عن المنکر کا کام شروع کیا۔ حتی کہ اس کی دسیسہ کاریوں کے نتیجہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ برپا ہو؛ اور شہید کردیے گئے۔ پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ تشریف لائے؛ تو اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت کا اظہار اور آپ کی نصرت کے سلسلہ میں غلو کرنے لگا۔ تاکہ اس طرح اپنے من کی خباثت کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کی شرارتیں معلوم ہوئیں تو آپ نے اس کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ تو وہ وہاں سے بھاگ کر قرقیس چلا گیا۔ اس کا واقعہ تاریخ کی مشہور کتابوں میں مرقوم ہے''۔[منہاج السنة ۸ / ۴۷۸]

نیز پہلے بیان ہو چکا ہے کہ: ''جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر فضیلت دیتا تھا؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کو حد قذف لگاتے''۔[السنة ۱۲۱۹ ؛ ۹۹۳ .]

باطل پرستوں کے دلوں میں خوارج کی بدعات کا کچھ خمار باقی رہا۔ یہ باطل پرست شیعہ اور حروریہ/خوارج تھے۔ اسی لیے شیعیت کو زندیقیت کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ قاضی ابوبکر باقلانی [بن الطیب] رحمہ اللہ [۳۳۸ھ-۴۰۳ھ] نے بھی ذکر کیا ہے۔ نیز انہوں نے باطینہ فرقے اور ان کے دین اسلام کو بگاڑنے کی کوششوں کی وضاحت کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''یہ لوگ اپنے داعی سے کہتے ہیں: ''جب کسی کو مسلمان پائیں؛ اور اس کو دعوت دی جائے تو اس کے سامنے شیعیت کو اپنا دین اور شعار بنایا جائے۔ اور ان پر اثر انداز ہونے کے لیے سلف کے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ظلم کے فسانے؛ اور ان کے بیٹے حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کو اپنی راہ بنایا جائے۔ پس بنو تیم، بنو عدی، بنو امیہ، بنو عباس ان تمام سے براءت کا اظہار کیا جائے۔ اور یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ غیب دان تھے، اور تمام عالم کو پیدا کرنے کی ذمہ داری آپ کے سپرد ہے۔ اسی طرح شیعہ کی دیگر عجیب و غریب باتیں ہیں جن سے ان کی جہالت ٹپکتی نظر آتی ہے۔

[زنادقہ کی دعوت کا دوسرا مرحلہ]: اگر آپ سے کچھ شیعہ مانوش ہو جائیں؛ اور آپ کی دعوت پر لبیک کہیں؛ تو ان کے سامنے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کی برائیاں/ سیاسی غلطیوں بیان کی جائیں''۔ [منهاج السنة ٨ / ٤٨٠]

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا بھلا کہتا ہے؛ دراصل وہ اہل بیت پر اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر دشنام طرازی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اس لیے کہ اصل میں ان لوگوں کے نزدیک اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام کا ایک ہی مقام ہے؛ [وہ ان سب کو گمراہ سمجھتے ہیں]۔ [القرامطة ص ٥٢ ؛ تحقيق محمد الصباغ]

[علماء اور سلف امت کے متعلق عقیدہ]

٩٧۔((وَعُلَمَاءُ السَّلَفِ مِنَ السَّابِقِيْنَ وَمِنْ بَعْدِهِمْ مِنَ التَّابِعِينَ أَهْلِ الْخَبْرِ وَالاثَرِ وَأَهْلِ الفِقْهِ وَالنَّظَرِ لاَ يُذْكَرُونَ إِلَّا بِالْجَمِيلِ وَمَنْ ذَكَرَهُم بِسُوءٍ فَهُوَ عَلَى غَيْرِ السَّبِيلِ .))

''......سابقہ علماء سلف ان کے بعد تابعین؛ نیکوکار اہل علم و فضل؛ وہ اہل فقہ اور اہل نظر تھے، ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا جائے گا؛ جو شخص انہیں برا بھلا کہتا ہے وہ راہ اعتدال سے ہٹا ہوا ہے''۔

تَشریح......: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء: ١١٥)

''اور جو شخص ہدایت اور سیدھا راستہ واضح ہونے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے

ہم ادھر ہی کر دیں گے اور؛ اور پھر ہم اس کو جہنم میں داخل کریں اور وہ بری جگہ ہے۔''

پس ہر مسلمان پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی موالات/ دوستی کے بعد اہل ایمان سے موالات رکھنا واجب ہوتا ہے۔ جیسے قرآن پاک نے بیان کیا ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ہیں؛ اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایسے ستارے بنایا ہے جن سے خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں ہدایت ملتی ہے۔ ان کے ہدایت یافتہ/ اور علمی تحقیق کے مقام پر فائز ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے''۔[رفع الملام ١١؛ مجموع الفتاوی ٢٠/ ٢٣٢]

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل ہر امت کے علماء بدترین لوگ تھے؛ سوائے مسلمانوں کے علماء کے۔ بے شک ان کے علماء ان میں سے بہترین لوگ ہیں؛ کیونکہ وہ امت میں رسول اللہ ﷺ کے جانشین ہیں؛ اور مردہ سنتوں کا احیاء کرنے والے ہیں۔ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے کلام پر عمل ہو رہا ہے، اور وہ کتاب اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستگی رکھتے ہیں۔ کتاب اللہ تعالیٰ ان کے متعلق ہدایات دیتی ہے؛ اور وہ کتاب اللہ تعالیٰ کی تعلیم عام کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ تمام اس بات پر یقینی طور پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت واجب ہے۔ لیکن جب کسی عالم کا قول صحیح حدیث کے خلاف ہو تو اس کو چھوڑنا واجب ہو جاتا ہے۔ اس حدیث پر عمل نہ کرنے میں اس عالم کے ہاں ضرور کوئی نہ کوئی عذر ہوگا۔ یہ عذر تین قسم کے ہو سکتے ہیں:

اول: ہو سکتا ہے کہ اس کا اعتقاد/ یقین ہی نہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

دوم: اس کا اعتقاد ہی نہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے مقصود یہ مسئلہ ہے۔

سوم: اس کا اعتقاد ہو کہ یہ حکم منسوخ ہے''۔[رفع الملام ١١]

پس سبقت اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے پیغامات ہم تک پہنچانے کی وجہ سے انہیں ہم پر فضیلت حاصل ہے۔ اور ان میں سے مخفی چیزوں کی وضاحت کرنے کی وجہ سے ان کا ہم پر احسان ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور ان کو بھی راضی فرمائے۔[یہی تعلیم ہمیں شریعت میں دی گئی ہے کہ ہم یوں کہیں]:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ﴾ (الحشر: ١٠)

''اے ہمارے رب! اور ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے؛ اور مومنوں کی بابت ہمارے دل میں کینہ پیدا نہ کر، ہمارے رب بے شک تو رؤوف ورحیم ہے۔''

اولیاء اللہ کے متعلق عقیدہ

۹۸۔ ((وَلَا نُفَضِّلُ أَحَداً مِنَ الأَوْلِيَاءِ عَلَى أَحَدٍ مِنَ الأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمِ السَّلَامُ وَنَقُولُ: نَبِيٌّ وَاحِدٌ أَفْضَلُ مِنْ جَمِيعِ الأَوْلِيَاءِ .))

''ہم کسی ایک ولی کو کسی پیغمبر پر فضیلت نہیں دیتے بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ ایک نبی تمام اولیاء سے افضل ہے''۔

تشریح...... : شیخ رحمہ اللہ کا مقصد اتحادیہ اور جاہل صوفیہ کا رد ہے اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ اہل استقامت ہمیشہ علم کے تابع رہے اور شریعت کی متابعت سے کبھی روگردانی نہ کی۔ یاد رہے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر واجب قرار دیا ہے کہ وہ رسولوں کا اتباع کرے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ﴾ .... إلى .... ﴿وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا o﴾ (النساء: ٦٤، ٦٥)

''اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا؛ وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے؛ اور لوگ جب اپنے حق میں ظلم کر بیٹھے تھے اگر آپ کے پاس کیوں نہ آئے؛......آگے تک...... بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب ہی مومن ہوں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ o﴾ (آل عمران: ٣١)

''فرما دیجیے: اگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہے؛ تو میری اتباع کرو؛ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے۔''

ابو عثمان نیشاپوری رحمہ اللہ [۲۳۷ھ-۲۹۸ھ] کا فرمان ہے: ''جو شخص قولاً و عملاً اپنے نفس پر سنت کو نافذ کرتا ہے؛ وہ حکمت کی بات کرتا ہے؛ اور جو شخص خواہشات کو اپنے نفس پر غالب کرتا ہے؛ وہ بدعت ہی کی باتیں کرتا ہے۔

بعض علمائے کرام رحمہم اللہ کا فرمان ہے: ''کچھ لوگوں نے سنت کو صرف اس وجہ سے چھوڑا ہے کہ ان کے نفس میں تکبر پایا جاتا ہے۔ ان کی بات بالکل درست ہے۔ اس لیے جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات کی اتباع نہیں کرتا؛ تو وہ اپنی من مرضی کر رہا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی خواہشات کا پیروکار ٹھہرا۔ اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور روشنی اس کی نظر سے اوجھل ہے۔ دراصل وہ نفس کے دھوکے میں مبتلا ہے وہ تو ان لوگوں کے قول کے مشابہ ہے جنہوں نے کہا: [اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:]

﴿لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ (الانعام: ١٢٤)

''ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے حتی کہ ہمیں بھی وہی کچھ مل جائے جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو ملا ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ وہ اپنی پیغمبری کسے عطا فرمائے۔''

بہت سارے لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنی سیادت و عبادت میں انہماک اور اپنی روح کو مصفّٰی کر کے انبیائے کرام علیہم السلام کی اتباع کیے بغیر ہی اس مقام تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

اور ان [صوفیاء] میں سے کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام سے بھی افضل ہو گئے ہیں۔

اور کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں: انبیائے کرام و مرسلین عظام علیہم السلام خاتم الاولیاء کے چراغ سے علم حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر وہ اپنے متعلق خاتم الاولیاء ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ ان کا یہ علم درحقیقت وہی فرعون کا قول ہے [اس میں کچھ فرق نہیں]۔

فرعون کہتا تھا: تمام کائنات جو نظر آرہی ہے یہ واجب بنفسہ ہے [یعنی خود بخود پیدا ہوگئی ہے]، اس سے الگ اس کا کوئی صانع/خالق نہیں۔ یہ شخص کائنات کو اللہ تعالیٰ قرار دیتا ہے۔ فرعون نے بظاہر اللہ تعالیٰ کا بالکل انکار کر دیا تھا، لیکن باطن میں وہ ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا تھا۔ وہ کائنات کا صانع/خالق مانتا تھا۔ لیکن یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مخلوق کا وجود ہی خالق کا وجود ہے۔ ابن عربی اور اس کے رفقاء کا یہی خیال تھا۔ [منهاج السنة ۵ / ۳۳۱.]

ابن عربی نے جب محسوس کیا کہ شریعت کے ظاہر کو بدلنا مشکل ہے تو اس نے کہا: نبوت تو ختم ہوگئی ہے؛ لیکن ولایت ختم نہیں ہوئی۔ اور یہ دعوی کیا ولایت کی کچھ اقسام مقام نبوت سے بھی اعلی وارفع ہیں؛ اور بے شک انبیائے کرام علیہم السلام تو اولیاء سے مستفید ہوتے ہیں۔ اس نے کہا ہے:

((مقام النبوة فی برزخ فویق الرسول و دون الولی .)) [منهاج السنة ۵ / ۳۳۵]

''برزخ میں نبوت کا مقام رسول سے زیادہ ہے اور ولی سے کم ہے۔''

درحقیقت یہ شریعت کو بدلنا ہے۔ ولایت تو اہل ایمان، متقین کے لیے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝﴾ (یونس ۶۲، ۶۳)

''آگاہ رہو بے شک اولیاء اللہ کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ غم اُٹھائیں گے۔ وہ جو ایمان لائے اور پرہیزگار رہے۔''

پس نبوت ولایت سے زیادہ خاص ہے اور رسالت نبوت سے زیادہ خاص ہے۔ جیسے اس سے پہلے اس مسئلہ پر تنبیہ گزر چکی ہے۔

ابن عربی نے فصوص الحکم میں کہا ہے:

''جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی مثال دیوار کی ایک اینٹ کے ساتھ دی تھی؛ جو دیوار مکمل ہو چکی تھی؛ صرف ایک اینٹ کی جگہ باقی تھی۔ اینٹ کی وہ جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ تھی؛ مگر یہ ہے کہ رسول اللہ تعالیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام کو دیکھا نہیں تھا۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے: ''ایک اینٹ کی جگہ''۔ جب کہ خاتم الاولیاء کے لیے اس جگہ کو دیکھنا ضروری ہے۔ اس کا خیال ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مثال دی ہے۔ اور اپنے متعلق اس کا خیال ہے کہ وہ اس دیوار میں دو اینٹوں کی جگہ خالی تھی؛ اور اس نے وہ دو اینٹوں کی پر کر دی اور دیوار مکمل ہوگئی۔ اس کا اپنے آپ کو دو اینٹوں کے برابر سمجھنے کا سبب یہ ہے کہ: اس دیوار میں ایک اینٹ سونے کی ہے؛ اور ایک اینٹ چاندی کی۔ چاندی کی اینٹ سے مراد ظاہری شریعت اور اس میں موجود احکام ہیں۔ جیسا کہ اس نے شریعت میں اللہ تعالیٰ سے جو چیز لی ہے؛ وہ اپنی ظاہری صورت میں ہے؛ اور اس کی اتباع کی جاتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دین ایسے ہی ہے جیسے ظاہر میں نظر آرہا ہے۔ تو پھر ضروری ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسا خیال رکھے۔ اور وہ خود باطن میں اس دوسری سونے کی اینٹ کی طرح ہے۔ اور وہ احکام اس معدن سے اخذ کرتا ہے جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی لے کر آنے والے فرشتے اخذ کرتے ہیں''۔

پھر کہتا ہے: ''اگر آپ اس بات کو سمجھ گئے ہیں جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے؛ تو آپ کو عمل نافع ہوگیا''۔ ❶

❶ ـ فصوص الحکم (۱/ ۶۳؛ منهاج السنة النبوية ۵/ ۳۳۷ .)۔

اس شخص سے بڑا کافر اور کون ہوسکتا ہے جو اپنی مثال سونے کی اینٹ سے دیتا ہے اور پیغمبر کی مثال چاندی کی اینٹ کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اپنے آپ کو پیغمبروں سے اعلیٰ اور افضل سمجھتا ہے۔ یہ ان کی جھوٹی خواہشات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ﴾ (المومن غافر: ۵۶)

''ان کے دلوں میں تکبر کے سوا اور کچھ نہیں؛ اور وہ اس کو پہنچنے والے نہیں۔''

جس شخص کی باتیں اس قسم کی ہیں اس کا کافر ہونا کیسے مخفی رہ سکتا ہے؟۔ اس کی اس طرح کی دیگر بھی بہت ساری باتیں ہیں۔ ان میں اس کا کچھ کفر مخفی ہے؛ اور کچھ کفر ظاہر نظر آتا ہے۔ پس ضرورت ہے کہ اس کے کلام پر شدید تنقید کی جائے تاکہ اس کے باطل نظریات آشکار ہوجائیں۔ ❶

☼ تفصیل کے لیے دیکھیں: الرد علی ابن عربی بن مجموع الفتاویٰ (۲/ ۲۰۴؛ اور بعد کے صفحات)۔

اس کے کچھ کفریہ نظریات ایسے ہیں؛ جو ہر ناقد پر ظاہر ہیں۔ اور کچھ نظریات ایسے ہیں جن میں پوشیدہ کفر صرف ماہر اور صاحب بصیرت ناقد پر ہی ظاہر ہوسکتا ہے۔ ابن عربی اور اس کے ہمنواؤں کا کفر ان لوگوں کے کفر سے بھی زیادہ ہے۔ جنہوں نے کہا تھا:

﴿لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ﴾ (الانعام: ۱۲۴)

''جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو عطا ہوا ہے جب تک ہمیں عطا نہ ہوگا ہم ایمان نہیں لائیں گے۔''

لیکن ابن عربی اور اس کے ہم خیال لوگ منافق؛ زندیق؛ اتحادیہ ہیں جو دوزخ کے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔ اور منافقین کے ساتھ ان کے اسلام کا اظہار کرنے کی وجہ سے مسلمانوں والا معاملہ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارک میں منافقین اسلام کا اظہار کرتے تھے مگر باطن میں کفر کو چھپائے رکھتے تھے۔ اور آپ ﷺ ان کے اظہار کے مطابق ان کے ساتھ مسلمانوں والا معاملہ کرتے تھے۔ اگر ان میں سے بعض لوگوں سے ان کے اندر کے مخفی کفر کا اظہار ہوجائے تو پھر اس پر مرتد کے احکامات جاری کیے جائیں گے۔ پھر کیا ان کی توبہ قبولیت کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔ صحیح مسلک یہی ہے کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ معلیٰ رحمہ اللہ [۲۱۱ھ] نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے اس روایت کو بیان کیا ہے۔ واللہ المستعان۔

معجزہ و کرامت کی بحث

۹۹۔((ونُؤْمِنُ بِمَا جَاءَ مِنْ كَرَامَاتِهِمْ وَصَحَّ عَنِ الثِّقَاتِ مِنْ رُوَايَاتِهِم①۔)) .

''ان سے صحیح ثقہ راویوں کی وساطت سے جو کرامات منقول ہیں ہم ان پر ایمان رکھتے ہیں۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: مصنف رحمہ اللہ نے بہت ہی اچھی بات کہی ہے جو انہوں نے روایات کے صحیح ہونے کی قید لگائی ہے۔ اس لیے کہ لوگ

عموماً متاخرین کرامات کی روایت میں بڑی وسعت اختیار کر چکے؛ حتی کہ وہ کرامات کے نام پر ایسی باطل چیزیں بھی روایت کرتے ہیں جن کے باطل ہونے میں کوئی ادنی عقل والا آدمی بھی شک نہیں کر سکتا۔ بلکہ ان روایات میں بعض مرتبہ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں شرک اکبر ہوتی ہیں۔ شعرانی کی کتاب طبقہ اولیاء ان وسیع و شامل کتابوں میں سے ہے جس نے یہ باطل باتیں روایت کی ہیں۔ ان باتوں میں سے ایک یہ بھی کسی [نام نہاد] ولی سے روایت کیا گیا ہے؛ وہ کہتا ہے: ''میں نے اللہ تعالیٰ کے ادب میں بیس سال سے کسی بھی چیز سے کن فیکون کہنا چھوڑ دیا ہے''۔ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کی باتوں سے بہت ہی بلند ہیں۔

آپ کو صحیح کرامات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے ایسے واقعات بھی مل جائیں گے جن میں کوئی حرج والی بات نہیں۔ امام نووی نے ریاض الصالحین میں کچھ ایسے واقعات نقل کئے ہیں۔ (دیکھیں: باب نمبر ۲۵۳؛ حدیث نمبر ۱۵۱۶؛ ۱۵۱۷؛ و ۱۵۳۲؛ میری تحقیق کے ساتھ)۔

تشریح: ......لغت میں معجزہ اور کرامت ہر خرق عادت کا نام ہے۔ متقدمین ائمہ اہل علم رحمہم اللہ سے کرامت کی تعریف اسی طرح منقول ہے۔ لیکن اکثر متاخرین معجزہ اور کرامت لفظ کے استعمال میں فرق بتاتے ہیں؛ وہ معجزہ کا لفظ نبی کے لیے خاص کرتے ہیں؛ اور کرامت کا لفظ ولی کے لیے۔ اس کا خلاصہ اور جامع تعریف یہ ہے کہ: خارق عادت کام؛ معجزہ [یا کرامت] کہلاتا ہے۔ پس صفات کمال کا مرجع تین امور ہیں:

۱۔ علم، ۲۔ قدرت ۳۔ غنی [بے نیازی]۔

یہ تینوں کامل اوصاف تو صرف اللہ وحدہ لا شریک کے شایان شان ہیں۔ [کسی اور کے لائق نہیں]۔

پس بے شک اللہ تعالیٰ نے ہی اپنے علم کے ساتھ ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے اور وہ ہر پر چیز قادر ہے۔ اور وہ تمام جہان والوں سے غنی اور بے نیاز ہے۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا تھا کہ آپ ان تینوں چیزوں کے دعویٰ سے برأت کا اظہار کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (الانعام: ۵۰)

''فرما دیجیے: میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ ہی تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس چیز کی اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے''۔

حضرت نوح علیہ السلام جو کہ پہلے اولعزم پیغمبر ہیں؛ آپ نے بھی ایسے ہی فرمایا تھا۔ آپ پہلے رسول تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف مبعوث کیا تھا[1]۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الرسل ہیں؛ اور آخری اولوالعزم رسول ہیں۔ ان دونوں انبیائے کرام علیہم السلام نے ان تین چیزوں سے براءت کا اظہار کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگ کبھی کبھار ان سے علم غیب کا مطالبہ کرتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان گرامی میں ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۝﴾ (النازعات: ۴۲)

''وہ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے کب اس کا قائم ہونا ہے''۔

[1]۔ البخاری ٤٤٧٦؛ مسلم ۱۹۳۔

کبھی ان سے قدرت اور تاثیر کا مطالبہ کیا جاتا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝﴾ (الاسراء: ۹۰)

''کہا: ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک تو زمین سے چشمہ نہ نکال لے۔''

اور کبھی ان کی انسانی ضرورتوں کی وجہ سے ان پر عیب لگایا جاتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان : ۷)

''کہنے لگے: کہ اس رسول کو کیا ہو گیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ وہ انہیں بتا دیں کہ یہ کام میرے دائرہ اختیار میں نہیں۔ ہاں ان تینوں چیزوں میں ان کو وہی ملتا ہے جو جس قدر اللہ تعالیٰ عطا فرما دیں۔ پس آپ اسی قدر علم رکھتے ہیں جتنا علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے [اور اسی قدر قدرت رکھتے ہیں جتنا آپ کو قادر بنایا گیا ہے]۔ اور اسی چیز سے بے نیاز ہیں؛ جس سے اللہ تعالیٰ نے بے نیاز کر رکھا ہے۔ اور عام عادت کے برعکس/ یا اکثر لوگوں کی عادت وطبیعت کے برعکس۔ پس تمام معجزات اور کرامات ان تین قسم کے اوصاف سے خارج نہیں ہوتے''۔[مجموع الفتاوی ۱۱/ ۳٤ .]

پھر خرق عادت فعل سے اگر مطلوب دینی فائدہ حاصل ہوتا ہے؛ تو یہ ایسے نیک اعمال میں سے ہے جو شرعاً اور دیناً مامور بہ ہیں۔ پھر یا تو وہ حکم واجب ہوگا یہ مستحب۔ اور اگر اس سے مباح فعل حاصل ہو تو اس صورت میں دنیوی طور پر وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے جس کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا جائے۔ لیکن اگر اس کی صورت ایسی ہو کہ وہ کسی ممنوعہ کام کو شامل ہو؛ خواہ وہ ممانعت تحریمی ہو یا تنزیہی؛ تو وہ فعل اللہ تعالیٰ کے عذاب کا اور اس کی ناراضگی کا سبب ہوگا۔ جیسے وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کا علم دیا گیا تھا؛ مگر اس نے اس کو چھوڑ دیا؛ اس کا نام بلعام بن باعور تھا؛ خواہ ایسا کرنا اجتہاد کی وجہ سے ہو یا تقلید کی وجہ سے یا کوتاہ علمی یا کم عقلی یا غلبہء حال یا عجز یا کسی دوسری ضرورت کی وجہ سے''۔[مجموع الفتاوی ۱۱/ ۳۱۹ .]

پس خارق عادت کی تین اقسام ہیں:

۱۔ یا تو دین اسلام میں اس کی تعریف کی جاتی ہوگی۔

۲۔ یا قابل مذمت ہوگت۔ ۳۔ یا مباح ہوگا۔

اگر خارق عادت مباح ہے؛ اور اس میں کوئی فائدہ بھی ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ وگرنہ وہ دیگر ان تمام مباحات کی طرح ہے جن کا کچھ فائدہ نہیں۔ ابو علی جوزجانی کا فرمان ہے:

''استقامت کے طالب بنو؛ کرامت کے طالب نہ بنو۔ بے شک آپ کا نفس تو کرامت کا طالب ہوتا ہے لیکن آپ کا رب آپ سے استقامت کا مطالبہ کرتا ہے''۔

شیخ سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان:

آپ اپنی کتاب 'عوارف'[ص۵۴] میں فرماتے ہیں: ''اس باب میں یہ بہت بڑا اصول ہے''۔ بے شک بہت سارے مجتہدین؛ اور عبادت گزار متقدمین سلف صالحین کا سنتے ہیں؛ کہ جو کچھ انہیں کرامات اور خوارق عادت دیے گئے تھے؛ تو ان کے نفوس میں ہمیشہ اس کی طرف میلان رہتا ہے؛ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں بھی کوئی کرامت مل جائے۔ اور ان میں سے کوئی ایک تو اس [کرامت کے نہ

ملنے کی] وجہ سے کبیدہ خاطر رہتا ہے؛ اور اسے اپنے اعمال کے درست ہونے پر شک ہونے لگتا ہے۔ کیوں کہ اسے کرامات سے نواز نہیں جارہا۔لیکن اگر وہ اس کے راز سے آگاہ ہوجائیں تو یہ معاملہ ان پر آسان ہوجائے۔ اور وہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ بعض سچے مجاہدین پر اس کا کوئی باب کھول دیتے ہیں۔ اس میں حکمت یہ ہوتی ہے کہ ان خوارق عادات اور قدرت کے آثار کو دیکھ کر اس کا یقین زیادہ ہو جائے۔ اور دنیا سے زہد/ بے نیازی میں اس کا عزم مزید تقویت پکڑ لے۔ اور خواہشات نفس کے اسباب سے کنارہ کش ہوجائے۔ پس صادق العزم لوگ تو نفس سے استقامت کا مطالبہ کرتے ہیں یہی کرامات کا اصل منبع ہے''۔[مجموع الفتاوی ١١/ ٣٢٠.]

اس میں کچھ شک نہیں کہ قلوب پر تاثیر ابدان سے زیادہ ہوتی ہے۔لیکن اگر دل نیک ہوں تو ان پر اثرات اچھے ہوتے ہیں اور اگر دل خراب ہوں؛ تو اثرات بھی فاسد مرتب ہوں گے۔ اس لحاظ سے بعض احوال کے اثرات اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ہوتے ہیں اور بعض احوال کے اثرات اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکروہ ہوتے ہیں۔

فقہائے کرام نے اس انسان سے قصاص کے مسئلہ پر گفتگو کی ہے جو کسی دوسرے کو باطن میں قتل کردیتا ہے۔ یہ لوگ اپنے باطن کا مشاہدہ کرتے ہیں؛ اور ان کے دل امر کونی کے تابع ہوتے ہیں۔ اور محض خرق عادت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کرامت شمار کرتے ہیں۔ اور یہ نہیں جانتے کہ حقیقت میں کرامت لزوم استقامت کا نام ہے۔ اور یہ کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو اس سے بڑی کرامت کے ساتھ عزت نہیں بخشی جس کو اپنی پسند اور رضامندی اور اپنی اطاعت اور اپنے رسول کی اطاعت کی توفیق؛ اور اپنے اولیاء کے ساتھ دوستی اور اپنے دشمنوں کے ساتھ دشمنی کی توفیق سے نوازا ہو۔ یہی لوگ وہ حقیقی اولیاء اللہ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (یونس: ٦٢)

''آگاہ رہو بے شک اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم کھائیں گے۔''

اور جو کچھ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو آزماتے ہیں؛ کہ اسے خرق عادت کی مسرتیں ملتی ہیں؛ یا کوئی دیگر چیز؛ یا تکالیف میں مبتلا کرتا ہے؛ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ہاں لائق اکرام ہے؛ اور نہ ہی اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ ذلیل ہے؛ بلکہ کتنے ہی لوگ ہیں جو ان میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری کرکے سعادتوں سے ہمکنار ہوئے ہیں اور کتنے ہی لوگ اس کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے بدبختی میں جا پڑے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰـهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۵ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَكْرَمَنِ ۞ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰـهُ فَقَدَرَ عَلَیْهِ رِزْقَهٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ ۞﴾ (الفجر: ١٥، ١٦)

''مگر انسان کو جب اس کا رب آزماتا ہے پس اسے عزت اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے: میرے رب نے مجھے عزت دی؛ اور جب آزماتا ہے اس پر روزی تنگ کردیتا ہے کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کیا۔''

پس یہی وجہ ہے کہ ان امور میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم: وہ لوگ ہیں جن کا مقام خرق عادت/کرامات کی وجہ سے بلند ہوتا رہتا ہے۔

دوسری قسم: وہ جو ان خرق عادات افعال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سامنا کریں گے۔

تیسری قسم: جن کے حق میں خرق عادات/کرامات مباحات کی منزلت پر ہوتی ہیں''۔[مجموع الفتاوی ١٠/ ٢٩.]

[کرامت کی] کشف اور تاثیر کلمات اللہ تعالیٰ کے اختلاف کے حساب سے مختلف ہوتی ہے۔ کلمات اللہ تعالیٰ کی دو اقسام ہیں:

کونی کلمات   دینی کلمات۔

پس اللہ تعالیٰ کے تکوینی/کونی کلمات وہ ہیں جن کے ساتھ نبی اکرم ﷺ نے اپنی اس دعا میں پناہ مانگی ہے:

((اَعُوْذُبِکَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ الَّتِیْ لَایُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ .))

''میں اللہ تعالیٰ کے ان مکمل کلمات کی پناہ میں آتا ہوں، جن سے آگے نہیں گزر سکتا، کوئی نیک اور نہ کوئی بدآدمی''۔

مسند أحمد ٣/ ٤١٩؛ برقم ١٥٤٤٠. صحیح۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝﴾ (یس: ٨٢)

''بے شک اس کا امر جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ چیز ہو جاتی ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ﴾ (الانعام: ١١٥)

''اور تمہارے رب کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔''

پس تمام تکوینی امور اور خرق عادات افعال ان کلمات کے تحت داخل ہیں۔

دوسری قسم میں دینی کلمات ہیں۔ ان سے مراد اللہ تعالیٰ کا کلام اور وہ شریعت ہے جس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی مبعوث کیا گیا۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے اوامر اور اس کے نواہی ہیں۔ اس میں بندے کا حصہ اس کا علم اور عمل ہوتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق آگے حکم دینے میں ہے۔ اسی طرح تکوینی امور کے کلمات اور ان کے اثرات کا بھی علم عموم اور خصوص کے اعتبار سے ہوتا ہے/ یعنی ان کے موجب کے اعتبار سے۔ پس پہلی قسم تدبیری کونی ہے۔ اور دوسری قسم شرعی دینی۔ پس پہلی قسم کا کشف/علم کا آشکار ہونا حوادث کائنات سے متعلق علم ہے۔ اور دوسری قسم کا کشف/علم کا آشکار ہونا شرعی احکام کا علم ہے۔ پہلی [قسم کے کلمات] کی تاثیر کونیات میں ہوتی ہے؛ خواہ وہ اس کے اپنے نفس میں ہو؛ جیسے: پانی پر چلنا؛ اور ہواء میں اڑنا؛ اور آگ پر بیٹھنا۔ یا [یہ تاثیر] کسی دوسرے پر ہو جیسے: کسی کو تندرست کر دینا، کسی کو ہلاک کر دینا، کسی کو مالدار بنانا، کسی کو فقیر بنانا وغیرہ۔

دوسری قسم [کے کلمات] کی تاثیر شرعی امور میں ہوتی ہے۔ خواہ وہ اپنی ذات میں ہو؛ جیسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع ہونا؛ کتاب اللہ تعالیٰ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وابستگی رکھنا۔ یا کسی دوسرے میں ان کی تاثیر ہو: جیسے: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دے۔ تو اس کی بات کی شرعاً اطاعت کی جائے گی۔

جب یہ طے ہو گیا؛ تو یہ جاننا چاہیے کہ خوارق کا عدم علم یا ان پر عدم قدرت کسی مسلمان کو اس کے دین میں ذرہ برابر نقصان دہ نہیں۔ پس جس شخص کو غیب کی چیزوں کا کچھ کشف نہیں ہوتا؛ اور نہ ہی کونیات میں کوئی چیز اس کے لیے مسخر ہوتی ہے؛ تو اس سے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے مرتبہ میں کچھ کمی نہیں آتی۔ بلکہ بسا اوقات ان چیزوں کا نہ ہونا زیادہ نفع بخش ہوتا ہے۔ [مجموع الفتاوی ١١/ ٣٢٢.]

بیشک اگر کشف کے ساتھ دین بھی ہے تو بہتر؛ وگرنہ ایسے انسان کے لیے دنیا و آخرت میں بربادی ہے۔ [مجموع ١١/ ٣٢٠.]

اس لیے کہ خرق عادت کبھی دین کے ساتھ ہوتا ہے؛ اور کبھی دین کے بغیر؛ یا دین میں خرابی کی وجہ سے؛ یا دین میں کمی کی وجہ سے۔[مجموع الفتاوی ۱۱/ ۳۴.]

پس نفع دینے والے خوارق عادات وہی ہیں جو دین کے تابع اور اس کے خادم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ وہی اقتدار نفع بخش ہے جو دین کے تابع ہو۔ یہی حال نفع بخش مال کا بھی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ میں اقتدار اور مال دونوں نفع بخش تھے۔ پس جو کوئی ان چیزوں کو مقصود بنالیتا ہے؛ اور دین کو اس کے تابع؛ اور اس کا وسیلہ بنالیتا ہے؛ اصل میں اس کا مقصد دین نہیں ہوتا۔ وہ اس شخص کے مشابہ ہے جو دین کے بدلے دنیا کھاتا ہے۔ اس کا حال اس شخص کے حال جیسا نہیں جو عذاب کے خوف یا جنت کی امید پر دین کو اپناتا ہے۔ بے شک اس کو حکم تو اسی چیز کا دیا گیا تھا؛ اور یہی راہ نجات اور صحیح شریعت ہے۔

تعجب ہے کہ اکثر لوگ سمجھے ہیں کہ ان کی فکر دوزخ کے خوف یا جنت کے طلب سے بلند ہو چکی ہے؛ ان کا دین کے ساتھ تعلق خوارق دنیا میں سے ادنیٰ درجہ کا خرق عادت کی طلب ہے''۔[مجموع الفتاوی ۱۱/ ۳۳۴.]

پھر بے شک جب علم و عمل کے اعتبار سے دین صحیح ہو؛ تو جب ضرورت ہو تو اس وقت لازمی طور پر ان کے ہاتھوں خرق عادت ظہور میں آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ○ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ (الطلاق : ۲،۳)

''اور جو کوئی اللہ سے ڈرے وہ اس کے لیے راہ بنادیتا ہے اور اس کو وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں کا اسے وہم و گمان بھی نہ ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا ﴾ (الانفال : ۲۹)

''اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے وہ تمہارے لیے فرقان پیدا کر دے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا ○ وَّ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ وَّ لَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ○﴾ (النساء: ۶۶، ۶۸)

''اگر وہ اس نصیحت پر کاربند ہوتے جو ان کو کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا اور ہم ان کو اپنے ہاں سے اجر عظیم بھی عطا فرما دیتے اور سیدھے رستے بھی دکھاتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ﴾ (یونس : ۶۲، ۶۴)

''آگاہ رہو اولیاء اللہ کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے؛ وہ جو ایمان لائے اور تقوی اپنایا؛ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔''

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''مومن کی فراست سے ڈرو وہ اللہ تعالیٰ کے نور کے ساتھ دیکھتا ہے۔'' ❶

❁ حدیث ضعیف هے ترمذی وغیرہ کی سند میں عطیه عوفی ضعیف مدلس هے (احادیث ضعیفه ۱۸۲۱)۔

پھر اس کے بعد آپ نے یہ آیت کی تلاوت کی:

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ﴾ (الحجر : ۷۵)

''بے شک اس (قصے) میں اہل فراست کے لیے نشانی ہے۔''

ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جس شخص نے میرے دوست کے ساتھ دشمنی کی؛ اس نے میرے ساتھ اعلان جنگ کیا۔ اور میرا بندہ میرا تقریب فرائض کی ادائیگی سے جس قدر حاصل کرتا ہے اس کی مثال نہیں۔ میرا بندہ ہمیشہ نوافل ادا کر کے میرا اقرب حاصل کرتا رہتا ہے، حتی کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا ہے، جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں، جس کے ساتھ وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس کے ساتھ وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرتے گا تو میں ضرور اس کا سوال پوار کروں گا، اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے گا؛ تو میں ضرور اس کو پناہ دوں گا۔ مجھے کسی کام میں کبھی تردد نہیں ہوا جس کو میں نے کرنا ہوتا ہے؛ جس قدر تردد مجھے مومن بندے کی روح کے قبض کرنے میں ہوتا ہے؛ وہ موت کو مکروہ جانتا ہے اور میں اس کی تکلیف کو ناپسند سمجھتا ہوں لیکن اس سے کوئی چارہ کار نہیں'' ❶۔

معلوم ہوا کہ استقامت تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور کرامت طلب کرنا نفس کا حصہ ہے۔ وباللہ التوفیق۔

❁ حدیث صحیح هے۔ بخاری ٦٥٠٢۔ الصحيحة (١٦٤٠)۔[مجموع الفتاوی ١١/ ٣٣١.]

معتزلہ اور انکار کرامات:

معتزلہ کرامات کا انکار کرتے ہیں؛ ان کے عقیدہ کا باطل ہونا صاف ظاہر ہے۔ بے شک یہ ایسے ہی ہے جیسے محسوسات کا انکار کرنا۔ ان کا یہ کہنا کہ: اگر کرامات صحیح ہوں؛ تو معجزات کے مشابہ ٹھہریں۔ اس سے تو نبی اور ولی میں التباس پیدا ہوتا ہے؛ جو کہ ناجائز ہے۔ نیز ان کا یہ دعویٰ تب صحیح ہوتا جب ولی خارق عادات پیش کر کے نبوت کا دعوی بھی کرتا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوتا؛ اور اگر وہ نبوت کا مدعی ہے تو وہ [جھوٹا ہے] ولی نہیں؛ بلکہ وہ جھوٹا کذاب اور متنبّی ہوگا۔ اس سے پہلے [سچے] نبی اور متنبّی [نبوت کے دعویدار] کے مابین فرق پر بحث گزر چکی ہے۔ جہاں شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ بحث کی تھی: ''اور بے شک محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بزرگ بندے اور اس کے چنے ہوئے رسول ہیں''۔

فراست کے اقسام:

یہاں پر اس بات سے آگاہ کرنا ضروری ہے کہ فراست کی تین قسمیں ہیں:

اس کی تفصیل کے لیے دیکھیں: مدارج السالکین ۲/۴۸۲۔

پہلی قسم: فراست ایمانی: اس کا سبب وہ نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں ڈالتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مظبوط تخیل دل میں پیدا ہوتا ہے؛ وہ دل پر یوں حملہ آور ہوتا ہے جس طرح شیر شکار پر حملہ آور ہوتا ہے۔ فراست کا لفظ ''فریسہ'' (یعنی شکار) سے مشتق ہے۔ یہ فراست ایمانی قوت کے حساب سے ہوتی ہے۔ پس جس کا ایمان قوی ہوگا؛ اس کی فراست اسی قدر تیز ہوگی۔ ابوسلیمان دارانی رحمہ اللہ [۱۴۰-۲۱۵ھ] کا فرمان ہے: '' فراست میں نفس کو مکاشفہ اور غیب کا معائنہ ہوتا ہے۔ پس فراست ایمان کے مدارج میں سے ایک مقام ہے''۔ (انتہی) [مدارج السالکین ٢/ ٤٨٣۔]

دوسری قسم: فراستِ ریاضت: یہ فراست بھوکا رہنے، بیداری کرنے؛ اور خلوت اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جب نفس رکاوٹوں سے الگ ہوتا ہے؛ تو جس قدر وہ ان رکاوٹوں سے دور ہوگا؛ اسی قدر اسے فراست اور کشف حاصل ہوتے ہیں۔ یہ فراست مومن اور کافر دونوں میں مشترک ہے۔ یہ نہ ایمان کی دلیل ہے اور نہ ہی ولایت کی۔ اور نہ ہی نفع بخش حق اور صراط مستقیم کا انکشاف کرتی ہے۔ اس فراست کا کشف بالکل اسی کشف کی مانند ہے جو حکمرانوں، رؤساء اطباء اور ان جیسے دیگر لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ [مدارج السالکین]

تیسری قسم: فراست خلقی: اس کے بارے میں اطباء اور دیگر [علماء] نے رسائل تالیف کیے ہیں۔ وہ اعضاء کی تخلیق سے اخلاق [اور عادات] پر استدلال کرتے ہیں؛ اس لیے کہ ان دونوں چیزوں میں ارتباط موجود ہوتا ہے۔ حکمت الٰہیہ بھی اس کا تقاضا کرتی ہے۔ جس طرح جب کسی انسان کا سر معمول سے زیادہ چھوٹا ہو تو اس سے اس کی عقل کی کمی پر استدلال کیا جاتا ہے۔ اور سر کے معمول سے زیادہ بڑے ہونے سے بڑی عقل پر استدلال کیا جاتا ہے۔ اور سینے کی کشادگی سے خوش اخلاقی پر؛ اور سینے کی تنگی سے بداخلاقی پر استدلال کیا جاتا ہے۔ اور آنکھوں کے جمود [پچکے ہونے] اور نظر کی کمزوری اور اس انسان کے دل کی حرارت کی کمزوری پر استدلال کیا جاتا ہے''۔ اس کی مثالیں کافی ہیں۔ [مدارج السالکین ٢/ ٤٨٦ .]

قیامت کی نشانیوں پر ایمان

١٠٠۔((ونُـؤْمِـنُ بِأَشْرَاطِ السَّاعَةِ مِنْ خُرُوجِ الدَّجَالِ وَنُزُولِ عِيسٰى ابْنِ مَرْيَمْ عَلَيْهِ السَّلاَمِ

مِنَ السَّمَاءِ①۔ وَنُؤْمِنُ بِطُلُوعِ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَخُرُوجِ دَابَّةِ الْأَرْضِ مِنْ مَوضِعِهَا .))

''ہم قیامت کی نشانیوں پر ایمان رکھتے ہیں: جیسے دجال کا خروج، عیسی بن مریم کا آسمان سے نزول؛ اور ہم سورج کے مغرب سے طلوع ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، دابۃ الارض [زمینی حیوان] کے اپنی جگہ سے نکلنے پر ہم ایمان رکھتے ہیں''۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: اس بارے میں کافی تعداد میں متواتر احادیث پائی جاتی ہیں۔ اور اس کی گواہی ماہر محدثین نے بھی دی ہے۔ اس سلسلہ میں میرا بھی ایک رسالہ ہے جس کا نام میں نے رکھا ہے:''قصة المسيح الدجال و نزول عيسى عليه السلام ''۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی تبییض کی توفیق عطا فرمائے۔ [یہ رسالہ چھپ چکا ہے؛ مترجم]

تشریح ......: حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: میں غزوہ تبوک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم چمڑے کے خیمہ میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت سے پہلے چھ چیزوں کو شمار کر لیجیے، میرا فوت ہو جانا، پھر بیت المقدس کا فتح ہونا۔ پھر تم لوگوں میں عام مرنے کی وبا؛ جیسے بکریوں وغیرہ میں وبا پھیلتی ہے۔ پھر مال و دولت کا عام ہونا؛ حتی کہ ایک شخص کو سو دینار بھی دیئے گئے ہوں؛ تو وہ پھر بھی ناراض ہی رہے گا۔ پھر ایسا عام فتنہ کہ عرب کا کوئی گھر ایسا نہیں رہے گا جہاں وہ فتنہ داخل نہ ہو۔ پھر تمہارے اور رومیوں کے درمیان مصالحت ہوگی؛ لیکن رومی غدر کریں گے۔ وہ تمہارے مقابلہ کے لیے اسی (۸۰) جھنڈے لے کر آئیں گے، ہر جھنڈے کے نیچے بارہ ہزار فوج ہوگی''۔ ❶

❶ بخاری ۳۱۷٦ ، ابو داؤد ۴۲۹۳ ، ابن ماجه ۴۰۴۲ ، طبرانی ۱۸/ ۷۰؛ یہ حدیث صحیح هے (فضائل الشام ص ۲۳ طبع المكتب الاسلامی)۔

حضرت حذیفہ بن اسید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے؛ اس وقت ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا:''تم کس چیز کا ذکر کر رہے تھے؟۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا:

''ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت ہرگز قائم نہ ہوگی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نشانیاں شمار کیں) اور فرمایا:''دخان یعنی دھوئیں کا ذکر فرمایا، اور دجال، دابۃ الارض؛ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا؛ عیسیٰ بن مریم کا نزول؛ یا جوج ماجوج؛ تین جگہ سے زمین کا دھنسنا؛ ایک مشرق میں دوسرا مغرب میں تیسرا جزیرۃ العرب میں۔ اس کے آخر میں یمن سے آگ نکلے گی جو لوگوں کو میدان محشر کی طرف دھکیل کر لے جائے گی''۔ ❶ [یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔]

نیز بخاری اور مسلم میں ہے؛ یہ الفاظ بخاری کے ہیں، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں دجال کا ذکر ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ تو تم پر مخفی نہیں ہے، بے شک اللہ تعالیٰ کانا نہیں، اور آپ نے اپنے ہاتھ سے آنکھ کی طرف اشارہ کیا؛ لیکن مسیح دجال کی داہنی آنکھ کانی ہوگی، گویا کہ اس آنکھ انگور کی مانند ابھری ہوئی ہوگی''۔ ❷

☼ حدیث صحیح هے۔ صحیح مسلم (۸/ ۱۷۹) برقم ۲۹۰۱۔ مسند احمد (۴/ ٦۔ ۷)۔

علامہ البانی کہتے ہیں: بعض روایات میں اس کی بائیں آنکھ کانی ہوگی۔ لیکن حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی یہ حدیث زیادہ راجح اس لیے ہے کہ اس پر شیخین کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے؛ اور ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ اور بعض نے ان دونوں روایات کے مابین جمع و تطبیق کی کوشش کی ہے؛ جو

تفصیل جاننا چاہے تو اسے فتح الباری ۱۳/ ۹۷ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

❁ حدیث صحیح ھے۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر نبی نے اپنی قوم کو کانے دجال سے ڈرایا ہے۔ خبر دار! دجال کانا ہے؛ اور بے شک تمہارا رب کانا نہیں۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان (ک۔ف۔ر) لکھا ہوگا''۔

ایک روایت میں اس کی تفسیر کافر سے کی گئی ہے''۔ [1] اسے امام بخاری اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! مستقبل قریب میں تم میں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول عادل حکمران کی حیثیت میں ہوگا۔ وہ صلیب توڑ دے گا، خنزیر کو قتل کرے گا، جزیہ معاف کرے گا۔ مال عام ہو جائے گا؛ حتیٰکہ کوئی شخص مال لینے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ حتی کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے گا''۔ [2]

اس کے بعد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا اگر تم پسند کرو تو اس آیت کی تلاوت کرو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

✪ حدیث صحیح ھے ترمذی (۲/ ۳۹) (اس نے کہا حدیث حسن صحیح ہے) میں کہتا ہوں یہ حدیث بخاری، مسلم کی شروط پر ہے۔ بخاری (۷۱۳۱)، مسلم (۸/ ۱۹۵)۔ برقم ۲۹۳۳ .

❁ (حدیث صحیح ھے) صحیح مسلم (۱/ ۹۳۔۹٤)۔ الصحیحة (۲٤٥۷)۔ نیز سمجھ لیجیے کہ دجال، نزول عیسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں احادیث متواترہ ہیں ان پر ایمان لانا ضروری ہے ان لوگوں کی باتوں میں نہ آئیں جو دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ احادیث آحاد ہیں یہ وہ لوگ ہیں انہیں اس کا کوئی علم نہیں۔ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو احادیث کے طریق کا تتبع کرتا ہو، اگر کوئی شخص ان احادیث کا تتبع کرے گا تو وہ ان کو متواتر پائے گا جیسا کہ اس علم کے ماہر حافظ ابن حجر وغیرہ نے اس کی گواہی دی ہے۔ اس بات پر سخت افسوس ہے کہ کچھ لوگ دیدہ دلیری کے ساتھ بات کرتے ہیں جو ان کی شان کے مناسب نہیں، خاص طور پر جب دین اور عقیدہ کی بات ہو۔

ان میں آخر میں اس قسم کا دعوی کرنے والا انسان عزالدین بلیق ہے؛ جس کی کتاب ''موازین القرآن والسنة'' ہے۔ اس نے دوسرے ایسے لوگوں کی تقلید میں بہہ کر یہ بات کہہ دی ہیں جنہیں اس علم کی کوئی معرفت نہیں۔ اس نے کہا ہے: ''بے شک حضرت عیسی علیہ السلام کے دجال کے بعد نازل ہونے کی روایات وہب بن منبہ اور کعب الاحبار سے منقول ہیں؛ جو کہ محض من گھڑت ہیں۔ حقیقت میں ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ میں نے اس سے پہلے تقریباً چالیس احادیث کی تخریج کی ہے؛ جن میں عیسی علیہ السلام اور دجال کا ذکر تک نہیں۔

﴿وَ اِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ وَ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يَكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ شَهِيۡدًاۚ﴾ (النساء: ۱۵۹)

''اور کوئی اہل کتاب ہوگا مگر ان کی موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئے گا اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوں گے۔''

البخاری ۲۲۲۲ ؛ مسلم ۱۵۵۔

دجال کے خروج اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے اور دجال کو قتل کرنے، دجال کے قتل کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں یاجوج ماجوج کے نکلنے؛ اور عیسیٰ علیہ السلام کی دعا کی برکت سے ایک ہی رات میں ان کی ہلاکت کی احادیث کثیر تعداد میں ہیں، اس مختصر کتاب میں ان کو تفصیل کے ساتھ ذکر نہیں کیا جا سکتا۔

دابة الارض [زمینی جانور] کے نکلنے اور سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ اِذَا وَقَعَ الۡقَوۡلُ عَلَيۡهِمۡ اَخۡرَجۡنَا لَهُمۡ دَآبَّةً مِّنَ الۡاَرۡضِ تُكَلِّمُهُمۡ اَنَّ النَّاسَ كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوۡقِنُوۡنَ﴾

(النمل: ۸۲)

''اور جب ان کے بارے میں (عذاب کا) وعدہ پورا ہوگا تو ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے بیان کردے گا اس لیے کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں کرتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأْتِيَهُمُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَٰنُهَا لَمْ تَكُنْ ءَامَنَتْ مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِىٓ إِيمَٰنِهَا خَيْرًا قُلِ ٱنتَظِرُوٓا۟ إِنَّا مُنتَظِرُونَ﴾

(الانعام: ۱۵۸)

''یہ اس کے سوا اور کس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا خود تمہارا رب آئے یا تمہارے رب کی کچھ نشانیاں آئیں؛ جس روز تمہارے رب کی کچھ نشانیاں آجائیں تو کسی نفس کو ایمان لانا فائدہ نہ دے گا جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا ہو۔ یا اپنے ایمان میں نیکی نہ کی ہو۔ فرمادیں: تم بھی انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں۔''

امام بخاری رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت قائم نہ ہوگی حتی کہ سورج اپنے مغرب سے طلوع ہو، جب لوگ اسے دیکھ لیں گے تو قیامت پر ایمان لے آئیں گے؛ اس وقت کسی ایسے نفس کو اس کا ایمان لانا فائدہ نہ دے گا جو اس سے قبل ایمان نہیں لایا''۔ ❶

نیز مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ فرماتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث محفوظ کی ہے جس کو میں کبھی فراموش نہیں کیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے: ''قیامت کی پہلی نشانی سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے؛ اور چاشت کے وقت لوگوں کے سامنے دابۃ الارض [زمینی چوپائے] کا نکلنا ہے۔ ان میں سے جو نشانی پہلے ظاہر ہوئی، دوسری نشانی اس کے بعد جلدی رونما ہوگی''۔ ❷

اس سے مقصود یہ ہی کہ وہ پہلی نشانی جو غیر مانوس ہوگی۔ اگرچہ اس سے پہلے دجال کا خروج اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول اور یاجوج ماجوج کا خروج ہو چکا ہوگا۔ یہ تینوں نشانیاں مانوس ہیں؛ اس لیے کہ یہ وہ بھی بشر ہی ہوں گے، ان ہی کی مانند مألوف ہوں گے۔ جبکہ دابۃ الارض کا عجیب وغریب شکل میں نکلنا مانوس نہیں ہوگا۔ اور وہ لوگوں سے باتیں کرتا ہوگا؛ اور ان پر ایمان یا کفر کی نشانی بھی لگائے گا؛ یہ امور غیر مالوف اور عادت سے خارج ہے۔

چنانچہ زمینی نشانیوں میں سے پہلی نشانی دابۃ الارض کا نکلنا ہے؛ اور سورج کا اپنی عادت مستمرہ کے خلاف مغرب سے طلوع ہونا پہلی آسمانی نشانی ہے۔ [نهاية ۱/ ۱۸۵]۔ بعض حضرات نے علامات قیامت کے موضوع پر الگ الگ کتابیں تالیف کی ہیں جو کہ بڑی مشہور ہیں؛ یہ مختصر کتاب اس تفصیل کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

❶ حدیث صحیح هے۔ مسلم (۱/ ۹۵)۔ مسلم میں اس روایت کے الفاظ یوں ہیں: ''جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا تو وہ تمام لوگ ایمان لے آئیں گے؛ پس آج کے دن ایمان لانا نفع نہیں دے گا......؛ یہاں سے آگے بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور شیخین کے ہاں اس کی ایک شاہد روایت بھی ہے جو کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ البخاری ٤٦٣٥؛ مسلم ۱۵۷؛ النهاية ۱/ ۱۹۵۔

❷ حدیث صحیح هے۔ مسلم (۸/ ۲۰۲) برقم ۲۹٤۱۔

[کاہن اور نجومی پر رد]

۱۰۱۔((وَلاَ نُـصَـدِّقُ كَاهِناً وَلاَ عَرَّافاً وَلاَ مَنْ يَدَّعِي شَيْئاً يُخَالِفُ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ وَإِجْمَاعِ الأُمَّةِ .))

" ہم کسی کاہن اور عراف کی تصدیق نہیں کرتے ہیں اور نہ اس شخص کی تصدیق کرتے ہیں جو کتاب وسنت اور اجماع امت کے خلاف کسی بات کا دعویدار ہے"۔

تَشْرِیح......: امام مسلم اور امام احمد رحمہما اللہ نے حضرت صفیہ بنت ابی عبید رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے؛ وہ ازواج مطہرات میں سے کسی ایک سے روایت کرتی ہیں، کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص عراف کے پاس گیا، اور اس سے کسی چیز کے متعلق پوچھا، تو چالیس رات تک اس کی نماز قبول نہیں ہوگی"۔ ❶

❶ صحیح مسلم ۲۲۳۰، مسند احمد برقم ۱۶٦۲۰، حدیث صحیح هے۔ غاية المرام (۲۸٤)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے؛ بے شک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص کاہن یا عراف کے پاس گیا اور اس کی باتوں کی تصدیق کی: اس نے اس دین کے ساتھ کفر کیا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا"۔ ❶

بعض علماء کے نزدیک نجومی عراف کے نام میں داخل ہے۔ جبکہ بعض دیگر علماء کے نزدیک دونوں مترادف المعنی ہیں جب عراف سے دریافت کرنے والے کے لیے یہ وعید ہے تو جس سے دریافت کیا گیا ہو وہ کس وعید کا مستحق ہوگا؟۔[مجموع ۳۵/ ۱۹۳]

❶ حديث صحيح هے۔ آداب الزفاف (ص ۳۱)۔ غاية المرام (۲۸۵)۔ مسند احمد ۹۵۱۵ ؛ أبو داؤد ۳۹۰٤۔

صحیحین میں اور مسند امام احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے؛ فرماتی ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے میں پوچھا گیا؛ تو آپ نے فرمایا: "وہ کچھ بھی نہیں"۔ انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! کبھی وہ سچی بات کہتے ہیں"۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جنات اس سچی بات کو اچک لیتے ہیں؛ اور پھر اپنے دوست کاہن کے کان میں ڈال دیتے ہیں، کاہن اس میں ایک سو جھوٹھ موٹھ ملا دیتے ہیں"۔ ❶

❶ بخاری ۳۲۱۰، مسلم ۲۲۲۸۔ مسند احمد (٦/ ۸۷ برقم ۲٤۵٦۱)۔

نیز صحیح احادیث میں ثابت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کتے کی قیمت گندی چیز ہے،طوائف کی کمائی گندی چیز ہے،کاہن کی شیرینی گندی چیز ہے''۔ ❶

[حدیث میں اس کمائی کو حلوان کہا گیا ہے؛ جس کو عام طور پر مٹھائی یا شیرینی کا نام دیا جاتا ہے۔]

وہ آمدنی بھی اسی میں داخل ہے جونجومی لیتا ہے یا قسمت آزمائی کرنے والا تیروں والا فال نکال کر لیتا ہے؛ مثلاً وہ لکڑ جس پر ''اب ج د'' مختلف حروف تحریر کیے ہوتے ہیں۔اسی طرح کنکر چلانے والا اور زمین پر لکیریں کھینچنے والا جو کچھ وصول کرتا ہے تمام حرام آمدنی ہے ۔اس کی حرمت پر علماء کا اجماع نقل کرنے والوں میں امام بغوی،قاضی عیاض بھی ہیں۔

❶ حديث صحيح هے۔ مسلم حديث رافع بن خديج ۱۵٦۸ ؛ البخاری ۲۲۳۸ مسلم ۱۵٦۸ عن أبی مسعود۔

صحیحین میں حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے رات کے وقت بارش کے بعد حدیبیہ کے مقام پر خطبہ دیا۔آپ نے فرمایا:

((هَـلْ تَـدْرُوْنَ مَـا ذَا قَـالَ رَبُّـكُمْ ؟ . قُلْنَا اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ أَعْلَمُ . قَالَ: قَالَ: أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِیْ مُـؤمِـنٌ بِـیْ وَ كَـافِـرٌ . فَـأَمَّـا مَـنْ قَـالَ : مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ رَحْمَتِهٖ" فَذٰلِكَ مُؤمِنٌ بِیْ كَافِرٌ بِالْكَوَاكِبِ . وَأَمَّا مَنْ قَالَ : مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَ كَذَا" فَذَالِكَ كَافِرٌ بِیْ مُؤمِنٌ بِالْكَوَاكِبِ .)) ❶

''کیاتم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ ہم نے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''میرے بندوں میں سے بعض نے مجھ پر ایمان کی حالت میں صبح کی اور بعض نے کفر کی حالت میں۔ پس جس نے کہا کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی وہ میرے مومن ہیں اور ستاروں کے کافر۔اور جنہوں نے کہا کہ ہم پر یہ بارش ستاروں کی وجہ سے ہوئی؛ وہ میرے کافر ہوئے اور ستاروں پر ایمان لائے''۔

❶ [مسلم،ح:71] حدیث صحیح ہے۔البخاری ۸٤٦ .

صحیح مسلم میں اور مسند أحمد میں حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''میری امت میں چار کام جاہلیت کے ہیں کو وہ ترک نہیں کریں گے: حسب ونسب پر فخر کرنا،نسب پر طعن و تشنیع کرنا؛ ستاروں سے بارش طلب کرنا،نوحہ گری کرنا''۔ ❶

مسلم ۹۳٤ ؛ مسند أحمد ۲۲۸۹۸ ؛ أحكام الجنائز ۷۲ ؛الصحيحة ۷۳٤ .

ان سے روکنے پر نبی کریم ﷺ،صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین،تمام ائمہ رحمہم اللہ سے احادیث واقوال کثرت کے ساتھ منصوص موجود ہیں۔اس کتاب میں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔[مجموع الفتاوى ۳۵/ ۱۹٤ .]

علم نجوم جس کا موضوع اِحکام/یقینی بنانا اور اثرات ڈالنا ہے،یعنی احوال [اور حوادثات] فلک سے احوال [حوادث] ارضی پر استدلال کیا جاتا ہے۔یا پھر فلکی نظام کو زمین کے حرکات اور زوال پر منطبق کرنا اور آپس میں ملانا ہے۔یہ علم حاصل کرنا کتاب وسنت کی روشنی حرام ہے۔بلکہ تمام پیغمبروں کی زبانی اس کو حرام قرار دیا ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتٰى﴾ (طٰهٰ: ٦٩)

''اور جادوگر جہاں جائے فلاح نہیں پائے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ﴾ (النساء: ۵۱)

''بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا ہے جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا کہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں۔''

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ نے کہا ہے: ''جبت سے مراد جادو ہے''۔[مجموع الفتاوی ۳۵/ ۱۹۲.]

صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے؛ فرماتی ہیں:

''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا؛ آپ اس کی کمائی میں کھایا کرتے تھے۔ وہ ایک روز کوئی چیز لایا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے تناول فرمالیا۔ غلام نے کہا: ''آپ کو معلوم ہے یہ کس چیز کی کمائی تھی؟۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: کس چیز کی کمائی تھی؟۔ اس نے کہا: ''میں نے جاہلیت میں ایک شخص کے لیے کہانت کی؛ حالانکہ میں علم کہانت سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ دراصل میں نے اس کو فریب دیا تھا۔ آج وہ مجھے ملا تو اس نے مجھے عطیہ دیا۔ آپ نے اس میں سے کھایا ہے''۔

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ منہ میں ڈالا اور اپنے پیٹ میں جو کچھ تھا؛ سب قے کر دی''۔ [1]

[1] حدیث صحیح هے۔ بخاری، مناقب لانصار (۳۸۴۲)۔

حاکم وقت اور جس شخص کو بھی قدرت حاصل ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ نجومیوں اور کاہنوں، عرافین؛ رمل والوں اور قرع اور فال نکالنے والوں [یا دیگر کسی ذریعہ سے مستقبل کی خبریں دینے والوں] کا قلع قمع کر دے۔ انہیں دکانوں، اور عام شاہراہوں نہ بیٹھنے دیا جائے، نہ ہی لوگوں کے گھروں میں اس کام کے لیے داخل ہونے دیا جائے۔ اور جس شخص کو ان کاموں کے حرام ہونے کا علم ہو جائے اور پھر بھی وہ باوجود قدرت کے ان کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا؛ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کافی ہے:

﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۝﴾ (المائدہ: ۷۹)

''وہ منکر کاموں کے کرنے سے رکتے نہیں تھے یقیناً ان کے افعال برے تھے۔''

تمام مسلمانوں کا اتفاق/ اجماع ہے کہ یہ ملعون لوگ گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں حرام مال کھا رہے ہیں۔ سنن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؛ آپ نے فرمایا:

''جب لوگ برے کام دیکھیں اور اس کو تبدیل نہ کریں، جلدی ہی ان سب پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے گا''۔ [1]

[1] حدیث صحیح هے مشکوٰۃ (۵۱۴۲)۔أبو داؤد ۴۳۳۸؛ [مجموع الفتاوی ۳۵/ ۱۹۵.]

جو لوگ کتاب و سنت کے مخالف حرکتیں کرتے ہیں؛ ان کی کئی اقسام ہیں:

اول: اہل تلبیس [خلط ملط کرنے والے] جھوٹے اور دھوکہ باز۔ ان میں سے کوئی ایک ظاہر کرتا ہے کہ کوئی جن ان کے تابع ہے۔ یا پھر وجد اور حال والوں کی طرح حال واقع ہونے کا دعوی کرتا ہے۔ حقیقت میں وہ جھوٹے مشائخ؛ جھوٹے فقیروں؛ اور مکار اہل طریقت میں سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایسی سخت اور عبرت ناک سزا کے مستحق ہیں جس کے بعد یہ اور ان کے امثال و ہمنواء اپنے دجل اور تلبیس سے باز آجائیں۔ ان میں بعض اوقات کوئی ایسا گمراہ بھی ہوتا ہے جو قتل کا مستحق ہوتا ہے۔ جیسے وہ انسان جو خوش فہمی میں

مبتلا ہوکر نبوت کا دعویٰ کرتا ہے؛ یا جو کوئی شریعت کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ یا اس طرح کی دیگر کوئی خلاف شریعت حرکت کرتا ہے۔

دوم: کچھ لوگ علم جادو کے ذریعہ ان امور میں بڑے جزم اور اعتماد کے ساتھ حقیقت کے انداز میں بات کرتے ہیں؛ اور مختلف اقسام کے سحر کو کام میں لاتے ہیں۔ [یعنی باطل تخیلات کو حقیقت کا نام دے کر پیش کرتے ہیں]۔

❀ جمہور علماء جادوگر کے قتل کرنے کو واجب کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ، اور ایک روایت میں امام احمد رحمہ اللہ سے یہی مذہب منصوص ہے۔ اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جیسے، حضرت عمر، حضرت ابن عمر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اور دیگر حضرات سے بھی یہی قول منقول ہے۔ پھر ان کے مابین اس مسئلہ میں اختلاف ہے: کیا اس سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا یا نہیں؟۔ اور کیا وہ جادو کرنے سے کافر ہو جاتا ہے؟ یا اسے فساد فی الارض کے ارتکاب کی وجہ سے قتل کر دیا جائے؟۔

ایک گروہ کا خیال ہے کہ: ''اگر اس نے جادو کے ساتھ کسی کو قتل کیا ہے تو اسے بھی قتل کیا جائے۔ وگرنہ قتل سے کم کوئی سخت سزا دی جائے۔ بشرطیکہ اس کے قول اور عمل میں کفر کی آمیزش نہ ہو۔ یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے، امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔

جادو کی حقیقت اور اس کی اقسام:

جادو کی حقیقت اور اس کی اقسام کے بارے میں علمائے کرام رحمہم اللہ کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کہتے ہیں: بے شک جادو کا اثر مسحور [جادو کئے گئے انسان] کی موت اور بیماری میں؛ بغیر کسی ظاہر چیز کے پہنچنے کے ہو سکتا ہے۔

بعض علماء نے اس کو محض تخیل [خیال] قرار دیا ہے۔

لیکن اس بات پر تمام کا اتفاق ہے کہ وہ جادو جس میں سات ستاروں یا دیگر ستاروں کا پکارا جاتا ہے یا ان سے مخاطب ہوا جاتا ہے یا ان کو مسجود بنایا جاتا ہے؛ اور ان کی مناسبت کا لباس، انگوٹھی خوشبو وغیرہ استعمال کر کے ان کی قربت حاصل کی جاتی ہے؛ تو اس کے کفر ہونے میں کچھ شک نہیں یہ تو شرک کا باب اعظم ہے۔ جس کو بند کرنا بلکہ ختم کرنا ضروری ہے۔ جادوگروں کا یہ فعل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے فعل کی جنس سے ہے؛ اللہ تعالیٰ نے ان کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ٥ فَقَالَ اِنِّي سَقِيْمٌ ٥﴾..... الی .....﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ٥﴾ (الصافات: ۷۶-۸۲)

''تب انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نظر کی اور کہا میں تو بیمار ہوں۔ ...... آگے ان آیات تک؛ ...... جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو شرک کے ظلم سے نہیں ملایا؛ ان کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔''

نیز تمام علماء اس پر متفق ہیں کہ ہر وہ دم، تعویذ، اور قسم وغیرہ جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کی آمیزش ہو اس کو زبان پر لانا جائز نہیں۔ بھلے ان کلمات کی تاثیر سے جنات وغیرہ بھی مطیع ہو جاتے ہوں۔ اسی طرح ان تمام کلمات کا بھی زبان پر لانا جائز نہیں جن میں کفر پایا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ کلمات جن کا معنی معلوم نہ ہو ان کو بھی زبان پر نہ لایا جائے۔ اس لیے کہ ان میں ایسے شرکیہ کلام ہونے کا امکان ہے جس کے متعلق کچھ معلوم ہی نہ ہو۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''دم کرنے میں کچھ حرج نہیں، جب تک اس میں شرکیہ کلمات نہ ہوں''۔ ❶

نیز جنات سے پناہ لینا بھی جائز نہیں۔یقیناً اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ان اس فعل کی وجہ سے مذموم قرار دیا ہے۔

❶ مسلم ۲۲۰۰، حدیث عوف بن مالك الاشجعی۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝﴾ (الجن: ٦)

''اور کچھ آدمی جنوں کے مردوں سے پناہ لیا کرتے تھے سوانہوں نے ان کی سرکشی بڑھادی۔''

کہتے ہیں کہ: جب کوئی شخص کسی وادی میں پڑاؤ ڈالتا تو وہ کہتا: ''میں اس وادی کے بیوقوف جنات سے عظیم جن کی پناہ میں آتا ہوں''۔اس طرح وہ صبح تک اس کی پناہ اور امان میں رات گزارتا۔انسانوں کے اس انداز نے جنوں کو مزید مغرور بنا دیا۔ان کی دلیری، سرکشی اور شر میں اضافہ ہوگیا۔اور انہوں نے برملا کہا کہ تمام جنات اور انسانوں پر ہم غالب ہیں اور ان پر ہماری سرداری ہے۔انسانوں کے اس قسم کے برتاؤ نے جنات کو مزید سرکش اور متکبر بنا دیا اور ان کے کفر میں اضافہ ہوگیا۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (سبا ٤٠، ٤١)

''اور جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے فرمائے گا کیا یہ لوگ تم کو پوجا کرتے تھے، وہ کہیں گے تو پاک ہے تو ہی ہمارا دوست ہے نہ یہ، بلکہ یہ جنات کو پوجا کرتے تھے اور اکثر ان ہی کو مانتے تھے۔''

یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھتے تھے کہ وہ فرشتوں کو پکارتے ہیں اور وہ ان سے مخاطب ہوتے ہیں۔حالانکہ ان پر شیاطین کا نزول ہوتا ہے ان کے گمراہ ہونے میں کچھ شک نہیں۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾ (الانعام: ١٢٨)

''اور جس دن وہ ان سب کو جمع کرے گا، اے جنوں کی جماعت! بلاشبہ تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا، اور انسانوں میں سے ان کے دوست کہیں گے: ہمارے رب! ہم ایک دوسرے سے مستفید ہوتے رہے اور اس وقت کو پہنچ گئے جو تو نے ہم پر مقرر کیا تھا، فرمایا: تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہے ہمیشہ اس میں رہو گے مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے بے شک آپ کا رب دانا باخبر ہے۔''

پس انسان کا جنات سے مستفید ہونا اپنی بعض ضروریات پوری کرانا؛ اور اس کے احکام بجالانا؛ اور انہیں چند غیبی امور سے متعلق خبر دینا؛ اور اس طرح کے دیگر کام کرنا ہے۔اور جنات کا انسانوں سے فائدہ اٹھانا یہ ہے: انسانوں کا جنات کی تعظیم کرنا؛ اور ان سے مدد مانگنا؛ اور مشکل حالات میں ان کو پکارنا اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

تیسری قسم: جو شیطانی احوال؛ کشوف اور رجال غیب کے ساتھ خطاب کے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔اور یہ گمان کرتے ہیں کہ انہیں ایسی خوارق عادات/کرامات حاصل ہیں جن کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اولیاء اللہ ہوں۔اور ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اہل

اسلام کے خلاف اہل شرک کے ساتھ معاونت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے ساتھ ساتھ انہیں مسلمانوں سے بھی قتال کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ مسلمان نافرمان ہوگئے ہیں۔ حقیقت میں یہ لوگ مشرکین کے بھائی ہیں۔

[رجال غیب]

اہل علم کے ان کے بارے میں تین گروہ ہیں:

اول: ایک گروہ تو ان کے وجود کا انکار کرتا ہے، لیکن چونکہ بعض لوگوں نے ان کا مشاہدہ کیا ہے، یا بعض ثقہ قسم کے لوگ بتاتے ہیں کہ رجال غیب کو دیکھا گیا ہے؛ اور جب لوگ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کے سامنے خشوع خضوع اختیار کرتے ہیں۔ ان بنا پر ان کے وجود کو تسلیم بھی کیا گیا ہے۔

دوم: دوسرا گروہ جو ان کو پہچان چکے ہیں؛ اور وہ تقدیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور ان کا عقیدہ ہے کہ باطن میں اللہ تعالیٰ تک رسائی کا ایک راستہ انبیاء کے بتائے ہوئے راستہ کے متبادل بھی ہے۔ [اور یہ راستہ رجال غیب کا ہے]۔

سوم: تیسرا گروہ: ان کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ ولی کو رسول کی اطاعت کے دائرہ سے خارج قرار دیں۔ تو کہنے لگے کہ: اصل میں رسولوں ان دونوں گروہوں کے مدد و معاون ہوتے ہیں۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم تو کرتے ہیں، مگر حقیقت میں آپ کے دین اور شریعت سے بالکل جاہل ہیں۔ [دونوں گروہوں سے مراد اہل شریعت اور اہل طریقت ہیں]۔

حقیقت میں یہ لوگ شیاطین کے پیروکار ہیں اور رجال غیب جنات ہی ہیں۔ اور انہی کو رجال کا نام دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝﴾ (الجن: ٦)

''اور یہ کہ بعض بنی آدم، بعض جنات کی پناہ پکڑا کرتے تھے (اس سے) ان کی سرکشی اور بڑھ گئی۔''

وگرنہ انسان تو مالوف و مانوس ہوتے ہیں؛ انسان تو مشاہد ہیں؛ دکھائی دیتے ہیں۔ اگر چہ کبھی انسان نظروں سے اوجھل بھی ہوجاتے ہیں؛ لیکن ان کا ہمیشہ کے لیے انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہنا ممکن نہیں۔ اور جن لوگوں نے رجال غیب کو انسانوں سے شمار کیا ہے؛ یہ ان کی غلطی اور جہالت ہے۔ ان کے متعلق گمراہی؛ اور تین گروہوں میں تقسیم ہوجانے کا سبب یہ ہے کہ وہ اولیاء الرحمان اور اولیاء شیطان میں فرق نہیں کر پاتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں: فقیر لوگ [اہل طریقت] جو کچھ کرتے ہیں، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ بات بالکل باطل ہے۔ بلکہ واجب یہ ہوتا ہے کہ ان کے اقوال، افعال کو شریعت محمدیہ پر پیش کیا جائے؛ ان کی جو باتیں اور کیفیتیں شریعت محمدیہ کے موافق ہوں انہیں قبول کیا جائے اور جو مخالف ہوں انہیں رد کر دیا جائے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''جو شخص ایسا عمل کرتا ہے جس پر ہمارا حکم نہیں؛ وہ عمل مردود ہے۔''[1]

[1] بخاری، مسلم بروایت حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)۔ الارواء (۸۸)۔ غایۃ المرام (۵)۔ السنۃ (۵۲، ۵۳)۔

دوسری روایت میں ہے:

''جس نے ہمارے دین میں ایسی چیز ایجاد کی جو اس دین میں سے نہیں؛ تو وہ مردود ہے''۔

پس رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں اور آپ کی بیان کردہ حقیقت کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں؛ اور آپ کی شریعت کے علاوہ کوئی شریعت نہیں؛ اور آپ کے عقیدہ کے علاوہ کوئی عقیدہ نہیں۔ آپ کے بعد کوئی بھی اللہ تک؛ اس کی رضا تک؛ اور اس کی جنت اور کرامت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا؛ مگر ظاہری و باطنی طور پر آپ ﷺ کی اتباع سے ہی [یہ مقام حاصل کرسکتا ہے]۔

اور جو شخص آپ کی بیان کردہ احادیث کی تصدیق نہیں کرتا آپ کے احکام کی اطاعت کا التزام نہیں کرتا؛ خواہ وہ [احکام] باطنی اعمال ہوں، جن کا دل کے ساتھ تعلق ہے؛ یا ظاہری ہوں جن کا تعلق بدن کے ساتھ ہے؛ تو وہ مومن نہیں ہوسکتا۔ چہ جائیکہ اس کو ولی اللہ تعالیٰ کہا جائے۔ اگر چہ وہ فضا میں اُڑتا ہو، یا پانی پر چلتا ہو؛ اور خزانۂ غیب سے خرچ کرتا ہو؛ اور اگر خالی گریبان سے سونا نکال کر پیش کر رہا ہو۔ بھلے وہ کسی بھی قسم کی خوارق عادت [کرامات کے نام پر] پیش کردے۔ تو وہ کچھ بھی نہیں؛ جب تک وہ احکام شریعت کو ترک کررہا ہے؛ اور ممنوعات پر عمل کررہا ہے۔ ہاں یہ ان شیطانی احوال والوں میں سے کوئی ایک ہوسکتا ہے جو احوال اس انسان کو اللہ تعالیٰ سے دور کرتے ہیں؛ اور اس کی ناراضگی اور عذاب کے قریب کرتے ہیں۔ البتہ جو لوگ مکلّف نہیں ہیں جیسے بچے یا پاگل؛ تو وہ مرفوع القلم ہیں۔ وہ سزا کے مستحق نہیں ہیں۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ پر وہ ظاہری و باطنی ایمان حاصل نہیں جو اللہ تعالیٰ کے مقرب اولیاء کو؛ اور اس کی کامیاب جماعت کو؛ اور اس کے غالب لشکر والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس قسم کے لوگ اپنے باپ دادا کی اتباع میں اسلام میں داخل سمجھے جائیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِیءٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝﴾ (الطور: ۲۱)

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی راہ ایمان میں ان کے پیچھے چلی ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے اعمال میں سے کچھ کم نہ کریں گے ہر شخص اپنے اعمال میں گروی رکھا ہوا ہے۔''

مجانین کی ولایت کی حقیقت:

جو کوئی کسی دیوانے یا فاتر عقل والے انسان کی بابت اولیاء اللہ تعالیٰ میں سے ہونے کا عقیدہ رکھتا ہو؛ جب کہ وہ اقوال و افعال اور احوال میں رسول اللہ ﷺ کی متابعت ترک کئے ہوئے ہو اور اسے رسول اللہ ﷺ کے سچے اتباع کاروں پر فضیلت دیتا ہو؛ تو ایسا انسان گمراہ اور بدعتی ہے۔ وہ اپنے عقیدہ میں خطا پر ہے۔ [مجموع الفتاوی ۱۰/ ۴۳۰.]

بے شک یہ اس دیوانہ انسان یا تو شیطان زندیق ہے، یا بظاہر حیلہ باز مکار متصوف ہے؛ یا وہ دیوانہ اور معذور ہے۔ ایسے شخص کو اولیاء اللہ تعالیٰ متبعین رسول اللہ ﷺ پر کس طرح برتری دی جاسکتی ہے؛ یا ان کے برابر کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟۔ یہ نہیں کہا جاسکتا: کہ ممکن ہے وہ باطن میں متبع سنت اور ظاہراً تارک سنت ہو۔ ایسا کہنا بھی غلطی ہے۔ بلکہ ظاہری اور باطنی طور پر رسول اکرم ﷺ کی اطاعت فرض ہے۔

یونس بن عبدالاعلیٰ صدفی رحمۃ اللہ علیہ کا قول:

یونس بن عبدالاعلیٰ صدفی رحمۃ اللہ علیہ [۱۷۰-۲۶۴ھ] فرماتے ہیں: ''میں نے امام شافعی رحمہ اللہ سے کہا: ''ہمارے استاذ حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''جب تم کسی شخص کو پانی پر چلتے ہوئے دیکھو تو دھوکہ میں نہ آؤ، حتیٰ کہ اس کا معاملہ کتاب وسنت پر پیش کرو''۔ اس پر امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ''لیث رحمۃ اللہ علیہ نے کمی چھوڑ دی؛ میں کہتا ہوں کہ: ''جب تم دیکھو کوئی پانی پر چل رہا ہے؛ یا ہوا میں اڑ رہا ہے؛ تو اس کا بالکل اعتبار نہ کرو؛ حتیٰ کہ اس کا معاملہ کتاب اللہ تعالیٰ پر پیش کر دو''۔

جولوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''میں نے جنت کو دیکھا؛ میں نے دیکھا کہ اکثر اہل جنت کمزور عقل والے ہیں''۔ ❶

❶ حدیث ضعیف ہے اس حدیث کو ابوبکر کلاباذی نے مفتاح المعانی ق (۱/۲۷۵) اور ابن عسا کر نے (۱۲/ ۲/۳۴۵) پر ذکر کیا کہ ابن شاہین کا قول ہے کہ اس حدیث میں مصعب بن ماہان منفرد ہے میں کہتا ہوں وہ سچا ہے لیکن زیادہ خطا کرنے والا ہے (کمافی التقریب) میں کہتا ہوں، اس تک سند میں احمد بن عیسیٰ خشتان کے بارے میں ابن عدی نے کہا ہے: اس نے منکر روایات روایت کی ہیں۔ پھر اس حدیث کو ذکر کر کے کہا کہ یہ حدیث اس سند کے ساتھ باطل ہے۔ نیز اس حدیث کو ابن عدی ق (۲/۱۶۶) اور اس کے غیر نے بھی اس حدث کو انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) سے مرفوعاً ذکر کیا ہے۔ اور کہا کہ یہ حدیث اس اسناد کے ساتھ منکر ہے اس حدیث کو سلامہ بن روح کے علاوہ کسی نے ذکر نہیں کیا اور وہ ضعیف ہے اس کا حفظ غلط ہو گیا تھا۔ نیز ابوموسی المدینی کے نزدیک (اللطائف ق ۱/۷۵) میں اس کی متابعت سفیان بن عیینہ نے کی ہے ساتھ ہی کہا ہے کہ ابن عیینہ کی زہری سے حدیث غریب ہے؛ البتہ سلام بن روح کی روایت معروف ہے۔ نیز یہ حدیث دو طریق سے مرسل بھی آئی ہے پہلا طرق محمد بن منکدر سے ہے۔ معافی بن عمران الزہد میں (ق ۱/۲۴۹) پر کہتے ہیں کہ: ہم سے محمد بن ابی حمید مدنی نے محمد بن منکدر سے اس حدیث کو مرفوع بیان کیا، خیال رہے یہ مدنی راوی ضعیف ہے جیسا کہ تقریب میں ہے۔ اور دوسرا طریق عمر بن عبدالعزیز سے مرسل مرفوع ہے۔ اس میں اضافہ ہے کہ (اعلیٰ علیین عقل والوں کے لیے ہے) اس کو عبدالوہاب کلابی نے اپنے مجموعہ حدیث میں ق (۲/۱۷۶) میں سند کے ساتھ عبدالعزیز بن عمر بن عبدالعزیز عن ابیہ سے روایت کیا ہے۔ عبدالعزیز راوی سچا ہے لیکن خطا کر جاتا ہے کمافی التقریب۔ نیز اس میں ایسے رواۃ بھی ہیں جن کے حالات سے میں باخبر نہیں ہو سکا نیز اس روایت سے اس شخص کا رد ہو رہا ہے جس کا قول ہے کہ اس زیادتی کا اصل موجود نہیں ہے اور یہ زیادتی مدرج ہے۔ احمد بن ابی الحواری نے اس کو مدرج کیا روایت کیا ہے۔ جب کہ احمد کا اس حدیث میں ذکر ہی نہیں ہے۔ میں نے اس حدیث پر بحث کو طویل کر دیا ہے اس لیے کہ مجھے معلوم ہوا کہ شیخ احمد شاکر نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ اس حدیث کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کا کچھ اصل نہیں، حالانکہ میں نے کسی عالم کو نہیں پایا کہ جس نے کسی حدیث کے بارے میں یہ کہا ہوا البتہ زیادتی کے بارے میں بعض لوگوں نے کہا ہے لیکن محدثین کی اصطلاح میں یہ کبھی نہیں کہا گیا (کہ جس حدیث کی ایک یا ایک سے زیادہ اسانید ہوں اگرچہ ضعیف ہوں) کہ اس کا اصل نہیں ہے۔ اب اس کو جان لینا چاہیے۔

یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں۔ اور نہ ہی اس کی آپ ﷺ کی طرف نسبت کرنا صحیح ہے۔ بلا شک وشبہ جنت اہل عقل کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ جن کو ان کی عقلوں نے اللہ تعالیٰ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان کی طرف رہنمائی کی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے اوصاف اپنی کتاب میں ذکر کیے ہیں۔ لیکن ان میں اس وصف کا ذکر نہیں کہ اہل جنت کمزور عقل والے ہوں گے۔ البتہ آپ ﷺ نے یہ ضرور فرمایا ہے:

''میں نے جنت کا مشاہدہ کیا؛ میں نے اس میں کثرت کے ساتھ فقراء کو پایا'' ❶۔

کمزور عقل والوں کا آپ نے ذکر نہیں کیا۔

❶ مسلم من حدیث ابن عباس والبخاری ۳۲۴۱؛ عن عمران۔ الاحادیث الضعیفہ (۲۸۰۰۱)۔ تحت حدیث

آخر وقع فيه زيادة منكرة .

[باطنی ملامتی فرقہ :]

یہ وہ لوگ ہیں جو ایسے کام کرتے ہیں جن پر انہیں ملامت کیا جائے ؛ اور دعوی کرتے ہیں کہ ہم باطن میں اتباع کرنے والے ہیں ۔ ان کا مقصد ریا کاری سے گریز کرنا ہے ۔ انہوں نے ایک باطل کو رد کرنے کے لیے دوسرے باطل کو اختیار کیا ہے ۔ جبکہ صراط مستقیم ان دونوں چیزوں کے درمیان میں ہے ۔

[قوالی یا سماع سے غشی کھانے والے کو بدعتی کہنا:]

اس طرح وہ لوگ جو قوالی اور عمدہ گانے سن کر وجد میں آجاتے ہیں ان پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے ؛ وہ بدعتی اور گمراہ ہیں ۔ انسان سے ایسی چیز کا مطالبہ ہرگز نہیں کیا گیا جو اس کی عقل زائل ہونے کا سبب بن جائے ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ میں کوئی بھی ایسی کرتیں نہ کرتا تھا ۔ حتی کہ قرآن سن کی بھی کوئی غشی نہیں کھاتا تھا ۔ بلکہ وہ بالکل ویسے ہی تھے جیسے قرآن پاک نے ان کے اوصاف بیان کیے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ (الانفال: ۲)

” جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں ۔ “

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ٥﴾
(الزمر: ۲۳)

” اللہ تعالیٰ نے بہت اچھی باتیں نازل کی ہیں ؛ کتاب ملتی جلتی اور دہرائی جانے والی ۔ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر ان کے بدن اور دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں نرم ہو جاتے ہیں یہی اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے وہ جس کو چاہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ۔ “

البتہ جن اہل عقل دیوانوں کا تذکرہ علماء نے خیر کے ساتھ کیا ہے ؛ درحقیقت ان لوگوں میں خیر تھی ؛ بعد ازاں ان کی عقل زائل ہو گئی ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب کبھی انہیں اس جنون سے کچھ افاقہ ہوتا ہے ؛ تو وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں ایمان پر دلالت کرتی ہیں ۔ اور جب عقل زائل ہو تو بہکی ہوئی باتیں کرتے ہیں ‘‘ ۔ [مجموع الفتاوى ۱۰ / ٤٤٠ .]

اور جو کوئی اس حالت جنون سے پہلے کافر یا فاسق تھا ؛ تو اب اس کا پاگل پن اس کے ثابت شدہ کفر اور فسق کو ختم نہیں کر سکتا ۔ ایسے ہی جو اہل ایمان متقی پاگل ہو جائیں ؛ انہیں بھی قیامت کے دن ایماندار ، پرہیزگاروں کے ساتھ اٹھایا جائے گا ۔

مقصود یہ ہے کہ جنون یا کسی دوسری وجہ سے عقل کا زائل ہونا ؛ بھلے اس انسان کو دیوانہ کہا جائے ؛ یا صاحب الحال کہا جائے ؛ یہ

حالت اس [صاحب حال/ دیوانے] کے ایمان اور تقوی بڑھانے کو واجب نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس سے قبل جس بھی خیر وشر پر قائم تھا؛ اسی پر باقی رہے گا۔ اس میں نہ ہی کوئی کمی ہوگی نہ ہی زیادتی۔ لیکن اس کا جنوں اسے خیر و بھلائی میں آگے بڑھنے سے محروم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ کسی برے کام پر سزا دینے سے وہ اس سے رکے گا نہیں اور نہ اس سے پہلے کیے ہوئے گناہ ختم ہوں گے۔

بعض اس قسم کے دیوانے جب طربیہ قوالیاں سنتے ہیں تو ہذیان گوئی شروع کر دیتے ہیں؛ اور بعض ایسی زبان میں باتیں کرتے ہیں جو ان کے ہاں معروف زبان کے خلاف ہے؛ تو درحقیقت یہ شیطان ہوتا ہے؛ جو ان لوگوں کی زبان پر بولتا ہے، جیسے جنات آسیب زدہ انسان کی زبان پر بات کرتے ہیں''۔[مجموع الفتاوى ١٠ / ٤٤٣.]

یہ تمام احوال شیطانی ہیں۔ بھلا یہ کیسے درست ہے کہ عقل کا زائل ہونا اللہ تعالیٰ کی قربت اور اس کی ولایت پانے کے لیے سبب یا شرط ہو؟۔ جیسا کہ بہت سارے گمراہ لوگوں کا خیال ہے۔ حتی کہ ان میں سے ایک شاعر کہتا ہے:

هم معشر حلوا النظام و خرقوا السياج فلا فرض لديهم و لا نفل

مجانين إلا أن سر جنونهم عزيز وعلىٰ ابوابه يسجد العقل

''یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کے نظام کے تار و پود کو بکھیر دیا ہے اور شرعی حدود کو پھاڑ ڈالا ہے، اب ان کے ہاں نہ فرض ہے نہ نفل۔ یہ تو دیوانے ہیں مگر ان کی دیوانگی کا راز اتنا بلند ہے کہ عقل اس کے دروازہ پر سجدے کناں ہے۔''

یہ گمراہ بلکہ کافر انسان کا کلام ہے۔ جس کا خیال ہے کہ دیوانگی میں ایسا راز ہے جس کے دروازے پر عقل بھی سجدہ ریز ہوتی ہے۔ دراصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعض دیوانوں میں کچھ مکاشفات، خرق عادت عجیب وغریب تصرفات کے واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ حالانکہ اس کا سبب ان کے ساتھ شیاطین کی دوستی ہوتا ہے۔ جیسا کہ جادوگروں اور کاہنوں کے ساتھ شیاطین ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ تو اس قسم کا گمراہ انسان اس کشف یا خرق عادت کی وجہ سے انہیں اللہ تعالیٰ کے ولی گمان کرتا ہے۔ حالانکہ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو؛ وہ کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِيْنُ o تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ o﴾(الشعراء: ٢٢١، ٢٢٢)

''(اچھا) میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں، ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں۔''

پس وہ تمام لوگ جن کے پاس شیطان کا آنا جانا ہوتا ہے ان کے ہاں جھوٹ اور فسق و فجور کا پایا جانا ضروری ہے۔ اور جو لوگ ریاضتوں اور خلوتوں کی عبادت کرتے ہیں؛ اور با جماعت نماز اور جمعہ ترک کر دیتے ہیں؛ [اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہے] درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں ہی اکارت ہوگئیں، اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ نیک اعمال کر رہے ہیں؛ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو کوئی بلا عذر سستی دکھاتے ہوئے تین جمعہ ترک کر دے، اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتے ہیں''۔ [1]

اور جو کوئی بھی علم رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی سے اعراض کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ اگر اسے علم نہیں تو وہ پرلے درجہ کا گمراہ انسان ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر نماز میں یہ دعا کرنے کا حکم دیا ہے کہ وہ ہمیں

سیدھی راہ پر چلادے ﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾ ''ان لوگوں کی راہ جن پر اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں جیسے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین رحمہم اللہ۔ اور یہی بہترین رفیق ہیں''۔؛ اور ان لوگوں کی راہ پر نہ چلائے جن غضب ہوا؛ اور نہ ہی ان کی راہ جو لوگ گمراہ ہوئے۔

❁ حدیث صحیح ہے البتہ بخاری اور مسلم میں نہیں ہے ابوداؤد، نسائی، احمد وغیرہ نے اسے روایت کیا ہے، امام حاکم نے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ لیکن یہ کہنا وہم ہے۔ البتہ حدیث کی سند حسن ہے ترغیب وغیرہ میں اس کے شواہد موجود ہیں۔ صحیح ابن خزيمة ٤٨٧٥؛ أبو داؤد ١٠٥٢ مجموع الفتاوی ١٠ / ٤٤٣.]

کیا علم لدنی کی موجودگی میں وحی کی ضرورت نہیں؟

جہاں تک علم لدنی کی موجودگی میں ہمیں وحی سے استغناء پر استدلال کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ کا تعلق ہے؛ جس کا بعض لوگ دعوی کرتے ہیں؛ تو ان کے درمیان کوئی موافقت نہیں۔ اس قسم کی باتیں کہنے والے لوگ ملحد زندیق ہیں۔ بے شک حضرت موسی علیہ السلام حضرت خضر کی طرف مبعوث نہ تھے۔ اور نہ ہی حضرت خضر علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی متابعت کا حکم دیا گیا تھا۔ اسی لیے حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا تھا: آپ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث موسیٰ علیہ السلام ہیں؟۔ تو انہوں نے فرمایا: ''ہاں''۔[البخاری ٣٤٠١؛ جزء من حديث طويل.]

جب کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام جن وانس کی جانب مبعوث ہیں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو وہ بھی آپ کی پیروی فرماتے''۔ ❶

اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمین پر نزول ہوگا؛ تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق فیصلے کریں گے۔

اور اگر کسی کا دعویٰ ہے کہ اس کی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی کیفیت ہے؛ جو کیفیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ تھی؛ یا پھر وہ امت محمدیہ میں سے کسی کے لیے اس کو جائز سمجھتا ہے؛ تو اسے اپنے اسلام کی تجدید کی ضرورت ہے اور وہ دوبارہ کلمہ شہادت کا اقرار کرے۔ بے شک وہ بالکل دین اسلام سے خارج ہو چکا ہے؛ چہ جائیکہ اسے اولیاء اللہ میں سے شمار کیا جائے۔ بلکہ وہ تو اولیاءِ الشیطان میں سے ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر زنادقہ اور اہل استقامت کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ آپ کوشش کریں گے تو یہ فرق نظر آئے گا۔

❁ الارواء (١٥٨٩)۔ گویا کہ مؤلف رحمہ اللہ اس حدیث کی طرف اشارہ کررہے ہیں جو ان کے استاذ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورہ آل عمران آیت ۸۰ کی تفسیر میں نقل کی ہے۔ جس میں ہے: ''اگر حضرت موسی اور حضرت عیسی علیہما السلام بھی زندہ ہوتے تو انہیں میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا''۔ یہ حدیث حضرت عیسی علیہ السلام کے ذکر کے بغیر محفوظ ہے۔ جبکہ عیسی کا اضافہ میرے نزدیک منکر ہے؛ مگر اس کی اسناد میں مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملی۔ شارح نے یہ کلام مدارج السالکین سے نقل کیا ہے۔

یہی حال ان لوگوں کا ہے جو کہتے ہیں کہ کعبہ ان میں سے بعض لوگوں کا طواف کرتا ہے، بھلے وہ جہاں بھی ہوں۔

[ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ] کعبہ اس وقت حدیبیہ کی طرف کیوں نہ نکلا؛ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طواف کیوں نہ کیا، جب آپ وہاں پر روک دیئے گئے تھے؛ اور آپ چاہتے تھے کہ ایک محبت بھری نظر کعبہ کو دیکھ لیں۔ دراصل یہ لوگ ان لوگوں کے ساتھ مشابہت رکھتے

ہیں جن کا بیان ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝﴾ (المدثر: ٥٢)......الخ

''بلکہ ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس کھلی ہوئی کتاب آئے۔''

[جماعت کی اہمیت]

١٠٢۔((وَنَرَى الْجَمَاعَةَ ①حَقًّا وَصَوَابًا وَالْفُرْقَةَ زَيْغًا وَعَذَاباً .))

''ہم جماعت کو حق اور صحیح سمجھتے ہیں اور تفرقہ کو ٹیڑھا پن اور عذاب گردانتے ہیں''۔

① ۔علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جماعت وہ راستہ ہے جس پر جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم اجمعین گامزن تھے۔اور یہ لوگ فرقہ ناجیہ ہیں؛ اور یہی محدثین[اہل حدیث] کا گروہ ہیں؛ اور جو لوگ مذاہب کے متبعین ان کی راہ پر چلتے ہیں؛ اور دیگر حضرات بھی۔

اقول: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ,,تم پر جماعت کے ساتھ منسلک رہنا واجب ہے'اور اپنے آپ کو تفرقہ بازی سے بچاؤ۔ بیشک شیطان ایک کے ساتھ ہوتا ہے،اور وہ دو سے زیادہ دور ہوتا ہے۔اور جو کوئی جنت کی خوشبو پانا چاہے اسے چاہیے کہ جماعت کو لازم پکڑے،،۔[أرواء الغليل ٦/ ٢١٥؛ الجامع الصغير ؛ح:٤٣١١۔ قال الألباني صحيح ، أنظر: صحيح الجامع برقم:٢٥٤٦۔ضلال الجنة ١/ ٣٥۔]

ایک دوسری روایت میں ہے،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((فإن يد الله على الجماعة))۔''بے شک اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے''۔[الجامع الصغير ؛ح:٢٧٢٩۔ قال الألباني صحيح ، أنظر: صحيح الجامع برقم :١٨٤٨٦۔ضلال الجنة ١/ ٣٣۔]

(علامہ بربہاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں): فمن السنة لزوم الجماعة؛ فمن رغب عن الجماعة وفارقها فقد خلع رِبقةَ الإسلام من عنقه ؛ وكان ضالاً مضلاً۔''اور سنت میں سے ہے کہ جماعت کو لازم پکڑا جائے۔اور جو کوئی جماعت سے بے رغبتی کرے اور اس سے جدا ہو جائے' تو یقیناً اس نے اسلام کا پٹہ اپنے گلے سے اتار پھینکا۔خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا بن گیا''۔

اس حدیث کی بنیاد پر جماعت کے لیے دو بنیادی اکائیاں ہیں: ا-:یہ کہ جماعت کا منہج کتاب وسنت پر مبنی ہو نہ کہ لوگوں کی آراء اور قیاسات پر۔

٢-: یہ کہ اس مسلمان جماعت کا امام ہو'جو ان کی قیادت اور رہنمائی کرے؛ اور جس کی طرف رجوع کیا جاتا ہو۔اس لیے کہ جماعت کا اکٹھا ہونا امام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اگر مسلمانوں کے لیے امام (اکبر یعنی حاکم) نہ ہو تو پھر ان تمام فرقوں سے دور رہو(بھلے وہ اپنے آپ کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہوں' اور انہوں نے اپنی اپنی جماعتیں بنا کر ان کے امراء بھی مقرر کر رکھے ہوں'اس صورت میں یہ تمام لوگ فرقے کہلائے گے'ان پر جماعت کا اطلاق نہیں ہوسکتا؛ اور ان سے علیحدہ ہونے والے کے لیے کوئی وعید نہیں ہے' بلکہ از روئے حدیث ان سے علیحدہ ہونا واجب ہو جاتا ہے-دراوی جی عفی اللہ عنہ-)۔

تَشْرِیح......:اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آلِ عمران: ١٠٣)

''اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

(آلِ عمران: ۱۰۵)

''اوران کی طرح نہ ہونا جومتفرق ہو گئے اورواضح احکام آنے کے بعد ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے یہ وہ لوگ ہیں جن کو بڑا عذاب ہوگا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَہُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْہُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَآ اَمْرُہُمْ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ یُنَبِّئُہُمْ بِمَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَo﴾ (الانعام: ۱۵۹)

''بے شک جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا؛ اور کئی کئی گروہ ہو گئے؛ آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں؛ ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر ہے، پھر جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں وہ ان کو (سب) بتائے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَo اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ﴾ (ھود: ۱۱۸، ۱۱۹)

''وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جن پر تمہارا رب رحم کرے۔''

پس اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت والوں کو اس اختلاف سے مستثنیٰ رکھا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ نَزَّلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍo﴾(البقرہ: ۱۷۶)

''یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے برحق کتاب نازل فرمائی ہے اور بے شک جنہوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا وہ بہت دور کی بدبختی میں جا پڑے ہیں۔''

اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بیشک اہل کتاب اپنے دین کے سلسلہ میں بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ اور بے شک یہ امت عنقریب تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی؛ یعنی تمام فرقے خواہش پرست ہونگے۔ سارے فرقے جہنمی ہوں گے؛ سوائے ایک فرقہ کے؛ وہی ایک جماعت ہوگی''[1]۔

ایک روایت میں ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! وہ کون ہیں؟۔

'آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس راہ پر چلنے والے جس پر میں اور میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں''۔

اس حدیث سے واضح ہوا کہ سوائے اہل سنت والجماعت کے اکثر اختلاف کرنے والے تباہ و برباد ہونے والے ہیں۔ نیز اختلاف کا واقع ہونا لامحالہ تھا۔

نیز امام احمد رحمہ اللہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے حدیث لائے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''شیطان انسان کا بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے؛ وہ دور رہنے والی اور کنارے والی بکری کر پکڑتا ہے، پس تم اپنے آپ کو گروہ بندی سے بچاؤ؛ اور جماعت، عوام، مسجد کو لازم پکڑو''۔[2]

[1] صحیح ہے ابوداؤد ۴۵۹۷۔ الصحیحة (۲۰۳)۔ البتہ بعد میں ذکر ہونے والی حدیث میں ضعیف ہے۔

❁ صحیح الاسناد ہے لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس حدیث کو کیسے صحیح کہہ دیا۔ حالانکہ اس کی سند ضعیف ہے۔ دیکھیے: تخریج المشکوٰۃ (۱۸٤) احادیث الضعیفه (۳۰۱٦) ضعیف الجامع الصغیر (۱٤۷۷)۔

نیز بخاری، مسلم میں ہے: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَى أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ﴾ (الانعام: ٦٥)

''فرما دیجیے: وہ قادر ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے عذاب بھیجے۔''

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تیری ذات کے ساتھ پناہ طلب کرتا ہوں، پھر جب فرمایا:

﴿أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ﴾ (الانعام: ٦٥)

''یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے۔''

تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تیری ذات کے ساتھ پناہ طلب کرتا ہوں، پھر جب فرمایا:

﴿أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ﴾ (الانعام: ٦٥)

''یا تمہیں فرقہ فرقہ کر دے اور ایک کو دوسرے (سے لڑا کر آپس) کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔''

آپ نے فرمایا: ''یہ دونوں عذاب معمولی ہیں''۔ ❶

❁ حدیث صحیح ہے۔ التحفة للحافظ المزی (۲/ ۲۵۱)۔ اس حدیث کو صرف بخاری نے روایت کیا ہے ٤٦٢٨؛ دیکھو: تفسیر ابن کثیر۔

پس یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ امت محمدیہ کا فرقوں میں تقسیم ہو جانا اور ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس حالت سے براءت کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ چناچہ وہ اس خصلت کے سلسلہ میں دور جاہلیت کی راہ پر ہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب امت میں اختلاف رونما ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کثرت کے ساتھ موجود تھے؛ ان سب نے اس بات پر اجماع کیا کہ قرآن پاک کی کسی آیت کی تاویل کرتے ہوئے؛ اختلاف کی وجہ سے جو خون بہایا؛ مال ضائع ہوا؛ یا زخم پہنچا؛ اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا گویا کہ اس اختلاف کو دور جاہلیت کے اختلاف پر محمول کیا جائے''۔

نیز امام مالک رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتے ہیں، وہ کہا کرتی تھیں: لوگوں نے اس آیت پر عمل چھوڑ دیا ہے:

﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ﴾ (الحجرات: ۹)

''اور اگر مومنوں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف رجوع لائے۔'' [مؤطا میں یہ روایت نہیں ملی]

بے شک جب مسلمان آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرانا واجب ہو جاتا ہے۔ جیسے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ لیکن جب اس پر عمل نہ کیا گیا تو فتنوں نے سر نکالا اور دور جاہلیت لوٹ آیا اور نزاع بڑھتا چلا گیا۔

امت کا اختلاف اور اس کا حل:

یہی حال ان تمام امور کا ہے جن امور میں امت کا اختلاف ہے؛ خواہ وہ اصول میں ہو یا فروع میں؛ جب ان معاملات کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی طرف نہ لوٹایا جائے؛ تو اس میں حق واضح نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ان میں اختلاف کرنے والے بھی بغیر کسی واضح دلیل کے اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے؛ اور یہ ایک دوسرے کے پاس موجود حق کا اعتراف کرلیں؛ اور ایک دوسرے پر سرکشی نہ کریں؛ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بعض اجتہادی مسائل میں اختلاف موجود تھا؛ اور وہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے تھے؛ نہ کوئی کسی پر عداوت کرتا نہ ہی اس پر عداوت کی جاتی۔ اگر ان پر رحم نہ کیا جاتا؛ تو ان کے مابین مذموم اختلاف پیدا ہو جاتا؛ اور وہ ایک دوسرے پر بغاوت کرتے۔ خواہ یہ بغاوت صرف زبان سے ہو جیسے ایک دوسرے کافر اور فاسق کہنا؛ خواہ فعل سے ہو جیسے فریق مخالف کو قید کرنا؛ مارنا؛ قتل کرنا۔ اور جو حضرات مسئلہ خلق قرآن میں امتحان میں مبتلا کرتے تھے؛ ان کا تعلق بھی اسی گروہ سے تھا۔ انہوں نے ایک بدعت ایجاد کرلی؛ اور پھر جس نے اس بدعت میں ان کی مخالفت کی؛ اسے وہ کافر کہتے؛ اس کے حقوق کی پامالی کرنا اور انہیں سزائیں دینا حلال سمجھتے۔

جب لوگوں پر دین اسلام کی کچھ وہ باتیں مخفی رہ جائیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے؛ تو پھر اس سلسلہ میں لوگ یا تو عادل ہوتے ہیں یا ظالم۔ ان میں عادل [اعتدال پر قائم] وہ ہے جو ان چیزوں پر عمل پیرا ہو جو اسے انبیاء کرام علیہم السلام کے آثار میں سے پہنچی ہیں۔ اور وہ دوسرے پر ظلم نہیں کرتا۔

اور ظالم وہ ہے: جو دوسرے پر زیادتی کرتا ہے۔ ان میں سے اکثر جان بوجھ کر زیادتی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ﴾ (آلِ عمران: ۱۹)

''اور اہل کتاب نے جو (اس دین سے) اختلاف کیا ہے تو علم حاصل ہونے کے بعد آپس کی ضد سے کیا۔''

اگر ایسا نہ ہوتا؛ اور جس عدل کا انہیں علم تھا اس کے مطابق راہِ اعتدال پر چلتے؛ اور ایک دوسرے کو برداشت کرتے۔ جیسا کہ ائمہ اہل علم کی تقلید کرنے والے لوگ۔ یہ حضرات خوب سمجھتے ہیں کہ وہ ان مسائل میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی معرفت سے عاجز ہیں؛ پس انہوں نے اپنے ائمہ علم کو رسول اللہ ﷺ کا نائبین کا درجہ دیا؛ اور کہہ دیا کہ: ہم زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کرسکتے تھے۔ پس ان میں سے عادل حضرات دوسروں پر ظلم وزیادتی نہیں کرتے؛ اور نہ ہی اپنے مخالفین پر قول یا فعل سے زیادتی کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے ہی امام کا قول صحیح ہے؛ بھلے اس پر وہ کوئی دلیل نہ بھی پیش کرسکے؛ اور اپنے مخالف کی مذمت کرے؛ حالانکہ اس کا عذر ہے''۔ [مجموع الفتاوی ۱۷ / ۳۱۰.]

اختلاف کی اقسام:

پھر اختلاف اور افتراق کی اصل میں دو قسمیں ہیں:

اول: اختلاف تنوع.

دوم: اختلاف تضاد ۔

پھر **اختلاف تنوع** کی آگے کچھ اقسام ہیں:

اول: دونوں اقوال اورافعال میں سے ہر ایک حق اور مشروع ہو۔ جیسا کہ قرآن پاک کی قراءتوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہو گیا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ڈانٹ پلاتے ہوئے فرمایا: ''تم دونوں کی قراءت صحیح ہے''۔ ❶

❶ بخاری ۲٤۱۰ من حديث عبد الله بن مسعود (رضی الله تعالىٰ عنه)۔

ضروری نوٹ: علامہ بربہاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فمن خالف أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم في شيءٍ من أمر الدين فقد كفر''۔ ''سو جس نے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت امورِ دین میں سے کسی چیز میں کی؛ اس نے یقیناً کفر کا ارتکاب کیا'' ۔اس میں بذیل تفصیل ہے:

کفر دو قسم کا ہوتا ہے: کفر اعتقادی: اس کی وجہ سے انسان ملت اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

کفر عملی: کفر عملی کی وجہ سے انسان اس وقت تک دائرہِ اسلام سے خارج نہیں ہوتا جب تک وہ ایسے کام نہ کرے جو اسلام کے صریح مخالف ہوں، جیسے بتوں کو سجدہ کرنا، قرآن مجید کی توہین کرنا، یا انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی ایک نبی کو گالی دینا یا ان کا ٹھٹھہ و مذاق اڑانا، اور ان میں عیب جوئی کرنا اور نقص نکالنا وغیرہ ۔ جو شخص عقیدہ کے معاملات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف عقیدہ رکھتا ہو؛ اس کا شمار کفر اعتقادی کے مرتکب افراد میں ہوگا۔ اور اس سے کوئی تأویل وغیرہ قبول نہیں ہوگی۔ جیسے کہ روافض، معتزلہ، شیعہ اور خوارج وغیرہ (اور موجودہ دور میں بہائی؛ قادیانی؛ بابی؛ اور ذکری فرقے۔ ان سب کے عقائد حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے عقائد اور ان کے علم و عمل کے خلاف ہیں؛ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس شر سے محفوظ رکھے)۔

❀ اسی طرح نوع کا اختلاف؛ جیسے اذان، اقامت؛ دعائے استفتاح، سجدہ سہو کے مقام، تشہد، نماز خوف اور تکبیرات عیدین وغیرہ کے مسائل میں [اختلاف تنوع کا اختلاف] ہے۔ یہ تمام طریقے مشروع/ جائز ہیں؛ اگر چہ بعض صورتیں دیگر صورتوں سے ارجح اور افضل ہیں۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ امت کے بہت سارے لوگوں میں اس اختلاف کی وجہ سے گروہوں کی جنگ وقتال تک نوبت پہنچی ہے؛ ان میں بعض لڑائیاں اقامت دوہری یا اکہری کہنے پر یا اس جیسے دوسرے مسائل میں اختلاف کی وجہ سے پیش آئیں۔ حالانکہ ایسا کرنا بالکل حرام ہے۔

اسی طرح آپ ان میں سے بہت سارے لوگوں کو دیکھیں گے کہ ان کے دلوں میں ان میں سے کسی ایک صورت کی خواہش زیادہ اور دوسری صورت سے اعراض اور اس کی ممانعت ہوتی ہے۔ پس اس خواہش کی وجہ سے وہ اسی چیز میں داخل ہو جاتے ہیں جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا تھا۔

اور اختلاف کی ایک صورت یہ ہے کہ دو بظاہر مختلف قول مترادف المعنی ہوتے ہیں؛ لیکن دونوں کی عبارات مختلف ہوتی ہیں۔ جیسا کہ بہت سارے لوگوں میں الفاظ کی حدود، دلائل کے صیغوں اور مسمیات کی تعبیر میں اور اس طرح کے دیگر امور میں اختلاف ہوتا ہے۔ پھر جہالت یا ظلم کی وجہ سے کسی ایک قول کی تعریف کی جاتی ہے اور دوسرے قول کو مذموم قرار دیا جاتا ہے؛ اور اس کے قائل پر زیادتی کی جاتی ہے۔ اس طرح کے دیگر امور بھی پیش آتے ہیں۔

دوم: اختلاف تضاد ۔ وہ ہے جس میں دونوں اقوال ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ کبھی یہ نفی/ منافات اصول میں میں ہوتی ہے؛ اور کبھی فروع میں۔ جمہور اہل علم کے ہاں ان میں سے ایک فریق حق پر ہوتا ہے۔ یہ معاملہ زیادہ گھمبیر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ دونوں اقوال ایک دوسرے کی نفی کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں ان میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق کا قول باطل پر ہوتا ہے؛ اور ان کے مد مقابل فریق کس قدر حق پر ہوتا ہے؛ یا اس کے پاس ایسی دلیل ہوتی ہے جس کا تقاضا کسی قدر حق کا ہوتا ہے۔ مگر فریق اول حق کے ساتھ ساتھ باطل کا بھی رد کر دیتا ہے۔ تو معاملہ ایسے ہو جاتا ہے کہ اگر دوسرا فریق بھی باطل کے ساتھ

کسی قدر حق کو بھی رد کر دیتا ہے؛ تو پہلا فریق ان اصولوں کو ہی رد کر دیتا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے ہاں اس طرح کے معاملات بہت زیادہ پیش آتے ہیں۔

اہل بدعت کا معاملہ غالب طور پر اسی طرح کا ہوتا ہے۔ جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے نور اور ہدایت سے نوازا ہو؛ وہ وہ اس اختلاف میں اس واضح راہ کو دیکھ لیتا ہے جو اس اختلاف اور اس جیسے دوسرے اختلاف کی ممانعت کے سلسلہ میں کتاب وسنت میں وارد ہوئی ہے۔ اگر چہ صحیح اور سلیم دل اس کا انکار بھی کرتے ہیں؛ مگر [اس پر کتاب وسنت کی تائید] بھی ہو تو نور علیٰ نور ہو جاتا ہے۔

اختلاف تنوع جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے؛ اس میں وہ انسان قابل مذمت ہے جو اپنے مخالفین پر کیچڑ اچھالتا ہے جبکہ قرآن کریم نے دونوں فریقوں کی تعریف کی ہے اگر مخالفت میں طعن وتشنیع نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (الحشر: ٥)

''تم نے جو کھجور کا درخت کاٹ ڈالا؛ یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا؛ یہ سب اللہ کے حکم سے ہوا۔''

درختوں کو کاٹنے پر ان میں اختلاف تھا چنانچہ کچھ لوگوں نے درختوں کو کاٹا اور دوسرے لوگ باز رہے۔

اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾ (الانبیاء: ۷۸، ۷۹)

''اور داؤد اور سلیمان؛ جب وہ ایک کھیتی کا فیصلہ کرنے لگے جسے لوگوں کی بکریاں رات کو چر گئیں تھیں اور ہم ان کے فیصلے کو دیکھ رہے تھے؛ تو ہم نے فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا اور ہم نے دونوں کو حکم اور علم بخشا تھا۔''

ان دونوں آیتوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو فہم کے ساتھ خاص کیا گیا ہے جب کہ دونوں کی علم اور حکمت کے اوصاف کی وجہ سے تعریف کی گئی ہے۔ اور جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے دن اس شخص کو درست قرار دیا جس نے عصر کی نماز اس کے وقت میں ادا کی اور اس شخص کو بھی درست قرار دیا جس نے عصر کی نماز کو مؤخر کیا اور بنو قریظہ پہنچ کر وہاں نماز ادا کی''۔ [1]

نیز ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''جب حاکم اجتہاد کرے اور صواب کو پالے تو اس کے لیے دو ثواب ہیں اور جب اجتہاد میں خطا کر جائے تو اس کے لیے ایک ثواب ہے''۔ [2]

اس کی مثالیں کافی زیادہ ہیں۔

دوسرا اختلاف وہ ہے جس میں ایک جماعت کی حمد وستائش کی گئی ہو اور دوسری جماعت کی مذمت کی گئی ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

[1] بخاری ٩٤٦، مسلم ١٧٧٠؛ عن ابن عمر۔

[2] بخاری ٧٣٥٣؛ ٧٣٥٢، مسلم ١٧١٦، احمد و غیر ھم من حدیث ابی ھریرہ و عمر وبن العاص۔

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ﴾ (البقرہ: ٢٥٣)

''اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سے پچھلے لوگ اپنے پاس کھلی نشانیاں آنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے لیکن انہوں نے اختلاف کیا تو ان میں سے بعض تو ایمان لے آئے اور بعض کافر ہی رہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِیۡ رَبِّهِمۡ فَالَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَهُمۡ ثِیَابٌ مِّنۡ نَّارٍ﴾(الحج: ۱۹)

''یہ دو فریق اپنے رب کے بارے میں جھگڑتے ہیں تو پس جو کافر ہوئے؛ ان کے لیے آگ کے پیرہن کاٹے جائیں گے۔''

امت میں اختلاف کا بڑا حصہ جس کی اصل خواہشات ہیں؛ اس کا تعلق پہلی قسم سے ہے۔ اسی طرح امت مسلمہ میں خون گرانا اموال کو حلال سمجھنا؛ اور بغض اور عداوت وغیرہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔ چونکہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے پاس موجود حق کا اعتراف نہیں کرتا؛ اور نہ ہی ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرتا ہے۔ بلکہ اپنے پاس موجود حق کے ساتھ باطل ملا کر اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے؛ پھر دوسرا فرقہ بھی ایسے ہی کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اس سرکشی اور بغاوت کا اصل مصدر بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ مَا اخۡتَلَفَ فِیۡهِ اِلَّا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡهُ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَیِّنٰتُ بَغۡیًۢا بَیۡنَهُمۡ﴾(البقرہ: ۲۱۳)

''اور اس میں اختلاف ان لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی باوجود یہ کہ ان کے پاس کھلے ہوئے احکام آ چکے تھے؛ آپس کی ضد سے۔''

اس لیے کہ سرکشی/ بغاوت کا مطلب ہے: حد سے تجاوز کر جانا۔ اس چیز کو قرآن پاک کے متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے تاکہ اس امت کے لیے سامانِ عبرت ہو جائے۔ اسی مضمون کے قریب تر صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابو زناد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے؛ وہ اعرج سے؛ اور وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم مجھے چھوڑے دو؛ جب تک میں تمہیں چھوڑے رکھوں۔ بے شک تم سے پہلے لوگ کثرت سوال اور انبیائے کرام علیہم السلام کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ تو جب میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو تم اس سے رک جاؤ؛ اور جب کسی بات کا حکم کروں تو استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو''[1]۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ: جس چیز کا انہیں حکم نہیں ملا؛ اس کے متعلق سوال کرنے سے رک جائیں۔ اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ: سابقہ امتوں کی ہلاکت کی وجہ ان کا کثرت کی ساتھ سوال کرنا؛ اور پھر انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرتے ہوئے ان کی نافرمانی کرنا تھی۔

[1] حديث صحيح هے۔ الا حاديث الصحيحة (۸۵۰)۔ الارواء (۱۵۵، ۳۱٤) حديث ابی هريرة۔البخاری ۷۲۸۸؛ مسلم ۱۳۳۷؛ ۲۳۵۷.

جو لوگ اختلاف کو تسلیم کرتے ہیں؛ ان کے نزدیک اختلاف فی الکتاب دو قسم کا ہے:

اختلاف فی التنزیل اور اختلاف فی التاویل۔

ان دونوں میں ایمان کا ایک حصہ پایا جاتا ہے۔ کامل ایمان نہیں۔

پہلا اختلاف: جیسے اللہ تعالیٰ کا قرآن کے ساتھ کلام کرنے اور اس کے نازل کرنے میں اختلاف۔

ایک گروہ کہتا ہے: یہ کلام اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیئت کے ساتھ حاصل ہوا ہے؛ لیکن اسے دوسری چیز میں پیدا کیا گیا ہے؛ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم نہیں۔

دوسرے فرقے کا عقیدہ ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی صفت اور اس کے ساتھ قائم ہے؛ یہ مخلوق نہیں۔ لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مشئیت اور قدرت کے ساتھ کلام نہیں کرتے۔ واضح رہے کہ دونوں گروہوں نے اپنے کلام میں حق و باطل کو جمع کر دیا ہے۔ پس وہ حق کے ایک حصہ پر ایمان لائے؛ اور دوسرے فریق نے پہلے گروہ کی بعض حق باتوں کو بھی جھٹلا دیا۔ اس کی طرف اشارہ پہلے گزر چکا ہے۔

اختلاف فی التاویل: یہ بھی کچھ حصہ پر ایمان کو متضمن ہے؛ کچھ حصہ کو نہیں۔ یہ اختلاف بھی کثرت کے ساتھ ہے۔

جیسا کہ حضرت عمرو بن شعیب کی اپنے والد سے؛ اور ان کے دادا سے روایت میں ہے؛ فرماتے ہیں:

''ایک دن رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تشریف لائے تو وہ مسئلہ تقدیر میں جھگڑا کر رہے تھے۔ ہر ایک اپنے مؤقف پر آیات پیش کر رہا تھا۔ [تو آپ ﷺ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا]، جیسا کہ آپ ﷺ کے چہرہ میں انار نچوڑا گیا ہو۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا:

''کیا تمہیں اس کا حکم دیا گیا ہے؟ یا تمہاری یہ ذمہ داری ہے کہ تم کتاب اللہ تعالیٰ کے بعض کو بعض کے ساتھ غلط قرار دے رہے ہو؟۔ دیکھو: جس کام کا تمہیں حکم دیا گیا ہے؛ اس کی اتباع کرو۔ اور جس کام سے روکا گیا ہے اس سے باز آ جاؤ'' [1]۔

[1] حديث صحيح هے۔ شرح السنة للبغوی (۱۲۱) طبع المكتب الاسلامی.

ایک روایت میں ہے: ''اے قوم! اسی وجہ سے تم سے پہلے ہونے والی امتیں گمراہ ہوگئیں؛ کہ وہ اپنے پیغمبروں سے اختلاف کرتے؛ اور کتاب اللہ تعالیٰ کی بعض آیات سے بعض آیات کا رد کرتے۔ اور بے شک قرآن پاک اس لیے نازل نہیں ہوا کہ اتو اس کی کچھ آیات کو دوسری آیات سے رد کر دو۔ لیکن قرآن پاک کا نزول اس لیے ہوا ہے کہ اس کی بعض آیات دوسری بعض آیات کی تصدیق کرتی ہیں۔ پس جس جس قدر تمہیں معرفت حاصل ہو جائے اس پر عمل کرو؛ اور جس قدر متشابہات رہ جائیں ان پر ایمان لے آؤ''۔ [الطبقات لابن سعد ٤ / ١٩٢.]

ایک روایت میں ہے: ''پس بے شک تم سے پہلی امتوں پر اس وقت تک لعنت نہیں کی گئی کہ ان میں اختلاف رونما ہوا۔ یاد رکھو قرآن پاک میں جھگڑے کھڑے کرنا کفر ہے''۔

(یہ حدیث مشہور ہے؛ جو کہ مسانید اور سنن کی کتابوں میں روایت کی گئی ہے۔ مسند أحمد ٦٦٦٥؛ بهيقي ٨٥؛ إقتضاء الصراط المستقيم ٣٧-٤٢؛ مصنف ابن ابی شیبه ١٠/ ٥٢٨؛ لالكائی ١١١٩۔ صحيح)

اصل حدیث صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن رباح الانصاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے؛ وہ کہتے ہیں: بے شک حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''ایک روز میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں دوپہر کے وقت گیا، آپ نے دو آدمیوں کی آواز سنی وہ ایک آیت میں اختلاف کر رہے تھے۔ آپ ﷺ تشریف لائے، آپ کے چہرہ مبارک سے غصہ کے آثار نمایاں تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ کتاب اللہ تعالیٰ میں اختلاف کی وجہ سے تباہ برباد ہوئے''۔ [1]

تمام اہل بدعت تاویل میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔بعض تاویلات پر ایمان رکھتے ہیں۔بعض پر ایمان نہیں رکھتے۔جو آیات ان کی رائے کے موافق ہوں انہیں تسلیم کرتے ہیں اور جو آیات ان کی رائے کی مخالف ہوں؛ان کی تاویل ایسی کرتے ہیں؛ جو اصل میں تحریف ہے؛کلمات کو اپنی جگہ پر بدل دیتے ہیں۔یا کہہ دیتے ہیں: یہ متشابہ ہے جس کے معنی کا کسی کو علم نہیں۔پس اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ معانی کا انکار کرتے ہیں؛ یہ کام دراصل ان آیات کے ساتھ کفر کے معنی میں ہے۔

اس لیے کہ معانی کو چھوڑ کر صرف الفاظ پر ایمان رکھنا ویسے ہی ہے جیسے اہل کتاب کا ایمان ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

۞ حديث صحيح هے۔مسلم ٢٦٦٦۔

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (الجمعه: ٥)

''ان کی مثال جنہیں تورات دی گئی، پھر انہوں نے اس کے بار کو نہ اٹھایا؛ گدھے کی طرح ہے جس پر کتابیں لدی ہوں۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ﴾ (البقره: ٧٨)

''اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں؛ جو کتاب کا علم نہیں رکھتے؛ سوائے حروف پڑھنے کے۔''

لفظ امانی سے مراد: معانی سمجھنے کے بغیر صرف تلاوت ہے۔یہ شخص اس مومن کی طرح نہیں ہوسکتا جو قرآن کے کچھ نہ کچھ معانی سمجھتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے۔اور کچھ حصہ اس پر مشتبہ رہ جاتا ہے؛اس کا علم وہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''قرآن پاک کی جن آیات کے معانی کی معرفت حاصل ہو جائے ان پر عمل کرو؛اور جس سے تو لاعلم رہو؛اس کو قرآن کے کسی عالم کے سپرد کرو''۔ [1]

یہ انسان آپ ﷺ کے حکم پر عمل کرنے والا ہے۔

۞ صحيح هے۔ مسند احمد (٢/ ١٨١) فى الحديث (٤٦٢).

آسمان اور زمین کا دین: دین اسلام:

۱۰۳۔((وَدِيْنُ اللّٰهِ فِيْ الأَرْضِ وَالسَّمَاءِ وَاحِدٌ وَهُوَ دِيْنُ الإِسْلاَمِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ وَقَالَ تَعَالٰى:﴿وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾))

''آسمان و زمین میں اللہ تعالیٰ کا دین ایک ہے اور وہ دین اسلام ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران: ١٩)

''بے شک دین اللہ تعالیٰ کے ہاں اسلام ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائده: ٣)

''اور میں نے تمہارے لیے اسلام دین پسند کر لیا ہے۔''

علامہ بربہاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جان لیجیے کہ: اسلام ہی سنت ہے' اور سنت ہی اسلام ہے۔ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا''۔[شرح السنہ اردو ۵۱] حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں؛ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((أَلَا وَإِنِّي أُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَ مِثْلَهٗ مَعَهٗ ' أَلَا وَ إِنِّي أُوتِيْتُ الْقُرْآنَ وَ مِثْلَهٗ ؛......))۔[صحيح ؛ أحمد ٤/ ١٣٠ -١٣١ ۔

أبو داؤد ٤٦٠٤- والترمذى ٢٦٦٤- مختصر الشريعه ص ٤٣-رواه عبدالرزاق في المصنف ٩٧-]
''آگاہ ہو جاؤ مجھے کتاب اور اس کے ساتھ اس جیسی چیز دی گئی ہے۔ آگاہ ہو جاؤ مجھے قرآن اور اس جیسی چیز دی گئی ہے؛ ......''۔
سو جو آدمی اسلام کا دعوی کرتا ہو' اور سنت کا منکر ہو' وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ اور جو انسان سنت کو جانتا ہے' مگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرتا ہو' اور نہ ہی سنت پر عمل کرتا ہو' تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ مسلمان ہونے کے لیے کتاب وسنت دونوں پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔ کتاب وسنت میں کسی طرح بھی تفریق نہیں کی جا سکتی۔

١٠٤- ((وَهُوَ بَيْنَ الْغُلُوِّ وَالتَّقْصِيرِ ، وَبَيْنَ التَّشْبِيهِ وَالتَّعْطِيلِ ، وَبَيْنَ الْجَبْرِ وَالْقَدَرِ ، وَبَيْنَ الأَمْنِ وَالإِيَاسِ.))

''پس دین اسلام افراط وتفریط، تشبیہ وتعطیل، جبر وقدر، اور امید اور ناامیدی کے درمیان ہے''۔

تَشْرِیح: ......صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''ہم انبیاء کی جماعت ہیں ہمارا دین ایک ہے۔'' [1]

[1] بخاری ٣٤٤٣، مسلم ٢٣٦٥- صحيح الجامع الصغير (١٤٦٥). اس قسم کے الفاظ جامع الصغیر میں بھی مل جائیں گے۔

نیز اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آلِ عمران: ٨٥)

''اور جو شخص اسلام کے علاوہ دین تلاش کرتا ہے اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا۔''

اسلام ہر دور میں عمومیت کا حامل ہے البتہ شرائع میں اختلاف ضرور ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا﴾ (المائدہ: ٤٨)

''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے۔''

پس دین اسلام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے اپنے انبیائے کرام علیہم السلام کی زبانی مشروع ٹھہرایا ہے۔ پس اس دین اسلام کے اصول وفروغ انبیاء علیہم السلام سے منقول و ماثور ہیں۔ ان کی حقیقت اظہر من الشمس ہے؛ ہر چھوٹا بڑا؛ فصیح؛ اور کمزور بیان والا؛ ہوشیار اور سست؛ ان کے لیے ممکن ہے کہ وہ کلمۂ اسلام کا اقرار کر کے آناً فاناً اسلام میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اور کلمہ اسلام سے خارج ہونا اس سے بھی زیادہ جلدی ممکن ہے۔ جیسے کلمہ کا انکار کرنا؛ اس کی تکذیب؛ اس سے ٹکراؤ؛ یا اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنا؛ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کلام میں شک کرنا؛ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کو رد کرنا؛ یا جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے نفی کی ہے؛ اس میں شک کرنا؛ ان کے علاوہ دیگر امور بھی ہیں۔

پس کتاب وسنت دین اسلام کے ظہور/ واضح ہونے اور اس کی تعلیم کے آسان ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اور یہ کہ بے شک کوئی دور دراز سے آنے والا آتا؛ اور اس وقت اسلامی تعلیم سے روشناس ہو کر واپس وطن لوٹ جاتا۔ نبی کریم ﷺ کے تعلیم دینے میں الفاظ میں اختلاف دین سیکھنے والے کے اعتبار سے ہوا کرتا تھا۔ اگر وہ دور کے وطن سے آیا ہو جیسے حضرت ضمام بن ثعلبہ نجدی رضی اللہ عنہ اور عبدالقیس کا وفد؛ تو پھر آپ انہیں ایسے ضروری امور کی تعلیم سے بہرہ ور فرماتے ہیں؛ جن سے لاعلم رہنے کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ حالانکہ

آپ کو بخوبی علم تھا کہ آپ کا دین آفاق عالم میں پھیلے گا۔

اور آپ ان لوگوں کی طرف ایسے مبلغین بھیجتے جو انہیں ضروری مسائل اور ان اتمام امور کی تعلیم دیتے جن کی انہیں حاجت ہوتی۔ اور جو حضرات نزدیک رہنے والے ہوتے ؛ جن کے لیے کسی بھی وقت آنا ممکن ہوتا؛ تو اس اعتبار سے وہ تدریجی طور پر تعلیم حاصل کرتے۔اور کبھی ایسا ہوتا کہ آپ ﷺ کو معلوم ہوتا کہ اس انسان نے ضروری مسائل سمجھ لیے ہیں؛ تو پھر اس کے حال اور ضرورت کے حساب سے اس کو ایسا جواب دیتے جو سوال کرنے والے کے قرینہ پر دلالت کرتا ہوتا۔جیسا کہ آپ نے ایک مسائل سے فرمایا:

''تم کہو: ''میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا'' پھر اس پر استقامت اختیار کرو''۔

لیکن جو کوئی ایسی شریعت کو دین بناتا ہے جس کی اجازت اللہ تعالیٰ نہیں دی؛ تو یہ بات معلوم شدہ ہے کہ: اس کے مستلزم اصولوں کی روشنی میں یہ جائز نہیں کہ یہ دین نبی اکرم ﷺ سے؛ یا آپ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے نبی سے منقول ہو۔کیونکہ یہ [خودساختہ] دین باطل ہے؛ اور باطل کا ملزوم بھی باطل ہوتا ہے۔جیسے یہ صاف ظاہر ہے کہ حق کو لازم کرنے والی چیز بھی حق ہی ہوتی ہے۔

[دین اسلام سے افراط وتفریط کی نفی:]

امام طحاوی رحمہ اللہ کا قول: ((وَهُوَ بَيْنَ الْغُلُوِّ وَالتَّقْصِيرِ .))

''دین اسلام افراط وتفریط کے درمیان ہے''۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾ (المائدہ : ۷۷)

''کہہ دو اے اہل کتاب اپنے دین (کی بات) میں ناحق مبالغہ نہ کرو۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ٥ وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ٥﴾ (المائدہ: ۸۷، ۸۸)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جو پاکیزہ چیزیں ہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو؛ بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔اور جو حلال اور پاکیزہ روزی اللہ تعالیٰ نے تم کو دی ہے اس میں سے کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر ایمان رکھتے ہو۔''

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

''چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے آپ کے پوشیدہ عمل کے بارے میں دریافت کیا۔تو ان میں سے کسی نے کہا میں گوشت نہیں کھاؤں گا۔کسی نے کہا: میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا۔کسی نے کہا: میں بستر پر نہیں لیٹوں گا۔ان کی یہ باتیں نبی اکرم ﷺ تک پہنچیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؛ جنہوں نے یہ باتیں کہی ہیں۔لیکن میرا حال تو یہ ہے کہ میں تو روزے بھی رکھتا ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور قیام بھی کرتا ہوں اور گوشت بھی کھا لیتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔پس جس نے میری

سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں ہے''۔

یہ حدیث صحیح ہے؛ لیکن امام بخاری اور امام مسلم رحمہ اللہ کے ہاں حضرت انس سے ہے؛ حضرت عائشہ سے نہیں۔ اور یہ سیاق اختصار کے ساتھ صحیح مسلم ۱۴۰۱ سے لیا ہے۔ البخاری ۵۰۶۳؛ میں بھی یہی الفاظ ملتے ہیں۔ الإ رواء ۱۷۸۲۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی روایت صحیح بخاری میں ۶۱۰۱؛ اور مسلم میں ۲۳۵۶ نمبر پر ایک دوسرے سیاق سے ہے۔

بخاری، مسلم کے علاوہ دیگر کتابوں میں ہے: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوشیدہ عبادت کے بارے میں دریافت کیا گویا کہ انہوں نے آپ کی عبادت کو قلیل سمجھا''۔ [1]

اس آیت کریمہ کے سبب نزول میں کہا گیا ہے: ''ابن جریج نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون؛ اور حضرت علی بن ابی طالب، اور حضرت ابن مسعود، اور حضرت مقداد بن اسود، اور حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ اور چند دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تبتل/ دنیا سے لاتعلقی اختیار کی۔ اپنی بیویوں سے الگ تھلگ ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے۔ موٹے موٹے کپڑے زیب تن کر لیے۔ اور اچھے کھانے اور اچھے لباس کو اپنے اوپر حرام قرار دیدیا۔ صرف اسی قدر خوراک کھاتے اور لباس پہنتے جس قدر بنو اسرائیل کے متصوفین کھاتے اور پہنتے تھے۔ بلکہ خصی ہونے کا عزم کر لیا اور رات بھر قیام کا فیصلہ کیا اور دن کو روزہ نہ افطار کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

☼ مسند احمد (۳/ ۲۵۹) . بل هذا بمعناه فی صحیح البخاری فی أول النكاح ؛ هذا الحديث۔ بهيقی ۷/ ۷۷۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾

(المائدہ: ۸۷)

''اے مومنو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں ان کو حرام نہ کرو؛ اور حد سے نہ بڑھو کہ اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر کسی راستہ پر نہ چلیں۔ مراد ان کی حرام کردہ چیزیں تھیں؛ جیسے عورت، خوراک، لباس۔ اور جو انہوں نے پوری رات کے قیام اور ہمیشہ روزہ رکھنے کا عزم اور خصی ہونے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جانب پیغام بھجوایا؛ اور فرمایا:

''بے شک تمہاری جانوں کا بھی تم پر حق ہے۔ نیز تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے، روزہ رکھ بھی لیا کرو چھوڑ بھی دیا کرو، رات کا قیام بھی کرو اور سو بھی جایا کرو۔ وہ انسان ہم میں سے نہیں جس نے ہماری سنت چھوڑ دی''۔

''اس پر انہوں نے کہا: اے اللہ تعالیٰ! ہم تسلیم کرتے ہیں اور جو حکم تو نازل کیا ہے؛ ہم اس کی اتباع کرتے ہیں''۔ [1]

☼ اس سیاق سے یہ حدیث ضعیف هے نیز یه روایت مرسل هے۔

[تشبیہ اور تعطیل کی نفی:]

امام طحاوی رحمہ اللہ علیہ کا فرمان ہے: ((وَ بَيْنَ التَّشْبِيْهِ وَالتَّعْطِيْلِ .))

''دین اسلام تشبیہ، تعطیل کے درمیان ہے''۔ سابقہ اوراق میں یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ پسند فرماتے ہیں کہ ان کے وہ اوصاف بیان کئے جائیں؛ جو خود اس نے اپنے لیے وصف بیان کیے ہیں۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وصف بیان کیے ہیں۔ ان میں

تشبیہ سے گریز کیا جائے۔پس یوں کہنا درست نہیں کہ: اللہ تعالیٰ کی سماعت ہماری سماعت جیسی ہے؛ اور نہ یہ کہ اس کی بصارت ہماری بصارت جیسی ہے۔اور اسی طرح دیگر اوصاف بھی ہیں۔بغیر کسی تعطیل کے؛ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے جو اوصاف بیان کیے ہیں یا سب سے بڑی معرفت والی ہستی جناب نبی اکرم ﷺ نے بیان کیے ہیں؛ ان اوصاف کی نفی نہیں کی جائے گی۔[اللہ تعالیٰ سے اوصاف کی] نفی کرنا تعطیل کہلاتا ہے۔اس سلسلہ میں پہلے کلام گزر چکا ہے۔ جہاں پر مؤلف نے فرمایا: ''...... جو شخص تشبیہ اور نفی سے دور نہ رہا؛ وہ پھسل گیا......''۔

یہی معنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مستفاد ہوتا ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ٥﴾ (الشوری: ١١)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ١١)

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' اس میں مشبہہ فرقہ پر رد ہے۔

اور ﴿وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ ،اس میں معطلہ پر رد ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان ہے: ((وَبَيْنَ الْجَبْرِ وَالْقَدْرِ .))

''اور جبر وقدر کے درمیان ہے''۔

اس پر تفصیلی کلام گزر چکا ہے؛ یہ کہ بندہ اپنے اقوال اور افعال میں مجبور نہیں ہے۔اور یہ چیزیں رعشہ والی کی بیماری کی طرح نہیں؛ اور نہ ہی ہواء کے ساتھ درختوں کی حرکات کی طرح ہیں۔اور نہ ہی یہ بندہ کی تخلیق ہیں۔ بلکہ یہ انسان کا فعل اور اس کا کسب ہیں؛ ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

[مایوسی کی مذمت]

امام طحاوی رحمہ اللہ کا فرمان ہے: ((وَبَيْنَ الأَمْنِ وَالْيَأْسِ .))

''اور ایمان امید اور ناامیدی کے درمیان ہے''۔

اس کی بھی وضاحت ہو چکی ہے؛ مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے عذاب سے خائف رہے اور اس کی رحمت کا امیدوار رہے ۔اور خوف امید دونوں انسان کے لیے بمنزلہ دو پروں کے ہیں کہ وہ ان کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اور دار آخرت کی طرف پرواز کرتا جاتا ہے۔

[دین واعتقاد کا اظہار اور مخالفین سے اظہار برأت:]

١٠٥ـ((فَهٰذَا دِيْنُنَا وَاعْتِقَادُنَا ظَاهِراً وَّبَاطِنًا وَنَحْنُ بَرَآءٌ إِلَى اللّٰهِ مِنْ كُلِّ مَنْ خَالَفَ الَّذِي ذَكَرْنَاهُ وَبَيَّنَّاهُ۔

وَنَسْأَلُ اللّٰهَ تَعَالٰى أَنْ يُثَبِّتَنَا عَلَى الْإِيْمَانِ وَيَخْتِمَ لَنَا بِهِ وَيَعْصِمَنَا مِنَ الأَهْوَاءِ الْمُخْتَلِفَةِ

وَالآرَاءِ الْمُتَفَرِّقَةِ وَالْمَذَاهِبِ الرَّدِيَةِ مِثْلِ الْمُشَبِّهَةِ وَالْمُعْتَزِلَةِ وَالْجِهْمِيَةِ وَالْجَبْرِيَةِ وَالْقَدْرِيَةِ وَغَيْرِهِم ①۔ مِنَ الَّذِيْنَ خَالَفُوا السُّنَّةَ وَالْجَمَاعَةَ وَحَالَفُوا الضَّلَالَةَ وَنَحْنُ مِنْهُمْ بَرَآءٌ وَهُمْ عِنْدَنَا ضُلَّالٌ وَأَرْدِيَاءُ①۔)) . وَبِاللّٰهِ العِصْمَةُ وَالتَّوْفِيْقُ .

" پس ظاہراً وباطناً یہ ہمارا دین اوراعتقاد ہے۔نیز ہم ہراس شخص سے اللہ تعالیٰ کی طرف براءت کا اظہار کرتے ہیں جو اس دین کی مخالفت کرتا ہے جس کا ہم نے ذکر کیا؛اوراسے بیان کیا۔

اور ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ایمان پر ثابت قدم رکھے اوراسی پر ہمارا خاتمہ فرمائے اور ہمیں مختلف خواہشات اور متفرق آراء نیز غلط طریقوں سے محفوظ فرمائے۔مثلاً:مشبہہ،معتزلہ،جہمیہ،جبریہ،قدریہ وغیرہ؛جوسنت اور جماعت کی مخالفت کرتے ہیں اور گمراہی کے حلیف ہیں ہم ان سے براءت کا اظہار کرتے ہیں یہ تمام فرقے ہمارے نزدیک گمراہ اور بد ترین ہیں۔عصمت اور توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے"۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:میں کہتا ہوں:''جیسے وہ مقلدین حضرات جوچوتھی صدی ہجری کے بعد آنے والے ہر ایک پر تقلید کو واجب دینی ٹھہراتے ہیں۔اس وجہ سے وہ کتاب وسنت کے نور ہدایت سے منہ موڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔اور جو کوئی بھی اس مذہبی جمود سے جان چھڑا کر خالص کتاب وسنت کی پیروی کرنا چاہے؛اس پر جیسے ان کا جی چاہیے؛اور خواہشات نفس حکم دیں؛ویسے تہمتوں اور الزامات کی بھرمار کر دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ امام اہل سنت پر رحم فرمائے؛انہوں نے کیا خوب کہا ہے:''محمد ﷺ کا دین احادیث مبارکہ کا دین ہے۔کسی بھی نوجوان کے لیے ایک مبارک نعمت ان آثار کی پیروی ہے۔آپ ﷺ کی حدیث اورآل سے بے رغبتی نہ برتنا؛رائے تو ایک اندھیر رات ہے؛اور حدیث دن کی طرح روشن ہے۔ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی انسان کسی سنت سے جاہل رہ جائے؛مگر حدیث کا سورج تو چمک رہا ہے؛اوراس کی روشنی ہر طرف پھیل رہی ہے۔

① ۔علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:ایک مخطوطہ میں اس کے بعد ہے:" و الله تعالیٰ الهادی للحق ؛ و هذا آخر ما أردنا و إليه أشرنا ۔ و الحمد لله رب العالمين ۔ وصلى الله تعالىٰ على سيدنا محمد و آله و صحبه و سلم ۔

دمشق۔صباح السبت ۱۹ جمادی الأولی ۱۳۹۴ھ

مترجم شفیق الرحمٰن شاہ الدراوی ثم مکی/۱۳ جمادی الأولی/ ۱۴۳۹ھ بروز جمعرات؛قبل العصر/حرم شریف مکہ مکرمہ

تَشْرِیح......:ھذا سے مقصود شروع کتاب سے لے کر اختتام تک تمام مقاصد مراد ہیں۔

مشبهه :اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ان کا عقیدہ عیسائیوں کے عقیدہ کے مخالف ہے۔جنہوں نے مخلوق-حضرت عیسیٰ علیہ السلام -کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تشبیہ دی۔اوران کو اللہ تعالیٰ کہا۔لیکن ان لوگوں نے خالق کو مخلوق کے مشابہ کہا ہے؛جیسے داؤد جوار بی اوراس کے ہم عقیدہ لوگ۔

معتزلہ : سے مراد عمرو بن عبید[۸۰-۱۴۴ھ]،واصل بن عطاء الغزال[۸۰-۱۳۱ھ]اوران دونوں کے رفقاء ہیں۔دوسری صدی کے آغاز میں جب یہ لوگ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ[۲۱-۱۱۰ھ]کی وفات کے بعد اہل سنت والجماعت سے الگ ہو گئے؛تو یہ لوگ دوسروں سے الگ بیٹھا کرتے تھے۔حضرت قتادہ رحمہ اللہ[۶۱-۱۱۶ھ]اوران کے ہم خیال لوگ ان کو معتزلہ کہتے ہیں۔

[مجموع الفتاوى ۸ / ۲۲۸ .]

❀ یہ بھی کہا گیا ہے کہ واصل بن عطاء نے سب سے پہلے مذہب معتزلہ کے اصول تراشے۔پھر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے شاگرد عمرو بن عبید نے اس کی اتباع کی۔جب ہارون رشید[۱۴۹-۱۹۳ھ]کے عہد خلافت آیا؛تو ابوالہذیل[۱۳۵-۲۳۵ھ]نے ان

کے عقائد میں دو کتابیں تالیف کیں جن میں ان کا مذہب بیان کیا؛ اوران کے مذہب کی بنیاد پانچ اصولوں پر قائم کی۔ جن کو عدل، توحید؛ وعید کا نفاذ، دو منزلوں کے درمیان ایک منزل کا تعین ؛ اورامر بالمعروف نہی عن المنکر کے نام سے موسوم کیا۔اس میں انہوں نے حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ بدعات کا یہی عالم ہوتا ہے۔ان میں حق میں باطل بھی شامل ہوتا ہے۔

❀ معتزلہ ہی افعال میں مشبہہ بھی ہیں۔اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے افعال کو بندوں کے افعال پر قیاس کرتے ہیں۔اور یہ کہنے لگے کہ: جو افعال بندوں کے حق مستحسن ہیں؛ وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں بھی مستحسن ہیں۔اور جو افعال بندوں کے حق میں قبیح ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں بھی قبیح ہیں۔ نیز وہ کہتے ہیں: وہ فلاں کام کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔اور اللہ تعالیٰ کے لیے فلاں کام کرنا جائز نہیں۔ یہ اس فاسد اصول کے تقاضا کی بنا پر کہتے ہیں کہ ایک آقا اگر اپنے غلاموں کے دیکھے کہ وہ اس کی لونڈیوں سے زنا کرتے ہیں ؛مگر وہ انہیں روکتا نہیں ؛ تو سمجھا جائے گا کہ یا تو وہ ایک قبیح چیز کو مستحسن گردانتا ہے یا ان کو روکنے سے عاجز ہے۔تو اللہ تعالیٰ کے افعال کو بندوں کے افعال پر قیاس کرنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟۔ یہ تفصیل اسی کتاب میں دیگر مقامات پر ذکر ہو چکی ہے۔

عدل: جہاں تک [عقیدہ] عدل کی بات ہے؛ تو درحقیقت اس کے پردے میں انہوں نے تقدیر کے انکار کا عقیدہ چھپایا ہوا ہے۔وہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ شر کا خالق نہیں ہے اور نہ ہی اس کی بنیاد پر فیصلہ فرماتا ہے۔اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہی شر کو پیدا کیا ہے؛ اور پھر اس پر عذاب دے تو ایسا کرنا ظلم ہوگا۔جبکہ اللہ تعالیٰ عادل ہیں؛ وہ ظلم نہیں کرتے۔

تو اس فاسد اصول کی بنیاد پر لازم آتا ہے کہ اللہ کے ملک میں ایسی چیزیں ہوں جن کا وہ ارادہ نہیں کرتا؛ اور کبھی اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ تو کرتے ہیں مگر وہ وقوع پذیر نہیں ہوتی۔تو اس سے اللہ تعالیٰ کا عجز سے موصوف ہونا لازم آتا ہے۔تعالىٰ الله عن ذالك۔

توحید: اس کے پردہ میں انہوں نے عقیدہ خلق قرآن کو چھپا رکھا ہے۔اس لیے کہ اگر قرآن مخلوق نہیں؛ تو اس سے قدماء کا متعدد ہونا لازم آتا ہے۔اس فاسد قول کے نتیجہ میں ان پر لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کی قدرت اس کی باقی تمام صفات مخلوق ہوں؛ یا پھر تناقض لازم آتا ہے۔

وعید: کہتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے بعض بندوں کو وعید سنائی ہے؛ تو اللہ تعالیٰ کے لیے جائز نہیں کہ انہیں عذاب نہ دے کر اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کرے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ان کے نزدیک جس کو معاف کرنا چاہے اس کو معاف نہیں کرسکتا۔اور نہ ہی جس کو چاہے اسے بخش سکتا ہے؛ یہ ان کا فاسد عقیدہ ہے۔

منزلة بين المنزلتين: ان کے نزدیک جس آدمی نے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا ہو؛ وہ ایمان سے تو خارج ہو جاتا ہے؛ لیکن کفر میں بھی داخل نہیں ہوتا۔

امر بالمعروف جبکہ: اس بارے میں کہتے ہیں: ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے غیر کو ان باتوں کا حکم دیں جن کا ہمیں حکم دیا گیا ہے؛ اور جو کام ہمارے لیے لازم ہیں وہ ان پر بھی لازم ٹھہرائیں۔یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔اس کے ساتھ یہ چیز بھی ملا دی ہے؛ کہ اگر حکمران ظلم کریں تو ان کے خلاف بغاوت کرنا جائز ہو جاتا ہے۔معتزلہ کے ان پانچوں شبہات کے جوابات سابقہ اوراق میں اپنی اپنی جگہ پر بیان ہو چکے ہیں۔

معتزلہ کا غلط نظریہ:

ان کے نزدیک توحیداور عدل عقلی اصولوں میں سے ہیں؛ ان کی صحت کے بارے میں عقل کے بعد ہی سماعت سے معلوم ہوسکتا ہے۔ جب اس پر وہ ادلہ سمعیہ سے استدلال کرتے ہیں؛ توان کا ذکرصرف [اپنے مؤقف کو] تقویت دینے کے لیے کرتے ہیں؛ بطوراعتماد/ اصل بنیاد کے نہیں۔ کہتے ہیں: ہم ان صولوں کو سمعی دلائل سے ثابت نہیں کرتے؛ بلکہ ان کے متعلق علم؛ ان کی صحتِ نقل کے متعلق علم پر مقدم ہے۔ بعض معتزلہ تو اصول میں ادلہ سمعیہ کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک سمعی دلائل ذکر کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ اور بعض معتزلہ سمعی دلائل کا ذکرصرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ سمعی دلائل اور عقلی دلائل کی موافقت واضح ہوجائے؛ اور لوگ بھی اس طرح مانوس ہوجائیں گے؛ وگرنہ سمعی دلائل پر ان کو اعتماد نہیں۔ وہ تو قرآن وحدیث کو نصاب شہادت سے زائد گواہی کی طرح سمجھتے ہیں۔ اوراس فوجی مدد کی مانند سمجھتے ہیں جو لشکر تک پہنچتی ہے؛ جب کہ لشکر کو اس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ نیز اس انسان کی طرح سمجھتے ہیں جو اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے؛ اور پھر کوئی شرعی دلیل اس کی خواہشات کے موافق نکل آتی ہے۔

جیسا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ''ان لوگوں میں سے نہ بنو؛ جو اس وقت حق کی اتباع کرتے ہیں جب وہ ان کو خواہشات کے ساتھ موافق ہو۔ اور جب حق ان کی خواہشات کے مخالف ہو تو وہ حق کے مخالف ہوجاتے ہیں۔ تو اس صورت میں حق کی موافقت کی صورت میں بھی آپ کو کوئی ثواب نہیں ملے گا؛ اور حق چھوڑنے کی پاداش میں عقاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ آپ نے ان دونوں مقام پر اپنی خواہشات نفس کی پیروی کی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''بے شک اعمال کی صحت کا دارومدار نیت پر ہے۔ اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی''۔ [البخاری ۱؛ مسلم ۱۹۰۷]

عمل عمل کرنے والے کے قصد اور ارادہ کے تابع ہوتا ہے۔ پس ایسے ہی مضبوط اعتقاد بھی اس کے علم اور تصدیق کے تابع ہوتا ہے۔ تو جب اعتقاد ایمان کے تابع ہے تو اعتقاد ایمان کا حصہ ٹھہرا۔ جیسے نیک عمل جب اچھی نیت سے ہو تو وہ نیک عمل کہلاتا ہے ورنہ وہ نیک عمل نہ ہوگا۔ پس اہل ایمان کا وہ قول جو ایمان کے تابع نہ ہوں؛ وہ اہل صلاح کے اس عمل کی طرح ہے جو ان کے قصد وارادہ کے تابع نہ ہو۔ خیال رہے کہ معتزلہ میں کثرت کے ساتھ زندگی موجود ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت ہوگئیں جب کہ وہ اس خیال میں ہیں کہ وہ اچھے کام کررہے ہیں۔

جہمیہ: یہ لوگ جہم بن صفوان ترمذی [۱۲۸ھ] کی طرف منسوب ہیں۔ یہی وہ شخص ہے جس نے صفات باری تعالیٰ کی نفی اور تعطیل کا اظہار کیا تھا۔ اس نے یہ عقیدہ جعد بن درہم [۱۱۸ھ] سے لیا تھا؛ جس کو خالد بن عبداللہ قسری [۶۶-۱۲۶ھ] نے واسط شہر میں ذبح کردیا تھا۔ اس نے عیدالاضحیٰ کے دن خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''اے لوگو! تم قربانیاں کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری قربانیاں کو قبول فرمائے، میں جعد بن درہم کی قربانی کرنے لگا ہوں: بے شک اس کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل نہیں بنایا۔ نہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا ہے، جعد کی ان باتوں سے اللہ تعالیٰ بہت ہی بلند ہے۔ پھر منبر سے اتر کر جعد کو ذبح کردیا''۔

خیال رہے کہ اس دور کے علماء سلف صالح سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد اس نے جعد کو ذبح کیا تھا۔

اس کے بعد خراسان میں جہم آیا۔ اس نے وہاں پر اسی عقیدہ کا پرچار شروع کیا۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے چل پڑے۔ جبکہ اس نے اپنے رب کے بارے میں شک کرتے ہوئے چالیس دن تک نماز بھی ادا نہ کی۔ وجہ یہ تھی کہ مشرکین کے ساتھ اس کا مناظرہ تھا؛ جنہیں سمنیہ کہا جاتا تھا۔ وہ اصل میں ہندوستان کے ان فلاسفہ کے ساتھ تعلق رکھتے تھے جو حسیات کے علاوہ تمام چیزوں کا انکار کرتے تھے۔ انہوں نے جہم سے کہا: اے جہم! تیرا رب جس کی تو عبادت کرتا ہے؛ کیا وہ دیکھا جا سکتا ہے؟، یا اس کو سونگھا جا سکتا ہے؟ یا اس کا ذائقہ چکھا جا سکتا ہے؟ یا اس کو ٹٹولا جا سکتا ہے؟۔ جہم نے نفی میں جواب دیا؛ تو انہوں نے کہا تیرا رب تو معدوم ہے۔ اس پر جہم چالیس روز تک اس حال میں رہا کہ وہ کسی بھی چیز کی عبادت نہیں کرتا تھا۔ پھر اس کا دل کسی بھی ایسے معبود سے خالی ہو گیا جس کی وہ عبادت کرتا ہو۔ تو شیطان نے ایک نیا اعتقاد نقش کر دیا جو اس کی سوچ و فکر کی تخلیق تھا؛ تو اس نے یہ کہنا شروع کر دیا: اللہ تعالیٰ وجود مطلق کا نام ہے۔ اور تمام صفات کی نفی کر دی؛ اور اپنے نظریات میں جعد سے جا ملا۔

❀ یہ بھی کہا گیا ہے کہ: ''جعد نے اہل حران کے صابی فلاسفہ کے ساتھ میل جول قائم کر لیا تھا۔ نیز اس نے بعض نظریات ان یہود سے لیے تھے جو اپنے دین میں تحریف کے مرتکب تھے؛ جن کا تعلق لبید بن اعصم جادوگر کے ساتھ تھا۔ جس نے نبی اکرم ﷺ پر جادو کیا تھا۔ جہم کو خراسان میں قتل کیا گیا؛ اسے مسلم بن احوز نے قتل کیا۔ لیکن اس کا یہ عقیدہ لوگوں میں پھیل چکا تھا۔ پھر اس کے بعد معتزلہ نے اس مسئلہ میں اس کی تقلید کی۔ البتہ جہم مسئلہ تعطیل میں ان سے بہت آگے تھا۔ اس لیے کہ وہ اسماء الٰہیہ کی حقیقت کا انکار کرتا تھا۔ جب کہ معتزلہ اسماء کا تو انکار نہیں کرتے البتہ صفات کا انکار کرتے ہیں۔

جہمیہ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا وہ بہتر فرقوں میں سے ہیں یا نہیں؟۔ اس میں دو قول ہیں:

جن حضرات نے کہا ہے کہ وہ بہتر فرقوں میں داخل نہیں؛ ان میں حضرت عبداللہ بن مبارک [۱۱۸-۱۸۱ھ]، یوسف بن اسباط رحمہم اللہ بھی ہیں۔ دراصل جہمیہ کے خیالات کو اس وقت شہرت حاصل ہوئی جب امام بن حنبل رحمہ اللہ اور دیگر علماء اہل سنت رحمہم اللہ پر دور ابتلاء تھا۔ مامون عباسی [۱۷۹-۲۱۸ھ] کی امارت میں ان لوگوں کو تقویت حاصل ہوئی اور ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔

مامون ایک مدت تک خراسان میں مقیم رہا؛ وہ ان کے ساتھ ملا؛ پھر اس نے سن ۲۱۸ھ میں علماء طرسوس کا امتحان لینے کے لیے حکم نامہ جاری کیا؛ اور اسی سال فوت بھی ہو گیا۔ اور سن دوصد بیس (۲۲۰ھ) میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کو دوبارہ بغداد کی جیل میں ڈالا گیا۔ اسی دور معتصم [۱۷۹-۲۲۷ھ] کے ساتھ آزمائش کا واقعہ پیش آیا؛ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جہمیہ سے کلام کے مسئلہ میں مناظرہ بھی کیا۔ جب آپ نے ان کے دلائل کا رد کیا؛ اور یہ واضح کر دیا کہ دراصل ان کے پاس اس مسئلہ میں کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ اور یہ کہ ان کا لوگوں سے اس عقیدہ میں اپنی موافقت طلب کرنا؛ اور ان کا امتحان لینا ظلم اور جہالت پر مبنی ہے۔ معتصم چاہتا تھا کہ آپ کو چھوڑ دے لیکن کچھ [بے دین قسم کے] لوگوں نے مشورہ دیا کہ مصلحت اس میں ہے کہ انہیں مار پیٹ کی جائے۔ تا کہ بار بار خلافت کی حرمت پامال نہ ہو۔ لیکن جب انہیں مارا پیٹا گیا؛ تو عوام میں حکومت کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی، حکومت کو خوف محسوس ہونے لگا۔ تو آپ کو رہا کر دیا گیا۔ یہ واقعہ تاریخ کی کتابوں میں مذکورہ ہے۔

جہم کے انفرادی نظریات:

جہم اپنے اس عقیدہ میں منفرد تھا کہ جنت اور دوزخ فنا ہو جائیں گی۔ اور ایمان صرف معرفت کا نام ہے۔ اور کفر صرف جہالت کا نام ہے۔ حقیقت میں کسی کا کوئی فعل نہیں سب افعال اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ لوگوں کی طرف افعال کی نسبت مجازی ہے؛ جیسا کہ کہا جاتا ہے درخت متحرک ہے، آسمان گھومتا ہے، سورج ڈھل گیا۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

عجبت لشیطان دعا الناس جهرة　　　الی النار واشتق اسمه من جهنم

''مجھے شیطان پر تعجب ہے جو لوگوں کو دوزخ کی طرف کھلے عام دعوت دیتا ہے اور اس کا نام جہنم سے مشتق ہے۔''

یہ بھی منقول ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے جب اعراض اور اجسام کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''عمرو بن عبید پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس نے لوگوں پر اس مسئلہ میں گفتگو کا دروازہ کھولا ہے''۔

الجبریة : جبریہ کے عقیدہ کی اصل بنیاد بھی جہم بن صفوان نے ہی رکھی ہے؛ اس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ یہ کہ بندے کا فعل اس کے طول اور رنگ کی منزلت پر ہے۔ یہ فرقہ قدریہ/ منکرین تقدیر کا مخالف ہے۔ اور قدریہ کو قدر/ تقدیر کی طرف منسوب کرنے کی وجہ ان کا تقدیر کا انکار کرنا ہے۔ جیسا کہ مرجئہ کا یہ نام ارجاء کی نفی کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ یعنی کسی کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چھوٹ نہیں ملے گی؛ یا اللہ تعالیٰ انہیں عذاب میں مبتلا کرے گا یا ان کی توبہ قبول کرے گا۔

❀ اور کبھی جبریہ کو قدریہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تقدیر کے اثبات میں غلو اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کبھی لوگوں کو [مرجئہ] نام دیا ہے جو وعد اور وعید کسی چیز پر یقین نہیں رکھتے، بلکہ ہر کام میں تاخیر/ ارجاء کے معاملہ میں غلو کا شکار ہیں۔ وہ توبہ کرنے والے کے ثواب پر پکا یقین نہیں رکھتے؛ اور نہ اس کی عقوبت پر یقین رکھتے ہیں جو توبہ نہیں کرتا۔ اسی طرح کسی خاص انسان کے لیے دوٹوک بات نہیں کرتے۔ پہلے دور کے مرجئہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں بھی ارجاء کے قائل تھے؛ اور نہ ان کے ایمان کی گواہی دیتے تھے اور نہ ہی کفر کی۔

قدریہ کی مذمت میں سنن میں احادیث مبارکہ وارد ہوئی ہیں۔ ان میں سے سنن ابوداؤد میں عبدالعزیز بن حازم کی روایت سے ہے۔ وہ اپنے والد سے؛ اور وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں اگر وہ بیمار ہو جائیں تو ان کی بیمار پرسی نہ کرنا، اگر وہ فوت ہو جائیں تو ان کے جنازے میں شرکت نہ کرنا''۔ (حدیث حسن ہے/ اس سے پہلے گزر چکی ہے)۔

أبو داؤد ٤٦٩١ ؛ و روی أحمد نحوه بمعناه ؛ في المسند ٥٥٨٤ ؛ من وجه آخر عن ابن عمر رضي الله عنهما ؛ فصلنا القول فيه هناك .

قدریہ کی مذمت میں اس کے علاوہ بھی کثیر تعداد میں احادیث مروی ہیں۔ البتہ محدثین نے ان کے مرفوع ہونے کی صحت میں گفتگو کی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ روایات موقوف ہیں۔ بخلاف ان احادیث کے جو خوارج کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں؛ ان میں سے گیارہ احادیث صحیح ہیں۔ ان میں سے تین صحیح بخاری میں ہیں۔ اور باقی تمام صحیح مسلم کی روایات ہیں۔ لیکن ان کی مجوسیوں سے مشابہت صاف ظاہر ہے۔ بلکہ ان کا عقیدہ مجوسیوں کے عقیدہ سے بھی زیادہ برا ہے۔ کیونکہ مجوسی تو دو خالق ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں؛ اور قدریہ تو کئی ایک خالق ہونے کے معتقد ہیں۔

اس قسم کی بدعات متقابل ہیں اور ان کا سرچشمہ دراصل وہ فتنے ہیں جن کی وجہ سے امت مسلمہ میں افتراق ہوا۔ امام بخاری رحمہ اللہ علیہ

نے اپنی صحیح بخاری میں حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ [۱۳-۹۴ھ] سے نقل کیا ہے؛ آپ نے فرمایا:

''پہلا فتنہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کا؛ جب وقوع پذیر ہوا تو اس نے اصحاب بدر سے کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ اس کے بعد دوسرا فتنہ [حرہ کا فتنہ] واقع ہوا؛ اس نے اصحاب حدیبیہ میں سے کسی کو نہ چھوڑا۔ پھر تیسرا فتنہ واقع ہوا وہ ختم نہ ہوا کہ لوگوں میں کچھ عقل اور قوت باقی ہو۔ پس خوارج اور شیعہ پہلے فتنہ کی پیداوار ہیں۔ اور قدریہ اور مرجئہ دوسرے فتنہ کی۔ اور جہمیہ وغیرہ تیسرے فتنہ کے بعد پیدا ہوئے۔ یہ ایسے فرقے ہیں جنہوں نے دین اسلام کے ماننے والوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا یا بدعات کا مقابلہ بدعات سے ہوا''۔

شیعہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعظیم میں غلو کیا، جبکہ خوارج نے ان کو کافر کہا۔ اور معتزلہ نے وعید میں غلو کیا، حتی کہ بعض اہل ایمان کو بھی دائمی جہنمی بنا دیا۔ مرجئہ نے اتنا غلو کیا کہ بعض نے وعید کی بھی نفی کر دی۔ معطلہ نے تنزیہ میں اتنا غلو کیا کہ صفات کی بھی نفی کر دی۔ اور مشبہہ نے صفات میں اتنا غلو کیا حتی کہ تشبیہ میں مبتلا ہو گئے۔

انہوں نے دین اسلام میں ایسے دلائل اور مسائل کی بدعات ایجاد کیں جو کہ مشروع نہیں تھے۔ اور مشروع چیزوں سے منہ موڑ لیا۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے متقدمین یہود و نصاریٰ، مجوس اور صابیوں کی کتابوں سے مدد لی۔ انہوں نے ان کی کتابیں پڑھیں؛ اس طرح ان کی گمراہی جو ان میں سرایت کر گئی تھی؛ اسے انہوں نے اپنے مسائل اور دلائل میں داخل کر لیا؛ اور کبھی لفظی تحریف کرتے؛ اور کبھی معنوی تحریف۔ پس انہوں نے حق و باطل کو آپس میں ملا دیا اور وہ حق جو ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تھے اس کو چھپا لیا؛ پس وہ تفرقہ بازی اور اختلاف کا شکار ہو گئے۔ پس اس وقت ان لوگوں نے جسم، عرض، اور تجسیم کی نفی اور اثبات میں کلام کرنا شروع کیا۔

ان فرقوں کی گمراہی کا سبب:

ان فرقوں اور ان جیسے دوسرے فرقوں کی گمراہی کا سبب صرف یہ ہے کہ اس سیدھے راستے سے بھٹک جانا ہے جس پر چلنے کا ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ (الانعام: ۱۵۳)

''بے شک یہ میری سیدھی راہ ہے اس پر چلو؛ اور رستوں کی اتباع نہ کرو کہ تم کو اس کی راہ سے ہٹا دیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ (یوسف: ۱۰۸)

''فرما دیں: یہ میرا راستہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہوں میں اور میرے ماننے والے بصیرت پر ہیں۔''

یاد رہے کہ لفظ صراط اور سبیل واحد ہیں؛ اور مختلف راستوں کے لیے لفظ سبل جمع کے صیغہ کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ جو صراط مستقیم کے خلاف ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سمجھانے کے لیے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں

بائیں لکیریں کھینچیں، اور فرمایا: یہ (سبل) یعنی راستے ہیں اور ہر راستے پر شیطان ہے جو اس کی طرف دعوت دیتا ہے پھر آپ نے ذیل کی آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الانعام: ۱۵۳) [1]

"اور بے شک یہ میرا رستہ سیدھا ہے اس کی اتباع کرو (دیگر) رستوں کی اتباع نہ کرو کہ وہ تم کو اس رستہ سے دور کر دیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس کی تم کو وصیت کی ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔"

یہاں سے معلوم ہوا کہ صراط مستقیم کی راہ نمائی کی دعا کی ضرورت انسان کے لیے دیگر تمام ضرورتوں سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت مشروع کی ہے۔ خواہ یہ فرض ہو یا واجب۔ جیسا کہ علمائے کرام رحمہم اللہ کا اس میں اختلاف ہے۔ اس لیے کہ انسان عظیم القدر دعا کا محتاج ہے جو بہترین مطالب اور عمدہ مقاصد پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم یوں کہیں:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۝ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۝﴾ (الفاتحہ: ۵، ۷)

"تو ہمیں سیدھا رستہ دکھا، ان لوگوں کا رستہ جن پر تو نے انعام کیا، ان (لوگوں) کا رستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور ان کا جو گمراہ ہیں۔"

نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہود مغضوب علیہم ہیں اور عیسائی گمراہ ہیں"۔ [1]

نیز صحیح حدیث میں ثابت ہے؛ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کی راہ پر ایسے چلو گے؛ جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے؛ حتی کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ میں داخل ہو تو تم بھی اس میں داخل ہو جاؤ گے"۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا:

"یارسول اللہ! کیا یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟"۔ تو آپ نے جواب دیا: "اور کون ہیں؟"۔ (یعنی وہی ہے) [2]

---

[1] حديث صحيح هے / رواه الحاكم ۲/ ۳۱۸۔ وغیره ۔ تخريج السنة رقم (۱۷). مسند أحمد ۴۱۴۳ .

[1] حديث صحيح هے۔ ترمذی۔ صحيح ابن حبان (۱۷۱۵ ، ۲۲۷۹).

[2] حديث صحيح هے۔ متفق عليه۔ حديث ابی سعيد الخدری۔ السنة (۷۴، ۷۵)۔ الصحيحة (۶۳۴۸). إصلاح المساجد أز شيخ قاسمی ۳۴۔ وله شاهد آخر مخرج فی الصحيحة ۳۲۱۲ . اس حاشیہ کے ساتھ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ والے نسخہ میں یہ نوٹ لکھا ہوا ہے: "سبحانك اللهم و بحمدك أشهد أن لا إله إلا إنت أستغفرك و أتوب إليك۔

دمشق ۱۱/ ۱۲/ ۱۳۸۱ هجری محمد ناصر الدين الألبانی۔

اس سے آگے لکھا ہوا ہے: "پھر میں نے اس کی نظر ثانی کی؛ اور جو تخریج مجھ سے رہ گئی تھی اس کا استدراک کیا؛ اور سابقہ تخریجات پر کئی مفید تعلیقات کا اضافہ کیا۔ اور جن طباعتی غلطیوں کی اصلاح رہ گئی تھی؛ ان کی اصلاح کر دی۔ واللہ تعالیٰ ھو الموفق۔ عمان ۱/۱۱/۱۴۰۳ھ۔

أئمہ سلف کے ایک گرہ کا کہنا ہے کہ:

''جو کوئی علماء میں سے دین اسلام منحرف ہو جائے؛ اس میں یہود کی مشابہت ہوتی ہے؛ اور جو کوئی عبادت گزاروں میں منحرف ہو جائے اس میں عیسائیوں کی مشابہت ہوتی ہے۔

پس اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ اکثر منحرفین کا تعلق اہل کلام/متکلمین معتزلہ اور دیگر لوگوں میں یہود کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ حتی کہ یہود کے علماء معتزلی مشائخ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں؛ اور ان کے طریق/اسلوب کو مستحسن گردانتے ہیں۔ یہی حال معتزلہ کے شیوخ کا ہے وہ یہود کی طرف میلان رکھتے ہیں؛ اور انہیں نصاری پر فوقیت دیتے ہیں۔

اور اکثر منحرف عبادت گزار جن کا تعلق صوفیاء اور ان کے ہمنواؤں سے ہے؛ ان میں نصاری کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی حد تک رہبانیت، حلول وحدۃ الوجود اور دیگر عقائد کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ اور ان کے مشائخ علم کلام اور متکلمین کی مذمت کرتے ہیں۔ اور معتزلہ کے مشائخ صوفیاء کے طریقہ کی اور سماع، وجد اور صوفیاء کی پیدا کردہ بدعات وغیرہ کی مذمت کرتے ہیں۔

وحی کے بارے میں گمراہ فرقوں کے مختلف طریقے ہیں:

شیخ عفیفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس مسئلہ کی تفصیل کے لیے دیکھیں: درتعارض العقل والنقل ۱/۳-۶۔ اور تفسیر ابن کثیر آیت آل عمران ۱۰۔

۱۔ تبدیل کا طریقہ ۲۔ تجہیل کا طریقہ۔

اہل تبدیل کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ اهل الوهم و التخيل اور ۲۔ اهل التحريف و التاويل۔

اهل الوهم و التخيل:

وہ لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ تعالیٰ، آخرت کے دن، اور جنت و دوزخ کے بارے میں جو باتیں بتائی ہیں وہ نفس حقیقت کے مطابق نہیں۔ لیکن انہوں نے لوگوں سے اس انداز میں خطاب کیا ہے جو کچھ وہ تخیل کرتے [خیال میں لاتے] اور اس کا وہم رکھتے تھے؛ کہ اللہ تعالیٰ ایک عظیم اور بہت بڑی چیز ہے۔ اور یہ کہ اجسام کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ اور ان کے لیے محسوس نعمتیں اور محسوس عذاب ہوگا۔ اگرچہ معاملہ حقیقت میں ایسے نہیں۔ لیکن پھر بھی جمہور کی مصلحت اسی میں ہے۔ اور اگر انہوں نے یہ جھوٹی باتیں کہی ہیں؛ تو یہ جھوٹ بھی جمہور کی مصلحت کے لیے ہی۔ چنانچہ ابن سینا اور اس کے ہمنوا فلاسفہ نے اس اصل کو گمراہ کن قوانین کی بنیاد بنایا ہے''۔ [درء تعارض العقل و النقل ۱/ ۸]

اہل تحریف وتاویل:

ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا کہنا ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے اقوال سے مقصود حقیقت نفس الامر نہیں تھا۔ حقیقت نفس الامر تو وہی ہے جو ہم نے اپنی عقلوں سے سمجھا ہے۔ پھر وہ پیغمبروں کے اقوال کو اپنی آراء کے موافق بنانے کے لیے مختلف تاویلیں کرنے میں اپنی تمام توانائیاں لگا دیتے ہیں۔ پھر اسی لیے ان میں سے اکثر جزم کے ساتھ تاویل کا نام نہیں لیتے؛ بلکہ وہ کہتے ہیں: ممکن ہے اس سے مراد یہ ہو۔ بہرحال امکان اور احتمال کے حدود سے آگے قدم نہیں رکھ پاتے''۔ [درء تعارض العقل و النقل ۱/ ۱۲]

اہل جہالت وضلالت:

وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے پیروکار سب جاہل گمراہ ہیں۔ اپنی آیات اور انبیاء کے اقوال میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوصاف بیان کیے ہیں وہ ان کی حقیقت مراد سے بے خبر ہیں"۔[درء تعارض ...... ۱/ ۱۵]

نیز وہ کہتے ہیں کہ: بعض نصوص کی ایسی تاویل ہونا بھی جائز ہے جس کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہ جانتا ہو۔ نہ ہی اسے محمد ﷺ جانتے ہوں؛ نہ ہی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو واقفیت ہو، اور نہ ہی کسی دوسرے نبی کو۔ چہ جائیکہ صحابہ اور تابعین کو ان کا علم ہو، چنانچہ محمد ﷺ ان آیات کی تلاوت فرمایا کرتے تھے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طٰہٰ: ۵)

"اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا۔"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (فاطر: ۱۰)

"اس کی طرف نیک کلمات چڑھتے ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (صٓ: ۷۵)

"تجھے کس نے منع کیا کہ تو اس کو سجدہ نہ کرے جس کو میں نے ہاتھ سے پیدا کیا۔"

لیکن آپ ﷺ کو ان آیات کے معانی کی کوئی معرفت نہیں تھی۔ بلکہ جن معانی پر یہ آیات دلالت کرتی ہیں؛ ان معانی کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اور خیال کرتے تھے کہ یہ سلف صالحین کا انداز تفسیر ہے۔

پھر ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان سے مراد ان کا ظاہری مدلول اور مفہوم کے برعکس ہے۔ اس [مفہوم] کا کسی کو علم نہیں۔ جیسا کہ قیامت کے وقت کا کسی کو علم نہیں۔

بعض کہتے ہیں: ان آیات کو ان کے ظواہر پر رکھا جائے گا، اور انہیں ان کے ظاہر پر ہی محمول کیا جائے گا۔ مگر اس کے باوجود کہتے: اس کی تأویل/تفسیر کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ پس یہ لوگ تناقض کا شکار ہیں؛ اس لیے کہ وہ اس کے ظاہر کے خلاف اس کی تأویل/تفسیر کو ثابت کرتے؛ مگر اس کے باوجود کہتے ہیں: اسے اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے گا۔

یہ سب گروہ اس عقیدہ میں مشترک ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان نصوص کے وہ معانی بیان نہیں فرمائے جو ان سے مراد ہیں؛ جنہیں وہ مشکل یا متشابہ قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گروہ ان نصوص کو مشکل قرار دیتا ہے جو دوسرے گروہ کے ہاں مشکل نصوص سے ہٹ کر ہوتی ہیں۔

پھر ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں: آپ ﷺ کو بھی ان کے معانی کا علم نہ تھا۔

بعض کہتے ہیں: آپ کو تو علم تھا لیکن آپ نے ان کے معانی بیان نہیں فرمائے، ان کے معانی کا فہم/ وبیان عقلی دلائل پر؛ اور ان

لوگوں پر چھوڑ دیا ہے جو ان نصوص کی تأویل جاننے کے لیے اس علم میں مشغول رہتے ہیں۔

گویا یہ تمام لوگ اس نظریہ میں مشترک/ یک زبان ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ان آیات کی ایسی تفسیر نہیں لے کر آئے جو ہمارے ہاں معقول سے موافقت رکھتی ہو؛ یا آپ نے ان کی تعلیم نہیں دی''۔[درء تعارض العقل و النقل ١/ ١٤-١٧]

بلکہ ہم نے اسے اپنی عقل سے حق جانا ہے؛ اور پھر ہم نے کوشش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام کو اس پر محمول کیا جائے جو ہماری معقولات کے موافق ہو۔

اور یہ کہ انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے ماننے والے علقلیات کے متعلق علم نہیں رکھتے۔ اور نہ ہی وسمعی دلائل کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تمام فرقے خود سیدھی راہ سے گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے ہیں۔[درء تعارض العقل و النقل ١/ ١٩]

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ان واھیات باتوں سے محفوظ رکھے جو جہنم کی طرف لے جانے والی ہیں۔

((سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَ سَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ))

وجد فی نهاية أصل المخطوطة ما يلی:

قد تم تحريرها علی يد الفقير خادم العلماء الأعلام المحرری الكتب فی جامع مدرسة مرجان عليه الرحمة والرضوان ؛ عبد المحيی بن عبد الحميد ابن الحاج محمد مكی الشيخلی البغدادی ؛ يوم الإثنين التاسع من شهر رجب الأصم من شهور سنة اثنين و عشرين و ثلاثمائة بعد ألف ۔

أقول : قد وافق تاريخ نهاية المخطوطة مع تاريخ نهاية تصويب الترجمة ٩ رجب ١٤٤٠ه۔

اس کتاب کا ترجمہ پچھلے سال ۱۳ جمادی الأولی ۱۴۳۹ھ کو حرم مکی شریف میں مکمل ہوا۔

اور نظر ثانی؛ اور ترجمہ کا لفظ لفظ اصل کتاب سے تقابل اس سال ۱۰ رجب ۱۴۴۰ھ کو نیلم اُٹھمقام میں مکمل ہوا۔

والله هو الموفق لكل خير۔

فہرست